خدا بخش لائبریری
جرنل
پٹنہ
۲۴
خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

رجسٹریشن نمبر ۳۳۴۲۴/۷۷

مجلس ادارت

- قاضی عبدالودود (چیرمین)
- عابد رضا بیدار (سکریٹری)

چوبیسواں (۲۴) شمارہ ۱۹۸۳ء

اس سہ ماہی مجلے میں انگریزی، اردو، فارسی یا عربی میں ایسے مضامین شائع ہوں گے، جو خدابخش لائبریری کے نادر مواد پر مبنی ہوں یا لائبریری سے کسی نہ کسی قسم کا تعلق رکھتے ہوں

قیمت : پندرہ رُپے

سالانہ خریداری			
	اندرون ملک	:	۶۰ رُپے
	پاکستان	:	۱۲ ڈالر
	یوروپ	:	۸ پونڈ
	امریکا اور دیگر ممالک	:	۲۴ ڈالر

محبوب حسین نے پٹنہ لیتھو پریس، رمنا لین پٹنہ ۴، اور لبرٹی پریس، پٹودی ہاؤس، نئی دہلی میں چھپوا کر خدا بخش لائبریری سے شائع کیا

فہرست

اس شمارے کے لکھنے والے

- **جناب قاضی عبدالودود** (پ ۱۸۹۶ء): فارسی و اُردو ادبیات کے معروف محقق، صدر جمہوریہ کے "سرٹیفکیٹ آف میرٹ" کے اعزاز یافتہ۔ دسمبر ۱۹۸۳ء میں ایوان غالب نے غالب پر آپ کی گرانقدر تحقیقات کے اعتراف میں "غالب ایوارڈ" ملا۔ ۲۵ جنوری ۱۹۸۴ء کو پٹنہ میں وفات پائی۔ مزید تفصیل کے لئے جرنل شمارہ ۱ ملاحظہ ہو۔

- **جناب سید شاہ محمد اسمٰعیل** (پ ۱۹۲۰ء): مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے وائس پرنسپل اور ہر دلعزیز استاد۔ ۱۹۷۸ء میں ریٹائر ہوگئے۔ ۱۹۸۰ء سے خدا بخش لائبریری سے وابستہ ہیں۔

- **حافظ رضوان اللہ آروی** (پ ۱۹۵۹ء): پٹنہ یونیورسٹی سے فارسی ادب میں ایم۔ اے۔

- **جناب ضیاء الدین اصلاحی** (پ۔ ۱۹۳۰ تقریباً): فاضل مدرستہ الاصلاح سرائے میر اعظم گڈھ۔ دار المصنفین (شبلی اکیڈمی) اعظم گڈھ سے وابستہ ہیں۔

بقیہ کے لئے ملاحظہ ہو جرنل، شمارہ ۱۲، ۲۰، اور ۲۱-۲۳

'دیوان رضا' قبل ازیں 'معاصر' پٹنہ ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا تھا

دیوان رضا عظیم آبادی

ضی عبدالودود

قاضی صاحب کے کارناموں کو ان کی خواہش کے مطابق یکے بعد دیگرے پیش کرنے کا منصوبہ بن گیا جس میں اوّلیت مختصر/مستقل بالذّات تحریروں کو دی جانی تھی۔ ان میں بحیثیت محقق محمد حسین آزاد، عبدالحق اور غالب کا جائزہ تھا؛ کلام دلدار اور دیوان رضا عظیم آبادی کی تدوینیات تھیں؛ اور ایک منتخب مجموعہ 'اثباتِ بہار' کی ترتیب تھی جس میں ان کی ہر نوع کی ایک تحریر شامل رہے۔ بحیثیت محقق محمد حسین آزاد والا جائزہ اور دیوان رضا کی تدوین، مکتبہ جامعہ کے لائق سربراہ شاہد صاحب کی جانسوزی سے جنوری میں قاضی صاحب کے ہاتھوں میں پہنچ چکی تھیں۔ اثباتِ بہار کی وہ صرف پہلی کاپی دیکھ پائے (کہ یہ ابھی کتابت کی منزلوں سے گزر رہی تھی)۔ رہے نام ذات حق کا ! اور رہے نام حق کی جستجو کرنے والے اس بے لاگ محقق کا جس نے سچ کی تلاش میں، سچ سننے، سچ دیکھنے اور سچ کہنے کی ایک بار قسم کھائی تو موت تک اس کو نبھا دیا !! سچ، صرف سچ، اور سچ کے سوا کچھ بھی نہیں !!

عابد رضا بیدار

۱۵ فروری ۱۹۸۴ء

پیشگفتار

رضا تذکروں میں

رضا سے متعلق تذکروں نے جو غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں ان کا ازالہ تذکروں سے رضا کے تراجم پیش کیے بغیر نہیں ہو سکتا۔ تذکروں کے زمانۂ تصنیف کے بارے میں مقدمۂ دیوانِ جوشش میں جو کچھ لکھا گیا ہے ناظرین کے پیش نظر رہے تو بہتر ہے۔

(۱) تذکرۂ شورش عظیم آبادی: تذکرۂ شورش کے صرف ایک نسخے کا اس وقت تک پتا چلا ہے اور وہ کتب خانۂ بوڈلین اکسفرڈ میں ہے۔ اس کتب خانے کی فہرست میں اس کا سال تصنیف ۱۱۹۲ھ لکھا ہے، لیکن اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اس کا سال آغاز اس سے پہلے ہے۔ ۱۱۹۲ھ کے بعد مصنف نے کچھ اضافہ کیا یا نہیں، اس کے متعلق فی الحال کچھ کہنے سے قاصر ہوں۔ میرے پاس اس تذکرے کے بعض اجزا کی نقل ہے، اس میں رضا کا حال نہیں، لیکن ۵ شعر ہیں اس کے علاوہ رضا کے کتنے شعر اس تذکرے میں ہیں اس کے متعلق مجھے کوئی علم نہیں۔ اشپرنگر نے رضا کے ترجمے میں تذکرۂ شورش کے حوالے صرف اتنا لکھا ہے کہ " جمال کے دادا (گرینڈ فادر) قاضی نور اللہ شوستری مصنف مجالس المومنین (کذا) مجالس المؤمنین تھے" اشپرنگر نے جمال کے متعلق دوسرے تذکروں کے حوالے سے لکھا ہے کہ رضا کے والد تھے۔ جمال اور قاضی نور اللہ کے درمیان کئی پشتیں ہوں گی، لفظ گرینڈ فادر کا استعمال صحیح نہیں، نہ معلوم شورش نے کیا لکھا تھا جس کا اشپرنگر نے اس طرح ترجمہ کیا ہے۔ فہرست اشپرنگر میں جمال تخلص کے ایک شاعر کا ترجمہ الگ ہے:

"جمالؔ میر جمال الدین حسین، پٹنوی (of Patna)، نور اللہ خاں کے بیٹے (a son of)، تھے جو اعلیٰ منصب دارانِ بادشاہی سے تھے (Held a high office)، تذکرۂ شورش" یہ جمال بظاہر وہی میر جمال الدین حسین ہیں جو رضا کے والد تھے، لیکن یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ نور اللہ خاں سے قاضی نور اللہ شوستری مراد ہیں یا کوئی اور شخص۔ اگر قاضی صاحب مراد ہیں تو اشپرنگر نے (a son of)، غالباً "از فرزندانِ" کا ترجمہ کیا ہے۔ اگر وہ مراد نہیں ہیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ جمال کے والد کا نام بھی نور اللہ تھا اور ان کا سلسلۂ نسب بھی اس نام کے ایک بزرگ تک پہنچتا تھا۔ اشپرنگر نے جمال کی ریختہ گوئی کا بصراحت ذکر نہیں کیا لیکن، تذکرۂ شورش میں ان کا ترجمہ ہونے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ ریختہ بھی کہتے ہوں گے اور اُن کے اردو کلام کا نمونہ اس تذکرے میں ہوگا۔ جلال تخلص کے تحت اشپرنگر جلال الدین حسین، برادرِ خرد کمال الدین حسین دہلوی کا ذکر کا اور سرور صاحب عمدۃ المنتخبہ کے حوالے سے کرتے ہیں یہ لکھتا ہے کہ وہ جمال الدین جمال سے جن کا ترجمہ تذکرۂ شورش میں ہے مُغایرت نہیں۔ سرور اور ذکا کے تذکرے تو پیش نظر نہیں، لیکن قاسم کا تذکرہ موجود ہے اس میں رجب ۱۱۶۹ھ (جمال الدین حسین، جلال برادر خردِ کمال الدین حسین کمالؔ" کا ذکر ہے۔ اگر یہ کمال وہی ہیں جو قائم اور جرأت کے

شاگرد تھے۔ اور قاسم اور ذکا کے تذکروں میں اس نام اور تخلص کے کسی اور شخص کا ذکر نہیں تو اشپرنگر کا خیال کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔

(۲) مسرت افزا سے فی الحال استفادہ ممکن نہیں، اس میں رضا کا حال ہو تو عجب نہیں۔

(۳) گلشن سخن کے دو نسخے ہیں ایک لکھنؤ میں، دوسرا رام پور میں۔ نسخۂ رام پور سے جناب عرشی نے رضا کا ترجمہ اور اشعار نقل کرکے بھیجے ہیں، میں اُن کا نہایت ممنون ہوں۔ "میر رضا عظیم آبادی، اسمش میر محمد رضا، ابن میر جمال الدین حسن (کذا) از اقربائے میر حبیب اللہ مرحوم، نومشق سخن ست" (دو شعر) حسن کی جگہ حسین غالباً سہو کتابت ہے۔

(۴) گلزار ابراہیم: مقدمۂ دیوان جوشش میں لکھا گیا تھا کہ مصنف تذکرہ کی ننھیال عظیم آباد میں تھی۔ صحیح یہ ہے کہ علی ابراہیم خاں کے نانا مولوی نصیر شیخ پورہ کے رہنے والے تھے، اور ایران سے واپسی کے بعد عظیم آباد میں اقامت پذیر ہوئے تھے۔ سیر المتاخرین نول کشوری ص۱۱۹۔ گلزار ابراہیم جس زمانے میں لکھا جا رہا تھا مصنف کا قیام بنارس میں تھا اور اس زمانے میں مصنف گلشن سخن کا قیام بھی وہیں تھا (گلزار ترجمۂ مبتلا)۔ گلزار میں گلشن سخن کا ذکر نہیں آیا، لیکن گمان قوی ہے کہ یہ تذکرہ گلزار کے اختتام سے پہلے علی ابراہیم خاں کی نظر سے گزرا تھا۔ انھوں نے رضا کے متعلق لکھا ہے:
رضا تخلص عظیم آبادی، اسمش میر محمد رضا ابن میر جمال الدین حسین، جمال تخلص از قرابتیان میر حبیب اللہ مرحوم بود، از فیض صحبت سخن وران عظیم آباد راغب گفتن ریختہ گردیدہ۔ نومشق ست" (۲ شعر) علی ابراہیم خاں کا بیان گلشن سخن سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ گلزار میں رضا تخلص کے ایک نامعلوم الاسم شاعر کا بھی ذکر ہے جس کے بہت سے اشعار علی ابراہیم خاں کی نظر سے گزرے تھے۔ ایک شعر جو دیا ہے اُس کی زمین وہی ہے جو میر محمد رضا، رضا کی ایک غزل کی ہے:

ایک دم تو رضا کے پاس تو بیٹھ آج وہ اس جہاں سے اٹھتا ہے

(۵) تذکرۂ عشقی عظیم آبادی: مقدمۂ دیوان جوشش میں تذکرۂ عشقی کے زمانۂ تصنیف کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اُس سے قطع نظر صحیح یہ ہے کہ اس کے زمانۂ تصنیف کے بارے میں صرف اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ اس کی ابتدا ۱۲۰۹ھ میں یا اس سے قبل ہوئی تھی، اور اس بنا پر کہ اس میں بظاہر کوئی واقعہ مرزا جان تپش کی وفات کے بعد کا درج نہیں اور تپش کی وفات بہ قول اشپرنگر ۱۲۲۱ھ سے قبل ہوئی ہے۔ تذکرۂ عشقی کا زمانۂ اختتام ۱۲۲۳ھ کے لگ بھگ ہے۔
رضا تخلص اسمش میر محمد تقی خلف میر جمال الدین حسین از فرزندان میر نور اللہ شوستری صاحب تصنیف احقاق الحق و مجالس المومنین از سادات کرام و نجبائے ذوالاحترام ست۔ در اوائل حال چندے بہ تحصیل رسائل علم صرف و نحو و بعضے قواعد ضروریہ عربیہ ... توافی پرداختہ و استصلاح این فن از ... ضیا نمودہ ... شیوۂ شعر و سخن زہن ... (ذکر م خودہ) داشت۔ مدتے در شہر عظیم آباد طرح استقامت انداختہ بہ وسیلۂ این فن در شہر مرشد آباد در سرکار نواب مبارک الدولہ بہادر بہ کام دل گذرانیدہ ہماں جا وفات یافت (اشعار ۲۰)۔ "در عظیم آباد طرح استقامت انداختہ" سے ظاہراً یہ مطلب نکلتا ہے کہ کسی دوسری جگہ سے عظیم آباد آئے، لیکن رضا کے عظیم آبادی ہونے کی اتنی شہادتیں ہیں کہ عشقی کا قول نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ عشقی نے جو ۲۰ شعر رضا کے دیے ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی جو

* یہاں پر کتاب کو ابھی حال میں کیڑوں نے خراب کر دیا ہے، "انداختہ" اور ... مبلا مجھے یاد ہے۔

دراصل امین کا ہے اور گلزار ابراہیم میں امین کے نام درج ہے :

مرتے ہیں ہم تو تیرے لب آب دار پر ۔۔۔ گر آب زندگی ہو تو ماریں ہیں دھار پر

(۶) تذکرۂ ہندی مصحفی و ریاض الفصحا : اشپرنگر نے تذکرۂ ہندی کے حوالے سے رضا کو سودا کا شاگرد لکھا ہے اور اُن کے دیوان کا ذکر کیا ہے، لیکن، تذکرۂ ہندی کے متعدد نسخے میری نظر سے گزرے ہیں کسی میں رضا عظیم آبادی کا ترجمہ نہیں مصحفی نے مرزا محمد رضا 'رضا' سودا کے صاحب دیوان شاگرد کا حال لکھا ہے، لیکن، وہ محمد رضا 'رضا' عظیم آبادی سے مختلف ہیں۔ ریاض الفصحا میں بھی رضا عظیم آبادی کا ذکر نہیں۔

(۷) مجموعۂ نغز مصنفہ قاسم دہلوی جلد ا صفحہ ۲۶۲ : قاسم نے رضا تخلص کے ایک شاعر کے متعلق لکھا ہے : جوانے ست از دودمان واجب الاحترام، میر محمد علی نام کہ بہ میر پٹنوی اشتہار دارد۔ بے طالب علمے ست از سکنۂ بلدۂ لکھنؤ محبت آما از شاگردان ضیا کہ در صنعت کشتی و شمشیر بازی دستے دارد۔ در علم ناگکا بھید و عروض و قافیہ مہارتے دارد" (تین شعر۔ ان میں سے ایک نقش شیریں کا مٹے الخ' دیوان میں ہے (صفحہ) اور دو صفحہ پر نقل ہو چکے ہیں۔ ان دونوں میں سے ایک تذکرۂ عشقی میں ہے (تیسرا شعر اور دوسرا شعر ایک ہی زمین میں ہے) قاسم نے محمدی کی جگہ غلطی سے محمد علی لکھ دیا، یہ دراصل محمد رضا 'رضا' عظیم آبادی ہی ہیں

(۸) عیار الشعرا[عـ۵] : خوب چند ذکا کے تذکرۂ عیار الشعرا کا مکمل نسخہ لندن میں ہے اس سے اس وقت کوئی مدد نہیں لی جا سکتی۔ پٹنہ کا نسخہ نسبتۃً مختصر ہے، ممکن ہے کہ اس میں رضا کا حال ہو، لیکن، بعض اسباب سے فی الحال اس سے بھی استفادہ نہیں کیا جا سکتا۔ اشپرنگر لکھتا ہے کہ اس تذکرے میں دو شاعر ہیں' ایک مرزا محمد رضا لکھنوی شاگرد سودا، صاحب دیوانِ مختصر اور میر محمد رضا شوستری معروف بہ میر محمد پٹنوی، متوطن پٹنہ مقیم لکھنؤ و شاگرد ضیاء میر محمدی کی جگہ میر محمد غالباً طباعت کی غلطی ہے۔ دتاسی نے (جلد ۲ صفحہ ۵۴۲) میر محمد علی رضا کے تحت لکھا ہے کہ ذکا ذاتی طور پر انھیں جانتا تھا۔ دتاسی کی نظر سے یہ تذکرہ نہیں گزرا تھا، اس کے متعلق اس کی معلومات فہرست اشپرنگر سے ماخوذ تھیں، فہرست اشپرنگر میں ذکا کی ذاتی واقفیت کا ذکر نہیں۔ دتاسی نے جو بات اشپرنگر نے غالباً میرزا جیون' رضا دہلوی کے متعلق لکھی تھی وہ محمد علی رضا کی نسبت بیان کر دی۔

(۹) نشتر عشق مصنفہ عاشقی عظیم آبادی : عاشقی بارھویں صدی ہجری کے آخری عشرے میں عظیم آباد میں پیدا ہوئے نشتر عشق جو فارسی گو شاعروں کا تذکرہ ہے، تیرھویں صدی کے چوتھے عشرے میں تمام ہوا ہے۔ اس کے متعدد قلمی نسخے موجود ہیں۔ ایک نسخہ دو ضخیم جلدوں میں کتب خانۂ مشرقیہ بانکی پور میں ہے: "میر محمد رضا 'رضا' مشہور بہ میر محمدی عظیم آبادی در بدو حال صرف و نحو فارسی تحصیل نمودہ رغبت بہ انشاے نظم ریختہ پیدا کردہ اصلاح از.. ضیا.. می گرفت و بہ طرز شعراے حال ریختہ خوب می گفت و پس از ایام چند پارۂ فقہ و حدیث حاصل نمودہ بعد رشد آبا تو بہ فرمودہ سکونت گرفت و بہ کمال زہد و ورع و اتقا و پرہیزگاری می زیست و بہ نہایت استغنا و بے اعتنائی

عـ۵ میرے پاس اس کا خلاصہ ہے، لیکن بدقسمتی سے اس کے ابتدائی اجزا ضائع ہو گئے ہیں۔

از امرا و روسائے آں دیار ملاقات می کرد و کم تر از خانۂ خود برمی آمد و اکثر بہ درس و تدریس اشتغال می داشت آخر حال توجہ بہ نظم فارسی گماشتہ از علوِ طبیعت و استعدادِ علمی خیلے خوش تلاش برآمد۔ غزل را بہ طرز صاف و شستہ می گفت و از حلم و اخلاق یاران را بسیار بہ عجز و فروتنی ملاقات می کرد۔ در سنہ ۱۲۱۶ھ راقم حروف از وطن مالوف خود برآمدہ در بنارس استقامت داشت کہ آں سیّد عالی نسب ہم بہ عزم حصول استفادۂ ملازمت.. باعث فخر ہندوستان مجتہد زمان حضرت مولٰنا دل دار علی صاحب مدظلہ العالی از بنگالہ بہ بنارس رسید و دو سہ روز بہ مکانِ میر علی ناظر عدالت شہر مذکور قیام داشتہ روانۂ لکھنؤ شد، چناں چہ راقم را ہم بہ مکان میر علی مرحوم از آں سیّد عالی نژاد اتفاق ملاقات افتادہ۔ در آں آوان سنِ شریفش قریب بہ پنجاہ و سہ خواہد بود۔ آخر در ہماں سال بعد از مراجعت لکھنؤ بہ مرشد آباد رسیدہ بہ گل گشت روضۂ رضوان شتافت۔ راقم گوید قطعہ:

بود سیّد با مذاق و خوش کلام و خوش خیال   سوئے جنت رفت ناگہ شاد از حکمِ قضا
سنِ تاریخش کسے پرسید چوں از عاشقی   خاطرش درخوں تپید و گفت افسوس از رضا

ایں مطلع از آں مہر سپہر سیادت و جلالت ست" (صرف ایک شعر فارسی)

(۱۰) گلشن بے خار نول کشوری ص۸۴: اس تذکرے میں میر محمد رضا رضا کے بارے میں لکھا ہے: "از ساکنانِ عظیم آباد ست پرتوے از میر ضیا یافتہ، و در عنفوان جوانی بہ ورع و زہد گرائیدہ" ایک شعر دیا ہے: اس کا کچھ انجام الخ دیوان ص۱
میر محمدی رضا کی جداگانہ ہستی تسلیم کرتے ہوئے ان کے متعلق لکھا ہے: "سیدے ست از لکھنؤ و از تلامذۂ میر ضیا ست" ایک شعر: نقش شیریں الخ دیوان ص۲۔ عنفوان جوانی میں زہد و ورع کی طرف میلان کا ذکر نہ معلوم شیفتہ نے کس تذکرے میں دیکھا۔ اشپرنگر لکھتا ہے کہ شیفتہ نے رضا تخلص کے دو شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ پٹنہ کے میر محمد شاگرد ضیا اور لکھنؤ کے میر محمدی شاگرد ضیا۔ گلشن بے خار کے مطبوعہ نسخے میں میر محمد نہیں میر محمد رضا ہے۔
تاریخ ادبیات ہندی و ہندستانی مصنفہ دتاسی جلد ۲: ص۵۸۶ "رضا (میر محمد یا محمدی) بہ قول عشقی عظیم آبادی ...... رضا کو لوگ بے تکلفی میں میر پٹنوی (امیر پٹنہ[۱]) کہتے تھے۔ ان کا قیام لکھنؤ میں رہا تھا (حاشیے میں لکھا ہے کہ انھیں رضا لکھنوی سے مختلف سمجھنا چاہیے) مگر ان کی وفات مرشد آباد میں ہوئی۔ رضا[۲] اور عظیم آباد کے ممتاز ترین[۳] ادیبوں میں جو دوستانہ ربط تھا اُس نے ان میں شاعری کا ذوق پیدا کیا؛ اور یہ.. سودا کے شاگرد[۴] ہوئے۔ رضا طرز جدید[۵] میں ہندوستانی شعر کہتے تھے، اور ان کے اشعار دیوان[۶] کی شکل میں مرتب ہیں۔ علی ابراہیم

[۱] چوں کہ لفظ 'پٹنوی' ممکن تھا کہ پڑھنے والوں کی سمجھ میں نہ آئے، دتاسی نے اس کی تشریح کر دی ہے۔ میر کی جگہ امیر لکھنا غلط ہے۔ اس سے مفہوم بدل جاتا ہے۔ میر پٹنوی میں میر سے سید مراد ہے۔ [۲] اس عبارت کا ماخذ گلزار کے سوا کوئی اور تذکرہ نہیں ہو سکتا، لیکن، دتاسی نے "ممتاز ترین" اپنی طرف سے بڑھا دیا ہے۔ [۳] مرزا محمد رضا، رضا لکھنوی سودا کے شاگرد تھے۔ دتاسی نے دھوکا کھایا ہے۔ [۵] نہ معلوم دتاسی کو یہ اطلاع کہاں ملی اور طرز جدید سے اس کا کیا مطلب ہے۔

اور مصحفی[۵۳] نے ان کے متعدد شعر نقل کیے ہیں ذیل میں ایک نظم (Piece de vers) کا ترجمہ ہے جو بینی نرائن کے یہاں ہے" [پانچ شعروں کا ترجمہ دیا ہے۔ یہہ اشعار چمن بے نظیر (مطبوعۂ مطبع مفید عام لاہور ۱۳۲۲ھ) میں موجود ہیں، مصنف کا تخلص دیا ہے، نام، اور وطن نہیں دیا:

جب شکر لبِ نے مرے لب سنائی گالی — مجھے میٹھی لگی خوش ہو کے میں کھائی گالی
کیا حلاوت تھی تری گالی میں اللہ اللہ — قند و مصری سے مگر تھی یہ بنائی گالی
چھیڑ کے تیرے تئیں ایسے ہی ہم کھاتے ہیں — عاشقوں کو تو ہے یہہ دودھ ملائی گالی
ترش رو ہو کے شکر لب جو مجھے دیتا ہے — وصف رکھتی ہے کھٹائی میں مٹھائی گالی

اے رضا تیری زباں تو ہے نپٹ شیر و شکر — یہہ نئی طرح کی اب تو نے بنائی گالی]

چمن بے نظیر میں رضا کے نام (شاعر کا نام اور وطن درج نہیں) کئی غزلیں اور ملتی ہیں، ان کے اشعار کی مجموعی تعداد ۱۶ ہے۔ دتاسی نے جس غزل کا ترجمہ دیا ہے یا اس مجموعے کی اور کوئی غزل میرے نزدیک رضا عظیم آبادی کی نہیں اس لیے میں نے ان غزلوں کو دیوان میں شامل نہیں کیا۔ چمن بے نظیر کی غزلوں کے مطلع یہہ ہیں:

تم نے کچھ قدر مری آہ نہ جانی افسوس ۵ شعر قدر دانی سے کوئی بات نہ مانی افسوس ص ۲
تمھاری مجھ سے تھی اے بے وفا شرط ۶ شعر مرے دل کی تو کیا لایا بجا شرط ص ۵
خواہ نزدیک رکھو خواہ رکھو دور ہمیں ۵ شعر دیکھنا ایک نظر تم کو ہے منظور ہمیں ص ۱۱]

ص ۲۵ : "رضا (میر محمد علی)، لکھنؤ کے ایک سید کے بیٹے اور ضیا کے شاگرد شعریات عرب میں اپنی مہارت کے لیے مشہور تھے۔ اس مہارت سے انھوں نے کام بھی لیا ہے، چناں چہ وہ بہ قولِ قاسم[۵۶] ممتاز ترین شعرائے ریختہ میں شمار ہوتے ہیں، اور دوسری چیزوں کے علاوہ انھوں نے ایک مثنوی[۵۷] بھی لکھی ہے۔ ذکا انھیں ذاتی[۵۸] طور پر جانتے تھے۔ انھیں لوگ اکثر میر محمدی بھی کہتے ہیں۔ (حاشیے میں ہے کہ شیفتہ اور کریم میر محمدی کا الگ ذکر کرتے ہیں لیکن میرے خیال میں یہہ صحیح نہیں) ۔ یہہ علی گڈھ میں عدالت[۵۹] کے ناظر تھے۔

---

[۵۴] رضا عظیم آبادی کے دیوان کا کہیں ذکر نہیں لیکن تذکروں میں رضا لکھنوی تلمیذ سودا کے دیوان کا ذکر ہے۔ [۵۵] بینی نرائن کے دیوانِ جہاں کا ایک نسخہ لندن اور ایک کلکتہ میں ہے، جنگ کی وجہ سے ان سے استفادہ ممکن نہیں۔ بینی نرائن غیر محتاط مصنف اور دتاسی بھی بہت بے پروا ہے۔ خبر نہیں دراصل یہہ اشعار بینی نرائن نے کس رضا کی طرف منسوب کیے ہیں [۵۶] قاسم نے محمد علی رضا کے کلام کے متعلق مطلقاً کوئی رائے ظاہر نہیں کی [۵۷] مرزا علی رضا، رضا شاگرد سرب سکھ دیوانہ نے مثنوی لکھی تھی۔ محمد رضا، رضا یا محمد علی۔ رضا کی مثنوی کا ذکر کسی تذکرے میں نہیں، مرزا علی رضا۔ رضا کا حال تذکرۂ میر حسن اور گلزار وغیرہ میں ہے [۵۸] یہہ بات ذکا نے غالباً میر جیون، رضا دہلوی کے متعلق لکھی ہوگی [۵۹] عدالت 'Ministère de justice' خدا جانے میر محمدی یا میر محمد علی رضا کا ناظر عدالت ہونا دتاسی نے کہاں سے لیا۔ میر محمد علی رضا، رضا اور میر محمد رضا، رضا اور میر محمدی رضا۔

(۱۲) سخن شعرا نساخ ص۱۸۱ : نساخ نے میر محمد رضا لکھنوی شاگرد ضیا اور میر محمد رضا عظیم آبادی شاگردِ ضیا کا الگ الگ ذکر کیا ہے۔ ایک ایک شعر جو دونوں کی طرف منسوب کیا ہے دیوانِ رضا میں پایا جاتا ہے۔

حالات زندگی

میر محمد رضا، معروف بہ میر محمدی عظیم آباد کے رہنے والے تھے اور ۱۱۶۳ھ[1] کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ ان کے والد میر جمال الدین حسین جمال بھی شاعر تھے، ان کے والد کا نام نور اللہ خاں تھا اور وہ عہدِ اکبری و جہانگیری کے مشہور فاضل قاضی نور اللہ شوستری کی اولاد سے تھے۔ قاضی نور اللہ شوستری ساداتِ حسینی سے تھے چنانچہ خود فرماتے ہیں[2]:

دارائے دہر سبط رسولم بود پدر بانوے شہر دختر کسریٰ ست مادرم

"صرف و نحو" اور "فارسی" کی تحصیل کے بعد[3] "سخن وران عظیم آباد" کے فیضِ صحبت سے ریختہ گوئی کا شوق پیدا ہوا اور رضا تخلص اختیار کیا، سالِ ولادت جو اوپر لکھا گیا ہے غلط نہیں تو ان کی شعر گوئی کا آغاز ۱۱۸۰ھ[5] کے لگ بھگ ہوا ہوگا۔ اُس وقت عظیم آباد میں فغاں اور عشق، جوشش اور دل وغیرہ موجود تھے، لیکن رضا نے میر ضیاء الدین ضیا دہلوی کو اپنا استاد بنایا۔ شعر گوئی کے آغاز کے بعد تعلیم کا سلسلہ جاری رہا، اور بہ قول عاشقی "پارۂ فقہ و حدیث حاصل نمودہ" کسی تذکرہ نگار نے تعلیم کے لیے ان کے لکھنؤ جانے کا ذکر نہیں کیا لیکن وہ تذکرہ نگار جو ان کے مرشد آباد کے قیام سے ناواقف ہیں، ان کا عرف میر پٹنوی بتاتے ہیں اور ان کی سکونتِ لکھنؤ کا ذکر کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ دینیات کی تکمیل کے لیے لکھنؤ گئے ہوں گے اور وہیں میر پٹنوی کے نام سے مشہور ہوئے ہوں گے۔ بنگالہ سے ان کا قدیم تعلق تھا، تذکرہ نگاروں نے انھیں "از اقربائے میر حبیب اللہ" لکھا ہے، مبارک الدولہ کے زمانے میں (۱۱۸۳ھ تا ۱۲۰۸ھ) یہ مرشد آباد گئے اور عشق کے قول کے مطابق "بہ وسیلۂ ایں فن (یعنی فنِ شاعری) بہ سرکار نواب مبارک الدولہ بہادر بہ کامِ دل گذرانیدہ" خود ضیا بنگالہ سے شاید خوش نہ تھے، دیوان میں یہ شعر پایا جاتا ہے:

کہاں بنگالہ اور کہاں میں رضا بس نہیں چلتا آب و دانے سے ص۶۶

---

[1] اگر عمر کے متعلق عاشقی کا بیان صحیح ہے [2] اس کے متعلق تذکرۂ شورش کی طرف رجوع کیے بغیر کوئی بات قطعی طور پر نہیں کہی جا سکتی۔ [3] ریاض الشعرا والہ نسخۂ کتب خانۂ مشرقیہ۔ [4] عاشقی۔ اس کے متعلق عشق کا قول بھی ملاحظہ ہو [5] دیوان رضا میں بہت سے شعر ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ رضا ضیا کے عقیدت مند شاگرد تھے۔ ایک شعر یہ ہے:

رضا استاد ہے لیکن ضیا سے اس کو کیا نسبت خدا کو پہلے پہنچے تب مرے استاد کو پہنچے ص۸

[5] عموماً شعر گوئی کا آغاز عنفوانِ شباب میں ہوتا ہے، اس لیے میں نے عاشقی کے اس قول کو کہ تعلیم کی تکمیل سے قبل ہی رضا نے شعر کہنا شروع کر دیا تھا قبول کر لیا ہے۔ گلشن سخن اور گلزار ابراہیم کے مصنفین نے جو انھیں نومشق لکھا ہے وہ اس بنا پر ہوگا کہ انھیں اسی طرح اطلاع ملی ہوگی۔

عاشقی کا بیان ہو کہ: "بہ کمال زہد و ورع و اتقاء و پرہیزگاری می زیست و بہ نہایتِ استغنا و بے اعتنائی از امرا و رؤسائے آں دیار (یعنی مرشدآباد) ملاقات می کرد و کم تر از خانۂ خود بر می آمد و اکثر بہ درس تدریس اشتغال" بہ خوبی ممکن ہے کہ ابتدا میں دربار سے تعلق رہا ہو اور بعد کو وہ حال رہا ہو جس کا عاشقی نے ذکر کیا ہے۔ رضا کے ایک شعر سے کسی حد تک عشقی کے قول کی تائید ہوتی ہے:

یہ غزل خدمت نواب کی ہے میر رضا — اور اک دوسری کہہ دیجیے ہم کاروں کو ۵۶

فارسی گوئی کی طرف انھیں آخر میں توجہ ہوئی عاشقی نے لکھا ہے کہ "از علوِ طبیعت و استعدادِ علمی خیلے خوش تلاش برآمد" ۱۲۱۷ھ میں مشہور شیعی عالم دلدار علی مرحوم سے ملنے کے لیے لکھنؤ جا رہے تھے کہ بنارس میں دو تین دن میر علی، ناظر عدالتِ بنارس کے مکان پر ٹھہر گئے، اور وہیں عاشقی کو ان سے ملنے کا موقع ملا۔ اسی سال لکھنؤ سے مرشدآباد واپس جانے کے بعد ان کا انتقال ہوا۔

ان کی تحصیل علم کے متعلق جو تفاصیل تذکرۂ عشقی اور نشترِ عشق میں ہیں اُن کے بعد ان کی عربی دانی میں شبہہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔ صرف و نحو سے عربی کی صرف و نحو مراد ہے۔ اور فقہ و حدیث اس زمانے میں عربی کے سوا کسی دوسری زبان میں شاید ہی کہیں پڑھائی جاتی ہو۔ عشقی نے "قواعد ضروریۂ عروض و قافیہ" کی تحصیل کا ذکر کیا ہے، قاسم کہتا ہے کہ علم نا کا بھید و عروض و قافیہ" میں مہارت تھی۔ اگر نا کا بھید میں مہارت تھی تو برج بھاشا سے بھی واقف ہوں گے۔ قاسم کے بیان کے مطابق "صنعت کشتی و شمشیر بازی" میں بھی دست گاہ تھی۔ انکے عادات و اطوار کی کسی نے برائی نہیں کی، عاشقی نے ان کی مرشدآبادی زندگی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ اوپر گزر چکا ہے شیفتہ کا قول ہے کہ "عنفوانِ جوانی" سے ہی زہد و ورع، کی طرف مائل تھے۔

ان کی اولاد کا ذکر کسی تذکرے میں نہیں، لیکن عشقی کے یہاں ایک شاگرد کا حال ملتا ہے: جعفر و جعفری تخلص اسمش مرزا جعفر پسر کہتر فائز علی خاں جوانے .. رند مشرب از غزل سرایانِ عظیم آبادست۔ در اوائل مشق .. اشعار خود از نظر میر محمدی، رضا .. می گذرانید، چناں چہ بہ فیض صحبت میر مرقوم بر بعضے قواعد ضروریۂ علم عروض و قوافی ماہر گردید ..." عشقی نے جو اشعار دیے ہیں اُن میں سے ۳ نقل کیے جاتے ہیں:

تمنائے قدم بوسی میں آنسو بہہ چلے یاں تک — کہ بہتے بہتے موجِ اشک ہی، جا پہنچے ہم واں تک
یوں کسوتِ صورت میں نہاں تو ہے عیاں ہم — جوں پردۂ معنی میں عیاں تو ہے نہاں ہم
یارب بتوں کے دل میں کوئی راہ کیا کرے — پتھر میں کچھ کرے ہے اثر آہ کیا کرے

تصانیف

فارسی کلام: فارسی کلام مدوّن ہوا یا نہیں، اس کے متعلق مجھے کچھ علم نہیں۔ کتب خانۂ مشرقیہ بانکی پور کی مطبوعہ فہرست جلد ۳ میں کتاب ۳۴۹ کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ رضا عظیم آبادی کا دیوان ہے۔ اس کتاب میں مصنف کا نام مرقوم نہیں متعلقہ میں البتہ رضا تخلص ہے۔ فہرست نگار نے اپنی رائے اس بنا پر قائم کی ہے کہ اس دیوان میں رضا کے مخمس قتیل کی

غزلوں پر ہیں۔ جس زمانے میں میں نے اس دیوان کو محض سرسری طور پر دیکھا تھا۔ فہرست نگار کی راے سے اختلاف کی کوئی وجہ نہیں پاتا تھا۔ اب کے اسے غور سے پڑھنے کا اتفاق ہوا تو ردیف ت میں یہ بیت ملی:

از شفائی بہر گوے سخن گوئی ہا   بلگرامی ست رضا گرچہ صفاہانی نیست

سید محمد رضا، رضا بلگرامی شاگرد مصحفی و قتیل (بہ روایتِ صفیر بلگرامی) غدر سے دو برس قبل تک زندہ تھے، یہ دیوان انھیں کا ہے۔ صفیر نے جلوۂ خضر جلد اوّل میں (ص۱۶۱ و ص۱۹۰) میں ان کے فارسی دیوان کا ذکر بھی کیا ہے۔ نشترِ عشق میں رضا عظیم آبادی کا صرف ایک شعر دیا ہے وہ اس دیوان میں نہیں:

"کشتن چہ لازم ست بہ این خشم و کین مرا   از ناز چون نمی کشی اے نازنین مرا"

دیوان اردو: ہندوستانی تذکرہ نگاروں نے رضا کے دیوان اُردو کا ذکر نہیں کیا، لیکن اس کے دو نسخے ن اور ن۲ جو سید وکیل احمد صاحب (بہار شریف) کی مِلک ہیں اور انھیں نواح مرشد آباد کے کسی کتب خانے سے دست یاب ہوئے ہیں، اس وقت پیشِ نظر ہیں۔ دونوں کی تقطیع ایک ہے (تقطیع ۱۰×۶ ۱/۲ انچ)، اور دونوں کسی زمانے میں بعض اور کتابوں کے ساتھ ایک ہی جلد میں تھے۔ ن کے آخری اوراق ضائع ہو گئے ہیں۔ اوراق موجودہ کی تعداد ۶۰ ہے۔ کسی صفحے میں پندرہ کسی میں سولہ اور کسی میں سترہ سطریں ہیں۔ ن جا بجا سے کرم خوردہ ہے اور اس کا کاتب بدخط اور کم سواد ہے۔ کاتب اور زمانۂ کتابت کے متعلق اس میں اگر کچھ ہوگا تو وہ ضائع ہو گیا۔ میری راے میں ن۲ اس کی نقل ہے۔ اگر یہ راے صحیح ہے تو اس کا زمانۂ کتابت جمادی الاخری ۱۲۲۵ فصلی سے قبل ہے۔ ن۲ کے اول و آخر کے اوراق موجود ہیں لیکن درمیان سے بہت سے اوراق غائب ہیں۔ موجودہ اوراق کی تعداد ۲۹ ہے اور مسطر ۱۵ سطروں کا ہے۔ اس کے کاتب کا خط بہتر ہے لیکن غلط نویسی میں یہ کاتب ن کا بھی استاد ہے۔ خاتمہ حسبِ ذیل ہے "تمام شد ہذہ الکتاب دیوان میر رضا بہ خط خام بے سرانجام شیخ حفیظ اللہ بہ پاس خاطر کلب علی خاں صاحب تعالی اللہ عمرہ۔ بہ تاریخ بست پنجم شہر جمعہ الثانی (کذا) ۱۲۲۵ فصلی قلمی شد"۔ دیوان مطبوعہ میں ن اور ن۲ سے ۵۶ ، ۱ شعر لیے گئے ہیں۔ اگر میرا یہ خیال صحیح ہے کہ ن۲ ن کی نقل ہے تو اس بنا پر کہ ن کے آخری اجزا جو ضائع ہو گئے ہیں ن۲ میں موجود ہیں، یہ کہا جا سکتا ہے کہ کاتب ن۲ نے نقل کرنے میں سہواً جو اشعار چھوڑ دیے ہوں اُن سے قطع نظر ن مکمل موجود ہے۔ اپنی اصلی شکل میں بھی یہ نسخہ رضا کے کل کلام پر حاوی نہ تھا، اس لیے کہ تذکروں میں ۲۵ شعر ایسے ملتے ہیں جو ن یا ن۲ میں نہیں اور ان میں سے بیشتر کا شمار رضا کے منتخب اشعار میں ہے۔ دیوان مطبوعہ کی ترتیب اور قلمی نسخوں کی ترتیب میں بہت کم فرق ہے۔ غزل ۱۱۲ ن میں غزل ۱۰۹ کے بعد اور ۱۱۰ اور ۱۱۱ سے قبل ہے۔ غزل ۲۴۹ ن میں ردیف و ہی میں ہے۔ دونوں کا املا رضا کے زمانے میں 'دونو' بھی تھا۔ اس کے علاوہ ممکن ہے کہ بعض شعروں کی ترتیب نقل کرنے میں نادانستہ بدل گئی ہو۔

---

[۱] جہاں تک مجھے یاد ہے پروفیسر براؤن نے اپنی فہرست میں لکھا ہے کہ رضا تخلص کے ایک (غالباً اردو گو) شاعر کا دیوان کنگز کالج کیمبرج کے کتب خانے میں موجود ہے۔ یہ دیوان میری نظر سے نہیں گزرا۔

املا اور زبان

املا کے جو اصول دیوانِ جوشش کی ترتیب کے وقت پیشِ نظر تھے، دیوانِ رضا کی ترتیب میں بھی اُن کی پابندی کی گئی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ فارسی کے بہت سے الفاظ جو پہلے غالب کی تقلید میں ز سے لکھے گئے تھے، دیوانِ رضا میں ذ کے ساتھ ملیں گے۔

رضا کی زبان وہی ہے جو اُن کے دہلوی ہم عصروں کی ہے۔ بہار و بنگالہ کا اثر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا۔ رضا عربی داں تھے اور بہ قولِ عاشقی "درس و تدریس" کا شغل رکھتے تھے، لیکن ان کی زبان اہلِ مدرسہ کی زبان نہیں۔ کوئی ایسا عربی لفظ جس سے اردو بولنے والے مانوس نہ ہوں، انھوں نے استعمال نہیں کیا۔ عربی فقرے بھی ایک آدھ جگہ سے زیادہ ان کے دیوان میں نہیں آئے۔ اور عربی الفاظ کو انھوں نے اسی طرح برتا ہے جس طرح وہ ہندوستان میں مستعمل تھے: فارسی مادّوں سے عربی سانچوں میں جو لفظ ڈھالے گئے ہیں اُن میں بھی بعض ان کے یہاں ملیں گے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں: الکاظمین الغیظ ۲۶۱، سہی[1] ۹۳ (جس موقع پر عموماً صحیح استعمال ہوتا ہے، رضا نے سہی لکھا ہے)، حشر ۱۸۰ و ۲۱۶ (بہ سکونِ ش چاہیے۔ حشر رضا کے کسی ہم عصر کے یہاں میری نظر سے نہیں گزرا) مؤثر ۲۴۴ (مؤثّر بہ تشدیدِ ث چاہیے۔ جوشش کے یہاں مؤثر بغیر تشدید ملتا ہے) تظلّم ۸۲ (ظلم کے معنی میں اہلِ ایران استعمال نہیں کرتے۔ سودا، ضیا، حسن، نصیر وغیرہ نے البتہ اسے ظلم کا مرادف قرار دیا ہے) مزیّب ۱۹۱ (زیب سے اہلِ ایران نے بنایا ہے۔)

فارسیت بھی رضا کے یہاں ان کے اکثر معاصرین کے مقابلے میں کم ہے۔ (۱) نامانوس الفاظ بہت کم ہیں۔ ممکن ہے کہ اہلِ اردو خیاغ ۱۳۰ (بہ شرطِ خیاغ)، ردستائی ۱۰۲، مژدکانی ۷۷، کو نامانوس قرار دیں (۲) بعض الفاظ میں خود تصرف کیا ہے یا ان میں تصرفات کو قبول کیا ہے: لاچار ۴۰ (صحیح ناچار)، زرہ پوش ۲۰۰ (زِرہ چاہیے)، دوانا (۳) فارسی لفظوں میں اردو کی یاے تانیث[2]: سبزی ۹۳، دوانی ۲۲۵، مستانی ۲۱۱ (۴) فارسی اور عربی مادّوں سے جو مصادر اردو والوں نے بنائے ہیں انھیں استعمال کیا ہے: لرزنا ۳۰ (لَرزنا چاہیے)، بدلنا، بخشنا، فرمانا، گزرنا، آزمانا (۵) عربی، فارسی اور ہندوستانی الفاظ کی ترکیب: بے چین ۷، دل جلا ۴۲، ایک بارگی ۱۷۱، تازہ ملا ۷۱، دیوانہ پن ۴۲، طوفان بھرے ۲۱۹، ارمان بھرے۔ (۶) فارسی عربی یا ہندوستانی کے دو لفظوں سے جو ہم معنی یا قریب المعنی ہیں، بیچ میں واوِ عطف لائے بغیر مرکبات بنالیتے ہیں، اور اس سے معنی میں کوئی تغیرِ مقصود نہیں ہوتا: تن بدن ۵۰، گلی کوچہ، راہ باٹ ۱۱۲، بوباس ۲۶۳ (۷)، الف ندا: قاصدا ۱۴۱، ساقیا ۹۰، واعظا ۱۵۰، ناصحا ۱۶۰ (۸) واوِ عطف: "وہ ایمن کی تھی نہ وادی ہو نہ نخل طور تھا"، کیا دیر و کیا حرم ۵، نام و نشان ۱۷ (۹) اعلانِ ن: شہر ویرانے ۹۰، آب و دانے ۴۰، زخم و داغوں ۴۶، پان و مسی ۱۵، اینٹ و پتھر ۲۱۱، رات و دن ۲۴۲ (ان دونوں میں کتابت کی غلطی بھی ممکن ہے۔) دو فارسی لفظوں کے درمیان کبھی واوِ عطف نہیں بھی لاتے: دل جگر ۱۴ (۹)

---

[1] اگر ایک عدد ہے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ اس سے غزل کا شمار مراد ہے، اگر دو، تو اوپر غزل کا اور نیچے شعر کا شمار ہے۔ [2] ذ سے مراد مذکر اور ث سے مؤنث ہے [3] اس میں یاے مصدری بھی ہو سکتی ہے۔

فارسی حروف جار و ربط وغیرہ سودا و میر کے مقابلے میں بہت کم استعمال کیے ہیں:* تا مجھے انتظار میں مارے ۵۵، تا حشر ۱۰۹، داغ بر بالائے داغ ۱۵۳، خانہ بہ خانہ ۱۰۸، در بہ در، تا کجا ۲۲۹، در پئے آزار ۲۹۲، بہ سان شمع ۳۰۲، بہر امتحان ۹۴، کو بہ کو ۱۷۸ ۔ (۱۰) فارسی کی تقلید میں فعل وغیرہ کی صفت اس طرح لاتے ہیں کہ حروف ربط وغیرہ کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس کی مثالیں ان کے یہاں زیادہ نہیں۔ جہاں اردو کے روزمرے میں علامت اضافت کا یا کی استعمال ہوتا ہے محض کسرۂ اضافت سے کام لیتے ہیں، یا کہیں یہ بھی نہیں ہوتا روزمرۂ اردو کے خلاف فارسی کی تقلید کی ان صورتیں بھی ہیں، لیکن یہ سب رضا کے معاصرین کے یہاں رائج ہیں: محرم عالم کا ۲، قیامت شور پڑے گا ۴۴، عشوہ گری کا شرمندہ (شرمندۂ عشوہ گری) نالہ تن پر کرنا ہے ۱۷۱ (برتن کا ترجمہ)، فخر صفائے صبح کرنا دم دیر دیر آتا ہے ۱۴۷، حیات آرزو کریں ۱۹۳، دم عیسیٰ کیا تمنا کریں، پامال عندلیب ۲۶۹، ہم دیر واقف ہوئے ۳۲۱ (۱۱) فارسی محاوروں اور روزمروں کے تراجم انھوں نے لیکن، جو ان کے عہد میں رائج تھے اُن میں سے زیادہ تر ایسے جو بہت عام تھے ان کے یہاں ملتے ہیں: کسی سے برآ آنا ۹۵، مدلف کو شانہ کرنا ۲، شیوہ لینا ۱، مجھے امتحان کیا ۲، آشیاں کرنا ۲۷، سبق روشن ہونا ۷، براقتادہ ہونا ۹۸، کسی سے صحبت برآر ہونا ۲۵۳، برباد دینا ۲۶۸ (اور مثالیں دوسری جگہ ملیں گی)

<u>فارسی اور عربی کے مفردات و مرکبات</u>: اس عنوان کے تحت فارسی او عربی کے مفردات و مرکبات اکٹھا کر دیے گئے ہیں۔ کہیں کہیں موقعِ استعمال دکھانے کے لیے ان کے ساتھ جو ہندوستانی الفاظ مستعمل ہوتے ہیں وہ بھی دیے گئے ہیں:

اظہار خلق، جوش تنور، مسجود، خباب احمدی، بے سائگی، کاشانہ، سکتہ، رکاب عالی میں، ضبط نفس، خوں گرفتہ، معجز، زور ہے (زور بلا نوش تھا)، خورشید کا صفحہ، قضیا (صحیح قضیہ)، ناترس، رقیب خانہ برانداز، بے رحمانہ، ماتم خانہ، خوش خرم، لب جاں بخش، نگہ بان، پرستش، گریہ تاں ۲۴، یا رخدا یا لال ۹۲، مضطر ۳۲، حباب اسا، توشق، بلاکش ۲۴، سر زلف کا رنمایاں، فروزاں، نامراد، دغا بیگانہ ۵۲، گوار (گوارا) جائے رقت، بوالہوس، صرف زباں ۵۶، جائے باش، خوش آشیاں، فروغ شمع بزم نکتہ دانی، فکر تکفین (بہ اعلان ن)، لیاقت، دشت پیمائے جنوں، ناخوشی دوست، نالۂ آتش فگن، عشق رسوا، ستارہ سوختہ، با وصف سوزباں کے ۶۱، دلگیں، حرف بہ گویاں، صراط تریاق، زیاد، اہل معنی، مقرر، ۶ میراث ۹۹؟، بر جہاں پرور، اک وضع سے، خشکی طالع، حسن روزافزوں دل، عشق شور افزا، چشم سخن گو، صاحب جگری، ظروف ۱ (ظرف)، آہ سحری دیدہ وری، سوختہ موزونوں (شاعروں) ذرہ سی بات جوڑا بھی ملتا ہے ۲۷، اس معاملے میں، بدمزگی، خاطر گرفتہ، خبث ۷۶، چھپی، ناشورا، مادر زاد (داغ دل کی صفت)، اگر بینا، آئینہ سیما، شور افگن، شارع نگر ۹؟، خانۂ دل حبیب، تیرہ روزی ۳۸، تعزیہ خانہ، کم فرصتی، درد جاں تاں، قماش دل، سخن رس، آتش خانہ، بزم افروز، ستم ایجاد۔

* کسی لفظ کے بعد علامت استفہام سے یہ مراد ہے کہ قلمی نسخے میں ممکن ہے یہ نہ ہو۔

آہنِ جگری، شیر و یہ (بہ وزن مطلوبہ) حسرت قد کا خستہ، نشا۱۹۱ (نشہ)، جاں فشانیوں، بدلا، یہ بات ٹھہرے ۹۳،
آگہی، ردیف، تاب ناک، شاعراں، شاعراں، جواب جواب، (زبانِ حال، شاعرو)، ہم پیشگی ۱۰۲، مدرس، شہری
ناچارگی (ناچاری) روے آتش ناک، تھے لگائے ورنہ رند ہے تیاک رات" (زبان حال، رند) شعلہ افشاں،
قرب و بُعد، شمع شبستاں، خوش حرکات ۱۱۲، خندہ زن، ابر دریا دل، نہ دیدن، درہم، دینار،
معمورۂ عالم، جاروب کش، واقعہ (" یقیں کے واقعے کی سن خبر وہ بدگماں بولا یہ دیوانہ کچھ اتنا تو نہ تھا بیمار کیا
کہیے") عزادار، دلِ نالاں (بہ اعلان ن) شمع سحرگاہ، خس پوش، اشباہ، محل نشیں، تازہ و تر، حیرت فزا،
مبادا، دہرِ خانہ آباد، بیلے ۱۲۵، مایہ ناز، زبانی فرہاد، عین کرم، کشاکش ۱۲۸، فراموشی کاراں، سر منظر یہ ۱۳۳
سیہ روز، فائدہ تر، سادہ تر ۱۳۹، فراشِ محفل، دامن ناز، فوج کشی، بندہ نواز، خوش آمد، خدا نہ کردہ،
طفل بازی گوش (یہاں کوش صحیح نہیں)، بد قمار، پرستار، کج فہم، شہر بیدادوں ۱۴۸، (اضافت کی یہ
صورت اب جائز نہیں)، سیراب، شرابی، مستانہ، جانانہ، جلوۂ مستانہ، بے خطر، قلبِ دل، ہم سفری، ملزوم شعار
عاشق، غمزۂ بے باک، اشکِ جگری رنگ، جاں سپری، یار و اغیار ۱۶۴، خوں چکاں، رازِ نہانی، آب ریزی،
روغن فشانی، معنی رس، مباد، عبدالصنم، وسعتِ مشرب، لیک، سوختگی، دیوانے مستانے ۱۷۲، موردِ سفر، گویا،
خطِ شکستہ، کینہ ور، بے جگر، رعشہ، غریب غریب ہو کر ۱۷۵، حالی شعر، نشانہ گاہ، خندیدہ، نالیدہ، دریہ درگزیدہ،
غلیدہ، اشکوں سے طوفان دیدہ، دو جہاں سے دامانِ خواہش چیدہ، نامہ پیچیدہ، چشمِ خوں فشاں، صرع، شریانِ
غبطی، مہد، بہ قولِ حسن، بے غیرت، سیہ بختی ۱۸۵، اصاحبی، تن پروری، عقلاً، گرم خو، آفتاب رو، نگاہ قہر، نظر التفات،
خوں فشاں غزل، صاحبِ معنی، نالۂ خونیں، چمن زار، دنبالہ گرد، سبحۂ صد دانہ بوسے کے بدل میں ۲۰۲، حسن کے عمل میں،
گل بوٹے، قبلہ و کعبہ، مطعونِ زبانِ انام، نمازی، بیت المال، کالاے جہاں، حسبِ حال، مولوی، مسئلہ اشکال
(مشکل)، قیل و قال، دل مغفور، خارہ (خارا زیادہ تر مستعمل)، ثابت و سیارہ، سراپا ۲۱۱، خستہ جگر، خاطر خوش،
محنت رسیدہ ۲۲۵، جدائی نہ دیدہ، خمیدہ، از خود شدگانِ عشق، راحت طلبی، ظفر، زہرِ حسرت چشیدگانِ فراق،
من و سلویٰ، کارفرمائی، جستجوے محال، نیا کی وضع کا کلام، گرنگی ۲۳۰، اعجازِ عیسوی، تکرار ۲۳۱، واجب القتل،
خشمِ بے موقع، گھر شب چراغ، جمعیتِ اغیار، سایہ فگن، خوشی جاں ۲۴۲، شوخ چشمی، عکس پذیرا، معرکۂ عشق،
جاں باز، ترکِ تازِ غمزہ، خوش دہن، غزل کو در غزل کہنا، سخن داں، شکنجِ زلف، بے موجب ۲۵۲،
نرگسِ مخمور، طرز نگاہ، دل عفراں پناہ، سوختہ جاں، شرعِ محبت، قابلِ دیدار (جو دیکھ سکے) آئینہ، خاطر گرفتگی،
ضعف، رنج روی، منفردی، ہم کاروں، دشوار دل ۲۵۹، خاتونِ جنت، موالی (بہ طور واحد استعمال کیا ہے)
اس کی مثال دوسرے شاعروں کے یہاں ملتی ہی نا صبی، حضرت صاحب، رجعت، قناعت، آمیزشِ دنیا،
خس ۲۶۴، پا برہنہ، حقِ صحبت دیرینہ، ذوقِ مستی، حورِ بہشتی، شعلہ در، پرورش، بو قلموں، پیچ تاؤ (پیچ و
تاب)، دل سوختہ، نگاہ غلط انداز، کم حقی، قدیمی، مخلص، وادیِ مقدس، بیہودہ (بجھر نا کے ساتھ)،

تباں ۲۰۹، سمی پارۂ دل، طفلِ دبستانی، ملّا، حرمانِ زدگان عشق، جفا پیشہ، حدت گزیں، کج باز، نکتہ داں ۲۸۲ (بہ اعلان ن) دنیا، بدبلا، بوالہوس، چاپلوس، خدائی خراب، زلفِ کج ادا، چنداں، بیرنگی، صورت آشنا، دریدہ، قبلۂ من، آزردہ دخفا، عشق ہوس فزا، صنعت نمائی، خستہ حالی، اذیت، پلۂ میزاں، رنگ باختہ، حسن سرکش، مراختہ ؟ ۳۰۰ (ریختہ سے اہلِ ہند نے بنایا)، ساختہ (جنوں کے لیے)، خاطر اندوہگیں، آتش دربغل، اعجاز آفریں، شاخسانے، خواہ نخواہ، شعر شناس، شکریں دہن، عارفوں، ہلاک خستہ دردناں ۳۰۸، داشد، آہ سوزناک حربا، کشتۂ سیماب (بے پیر (اس میں پیر کی اصل کیا ہے، یہ متیقن نہیں)، شکستہ رنگی، تعیین جہنم احول، جلنے کو مہیا، دل گرفتہ، آہ گنہ گاروں (آہ گنہ گاراں زبانِ حال)، شعلے، رعنائی قد، تغیر، کرامت ۳۱۰، جگر کے پرزے، ادیب عشق $\frac{۳۱۹}{۲}$، قرینہ، سگانِ کو، موتی، حسن جاں افروز، کلمۃ الحق، غلط فہم، جگر کاوی، لالۂ احمر، بے طاقتوں، سخن سازی، دیوار قہقہہ، بے طرح کی لگاوٹ ۳۲۰، تلخی نزع، بینائی۔

ہندوستانی مفردات ومرکبات (متروکات بھی اسی عنوان کے تحت ملیں گے) نامانوس ٹھیٹ ہندوستانی، الفاظ رضا کے یہاں کم ملتے ہیں، حالاں کہ رضا کے مقلد (دور برج بھاشا سے واقف ہونے کی وجہہ سے توقع تھی کہ ان کے یہاں ایسے الفاظ زیادہ ملیں گے: "اس کے تئیں" یاں (غالب نے یہاں تک مجھے یاد ہے اپنی ایک غیر مطبوعہ تحریر جو کتب خانۂ ریاست رام پور میں محفوظ ہے، یاں اور واں کا لفظ یہاں اور وہاں بتایا ہے، لیکن اب اس طرح کوئی نہیں بولتا، (دراصل یہہ ہے کہ یہہ الفاظ بول چال میں ہیں بھی نہیں۔) مت، شو، پرے، تلک، ٹک، یہ، اُس بن، ادھر، لڑکوں کا گھروندا، بن بیا ۱۵، بل بے، کیوں کے، نت، عالم کے بیچ، غیر کنے، کتا، کھوج ۲۰، اپنے تئیں، پتنگے، اُن نے، جھالا، (لوہو) اکھٹا (بہ وزن یک جا)، سوتوں، ۳۱، دونی، اودھر، جوں ۴۰، کبا سا، پھول پھل، رسی سانپ کا کٹا ہوا ڈرتا ہے، سرنگے، الٹی سمجھ، گیلی ۵۶، لکڑی، نیٹ ۶۴، ہنستا چہرہ، صراط اوپر (صراط کے اوپر) جیدھر، مرزوع کے اوپر، اب تئیں (ابنا ساب)، کواڑ، آگے $\frac{۶۹}{۲}$، جلتے بی، تجھ بن (تجھی) بیچ مچ کا دیوانہ، چھلا ۹۰، کھلی، اپنے بھاؤں ۹۰، ادگست $\frac{۹۹}{۲}$ کھرپے (مرکب)، مرگئے کے بعد لاش پر، برائی بھنائی بات، ۱۰۲، میاں (بہ قول مصنف بہار عجم یہہ لفظ سندھی ہے)، جوں کے $\frac{۱۰۱}{۲}$، گھاٹ گھاٹ ۱۱۱، دھواں دھار ۱۲۲، مر گئے پر، آٹھوں پہر، بھلے مانس ۱۳۱، کناری، پور، بھالا، تردار (ان دوران میں زیادہ تر تردار)، تلوار بہت کم)، کیدھر ۱۵۰، تجھ پیرہن میں (تیرے پیرہن میں)، مجھ گریباں، دے، تب ۱۶۳، مول، اس ہی (اسی)، اپنے کام کے بہانے ۱۶۷، منہ دی بھرا، تجھ ذکر، تبھی ۱۸۱، پھینک پھانک ۱۹۲، انکھیاں یا توں ۲۰۰، جلتے بلتے، بھونچال، دھتاں سجھوں ۲۱۵، موڑوں ۲۲۰، بن اجل، اپنے، بھوا صرف پر طور، ردیف آ گند ۲۴۱، گدھا (بہ ہائے مخلوط)، کٹنے اک ۲۵۹، جھنت، ہنگ، پیا، گھاؤ، بناؤ $\frac{۲۷}{۲}$، دنیا، لگاؤ، چار دن زی، اگلی باری ۲۰۰، سروتی ۲۸۲، برچھی، لونڈے، بھرے بھادوں، جوں توں کے ۲۹۰، بھائی ۲۹۵، چہیرا، ادھن، بیبا کی، رنت، بوڑھا، اس کا سا، داں، آپ سے ۳۱۴، روتی صورت، لگاوٹ، گات، چھب۔

مصادر، محاورات، روزمرے: کس مصدر کے ساتھ کون سے الفاظ استعمال کیے ہیں کون کون سے محاورات رضا کی زبان پر تھے اور فارسی محاوروں اور روزمروں کا کس طرح ترجمہ کیا ہے اس کی مثالیں ذیل میں ملیں گی:

زلفوں کو صبا سے الجھانا، اسی دن کے لیے نہ بکنا تھا، سر پٹکنا، لہلہانا (چمن کے لیے)، تلانا، غنچہ کھلنا، دریا کا ابلنا، سنوارنا ۲، اُگنا، جلانا، دل میں انگارے بونا ۴۴، ڈبونا، کسی سے صحبت نبھنا، لوہو بہنا، کسی چیز سے چھلکنا، گھورنا، پاؤں چھونا ۴۹، نہال اگتے ہی جلا، خون میں لوٹنا، کسی سے نہ بننا ۵۹، بہانا، اپنے تئیں رسانا ۶۶، ترسنا، کسی کے تلووں کو سہلانا، کسی کے پاؤں سے لپٹنا، قسمت لڑنا، دل جلانا، زبان ہلانا، سلانا، شعلہ بھڑکنا، تحمل کے سوا عاشق سے کچھ نہیں بنتا، قافیہ ٹھہرنا، پچھتانا، ہونٹ ہلنا، شعلہ بھڑکانا، کسی کی بات آزمانا، بات بڑھانا، بدبدانا، چونکنا، جھانکنا ۱۰۲، چوکی بٹھانا، خوان میں ٹکڑے چننا، آنکھوں میں رات کاٹنا، وادی کو عنان پھیرنا، قتل کو بہانہ ڈھونڈنا، ڈبانا، بکانا ۱۲۳، زلفوں کو بکھرانا، کاغذ لکھنا، کسی کی گور پر نور برسانا ۱۳۶، مطلب کھلنا ۱۵۵، گھڑیاں گنتا ہم سفری مجھ سے نہ چاہو، زلفوں کا بنانا، پھولنا پھلنا ۱۷۰، راہ روکنا، کسی سے آنکھ لڑانا، دل میں جو ٹھہرا ؤ گے تم، غزل پڑھوانا، سنبھالنا، جنگل گھیرنا، چونکانا ۱۹۲، سر کو پیٹنا، دل چاک چاک ہونا ۲۰۱، گلنا، کسی کو مچلنا ۲۰۲، لگانا بجھانا، زہر اگلنا، دل پگھلنا، کھلوانا، ہاتھ ملنا، عینک نہ اترنا، تیر سا دل میں کھٹکنا، بازی جیتنا، کسی کے منہ سے رال بہنا، چھپیت جھپکنا، جی میں باتیں سمانا، لڑائیاں ٹھانا، جفا سے منہ نہ موڑنا، آنکھیں مندنا، بانٹنا، دامن چھڑانا، ۲۴۵، کسی سے برا ماننا، سر پہ خاک اڑانا، غزل کو در غزل کہنا، کسی کی گلی کی خاک چھاننا، ہونٹ کا چاٹنا، سر دھننا ۲۶۵، نہانا، سونگھنا، بلوانا، عشق سے بھرنا، کسی کے منہ پر چڑھنا، چشم پہ ہاتھ پھیرنا، پاؤں تھرانا، دل کا ملنا، ترسانا ۲۷۱، سر گرانا، ۲۸۱، گھوڑا کدانا، اینڈی بینڈی سنانا، جی کو کھپانا، گلے کو سان سے رگڑنا، درد ر پھرانا، دل کڑھنا، منڈانا، ۲۹۶ منہ کا کھلنا ۳۰۶، کسی سے پرچنا، کملانا، کسی سے توڑنا، تیوری چڑھانا، منہ بنانا، غل مچانا، ۳۲۱، دل کو کسی سے پرچانا، کسی بات سے جی چرانا، دبکنا ۳۲۸/۵، کسی کا خیال بندھنا، سسکنا، بچھڑنا۔

آنا: شانہ زلف میں در ۸، دل بھر، منہ تک جگر، غزل ۲۲، کسی بات کا حیف، غزل ۹۴، تجھے غضب آئے، دل بھرا ۵۶، چینی میں بال، بحال ۹۷، غزل ۸۶، گور کے منہ سے بھر، منہ پر بات نہ ۱۰۲، بن، دل گھبرا گھبرا ۱۳۱، کسی کے ہاتھ نہ ۱۴۴، بہار پر، دم کسی سے غرض پر، کسی امر ... ز ۱۶۲، کسی کو کسی بات پر درد، جی تنگ ۱۹۱، بیل میں ۲۰۲، ہر پھیر ۲۰۵، خدا یاد، آنکھیں بھر، کسی کا قدم ۲۲۹، ہاتھ میں ۲۶۸، پانچوں انگلیاں اکھڑ ۲۶۹، اور اسے پیش ۲۸۵، آپ میں نہ ۳۲۷، منہ میں پانی بھر بھر

اٹھانا: حادثہ ۱۰، دست شہادت ۱۷۹، فتنہ، کسی سے ہاتھ ۱۹۱، کسی کی منت کو ۲۵۱ اٹھنا: غزل ۶۵، فتنے ۷۰، کسی کو ارمان ۹۷، فغاں ۱۸۱، صدا ۳۲۱، غزل ۶۴۳ باندھنا: پٹی ۶۷، مسجد کی تاک ۹۲، کسی پر گھات ۳۱۴

جان کے درپے، جوانسنگار ۵۰، غزل ۸۹، مجھے معتاد، پرافتاد، اندھیرے ۹، جگر کباب ۱۰۵، اگرم، کسی کا نام
بلند ۱۲۲، دوچند، دل فسانوں پہ ۱۳۲، رازِ افشا، چمن کے بسمت ۱۴۹، مستانہ ۱۵۰، کسی کو ہوا موافق
نہیں، کسی کے منتظر، ہے شرط ۱۷۰، اپنے حال پہ نظر نہیں، عقل کا اثر نہیں، صاحبی ۱۹۰، چارہ چشم، نبیذ حرام
۲۰۴، خال تقریر سے باہر، ہیہ بھی کچھ مال ہے، کسی کا منہ کالا، سر پہ دھقاں، زرد پہ ناز، ان ۲۱۱، لوٹ ۲۱۳،
رام، کچھ اس میں حال نہیں ۲۲۱، احتیاج غسل، غم سے آب، غصہ غم سے کباب، ہم کلام، میرے درد کی دوا نہیں
۲۳۰، کسی بات پر بہم تکرار، کسی سے نسبت ۲۳۴، گوشت ناخن سے جدا ہونا ممکن نہیں، شہادت جلال
۲۴۴، یاد ۲۴۵، تیر باراں، روگرداں، نام ۲۵۲/۱، کسی سے صحبت برابر، زمین کا پیوند، مغروری، وسواس،
سبھوں کے لیے پار ۲۶۳، غزل ۲۷۰، رقیبوں کے تیئں ارزانی ۲۷۲، کسی کے ہاتھ گرد، رہنا، مسعود میں ہونا،
کسی ہتھے وصل تمام، ۲۷۹/۲، ۲۸۰/۱۵، کسی سے ہم زباں ۲۹۱، ہمارا قصہ مختصر ہو، شب کسی پر بھاری، قبضے پر تلوار
بھاری، کسی سے بالا ۳۰۰، غزل ۳۱۲ و ۳۱۳، ۳۲۷ فیصل — **تذکیر و تانیث**: الف کے تحت وہ الفاظ ہیں جو اس طرح
اشعار میں بندھے ہیں کہ ان کی تذکیر یا تانیث کے متعلق کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ ب کے تحت وہ الفاظ ہیں جو اس طرح نہیں بندھے:

ذ الف: جود، اثم، سکتہ، ارمان ۳۴، گذارہ، مزاج، گلی کوچہ ۱۴، تقاضا، مدادا، سد ۲۲، ٹھاٹ، حیف، توہم، قتال، گذر،
محشر، آل، آب خنجر ۳۸، بدھ، ہراز یاں، پریکھا، ملال، وبال، سخن، محل ۵۵، کتاں، آہ و فغاں، مسکن، کنار چمن ۵۹،
بن، لقب، ادب، افسر، دستور، انتقام، روزن، شقہ ۸۵، زہر ہلاہل ۱۰۱، چاہ ۱۱۶، آب اور آتش ۱۴۸، کیا
ہے عشق نے صنعت سے یک جا آب اور آتش" چشم ۱۹۹ و ۲۱۹، پیچ و تاب ۲۰۷، داد، خواب، پیچ و تاب، دلاسے،
سیلاب ۲۰۹، منکا، ذ ب: بڑھاپا ۱۳، لڑکوں کا گھروندا ۱۴، عرش ۲۰، غنچہ ۶۰، نیرنگ ۲۷، خبث ۶۶/۲، سیلاب؟
"، کشت ۲۱۷، طنز و طعن ۱۰۳، خلل، فخر ۱۱۹، استخواں ۱۲۲، کباب ۱۳۰، ماہ و سال، پایاں ۱۴۱، گھاس ۱۴۵،
لگن ۱۵۲، عیار ۱۵۰، دسترس، بھرم ۱۶۰، سلوک ۱۷۵، دیوار و در ۱۸۰، فغاں، اندھیرے ۱۸۵، جنگل، جان ۱۹۱/۲ و
۳۰۷، طعن ۲۰۰، ننگ ۲۰۴، جی کا کال، ڈھنڈورا ۲۱۵، تم، منہ کا اگال ۲۲۱، نباہ ۲۳۰، اضطراب، صندل،
۲۴۷، نام ۲۵۲، وسواس ۲۶۲، یاس، انگرہ ۲۶۵، فکر ۲۶۸، تردد، تعارف ۲۸۵، دید ۳۱۰، تابوت، سورہ ۳۲۲،

ث الف: راہ ۵۹، گزک ۶۱، نمود ۶۹، عرض ۷۶، توقع، چونٹیں ۱۰۵، اصطلاحیں لاتیں صاحب بیلاتیں ۲۱۷، بسیل۔
۲۲۴/۵، نمود ۲۴۴، باڑھ ۲۸۲، ملاقات ۲۹۰، خاطر ۳۰۲، آسیں، طبع، جاہ ۳۰۵، واہ، جان، آن، کمان، تان،
گرد ۳۲۱، افراط، تقلید۔

ث ب: وادی ۱۹۹، نرگس ۱۴، صوت ۲۹، صدمہ ۳۴، آب خورہ ۳۶، سجدہ گاہ، چوکھٹ، بلا ۴۸، سوز و تپش
۴۴، الٹی سمجھ، جائے باش ۵۶، دکان ۶۶، ناک باندھی ۹۲، جیب ۹۲ (زبان)، چوٹ، غول، سرگذشت، عابد،
سانٹ بانٹ ۱۱۲، چوکی، پھوٹ پھاٹ، دشنام ۱۲۰، گرد ۱۲۲، تاثیر ۱۲۷، چال ۱۳۰، چھینٹ، مثل ۱۴۰،
معاش ۱۹۸، وضع ۱۸۰، تاب جگر، آمد شد ۱۹۰، خلعت، طلب ۱۹۴، سیر، سانس ۱۹۶، تعدی، عینک

دیوانِ رضا عظیم آبادی

دیوان میر رضا عظیم آبادی

ایمن کی تھی نہ وادی نہ نخل طور تھا ۱ روشن ہمارے دل میں ترا جب نور تھا ۱

کچھ فائدہ نہ تھا اسے اظہار خلق سے منظور اس ہی پردے میں اپنا ظہور تھا ۲

یارب نہ کیجو ہم کو خجل روز حشر میں رحمت پہ تیری اپنے گنہ کا غرور تھا ۳

نزدیک سے جو دیکھا تو دل ہی تھی حق کا گھر کعبے کو دور جاننا اپنا قصور تھا ۴

لائق نہ کار دیں نہ دنیا کے کام کا اس دل کا پیدا کرنا بھلا کیا ضرور تھا ۵

شورش تھی اپنے اشکوں کی عالم میں جب تلک طوفان نوح کا تھا نہ جوشش تنور تھا ۶

دی دل سی چیز اس کو رضا اک نگاہ پر ——— اے بے شعور کچھ بھی بھلا یہ شعور تھا ۷

بہ جائے کعبہ جس کا در ہوا مسجود عالم کا ۲ محمد نام اس کا ہے محمود عالم کا ۱

جو کچھ چاہے ہو لے دل بے حجاب احمدی تو سخاوت اس کی کا ٹکڑا ہی سارا جود عالم کا ۲

حدیث احمد بے میم سن بے سایگی کو دیکھ روا ہے اس کے تئیں کہیے اگر معبود عالم کا ۳

رضا مقبول اگر آل نبی کا ہو تو کیا غم ہے ——— ہوا محروم عالم کا کہ یا مردود عالم کا ۴

دل اب ویراں ہے کیوں کاشانہ تیرا ۳ ہوا کیا ہائے صاحب خانہ تیرا ۱

بتا لے لالے میری طرح سے ہائے بھرا ہے خوں سے کیوں پیمانہ تیرا ۲

کہے ہے قیس بھی سودائی اس کو ہوا ہے جو کوئی دیوانہ تیرا ۳

نہ الجھا اپنی زلفوں کو صبا سے دل صد چاک ہوگا شانہ تیرا ۴

کبھی ہم سے ادھر آتے ہیں مجنوں رہے آباد یہ ویرانہ تیرا ۵

یہ ہی اپنے ہیں طالع ہیں کہاں سے یگانہ غیر ہے بیگانہ تیرا ۶

ترے نالوں سے ہم سائے تو مر گئے ——— رضا دشمن نہ ہو ہم خانہ تیرا ۷

آج مجلس ہی میں آنے سے ترے سکتہ نہ تھا ۴ کل چمن میں کون سا گل نہ ترا انکتا نہ تھا ۱

رات اس کی بزم میں جوں شمع مجھ کو رشک تھک جاتے تھے چلے اور پاؤں اٹھ سکتا نہ تھا ۲

غیر کے گھر جاتے ہو جو اب نہیں اٹھتے قدم میر کا اب حال ہیں آگے کبھی تھکتا نہ تھا ۳

۴ اپنے حرماں کا سبب ضبطِ نفس کا تھا خلل   ورنہ کس دریا میں یاں کے گوہرِ یکتا نہ تھا
۵ راتوں کو جانے کا اُس کوچے میں اب دیکھا مزہ — میں اسی دن کے لیے کیوں اے رضا یکتا نہ تھا
۱ سنتے ہیں رہرووں سے شاید وہی رضا تھا   ۵ بسمل سا تیری رہ میں اک نوجواں پڑا تھا
۲ کیا دیر کیا حرم ماتھا سب جگہ پہ ٹپکا   حاصل ہوا نہ ہم کو جو اپنا مدعا تھا
۳ اچھا ہوا نہ بے تاب ہو کر ہوا کہ ہم کو   اس خوں گرفتہ دل نے بے چین کر رکھا تھا
۴ مت بلبلا چمن تو کھلنے پہ گل کے اک وقت   داغوں سے دل بھی اپنا گلزار ہو رہا تھا
۵ کیا جور کیا جفا میں کیا ناز کیا ادا میں   دیکھا زیادہ اس سے جتنا تمھیں سنا تھا
۶ اب ہر کسی کی باتیں سنتا جو ہے رضا تو — کہنا بھلا ہمارا کہنا تو کیا برا تھا
۱ اپنے بیمار سے بتلا تو تجھے کیا کرنا   ۶ مرنے دینا اُسے یا اُس کا مداوا کرنا
۲ اشکِ گرم اس کو نہ کہہ آیا یہ ہے معجزِ عشق   آتش و آب کو اک کاسے میں یک جا کرنا
۳ رشک آئینے پہ آتا ہے کہ بے خوفِ رقیب   سینہ کھولے ہوئے منہ کو ترے دیکھا کرنا
۴ سچ کہو میر رضا کس پہ ہوئے ہو عاشق — بے سبب تو یہ نہیں ہر گھڑی رویا کرنا
۱ سینہ ہمارا غم سے کبھی خالی کم رہا   ۷ دردِ جگر گیا ہے تو دل کا الم رہا
۲ غم بھی ترا تو کوئی بلا نوش زور تھا   اس سے نہ دل میں خون نہ آنکھوں میں نم رہا
۳ رنگِ حنا ہے اتنا کہاں سرخ سچ بتا   کس بے گنہ کا خوں ترے ہاتھوں میں جم رہا
۴ چاہا تھا مل کے وصل میں روئیں گے خوب سا   سو اشک آ کے آنکھوں میں حیرت سے تھم رہا
۵ جنت میں پھر خوشی نہیں ممکن ہے اے رضا — دل میں اگر وہاں بھی یہی تیرے غم رہا
۱ کیا جانیے کس طرح کی لے کر خبر آیا   ۸ قاصد مرا کچھ آج ہے پھر چشم تر آیا
۲ زلفِ بتِ مغرور میں جب شانہ در آیا   رتبہ ہمیں تب چاکِ جگر کا نظر آیا
۳ لے لالے یہ سوزش تھی ہمارے ہی جگر سے   پر اُس بتِ بے رحم کے دل سے نہ بر آیا
۴ یادل جو بھرے دیکھے ظرف مے کدے کے کل   یاد آتے ہی اُس ساقی کی دل اپنا بھر آیا
۵ خنجر کو ترے دل سے میں اب کہاں تک   اس غم میں تو ظالم مرے منہ تک جگر آیا
۶ ہمسائے کی جاتی رہی نالوں سے ترے نیند — خاموش تو رہ اب بھی کہ وقتِ سحر آیا
۱ جب تک جیا میں عشق میں حیران ہی رہا   ۹ اپنے کیے سے آپ پشیمان ہی رہا

آیا نہ وقتِ نزع بھی بالیں پہ یار ہائے   ہم مر گئے پہ جی میں یہ ارمان ہی رہا   ۲
دیکھی تھی ایک رات تری زلف خواب میں   پھر جب تلک جیا میں پریشان ہی رہا   ۳
غیروں کے لگ گئے گلے جب چاہا جس گھڑی —— لیکن رضا سے وعدہ و پیمان ہی رہا   ۴

رہا گر یہی طور اُس بے وفا کا   ۱۰   نظر پھر نہیں آتا جینا رضا کا   ۱
یہاں شوق غالب ہاں رشک مانع   عجب حال ہے اس دل مبتلا کا   ۲
وفا پر دل اپنے کی روتا ہوں ظالم   گلہ کچھ نہیں مجھ کو تیری جفا کا   ۳
ہوا صفحہ خورشید کا مشق میرا   میں شاگرد جب سے ہوا ہوں ضیا کا   ۴
ٹک اک تو ہی کھول آہ اس دل کا غنچہ   نہ احسان ہو ہم پہ بادِ صبا کا   ۵
رضا چھوڑ سب خویش و بیگانہ کو تو —— ہوا آشنا ایسے سب آشنا کا   ۶

تماشا باغ کا جائے نہ اُس بن ہم کو صحرا کا   ۱۱   تری گردن پہ ہے غیرت یہ خون اپنی تمنا کا   ۱
گیا ڈھہ بے ستوں بھی اور جو بھی ہو چکا ویران   ہوا قضیا نہ آخر آہ پر شیریں و لیلیٰ کا   ۲
ہوئی تعمیر دل اپنی خراب اشکوں کے سیلوں سے   نہ تھا جوش تنور اور یہ ابلنا تھا نہ دریا کا   ۳
رفو پھر کیجیو پیراہنِ یوسف کو اے خیاط   سیا جائے تو سی پہلے تو چاک دل زلیخا کا   ۴
نہ اس کو ترس حق ہے نہ ترس تیرے پر تر سے —— رضا عاشق ہوا ظالم تو کس نا ترس ترسا کا   ۵

کس نے دل کا علاجِ داغ کیا   ۱۲   کیوں مرے گھر کو بے چراغ کیا   ۱
کم ملا جو تیری گلی میں گیا   ہم نے دل کا بہت سراغ کیا   ۲
جو ہیں گلشن میں گئے کہ غنچے نے   مسکرانے نے اور داغ کیا   ۳
گل کی مت کہہ رضا کہ اُس بن ہائے —— اس کی بو نے تو بے دماغ کیا   ۴

بھولے سے بھی... ادھر نہ آ پھرا   ۱۳   ہر چند اس کو میں نے کہا سر پھرا پھرا   ۱
تھک بیٹھ آیا اب تو بڑھاپا بھی اے رضا —— اے خانماں خراب بہت تو چلا پھرا   ۲

غیروں کا اس طرف سے گناہ نہ جائے گا   جب تک کہ ایک دو کہیں مارا نہ جائے گا   ۱
نرگس اُگے گی سبزے کی جا خاک سے مری   یاروں کا مرنے پر بھی نظارہ نہ جائے گا   ۲
یہ دل ہے لڑکوں کا نہ گھروندا سمجھ اسے   بگڑا تو پھر کسی سے سنوارا نہ جائے گا   ۳
گھر پر رقیب خانہ برانداز کے رضا —— ہوگا اگر تو یار ہمارا نہ جائے گا   ۴

۱ گر گریباں سیا تو کیا ناصح ۱۵ سینے کا چاک بن سیا ہی رہا
۲ سب عمل بے سری کہرا کے ـــــ جب تلک میں جیا جفا ہی رہا
۱ محبت سے جب تک سروکار تھا ۱۶ یہ جینا بھی ہم کو تو دشوار تھا
۲ رہا کے نہ ہو مرنے کا کیوں کے غم ـــــ خدا بخشے اُس کو عجب یار تھا
۱ کل مزاج اُس تندخو کا سخت بے رحمانہ تھا ۱۷ جو گلی کوچہ تھا اس بستی کا ماتم خانہ تھا
۱ جب تکیں گے جی سے یہ ماتم نجائے گا ۱۸ ہم جائیں گے پر آہ ترا غم نہ جائے گا
۲ جو باعثِ حیات تھے سو یار مر گئے اب دیکھنا ہے کس طرح یہ غم نہ جائے گا
۳ سو عید اگر زمانے میں لائے فلک ولیک گھر سے ہمارے ماہِ محرم نہ جائے گا
۴ دکھلائیں گے ہم ابر تجھے اشک باریاں خونِ جگر جو پلکوں پہ آ جم نہ جائے گا
۵ ہت ایسا حادثہ جو اٹھایا کرے گا چرخ ـــــ پھر کوئی جہان سے خوش و خرم نہ جائے گا
۱ دل کی بیتابیوں سے عشق چھپایا نہ گیا ۱۹ نام کس نے لیا تیرا کہ میں پایا نہ گیا
۲ حسرت لب تیری جس کے تئیں قتل کیا پھر مسیحا سے بھی وہ کشتہ جلایا نہ گیا
۳ رات کو خواب میں دیکھا جو اُسے کیا کہیے صبح تک جی سے پھر اک لحظہ بھلایا نہ گیا
۴ بعد یک عمر کے احوال جو پوچھا اس نے آگیا رونا ہمیں حال سنایا نہ گیا
۵ مر گیا سر کو پٹک کوہ کن آخر غم سے ـــــ عشق کیا سنگِ گراں تھا کہ اٹھایا نہ گیا
۱ اک نگاہ مست ایسی کی کہ دیوانہ کیا ۲۰ آئینہ خانے کو مجھ دل کے پری خانہ کیا
۲ جلوہ گر جس دم ہوئے ناز و نیاز عالم بیچ تجھ کو شمع بزم خوبی مجھ کو پروانہ کیا
۳ ہم سے کیا تقصیر ایسی ہوئی جو تم برہم ہوئے ـــــ سرمہ آنکھوں میں دیا یا زلف کو شانہ کیا
۱ جب ناز سے وہ کہتا ہے چل جا نہیں آتا ۲۱ اُس وقت مرے دل میں ہے کیا کیا نہیں آتا
۲ تو غور کئے جاتا ہے حیرت ہے یہ مجھ کو کتا جہاں رہتا ہے فرشتہ نہیں آتا
۳ کچھ آپ ہی تجھے وعدے کی شرم آئے وگرنہ ـــــ محجوب محبت کو تقاضا نہیں آتا
۱ اُس کے لب جاں بخش کے تئیں کیا نہیں آتا ۲۲ اک درد محبت کا مداوا نہیں آتا
۲ سو جان پہ بھی دیجے نہیں ایک نگہ کو لڑکا ہے ابھی تو تجھے سودا نہیں آتا
۳ اے دشمن عاشق ہے کوئی پوچھو تو جا کر کیا آتا ہے غیروں کو ہمیں کیا نہیں آتا

۴ سو غمزے کے رکھتا ہے نگہبان پس و پیش — آتا ہے اکیلا پر اکیلا نہیں آتا
۵ میں دیر ہو بتخانہ کا اے شیخ و لیکن — جو طور پرستش کا ہے یاں کا نہیں آتا
۶ تونے تو نکالا نہیں سچ کہنا رضا کو ـــــ کہتے ہیں سبھی اس کے تئیں آ نہیں آتا

۱ کون سد ہوئے میرے قاتل کا ۲۳ دیکھیے پھر کر تڑپنا بسمل کا
۲ راہ رووں سے ادھر نہ کوئی پھرا — کس سے پوچھیں نشان منزل کا
۳ لایا کیا کیا خرابی ہم پر ہائے — خانماں ہو خراب اس دل کا
۴ زلف تجھ سے نہ سلجھے گی شانے ـــــ ہے یہ عقدہ رضا کی مشکل کا

۱ کل یار سیر کرنے گلزار کو گیا تھا ۲۴ نظروں میں بلبلوں کی گل خار ہو گیا تھا
۲ وصل آیا ہائے تو بھی نکلے ہے نالہ گرم — کیا ہجر میرے دل میں انگارے بو گیا تھا
۳ اپنا بھی کوچے اک دن گریہ ستاں تھا اے ابر — روتا ہی رہ گیا تھا ایدھر جو گیا تھا
۴ اب شوق سے چلا دے پھر اس گلی میں مجھ کو — آکر جہاں میں اک بار دل اپنا کھو گیا تھا
۵ انگارے جائے باراں برسا کریں ہیں تب سے — میں دل جلا کسی دن دریا پہ رو گیا تھا
۶ پھر آج چشم تر ہے یارب تو صبر بھیجو ـــــ کل رو کے یہ رضا تو عالم ڈبو گیا تھا

۱ کیا کہوں حال دل کی حسرت کا ۲۵ خانہ ویراں ہو اس محبت کا
۲ گور میں بھی نہ دل کو آیا چین — میں ہوں دیوانہ اپنی وحشت کا
۳ دل دیا ایک نگہ پہ میر رضا ـــــ کچھ ٹھکانا ہے ایسی ہمت کا

۱ جگر کے ٹکڑے چن چن کر بھرے ہیں خوان آنکھوں کے ۲۶ کیا ہے دل نے اب یہ ٹھاٹھ کس کی میہمانی کا
۲ سینے غم سے اور دل سے نبھے گی کیونکے صحبت ہائے — کبھی دیکھا بھی ہے گا ساتھ رہتا آگ پانی کا
۳ اگر ہم سانس بھی لیں ہیں تو زہ زہ دل سے نکلے ہے — کچھ اب احوال مت پوچھو ہماری ناتوانی کا
۴ جواں مارا رضا کو تو نے جرم عشق پر ظالم ـــــ نہ آیا حیف تجھ کو حیف اس کی نوجوانی کا

۱ دل آزردہ نے بہا ہی مجھے حیراں کیا ۲۷ چشم خوں بار نے اک اور بھی طوفاں کیا
۲ عمر نوح اس کے تئیں بار خدایا دیجو — قطرۂ اشک کو جس نے مرے طوفاں کیا
۳ عاشقوں کی گئی غیرت ترے جینے سے رضا ـــــ اس ترے صبر نے ہم کو بھی پشیماں کیا

۱ اس بت عیار نے کچھ تو تو ہم کیا ۲۸ روتے جو دیکھا مجھے آج تبسم کیا

۲ تیرے تظلم کو دوست .... دشمنوں نے دیکھ کر جس کو مستم کیا

۳ کھوج میں اُس کا شوخ گھر پایا ہو اس طرح — اپنے تئیں لے رضا تو نے مگر گم کیا

۱ نہ ہم نے سرو نہ شمشاد کا خیال کیا ۲۹ کسی نے قد کو دکھا کر ہمیں نہال کیا

۲ نہ دیکھی خواب میں پھر ہنستے خواب کی صورت میں ایک دن تری صورت کا جو خیال کیا

۳ نظر اٹھا کے جدھر دیکھی کربلا ہے جہاں الٰہی کس کے یہ غمزے نے ہو قتال کیا

۴ قفس سے صوت گئی کس نالے کی اُس تک زبانِ مرغِ چمن کو یہ کس نے لال کیا

۵ ہزار حیف ہے اے آہ بے اثر تجھ سے نہ پہنچی اُس تلک اور مجھ کو خستہ حال کیا

۶ زباں جو بزم میں کاٹیں ہیں شمع کی ہر شب خدا ہی جانے پتنگے سے کیا سوال کیا

۷ کٹے گی کیوں کے رضا کی الٰہی شب — دن ہی کو اُن نے تو روز روز خراب حال کیا

۱ تم نے آباد کسی کا گھر نہ کیا ۳۰ اس طرح پر کبھی گذر نہ کیا

۲ یار کی کچھ نہ دی خبر ہرگز جب تلک ہم کو بے خبر نہ کیا

۳ میرے نالوں سے عرش لرز گیا پر ترے دل میں کچھ اثر نہ کیا

۴ مار ڈالا رضا کو ناحق ہائے — کچھ بھی ظالم خدا کا ڈر نہ کیا

۱ ہرچند حال دل کا میں کہہ کہہ کے تھک گیا ۳۱ اُن نے نہ پوچھا کون تھا اور کیا یہ بک گیا

۲ آخر وفا نے کس پہ نہ بالکل ہی سکے آب آہوں سے دل جگر تو ہمارا دہک گیا

۳ تھا لگ رہا رقیب ترے در پہ مجھے دیکھا جو آتے پھر دبے پاؤں کھسک گیا

۴ اک بار لے رضا کہیں دل بھر کے رو لیجئے — مردم کے تیرے رونے سے جی اب تلک گیا

۱ جس کو جانا دوست سو دشمن ہی آخر ہو گیا ۳۲ دل مرا آشنائی سے مکدر ہو گیا

۲ ہجر کا پیغام یا تھی یا اس کی کچھ بات ہے سنتے ہی قاصد جسے دل میرا مضطر ہو گیا

۳ جس کو تو نے بھر نظر دیکھا قیامت اُس پہ ہوئی بات جس سے تو نے کی اُس پر تو محشر ہو گیا

۴ دشت میں لیلیٰ کے پیارے عشق تو اک بات تھی عہد میں اب آ کے تیرے ایک دفتر ہو گیا

۵ میں نے کل پوچھا رضا سے سوز کا دل کے بیاں — شمع ساں اک آہ کی اور وہیں آخر ہو گیا

۱ فلک گر ہم کو تو رسوا کرے گا ۳۳ بھلا ہم ہو چکے پھر کیا کرے گا

۲ منائے گا کوئی تجھ کو کہاں تک اگر ایسا ہی تو روٹھا کرے گا

رضا ہے بے قرار ایسا دن ہی سے —— خدا جانے کہ شب کو کیا کرے گا ۳

ہمیں قاصد خبر اُس کی کرے گا ۳۴ گر اپنے حال کی کچھ سُدھ رکھے گا ۱

ملیں گے داغ ہی اس سینے کو یارب کسی چھاتی سیتی بھی یا لگے گا ۲

نیاز و ناز کب دیویں گے فرصت کہوں گا حال میں اور تو سنے گا ۳

دوانوں کا ترے جب حشر ہوگا قیامت شور محشر میں پڑے گا ۴

نہ کر ہمدم رضا کے قتل کا ذکر —— تری ان باتوں سے لوہو بہے گا ۵

حال جس نے مرا سُنا ہوگا ۳۵ اُن نے سنتے ہی رو دیا ہوگا ۱

یارب رحم مجھ میں صبر نہیں یارب اس کا مآل کیا ہوگا ۲

میں نے جو کچھ سنا ہے تیری کبھی تو نے بھی یہہ کہیں سنا ہوگا ۳

اُس کی مجلس میں کل چلا یہہ ذکر ق کوئی ایسا نہ مبتلا ہوگا ۴

اس طرح کل اُسے میں دیکھا تھا کہ وہ اب تک تو مر گیا ہوگا ۵

وہیں آنکھیں دکھا کے کہنے لگا اس کے مرنے سے میرا کیا ہوگا ۶

یہہ سنا ہوگا جب رضا نے ہائے —— اُس کے کیا دل پر آ گیا ہوگا ۷

بھرے اس بے خبر دنیا میں کوئی کیا اپنا پیمانہ ۳۶ حباب آسا کھلی جب آنکھ یاں تب ہی مر جانا ۱

عجب یہہ آب خورہ ہم کو ملی ہے تیری فرقت میں کہے خونِ جگر کھانا کہے آنسو کا پی جانا ۲

بھلے ہیں ہم تو اے ساقی تری اس چشم مے گوں سے بلا سے پھوٹ جائے شیشہ اور گر جائے پیمانہ ۳

عجب کچھ نام نکلا ہے ترے کوچے میں اپنا بھی کوئی کہتا ہے سودائی کوئی کہتا ہے دیوانہ ۴

رضا ہے سجدہ گاہ اپنی کسی کی اب تو چوکھٹ ہی —— خدا جانے حرم کیا ہے کسے کہتے ہیں بت خانہ ۵

یہ کیا سچ ہے اس کو پیار سے بتاتا ۳۷ ادھر وعدہ کرنا اُدھر بھول جانا ۱

مرے ابر ایسے پھرے تیری گلی میں گیا تو بھی اپنا نہ یہہ آنا جانا ۲

یہ رحم و ستم اکٹھا سیکھے ہو کس سے ادھر گھورنا اور اُدھر مسکرانا ۳

گئی نیند سوتوں کی خواب عدم کے —— رضا کیا قیامت ہے تیرا فسانہ ۴

نہیں معلوم صدمہ کس کے غم کا رات اس پر تھا ۳۸ سحر دیکھا رضا کو تو نہایت ہی وہ مضطر تھا ۱

پلا آب حیات اے خضر اپنا اور کو ہی تو پیا ہم نے جو کچھ قسمت میں اپنی آب خنجر تھا ۲

۳ عجب راحت سے گزری رات اپنی اور اُس کی کل   وہاں تھا زیر سر زانوے غیر یہاں کا پتھر تھا

۴ شب ہجراں تو کچھ دونی بلا ار ہی نظر آئی   جدائی کا تھے ہم جانتے تھے دن ہی بدتر تھا

۵ عبث کرتا ہو ننگ اے غم دل بریاں ہم سے   کیا حاضر تری خاطر نہیں جو کچھ میسر تھا

۶ اجل نے آہ سبقت کی ترے آنے کی آگی ہے   تو جب تک پہنچے پہنچے یاں کرا اپنا کام آخر تھا

۷ طبیب اپنا نپٹ نو مشق کیا جانے کیا سمجھے   اگر کبھی . . . . ہمارا حال ابتر تھا

۸ رضا پر کیسی کیسی آفتیں تھیں رات تجھ بن ہائے —— شب ہجراں تھی تیری یا کہ ظالم روز محشر تھا

۱ بوسہ ہی لینے پہ ظالم نے نہ جمدھر کھینچا   ۳۹ یاں بھی ہم نے چھوا اُن نے تو خنجر کھینچا

۲ بے طلب غیر کے آجاتا تھا واعظ افسوس   جذبۂ عشق نہ تو نے اُسے ادھر کھینچا

۳ دیکھیے حضرت دل کس پہ کرم کرتے ہیں   عشق نے کھینچا ادھر عقل نے ادھر کھینچا

۴ یہ بجلی جگر کے ٹکڑا ہے خواب   لخت دل جیتوں نے اشکوں کی جگہ پر کھینچا

۵ ابروے یار کا یاں تک تھا رضا محو خیال —— غیر کی تیغ سے بھی اُن نے نہیں سر کھینچا

۱ ذکر ہر ایک آن ہے تیرا   ۴۰ ہر گھڑی دل میں دھیان ہے تیرا

۲ توڑتا آئینے کو رشک سے لیک   یار منہ درمیان ہے تیرا

۳ دل کو شانے کے ہاتھ سے کھینچا   زلف یہہ میہمان ہے تیرا

۴ ہم نہ کہتے تھے مت مل اُس سے رضا   ق اس میں ظالم زیان ہے تیرا

۵ دیکھ تو اب بھلا زمانے میں —— کچھ بھی نام و نشان ہے تیرا

۱ جب سے ہیں گل رخاں کا یار ہوا   ۴۱ سب کی نظروں میں خوار و زار ہوا

۲ تھی خبر کیسی قاصدا جس سے   اور بھی دل یہ بے قرار ہوا

۳ اختیار ہی کو ہم کریں گے دور   ہم کو گر کچھ بھی اختیار ہوا

۴ کس کا تیر نگاہ یہہ چھوٹا   لگتے ہی دل کے وار پار ہوا

۵ کہتے تھے تجھ کو مت مل اُس سے رضا —— اپنے ہاتھوں تو آپ خوار ہوا

۱ جس بلاکش سے یار آ نہ ملا   ۴۲ اُس کو جینے کا کچھ مزہ نہ ملا

۲ داغ دل پر جگر پہ زخم اے عشق   تیری دولت سے ہم کو کیا نہ ملا

۳ ہاے جز افشاں داغ کے ہم سے —— گرم ہو کوئی اے رضا نہ ملا

یار کے رخ نے کبھی اتنا نہ حیراں کیا ۴۳ فکر سر زلف نے جیسا پریشاں کیا ۱

ایسا کسی سے جنوں دست گریباں نہ ہو — چاک گریباں کا بھی چاک گریباں کیا ۲

کر چکا تھا زہر رشک پرزے میں کار اپنا یک — تیغ جدائی نے زور کار نمایاں کیا ۳

عشق ترے ہاتھ سے تو ہی بتا کیا کریں — وصل میں حیراں کیا ہجر میں گریاں کیا ۴

عیش و غم باغ دہر دم ہے ٹک گل کو دیکھ — چاک کیا تو کبھی میں کہوں خنداں کیا ۵

اُس کا چراغ مراد رہیو فروزاں مدام — داغوں سے دل کو مرے جس نے چراغاں کیا ۶

عشق کی کیا تربیت تجھ سے کہوں اے رضا — آہ کو نالہ کیا نالے کو افغاں کیا ۷

دی غم نے آگ دل کو کہ یا رب جگر جلا ۴۴ ان دو گھروں میں کون سا یہ آہ گھر جلا ۱

غم دل سمجھ کے تو نے بھلا اس کو آگ دی — خانہ خراب دیکھ تو کس کا یہ گھر جلا ۲

سوز و تپش رضا کی نہ کچھ پوچھ مجھ سے آہ — جوں شمع غم کی آگ میں وہ سر بہ سر جلا ۳

آئینہ ہم ہوئے تو وہ مکھ چھپا چلا ۴۵ گر خاک راہ کی ہوئے دامن اٹھا چلا ۱

کس نے کہا تھا اس کو کہ تو مریو نامراد — ناشاد ہی زمانے سے آخر رضا چلا ۲

نہ کہہ یہ کہ گھر یار کل جائے گا ۴۶ مرا آج ہی جی نکل جائے گا ۱

کروں کیوں کے دل خوش فقط یاد سے — یہ لڑکا نہیں جو بہل جائے گا ۲

نہ فانوس سے گرمی کرا تنی شمع — پتنگے کا جی غم سے جل جائے گا ۳

رضا نوجواں ہے نہ سمجھا اسے — یہ آخر کو آپ ہی سنبھل جائے گا ۴

رضا کا یار سے ہونا جدا ہی ہم کو اچھا تھا ۴۷ کبھی درد اپنا کہنے کو ہمارے یاں آتا تھا ۱

کٹے یہ دس دن اپنی زندگی کے روتے ہی بیتے — کبھی ہم نے جو اس کو خواب میں اک رات دیکھا تھا ۲

لبوں نے اُس کے مارا ہم کو یہ بھی خوبی قسمت — ہمارا ہو گیا قاتل جو عالم کا مسیحا تھا ۳

کہوں ہمدم خرابی رات کی کیا جوں گل و شبنم — میں رو رو حال دل کہتا تھا وہ سن سن کے ہنستا تھا ۴

سزا اس کی یہی ہے اب گریباں اپنا پھاڑا کر — رضا دامن کو اس کے ہاتھ کیوں تو نے لگایا تھا ۵

دنیا کا جب کہ خوب بہ دیکھا کہا سنا ۴۸ جوں کوہ ایک ہی نظر آیا کہا سنا ۱

ہنس کر چمن کے تخت پہ کر بیٹھا جیب چاک — باد صبا کا غنچے نے یہ کیا کہا سنا ۲

کیا یہ نہیں سنا ہے کہ ہم بھی ہیں یاں کچھ — غیر از ستم نہ دل کے جو کچھ تھا کہا سنا ۳

۴ رخصت تمہونسے دوستو لاچار ہوتے ہیں — سب کیجیو معاف ہمارا کہا سُنا
۵ اک دم کے واسطے نہ کیا کیا کیے رضا — دیکھا، چھپایا، توڑا، بنایا، کہا، سنا

۱ جو ترے در پہ میری جاں آیا ۴۹ مر گیا کہتا میں کہاں آیا
۲ دیکھیں اب کس کا پردہ اٹھے گا — حرف شکوہ سرِ زباں آیا
۳ مت اٹھا اس کو سوجہت ہائے — در پہ تیرے یہ ناتواں آیا
۴ تیرے ہاتھوں سے بے قراریِ دل — جی ہمارا بھی اب بہ جاں آیا
۵ تو تو ایک ہی طرف یاں سے گیا — غم ہزاروں طرف سے یاں آیا
۶ مر ہی جانا بھلا ہے میر رضا — یار اب بہر امتحاں آیا

۱ کچھ غم میں نہ پوچھ حال دل کا ۵۰ مر گئے نہ گیا ملال دل کا
۲ میں خواب میں آہ تجھ کو دیکھوں — ہے یہ ہی مرے خیال دل کا
۳ کچھ ہم سے نہ پوچھ پھول پھل کی — اگتے ہی جلا نہال دل کا
۴ حسرت نہ شادی اس کی تجھ پر — ... کے پڑے وبال دل کا
۵ ویراں ہے رضا کا سینہ کیوں آج — شاید ہوا انتقال دل کا

۱ آنکھوں سے بجائے اشک گرا خون جلا ہوا ۵۱ پان و مسی کا کس کی یہ دل مبتلا ہوا
۲ سنبل سے بھاگتا ہوں میں وہ زلف بوجھ کر — رسّی سے ڈرتا سانپ کا ہے گا کٹا ہوا
۳ ہم نے سوا وفا کے سنایا نہ کچھ تجھے — کس کے کہے سے کہہ تو یہ تو بے وفا ہوا
۴ دیکھا رضا کو میں نے عجب طرح ایک دن ق سر ننگے پا برہنہ، گریباں پھٹا ہوا
۵ یہ سنتے اُس نے ایسا پڑھا مطلع اُس گھڑی — مضمون جس کا خون میں تھا لوٹتا ہوا
۶ عاشق ہوا خراب ہوا مبتلا ہوا — اب اور کیا کہوں میں پوچھو کہ کیا ہوا

۱ محبت اس وفا بیگانہ کی اب سے کر دل میں ۵۲ اٹھاتا کیوں ہے تو مجھ کو یاں سے اے آشنا سمجھا
۲ ابھی تو تھا خوش و خرم ہوا آزردہ کیوں ظالم — میں رویا اپنی قسمت پہ بتا تو تو نے کیا سمجھا
۳ بری رویوں کی بھی جوں یوانی ہی نہ دیکھی — وفا جس نے سکھائی ان کو ہے وہ جفا سمجھا
۴ ہوئی ساری خدائی دشمن اس کی پر نہ باز آیا — خدا جانے بتوں کی دوستی میں کیا رضا سمجھا

۱ جفائے عشق کا جب بزم میں بیاں ہوا ۵۳ رضا کی سن کے خرابی ہمیں بھی کان ہوا

جب اُس کی بزم میں ہم سوزِ دل لگے کہنے — سوائے شمع کے کوئی نہ ہم زباں ہوا — ۲
جہاں میں مثلِ مہ و مہر در بہ در ہی رہا — فلک کے خوان پہ جو آ کے میہمان رہا — ۳
خدا کے واسطے تو چھوڑ اپنے جینے کی — ہنسیں گے سب کوئی ظالم کہ نوجوان ہوا — ۴
رضا کے مرنے کا احوال و نزع کی حالت — سُنا جو اُس نے تو ہم سے بھی بدگمان ہوا — ۵
سخت جانی نے مجھ کو خوار کیا ۵۴ یار کے مُنہ سے شرمسار کیا — ۱
ہمنشیں نام کیوں لیا اُس کا — کیوں مرے دل کو بے قرار کیا — ۲
ہم کو روزِ شمار یاد آیا — جب ستم کو ترے شمار کیا — ۳
دے کبھی ایک بوسۂ شیریں — سخنِ تلخ بس گوارا کیا — ۴
ہم کو کس مُنہ سے مُنہ دکھائے گا ۵۵ آئینہ جس نے تجھ کو دکھلایا — ۱
سامنے بلبلوں کے توڑے گل — ٹوٹیو ہاتھ باغباں تیرا — ۲
جی گیا غم میں تیرے اے بے رحم — پر مرے جی سے تیرا غم نہ گیا — ۳
ذکر اس کا کہیں ہوا شاید — یک بہ یک دل مرا تڑپ اُٹھا — ۴
جائے رقت ہے حالتِ مجنوں — گر پڑا جب جو محمل آگے چلا — ۵
ہوتی ہے اب زباں ہماری بند — بیٹھ جا حال دل کا سنتا جا — ۶
خنجرِ یار ہے مگر تشنہ — پھر لہو اپنا جوش کرنے لگا — ۷
تا مجھے انتظار میں مارے — حشر کو وعدۂ وصال ملا — ۸
بے وفا میرا یار کس کا ہے — بوالہوس اُس کی بات پر مت جا — ۹
آج کچھ سخت بے قرار ہوں میں — سچ کہو کس سے کیا قرار کیا — ۱۰
آہ کیا جانے کیوں ہے تو دشمن — دوست سارا جہاں ہے اپنا — ۱۱
کس کا کوچہ ہے یہ کہ اپنا قدم — نقشِ پا کی طرح نہیں اٹھتا — ۱۲
اے ترحم تجھے غضب آئے — قتل سے میرے اُس کو باز رکھا — ۱۳
خاکِ رہ اُس کی ہو گیا یہ تن — خوب ہوا کیا کفن کے کام آیا — ۱۴
سب سنی ہم نے کل جو کچھ گزری — عشق پھر کیجیے گا میر رضا — ۱۵
جوں شمع تا کہ سب تن صرفِ زباں نہ ہوگا ۵۶ یک حرفِ بزمِ جاناں ہم سے بیاں نہ ہوگا — ۱

۲ دیتا تو ہوں تسلی میں اُس کو دیکھ دل کو | میرے رفو ولیکن ہرگز کتاں نہ ہوگا

۳ جنت کے حور و غلماں زاہد کے تئیں مبارک | ہم کیا کریں گے جا کر واں تو جہاں نہ ہوگا

۴ نو مشق عشق ہیں ہم آہیں کریں عجب کیا | گیلی جلے گی لکڑی کیوں کر دھواں نہ ہوگا

۵ گہہ زلف گاہ خط ہے اب جا کے باش اس کی | ویسا ہی مرغ کوئی خوش آشیاں نہ ہوگا

۵ تم داغ دل میں جب کے دیتے تو ہو ولیکن | یہہ آفتاب روشن ہم سے نہاں نہ ہوگا

۶ ہم نے تو کھائی سوگند آنے کی اپنے گھر کے | — جب تک رضا کا موقوف آہ و فغاں ہوگا

۱ گرد اُس شوخ سے اے غمگسار و ذکر غمگیں کا | ۵۷ دل بے تاب شاید آشنا ہو اس سے تسکیں کا

۲ مرے داغِ جگر کو دیکھ کے فرہاد کہتا ہے | تماشا ہے جو اس تمکیں سے بیٹھے نقش شیریں کا

۳ نہ سمجھا سا تھا اس کے استخواں کا مغز بہتا ہے | میں خوش تھا یہہ کہ بارے رنگ بدلا اشک خونیں کا

۴ مقابل تیرے قامت کے قیامت بھی نہیں ہوتی | ارادہ کر ہیں اس مصرع موزوں کی تضمیں کا

۵ ضیا جب تک فروغِ شمعِ بزم نکتہ دانی ہے | — رضا مشتاق ہو ہرگز نہیں تیری بھی تحسیں کا

۱ تو ہی دشمن مرا کچھ اے بتِ پُرفن نہ رہا | ۵۸ جو ترا دوست ہوا کب مرا دشمن نہ رہا

۲ خواریِ عشق نے ایسا مجھے بے قدر کیا | دوست کا ذکر تو کیا کوئی بھی دشمن نہ رہا

۳ خاک رہ اس کا ہوا تن بدن اپنا سو شکر | فکرِ تکفین سے چھوٹے غم مدفن نہ رہا

ہے قصور اپنی لیاقت کا وگرنہ محروم | فیض خورشید سے اک دیدۂ روزن نہ رہا

۴ وحشت پیا ہے جنوں ایسے بیاباں کا ہوں | جہاں رہزن خطر جان سے ایمن نہ رہا

۵ رونا آدم کے تئیں ناخوشی دوست کا تھا | یہہ نہ تھا ڈر اُسے فردوس میں مسکن نہ رہا

۶ جس طرح ہم رہے دنیا میں رہیں اس طرح رضا | — شیخ بت خانے میں کعبے میں برہمن نہ رہا

۱ روز ازل ہر ایک نے ایک ایک فن لیا | ۵۹ دل نے ہمارے نالۂ آتش فگن لیا

۲ پھرتے نہیں ہیں طوف سے کوے بتاں کے شیخ | بدلے ردا کے دوش پہ ہم نے کفن لیا

۳ جلدی چراغ لوں نہیں جلتا چراغ سے | جوں دل کے داغ تازہ نے داغ کہن جلا

۴ دیکھا جو عقل سے نہیں بنتی ہے عشق میں | مجنوں غریب کیا کرے دیوانہ پن لیا

۵ یاں تک کنارۂ بزم سے خوگر ہوئے کہ ہم | گلشن میں بھی گئے تو کنارِ چمن لیا

۶ خانہ خراب رہنا تقاضائے عشق ہے | فرہاد نے پہاڑ نہ مجنوں نے بن لیا

کی اُس نے راہ عشق کی طے جبکہ اے رضا — رہ بر کو چھوڑ نفس سے راہ زن لیا ۷

یار کو بے باکی میں اپنا سا ہم نے کر لیا ۶۰ یعنی اُس نے ٹھٹھہ کر دل میں سر ہمارا دھر لیا ۱

عشق رسوا نے دی اوڑھنی حجاب حسن کو — جو اٹھا پردہ یہاں سو اُس نے دامن پر لیا ۲

اس کو مے خواری نہیں کہتے ہیں غم خواری ہے یہ — جگر و دل سے لی گزک اور غیر سے ساغر لیا ۳

نام کو دل میں جگہ چھوڑی نہ داغ عشق نے — ایک مہماں ایسا آیا جس نے سارا گھر لیا ۴

ذوق دیکھو مجھ سے صیدِ ناتواں کے واسطے — تیغ لی اک ہاتھ میں اک ہاتھ میں خنجر لیا ۵

میں ستارہ سوختہ وہ ہوں کہ جس کا زائچہ — اُس گھڑی کھینچا گیا جب داغ کا اختر لیا ۶

چشم و دل رکھو ہو یارو جاؤ ٹک بوجھو اُسے — مجھ سے کیا کہتے ہو اُس نے دل ترا کیوں کر لیا ۷

اے رضا راہ میں خضر کی مت راہ دیکھ — گھر کعبے جانے میں کسی نے بھی بھلا رہبر لیا ۸

شب اپنے دل میں اس کا جلوہ شرر فشاں تھا ۶۱ اے شمع تو کہاں تھی پروانہ تو کہاں تھا ۱

یعقوب کیوں خفا ہے بے جرم ہے زلیخا — یوسف کو جو کہ لایا کنعاں کا کارواں تھا ۲

تم چپ تو بیٹھے گھر میں دیکھو گے راز اپنا — اب اتنا ہی عیاں ہے وہ جس قدر نہاں تھا ۳

لوہو خدا کا پیتا کل رات رشک سے میں — تیر اندام پیارے کیا کیجے درمیاں تھا ۴

اُس سرو قد کے آگے حیرت سے ہیں چمن میں — باوصف سو زباں کے جوں غنچہ بے زباں تھا ۵

صیاد اے قفس میں اتنا بھی خوار مت رکھ — کل شاخ گل چمن میں بلبل کا آشیاں تھا ۶

اور حسرتیں رضا کی معلوم نہیں پر اتنا — ہم جانتے ہیں جب وہ مرتا ہے نوجواں تھا ۷

پڑا ہے درد و غم سے بس کہ پیارے کام اپنا ۶۲ ہوا ہے تیرے یاروں میں لہو درد القب اپنا ۱

یہ کس کا راز ہے ٹکڑے ہوئے پروا نہیں کرتا — بہ رنگ غنچہ بہ ہر گز زخم لب اپنا ۲

نہ کرتا ہی نظر تو اور نہ آنکھیں ہی سمجھتی ہیں — بتا دے کیا کہوں پوچھ جو رونے کا سبب اپنا ۳

نظر کر جام و مینا پر کہ کیوں کر منہ ملاتے ہیں — بھڑا دے تو بھی تو لب سے مرے یک بار لب اپنا ۴

مرا لے نام پہلے جام کو مے خوار پیتے ہیں — رضا شکر خدا ہے مے کدے میں یہ ادب اپنا ۵

خاموشی سے یہاں تک ہے کار و بار اپنا ۶۳ ہوئے گا سنگ سرمہ سنگ مزار اپنا ۱

کعبے میں شیخ مجھ کو سمجھے ذلیل لیکن — سو لنگر مے کدے میں ہے اعتبار اپنا ۲

شب مہتاب میں جو بادۂ گل فام دیکھو گا ۶۴ لُٹے محشر کے دن ساقی کوثر جام دیوے گا ۱

۲ وہ دن کیا ہو گئے اور ہاے وہ باتیں کدھر — دعا کرتے تھے ہم کس روز تو دشنام دیوے گا
۳ نپٹ گھبرا کے اب مرتے تو ہیں لے تا بوسے ہم — ولیکن خوف یہ جی میں نہ دل آرام دیوے گا
۴ بھلا دینی یہ دل کی بات صورت اس کی اے قاصد — ادھر سب دیکھتا تو جو مرا پیغام دیوے گا
۵ موے فرہاد اور مجنوں تو آغاز محبت میں — رضا اب دیکھنا ہے اس کا تو انجام دیوے گا

۶۵
۱ حرف بہ گویاں سو فتنہ کیا کہوں کیا کیا اٹھا — حسن نے پردہ کیا اور عشق کا پردہ اٹھا
۲ آتش غم نے نہ پوچھو کیا کیا دل سے سلوک — آہ سے نکلا دھواں اور نالے سے شعلہ اٹھا
۳ شمع جس گرمی سے جی چاہے تو مل فانوس سے — بزم سے اب تیری ظالم دل پتنگے کا اٹھا
۴ دل بھر آتا ہے خالی دیکھ اس ساقی سے بزم — ہم نشیں آگے سے میرے جام اور مینا اٹھا
۵ رات تنہا کس کا چہرہ خواب میں دیکھا رضا — نیند سے جو تڑکا یک صبح کو روتا اٹھا

۶۶
۱ میں نہیں اس فکر میں یار جدا ہو گیا — سوچ ہے کل کیا تھا اور آج یہ کیا ہو گیا
۲ دوست پامال جو میرے تئیں یوں کیا — کون سے دشمن کا ہاے مجھ پہ کہا ہو گیا
۳ کیوں کے میں رو رو مناؤں اس کے تئیں کیا کروں — ہنستے ہی ہنستے وہ ہاے مجھ سے خفا ہو گیا
۴ کہنا پھر اب اے رضا میں نہیں عاشق کہیں — لیتے ہی نام اس کا رنگ تیرا ہوا ہو گیا

۶۷
۱ مت نکال اپنی گلی سے کیا رضا گھر جائے گا — رہنے دے اس ناتواں کو راہ ہی میں مر جائے گا
۲ رکھنے کے ہرگز نہیں عاشق صراط اوپر قدم — ہم تو لو دھر جائیں گے وہ شوخ جیدھر جائے گا
۳ وصل تو تریاق ہے ہر چند ہے تیرا زیاد — زہر ہجراں لیکن اپنا بھی اثر کر جائے گا
۴ قتل تو کرتا ہے مجھ کو دامن اپنا باندھ لے — خون عاشق جوش کرتا ہے کہیں بھر جائے گا
۵ اپنی آنکھیں بند کر کیا باندھے ہے پٹی مجھے — طفل ہے تو دیکھ کر بسمل مجھے ڈر جائے گا
۶ حیف اہل حق کے جانے پر آتا ہے رضا — یہہ بھی جو آتا ہے اک دن مقرر جائے گا

۶۸
۱ سنگ جفا سے شیشۂ دل چور کر دیا — دکھلا کے آنکھ آنکھوں کو ناسور کر دیا
۲ بسمل ہوئے قاتل کے پاؤں پر — ایسا ہی پاس عشق نے مجبور کر دیا
۳ نقش اپنا اس کے دل سے مٹا دیجے تو سہی — یوں پاس سے رضا کے تو بے ودور کر دیا

۶۹
۱ جانتے تھے ہم بھی مرنا ہجر میں بہتر نہ تھا — پر کریں کیا حال اپنا کچھ اسے باور نہ تھا
۲ بے جواب آتا ہے شاید نامہ بر اے ہم نشیں — کیا ہوا دل کو مرے اتنا کبھی مضطر نہ تھا

شاید اگلے سال میراث چمن ہو عندلیب　　خوب گل آئے تھے تر ہی ایسا کوئی پر نہ تھا　۳

رہ گیا کیا تھک کے صحرا میں کوئی بے خانماں　　جوش میں اتنا کبھی ابر بہاراں پر نہ تھا　۴

دل مرا یوسف کو مٹے پھر دیکھ وہ کرتا ہے کیا　　جب کہے گا تو گماں اس کا تبھی کا اس پر نہ تھا　۵

غیر گر ہے آشنا ہم بھی تو بیگانہ نہیں　　اس کی آنکھوں میں بسے یہ دل تمہارا گھر نہ تھا　۶

عشق نے ہر ایک سے اک ضرب کی ہے نمود　　کوہکن کے سر پہ تیشہ تھا اگر افسر نہ تھا　۷

ایک پر صیاد نے چھوڑا نہ اس نخچیر کا　　بھر دیا بالیں میں لائق تیر کے جو پر نہ تھا　۸

کل وہاں گل سر پہ تھا یاں سر پہ تھا داغ جنوں　　کب ہمارا عشق تیرے حسن کے ہمسر نہ تھا　۹

اے رضا کیا خشکیِ طالع کہوں اک عمر تک ـــ جوں گہر دریا میں تھا تو بھی لب اپنا تر نہ تھا　۱۰

دیکھنے میں تو قضا نے عشق ہی تنہا دیا　۷۰　پر غم و رنج و الم جو تھا سبھی اک جا دیا　۱

اس کا کچھ انجام بھی سمجھا کہ تو نے اے فلک　　حسن روز افزوں وہاں یاں عشق شور افزا دیا　۲

درد و غم جو سو لگی اس قدر پروا نہیں　　دل کے تئیں پر ہجوم یاس نے گھبرا دیا　۳

اس قدر نومید رکھنا غم زدوں کا خوب نہیں　　وصل کا مژدہ نہیں تو قتل کا وعدہ دیا　۴

دور کھینچ اے پرتو خورشید اپنے تئیں کہ اب　　اس کے سائے کا فلک نے تجھ کو ہمسایہ دیا　۵

شوق سے دل کھول کر اب جور اور بیداد کر　　سب تری چشم سخن گو نے ہمیں سمجھا دیا　۶

ناز کم کر بے دلوں پر قدر نعمت کی سمجھ　　شکر کر تجھ کو خدا نے یہ رخ زیبا دیا　۷

میں نے پوچھا اس قدر فتنے کہاں سو اٹھتے ہیں　　اس کے چہرے سے قضا نے برقع کو سرکا دیا　۸

دین و دل تاب و توان و صبر کا کچھ غم نہیں　ق　چشم و ابرو زلف و خال و خط نے جو مانگا دیا　۹

پر یہ ہے افسوس ایسا دیکھ اسے گھبرا گئے ـــ یہ نہیں اب یاد آتا ہے کہ کس کو کیا دیا　۱۰

سادہ رویوں سے رضا ملتا نہ تھا یہ کیا ہوا ـــ نوخطوں نے کیسا باغ سبز اسے دکھلایا　۱۱

شرمندہ نہیں کون تری عشوہ گری کا　۷۱　بے وجہ نہیں منہ کا چھپانا ہے پری کا　۱

جو لب کو ترے دیکھ کے بے ہوش نہ ہووے　　دعویٰ اسی کو بجا ہے صاحب جگری کا　۲

تم دل ہی میں پلتے رہے ہو سیکھا کہاں سے　　اے اشک یہ شیوہ جو لیا پردہ دری کا　۳

جس طرح سے مجھ سے کہے یار سے جا کر　　یہ ڈھب کسی کو آتا ہے پیغام بری کا　۴

پتھر سے ہوں دل یک نگہ گرم میں پانی　　ہے عشق سے ایجاد ہنر شیشہ گری کا　۵

٦ چل آئینہ خانے میں کہ ہے زور تماشا — جس طرف نظر کیجیے عالم ہے پری کا
٧ افسوس شب ہجر کی شام آتے ہی مر گئے — کیا کیا تھا بھروسا تھا ہمیں آہ سحری کا
٨ کر قتل مجھے شوق سے بدنامی سے مت ڈر — دستور نہیں کشتہ پہ یاں نوحہ گری کا
٩ حیران ہوں آئی نظریں کمر اس کو — دعویٰ تھا مجھے اپنی رضا دیدہ وری کا

١ اُس چشم نے کہ طوطوں کو نکتہ داں کیا ٤٢ ایسی کر اک نگہ کہ مجھے بے زباں کیا
٢ گھبراؤں کس طرح دل پُر آہ سے نہ میں — اس سوختہ نے اب تو نہایت دھواں کیا
٣ حال اُس نے پوچھا جب نہ رہی طاقت بیاں — اس پوچھنے نے اور مجھے بے زباں کیا
٤ یارب تو اُس کے دل سے مدام کبھو غم کو دُور — جس نے کسی کے دل کو کبھی شادماں کیا
٥ نیرنگ بے ثباتی کا ہے اس چمن کا رنگ — بلبل نے کیا سمجھ کے یہاں آشیاں کیا
٦ مضمون خط اسی سے ہے ظاہر کہ ہوگا کیا — قاصد کی جا جو اشک کو ہم نے رواں کیا
٧ گہہ عشوہ گہہ کرشمہ گہے ناز گہہ ادا — کس کس طرح سے اُس نے مجھے امتحاں کیا
٨ خوبوں کو ہم نشیں تو کبھی دل نہ دیجیو — میں اس معاملے میں بہت سا زیاں کیا
٩ مجنوں کا عشق سچ ہے پہ موزونوں نے رہنما — ذرّہ سی بات تھی اُسے اک داستاں کیا

١ ذوق اپنے دل کو تلخی غم کا سدا رہا ٤٣ منہ میں ہمارے بد مزگی کا مزہ رہا
٢ کیا دار تھا کہ دیدۂ مست ربانی کی طرح — تحسیں کو اُس کی یاں لب ہر زخم وا رہا
٣ قسمت تو دیکھو روز شب اک عمر اُس کے ساتھ — مانند نور و سایہ رہا پر جدا رہا
٤ خاطر گرفتہ اور ہوئے سیر باغ سے — لالے کو دیکھتے ہی دل اُس گل میں جا رہا
٥ کب تک رکھے گا میرے ستانے کا تو خیال — گالی تلک تو دے چکا اب اور کیا رہا
٦ یہہ کس کے دیکھے کے نی ...... — سارے بدن سے جی نکل آنکھوں میں آ رہا

١ برقع جو اُس کے منہ سے ذرا دور ہو گیا ٤٤ دیکھا تو رنگ شمع کا کافور ہو گیا
٢ کیا دل نے میرے بخت زبوں کو دیا فریب — جو زخم اُس کے تیر کا ناسور ہو گیا
٣ اُس کی مژہ کا آ گیا تھا ایک دن خیال — سینہ تمام خانۂ زنبور ہو گیا
٤ رو بے حجاب آیا کہ ہوئی صبح کیا ہوا — کیوں چہرہ ایسا شمع کا بے نور ہو گیا

١ نکال لے لیا جی کا رواں سے سارے ٤٥ یوں کہنے میں تو زلیخا نے اک غلام لیا

کہو تو کیوں کے نہ ہوں میں کباب اس غم سے — نشے میں کیتے نہ مجھی سے اُس نے جام لیا ۲۰

جز اک کفن کے ترے ساتھ کچھ نہ جائے گا — اگرچہ تو نے یہاں ملک روم و شام لیا ۳

گئے جو غم سے ہوا خوش ہو کوئی اس کا بھی — فلک نے عشق مجھے دے کے انتقام لیا ۴

طبیب دیکھ کے مجھ کو دوا نہ کچھ بولا ۷۰ — خدا کو سونپ دوا اس کے سوا نہ کچھ بولا ۱

رقیب جبت مرا اس کے آگے کرتا ہے — سنو تو یار رہ کوئی آشنا نہ کچھ بولا ۲

میں جس سے پوچھا نشاں اُس پری کی منزل کا — وہ میرے منہ کے تئیں تک رہا نہ کچھ بولا ۳

میں عرض کی نہیں تم مجھ سے بولتے ہو کیوں — وہ اتنا کہتے ہی سن ہو گیا نہ کچھ بولا ۴

مجھے حیرت ہے یارب اس کا کیا انجام ہووے گا ۷۷ — وہاں ہے حسن روز افزوں یہاں ہے عشق شورافزا ۱

ہماری چشم سے سیلاب خوں جاری ہوئی تو ہے — کیا تو نے یہ ظالم اک نگہ کرنے میں دل دریا ۲

شکستہ دل کے اپنے آہ و نالہ پر میں حیراں ہوں — کہ چینی میں صدا ہوتی نہیں جس وقت بال آیا ۳

ہمارا کشت ہے اور برق لے ابر دریا دل — تو اب اور ہی کے جا مزرع کے اوپر اپنے تئیں برسا ۴

نہ پوچھو شام میری شام ہے ماہ محرم کی — کہوں کیا آہ اپنی صبح کی ہے صبح عاشورا ۵

کہا حال مصیبت جس سے وہ طعنے لگا کرنے — توقع جس سے مرہم کی رکھی اُس نے نمک چھڑکا ۶

ہماری تربیت میں باغباں یہ کیا تساہل ہے — بہ رنگ لالہ ہم بھی داغ دل رکھتے ہیں او رزا ۷

رکھو تیر و کماں مشہد پہ میرے جائے شمع و گل — کسی کی ہیں نگہ کا کشتہ ہوں قربان ابرو کا ۸

تری سنگیں دلی نے خود نما ثابت ہوئی ہم پر — گیا تو آئینہ خانے میں اور ہنستا ہوا نکلا ۹

جگہ دروازے پر بھی بیٹھنے کو اب نہیں ملتی — کریں کے دل میں اُس کے گھر ہمارے جی میں تو یہ تھا ۱۰

تری گر چشم بینا ہے نظر کر دیدۂ دل سے — کہ ہے اس آئینہ خانے میں کوئی آئینہ سیما ۱۱

خدا جانے کہ کیا ہے درد بیمار محبت کو — نہ مرتا ہے نہ اچھا ہوتا ہے بے تاب ہے رہتا ۱۲

اپنا چپ ہونا عجب ماتم کا شور افگن ہوا ۷۸ — باتوں سے چپ ہم رہے غم خواروں میں شیون ہوا ۱

کوئی یارب یوں کسی کی جان کے درپے نہ ہو — دل ہوا گر سنگ سختی میں تو نرم آہن ہوا ۲

اُس کے آتے ہٹ گیا آنکھوں کے آگے سے غبار — جیسے روشن جلوۂ خورشید سے روشن ہوا ۳

دل کے جلنے کا نہیں افسوس یہ غم ہے مجھے — جو عطش خانہ تھا دل کا داغ کا مسکن ہوا ۴

چاک پیراہن ہے اُس کو عیب جو عاشق نہیں — مرنے کی رسوائی ہے جب گور میں روزن ہوا ۵

۶ حسن رو سے سادہ کانگی بے بنائے لیکی کئے — دیکھتے خط کا سواد اپنا سبق روشن ہوا
۷ ایک عالم ہے یہاں کھویا گیا تقلید سے — جس طرح شارع پہ چلنا مور کا رہ زن ہوا
۸ دوستی بھی ایک صد رکھتی ہے لے خانہ خراب — آپ اپنی جان کا تو تو رضا دشمن ہوا
۱ جو ستم اُس نے کیا اب تئیں دشوار نہ تھا ۷۹ یہہ سبب تھا مری طاقت سے خبردار نہ تھا
۲ آرزو وصل کی دل سے نہیں جاتی یک بار — ورنہ مرجانا مجھے ہجر میں دشوار نہ تھا
۳ سایۂ بال ہما سے جو کیا مجھ کو تباہ — اے فلک اُس کا مگر سایۂ دیوار نہ تھا
۴ زخم کے لگتے ہی کیا کھل گئے چھاتی کے کواڑ — آگے یہہ خانۂ دل چسپ ہوا دار نہ تھا
۵ اُس کے آتے ہی چمن میں ہوا جوں گل بے قدر — خار اس طرح گلشن میں کبھی خوار نہ تھا
۶ کس گھڑی بزم تری عالم تصویر نہ تھی — کب میں حسرت سے وہاں صورتِ دیوار نہ تھا
۷ پوچھنا تھا تجھے بے درد ترحم سے ضرور — کیا ہوا حال مرا قابل اظہار نہ تھا
۸ یار دیکھو مرے دل کی طرح اب ترے ہے — جو کہے آئینہ حسرت کش دیوار نہ تھا
۹ مژدۂ وصل کے سنتے ہی یہ حال آیا — تھا یہ رنجور ہوس عشق کا بیمار نہ تھا
۱ مزاقت سے دل رنجور ہے اچھا نہیں ہوتا ۸۰ یہ داغِ عشق کیا ناسور ہے اچھا نہیں ہوتا
۲ مریض عشق سے سب کے یہاں تک دم میں طاقت تھی — مسیحا کیا کرے مجبور ہو اچھا نہیں ہوتا
۳ نہ جانو کیا مزہ پاتا ہے جس دن سے — ترا بیمار غم مسرور ہے اچھا نہیں ہوتا
۴ وہ آخر مر گیا جس کو نگہہ کے تیر نے مارا — کچھ اس کے زخم کا دستور ہو اچھا نہیں ہوتا
۵ عبث میری دوا کی جستجو کرتے ہو غم خوارو — مریض عشق تو مشہور ہے اچھا نہیں ہوتا
۶ ہزاروں دم کی امید ایک دم میں ہو دوالے — رضا یہہ کون سا مذکور ہے اچھا نہیں ہوتا
۱ خون سے میرے زیادہ رنگ ہے لاتی حنا ۸۱ جو تجھے اس طرح لے قاتل یہ ہو جاتی حنا
۲ جی میں ہو پامال کر ڈالوں اسے جوں نقش پا — بے ادب کیا تیرے تلووں کو ہو سہلاتی حنا
۳ جا کے اُس کے پاؤں سے لپٹی ہو یارب کے طرح — دیکھیے آخر کو ہو کیا رنگ دکھلاتی حنا
۱ دیکھتے ہی اُس کی صورت کو میں دیوانہ ہوا ۸۲ آئینہ سا نہ مرے دل کا پری خانہ ہوا
۲ تیرہ روزی میری اُس کی آنکھوں میں نہ تڑپا — نامہ بر لا پارا اپنا آپ ہی پروانہ ہوا
۳ شمع سے طاقت کسی کو ہم زبانی کی نہ تھی — یہہ دلِ صد چاک اُس کی زلف کا شانہ ہوا

بنوں سے مرے رونے پہ یوں کہنے لگا　　گھر نہیں میرا ہوا یہہ تعزیت خانہ ہوا　۴
ے کم فرصتی جب تاک بھرے جام نشاط　　زندگانی کا یہاں لب ریز پیمانہ ہوا　۵
یا کیا مفت و ، رجہاں ستان ہجر سے　　یار کے جانے کے ساتھ ہی اپنا مر جانا ہوا　۶
ت اپنی کیا کہوں محرومیِ طالع سے میں　　رات کو بلبل ہوا اور دن کو پروانہ ہوا　۷
اپنے در پہ مجھ کو یوں تجاہل سے کہا　　کس طرف سے اس مسافر کا ادھر آنا ہوا　۸
کہتے تھے رضا ہے عشق میں جی کا زیاں ...　　سچ ہے اے مشفق مرے آپ ہی کا فرمانا ہوا　۹

جیتے جی گر یہاں سے جائیے گا　۴۳　پھر کسے جا کے منہ دکھائیے گا　۱
زخم سینہ سے یہہ ہوا معلوم　　کوئی دن اور باؤ کھائیے گا　۲
اگر آنکھیں نہ مند گئیں اپنی　　زخم ایک ایک اُسے دکھائیے گا　۳
جان گر اب کے بچ گئی غم سے　　دل کسی سے نہ پھر لگائیے گا　۴
نہ کہا کچھ بھی میرے مرنے پر　　کچھ ہو یہہ بات منہ پہ لائیے گا　۵
دم آخر ہے میں بھی چلتا ہوں　　بیٹھ تو جائیے گا جائیے گا　۶
آہ و نالہ سے گر ملی فرصت　　حال دل کا اُسے سنائیے گا　۷
اتنے ملنے پر اے بتاں یہہ ناز　　کیا خدا سے ہمیں ملائیے گا　۸
اُس کو ہے تیغ آزمائی کا شوق　ق　جی میں آتا ہے دل چلائیے گا　۹
کام ہوگا جو لڑ گئی قسمت ـــ　ورنہ طالع تو آزمائیے گا　۱۰
لاش پر کشتۂ محبت کی　ق　عیسیٰ کے آنے پر نہ جائیے گا　۱۱
گو ہیں جاں بخش اس کے لب لیکن ـــ　آپ بھی ٹک زباں ہلائیے گا　۱۲
مے کدے سے چلے تو ہو مسجد ـــ　کیوں رہنا پھر بھی ادھر آئیے گا　۱۳

ست کر تماش دل کو مرے پارہ بے شنو　۴۴　گر آسماں پھٹا تو سلایا نہ جائے گا　۱
آنا گلوں کا تجھ کو مبارک ہو عندلیب　　بن یار ہم سے باغ میں جایا نہ جائے گا　۲
کچھ فکر جلد کر لے کہ تازہ ہوا ہے عشق　　بھڑکا اگر یہ شعلہ بجھایا نہ جائے گا　۳
ست جا تو اُس کے کوچے میں کہتے ہیں ـــ　پھر تجھ سے اپنے گھر تلک آیا نہ جائے گا　۴

یار سے خواستگار حور ہوا　۴۵　شیخ ناداں سے یہہ قصور ہوا　۱

۲ مر گئے ہم شراب کے غم میں — اب تو ساقی تجھے سرور ہوا
۳ شقۂ وصل کیوں دیا قاصد — اور بھی دل تو نا صبور ہوا
۴ اُن نے تلوار غیر پر کھینچی — مجھ کو مرجانا اب ضرور ہوا

۸۶

۱ بر میں وہ سیم بر نہیں آتا — میں غرض غم سے بر نہیں آتا
۲ اس میں ہوتا ہے وہ تو خوش لیکن — کیا کریں ہم کو مر نہیں آتا
۳ ہم تجھے اپنی قدر دکھلائیں — ہاتھ کچھ اس قدر نہیں آتا
۴ دل کی بیتابی نے خبر کی ہے — نامہ بر بے خبر نہیں آتا
۵ دیر و کعبہ میں کون سر پٹکے — ہم کو یہ دردِ سر نہیں آتا
۶ ہستی کی ہے دکان شیشے کی — کوئی پتھر ادھر نہیں آتا
۷ اس شجر کے لگائے ہم نے تخم — جس میں گل اور ثمر نہیں آتا
۸ کون آنکھوں سے ہو گیا اوجھل — ہائے اب کچھ نظر نہیں آتا
۹ سوزشِ دل کو آہ مت پوچھو — اشک بھی بے شرر نہیں آتا
۱۰ دیکھی اُس کی گلی رضا نے مگر — ان دنوں پھر وہ گھر نہیں آتا

۸۷

۱ میرے نالے پر نہیں تجھ کو تغافل کے سوا — گل نہیں سنتا کسی کا شور بلبل کے سوا
۲ تم جو چاہو کرو جور و عتاب و خشم و ناز — کچھ نہیں بنتا ہے عاشق سے تحمل کے سوا
۳ جو سخن رس آشنا ہیں زلف و کاکل کے تری — اُن کو مضموں بھی نہیں ملتا ہے سنبل کے سوا
۴ کس طرح مجھ سے جدائی تجھ کو آتی ہے پسند — قافیہ گل کا نہیں ٹھہرے ہے بلبل کے سوا
۵ واسطے موسیٰ کے سرمہ طور کا ہے اے رضا — میں نہ دوں آنکھوں میں خاکِ پائے دلدل کے سوا

۸۸

۱ گور کے منہ سے ہم پھر آئے تم نے کبھی بھی آ دیکھا — دیکھو تو ادھر آنکھ ملا کے تم کو بس دیکھا دیکھا
۲ کس کی الفت کیسی محبت کیا پھر منہ دیکھیں گے ہم — جاؤ چلے تم یہ بھی گویا ایک تماشا تھا دیکھا
۳ میں جو کہا اب مرتا ہوں میں ہنس کر بولا جھوٹ نرالا — مار نہ مریے پھر کیا کیجے طور جواب اس کا دیکھا
۴ آنے جانے میں اُس کوچے کے کیا دل بھر بھر آتا — رونے لگتے تھے ساتھ اُس کے جب کے تئیں روتا دیکھا
۵ کون نہ دیکھے ہم کو دکھایا جو کچھ ان کے دیکھنے نے — دل کو دیکھا آتش خانہ چشموں کو دریا دیکھا
۶ مرتا نہیں بن موت کوئی کیا کہیے رات جدائی کی — سر بھی پھوڑا چھری بھی ماری زہر بھی ہم نے کیا دیکھا

کل کیا کیا انداز کی باتیں اِن اُن میں چلتی تھیں — میر رضا تو بے مزہ اُٹھے ہم نے دور مزہ دیکھا ۷

بزم افروز وہ اک شب ستم ایجاد ہوا ۸۹ شمع ساں روز کا جلنا مجھے معتاد ہو ۱

گر ہما دام میں آئے تو اڑا دیتا ہے طائرِ وصل کے جو شوق میں صیّاد ہوا ۲

بھولا دنیا کو ہے زاہد ہوسِ جنت سے طفل کو ذوق سے بازی کے سبق یاد ہوا ۳

آہ اس عشق کی آہن جگری مت پوچھو تیغ شیرویہ بنا تیشۂ فرہاد ہوا ۴

حسرت قد کا تری خستہ چمن میں جو گیا سایۂ گلبن اُسے سایۂ جلّاد ہوا ۵

مدّتوں سے جو چلا آتا تھا دستور وفا سو ترے عہد میں یکبار بر افتاد ہوا ۶

اے رضا تجھ ہی پر استادی نہیں ہے موقوف — جو کہ شاگرد ضیا کا ہوا استاد ہوا ۷

اب بیٹھے پچھتایا کیجے پہلے اس کو نہ جانا تھا ۹۰ مرجانا بہتر تھا، لیکن اُس کی گلی نہ جانا تھا ۱

دیکھو تو کس کس طرحوں سے غیر لگاوٹ کرتا ہو بات بھی تم کو آتی نہیں ہو دل کیا تم کو لگانا تھا ۲

کچھ جو ہوتی عقل تو وہ لیلےٰ ہی کے در پر مر جاتا — دشت جانا کیا تھا مجنوں سچ مچ کا دیوانہ تھا ۳

کیا کہوں میں کس طرح سے دل مرا جاتا رہا ۹۱ اک چھلاوا تھا آیا چھل گیا جاتا رہا ۱

اُس کے جانے کی نہ کچھ پوچھو جوانی کی طرح اور تو کیا زندگانی کا مزہ جاتا رہا ۲

آئے تھے مستی میں ہم کرنے کو اُس سے گفتگو — ایک ہی اُس نے سنی سارا نشا جاتا رہا ۳

نہ دل ہی عشق کے شعلے نے کچھ تمام کیا ۹۲ زبان جل گئی اس آگ کا جو نام لیا ۱

نشے میں وہ رہے مسجد کی تاک باندھی تھی پہ شکر لغزشِ پا کا کہ جس نے تھام لیا ۲

نہ پوچھو مجھ سے رضا فائدہ محبت کا — کبھی کسی نے بھی ناکامیوں سے کام لیا ۳

کہتے ہیں آپ جو کچھ سو سب بجا ہے صاحب ۹۳ اِن جاں فشانیوں کا بدلا یہی ہے صاحب ۱

مجنوں کے مرنے کا ذکر پہنچا تو ہو گا ماتم بیماری میرے تئیں بھی اُس کو وہی ہے صاحب ۲

جاتا نہیں بہانہ کس کام کا یہ آنا دیکھو تو رات کتنی باقی رہی ہے صاحب ۳

اُگ جائے جیب میری گر ہونٹ بھی ہلا ہو یہ بات قہر تم سے کس نے کہی ہے صاحب ۴

گلشن کا پتّا پتّا کھاتا ہے زہر اس پر سبزی تمہارے خط کی کیا لہلہی ہے صاحب ۵

مرتے ہوا رضا پہ منہ سے ذرا نہ بولا — اس ادا سے تمہیں بھی کچھ آگہی ہے صاحب ۶

جور و ستم کسی پہ کرتے کوئی کیا سبب ۹۴ اُس کی جفا کا ہے یہ ہماری وفا سبب

۲ ارمان اُسے اٹھا ہے مرا اشکِ سُرخ دیکھ — شوق حنا کا اُس کے یہ رونا ہوا سبب
۳ ہر دم بُرا کہے ہو میاں مجھ کو کس لیے — آخر ہر ایک بات کا ہوگا بھلا سبب
۴ قاصد سوائے آہ کے عاشق کا کوئی نہیں — یوسف کی ہوئے لانے کی ہو کے صبا سبب
۵ دیکھیں کہے ہے کون غزل اس ردیف میں — کہنے کو اس زمیں کے ہوا ہے رضا سبب

۱ نہ اُس کی خو ہے اور نہ کہا غیر کا سبب ۹۵ ان گالیوں کا تیری ہو ہیکا رضا سبب
۲ نہ عشوہ نہ کرشمہ نہ غمزہ تھا نہ ادا — جانے کا اپنے دل کے کچھ اور ہی ہوا سبب
۳ آہِ سحر کرے ہے ہمارا شگفتہ دل — غنچوں کے ہوئے کھلنے کا بادِ صبا سبب
۴ نہ برق ہو نہ شعلہ نہ خورشید ہو نہ شمع — یارب ہمارے دل کی تپش کا ہو کیا سبب
۵ جلوے نے اُس کے حسن کے دل ہم سے لے لیا — بے کاہ کی کشش کا رضا کہہ رہا سبب

۱ بزم خوبوں سے تاب ناک ہے سب ۹۶ بن ترے اپنی بھاؤں خاک ہو سب
۲ حالِ دل اُس کی زلف میں مت پوچھ — شانے کی طرح چاک چاک ہے سب
۳ آہ کس صدمے کی یہ چوٹ لگی — دل جگر جان دردناک ہے سب
۴ عشق کی راہ کیا ہی او ہٹ ہے — دل و جاں لے رضا ہلاک ہے سب

۱ ابر ہے ابر ہے شراب شراب ۹۷ ساقیا ساقیا شتاب شتاب
۲ نامہ لکھتا ہوں اور کہے ہے شوق — قاصدا قاصدا جواب جواب
۳ ہم جیسے ہیں جو ٹک تو بولو — لیجیے لیجیے ثواب ثواب
۴ یار بن اپنی زندگی اے خضر — موت ہے موت ہے عذاب عذاب۔
۵ پھر رضا نے غزل کہی اس کا — شاعراں شاعراں جواب جواب

۱ ٹک تو محل کا نشاں دے جلد لے صورت زرا ۹۸ کب تلک بھٹکے پھریں اب ہم تو دیوانے خراب
۲ پھر بھی کچھ اندھیر ہے اب زلف تیرے درمیاں — گھر بسے شانے کا اور ہوں دل کا شانے خراب
۳ دل تو خوں ہو بہہ گیا اور ہے جگر باقی سو اب — اس کی بھی حالت لگی ہم کو نظر آنے خراب
۴ گھر بسیے تو گھر ہیں کس کے جا بسا ہے بول اُٹھ — مسجدیں یاں ہیں تجھ بن اور صنم خانے خراب
۵ شمع ہجر کا شعلہ اپنا آگ دے فانوس کو — کب تلک پھرتے رہیں گرد اس کے پروانے خراب
۶ چپ ہو اب تو لے رضا ان خاکیوں پر رحم کر — رونے سے تیرے ہوئے سب شہر و ویرانے خراب

کچھ نہیں بن تیرے ہم جوں گرد بیٹے جی خراب ۹۹ مر گئے کے بعد بھی عاشق کی ہو مٹی خراب ۱
ناقۂ لیلی کو رو گو جس طرح ہوا ہے غزال — شہر ویراں ہو چکا اب ہوتی ہو وادی خراب ۲
پوچھتے کیا ہو رضا کا مجھ سے تم حالِ خراب ۱۰۰ ایک تو تھا ہی دوانا تس پر اب پی ہو شراب ۱
دل دینا بھلا میرا ایسا تھا برا صاحب ۱۰۱ دن رات برا مجھ کو کہتے ہو بھلا صاحب ۱
اک دیکھنے کی خاطر یہہ باتیں جو سنتے ہو — تم اپنی طرف دیکھو اے میر رضا صاحب ۲
ہم مر گئے پہ شکوے کی منہ پر نہ آئی بات ۱۰۲ کیوں بے زبان عاشقوں کی آزمائی بات ۱
دعوائے عشق کرنے کا کیا منہ کسی کا تھا کم بولنے نے تیرے یہ ساری بڑھائی بات ۲
ہم پیشگی کی مجھ سے کرے گفتگو رقیب منہ اُس کا دیکھو ہو یہ تمہاری سکھائی بات ۳
سب کچھ پڑھایا ہم کو مدرس نے عشق کے ملتا ہو جس سے یار نہ ایسی پڑھائی بات ۴
اپنا کسے کہوں نہ کہوں کس کو ہے غضب جس وقت منہ سے نکلی ہوئی پھر پرائی بات ۵
کیا غیر نے کہا کہ لگے بڑبڑانے تم میں نے بھی چھیڑنے کی نئی اب تو پائی بات ۶
مذکور کل کا جانے دو ہو جاؤ گے خفا تھمتی نہیں زبان پہ جس وقت آئی بات ۷
مجنوں کے نام سے مرا حال اُس نے تب سنا شکرِ خدا کہ خوب بن آئی بنائی بات ۸
بلبل کا نالہ آگے مرے اس طرح سے ہے جس طرح شہریوں سے کرے روستائی بات ۹
تقریر صاف پر جو رضا کی کرے نظر — اندھے کے تئیں عجب نہیں دیوے دکھائی بات ۱۰
سنتے ہو تم تو دل سے میاں ہر کسی کی بات ۱۰۳ گر حکم ہو تو ہم بھی کہیں اپنے جی کی بات ۱
مذکور دل کا ہو اسے ٹک کان رکھ کے سن نہ ذکر جنگ کا ہو نہ ہو آشتی کی بات ۲
اک بوسے کے سوال پر اتنا عتاب کیا کیا جی میں دھر رکھی ہو ذرا سی ہنسی کی بات ۳
غیروں کا طنز و طعن کہاں اور میں کہاں سب ہے ہمارے دل کی یہ ناچارگی کی بات ۴
کب تک سنا کرو گے میاں دشمنوں کی بات ٹک دوستوں سے بھی تو سنو دوستی کی بات ۵
تجھ بن رضا کے مرنے کا کچھ غم نہیں پر آہ — جی ہی میں اُس کے رہ گئی افسوس جی کی بات ۶
زلف کھولے تھا کہاں اپنی وہ پھر بے باک رات ۱۰۴ خود بخود ہوتا تھا جوں شانہ دل اپنا چاک رات ۱
برگِ گل شبنم سے تر مت جانیو اے باغباں گل نے دامن سے کیے بلبل کے آنسو پاک رات ۲
شمع روشن جوں کہ آتی ہو نظر فانوس میں برقع میں تھا جلوہ گر وہ روئے آتش ناک رات ۳

۴ مغ بچے کے چہکنے سے ہوگیا سارا خلل — تجھے لگائے ورنہ رنداں دخترِ رز سے تاک رات
۵ تونے بھریاں شعلہ افشاں ایسی ہی آہیں رضا — یار کے کوچے کے جل گئے سب خس و خاشاک رات
۱ مت پوچھ دل جلا کہ جگر تھا کباب رات ۱۰۵ فرقت میں حال اپنا تھا یک سر خراب رات
۲ کوئی تو ہوئے دونوں سے جو غم سے چھوٹیں ہم — یا جلد آئے موت کہ جائے شتاب رات
۳ اوروں کی سرگذشت سنتے ہے وہ جاگ جاگ — میرے ہی حال سے اُسے آتا ہے خواب رات
۴ کیا حالِ دل کا کہیے کسی بن نہ پوچھو ہائے — نہ دن کو چین آئے اسے اور نہ خواب رات
۵ نہ رات ہی ہو رات ہیں تیرے ہجر میں — بن تیرے دن بھی ہو ہیں لئے آفتاب رات
۶ محشر کے دن سے کس کو ڈراتے ہو واعظا — ہجراں کی اسکی ہو ہیں ہوے عذاب رات
۷ کیا گزری دل جگر پہ رضا غم کی آگ سے — آتی تھی تیری آہ سے بوئے کباب رات
۱ گرم مت ہو جو میں کھینچوں نفس سرد بہت ۱۰۶ کیا کروں صبر بہت کم ہے مرا درد بہت
۲ یارب آوارہ ملاکون اب خاک کے بیچ — آہ کچھ دشت میں آج اڑتی ہی پھر گرد بہت
۳ غیر کا کیا ہوا درماں دو لبِ عیسیٰ دم — آج تڑپے ہے مرا کچھ دل پُر درد بہت
۴ تو کسی نہہ پسنے کا ہوا ہے عاشق — ان دنوں پھرے ہے رضا رنگ ترا زرد بہت
۱ یہ کہتا نہیں ہوں مان لو بات ۱۰۷ پر مری پیار سے ٹک سنو بات
۲ کچھ اس کے نہ قرب و بُعد کی پوچھ — میں کیا کہوں ہے یہ کو بہ کو بات
۳ اور عشق کی کیا کہوں میں یارو — ق اک طرفہ مرنے کی ہے سنو بات
۴ عار آتی تھی جس سے بات مجھ کو — کہہ جاتا ہے اب تو وہ بھی وہ بات
۵ سونے بھی دو ہونے آتی ہے صبح — اب میر رضا جی بس کرو بات
۱ تیرے ہی واسطے سب جھانکیں ہیں کوے آفت ۱۰۸ لے آفت آرزو کی اور آرزو سے آفت
۲ اُس فتنہ ساز کا کچھ مُنہ پھیرنا نہ پوچھو — ہونا پڑا ہے ہم کو اب روبہ روے آفت
۱ بھر عمر کی ریا کی مٹ جاتی ہے ملامت ۱۰۹ زاہد کی بت جو میرا اک دن کرے امامت
۲ تا حشر تو ملا جائے تو بھی نہ ہو برابر — جو کچھ کہ مجھ پہ کی ہے اس رات نے قیامت
۳ جز مشتِ استخواں کے تجھ میں نہیں رہا ہے — ق اک شخص نے یہ جا کر مجنوں کو کی ملامت
۴ رو کر کہا یہہ اُس نے سچ ہے نہ میر صاحب — کیا غم ہے جب تلک ہے لیلیٰ کا سگ سلامت

توکس کی شمع شبستاں تھا یار آج کی رات ۱۱۰ کہ صبح تک میں رہا بے قرار آج کی رات ۱

ہجوم یاس ہے اب روز وعدے کا گزرا — تو لے اجل ہو مری غمگسار آج کی رات ۲

زلفِ شب رنگ کی چلی کچھ بات ۱۱۱ ہم نے آنکھوں میں رات کاٹی رات ۱

نہیں ممکن کہ پھر قرار آئے — گر یہی دل ہے گور میں بھی ساتھ ۲

رات دن بے قرار رہتا ہے — دل بھی اپنا ہے زور خوش حرکات ۳

سچ کہہ رضا یہ کس سے لگائی ہے سانٹ بانٹ ۱۱۲ کچھ پھر ہے ان دنوں میں ترا جی نپٹ اُچاٹ ۱

دیکھیں گے کیوں کے چشموں سے جاتے رہے گئے تم — لخت جگر کی چوکی بٹھائی ہے گھاٹ گھاٹ ۲

ٹکڑے چنے ہیں دل کے جو آنکھوں کے خوان میں — ہر کس کے میہمانی کا لائے مردماں یہ ٹھاٹ ۳

اپنی گلی کے آنے سے مجھ کو نہ منع کر — بدنام ہوگئے بند کرے گا جو راہ باٹ ۴

اس چشم و دل نے کہنا نہ مانا تمام عمر — ہم پر خرابی لائی یہ گھر کی پھوٹ پھاٹ ۵

رہنے دے اپنی بزم میں کچھ بولوں میں اگر — مانندِ شمع پھر وہیں میری زباں کو کاٹ ۶

اب اس گلی میں آتا جو ہے ہر گھڑی رضا — کچھ تو ملی ہے واں سے تجھے میری بات چاٹ ۷

کہتے ہیں ہم غیروں سے بے فائدہ مت مل عبث ۱۱۳ دل شکستوں کو نہ کر لے دل ربا بے دل عبث ۱

خندہ زن نہ گل نمط نہ مثل شبنم اشک ریز — اپنی قسمت میں ملا ہے اس طرح کا دل عبث ۲

جوں صدف ہم سینہ چاک اک قطرے کی خاطر ہیں — بس ترا یہ شور ہے اے ابر دریا دل عبث ۳

پھیر عناں وادیِ مجنوں کو وگرنہ ہے یہ سب — بادیہ گردی تری اے صاحب محمل عبث ۴

اتنا ہی کہنا تجھے بس ہے کہ عاشق تھا رضا — قتل کو میرے بہانہ ڈھونڈنا قاتل عبث ۵

کیا نہ دیدوں سے زمانے کو سروکار ہے آج ۱۱۴ ایک درہم جو رکھے مالکِ دینار ہے آج ۱

کل تو معمورۂ عالم کو ڈبایا اے چشم — کیا خرابی ہے تو پھر رونے کو تیار ہے آج ۲

دیکھنا دیکھنا کیا دل میں لگی آتش عشق — کیوں مرا نالۂ خوں بار شرر بار ہے آج ۳

گردشِ چشم سے تیری جو ہوا کی کا حریف — سو دو چار دبِ کش خانۂ خمار ہے آج ۴

اے رضا خطِ سیہ اس کے نہیں چہرے پہ — حسن کے واقعے کا یار عزادار ہے آج ۵

نہ لیے راز محبت دل نالان کے بیچ ۱۱۵ آگ کس طرح سے ہو بند نیستان کے بیچ ۱

وہاں کیا ہے مرے اور شمع سحرگاہ کے بیچ ۱۱۶ دونوں کا کام تمام ہوتا ہے اک آہ کے بیچ ۱

۲ خط کے دھوکے سے گرا اُس کے زنخدان میں دل — کس نے خس پوش کیا چاہ مری راہ کے بیچ

۳ اپنے تئیں حق نے چھپایا کیا ظاہر تجھ کو — ایک عالم ہوا گمراہ اس اشباہ کے بیچ

۱ کرتا ہے تن پہ نالۂ دل ہر نفس کے بیچ ۱۱۷ شعلہ کرے ہو جیسے کہیں خار و خس کے بیچ

۲ پرواز ہم بھی کرتے ہیں لیکن نہ دل کو کھول — مانند مرغ قبلہ نما کے قفس کے بیچ

۳ تم ایک بار گی نہ ہوئے ہم سے ہم کنار — پہنچے کنار گور کے ہم اس ہوس کے بیچ

۴ محمل نشیں نے کچھ نہ کیا فرق حیف ہے — نالے میں دل کے اور صدائے جرس کے بیچ

۵ حسرت رضا کی اُس کی گلی میں تو کچھ نہ پوچھ — دیکھا تو ہوگا باغ میں بلبل قفس کے بیچ

۱ زلفوں کی کسی کی کہیں دیکھی ہے مگر موج ۱۱۸ بے چین رہے ہے عرق شرم سے ہر موج

۲ کل جوش نے دل کے تو لہو پانی کیا تھا — کیا آج کریں دیکھیں تری خون جگر موج

۳ جب اب دم تیغ تری یاد کروں ہوں — ہر زخم کہن مارے ہے اک تازہ و تر موج

۴ بے تابی دل مرنے پہ بھی دیوے جب آرام — اب زخم جو ہے تن پہ سو آتا ہے نظر موج

۱ بے پردہ ہو جو وہ رخ حیرت فزائے صبح ۱۱۹ خجلت سے حشر کو بھی نہ پھر منہ دکھائے صبح

۲ دیکھا نہیں ہے چاک گریبانِ یار کا — زاہد تو اتنا کرتا ہے فخر صفائے صبح

۳ اک دن بھی کچھ اثر نہ کیا اُس کے دل میں آہ — اے وائے وائے نیم شب ہائے ہائے صبح

۴ آہ سحر سے وا نہ ہوا دل تو ہے عجب — غنچہ کرے ہے کیوں کے شگفتہ ہوائے صبح

۵ دم بھر کی زندگی ہے چراغ سحر رضا — کچھ فکر جلد کر لے مبادا کہ آئے صبح

۱ جی دے ہے تیرے عشق میں بیمار بے طرح ۱۲۰ بدنامی تجھ پہ آئی مرے یار بے طرح

۲ کس بے گنہ کی آئی ہے اب دیکھیے قضا — تم ان دنوں میں کھینچتے ہو تلوار بے طرح

۱ سب ہی قاصد جواب نامہ و پیغام تلخ ۱۲۱ اُس لب شیریں سے نکلی کس طرح دشنام تلخ

۲ مے کدے سے تو جو گزرے اس طرف مت دیکھیو — عیش مستاں تلخ کر دیں گے ترے بادام تلخ

۳ ہے بلا سخت اپنے دل کے حق میں نام زلف — جس طرح غربت زدوں کے آگے ذکر شام تلخ

۴ ٹک ٹھہر خنجر سے خون اور رو لکا اس کو دھلنے دے — زندگی میری نہ کر لے جان بے آرام تلخ

۱ مجھ ناتواں سے نام ہے تجھ غم کا یاں بلند ۱۲۲ قدر اس ہما کی کرتا ہے یہ ہم استخواں بلند

۲ سارا جلا جہاں کا دھواں دھار ہو گیا — یارب ہوا ہے آہ کا کس کی دھواں بلند

پھر پھر کے آگ دہر میں سارے تو در نہیں   ایسا نہ ہو کہ آہ ہماری ہو یاں بلند ۳

تک دیکھنا رضا کی کہیں ہو نہ مشتِ خاک — یہہ گردسی جو ہے گی پہ کارواں بلند ۴

ناز کا مارا ہوا ہوں میں ادا کی سوگند ۱۲۳ کشتۂ جور و جفا ہوں میں وفا کی سوگند ۱

خواہ کافر مجھے کہہ خواہ مسلمان اے شیخ   بت کے ہاتھوں میں بکا یا ہوں خدا کی سوگند ۲

کچھ خبر راہِ فنا کی بھی رکھے ہے ہم سے   کہہ دے اے خضر تجھے آبِ بقا کی سوگند ۳

یار سے خواری و رسوائی ہمیں بہتر ہے   غیر کی عزت و حرمت سے وفا کی سوگند ۴

شمع کی روشنی سر کٹنے سے ہوتی ہے دوچند   درد ہی سے مجھے حاصل ہے دوا کی سوگند ۵

اُس کی گر جان سے مطلب نہیں تجھ کو میاں — جھوٹے کیوں کھاتا ہے ہر دم تو رضا کی سوگند ۶

نکل مت گھر سے تو اے خانہ آباد ۱۲۴ کیا اب ہم نے بھی ویرانہ آباد ۱

قبول ہوگا کہیں تو سجدہ اپنا   رہیں یہہ کعبہ و بت خانہ آباد ۲

ہمارا ہی رہے اک جام خالی   مغاں رہیو ترا مے خانہ آباد ۳

رہے اُس زلف سے یہہ دل پریشاں   ترا گھر ہوئے یوں اے شانہ آباد ۴

رضا لوٹا ہے کس سفاک نے آہ — کبھی دل کو ترے دیکھا نہ آباد ۵

جب ترحم کو وہ کرتا ہے نظر سے پیوند ۱۲۵ دل کے ٹکڑے مرے ہوتے ہیں نظر سے پیوند ۱

کیوں کے میں اب نہ کروں غم سے تہی قالب کو   ہاے بہلے کو ہوا اُس کی کمر سے پیوند ۲

زلفوں کو چہرے پہ بکھرا کے کہہ اے مایۂ ناز — اس طرح شام کو دیتے ہیں سحر سے پیوند ۳

حسن کے گل کی بہت کرتی ہی بلبل سبھی ۱۲۶ کیا تماشا ہے جو ہو جائے مرا یار نمود ۱

ہاے لے زندگانی فرہاد ۱۲۷ واے رے جاں فشانی فرہاد ۱

غم کا بوجھ اور بے ستوں کا کام   واے رے ناتوانی فرہاد ۲

سر کٹنے پر بھی آہ کیا کہیے   نہ گئی سرگرانی فرہاد ۳

اے مرید رضا تو شیریں سے   ق اتنا کہیو زبانی فرہاد ۴

ایک تیشے سے خاک میں مل گئی — کوہ سی سخت جانی فرہاد ۵

عشق شیریں لباں کے مرنے میں — ہے رضا ایک ثانی فرہاد ۶

قید کر ہم کو یہ ہے عین کرم اے صیاد ۱۲۸ دیکھا جاتا نہیں گل چیں کا ستم اے صیاد ۱

۲ گل سے ر ہیں قفس کرتا ہے تو ہاے نصیب — دور کیوں دام سے تیرے ہیں ہم اے صیاد
۳ یا کر آزاد کہ کر بند قفس کے روزن — یہہ ہوا باغ کی کرتی ہے ستم اے صیاد
۴ اپنے گرنے کا زمیں پر مجھے افسوس نہیں — شاخ گل اس کی کشاکش سے ہے خم اے صیاد

۱ زبانی کہیو لکھ سکتا نہیں اے نامہ بر کاغذ ۱۲۹ مجھے آتا ہے رونا اور ہوا جاتا ہے تر کاغذ
۲ نہ کچھ پوچھ عشق میں اپنے ہمارے دل کی حالت کو — کبھی دیکھا تو ہوگا تونے بھی ایک اے سر کاغذ
۳ یہاں تک بدگماں ہے میرے نامے کے توہم سے — نہیں چھوتا ہے مصحف کا بھی وہ کافر پسر کاغذ
۴ کسی کے عشق کی باتیں لکھیں اے یار سچ کہنا — رضا کیوں دیکھتا رہتا ہے تو آٹھوں پہر کاغذ

۱ نہ کہیو نکہت گل ہاے باغ نازک تر ۱۳۰ کسی کا اس سے بھی ہوگا دماغ نازک تر
۲ ہواے آہ کے چلنے سے بکھرے جاتے ہیں — گل چمن سے ہیں گل ہاے داغ نازک تر
۳ تمہارا چلنا نہیں خالی از نزاکت کبک — ہے اپنا آہ دماغ سراغ نازک تر
۴ الہی چشم بد اس سے تو دور ہی رکھیو — کہ مست سخت ہوں میں اور ایاغ نازک تر
۵ رضا کو یاد رکھو اے فراموشی کاراں — کہ دوستی ہے بہ شرط چراغ نازک تر

۱ اس کے لبوں کے مقابل ہرگز اے خضر آب حیات کر ۱۳۱ مرتا ہے اک روز میاں اپنے سے ظلمات نہ کر
۲ صبح سے جی ڈہا جاتا ہے دل گھبرا گھبرا آتا ہے — تجھ کو قسم میرے مرنے کی وعدے کا دن رات نہ کر
۳ ہم سے بھلے مانس نہیں آخر ہم کوئی رلوں نہیں — بیٹھ یہاں ہی دو اک دم کچھ جی میں پانچ اور سات نہ کر
۴ اپنے آنے جانے کی مت کہہ یار کہ ہم مر جائیں گے — غیر ہی بے غیرت ہے اتنا ہم سے یہہ حرکات نہ کر
۵ جب ہم نے کہا کہتے ہیں ہم عاشق نہیں پھر کیا بات رہی — کچھ کہہ کے جو کوئی منکر ہو اس بات سے تئیں اثبات کر
۶ میر رضا کی بات سے ہی کچھ ہے جس کو جی میں لانے کوئی — کیسے یہ جب ہمارے ہیں دو دن ایسی بات نہ کر

۱ بہت ہوا ان دنوں دل عشق کے فسانوں پر ۱۳۲ مجھے یہہ ڈر ہے کہیں رو نہ بیٹھو کانوں پر
۲ نہ ان کو شیخ سے الفت نہ برہمن سے نزاع — قسم ہے پیر کی مرتا ہوں نوجوانوں پر

۱ مان کہنا ندا آ بیٹھ سر منظر پر ۱۳۳ ورنہ جاری ہوا سیلاب لہو کا در پر
۲ آب حیوان کو کہاں ڈھونڈیے دل کے ہوتے — حیف ہے کوشش بے حاصل اسکندر پر
۳ دل کی الفت نہ گئی خط کے بھی آنے سے رضا — شام کو بھی یہ سیہ روز نہ آیا گھر پر

۱ کر نظر اپنی ٹک کشاری پر ۱۳۴ رحم کر میرے زخم کاری پر

شمع روتی تھی رات مجلس میں   بن ترے میری آہ و زاری پر   ۲
دل جگر جان سب تباہ ہوئے   روؤں کس کی میں سوگواری پر   ۳
ٹک قرار اپنا یاد کر پھر تو   طعن کر میری بے قراری پر   ۴
پھر بہت یاد کر کے روئے گا — ہنس لے اب میری اشک باری پر   ۵
تیری گلی بغیر رضا کو نہیں قرار   ۱۲۵   جز سمت کعبہ قبلہ نما کو نہیں قرار   ۱
آئے گا جب سں دل نالاں کو گو ہیا — منزل بغیر پہنچے درا کو نہیں قرار   ۲
روز تو ہم کو ملے ہیں زور پر   ۱۲۶   زدمت کرنا کسی کم زور پر   ۱
کیا تماشا ہا تھ میں ٹک دیکھنا   آنکھ چپکی جائے ہے ہر پور پر   ۲
کس برو نار پر کھائے ہیں گل   کیوں مرے دل سے ہیں تیرے موڑ پر   ۳
روشنی بزم معنی تھا رضا — نور برسے یارب اُس کی گور پر   ۴
جان دینے پہ ملے ہے جاناں   ۱۲۷   عشق کا سود و زیاں ہی کچھ اور   ۱
گو تو دامن کو اور خنجر کو دھو   خون عاشق کا نشاں ہی کچھ اور   ۲
بس محبت تری دیکھی تاثیر   یہاں کچھ اور وہاں ہی کچھ اور   ۳
سرو کو قد سے نہ دوں اُس کے مثال   نوجواں میرا جواں ہے کچھ اور   ۴
بدگماں یار ہوا غیروں سے   اس میں بھی ہم کو گماں ہی کچھ اور   ۵
لے رضا جلد خبر لے دل کی — اب کے حسم ہی کچھ اور   ۶
اب رضا کا ملال ہے کچھ اور   ۱۲۸   اب دوانے کا حال ہے کچھ اور   ۱
سرو کو اُس کے قد سے کیا نسبت   وہ مرا نو نہال ہے کچھ اور   ۲
کبک چلتا ہے وضع سے لیکن   خوش خراموں کی چال ہی کچھ اور   ۳
خون دل سے بھرا ہے شیشۂ چشم   شیخ جی کا خیال ہے کچھ اور   ۴
ایک دم ہجر کا قیامت ہے — عشق کا ماہ و سال ہے کچھ اور   ۵
ہوں نقش پا سے راہ میں اُس کی نتادہ تر   ۱۲۹   قوت ہو ناتوانی کی یارب زیادہ تر   ۱
کس طرح نو خطوں کے نہ کھائے بھلا فریب   ہے رنے سادگاں سے بھی دل اپنا سادہ تر   ۲
کیوں کر نہ آنکھیں ٹھنڈی کرے خدا کرے سب ۳

۴ چاہا تھا اُس کو بھولیں جفا کے خیال سے — اس سے تو یاد اور بھی ہوئے ہے زیادہ تر

۱ نہ رکھ فانوس اے فراش محفلِ شمع روشن پر ۱۴۰ نہ پروانے بچارے کا تو لے خون اپنی گردن پر

۲ سمجھ کر رکھیو پھاہا داغِ سینہ پر مرے جرّاح — نہیں رکھتا ہے ہرگز پنبہ کوئی سوراخِ گلخن پر

۳ زہے تسلیم زیرِ تیغ بھی تڑپے نہ اس ڈر سے — مبادا چھینٹ لوہو کی پڑے قاتل کے دامن پر

۴ نہ چھوڑا آرزو کا ایک دانہ بھی جو پھر تو نے — گری بجلی کہاں سو ایسی اپنے آہ خرمن پر

۵ رضا لشکرِ جگر کا غم نہ رو چپ رہ کہ ہم کو بھی — ہے اپنے دل کا ماتم یاد آتا تیرے شیون پر

۱ پھر نظر دیکھیں گے ہم اُس کو بلا جانان اگر ۱۴۱ دیویں گے رونے سے فرصت دیدۂ گریاں اگر

۲ حشر میں انصاف تو ہوگا و لیکن اس کو دیکھ — حال اپنا کہہ سکے گا عاشقِ حیراں اگر

۳ اے مسلماناں کریں گے ہم سلام اُس دم تمھیں — آ گیا ایدھر کو وہ غارت گرِ ایماں اگر

۴ دل کو کرتے ہو تو قطع کیجیے اس غم سے — عشق کے آغاز کا ہوتا کہیں پایاں اگر

۵ اے رضا وعدہ ہے اُس کے آج کیوں ہوتا خراب — کل ہی کر لیتا وفا کا اُس کی تو پیماں اگر

۱ رضا اس آہ و فغاں سے تو جائے مر بہتر ۱۴۲ فسانۂ غمِ دل دار مختصر بہتر

۲ کبھی یہ کاوشِ غم اے اپنے جی سے گئی — خراب تر ہوا دل گر ہوا جگر بہتر

۳ جو چشم و دل نہ رہیں اختیار میں اپنے — دل ایسا خوب ہے بہتر و چشم تر بہتر

۱ چاندنی ہے آگ سی اے ماہ ہمارے تجھ بغیر ۱۴۳ لگتے ہیں اخگر سے آنکھوں میں ستارے تجھ بغیر

۲ حسرتوں سے دل کی اپنا جلد جی نکلا نہیں — دیر گر مرنے میں تھی لاچار پیارے تجھ بغیر

۱ ہاتھ اُس کے نہ آیا دامنِ ناز ۱۴۴ عشق کو سنتے ہی تھے دست دراز

۲ بیت ابرو ہے مخزنِ اسرار — خط ہے چہرے کا شرحِ گلشنِ راز

۳ دیکھ کر چشم خونِ دل رونا — کہیں افشا نہ ہو کسی کا راز

۴ کیوں نہ بدنام ہوں جہان میں میں — دل ہے بدخواہ چشم ہے غمّاز

۵ ایک دل کے لیے یہ فوج کشی — عشوہ و ناز غمزہ و انداز

۶ جب بلاتا ایاز کو محمود — کچھ نہ کہتا سوائے بندہ نواز

۷ جب تک اُس سے نیاز دل کے کہوں — نہیں پڑھنے کا اے رضا میں نماز

۱ بجھ گیا دل غم سے اور خو اُس کی سرکش ہے ہنوز ۱۴۵ جل گیا یہ گھاس اور وہ شعلہ سرکش ہے ہنوز

مر گئے تو بھی گیا جی سے نہ زلفوں کا خیال — گور میں بھی آہ اس دل پر کشاکش ہے ہنوز ۲
ناخوشی تیری سے رضا کی بر کے آہ — تو خوش آمد سے رقیبوں کی ہے میاں خوش ہنوز ۳

مری خبر نہیں تجھ کو ستم شعار افسوس ۱۴۶ — کرے گا پھر تو پشیماں ہو بار بار افسوس ۱
خدا نہ کردہ ہوں شاکی ہجوم غم کا ترے — میں اپنی تنگ دلی پر کروں ہوں یار افسوس ۲
اُسے تو دل پر مرے داغ کا خیال نہیں — بہار پر نہیں آتی یہ لالہ زار افسوس ۳
غبار آگیا آنکھوں میں راہ تکنے سے — پر اُس کی راہ کا پایا نہیں غبار افسوس ۴
چمن کی سیر سے اُس بن شگفتگی معلوم — پر اسا ہی بناؤ بجا ہی ہے بہار افسوس ۵
حریف خوب ملا تھا وہ طفل بازی گوش — پہ عشق بازی میں ہے سخت بد قمار افسوس ۶
کیا ہے ایسا مجھے بتا سے نو میدی ق — ہزار حیف ہے اے عشق اور ہزار افسوس ۷
کہ میرے جانے پر آتا ہے اضطراب کو حیف — کرے ہے رہنے پہ وعدے کے انتظار افسوس ۸
مگر طبیب نے میرے دیا جواب رضا — کریں ہیں آج پرستار بار بار افسوس ۹

دم ہے آتا دیر دیر اور نکلے ہے کم کم نفس ۱۴۷ — جی کی کچھ کہتے جو پاتے اپنے کوئی ہم نفس ۱
ایک دم آرام سے گزرے تو ممکن یہ نہیں — کہہ کے آئے ہم رہاں یہ ہم سے آخر دم نفس ۲
کیا کہیں اب ناتوانی سے بہ قول اپنے رضا — "دم ہے آتا دیر دیر اور نکلے ہے کم کم نفس" ۳

فسوں تیرا کرے گا مختلط سیماب اور آتش ۱۴۸ — کہ لب پر تیرے یک جا جلوہ گر ہے آب اور آتش ۱
مجھے ہر دم کی اشک و آہ سے دل کی بہت ڈر ہے — جلا دیویں مبادا میرے تئیں یہ آب اور آتش ۲
بہت سا میں نے ٹھہرایا نہ ٹھہری یک نفس ہرگز — نگاہ اپنی ترا چہرہ ہے جوں سیماب اور آتش ۳
نہ کہہ اے زاہد کج فہم خون از ہے شیشے میں — مغاں کے خلق سے باہم ہیں آب اور آتش ۴
جب آیا عشق دل میں صبر کو لازم ہوا جانا — نہیں رہ سکتے ہیں باہم کہیں سیماب اور آتش ۵
تو اشک گرم مت آنکھوں میں اپنی جا نہ ہرگز — کیا ہے عشق نے صنعت سے یک جا آب اور آتش ۶
اُسے جب دیکھتا ہوں آپ سے جاتا رہوں ہوں ہائے — مقابل کس طرح ہو کر رہیں سیماب اور آتش ۷
تری نیرنگی نے یک رنگ کر آدم کو دکھلایا — جو چاروں مختلف تھے باد اور خاک آب اور آتش ۸
لیا کھینچ اپنا زانو ہائے کس نے ہم نشیں سچ کہہ — کہ اب سر میرا اور بالیں ہے جوں سیماب اور آتش ۹
کسی کو اشک و آہ اپنی پہ رحم آتا نہیں ذرہ — الٰہی شہر بیداد وں کو لیوے آب اور آتش ۱۰

۱۱ گیا جو کوچے سے تیرے گیا وہ سا عالم سے — مثل عاشق کی پھر دنیا سے ہو سیماب اور آتش

۱۲ سلوکِ غم ہمارے دل کو مت پوچھو تم اے یارو — کبھی دیکھا تو ہوگا تم نے ملتے آب اور آتش

۱۳ اٹھا مت برقع اپنے منہ سے آگے بے قرار دل کے — مری جاں اور تری صورت ہو جوں سیماب اور آتش

۱۴ کوئی سیراب عشرت سے کوئی جلتا ہو حسرت سے — مگر ظالم تری تروار میں ہو آب اور آتش

۱۵ رضا دو قافیے پر میں لکھی ساری غزل آخر — کہیں ہو آب اور آتش کہیں سیماب آتش

۱ دل شکستہ کو ہو اب شراب کی خواہش — (۱۴۹) کہاں تلک نہ ہو زخمی کو آب کی خواہش

۲ میں کیا کروں گا ہوا دل بھی جل کے اب جھسمنت — اگر کرے وہ شرابی کباب کی خواہش

۳ رضا کو تری خوشی سب طرح سے ہو منظور — نہ غم عذاب کا ہو نہ ثواب کی خواہش

۱ ہوتے ہیں جب شراب سے مستانہ وقت رقص — (۱۵۰) کیا کیا ادا بتاتے ہیں جانانہ وقت رقص

۲ طاؤس اپنی شورش مستی کو بھول جائے — دیکھے اگر وہ جلوۂ مستانہ وقت رقص

۱ چشم سے تیری برآئی جو تھی آفت کی غرض — (۱۵۱) تیرے قامت سے ہوئی حاصل قیامت کی غرض

۲ جان نے بھی کر دیا مطلب وفا کا سب تمام — دل ہی نے میرے نہ کی پوری محبت کی غرض

۱ ہو روشنی بزم مری بے خطر اے شمع — (۱۵۲) پروانگی مجھ کو نہیں تھا یاں پر اے شمع

۲ پروانے کو تو شام ہی کو تو نے جلایا — کچھ اپنی سحر کی بھی تجھے ہے خبر اے شمع

۳ یہ سچ ہے کہ چہرہ ترا چندا ہے ولیکن — پھر کس لیے رکھتا ہو لگن چشم تر اے شمع

۴ یوں صبح کے تئیں اپنی کیا شام رضا نے — جس طرح تری شام ہوئی سحر اے شمع

۱ دل میں اب باقی نہیں ہے جائے داغ — (۱۵۳) ہیں لگے از بس داغ بر بالائے داغ

۲ لالے کو اک داغ تازہ اور ہو — دل کا اپنے گر رضا دکھلائے داغ

۱ ہم اپنی دینے میں تم کو کریں نہ جان دریغ — (۱۵۴) تم ایک بوسہ نہیں دیتے مہربان دریغ

۲ تجھے نہ جانا کبھی تو نے اپنا دشمن بھی — دریغ میری محبت ترا گمان دریغ

۱ ذرا تو ناز کرے شوخ بے وفا موقوف — (۱۵۵) نیاز فرض ہو اب ملنا ہو گیا موقوف

۲ ترا تو اب کہیں مطلب کھلا کہ مرنے عشق — کیا تھا پہلے ہی سے اپنا مدعا موقوف

۳ حساب میں بھلا دیکھیں زیادہ نکلے کون — خطا نہ کم کریں ہم اور نہ تو عطا موقوف

۴ کبھی جو بات نہ کہتا تھا اس نے دی گالی — اثر جو دیکھا نہ کچھ ہم نے کی دعا موقوف

یہ عقل ہے کہ خدائی اُسے ملے لیکن — بتوں کا عشق کرے اب بھی گر رضا موقوف ۵

کیا درد ہے عشق کا مخالف ۱۵۶ ہے اس کی سبھی دوا مخالف ۱
کیوں کر ملے مجھ سے یار ہنس کے — آپس میں شہہ و گدا مخالف ۲

شورِ بلبل ہے فغانِ دلِ زارِ عاشق ۱۵۷ سر گریبان میں کرتا ہے بہارِ عاشق ۱
دیکھ کیدھر گیا ٹک قول و قرار اپنے کو کیا ہوا پوچھ نہ کچھ صبر و قرارِ عاشق ۲
جن نے عالم میں فنا ہی کے ...... کچھ نہ لے اہل جہاں پوچھو دیارِ عاشق ۳
داغِ دل گنتا ہوں گہہ گاہ فلک کے تارے ہے شبِ ہجر تری روز شمارِ عاشق ۴
ہاتھ سے دیدۂ ترکے مری حالت مت پوچھ بحرِ عمّاں کا کنارہ ہے کنارِ عاشق ۵
پہلے ٹک قلب دل بوالہوساں ہاتھ میں لے ہوگا ظاہر تجھے تب صاف عیارِ عاشق ۶
خاک پر گو کہ ہماری نہ رکھے کوئی چراغ ہوتا ہے داغ جگر شمع مزارِ عاشق ۷
دوستو ہم سفری مجھ سے نہ چاہو ہرگز کہ سرِ راہِ فنا پر ہے گذارِ عاشق ۸
ہر گھڑی آنے پہ مت جا تو رضا کے اے شوخ — بے قراری ہوئی لازم شعارِ عاشق ۹

گنتے ہی ہوئے گھڑیاں دن کرتے ہیں عاشق ۱۵۸ تھی کون گھڑی یارب ہم ہوگئے جب عاشق ۱
جوں نقش قدم در پر بیٹھا جو رضا اُس کے — اے خاک ترے سرپہ آرام طلب عاشق ۲

عجب نصیب ہیں اپنے اگر ہو یار موافق ۱۵۹ تو ایک دم نہیں رہتا ہے روزگار موافق ۱
چمن میں چاک جگر گل ہیں نالہ زن سبھی بلبل — ہوا کسی کو نہیں تیری اے بہار موافق ۲

ایک ہے تجھ پیرہن میں یوسف چالاک چاک ۱۶۰ دیکھنا دل کو زلیخا کے کہ ہو سب چاک چاک ۱
اپنا تو مُنہ بند کر سکتا نہیں ہے ناصحا مجھ گریباں کا سیا جائے گا تجھ سے خاک چاک ۲
گر گریباں کو ادھر تار نگہہ سے سیجیے — دل کو کرتا ہے اُدھر وہ غمزۂ بے باک چاک ۳

گو نہ ہوا دسترس یار کے داماں تلک ۱۶۱ کاش پہنچے یہ ہاتھ اپنے گریباں تلک ۱
کس کی پڑی در کی خاک دیدۂ گریاں میں آ اشک جو آتا نہیں اب سرِ مژگاں تلک ۲
وصل ہی کے دن مرے قتل کے درپے ہو رشک زیست کی کس کو اُمید ہے شبِ ہجراں تلک ۳
کہیو رضا مر گیا جو ہیں قفس میں گیا — گر ہو گذر اے صبا تیرا گلستاں تلک ۴

پہنچی ہے ناتوانی مری اب یہاں تلک ۱۶۲ نکلے ہے جان حرف جو لاؤں زباں تلک ۱

۲ تھا میرؔ تیر نالہ کا غل لامکاں تلک　　آگے خدا ہی جانے کہ گزرا کہاں تلک
۳ ظاہر کرے گا سب مری افتادگی کا حال　　جس کو رسائی ہوگی ترے آستاں تلک
۴ کیجے جفا کسی پہ تو اک حد سے کیجیے　　طاقت وفا کی دیکھیے ظالم جہاں تلک
۵ ہم ہی سنے تو ہم کو بھی کچھ اس میں سود ہے　　راضی جو تم ہمارے ہو جی کے زیاں تلک
۶ اک بار ہنس تو مجھ سے بھی آگے رقیب کے　　رکھتا ہے وہ خوشی تری دیکھو کہاں تلک
۷ سو بار اُن کو کہہ چکے باز آؤ عشق سے　　ق　اس میں خرابی آئے ہو جائے ہو جاں تلک
۸ مجنوں کا بھی فسانہ سنایا اُنھیں تمام　　فرہاد کا بھی قصہ کہا تھا جہاں تلک
۹ وے تو کسی طرح سے نہیں مانتے ہیں آہ　　— سمجھائے کوئی میر رضا کو کہاں تلک

۱ دکھلا چکی یاں تک تو مری جلوہ گری رنگ　　۱۶۳　آنکھوں سے نکلتے ہیں اب اشکِ جگری رنگ
۲ تک ہونے دے جارو بِ درِ مے کدہ کی خاک　　پھر دیکھنا ہے یہ ترا آبِ خضری رنگ
۳ اُس سروِ خراماں کو زرا آنے دے باہر　　تب دیکھیں گے جلوے کا ترے کبک دری رنگ
۴ وابستہ مرے دم سے ترا راز ہے ورنہ　　دکھلائے گی ظالم یہ مری جاں سپری رنگ
۵ اے شیخ تجھے دیو ریا کا جو نہ لگتا　　اپنا بھی دکھاتی مرے شیشے کی پری رنگ
۶ بس دیکھ چکے نالۂ شب تیرا تو جلوہ　　اب دیکھیے کیا کرتی ہے آہ سحری رنگ
۷ مل منہ میں رضا خاک ہم اُس کوچے کی مر گئے　　— عاشق یوہیں کرتے ہیں لباس سفری رنگ

۱ تجھ سے یوں مل گیا ہمارا دل　　۱۶۴　ہم سے نا آشنا تھا گویا دل
۲ جیسا خانہ خراب مجھ کو کیا　　گھر ہو ایسا خراب تیرا دل
۳ تم تو پاؤں اپنے سُرخ کر بیٹھے　　گو کہ پامال ہو کسی کا دل
۴ دشمن اک عالم اس کا کیوں ہوتا　　بات گر دوستوں کی سنتا دل
۵ مارو اغیار کا گلہ اک طرف　　دشمن اپنی بغل میں ہے گا دل
۶ کیوں نہ کہنے تھے بات ہماری سن　　ویسی ہی اب تو تو نے دیکھا دل
۷ آہیں ایسی بھریں رضا نے رات　　— جس سے گھبرا گیا ہمارا دل

۱ ہائے وہ دل جسے سب کہتے تھے افلاک کے مول　　۱۶۵　دولتِ عشق سے بکتا نہیں اب خاک کے مول
۲ جامِ جمشید کہاں جامِ مئے ناب کہاں　　آب حیواں ہی نہیں مے کدے کی خاک کے مول

بس کہ زلفوں کے بنانے کا اُسے سودا ہے — شانے کو لیتے ہیں اب ہم دل صد چاک کے مول ۳
خوں چکاں لاش نہیں کیو نکہ لگاتے صیاد — یعنی یہہ صید نہیں اُس کی ہی فتراک کے مول ۴

نہ نامہ بھیج سکتے ہیں نہ پیغام زبانی ہم ۱۶۶ کریں کس سے تری فریاد لے رازِ نہانی ہم ۱
یہ کس کے عشق کا شعلہ ہے بھڑکا تن بدن میں آ کے جلے آب ریزی کرتے ہیں روغن فشانی ہم ۲
نہیں آتا سبھی پر جھوٹ ہی کہیے کہ آئے گا کریں بے توقع صرف کیوں کر زندگانی ہم ۳
سبک سب کی نظر میں ہو گئے ہیں خاک ساری سے رکھیں ہیں آتش پر بھی تھے دل میں گرانی ہم ۴
غم ہجراں میں مرنے کی نہیں حسرت پہ یہہ غم ہے کہ اُس کے روبرو کرنے نہ پائے جاں فشانی ہم ۵
نہ سمجھے تھے کہ ہوگی حسب حال آخر کو اپنے ہی نہایت شوق سے سنتے تھے مجنوں کی کہانی ہم ۶
اب آیا وقت پیری کا ذرا تو رحم کر ظالم کہ صرف درد و غم تو کر چکے ساری جوانی ہم ۷
گرے جو اُس گلی میں تھے نہ اُٹھے نقش پا کی طرح کریں اب کس زباں سے شکر تیرا ناتوانی ہم ۸
رضا یاروں میں معنی رس نظر آتا نہیں کوئی — ضیا استاد کے آگے کریں اب شعر خوانی ہم ۹

دیکھیں ہماری ہوتی ہے کب شام غم تمام ۱۶۷ پروانے کا تو قصہ ہوا صبح دم تمام ۱
وعدے کی رات آئے ہے وہ حیلہ جو کبھی یعنی کہ اس ہی شوق میں ہو جائیں ہم تمام ۲
رندوں کے ہو جیے متعرض نہ شیخ جی جائے نکل مباد تمہارا بھرم تمام ۳
بندہ وہی خدا کا ہے جو بندگی کرے ورنہ یہی زمانے میں عبد الصنم تمام ۴
وہ تو بلاکشوں کو کہیں ہیں رکھے ہے دوست — میرے ہی ہو نصیب رضا درد و غم تمام ۵

جوں شرر ہستی میں کہنے کو تو یاں آتے ہیں ہم ۱۶۸ کھولتے ہی آنکھ کے پھر راکھ ہو جاتے ہیں ہم ۱
کس طرف ہے گھر ترا اے عشق بتلا دے ہمیں نہ تجھے کعبے میں نہ بتخانے میں پاتے ہیں ہم ۲
جب سے مہمان غم کے ہیں ہم کیا کہیں اپنی معاش خونِ دل پیتے ہیں اور لخت جگر کھاتے ہیں ہم ۳
دوستو ٹک اُس ستم گر کو نصیحت تو کرو — یہہ دوانا ہے رضا اب اس کو سمجھاتے ہیں ہم ۴

وسعت مشرب سے ہیں ہر نیک و بد کے یار ہم ۱۶۹ گاہ تار سبحہ ہیں گہہ رشتۂ زنار ہم ۱
کیا طبیبوں سے کہیں ہم حال اپنے درد کا نرگس بیمار تیری دیکھ ہوئے بیمار ہم ۲
چشم گریاں، سینہ بریاں، دل تپاں، غیرت کی آہ اٹھ چلے جوں شمع تیری بزم سے لے یار ہم ۳
شمع و گل تو ہم نہیں پہ زخم داغوں سے ترے روشنی بزم ہیں اور رونق گلزار ہم ۴

۵ تیغ ابرو ہر طرف اپنی دکھاتے ہو میاں — ہیں سپاہی ہم بھی دیکھیں آپ کی تروار ہم
۶ کم کریں گے آہ و نالہ تیری خاطر سے رضا — چشم ترسے یک ہیں لے مہرباں لاچار ہم

۱۷۰
۱ آخر تو میاں تجھ سے ہو نومید چلے ہم — آجا کہ ذرا دل میں ترے لگ کے گلے ہم
۲ کیا اشک سے اور آہ سے اپنا کہیں احوال — اس آب میں ڈوبے اور اس آتش میں جلے ہم
۳ کیا ہم کو سناتے ہو کر کل جاؤں گا میں آہ — ہے دیر بہت کل میں لو یاں آج ہی چلے ہم
۴ سینہ ہے سبھی داغ، جگر زخم ہے سارا — اے عشق ترے ہاتھ سے کیا پھولے پھلے ہم
۵ کیا سوختگی آہ رضا دل میں ہے تیرے — سننے سے ترے حال کے جاتے ہیں جلے ہم

۱۷۱
۱ اثر گر ایک پاتے نالہ سو بنیاد کرتے ہم — جو ملتا سننے والا کوئی تو فریاد کرتے ہم
۲ رضا اب کیا کیجے کہ آنسو بھی نہیں آتے — کبھی رو رو دلِ ناشاد کو بھی شاد کرتے ہم

۱۷۲
۱ اے بت ناآشنا کب تجھ سے بیگانے ہیں ہم — تو اگر اس بزم میں ہے شمع تو پروانے ہیں ہم
۲ بوسہ لیویں یا گلے لگ جائیں آزردہ نہ ہو — چاہنے والے ہیں اور دیوانے مستانے ہیں ہم
۳ کب الم اور حسرتیں اپنی کہیں اے دوستاں — رات کو بلبل ہیں ہم اور دن کو پروانے ہیں ہم
۴ گھورنے سے کیا تمھاری آنکھوں کے ہم ڈر گئے — مے اگر ہیں مست اے پیارے تو دیوانے ہیں ہم
۵ اے رضا ہم مل گئے اس سے گلے پی کر شراب — گو ہیں دیوانے پر اپنے کام کے سیانے ہیں ہم

۱۷۳
۱ گرچہ ہیں لاچار اپنے اس دلِ مضطر سے ہم — پر جو کچھ ہونی ہو ہو جاتے ہیں تیرے ڈر سے ہم
۲ بے وفا دست ستم اپنا ذرا موقوف رکھ — داغ سینے کے مقابل کر لیں ٹک اختر سے ہم
۳ کیا کہیں سوزِ دروں سے پہنچے ہیں اس حال کو — واسطے تسکین کے اب بدلیں ہیں دل اخگر سے ہم
۴ اس کے صاحب خانہ کے اب دیکھنے کا شوق ہو — کعبے کو ماہیں پاتے ہیں تیرے گھر سے ہم
۵ جب میں روکی راہ غصے ہو یہ کہہ کر پھر گیا — کم نکلتے ہیں اسی باعث رضا اب گھر سے ہم

۱۷۴
۱ ہر نفس موردِ سفر ہیں ہم — گویا دکانِ شیشہ گر ہیں ہم
۲ شمع کے گاہ تاج سر میں ہم — گہہ پتنگے کے بال و پر ہیں ہم
۳ عشق نے جب سے کی ہے دل گرمی — برق ہیں شعلہ ہیں شرر ہیں ہم
۴ رنگ رخسار خوب رویاں ہیں — آہ عشاق کے اثر ہیں ہم
۵ ہم ہیں نیرنگی بہار کے رنگ — نخل و برگ و گل و ثمر ہیں ہم

سجدہ گہہ ہیں تمام عالم کی — کس کی یہہ خاک رہ گذر ہیں ہم ۶
اہل دل اپنے لیتے ہیں مشتاق — گویا وصل کی خبر ہیں ہم ۷
حال خطِ شکستہ میں لکھا — یعنی اس سے شکستہ تر ہیں ہم ۸
دشمنی ہم سے ہو نہیں سکتی — تجھ سے شرمندہ کینہ ور ہیں ہم ۹
جب سے دیکھی ہے اُس کے گھر کی راہ — اور حسانہ خراب تر ہیں ہم ۱۰
رشک میں شور و شر سے ہیں لاچار — کچھ فرشتے نہیں بشر ہیں ہم ۱۱
اُس نے احوال پوچھا ہم مر گئے — کس قدر قصۂ مختصر ہیں ہم ۱۲
کیا کریں دل نہیں ہے پاس رضا — صبر میں ورنہ بے جگر ہیں ہم ۱۳

اب تو تم بھی جواں ہوئے ہو دیکھیں گے دل کو بچاؤ گے تم ۱۷۵ دل جو گیا ہم چشم کوئی پھر آنکھ اُسی سے لڑاؤ گے تم ۱
اب جو ہم تم سے کہتے ہیں تم بھی کسی سے کروگے وہی — ہم سے تمہارا سلوک ہو جیسا ویسا ہی بدلا پاؤگے تم ۲
بے تابی سے کروگے کیا کیا نکلی کسی کی مجلس میں — آؤگے تم بیٹھوگے تم پھر آؤگے تم اٹھ جاؤگے تم ۳
رعشہ تھی زباں میں لکنت پاؤں بیڑی ٹھہراوینگے — مُنہ سے کچھ کا کچھ نکلے گا دل میں جو ٹھہراؤگے تم ۴
وہ تمہاری سیکھ تمھیں سے بات میں بات نکالے گا — میری صورت اپنا سا منہ تاک کے پھر رہ جاؤگے تم ۵
نام کو دانہ دو دو دن تک میری طرح دیکھوگے نہیں — جب میں بہت سمجھاؤں گا تو تھوڑا سا کھانا کھاؤگے تم ۶
نئی نئی چوٹیں کھا کھا کر جب بے کل ہو ہو جاؤگے — مجھ کو ہمدرد اپنا سمجھ کہنے کو غم کے آؤگے تم ۷
ہر ہر بات میں رو رو کے گھبرا گھبرا کر بولوگے — کیسے غریب غریب سے ہو کر دل کی باتیں سناؤگے تم ۸
میرے حالی شعروں کے مضمون بہت یاد آئیں گے — دس دس بار ایک ایک غزل کو مجھ سے پھر پڑھواؤگے تم ۹
ہم نے ویسا آئینہ دے کر ہیں دکھلاہے — یہہ تو کہو معشوق کو اپنے ہم کو بھی دکھلاؤگے تم ۱۰
دل میں تم اپنے مت لانا جیتے رہے گر میر رضا — دے دل اُس کا ہاتھ میں لے کے جیسے دل کو لگاؤ تم ۱۱

رہیں ہیں دل لگا پرواز مرغ نامہ پر ہم ۱۷۶ نہ کہہ اے شیخ کافر رکھتے ہیں دین پیمبر ہم ۱
پیام دوست ہے ایک ہی جدا گو اصطلاحیں ہوں — جسے لکھتے ہیں جبریل اہل دل اُس کو کبوتر ہم ۲

سینہ نشانہ گاہِ تیر و سناں کریں ہم ۱۷۷ اس دل کے ہاتھ کیوں کر خاطر نشاں کریں ہم ۱
گرد کر غم سے اب کے بچ جائیں یا الہٰی — کافر ہوں گر کبھی پھر عشق بتاں کریں ہم ۲
کب گل کو درد آیا نالے پہ بلبلوں کے — کیا اس کے بھاؤں ہر چند آہ و فغاں کریں ہم ۳

۴ ہر دم کہو ہو کس کا بیمار عشق ہے تو — بے شرط درد اپنا پیارے بیاں کریں ہم

۵ کہہ اے رضا تو ہم کو کیا ہوئے گا شرمگانی — اس بے وفا کو تجھ پر گر مہرباں کریں ہم

۱۷۸

۱ نہ کھلا ہوں لالہ ساں نہ مثل گل خندیدہ ہوں — باغ میں دنیا کے میں تو بلبل نالیدہ ہوں

۲ کیا الم اور حسرتیں اپنی کہوں اے دوستاں — ہجر کا کشتہ ہوں میں اور وصل کا نادیدہ ہوں

۳ گھر پہ تو ہے کہاں میں تیری خاطر جوں صبا — کو بہ کو خانہ بہ خانہ در بہ در گردیدہ ہوں

۴ رو ہوں نہ غازہ ملا نہ ہاتھ ہوں مہندی بھرا — مثل مرجاں آپ ہی اپنے خون میں غلطیدہ ہوں

۵ نہ ابلنا بحر کا دیکھا ہے نہ جوشش تنور — اپنے ہی آنکھوں کے اشکوں سے میں طوفاں دیدہ ہوں

۶ آرزو کیا جانے کیا تجھ سے ہے اس کے دل تئیں — دو جہاں سے ورنہ میں داماں خواہش چیدہ ہوں

۷ داغ دل زخمی جگر سینہ مشبک چشم تر — ہر طرح سے تجھ سے میں اے عشق آفت دیدہ ہوں

۸ عشق کا نام و نشاں عنواں پہ ہو میرے رضا — میں کسی کے دل کا شاید نامۂ پیچیدہ ہوں

۱۷۹

۱ دل کا لینا تمہیں اے یار جو منظور نہیں — پھیر دو جلد کہ سودے کا یہ دستور نہیں

۲ دست شفقت نہ اٹھایاں سو نہیں جائے ہراس — دل صد چاک ہے یہہ خانۂ زنبور نہیں

۳ اک ہمیں مے کدۂ دہر سے ناکام رہے — ورنہ یاں کون ہو جو اس بادہ سے مخمور نہیں

۴ لے گئے بھر کے سبو بحر جہاں سے سب ہائے — اک ہمارا ہی پیالہ ہے کہ معمور نہیں

۵ تیری فرقت میں وہ حالت ہے مرے دل کی آہ — ق — نامے کو لکھنے کا جس کے ذرا مقدور نہیں

۶ کون سا روز ہے جو وہ نہیں ہے حشر کا دن — کون سی رات ہے جو ہجر میں دیجور نہیں

۷ نک سمجھ کر کے رضا جام محبت پیجو — یہہ مے عشق ہے ظالم مے انگور نہیں

۱۸۰

۱ تنہا گھر ہی کا سرخ یہ دیوار و در نہیں — اس چشم خوں فشاں سے گلستاں کدھر نہیں

۲ قاصد نہ کہہ کہ ان نے خبر بھی نہ پوچھی ہائے — اتنا بھی میرے حال سے وہ بے خبر نہیں

۳ دل کو تو جوں توں کر کے میں سمجھایا ناصحو — بن دیکھے اس کے مانتی یہہ چشم تر نہیں

۴ روشن ہمارے گھر کو کر اے شمع بزم حسن — خوش رہ کہ ہے پتنگے کے تئیں بال و پر نہیں

۵ قسمت تو دیکھ اپنے نصیبوں میں ہے ملا — اک نالہ ہائے اس میں ذرا بھی اثر نہیں

۶ میں نے کہا رضا سے کہ اے بے شعور ہائے — ق — کچھ بھی تجھے تو حال پر اپنے نظر نہیں

۷ یہہ وضع کیسی ہو گی کہاں کا یہہ طور ہے — جب آ کے تجھ کو دیکھتے ہیں اپنے گھر نہیں

ں کوچے میں گزرتے ہیں اُس کی زبانؔ   تجھ ذکر کے سوا کوئی حرفِ دگر نہیں ٨
ی کہے ہے اس کو تو سودے کا زور ہے   فساد شہر میں نہیں یا نیشتر نہیں ٩
اہو کوئی یہ مرض صرع کا ہوا   شر یانوں کی جو اس کو ذرا بھی خبر نہیں ١٠
لی کہے ہے کوئی کوئی کہتا ہے سڑی   کوئی کہے ہو عقل کا اس میں اثر نہیں ١١
کون دن کہ آہوں سے تیری نہیں ہے شام   وہ کون شب کہ نالوں سے روزِ حشر نہیں ١٢
بہات ہاتھ ملتا ہی رہتا ہے رات دن   رسوائی کا تجھے میاں کچھ اپنی ڈر نہیں ١٣
سن کے آہ بھر کے تب اُس نے پڑھا یہ شعر   جس سے غرض رہی مجھے تاب جگر نہیں ١٤
وس و ننگ ہوش خرد جان و دین و دل —   سب جاؤ اپنے پاس سے وہ ہی اگر نہیں ١٥
چار ہوں جو عرض غم بے کراں کروں ١٨١ ہر چند شکوہ ہوتا ہے لے بد زباں زبوں ١
وانگاں کی بات کے مت پڑ خیال میں   ہے اُس کی فہم ٢
تی ہو ناتوانی مری مثل نقش پا   ہر اک قدم پہ اب یہیں لے ہم رہاں رہوں ٣
ب دن فغاں اٹھے گا یہ سمجھے تھے ہم تبھی   کرتے تھے پیارے عہد میں جب تم افغاں اُغل ٤
ب کہہ تو کیا کروں میں یہ قولِ حسن رضا —   سن سن وہ میرا حال کہے ہو نہ ہاں نہ ہوں ٥
داب میں صورت خیال آ کر دکھاتا ہے ہمیں ١٨٢ جاگتے ہیں بخت تب جب خواب آتا ہی ہمیں ١
و بدار رہتا ہے تا مر جائیں ہم غم سے کہیں   اور ہمیں ہر یہہ خوشی یار آزماتا ہے ہمیں ٢
رضا اک بار ہو غیر اُس کے ہنسنے کے لیے   سو طرح کی ناخوشی کر کے رلاتا ہے ہمیں ٣
تو چپ بیٹھا ہے ہم کیوں کر چھپائیں اپنے تئیں   نام تیرا جو کوئی لیتا ہے پاتا ہے ہمیں ٤
رے کوچے میں کبھی آ کر جو ہو جاتے ہیں ہم   کعبے کے باشندوں پر افسوس آتا ہمیں ٥
رے بے غیرت نہیں ہم سے رضا معذور رکھ —   غیر سے ملنے کی اُس کے کیوں سناتا ہے ہمیں ٦
ں سوائے سوزِ دل جوں شمع کچھ کہتا نہیں ١٨٣ قیس پہ بھی سر کاٹنے بن یار تو رہتا نہیں ١
سو کہتے جو ہو بن دیکھے اُس کے نک تو رہ   میں تو رہ بھی جاؤں لیکن آہ دل رہتا نہیں ٢
ت نیا فتنہ ہی مجھ پر ایک اٹھتا ہے فلک   کون دن جو جس میں میں اُس کا ستم سہتا نہیں ٣
بے خبر جلدی رضا سینے میں دل کو کیا ہوا —   اشکِ سرخ آنکھوں سے تیری ان دنوں بہتا نہیں ٤
صبر کرنا دل اگر ہوئے تو مشکل بھی نہیں ١٨٤ یہہ بڑی مشکل ہے اپنے پاس اب دل بھی نہیں ١

۲ ہے تعجب بوالہوس سے تم کرو ہو اختلاط — وہ کسی کے پاس بٹھلانے کے بھی قابل نہیں
۲ کون ہے یاں ہم سوا اب جو دل جلوں کا ساتھ دے — اس قدر سوز و تپش میں شمع محفل بھی نہیں
۴ کیا ہوا تیرا رضا ننگ اور گئی غیرت کدھر — کیوں خراب اُس پر ہے تو وہ تیرا مائل بھی نہیں
۱ جام دو اوروں کو بھر اس طرف خالی بھی نہیں ۱۸۵ غیر کو بوسہ ملے اور ہم کو گالی بھی نہیں
۲ کیا کہیں اپنی سیہ بختی ہی کا اندھیر ہے — ورنہ سب کی ہجر کی رات ایسی کالی بھی نہیں
۲ ہو چلا بسمل رضا آگے ہی تو تو اور ابھی — میان سے تروار قاتل نے نکالی بھی نہیں
۱ کب تلک ہر دم کے آنے جانے سے مضطر رہیں ۱۸۶ اب یہی بہتر ہے اُس کے در ہی پر ہم مر رہیں
۲ ہم سوا سب چھوٹے اے صیاد کیا انصاف ہے — موسم گل میں بندھے اپنے ہی بال و پر رہیں
۳ آب خنجر ہی سے اُس کی یاں ہوئے سیراب ہم — بس اُدھر اے شیخ میرے زمزم و کوثر رہیں
۴ ٹک تو آ جا امتحاں پر خنجر بیداد کھینچ — بوالہوس سب جانتے ہیں عاشقوں کی قدر ہیں
۵ دیکھی بس تاثیر تیری ہم نے اے گرمی عشق — اشک اپنے واں ہوں پانی اور یہاں اخگر رہیں
۶ قیس نے گھیرا ہے جنگل کوہ کن نے کوہ کو — ہم دوانے اے رضا اب کس طرف جا کر رہیں
۱ ٹک بیٹھ تو اے شوخ دل آرام بغل میں ۱۸۷ آئے ہیں اس دل کو بھی آرام بغل میں
۲ کیوں کر کے نہ گلخن کی طرح آہ جلیں ہم — اک آگ ہے یاں جس کا ہے دل نام بغل میں
۳ سر رکھ کے گریباں میں کر سیر جہاں کی — آئینہ ترے جیب میں ہے جام بغل میں
۴ کس طرح رضا تو نہ ہو رسوائے زمانہ — جب دل سا ترے بیٹھا ہو بدنام بغل میں
۱ نہ کعبہ ہے یہاں میرے نہ ہے بت خانہ پہلو میں ۱۸۸ لیا کس گھر بسے نے آہ آ کر جا نہ پہلو میں
۲ فقط دل ہی سمجھ کر عشق دل کو آگ مت دیجو — کسی کے غم کا بھی ظالم ہے یاں کاشانہ پہلو میں
۳ ترے اک جانے سو اے دل کہوں کیا آہ اب میرے — تپش اور درد اور بے تابی ہے کیا کیا نہ پہلو میں
۴ خبر کس کی سُنی ہے کل یہاں سے آہ جانے کی — تڑپتا ہے مرا دل آج بے تابانہ پہلو میں
۵ کسی کے عشق کی باتیں رضا آہستہ ٹک کہنا — کہ دل سو دشمن جانی کا ہے گا خانہ پہلو میں
۱ نہ تجھی بدگماں سے بگڑے ہیں ۱۸۹ ہم تو سارے جہاں سے بگڑے ہیں
۲ آپ آئے بھی خواب میں میرے — کس لیے پاسباں سے بگڑے ہیں
۳ ہم سے بگڑا ہے گر یہ میر رضا — ہم بھی اس آسماں سے بگڑے ہیں

ہم آشنا ہی سمجھے ہیں اس زندگی میں	۱۹۰	عجب صاحبی ہے تری بندگی میں	۱
کہے ہے یہی آمد و شد نفس کی		نہ دیکھا کسی کو بھی پایندگی میں	۲
رضا کو بھلا کیا خدائی سے گی	—	بتوں کی جو ہے اس قدر بندگی میں	۳
ی کشمکش ہے زلف کی کیوں کر بچائے جان	۱۹۱	میرے کہاں سے پیچھے پڑی یہہ بلائے جان	۱
مہ مزیب آشنا ترا گلبدن نہ تھا		خلعت کسی کے دل کی ہو یا یہہ قبائے جان	۲
اس کو چاہتا ہو نہ رکھ زندگی عزیز		یہہ سینہ جائے یار ہے غافل نہ جائے جان	۳
دے کو ہیں نکالتے بیگانے کی طرح		تن پروری نہ کر تو جو ہے آشنائے جان	۴
، آنا یار رفتہ کا عقلاً بعید ہے		ممکن نہیں گیا ہوا پھر تن میں آئے جان	۵
، ہر گھڑی کے مرنے سے آیا ہو جی بہ تنگ		یا مجھ سے عشق ہاتھ اٹھائے کہ جائے جان	۶
آرزو تھی دل میں رضا کے کہ وقت مرگ	—	روتا تھا اور کہتا یہی تھا کہ ہائے جان	۷
روز محشر کی مت کرو باتیں	۱۹۲	ہم نے دیکھی ہیں ہجر کی راتیں	۱
کسی کی ٹھوکر نے اس کو چونکایا		برہمن بت کو مارے ہے لاتیں	۲
ہو گیا تھا دو چار چشم پر آہ		چلنے پائیں نہ دو دو سمجھاتیں	۳
دل کو جب اُس سے مانگتا ہوں میں		کرتا ہے بھینک بھانک کی باتیں	۴
کیوں رضا چپکا ہو گیا ایسا	—	کیا ہوئیں یار تیری وہ باتیں	۵
ایسے خرام ناز سے جیدھر و ورد کریں	۱۹۳	مُردے بھی اُس جگہ کے حیات آرزو کریں	۱
دنیا میں ہوئے حشر سے آگے ہی رستخیز		تیری نگہ کے مست جہاں ہاو ہو کریں	۲
مانگیں ہیں دل کو زلف جدا انکھڑیاں جدا		حیران ہیں ہم اسی میں کہ کس کس کا رد کریں	۳
جو دادخواہ نالونسے ہے حشر کو اٹھا		کاش اُس کے یا الٰہی تجھے رو بہ رو کریں	۴
دل جسے تو ما ہے تو ملا ہمیں رضا	—	پھٹ جائے آسمان تو کیوں کر رفو کریں	۵
رونے کی ناصحا نہ خو ہے ہمیں	۱۹۴	کیا کریں اس میں آبرو ہے ہمیں	۱
نت ہیں جو مہر و ماہ سرگرداں		آیا یہہ کس کی جستجو ہے ہمیں	۲
دین و دنیا کی سب طلب مٹ گئی		کس کی یارب یہہ آرزو ہمیں	۳
دیدے سے خوب رویوں کی ناصح	—	ہم ہیں لاچار اس کی خو ہے ہمیں	۴

۱ سیر گلشن کی نہ دو تکلیف دیوانوں کے تئیں ۱۹۵ پھر کرے گا کون آباد آہ ویرانوں کے تئیں
۲ شمع اک صبح قیامت تجھ کو بھی درپیش ہے گو کر آفت میں کٹے یہ رات پروانوں کے تئیں
۳ باغ میں ماتم ہے کس بلبل کا کچھ بے طرح آج چاک کر بیٹھے ہیں سارے گل گریبانوں کے تئیں
۴ پھر رضا ہے توڑتا توبہ کو کہہ دے ساقیا — شیخ جیوں سی کر رکھیں جاروب خانوں کے تئیں

۱ کس گرم خو کے ہاے پڑا دل تو ہاتھ میں ۱۹۶ پھرتا ہے ٹھنڈی سانس جواب بات بات میں
۲ مت وعدہ صبح کا کر اب لے آفتاب رو جوں شمع یاں ہے کام تمام اپنا رات میں
۳ گر پاپیادہ راہ حرم میں چلا تو کیا جب تک نہیں کسی کا لیا دل یہ ہاتھ میں
۴ کیوں کر نگاہِ قہر کا اُس کی بیاں کروں ہے جس کی بو سے خون نظر التفات میں
۵ اس دل کی ہمرہی نے مجھے بھی کیا خراب یارب کوئی نہ رہیو دوانے کے ساتھ میں
۶ یہ خوں فشاں غزل جو پڑھوں باغ میں رضا — بلبل کو فصل گل میں کروں بند بات میں

۱ اُس بن دو کون دل ہے جو اکبار غم نہیں ۱۹۷ یاں صبح عید بھی شب ماتم سے کم نہیں
۲ اس کے دہن کی گالی ہی کے شوق میں رہے ہستی میں آہ پر ہیں بھولا عدم نہیں
۳ غیروں کے ساتھ پھریے کہ اب گھر میں بیٹھیے یک ساں ہے اپنے آگے ہوئے جب کہ ہم نہیں
۴ شام ہی سے آہ بھرتا تھا دم لے گے رضا — دیکھا جو صبح آ کے تو یاں کچھ بھی دم نہیں

۱ سُن صاحب معنی سے دلِ زار کی باتیں ۱۹۸ استاد سے پڑھ مخزن اسرار کی باتیں
۲ فریاد ہے یارب نہ زبان محرم و نہ گوش اور جوش زباں دل میں ہے دلدار کی باتیں
۳ پھر خانہ خرابی بناؤ اے لے منعم تو سمجھے اگر صورت دیوار کی باتیں
۴ یہ آنکھ دکھانی تری کب مانتے ہیں ہم خاطر میں کوئی لاتا ہے بیمار کی باتیں
۵ ہر نالۂ خونیں سے کیا دل کو مرے خون بلبل سے جو پوچھی ہیں چمن زار کی باتیں
۶ سن میر رضا سے تو شب زلف کا قصہ — کافر سے بیاں جو نہ ہو زنار کی باتیں

۱ ہم جو اک آہ سرد کرتے ہیں ۱۹۹ دل جگر دونوں درد کرتے ہیں
۲ سرمگیں چشم خوش نگاہوں کے ہم کو دنبالہ گرد کرتے ہیں
۳ کیا رضا کا تھا درد دل جو مرے — اب تلک کان درد کرتے ہیں

۱ اس طرح بزم میں صفتِ رخ جاناں نہ کروں ۲۰۰ آتش شوق سے تا شمع کو پروانہ کروں

عقل کا طعن نہ کر مجھ پہ ابھی اے ناصح		اک سخن عشق کا کہہ تجھ کو بھی دیوانہ کروں	۲
اشک حسرت کی اگر ہوئے مدد اے زاہد		دل صد چاک کو میں سبحۂ صد دانہ کروں	۳
درد دل پوچھ نہ مجھ سے کہ وہ باتونی ہوں		حرف ہو ایک تو سو طرح سے افسانہ کروں	۴
اپنے سودا نے کیا شہر کا بازار تو گرم	—	اے رضا دل میں ہے آباد میں ویرانہ کروں	۵
یہ ہوئی ہے زندگانی مجھے تو عذاب تجھ بن	۲۰۱	نہ ہے دن کو چین تجھ بن نہ ہے شب کو خواب تجھ بن	۱
تو ہی کہہ تو اے ستمگر یہ کوئی بھی منصفی ہے		تجھے مجھ بغیر آرام مجھے اضطراب تجھ بن	۲
تو پھرا جو خانقہ سے کہا پیٹ سر کو زاہد		بھلا کیوں نہ عاشقوں کے رہیں گھر خراب تجھ بن	۳
نہ رضا کی پوچھ حالت کہ ہے کیونکے شب گزرتی	—	وہی درد و آہ و زاری وہی پیچ و تاب تجھ بن	۴
دل میرا پھک چکا ہے اک بوسے کے بدل میں	۲۰۲	ورنہ یہ منہ پہ سن لو سودا پڑا خلل میں	۱
کل کا کیا تھا وعدہ کل تم نے میرے صاحب		کلمہ کوں کہ کلے دل ہوئے اپنا کل میں	۲
غمزوں کی یہ تعدّی عشووں کی یہ جفائیں		ویراں ہے شہر دل کا اس حسن کے عمل میں	۳
بے دوستی حیدر ایماں نہیں ہے ثابت		پڑھتے ہیں اے عزیزو تو سے بھی وہ نکلے	۴
طفلوں کے سنگ نے پھر گل بوٹے وہ ہیں کیڑے		نخل جنوں ہمارا آیا جو کچھ بھی پھل میں	۵
سودا کے کیا ہے ایسا مبتلا قصیدے میں تو	—	جو کچھ رضا ہماری ہوگا نہیں غزل میں	۶
۔۔ق کی بیماری ہے جن کو دل ہی دل میں گھلتے ہیں	۲۰۳	مُردے ہیں وہ حقیقت میں ظاہر میں پھرتے چلتے ہیں	۱
۔۔راہ میں مل گئے کہنے لگے تیرے ہی گھر میں جاتا تھا	—	جاؤ چلے لڑکا تو نہیں میں مجھ کو آپ مچلتے ہیں	۲
۔۔روں کے لگانے جائیے اپنا جلاتے ہو مجھ کو		ڈرئیے ہماری آہوں سے ہم لوگ بھی جلتے بلتے ہیں	۳
۔۔سے کہتے ہیں اُن کے مُنہ میں تو آب حیات بھرا ہے سب		ہم سے جو کرتے ہیں باتیں پھر کیوں زہر اُگلتے ہیں	۴
۔۔ہے ہی درد کا شعر پڑھیں یوں ابھی پوچھ کیا بک گئے		جن کے دل پتھر ہیں سو کب ان باتوں سے پگھلتے ہیں	۵
۔۔کریے چپ جیسے اب کھلوانا رندوں کا خوب نہیں		ملتے ہیں ہم ہاتھ بڑے کوئی اور کچھ اور ہی ملتے ہیں	۶
۔۔رے اشک سُرخ سے تم یوں غافل ہو افسوس افسوس		دیکھو تو یہ لعل کے ٹکڑے کیسے خاک میں ملتے ہیں	۷
۔۔ید آتے جاتے پھر اُس خانہ جنگ سے بگڑی ہے	—	گھر سے بہت کم میر رضا جی اب ان روزوں نکلتے ہیں	۸
۔۔نق جو تمہارے میر رضا صاحب کہئے غلام تمھیں	۲۰۴	اپنے قبلہ و کعبہ سب کہتے ہیں سید امام انھیں	۱
۔۔ری پیاری لگتی ہیں آغاز محبت کی باتیں		یار سب اس کو صدیث کریں معلوم جو ہو انجام انھیں	۲

۳ ہم سائے مجھ نالہ کش کو شفقت سے لیے جاتے ہیں ایسا نہ ہو ہوئے کہیں راتوں کو نیند حرام انھیں

۴ میں جس کے لیے بدنام ہوا مطعون زبان انام ہوا سینہ ہو تنگ آنا ہی لینے سے میرا نام انھیں

۵ حال تو ہے تقریر سے باہر کیوں کے اسے تحریر کریں خط جو لکھیں کس طرح لکھیں ہم کیا کچھ بھیجیں پیغام انھیں

۶ مسجد میں یہ نمازی تو اسلام کا دعوی کرتے ہیں گر دو بت ادھر کو آنکلا ہم جھک کے کریں گے سلام انھیں

۷ سن کر مرنا میر رضا کا پہلے تو گھبرایا کچھ — پھر سوچ کے بولا خوب ہوا آیا اب آرام انھیں

۱ مجھ کو کیا جو کہتے ہو میاں تم ہو کہاں تم ہو کہاں ۲۰۵ دل کہاں ہے پاس میرے میری جان تم ہو کہاں

۲ وہ گلی ہے یا پری خانہ ہے یا فردوس ہے سچ کہو اے ہمدمو میں ہوں کہاں تم ہو کہاں

۳ جینے سے اپنا نہ ہو کام اور دل سے رکھے امید کیا وصیت کرتے ہو اے دوستاں تم ہو کہاں

۴ گل کھلیں گے بار بار اور آئے گی ہر پھر بہار ہے ہمیشہ سیر گلزار جہاں تم ہو کہاں

۵ جب جوانی گئی، رہا کیا آنا جانا سب گیا آؤ جانے دو دو باتیں اے میاں تم ہو کہاں

۶ دیکھنے کا چاؤ یہ عینک اترتی ہی نہیں دیکھو تم اپنی طرف اے مہرباں تم ہو کہاں

۷ پوچھتے ہیں حال تو منہ دیکھ رہتے ہو رضا — دل کہیں اور ہی ہے سنتے ہو میاں تم ہو کہاں

۱ وبال جان ہر اک بال ہے میاں ۲۰۶ تعلق دل کا کیا جنجال ہے میاں

۲ طلب میں کون دنیا کی ہو پامال یہ بیت المال کچھ بھی مال ہے میاں

۳ یہ کالا ہے جہاں کا منہ ہو کالا اگر سمجھو تو جی کا کال ہے میاں

۴ سنا ہو گا جو کچھ مجنوں کا احوال وہی اپنے بھی حسب حال ہے میاں

۵ تڑپ کر رہ بہ رہ ہم اس کے مر گئے نہ پوچھو کیا مرا احوال ہے میاں

۶ قدم رکھتے تمہارے دل تڑپ گئے یہ کوئی چال ہے بھونچال ہے میاں

۷ نہیں جاتا ڈنالی پن کا سودا عجب سر پر مرے دھمال ہے میاں

۸ کھلا کب مجھ لوی سے عقدۂ دل بہت یہ مسئلہ اشکال ہے میاں

۹ اگر ہے قول تو معصوم کا ہے سوا اس کے تو قیل و قال ہے میاں

۱۰ رضا کیا مل گئے اس جنگ جو سے — تمہارا آج چہرہ لال ہے میاں

۱ دشمنوں کو نہیں میں چاہتا مسرور کروں ۲۰۷ ورنہ میں عشق تو فرہاد کے دستور کروں

۲ نہ محبت نہ مروت نہ صفائی نہ وفا کون سا اپنے جفا کار کا مذکور کروں

دل سے میں روکنے پر عشق کے مجبور نہیں | کیا اُسے آئینۂ ہاتھ میں معذور کروں | ۳

عشق میں ہوتی ہے ہر چیز کی الٹی تاثیر | آہ میں کیوں کے علاج دل رنجور کروں | ۴

جذبہ جس کے دل نے کیا کیا خوب ہوا | چاہتا تھا میں اس آوارے کے تئیں دور کروں | ۵

خشکی لب تری دیدہ پریشانی رنگ | کون سی چیز کو میں عشق کی مستور کروں | ۶

اور اک تازہ تعلق کا گرفتار رہوا | جس نے چاہا کہ تعلق کے تئیں دور کروں | ۷

اے رضا اپنا پڑا یار تھا تنہائی کا — کیوں کے ہر وقت نہ یاد دل مغفور کروں | ۸

۲۰۸

کیا ہو گر ایک نگہ تجھ پہ اے مہ پارہ کروں | چارۂ کار کتان دل بے چارہ کروں | ۱

دل سنگیں ترا فولاد بنے اے ظالم | میں اگر شیشۂ دل اپنے کے تئیں خارا کروں | ۲

کیا گل و شمع سے تسکین ہو تجھ بن مجھ کو | رونا آتا ہے جو خورشید پہ نظارہ کروں | ۳

تو کبھی قول پہ ثابت نہ رہا اپنے ہائے | کب تلک میں گلۂ ثابت و سیارہ کروں | ۴

کچھ بہا اشک میں اور کچھ ہے سر مژگاں پر — اے رضا کیوں کے علاج دل صد پارہ کروں | ۵

۲۰۹

سوئے کعبہ و دیر اگر دیکھتا ہوں | سبھوں میں تجھے جلوہ گر دیکھتا ہوں | ۱

خدا یاد آتا ہے اس دم پیارے | تجھے جس گھڑی بھر نظر دیکھتا ہوں | ۲

اٹھانا ستم اس کا اور جیتے رہنا — رضا تیرا ہی یہ جگر دیکھتا ہوں | ۳

۲۱۰

جو ہستی کو اپنی عدم جانتے ہیں | حیات خضر کو بھی کم جانتے ہیں | ۱

خوشی میں رہیں گے قیامت تلک وہ | جو دنیا کی شادی کو غم جانتے ہیں | ۲

عبث وعدہ آنے کا ہم سے کرو ہو | تمھیں اے میاں خوب ہم جانتے ہیں | ۳

ق

نہ مسجد نہ بت خانہ نہ مدرسہ ہے | نہ اس دل کو دیر و حرم جانتے ہیں | ۴

پیارے تری خاک پا کی قسم ہے — یہ گھر تیرے رہنے کا ہم جانتے ہیں | ۵

رضا ہم کو کیا کام جنت سے اب تو — گلی ہی کو اس کی ارم جانتے ہیں | ۶

۲۱۱

ایک ہی سمجھے ہے وہ تو شکر و شکوہ کیا کریں | نامہ بر تو بھیجیں پر حیران ہیں کیا انشا کریں | ۱

سایۂ خورشید کا دیکھا سلوک اب دیکھیے | تیرہ روزوں سے تبان مہر سیما کیا کریں | ۲

زندگی اپنی تو ہے جوں شمع جلنے کے لیے | چشمۂ خضر و دم عیسیٰ تمنا کیا کریں | ۳

نالے پر بلبل کے گل خنداں ہیں گلشن کے تمام | ہم کو رونا بھی نہیں آتا وہاں جا کیا کریں | ۴

۵ خضر عمر جاوداں پر گھر نہیں رکھتا یہاں — اور ہم اتنی زندگی پر چاہیں ہیں کیا کریں
۶ ہم نہیں آسودہ از بس چھت فلک کی پست ہے — پایا اونچی کر نہیں سکتے ہیں مالا کیا کریں
۷ کام سے اپنے جو کچھ نکلے تو کچھ کیجے نمود — مثل تیرے لب لوں کو دسا کیا کریں
۸ درد تیرا کم ہوا ظاہر ہمارا کیا قصور — بھر چکے جتنے تھے عضو اپنے سراپا کیا کریں
۹ جس گھڑی کو دیکھی ہے اُس کی نگاہ اے ہمنشیں — تیر سا رہتا ہے کچھ دل میں کھٹکا کیا کریں
۱۰ اور نالاں زور پر ہوتا ہے اپنے لے رضا — اُس ستمگر سے بیاں احوال اپنا کیا کریں
۱ نہ باغ ہی ہے یہاں نہ بہار رکھتے ہیں ۲۱۲ یہہ ایک دل ہے وہ بھی داغدار رکھتے ہیں
۲ ہمارے مرنے میں اب غم سے کچھ نہیں باقی — مگر یہی کہ ترا انتظار رکھتے ہیں
۳ رہے ہیں ہم تو ہمیشہ سے عشق کے مجبور — وہ کون لوگ ہیں جو اختیار رکھتے ہیں
۴ ادا و ناز کی مت پوچھ ان بتوں کے ہاتھ — ہر ایک طرح سے عاشق کو مار رکھتے ہیں
۵ وہ گل عذار یہ کہتا تھا ہم غلام اپنے — یہہ ایک کیا ہے رضا سے ہزار رکھتے ہیں
۱ بتوں کو فائدہ کیا ہے جو ہم سے جنگ کرتے ہیں ۲۱۳ خفا جو زندگی سے ہوں اُنھیں کیوں تنگ کرتے ہیں
۲ ادھر اودھر سے پھر تیری گلی میں دل لے آتا ہے — طرف دیر و حرم کے جب کبھی آہنگ کرتے ہیں
۳ کسی اور ہی کے گھر کو بھیجو صیاد تو تر ہیں — ہم اپنے خون ہی سے اس قفس پر رنگ کرتے ہیں
۴ یہہ تنگ آ کر کے عالم نے گریباں چاک کر ڈالا — تباں پھر کس لیے جامے کو اپنے تنگ کرتے ہیں
۵ اسے تو تاب دم کی بھی نہیں جوں آئینہ خوباں — رضا کی طرف سے کیوں اپنے تنگ کرتے ہیں
۱ خستہ جگر ہیں غمزدہ ہیں دل فگار ہیں ۲۱۴ جو یار تیرے واسطے آپس میں یار ہیں
۲ نہ لالہ ہیں نہ گل ہیں چمن میں زمانے کے — ٹکڑے ہوئے جگر ہیں دلِ داغدار ہیں
۳ کس کو یہاں ہے شوق ترے باغ کا خلیل — آپ ہی جگر کے داغوں سے ہم لالہ زار ہیں
۴ اس عشق نے تمام ہنر عیب کر دیے — گل ہیں ولیک نظروں میں ہم سب کی خار ہیں
۵ صیاد کوئی گھات نہیں ہم پہ باندھتا — معلوم یہہ نہیں ہے کہ کس کے شکار ہیں
۶ افلاک تجھ پہ گر نہیں ظالم فریفتہ — پھر کیا سبب جو میری طرح بے قرار ہیں
۷ پامالی پر نہ اپنی ہی نازاں ہو تو رضا — ہم بھی کسی کے در پہ میاں خاکسار ہیں
۱ نہ خاطر خوش و نہ دل آرمیدہ ہوں ۲۲۵ جان ستم کشیدہ و محنت رسیدہ ہوں

تو آشنا رکھوں ہوں نہ کوئی میں اپنا ہائے — جب سے ملا ہوں تجھ سے سبھوں سے بریدہ ہوں ۲
ہر دست و جیب جب سے جنوں مجھ کو تب سے میں — دونوں جہاں کے عیش سے دامن کشیدہ ہوں ۳
ممکن نہیں کہ سی سکے تو اس کو ناصحا — دست جنوں سے جامہ رسیدہ ہوں ۴
جانے کا میں تمھارے تو مانع نہیں ہوں جاؤ — پر جلد آئیو کہ جدائی نہ دیدہ ہوں ۵
مت جانیو رضا کہ بڑھاپے سے ہوں جھکا — میں بار غم سے آہ کسی کے خمیدہ ہوں ۶

۲۱۶
نالے کا ڈھنڈورا نہ دے لے آہ نگر میں — دل جس نے چرایا ہے سو ہے میری نظر میں ۱
میں آمد و شد میں کسی کوچے کے موا ہوں — اے یارو مری قبر کرو راہ گذر میں ۲
از خود شدگان عشق کے جوں شمع جگہ سے — ملتے نہیں کہنے کو یہ رہتے ہیں سفر میں ۳
تہمت نہ ہو راحت طلبی کی مجھے ڈر ہے — نہ اشک رہا آنکھوں میں نہ آہ جگر میں ۴
تو آپ سے کب آئے مگر وقت دعا کے — معلوم یہ ہوتا ہے کہ اختر تھا گذر میں ۵
رحم آیا اُسے چہرہ پہ میرے — پایا میں شکست اپنی میں جو سنجے نظر میں ۶
تو جب سے گیا پوچھ نہ بیمار کی اُس نے — اک بار بھی آنکھ کھلی آٹھ پہر میں ۷
اب چاہے جہاں تک یہ قیامت کرے برپا — سمجھیں گے شب ہجر تو ہم روز حشر میں ۸
احوال اسیروں میں رضا کا نہیں معلوم — ہر ایک قفس خالی ہو صیاد کے گھر میں ۹

۲۱۷
مت رکھ رضا تو خوبوں سے صاحب سلامتیں — کھینچے گا ایسی باتوں سے آخر ندامتیں ۱
دل ہاتھ سے گیا نہیں آنے کا ناصحو — اب سبھی کیا کرو مجھ کو ملامتیں ۲
واعظ کسے ڈرائے ہے تو روز حشر سے — ہیں ہر رو نہیں ہوتی ہیں سو سو قیامتیں ۳
ہم بات بھی نہ کہہ سکیں غیروں سے ربط ہو — تقصیر نہیں تمھاری یہ اپنی ہیں شامتیں ۴
کب بر اچھلتے مریدوں کو ساتھ لے — بس شیخ جی کی دیکھ لیں ہم نے کرامتیں ۵

۲۱۸
دل میں اب خوں نظر آتا ہے نہ تم چشموں میں — آبرو کیوں کے رہے گی مری ہم چشموں میں ۱
بے گنہ قتل کرے گا کسے یہ ڈر ہے مجھے — آج ظالم تری سرخی ہے ستم چشموں میں ۲
جا پڑی جس پہ نظر پھر وہ وہیں لوٹ ہوا — ہے نگہ یا کہ بھرا ہے تری سم چشموں میں ۳
دوستو خاک ہو آرام کہ وہ کافر ہائے — رام ہرچند ہوا ہے وہی رم چشموں میں ۴
کس کی پھر حسرت دیدار میں مرتا ہے رضا — اب تلک باقی رہا ہے تری دم چشموں میں ۵

۱ دل ہو یہ غم نہ رہیو تو اس میں ۲۱۹ کہ کسی کی ہے آرزو اس میں
۲ اشک تو پونچھیں لیکن اے ناصح اپنی جاتی ہے آبرو اس میں
۳ گل سے کیا کام تھا مجھے پر اسے پاتا ہوں میں کسی کی بو اس میں
۴ ہم کو کچھ گالیوں کا ننگ نہیں پر بگڑتی ہے تیری خو اس میں
۵ مت خفا ہو رضا ہوا خاموش — کیا ہے اب آتی گفتگو اس میں

۱ عشق کے جاں نثار جیتے ہیں ۲۲۰ بعد مرنے کے یار جیتے ہیں
۲ زہر حسرت چشیدگانِ فراق ہیں موؤں میں ہزار جیتے ہیں
۳ دشمنوں پر تو تیغ یار نہ کھینچ ابھی تو دوست دار جیتے ہیں
۴ تو جہاں جائے مثل آب حیات مرتے اب ایک بار جیتے ہیں
۵ ایک دن داؤ ہے ہمارا بھی یہاں بازی تو یار جیتے ہیں
۶ بن اجل کوئی مر نہیں سکتا جی کو ہم مار مار جیتے ہیں
۷ غم ہجراں کی کچھ نہ پوچھ رضا — شکر پروردگار جیتے ہیں

۱ کون دم ہے ترا ملال نہیں ۲۲۱ پر تجھے کچھ مرا خیال نہیں
۲ اس کی زلفیں ہیں جان کا سودا سر مو میرے تئیں خیال نہیں
۳ ان لبوں کا تو ذکر آنے دو کس کے منہ سے بہتی رال نہیں
۴ کیا کہوں آہ سخت حیراں ہوں دل تو اپنا کبھی بحال نہیں
۵ عاشقوں کا وصال ہوتا ہے پر جسے کہتے ہیں وصال نہیں
۶ نازِ موسیٰ یہ منّ و سلوا پر کسی کے منہ کا تو اُگال نہیں
۷ جان بوجھ آسمان کے نیچے ق رہنا غافل یہ اچھی چال نہیں
۸ اک زمانے سے یہ پرانی چھت — جھک رہی ہے کچھ اس میں حال نہیں
۹ طبع موزوں سے ہوں رضا لاچار — شاعری اپنا کچھ کمال نہیں

۱ بے قراری وہاں منظور نہیں ۲۲۲ اور یہاں صبر کا دستور نہیں
۲ کارفرمائی کو ہو عشق ولیک کوئی فرہاد سا مزدور نہیں
۳ مے کدہ بھی کیا ہی آئے پسند یہاں اٹھنا کوئی... نہیں

بے قصور اپنی نگہہ کا ورنہ — وہ کسی پردے میں مستور نہیں ۴
اس قدر مت ہو آخر تم کو — چشم سب کہتے ہیں ناسور نہیں ۵
مارڈوں اپنے تئیں یا جاؤں نکل ق — میں ان حیروں میں مجبور نہیں ۶
پراسے کیا کروں لے وائے رضا — عشق میں اکنس کا دستور نہیں ۷
یہ کس کے غم میں یارب آنکھیں بھر آئیاں ہیں ۲۲۳ داماں و آستیں میں گل سے لڑائیاں ہیں ۱
مرجائے گر برہمن تو بھی یہ بت نہ بولیں — اللہ ری تیری قدرت کیا کبریائیاں ہیں ۲
کہتے ہو اک سخن پر ہم ماریں اور جلائیں — کیا کیا تمہارے جی میں باتیں سمائیاں ہیں ۳
دل کی ہم سے حیر دنیا میں کوئی ہوتی نہیں ۲۲۴ ہوئے ہر دریا سے جو حاصل سو یہ موتی نہیں ۱
. . . . احتیاج غسل بھی ہوتی نہیں ۲
. . . . آنسو نہ بہتے اگر روتی نہیں ۳
. . . . گر خیال اس کا نہ ہوتا زندگی ہوتی نہیں ۴
حسرت ہوا تھا دل تباہ — سیل اشک عبرت باراں اگر دھوتی نہیں ۵
نہیں بے وفا ہرگز چمن کے غنچہ و گل میں ۲۲۵ گر کچھ تھوڑی سی باتیں ہیں سو فریاد بلبل ہیں ۱
جو کچھ ہے رمز جز عشاق کے کیا کوئی سمجھے گا — جفا و ناز ہیں اس کے مرے صبر و تحمل ہیں ۲
رضا کس گل بدن کے عشق میں مارا گیا ہوگا — پھرے ہے خاک بھی اس کی دوانی موسم گل میں ۳
تو کرے ہوگا حجاب اور بے حجاب ہوتا ہوں میں ۲۲۶ گھر میں تو بیٹھے ہو اور در در خراب ہوتا ہوں میں ۱
. . . . . . مت ساتھ لے دریا میں جا — پائے چھینٹے غیر پر تو غم سو آب ہوتا ہوں میں ۲
غیر کے ساتھ اس کے سے پینے کی مت کہہ لے رضا — رشک کے یاں غصہ و غم سے کباب ہوتا ہوں میں ۳
میں تو گیا تھا کب کا ترے کوچے سے پر آہ ۲۲۷ اس دل کو جو قرار نہ آئے تو کیا کروں ۱
سو یار اب تو آپ سے جاتا رہا ہوں میں — آنے پہ بھی جو یار نہ آئے تو کیا کروں ۲
بے ہوش ہوں جس گھڑی پردے میں دیکھ کر — حیراں ہوں جب وہ پردہ اٹھائے تو کیا کروں ۳
سارے جہاں سو میں نے ہیں ٹھانی لڑائیاں — غیروں سی ۴
مرنے کا بھی بہانہ کیا میں نے لے رضا — اس کو جو اعتبار نہ آئے تو کیا کروں ۵
آرزوئے وصال میں سب ہیں ۲۲۸ جستجوئے محال میں سب ہیں ۱

۲ ہجر اپنی طرف سے ہے ورنہ   اُس طرف سے وصال میں سب ہیں
۳ واے غفلت اُدھر کی کہتے نہیں   اپنی ہی قیل و قال میں سب ہیں
۴ اے رضا تجھ کو کچھ خیال نہیں   — اپنے اپنے خیال میں سب ہیں
۱ یہہ تن بدن سے شمع زباں ہے تمام ہو   ۲۲۹ پروانے کی خموشی کہیں ہم کلام ہو
۲ یارب قدم نہ آئیو گل چیں کا باغ میں   جب تک نہ عندلیب گرفتار دام ہو
۳ یہہ طعن بے ستوں کا ہے خسرو کے طاق پر   کب زرے ہو جو زور محبت سے کام ہو
۴ ہم تیرے نالہ بھرنے کے مانع نہیں ہیں دل   پر یہہ نہ ہو جو نیند کسی کی حرام ہو
۵ میں تا کجا خراب ہوں بدنام تو ہے   تروار ایک مار کہ قصہ تمام ہو
۶ کلمہ کون رضا تجھے استاد جانوں میں   — جس دن ضیا کی وضع کا تیرا کلام ہو
۱ ہجر ایسی بد بلا کا کوئی مبتلا نہ ہو   ۲۳۰ دشمن بھی اپنے دوست سے یارب جدا نہ ہو
۲ . . . ہے کون کاوشِ ناخن سے عشق کی   زخمہ لگے نہ تار پہ جیب تک صدا نہ ہو
۳ . . . . ہے مجھے . . صدا   اس وقت دیکھے نامہ کوئی دوسرا نہ ہو
۴ . . . . ہو تمام تن   یک حرف بزم یار کا ہم سے ادا نہ ہو
۵ جانے اُس سے ملنے کا کیا شوق ہے مجھے   مانند برگ گل کبھی مجھ سے جدا نہ ہو
۶ اک غنچے نکلی بند قبا وا کیجے جو تو   وہ خرقہ ہی نہ ہوئی کہ عالم قبا نہ ہو
۷ مجھ سے گرفتگی تری واقف ہو گر نسیم   بلبل کے منہ پہ بند قبا گل کا وا نہ ہو
۸ بالفرض تیرے لب میں ہو اعجاز عیسوی   کیا فائدہ جو درد کی میرے دوا نہ ہو
۹ کہتے ہیں اک ستم زدہ رو رو کے مر گیا   — تو بھی تو چل کے دیکھتا پیارے رضا نہ ہو
۱ دل گرفتار دیکھیے کیا ہو   ۲۳۱ وہ ستمگار دیکھیے کیا ہو
۲ قتل پر میرے پھر ہوئے ہیں بہم   یار و اغیار دیکھیے کیا ہو
۳ ہم نشیں آہ پھر مرے دل کی   ہے شرر بار دیکھیے کیا ہو
۴ اول عشق بے خودی آ گئی   آخر کار دیکھیے کیا ہو
۵ ابھی بوسے پر اتنی حجت ہے   آ گئے تکرار دیکھیے کیا ہو
۶ پھر رضا غیر اُس سے ملتے ہیں   — اب کے اے یار دیکھیے کیا ہو

یہ بھی پہ گوارا ہی کہ سر تن سے جدا ہو ۲۳۲ پر ہاتھ نہ میرا ترے دامن سے جدا ہو ۱
نت ہم سے جدا رہتا ہے وہ دست الٰہی ایسا بھی کبھی ہوئے کہ دشمن سے جدا ہو ۲
کب میر رضا چھوڑتے ہیں اُس کی گلی کو — بلبل بھی کبھی آپ سے گلشن سے جدا ہو ۳
سوز دل پر ہے رشک گلخن کو ۲۳۳ آگ دی اُس نے میرے خرمن کو ۱
گر گریباں سے اپنا چھوٹتا ہاتھ تو پکڑتا کسی کے دامن کو ۲
دوستوں سے یہ ہے تو پھر تجھ سے کیا توقع رہے گی دشمن کو ۳
دیکھ کر میرے دل کا حال رضا — بھولے اپنے جگر کے شیون کو ۴
کیا عداوت تھی چشم تر تجھ کو ۲۳۴ دل ہی پر میرے ہے نظر تجھ کو ۱
رات تو کٹ گئی پتنگے کی شمع درپیش ہے سحر تجھ کو ۲
ہم تو گھبرا گئے بس اب اے آہ کیا یہیں کرنا تھا اثر تجھ کو ۳
اس طرح سے نہ ہم کو بے دل کر دل سے نسبت ہے کچھ بھی گر تجھ کو ۴
نارسا آہ و ناتواں نالہ کیوں کے پہنچے مری خبر تجھ کو ۵
راتوں کو اُس کے در پہ پھرتا ہے۔ دن لگے ہیں رضا مگر تجھ کو ۶
نہ کفر کی ہوس ہے نہ ایماں کی آرزو ۲۳۵ اس دل کو ہے محبت جاناں کی آرزو ۱
پھر پھر جو ہاتھ اپنا گریباں کرے ہے چاک ہے اس کو کس کے گوشۂ داماں کی آرزو ۲
روتے ہی روتے عمر کٹی اپنی پر کبھی حاصل ہوئی نہ دیدۂ گریاں کی آرزو ۳
صد شکر اُس کی تیغ کے لگتے ہی گئی جو کچھ کہ اپنے دل میں تھی ساماں کی آرزو ۴
خار و خس ہوس کو دی آگ عشق نے باقی ہے تیری جنبش داماں کی آرزو ۵
اک بار بھی نہ پہنچا ہماری تو داد کو ہم مر گئے لیے ہوئے درماں کی آرزو ۶
لگ جاؤ تک رضا کی بھی چھاتی سے میاں کبھی — اُس کے بھی نکلے سینۂ سوزاں کی آرزو ۷
بھولے سے تو وہ دیار آئے کبھو ۲۳۶ دل کو یارب قرار آئے کبھو ۱
داغ دل ہم دکھائیں گے، لالے اس برس میں بہار آئے کبھو ۲
غیر آتے ہیں تیرے یہاں کبھو — یہ بھی اُمیدوار آئے کبھو ۳
آہ مت پوچھو آہ مت پوچھو ۲۳۷ بری ہوتی ہے چاہ مت پوچھو ۱

۲ واجب القتل ہر طرح ہیں گے — عاشقوں کا گناہ مت پوچھو
۳ دیکھو انجام کار مجنوں کو — دوستی کا نباہ مت پوچھو
۴ عشق بازی رضا نے پھر کی ہے — اُس کا حال تباہ مت پوچھو

۱ دیں مثل اس رخ سے گل کو دیشا اس میں جو نہ ہو ۲۳۸ کہہ سکیں غنچہ دہن کو بھی گر اس میں بو نہ ہو
۲ اُس کی ابرو کی محبت کیوں کے اپنے دل سے جائے — گوشت ناخن سے جدا ممکن ہی کوئی ہو نہ ہو
۳ ناز بے جا خشم بے موقع ترحم چشم لطف — تم جو کچھ چاہو سو ہو اور ہم جو چاہیں سو نہ ہو
۴ دیکھ وقت نزع مجھ کو ہنس کے یوں کہنے لگا — ہم جو سنتے تھے رضا عاشق یہی ہے ہو نہ ہو

۱ نسبت ہمارے دل سے ہے اس درجہ داغ کو ۲۳۹ دیتا ہے بوسے لالہ طراوت دماغ کو
۲ منت کش مغاں نہیں ہونے کے مست عشق — بھرتے ہیں خون دل سے ہم اپنے ایاغ کو
۳ احسان صرصر اپنی تو ہمت کا ننگ ہے — گل کر دے باد یاس ہمارے چراغ کو
۴ چہرہ کسی کا دیکھے سکندر جو زلف میں — اپنے چھپا رکھے گھر شب چراغ کو
۵ پہلے قدم میں اپنے تئیں بھول گئے رضا — ہم بھی کہیں گئے تھے کسی کے سراغ کو

۱ لازم ہے بلند آہ کی رعایت نہ کرے تو ۲۴۰ تسخیر اگر دل کی ولایت نہ کرے تو
۲ آنکھوں کا بہے جانا سبھا گریے پر افسوس — اب بھی اگر اُس دل میں سرایت نہ کرے تو
۳ میں موڑوں نہ مُنہ اُس کی جفا سے پہ کروں کیا — اس وقت وفا پھر جو کفایت نہ کرے تو
۴ جمعیت اغیار سے ڈرتے نہیں عاشق — پر خوف یہ ہے اُن کی حمایت نہ کرے تو
۵ اے قاصد اگر نامہ مرا چاک کرے یار — بہتر ہے کہ مجھ سے بھی روایت نہ کرے تو
۶ پھر کہہ تو چپٹ کر نہ لیں ہم بوسہ سو کیوں کر — جب آپ سے گالی بھی عنایت نہ کرے تو
۷ اے میر رضا تجھ کو ابھی اُس سے ملا دیں — گر رشک کی پھر ہم سے شکایت نہ کرے تو

۱ نالہ شرر فشاں ہو یا آہ شعلہ در ہو ۲۴۱ بے فائدہ ہے اے دل جب تک نہ کچھ اثر ہو
۲ رحم اے فلک کہ کب تک یہ مشت خاک اپنی — رسوا ہے کو بہ کو ہو پامال در بہ در ہو
۳ شمشیر ہی کسی کی سایہ فگن ہو یا رب — کب تک یہ زندگانی آزار میں بسر ہو
۴ شب وصل کی ہے کر بند دیوار و در کے روزن — گو صبح جلد آئے پر دیر کر خبر ہو

۱ جس میں دل خوش ہو ترا خوشی بار مجھ کو ۲۴۲ نہ غم درد ہے نہ خواہش درماں مجھ کو

شوخ چشمی تری لے گئی مزاجی سو آرام ایک سا ہوگیا ہے شہر و بیاباں مجھ کو ۲
آئینہ ساں مری آنکھیں نہیں مندتی ہیں کبھی کس کے ہے رخ نے کیا آہ یہ حیراں مجھ کو ۳
کیا دیا ہے گل و شبنم کی طرح ہائے نصیب لب خنداں اُسے اور دیدۂ گریاں مجھ کو ۴
رات و دن زرد ہی طرح بانٹے ہیں قسمت تو نے غیر کو روز وصال اور شب ہجراں مجھ کو ۵
عشق کی بھیڑ پڑی جب کہ ترے دل پہ رضا — اور مشکل ہوئی جو جو کہ تھی آسان مجھ کو ۶

تو نے رضا کیا کیا خانہ خراب اس کو ۲۴۳ جو نام سے بھی تیرے اب ہے حجاب اس کو ۱
بیمار ہجر تیرا کیوں کر رہے نہ مضطر جائے نہ رات ہی اور آئے نہ خواب اس کو ۲
بے پردہ حال میرا اُس شوخ سے کہے ہے پر دیکھیو نہ ہمدم آئے حجاب اُس کو ۳
اے دوستو چلیو ٹک دیکھیں رضا کا احوال — کچھ رات بے طرح تھا کل اضطراب اُس کو ۴

بار ہے گردن کا سر گر ترا سودا نہ ہو ۲۴۴ آبلہ دل ہے اگر تیری تمنا نہ ہو ۱
چہرے پہ اپنے نشاں داغ کا پاتا ہوں میں چشم کو منظور اگر دیکھنا تیرا نہ ہو ۲
کیوں کہ دکھاؤں تجھے تجھ کو میں حیراں ہوں آئینہ کا آئینہ عکس پذیرا نہ ہو ۳
اُس کو شہادت حلال معرکۂ عشق میں سول کا تو ذکر کیا زخم لب وا نہ ہو ۴
ذرہ ہے لو ہو سوا صورت دیبا طرح — گر نہیں قسمت میں تو حاصل دنیا نہ ہو ۵

بہت ہے یاد تجھے فریاد کے انداز عاشق کو ۲۴۵ تری چشم سیہ ہوئی سرمہ آواز عاشق کو ۱
تجھے ظاہر ہو یہ دامن چھڑانا ہاتھ سے میرے جو پاس عشق اے ظالم نہ رکھے باز عاشق کو ۲
کرے گر مالک قسمت مجھے اللہ تو دوں میں نیاز و عجز خوبوں کو غرور و ناز عاشق کو ۳
نہ طاقت ضبط کی دل کو نہ کوئی ہم زباں اپنا محبت ایک دن مانے گا تیرا راز عاشق کو ۴
مرے نالے کے شعلے سے نیستاں میں لگی آتش فغاں اے بے کسی نے بھی نہیں ہم ساز عاشق کو ۵
رضا جی دینے بیٹھا تیری ابرو کے اشارے پر — کوئی کرتا ہے قتل اس طرح کے جاں باز عاشق کو ۶

ابر کے بن دیکھے ہرگز خوش دل مستاں نہ ہو ۲۴۶ تیر باراں ہے مجھ پر جب تلک باراں نہ ہو ۱
میری رسوائی نے تیرے حسن کی کی ہے نمود جب تلک شبنم نہیں روئے تو گل خنداں نہ ہو ۲
طرز تیری گفتگو کی ہے گواہ مے کشی بوئے گل اور نشۂ صہبا کبھی پنہاں نہ ہو ۳
شیخ کو نہ جہل ہے سو بار کعبے کے تئیں جائے اور آئے ولیکن پھر کہ بھا انساں نہ ہو ۴

۵ ذکر ابروے بتاں سے کیوں بُرا نے ہے شیخ   کیا ہوا کافر تجھے قبلے سے روگرداں ہو

۶ سچ بتا اے جان عشق و عشق بازاں کیا ہے تو   بن ترے میں اُس بدن سا ہوں کہ جس میں جاں نہ ہو

۷ یاں سے جا شیطان زلف یار کو ہم دے چکے   عاشقوں کا دین ہے یہہ شیخ کا ایماں نہ ہو

۸ نزک تاز غمزہ کا اُس کی یہی ڈر ہے رضا — یہہ غم آباد اپنا شہر دل کہیں ویراں نہ ہو

۱ صندل جبیں کا جس کی تری خاک کو نہ ہو ۲۴۷ یارب جہاں وہ جائے اُسے آبرو نہ ہو

۲ کل سے رضا ہے نزع میں چل تو بھی دیکھ آ — شاید کہ اُس کے جی میں تری آرزو نہ ہو

۱ خوشا وہ دن کہ میں تھا مست دیدار و مست صہبا تو ۲۴۸ تماشا دیکھتا تھا میں ترا میرا تماشا تو

۲ کسی کی ہے یہ قسمت میں کسی کا ہوگا دیوانہ   خدا ایسا کرے دیوانہ میں ہوں نام تیرا تو

۳ جدا ہو کر بتاں کب عاشقوں کو یاد کرتے ہیں — رضا حیراں ہوں میں کس بات پر ہے اتنا بھولا تو

۱ نہ ہوں شیخ و برہمن کیوں نہ کے تجھ پر مبتلا دونوں ۲۴۹ کہ زلف و رخ ہیں کفر و دیں ترے لے دل ربا دونوں

۲ گریباں پھاڑتا تھا یہہ وہ سر پر خاک اڑاتا تھا   ترے بن کرتے تھے ماتم چمن میں گل صبا دونوں

۳ خدا ہی جانے یہہ کس کو لگا تیر نگہ تیرا — تڑپتے تھے گلی میں تیری کل دل اور رضا دونوں

۱ کہاں ایسا جنوں جو لے چلے راہ بیاباں کو ۲۵۰ اُدھر ناصح سیے اور ہم ادھر پھاڑیں گریباں کو

۲ تری عصمت کے پردے میں کہیں رخنہ نہ پڑ جائے   زلیخا تک سمجھ کر کھینچیو یوسف کے داماں کو

۳ پھر اب لے آبلہ پاؤں سے ہے رہ دشت غربت کی   یہ مژدہ ہم سے جا دینا کوئی خار مغیلاں کو

۴ یہی آوارگی پر دل کی ہے آتا مجھے رونا   بغل میں میں نے کیوں دی ہے جگہ اس دشمن جاں کو

۵ ہماری خاک پر مت نام اُس قاتل کا لے ہمدم   عبث تو جوش میں لاتا ہے کیوں خون شہیداں کو

۶ رضا تو اس غزل کو در غزل کہنا مرے مشفق — تری ظاہر ہے خوبی طبع کی ہر سخن داں کو

۱ دم خنجر کو رحمت آفریں ہے آب پیکاں کو ۲۵۱ اٹھایا خضر کی منت کو اور عیسیٰ کے احساں کو

۲ اکیلا میں اور اتنے کام سب کیا کیا کروں یارب   دل بے تاب کو تھاموں کہ روؤں چشم گریاں کو

۳ محبت مفت میں ظاہر کی اور ناحق مجھے مارا — میں رکھتا جی میں تھا ظالم ترے اس راز پنہاں کو

۱ یہہ نہیں کہتا ہوں میں بوسہ ہو یا دشنام ہو ۲۵۲ وہ دے لے پیارے مجھے جس میں کہ تیرا نام ہو

۲ حسرتوں سے دل تو سارا ہو چکا ہے داغ داغ   دیکھیے اس عشق سے اب آگے کیا انعام ہو

۳ دل شکنج زلف میں بے تاب ہے موجب نہیں   کس طرح سے شست میں ماہی کے تئیں آرام ہو

خوبے تجھ کو رضا گر مُنہ نہیں دیتا ہے یار — کون مل کر ایسے رسوا سے بھلا بدنام ہو ۴

پڑا ہے دھک سے اب کاروبار مت پوچھو ۲۵۳ ملال، ہجر، غم انتظار مت پوچھو ۱

جو ایک ہو تو نہ کہیے یہاں ہیں لاکھوں بات کہے ہی جاؤں گا میں دہ ہزار مت پوچھو ۲

بگڑ تا رہتا تھا میں یار سے سو اب کیوں کر ہوا ہوں غیر سے صحبت برآر مت پوچھو ۳

چراغ خانۂ مفلس نے صبح کب دیکھی ہم عاشقوں سے غم روزگار مت پوچھو ۴

یہ کیا ہے دوستوں اک بار مار ڈالو مجھے کسی کے جانے کی تم بار بار مت پوچھو ۵

کسی کی نرگس مخمور ہوئی ہے ساقی — رضا کا اب کوئی رنج خمار مت پوچھو ۶

عاشق پہ جو کہ کرتے ہیں ثابت گناہ کو ۲۵۴ کاش اُس کی دیکھ لیں کہیں طرز نگاہ کو ۱

آتے جو دیکھا اُس کو تو بے خود سے ہو گر پڑے رکھتے تھے ہم ارادہ کہ روکیں گے راہ کو ۲

جو عشق کا بیان نہیں جانتے ہیں راست کر دیویں اُن کے آگے مرے کج کلاہ کو ۳

بے وجہ دل مرا نہیں طالب ہے عشق کا شعلے سے نت معاملہ رہتا ہے کاہ کو ۴

مجھ روسیہ کا روز اسی سے سیاہ ہے مت رکھ لگا کے زانو پر چشم سیاہ کو ۵

یوسف کی چاہ سود کے طالب کو چاہیے عاشق زیاں کیے ڈھونڈیں ہیں رستم کے چاہ کو ۶

اندھا بھی اپنے گھر میں جلا بیٹھے ہے چراغ موقوف رکھ نہ عشق پہ بیداد آہ کو ۷

مجھ کو بلا میں ڈال دیا آپ چل بسے — کیا کہیے اے رضا دل عفران پناہ کو ۸

کہتا ہے مجھ سے وہ خبردار ہو ۲۵۵ زرد ہوئے جاتے ہو بیمار ہو ۱

رکھتے ہیں ہم سوختہ جاں کو عزیز لالہ ہمارا گل دستار ہو ۲

شکوے سے ہے پُر دل پُر حوصلہ آہ اگر طاقت گفتار ہو ۳

شرع محبّت کے ہیں احکام اور نام وفا لے سو گنہ گار ہو ۴

یار ہے سب چیز سے ظاہر رضا — دیدہ اگر قابل دیدار ہو ۵

اُس تند خو سے کیوں نہ مرا تلخ کام ہو ۲۵۶ اب زہر جسم بھی نہ ہے مجھ پہ عام ہو ۱

سیر چمن سے جائے نہ خاطر گرفتگی کیا رنگ و بو سے آرزوے دل تمام ہو ۲

اب تک تو گل ہیں چاک جگر غنچے تنگ دل آئندہ دیکھیں باغ کا کیا انتظام ہو ۳

منزل پہ خاک پہنچے گا جس کو کہ ضعف ہو — جوں نقش پا ہر ایک قدم پر مقام ہو ۴

۱ کرتا ہے کج روی نئی ہر ایک آن تو ۲۵۷ پیوند ہے زمین کا اے آسمان تو
۲ کینے سے میرے دشمنوں نے بھی اٹھایا ہاتھ اے بدگمان پر نہ ہوا مہربان تو
۳ جانے کی کہہ نہ اپنے نہ مرنا کسی کا چاہ کیا جانتا نہیں ہے کہ ہے میری جان تو
۴ بوسہ لبوں کا مانگا ہے اور میں نے کیا کہا اتنی زباں درازی نہ کر کہنا مان تو
۵ دل گم ہوا کسی نے بھی پایا ہے اے رضا — اب اس گلی کی بیٹھا ہوا خاک چھان تو
۱ موت بھی آتی نہیں ہجر کے بیماروں کو ۲۵۸ کیا مصیبت ہے ذرا دیکھنا بےچاروں کو
۲ نالۂ دل نے ہمارے تو اثر کم نہ کیا اور معذوری زیادہ ہوئی دل والوں کو
۳ گو ہیں جنت میں مزے لیک نہیں بھولنے کا ہونٹ کا چاٹنا تجھ لب کے نمک خواروں کو
۴ اس سے بہتر نہیں کوئی چیز سوا بوسے کے رونمائی میں جو دیویں ترے رخساروں کو
۵ کبھی رونا کبھی سر دھننا کبھی چپ رہنا کام کرنے ہیں بہت سے ترے بےکاروں کو
۶ میں نے کاغذ تری تصویر کا عیسیٰ کو دیا نسخہ جوں دیتے ہیں بیمار سب عطاروں کو
۷ پتھروں ہی پہ جو تجلی ہے تو ہم غیرت سے آنکھوں ہی میں لیے مر جائیں کے نظاروں کو
۸ سب نمونہ ہے حقیقت کا جہاں تک ہے مجاز نقش جو کرتے ہیں گلزار کی دیواروں کو
۹ یہ غزل خدمت نواب کی ہے میر رضا — اور ایک دوسری کہہ دیجیے ہم کاروں کو
۱ جس طرح خواب سے آرام ہے بیماروں کو ۲۵۹ رہنا غفلت ہی میں بہتر ہے گنہ گاروں کو
۲ گوشہ گیری میں ہے اک اور بھی عالم کی سیر دن کو جو اہل رصد دیکھتے ہیں تاروں کو
۳ رکھا نام اس کا مرے دل نے تمنائے وصال کتنے اک جمع کیے عشق میں دشواروں کو
۴ دم عیسیٰ سے ہوں بیمار محبت کے ہلاک خضر گمراہ کرے عشق کے آواروں کو
۵ اشتیاق محبوب کا... نہیں جیب و دامن جانیں کیا لڑکے یہ اشراف کے بازاروں کو
۶ اور ٹکڑا ہوا مانند کتاں دل اپنا جتنا پیوند کیا اس سے میں مہ پاروں کو
۷ اٹھ گیا ہے نہ مرا ہاتھ کہیں دل پر سے ہاتھ کیوں ملتے میں دیکھوں گا ان پرستاروں کو
۸ کاش ہو وصف تری زلف کے.. کا نمود نامہ دیں حشر میں جب ہم سے سیہ کاروں کو
۹ اب نہیں دیکھو تسلی تو مرے قتل کے بعد صبر یوں آئے مرے مرے غم خواروں کو
۱۰ دن گیا وعدے کا تو مر نہ گیا حیف رضا — منہ دکھانا ہے پھر اے یار کے تو یاروں کو

اس گھڑی کچھ تھے اور اب کچھ ہو ۲۶۰ کیا تماشا ہو تم عجب کچھ ہو ۱
مجھ کو کچھ دل پہ اختیار نہیں تمھیں اس گھر کے اب تو سب کچھ ہو ۲
کچھ نہیں بات تس پہ یہہ باتیں قہر کرتے ہو تم غضب کچھ ہو ۳
بہت کی شرم تھوڑی سی پی کر اس کے رکھتا ہوں لب پہ لب کچھ ہو ۴
عشق بازی نہیں رضا بازی — پہلے جاں بازی کیجے جب کچھ ہو ۵

نہ خواہش فقر کی رکھتا ہوں نہ چاہوں میں دولت کو ۲۶۱ علی مولیٰ کی میرے دل میں دے یارب محبت کو ۱
نہیں پانے کا ہے تو راہ جنت میں کبھی ہرگز کرے جب تک نہ خوشنود ایسے تو غافل جنت کو ۲
عجب کیا ہے اگر مشہور ہو خلق حسن جگ میں کیا خلق محمد سے حسن کی پاک خلقت کو ۳
موالی ہوں میں تیرا حشر کے دن میرے ایماں کو تو اے شاہ شہید کربلا شہادت کو ۴
محبت عابد و باقر کی نہیں جس دل میں ہے کافر نہ ہو جو جعفری مذہب نہیں پانے کا رحمت کو ۵
علو شان کاظم کا نہ ہو اے ناصبی منکر تو پڑھ الکاظمین الغیظ کی قرآں میں آیت کو ۶
جہاں ظلم و فساد و فتنہ سے معمور ہے سارا الٰہی دیر کیا ہے حضرت صاحب کی رجعت کو ۷
رضا کیوں کر نہ ہم سے سرد ہو آتش جہنم کی — محمد نے کیا جب گرم بازار شفاعت کو ۸

حسرت ہوئی دونی گئے جب پاس زیادہ ۲۶۲ دریا میں نہانے سے ہوئی پیاس زیادہ ۱
کچھ زہر جدائی سے فلک تھوڑا سا عالم اور اس کے عوض میں تو کر الماس زیادہ ۲
سونگھ اپنا گریباں کہ میں خوب ہوں واقف گل سے تو کہیں اس میں ہے بو باس زیادہ ۳
بدخوئی میں وہ کم نہیں بے درد ولیکن بدگوئی دشمن کا ہے وسواس زیادہ ۴
بے رخصت بلبل نہ کروں سیر چمن کی عاشق کا ہے عاشق کے تئیں پاس زیادہ ۵
کم چھوڑا ہے آمیزش دنیا نے کسی کو شیطان سے بھی نکلی یہ خناس زیادہ ۶

بھرا ہے خون مرے ہاتھوں میں یا رنگ حنا سچ کہہ ۲۶۳ کیا ہے قتل تو نے کس کو اے ظالم بھلا سچ کہہ ۱
شمیم گل کہاں ایسی کہ جس سے دل تڑپ جاوے یہ کس کی بو لے آئی ہے تو اے باد صبا سچ کہہ ۲
ہوئے کھیوے سبھوں کے پار غم کے آہ دریا سے کنارے ہم بھی پہنچیں گے کبھی اے ناخدا سچ کہہ ۳
علاج آتا ہے تجھ کو اے مسیحا سارے عالم کا بھلا کچھ عشق کے بھی درد کی ہے گی دوا سچ کہہ ۴
تلطف سے صبا تیرے گلوں کی گر کھلیں کلیاں کبھی ہوگا ہمارے دل کا بھی یہ عقدہ وا سچ کہہ ۵

۶ کھلے سر پا برہنہ جیب چاک آہ و فغاں کرتا — پھرے ہے در بدر اب عشق میں کس کے رضا یہ کہہ

۱ یہہ نہیں کہتا ہوں حق صحبت دیرینہ دیکھ ۲۶۴ کر نظر تقصیر پر میری اور اپنا کینہ دیکھ
۲ رات بے رات آنے سے بدنام یوں مجھ کو نہ کر — چھلاے صاحب لعب اپنا سر گنجینہ دیکھ
۳ لالہ و گل ہی پر اتنے حوس مت کھا زینہار — زخم و داغوں سے کسی کے آ ہمارا سینہ دیکھ
۴ گر رضا کی ہو نہ حیرانی کا تجھ کو اعتبار — رو بہ رو بلوا کے اپنے اُس کو تو آئینہ دیکھ

۱ کیا قتل ایک دم میں اپنے خنجر کا تماشا دیکھ ۲۶۵ نہ موڑا میں نے بھی مُنہ میرے جوہر کا تماشا دیکھ
۲ بھرا ہے عشق سے جا کر نظر ڈالی مرے دل پر — چڑھا خورشید کے مُنہ پر اس اخگر کا تماشا دیکھ
۳ اٹھا برقع کو مُنہ سے اور لگا دے آگ تخشب کو — نکل ٹک گھر سے باہر دین آذر کا تماشا دیکھ
۴ زمیں پر ناز سے چل زلزلہ عالم میں پیدا کر — نظر کر آسماں پر ماہ و اختر کا تماشا دیکھ
۵ ہمیں اک بوسہ دے تا ذوق مستی سے ہو کف جاری — پھرا ے حد بہشتی موج کوثر کا تماشا دیکھ

۱ ہر نفس آہ و ہر زماں نالہ ۲۶۶ شعلہ ور آہ و خوں چکاں نالہ
۲ دیکھنا پرورش محبت کی — نالہ ہے آہ اور فغاں نالہ
۳ سانس لینا بھی اب تو مشکل ہے — وہ کہاں آہ اور کہاں نالہ
۴ کیوں کے پہنچے مری خبر تجھ کو — نارسا آہ و ناتواں نالہ

۱ اس رخ پہ نظر کر خط شب رنگ کا جلوہ ۲۶۷ کیا کھلتا ہے اس آئینے میں زنگ کا جلوہ
۲ لگتی ہے نگہ اپنی بہت بوقلموں آج — ہے سامنے ان آنکھوں کے کس رنگ کا جلوہ
۳ پھر بند ہو غنچے کی طرح وقت تبسم — گر دیکھے گل اُس کے دہن تنگ کا جلوہ
۴ اس آئینہ خانے میں جہاں کہ جو نظر کی — آیا نظر اپنے ہی رضا رنگ کا جلوہ

۱ دل جا پڑا نہ اُس بت ناآشنا کے ہاتھ ۲۶۸ لے کافر اب تو پھر نا ترا ہے خدا کے ہاتھ
۲ کس طرح سے یہ لیتی ہے بوسہ چٹ چٹ — کیا اُس کا پاؤں مفت لگا ہے حنا کے ہاتھ
۳ برباد دے ہے خاک دریا رفت صبا — یارب یہ تخت سلطنت آئے گدا کے ہاتھ
۴ بلبل یہ شاخ گل بڑی نازک سہی ولیک — جو ہم نے دیکھے ہیں سو کہاں اُس ادا کے ہاتھ
۵ اک بار بھی نہ دامن یار آیا ہاتھ میں — تھک کر کے رہ گئے مرے آخر دعا کے ہاتھ
۶ کچھ فکر ہیرے اس دل حیراں کا بھی کرے — جس نے دیا ہے آئینہ اُس خود نما کے ہاتھ

تا چمن کے تختے کو پامال عندلیب — گر اختیار باغ کا ہوتا رضا کے ہاتھ ۷

یرے کیا ہو ہر دم میں طلب چشم خوں بار پہ ہاتھ ۲۶۹ کاش اک بار بھی شفقت سے تم رکھتے دل افگار پہ ہاتھ ۱

لع امید نہ بیچے کیوں کر برسوں کی دعا خالی ہے — الٰہی جو قسم ملنے کے لیے تو اس نے رکھا تروار پہ ہاتھ ۲

ے روتے آنکھیں بیٹھیں خوف سے تھراتے ہیں پاؤں — اب آتے ہیں کسی کی گلی میں دھر رکھ کر ہم دیوار پہ ہاتھ ۳

ے ملنے کی مت پوچھو قہر کیا نزاکت نے — انگلیاں پانچوں اکھڑ آئیں رکھتے ہی اُس رخسار پہ ہاتھ ۴

دل لگانے کا چاؤ ہوتا ہے ۲۷۰ پر کلیجے میں گھاؤ ہوتا ہے ۱

پہنچا قاصد پہ مثل شانے کے — دل کے تئیں پیچ تاؤ ہوتا ہے ۲

ظلم یاں بے حساب ہے دیکھیں — حشر میں کیا بناؤ ہوتا ہے ۳

اب تو ہم ہار بیٹھے ہیں لیکن — جیت کا ایک داو ہوتا ہے ۴

شکوہ کرتے ہیں اُن جدائی کا — جہاں کچھ بھی لگاؤ ہوتا ہے ۵

بگڑی صورت تک اس کی دیکھ رضا — کس سے اُس کو نباؤ ہوتا ہے ۶

ل جو کہنے میں نہ ہو کیا حاصل اُس کے پاس سے ۲۷۱ زخم زخم اس کو کرا اور ہر زخم بھر الماس سے ۱

ن کو نسبت اُس کی زلفوں سے سراسر ہے خطا — ہوش کس کا اڑ گیا ہے مشک کی بو باس سے ۲

ب نمازوں میں جاتا ہی نہیں اُس کا خیال — میں نہ ملتا تھا بتوں سے کم اسی وسواس سے ۳

سہ لب کا غیر کو دیجے ہمیں ترسائیے — آب حیواں اُس کی قسمت ہو مریں ہم پیاس سے ۴

ون کے وہ عاشق دل سوختہ سے ساز کرے ۲۷۲ جس کا یہ حسن ہو جبریل نہ وہ ناز کرے ۱

ر خاص رقیبوں کے تئیں ارزانی — اس طرف کاش نگاہ غلط انداز کرے ۲

ہرا جی دینا تو کیا مرتا تھا اس رخ پہ میں — یک نظر جس کی جھمک خضر کو جاں باز کرے ۳

ہے عجب راہ محبت کا طریق اے یارو — پہنچے منزل کو جو انجام کو آغاز کرے ۴

یا تماشا ہے وہاں معرکہ آرا ہے عشق — جس جگہ کام نہ کچھ سحر نہ اعجاز کرے ۵

تنے شہباز ہیں اس صید کے ہوتے ہیں شکار — جو پر تیر کو اپنا پر پرواز کرے ۶

شک پروانے سے جلتا ہوں شب و روز رضا — کوئی مقراض اب اُس کا پر پرواز کرے ۷

ل شیخ و برہمن کا مرے ہاتھ گرد ہے ۲۷۳ نہ رہ مجھے کعبے میں نہ بت خانے میں لگ ہے

ل دیدۂ پُرنم دل پُر خون ہے کس بن — نہ جام نہ مینا ہے نہ خم ہے نہ سبو ہے ۲

۲ کیوں کر دل صد چاک کو اب سیجے رضا ہائے — نہ بخیہ ہی ہو سکتا ہے نہ جائے رفو ہے

۱ رضا کس طرح کا یہ دیوانہ پن ہے ۲۷۴ ترا چاک چاک آہ سب پیرہن ہے

۲ کرو مت تردد ہمارے کفن کا — فقیروں کی کفنی ہی اس کا کفن ہے

۳ شب ہی تلک ہے یہ ماجرا دیکھیو کل — نہ یہ یار ہیں گے نہ یہ انجمن ہے

۴ رضا کو گلی سے نہ اپنی نکالو — یہ عاشق قدیمی ہے یار کہن ہے

۱ روتا پھرتا ہے نالہ بھرتا ہے ۲۷۵ کہہ رضا سچ تو کس پہ مرتا ہے

۲ کس نے پھر تیغ کی ہے آج علم — پھر لہو اپنا جوش کرتا ہے

۳ قتل کیجے رضا سے مخلص کو — کوئی بھی ایسا کام کرتا ہے

۱ گر چشم تری جام صہبا کے برابر ہے ۲۷۶ اپنا دل پرخوں یہ مینا کے برابر ہے

۲ کہہ دینا سکندر سے کیوں پھرتا ہے بیہودہ — اک گوشۂ دل ساری دنیا کے برابر ہے

۳ کیوں خضر سے جدا ہوں کے میں نہیں آتا — جب دل کو ہوئی وسعت صحرا کے برابر ہے

۴ کر سیر ذرا دل کی وادی مقدس کی — ہر ایک شباں یاں کا موسیٰ کے برابر ہے

۵ آ عشق کے مکتب میں سی پارۂ دل کو پڑھ — یاں طفل دبستانی ملا کے برابر ہے

۶ حرماں زدگان عشق مستغنی ہیں جنت سے — یاں کا شجر بے بر طوبیٰ کے برابر ہے

۷ اے میر رضا شکوہ مت اس کی جفا کا کر — معشوق جفا پیشہ عنقا کے برابر ہے

۱ چشم و زلف اس کی کیا دل کو پسند آئی ہے ۲۷۷ مست زیبا ہے کہے اور کہے سودائی ہے

۲ اگلی باری کا گیا شور نہیں سر سے ہائے — اب خدا خیر کرے پھر یہ بہار آئی ہے

۳ کعبہ و دیر جدھر دیکھا ادھر کثرت ہے — آہ کیا جانئے کدھر گوشۂ تنہائی ہے

۴ شہر آباد ہے سودے سے رضا کے ورنہ — کوہ کن کوہی ہے اور قیس سو صحرائی ہے

۱ مجھ خاک سے جو لالہ اگا کیا عجب یہ ہے ۲۷۸ داغ جگر صعود میں ہے گا سبب یہ ہے

۲ گر میرا درد دل نہ سنا اس کا غم نہیں — باتیں لگا ہے غیر کی سننے غضب یہ ہے

۳ ظاہر ہیں سب پہ عشق کی خانہ خرابیاں — تبلا دوں کیا سجن اب اپنے عیب یہ ہے

۴ دشمن کو کیا رہے گی تو تیغ بتا تو ہائے — تیرا سلوک دوستوں سے یار جب یہ ہے

۵ دیکھا جو وقت مرگ مجھے ہنس کے یہ کہا — سنتے جو تھے رضا کے تئیں جاں بلب یہ ہے

ہوئے گا محبت کا سرانجام ہمیں سے ۲۷۹ اوروں کو دعا ہوئے یہ دشنام ہمیں سے ۱
سمجھانے کو اک میر رضا ٹھہرے تھے اُس کے — سُو بھی جو نظر آئے سو بدنام ہمیں سے ۲
کیا جانے کس کی صورت دل سے دوچار ہے اب ۲۸۰ بے خود بہ سان تصویر حیرت سے ہو رہا ہے ۱
تم نہ سمجھو اس کو تیر نگہ کی اُس کے یہہ زرہ پوش گردوں ہدف ہو رہا ہے ۲
کھینچو ہو تیغ کس پہ کہ سے غیر کے آہ آگے ہے دل یہ بسمل غیرت سے ہو رہا ہے ۳
رچا ہے صفائی وحدت گزیں ہوئے دل یہہ عکس آئینے میں کثرت سے ہو رہا ہے ۴
دیتا ہے دل سی شے بھی کوئی رضا کسی کو — اب تو خراب اپنی ہمت سے ہو رہا ہے ۵
غیر کے گھر وہ ہائے جاتا ہے ۲۸۱ کس طرح سر گرائے جاتا ہے ۱
یار دیکھو تو میری خاک سے بھی دامن اپنا اٹھائے جاتا ہے ۲
خاک سے ہو گئے ہیں ہم یک سان پر وہ گھوڑا کدائے جاتا ہے ۳
رازداری کہاں تلک اے عشق غم بھی جاں کھائے جاتا ہے ۴
آہ گور آ لگے ہیں تس پہ بھی وہ ہمیں آزمائے جاتا ہے ۵
مجھ کو سیدھا سمجھ کے وہ کج باز اینڈی بینڈی سنائے جاتا ہے ۶
تیرے بازار حسن میں یوسف شرم سے مُنہ چھپائے جاتا ہے ۷
جاتا ہے اُس کے در سے جو کوئی راہ سے مُنہ بھرائے جاتا ہے ۸
کیا ہی دل کش ہے یہہ جہان خراب بن موئے یاں سے جائے جاتا ہے ۹
ایک تو آپ ہی مردہ ہوں میں ق درد جی کو کھپائے جاتا ہے ۱۰
پوچھنا تس پہ دوست داروں کا — اور بھی جان کھائے جاتا ہے ۱۱
میں ہوں اس سے بھی تیرہ روز رضا — وہ جو سرمہ لگائے جاتا ہے ۱۲
اٹھے ہیں گہہ زمیں سے گہہ آسمان سے ۲۸۲ عاشق کہاں ہوئے کہ گئے ہم جہان سے ۱
آئندہ دیکھیں کرتا ہے کیا کیا ادائیں عشق کی صرف میں نے زندگی اب تک تو آن سے ۲
دیکھا نگاہ تیز سے کس شوخ چشم نے آتے نظر ہیں منہ پہ تمہارے نشان سے ۳
سچ کہنا بوالہوس سے خفا تو نہیں ہوئے کچھ ان دنوں جو مجھ پہ بہت مہربان سے ۴
جس دن سے اُس نے اپنی سروہی کو باڑھ دی میں دم بہ دم گلے کو رگڑتا ہوں سان سے ۵

۶ ہر شے میں جلوہ گر ہے ولیکن یہ لطف ہے — باہر ہے وہم وفہم و قیاس و گمان سے
۷ جس دل میں داغ ہو رکھا ہے جان کی عزیز — یوسف نہیں نکلتا ہے ہر کاروان سے
۸ قاصد چلا ہے چھوڑ اسیران عشق کو — لے نام عاشقوں کا ہر اک دلستان سے
۹ بہتر تو ہے گر اپنے گرفتار کے تئیں — کہہ دیجیے کچھ آپ بھی اپنی زبان سے
۱۰ اک عمر میں بھی شعر کی خدمت کی لے رضا — پر حیف ہے ملا نہ کسی نکتہ دان سے

۱ اس خستہ جاں کو کون سی یارب دوا لگے ۲۸۳ جس کو کہ سانس لینے میں اک تیر سا لگے
۲ تاثیر ہے وہاں سے زیاد اس کے نام کو — بیمار عشق کی نہ کسی کو ہوا لگے
۳ سو عمر خضر سے ہو تری زندگی زیاد — گر ایک دن کی بھی مری تجھ کو دعا لگے
۴ جوں سایہ تیرے ساتھ لگا پھرتا ہے رقیب — اس بد بلا کو سخت کوئی بد بلا لگے
۵ مت منہ لگانا بوالہوس چاپلوس کو — جب لگ چلے زیادہ وہیں کہہ دو پا لگے
۶ یوں شعر میں تلاش سبھی کرتے ہیں رضا — اتنا تو ہو جو چوٹ بھی دل کو ذرا لگے

۱ ترے خیال میں کل زور خواب دیکھا ہے ۲۸۴ تمام سرو میں پھولا گلاب دیکھا ہے
۲ کمر کی زلف کی کاکل کی ہم سے مت پوچھو — تمام عمر یہی پیچ و تاب دیکھا ہے
۳ تو اور ہی کو ڈرا روز حشر سے واعظ — شب فراق میں ہم نے عذاب دیکھا ہے
۴ چلا ہے کعبے کو بت خانے سے رضا یارو — کسی نے ایسا خدائی خراب دیکھا ہے

۱ میں ہی نہیں ہوں برہم اس زلف کج ادا سے ۲۸۵ ٹک منہ ترا جو پائیں الجھیں ابھی ہوا سے
۲ تم نے نکالنے میں کچھ کم نہ کیں جفائیں — اب تک جو تھم رہے ہیں ہم اپنی ہی وفا سے
۳ پہلی نگہ میں دل پر برچھی سے لگ گئی ہے — پہنچے تھے انتہا کو ہم اس کی ابتدا سے
۴ رکھنا قدم زمیں پر ٹک دیکھ کر پیارے — دل راہ میں پڑے ہیں لاکھوں کے نقش پا سے
۵ جا لے طبیب یاں سے اتنا نہیں سمجھتا — بیماری محبت کس کی گئی دوا سے
۶ میں عاشق بلا ہوں کرتا ہوں اس کو سجدہ — خاک قدم کو اس کی جو آوے کربلا سے
۷ مشہور تھی بزرگی ان کی سبھوں سے لیکن — ق اپنے تئیں تعارف چنداں نہ تھا ضیا سے
۸ اکثر گلی سے اس کی دیکھا تھا میں نے جاتے — ہو گئے تھے اس سبب سے کچھ صورت آشنا سے
۹ کل ان کو میں نے دیکھا ننگے پا برہنہ — جامہ جو ہے گلے میں سو ٹکڑے جا بجا سے

در پردہ یوں میاں اُن سے پوچھا کہ قبلۂ من — کیوں آج اس قدر ہیں آزردہ و خفا سے ١٠

محجوب سے وہ ہو کر کہنے لگے نہ پوچھو — مرجائیں یا الٰہی چھوٹیں کہیں بلا سے ١١

یہہ طرفہ ماجرا ہے اک جا پہ دل دیا ہے — پر قہر ہیں وہاں کے لونڈے زرا زرا سے ١٢

اتنی سی عمر میں یہہ عیاریاں ہیں کرتے — لیتے ہیں دل کو پہلے دے دے بہت دلا سے ١٣

جب دیکھتے ہیں آیا اب اختیار میں دل — جو دیکھیو تو پھر پیش آتے ہیں اس ادا سے ١٤

میں نے کہا کہ حضرت آپ اپنی طرف دیکھیں — جو ان بتوں سے ہوگا سو ہوگا وہ خدا سے ١٥

بے اختیار ہو کر بولے کہ سچ ہے صاحب — واقف نہیں ہوئے ہو عشق ہوس فزا سے ١٦

دریا کے رہنے والے کیا جانیں اس اثر کو — پانی کی قدر پوچھو اُن سے جو ہیں پیاسے ١٧

انسان ہے یہہ یا ملک یا حور ہے یہہ یا پری ٢٠٦ اعجاز عیسیٰ لب میں ہے آنکھوں میں سحر سامری ١

صنعت نمائی تھی غرض یا قتل عالم مدعا — یہہ کیا کیا حیراں ہوں میں تیری جو کی صورتگری ٢

گر تو نہیں مستور ہے کس نے مجھے رسوا کیا — دیوانہ سا ں پھر کیوں ہوں میں گر تو نہیں شکل پری ٣

ہے حسن سے ایجاد عشق اور عشق سے اُس کی نمود — میں تجھ سے ہوں تو مجھ سے ہے اے واہ عشق و دلبری ٤

دیکھا رضا کو بعد مرگ اک عمر بھر جو خواب میں — ہونٹوں میں خشکی ہے وہی آنکھوں میں ہی ہے تری ٥

محرومی کا کوئی مجھ سا گرفتار نہ ہوئے ٢٠٧ ملتا ہے اور لذت دیدار نہ ہوئے ١

پوچھے ہے مرا حال وہ بے درد و لیکن — جس وقت مجھے طاقت گفتار نہ ہوئے ٢

اب جاتے تو ہو میر رضا اُس کی گلی میں — ڈرتا ہوں یہہ آنا تمھیں دشوار نہ ہوئے ٣

نہ ہم کو یاد کرتا ہے نہ تو یاں آپ آتا ہے ٢٠٨ خیال اپنے کو بلوا لے عبث یہہ کیوں ستاتا ہے ١

نہ کہتے حال دل کو اپنے اس کہنے سے بہتر تھا — تمھیں تو نیند آتی ہے ہمیں تو رونا آتا ہے ٢

نہ سودے کا مرض ہے تھا کہ جس سے یوں ہو دیوانہ — زرا چھپ بیٹھا گھر میں مجھے دردر پھرآتا ہے ٣

رضا کے جان دینے پر دل اک عالم کا کڑھتا ہے — تو جیتا رہیو تیرے بھی کبھی کچھ جی میں آتا ہے ٤

مری چشموں سے یوں سیلاب آنسو کا نکلتا ہے ٢٠٩ بھری بھادوں میں جیسے جوش سے دریا ابلتا ہے ١

رضا اپنے پہ تجھ کو رحم کچھ آتا نہیں ظالم — تری تو خستہ حالی دیکھ جی غیروں کا جلتا ہے ٢

جوں توں کے روز ہجر تو دو دھوکے کٹ گئے ٢١٠ پر چھاتی پر پہاڑ سی یہہ رات رہ گئی ١

اک دم نہ اور بیٹھے کہ ہو چکتا میں تمام — جی ہی میں آہ جی کی مرے بات رہ گئی ٢

۳ وعدہ کیا تھا صبح کا سو وہ بھی آئے ہائے
لے پیارے دن گزر گیا پر بات رہ گئی

۴ واں دیر راہ کی ہوئی یاں جلدی سے اجل — ہوتے ہی ہوتے ایسی ملاقات رہ گئی

۱ قصور دوستی افشا ہوا کیا مہرباں ہم سے ۲۹۱ نہ ہو دشمن سے کوئی جیسے تم ہو بدگماں ہم سے

۲ غنیمت ہی سمجھ تو ہم کو اب اے عشق جاں فرسا
گئے فرہاد و مجنوں ہی ترا نام و نشاں ہم سے

۳ رضا سے دل جلے کی سوزشیں سیکھے بیاں کرنے — سمجھ کر جی میں ہو نا شمع محفل ہم زباں ہم سے

۱ کہہ دل نہ اسے عشق میں جو زار نہ ہوئے ۲۹۲ وہ آنکھ نہیں غم سے جو خوں بار نہ ہوئے

۲ وہ دوست جو کچھ میری اذیت میں ہو مصروف
دشمن کے بھی کوئی درپے آزار نہ ہوئے

۳ کس کام کا انداز نگہ سست یہ تیرا — کیا وار ہے وہ سینے کے جو پار نہ ہوئے

۱ ہو گئے ہم جو تھے نپٹ سیانے ۲۹۳ رخ ترا دیکھتے ہی دیوانے

۲ ہم تجھے چشم یار گھوریں گے
مست تو ہے تو ہم ہیں دیوانے

۳ .... تیشہ کوہ کن سے پوچھ — جس کے سر پر پڑے وہی جانے

۱ ہیں مر جائیں اب کہ یار آئے ۲۹۴ دیکھئے کب تئیں قرار آئے

۲ ایک اس سے کہی نہیں جاتی
بات جی میں اگر ہزار آئے

۳ جیتے جی گالی بھی نہ دی اے کاش
فاتحے کو سر مزار آئے

۴ میرے مرنے کی کہیو اے قاصد
جس طرح اس کو اعتبار آئے

۵ یہہ وصیت ہے خاک پر میری
جو کوئی آئے اشک بار آئے

۶ تم تو لاؤ رضا کو گر یک بار — آپ سے پھر ہزار بار آئے

۱ کہاں کا پیغام اور نامہ غرض یہہ احوال نامہ بر ہے ۲۹۵ خبر کو بھیجا تھا اُس کی ہم نے سو آپ ہی آیا تو خبر ہے

۲ نیاز مند ہم کو مار ڈالا یہ ناز بے جا بتا تو کب تک
بہانہ کرتا ہے نیند کا کیا ہمارا قصہ تو مختصر ہے

۳ جفا سے اُس کی وفا زیادہ یہ کس کی قدرت یہ کس کی طاقت
نہ بھائی ہم سے تو یہہ نہ ہوگا ترا لو بڑا ہی جگر ہے

۴ اگر نہیں قتل کیا کسی نے تو اس سے ہوتا ہی کیا بالے
کسی کا جیرا ہی سرخ شاید کہ خون میرا کسی کے سر ہے

۵ دہن کسی کا کمر کسی کی نظر میں آئے کہو سو کیوں کر — عدم کی ہیں گی یہ سب نشانی نہ کچھ دہن ہے نہ کچھ کمر ہے

۱ دل رنجور پر یہہ بار غم اے یار بھاری ہے ۲۹۶ بہت ہم نے اٹھایا پر بہت اس بار بھاری ہے

۲ نہ جا بالیں سے میرے شک ترحم کر کے کہتے ہیں
شب ہجراں ترے بیمار پر اے یار بھاری ہے

منڈائی اُس نے جب ابرو میں بولا کیا کیا ظالم لگا کہنے مرے قبضے پہ یہ تلوار بھاری ہے ۳

رضا دہشت نہیں محشر کی حیدر کی محبت کی ـــ ہمارا پلۂ میزاں جنوں کہار بھاری ہے ۴

یوں ہیں مری جان لیا چاہیے ۲۹۷ یا بھی کبھی دل ہی دیا چاہیے ۱

کیسی قیامت ہے وعدہ بنے کے کتنے دن اب اور جیا چاہیے ۲

جامۂ مجنوں کا مرے بن سیے چاک گریباں کا سیا چاہیے ۳

لے گیا لیلیٰ کو وہ مجنوں کے پاس ناقے کے قدموں کو لیا چاہیے ۴

غیر ہے ناپ کے قابل نہیں اُس کے تئیں زہر دیا چاہیے ۵

عشق کا بیمار اگر مر بھی جائے تو بھی دوا اُس کی کیا چاہیے ۶

ساقیِ دوراں کے رضا ہاتھ سے ـــ صاف ہو یا دُرد پیا چاہیے ۷

تجھ کو ہرجائی کوئی کیا چاہے ۲۹۸ موت عالم کی تا کجا چاہے ۱

اُس سے کیا دعویٰ کیجے جو ظالم قتل کر آپ ہی خوں بہا چاہے ۲

اُس کو بے درد ماریو یارب درد کی میرے جو دوا چاہے ۳

ترک عشقِ بتاں رضا ہم تو ـــ چاہتے ہیں اگر خدا چاہے ۴

یا فقیری ہے یا کہ شاہی ہے ۲۹۹ عشق میں دونوں روسیاہی ہے ۱

اس طرح اُس کو موت دے یارب زندگی میری جس نے چاہی ہے ۲

اپنا دکھلائے گوشۂ دستار گل کو دعوائے کج کلاہی ہے ۳

کیوں کے اس پر نہ ملے رضا مر ہے ـــ خوب صورت ہے اور سپاہی ہے ۴

گلِ عشاق رنگ باختہ ہے ۳۰۰ سرو اپنے چمن کا فاختہ ہے ۱

آتشِ غم سے آپ سنگ ہوئے اشک آئینۂ گداختہ ہے ۲

عشق بالا ہے حسن سرکش سے سایۂ سرو بال فاختہ ہے ۳

کوئی کہتا اسیرِ ساغر کو ہند میں بھی ہوا مراختہ ہے ۴

دیکھ سودا رضا کا دیوانے ـــ تیرا مجنوں جنوں ساختہ ہے ۵

سب یار ملتے ہیں گلے یہ کہہ کہہ کے عید ہے ۳۰۱ تو مجھ سے دور بھاگے نہایت بعید ہے ۱

مت دیکھ چشم سے یہ روز کسی ہلال قفلِ در مراد کے حق میں کلید ہے ۲

۳ ہم جانتے ہیں اُس کے تئیں پیرِ رضا — طفلی سے نوجوانوں کا جو کوئی مرید ہے

۱ نہ ہو خوش وصل سے بھی خاطرِ اندوہ گیں اپنی ۳۰۲ کہ اول دیکھنے میں ہے نگاہ واپسیں اپنی

۲ شبِ ہجراں میں نت لے اشک سوزاں تیری دوری سے — بہ سانِ شمع آتش در بغل ہے آستیں اپنی

۳ رضا گر دمی کی فکر ہو سحر آفریں کیا غم — کہ ہے فضلِ خدا سے طبع اعجاز آفریں اپنی

۱ درد کا مبتلا کیا تو نے ۳۰۳ عشقِ بے درد کیا کیا تو نے

۲ کیا ہوا گل کھلے چمن کے نسیم — کسی کا دل بھی وا کیا تو نے

۳ دل دیا ایسے بے وفا کو رضا — کیا کیا تو نے کیا کیا تو نے

۱ جب اٹھے تیرے آستانے سے ۳۰۴ جانیو اُٹھ گئے زمانے سے

۲ دن بھلا انتظار میں گزرا — رات کاٹیں گے کس بہانے سے

۳ جان بھی کچھ ہو جو نہ کیجے نثار — مر نہ جائیں گے اُس کے جانے سے

۴ ایک اس لف سے اٹھایا ہاتھ — چھٹ گئے لاکھوں شاخسانے سے

۵ کوئی مرجاؤ کام ہے اُس کو — اپنی تروار آزمانے سے

۶ اُس کے تیرِ نگاہ کے آگے — کچھ ہمیں بن گئے نشانے سے

۷ ناتوانی تجھے غضب آ لے — گئے اُس کی گلی کے جانے سے

۸ کہاں بنگالہ اور کہاں میں رضا — بس نہیں چلتا آب و دانے سے

۱ کس طرح چھپائیں محبت ہم نالوں سے چاہ نکلتی ہے ۳۰۵ جب ذکر کسی کا آجاتا ہے دل سے آہ نکلتی ہے

۲ یہہ کس کی آنکھوں کے سُرمے نے کیا گھر ہے میری آنکھوں میں — آنسو ہی نہیں نکلیں ہیں سیاہ نگہ بھی سیاہ نکلتی ہے

۳ کیا جانے کیسی آن پڑی کیوں ہم سے آہ کو لاگ پڑی — جب جاتے ہیں اُس کی مجلس میں یہہ خواہ مخواہ نکلتی ہے

۴ راتوں کو شکوہ میں سود نہیں چوری کی نمود نمو نہیں — ہو صبح تو اُس کو نکلنے دے تری شیخی ناہ نکلتی ہے

۵ رکھتے ہیں پاؤں پریں ہیں کہیں جاتے ہیں کہیں بے ہوش ہیں — ہر ایک قدم پر گرتے ہیں کس گھر کو یہ راہ نکلتی ہے

۶ جو شعر شناس یہاں سے ہیں کیا جانے رضا یہ کہاں کے ہیں — مذکور تو کیا ہے آہ کریں نہیں منہ سے واہ نکلتی ہے

۱ خطا آیا تس پہ بھی اُس میں کیا ہی آن نکلتی ہے ۳۰۶ بن ٹھن کر جب نکلے ہے وہ اپنی جان نکلتی ہے

۲ .... — منہ کے کھلنے کی ہے نشانی جب کہ کمان نکلتی ہے

۳ غیرت ہوئی گلوگیر اپنی یوں نکلے اس بزم سے ہم — جیسے پھانسی دینے میں گھبرا کے جان نکلتی ہے

تیر ہے یا یہہ برچھی ہے جو دل کو چھید ڈالے — سنتا زاہد مطرب کی کس ادا سے تان نکلتی ہے ۴
کس کا دارا کون سکندر کیسا خسرو ہم تو رضا — بندے ہیں اُن کے جن میں خدائی کی شان نکلتی ہے ۵

۲۰۷
یعقوب خوش نہ ہوگا بوے گل و شمن سے — آ اے صبا لپٹ کر یوسف کے پیرہن سے ۱
کس سے کہوں کرے گا کون اعتبار اس کو — ہے مجھ کو تلخ کامی اُس شکریں دہن سے ۲
کیا غم ہے تجھ کو اے دل کچھ کہہ تو اپنے جی کی — پوچھے نہ انجمن سے خوش ہو نہ تو چمن سے ۳
کیوں لالہ بے ستوں کا کرتا ہے داغ دل کو — پانی اُسے دیا ہے کیا خون کوہ کن سے ۴
ہوتا ہے کوئی پیوند اب آہنے شیشہ — کب زخم دل ہو بہتر ناصح ترے سخن سے ۵
یوں میرے گھر سے نکلا وہ شوخ شاد و خرم — جس طرح عارفوں کا نکلے ہے جان تن سے ۶
اس دشت پُر خطر میں جاتا ہوں میں اکیلا — ریگ رواں کو جس کے ہے خوف راہ زن سے ۷
کھلتا ہے ہوا سے اک جنبش مژہ کی — کیا برگ گل کو نسبت اُس نازنیں بدن سے ۸
بیماری بوالہوس کی سن کر بہت کڑھا وہ — بیمار میں ہوا ہوں یارو اسی کڑھن سے ۹
سنتے تو تھے رضا ہم سب ہیں بڑے مسلماں — پر کفر میں زیادہ نکلے دو برہمن سے ۱۰

۲۰۸
عاشق کو زندگی شب ہجراں نہ چاہیے — اے مرگ اتنی دیر مری جان نہ چاہیے ۱
دل کا مرے یہ حال ہے دشمن بھی رحم سے — کہتے ہیں اتنی دشمنی جان نہ چاہیے ۲
سینے کا زخم مجھ کو چھپاتا ہے اور ہائے — بے چاک عاشقی میں گریباں نہ چاہیے ۳
نہ شمع ٹھہرے اور نہ لگے سبزہ گور پر — اتنی بھی گرمی اے دل سوزاں نہ چاہیے ۴
جس زہر سے کہ ہوتے ہیں آسودگاں تمام — اُس سے ہلاک خستہ درونان نہ چاہیے ۵
وقت وداع مانع نظارہ تو نہ ہو — ہر وقت جوش دیدۂ گریاں نہ چاہیے ۶
مرگ رقیب سننے کی مجھ کو خوشی ہے لیک — کہتا ہے رشک ذکر بھی یہہ یاں نہ چاہیے ۷
آشفتہ کیوں ہو آئینہ خانے میں کیا گئے — یاروں کا راز یاروں سے پنہاں نہ چاہیے ۸
جو دل کہ کوے یار کے جانے سے وا نہ ہو — واشد کو اُس کی سیر گلستاں نہ چاہیے ۹
اے دل جو شرمگیں کبھی دیکھے تری طرف — یوں بے خودی سے کرنا پشیماں نہ چاہیے ۱۰
خود عشق سر کے دینے کا ساماں ہے رضا — کہتے ہیں عشق میں سر و ساماں نہ چاہیے ۱۱

۲۰۹
میں جان دیتا ہوں غمزۂ یار کے لیے — گل سے کسی نے توڑا نہیں خار کے لیے ۱

۲ میرے لیے خدا نے دیا ہے تجھے یہ حسن
خلقت دوا کی ہوئے ہے بیمار کے لیے

۳ ہم کو دیا قضا نے ہے اک خوں گرفتہ دل
سو ہے وہ بھی دیدۂ خوں بار کے لیے

۴ ہم کو ملی ہے عشق سے اک آہ سوز ناک
وہ بھی اُسی کی گرمئ بازار کے لیے

۵ حربا کی طرح تکتے ہیں خورشید کی طرف
ہم سے غریب سایۂ دیوار کے لیے

۶ لازم ہے خاک سے بھی کبھی کیجیے بسر
سر کو فقط نہ جانیے دستار کے لیے

۷ اے وائے خونِ دل سے ہے آسودہ میری آنکھ
اور چشم پاک چاہیے دیدار کے لیے

۸ دل کو گلِ بہشت کا داغی نہ کر رضا — یہہ آئینہ بنا ہے رُخِ یار کے لیے

۱ روئیے کس کے لیے اور کس کا ماتم کیجیے ۲۱۰ عمر جاتی ہے چلی کچھ اپنا ہی غم کیجیے

۲ گر نہیں اپنی جمعیت پر بہت لاچار ہیں
درد کچھ بھی کم ہو تو نالہ بہت کم کیجیے

۳ اُس کے جلوے نے کیا طاقت تمام اے ہم نشیں
سخت حیرانی ہے کیوں کر چشم پُر نم کیجیے

۴ عشق سو محنت ہے کیا کہیے دل بے تاب کو
ایک دو ملزوم نہیں کس طرح ملزم کیجیے

۵ قتل کا وعدہ تمھاری چشم دیتی ہے ولیک
مست ہیں وے آپ یہہ پیمان محکم کیجیے

۶ خاک میں ہم راہ آخر لے گیا سب رازِ عشق
اپنی غیرت نے نہ چاہا کوئی محرم کیجیے

۷ چشم رکھنا ابرِ تر پر دون ہمت ہے رضا — روئیے اور کشت اپنا سبز خرم کیجیے

۱ کشش دل کی کوئی مرنے سے بے تاثیر ہوتی ہے ۲۱۱ جو عاشق خاک ہو تو خاک دامن گیر ہوتی ہے

۲ کروں کیا کیونکہ لکھوں حال دل حیرانی رہا تھا
جو کہنے میں نہ آئے بات سو تحریر ہوتی ہے

۳ دل بے تاب مرنے پر بھی خاک اپنے نہ کام آیا
غلط ہے کشتۂ سیماب کی اکسیر ہوتی ہے

۴ یہ طوق گردنِ دل ہے وہ ہے گو پاؤں کی بیڑی
مقابل اُس کی زلفوں کے کوئی زنجیر ہوتی ہے

۵ کبھی اک بوسہ اٹھا تھا روبہ خشکیاں رکھنا ہیں
فرشتے ہم نہیں انسان سے تقصیر ہوتی ہے

۶ عمارت دیر و مسجد کی بنی ہے اینٹ و پتھر سے
دل ویرانہ کی کس چیز سے تعمیر ہوتی ہے

۷ کہا ہنسنے کو میں سو بات ہی موقوف کی اُس نے
غرض تقصیر کی دونی یہاں تعزیر ہوتی ہے

۸ جوانی ہی میں یہاں دخت رز نہیں ہے اپنی مستانی
قیامت حالت پیری میں یہہ بے پیر ہوتی ہے

۹ شب لیلیٰ کی زلف دیکھی خوابوں میں اور صبح کیا دیکھا — مرے زنجیر کرنے کی رضا تدبیر ہوتی ہے

۱ نالہ نہ کیجیے اُس کو جو شعلہ ور نہ ہوئے ۲۱۲ وہ اشک کیا ہے جس میں لختِ جگر نہ ہوئے

اے آہ گرم تجھ کو کچھ بھی ہے شرم آتی یاں جل کے راکھ ہوں میں اُن کچھ اثر نہ ہوئے ۲
سبدعیے زندگانی دشواری میں تو کاٹی آجا نظر کہ مرنا دشوار تر نہ ہوئے ۳
ہر دم شکستہ رنگی کرتی ہے بہار ن کیا غم اگر چمن میں مجھ کو گذر نہ ہوئے ۴
تجھ بن اگر ہنر ہے ٹک دیکھ عیب اپنا دشمن کے عیب سے ہرگز ہنر نہ ہوئے ۵
آئینہ ساں بنا ہے تو جسم تو سراپا یہ دیکھنا تعین جائے نظر نہ ہوئے ۶
اب کام تو رضا کا جی دینے سے بھی گزرا — بہتر ہے اس قدر عشق ہوئے. نہ ہوئے ۷
۲۱۳ کس لیے صحرا کے محتاج تماشا ہو جیے چاک کیجیے سینے کو اور آپ ہی صحرا ہو جیے ۱
کشتۂ لب ہو کے کیجیے جاوداں اب زندگی کیوں عبث منت کش خضر و مسیحا ہو جیے ۲
چشم احول سب کو دیکھے ہے زیادہ آپ سے عین بینائی ہو گر اس طرح بینا ہو جیے ۳
کب تلک سرگشتہ رہیے دن کو مثل گرد باد رات کو جوں شمع جلنے کو مہیا ہو جیے ۴
اس قدر ہم دل گرفتہ ہیں کہ مشکل ہے بہت اُس کے بند جامہ وا ہونے پہ بھی وا ہو جیے ۵
مجھ سے یہ مجوبی اور دشمن سے ایسا اختلاط شرم کیجے بے وفائی میں نہ رسوا ہو جیے ۶
آنا یوں تیوری چڑھائے مُنہ بنائے فائدہ گر یہی صورت ہو مت تشریف فرما ہو جیے ۷
بوالہوس کا یوں ہدف کیجیے نشانہ تیر کا غافل اپنی قدر سے بے درد آشنا ہو جیے ۸
جوں جرس بام و در ہر خانہ سے اٹھے گا شور مت سفر سے حشر برپا ساز سحا ہو جیے ۹
خانہ ویراں کر کے دیوا سے ہے نقش بوریا — کچھ نہ ہوئے پھر بھلا کیا کیجیے کیا ہو جیے ۱۰
۲۱۴ ہر اک کا حوصلہ چاہے ہے بحر و بر لیوے پہ مردہ جو لب خشک و چشم تر لیوے ۱
فلک عمارتوں کا اُس پر رکھے ہے احساں جو اس خرابے میں اک اینٹ زیر سر لیوے ۲
سوائے آہ شرر بار کوئی ایسا نہیں چراغ کی مرے بالیں پہ جو خبر لیوے ۳
سوائے نفس سے راہ زن نہیں بہتر جو راہ عشق میں چاہے کہ راہ بر لیوے ۴
کہاں سے پائی جہنم نے اس قدر سوزش مگر وہ آہ گنہگاروں سے اثر لیوے ۵
یہ میری چشم کو ہے ذوق خوں فشانی کا جو دل تمام ہو خونابۂ جگر لیوے ۶
یہ کیا تشابہ ہے قاصد مت آشنا ہو بے درد ٹھک جا کہتا ہوں ٹک دل مرا ٹھہر لیوے ۷
رضا نہ مانگ فلک سے کہ خو ہے سفلے کی — ندا بھی دیوے اُدھر پھر دیں ادھر لیوے ۸

۱ غرورِ حسن سے تم کب ہماری داد کو پہنچے ۲۱۵ پر اتنا تو کہو تیری خدا فریاد کو پہنچے

۲ نکلنا جان پُرحسرت کا میری سخت مشکل ہے اجل اے دردِ نومیدی مگر امداد کو پہنچے

۳ ملا شیریں سے گو خسرو پہ غیرتِ عشق کی دیکھو یہ کہتا تھا مبادا یہہ خبر فرہاد کو پہنچے

۴ اجل کرتی ہے غمخواری مری اب بھی پرستاری ہم اس حالت کو کہنا اُس ستم ایجاد کو پہنچے

۵ نہ گفتار اور نہ رفتار اک نقطہ رعنائی قد پر ترا کب سرِ قمری مرے شمشاد کو پہنچے

۶ رضا استاد ہے لیکن ضیا سے اُس کو کیا نسبت — خدا کو پہلے پہنچے تب مرے استاد کو پہنچے

۱ افسوس مرے درد کی تدبیر نہیں ہے ۲۱۶ فریاد کہ فریاد میں تاثیر نہیں ہے

۲ خاکسترِ پروانہ ابھی گرم ہے متغیر غفلت کو مری کیا ہوا تغییر نہیں ہے

۳ تقصیر میں افراط جو کی بندے نے کیا غم رحمت میں خداوند کی تقصیر نہیں ہے

۴ کیا دیکھا ہے معلوم نہیں کل سے رضا نے — حیرت زدہ ایسی کوئی تصویر نہیں ہے

۱ زخمِ جگر شگفتہ ہوں سینے کے داغ دیکھیے ۲۱۷ کہنے پر آئی بہار اپنا ہی باغ دیکھیے

۲ دل کا نشان زلف میں شانے سے تو نہ پایا ہے باقی رہا ہے خط میں اب اس کا سراغ دیکھیے

۳ تیشے نے تیرا کوہ کن دور کیا ہے دردِ سر پاتے ہیں اس بلا سے یار ہم بھی فراغ دیکھیے

۴ ہوتا ہے یہہ فروغِ بزم تا کہ جلے مزار پر کرتے ہیں ہم بھی روشن اب اپنا چراغ دیکھیے

۵ تو تو چمن کی سیر کا وعدہ کرے ہے کل رضا — شام تلک رہے بحال اپنا دماغ دیکھیے

۱ یاد ہے اُن روز دن کی جب تم ہم سے محبت رکھتے تھے ۲۱۸ یار نہ تھے واں محرم کوئی ایسی خلوت رکھتے تھے

۲ غم کے مارے ضعف سے اب تو قدرت چلنے کی نہیں کوچے میں تیرے آتے تھے جب پاؤں میں طاقت رکھتے تھے

۳ مت ہو خفا گر آپ کو مارا دیکھ کے غیر کو تیرے پاس اس میں ہم لاچار بہت ہیں کیا کریں غیرت رکھتے تھے

۴ مجھ کو دیکھ جنون نے ظالم دل نہ دیا کیا خوب کیا ہم سے یوں ناواقف تھے وے لوگ کرامت رکھتے تھے

۵ اب جو تم تلوار بہت ان روز دن ہاتھ میں رکھتے ہو تیر نگہہ اور خنجرِ مژگاں کیا کم آفت رکھتے تھے

۶ بھول نہ بیٹھ اُس غنچہ دہن کی بات پہ دشمن ہرگز خوار پھرے ہیں جیسے اب ہم ویسی عزت رکھتے تھے

۷ سیرِ چمن کی دید گلوں کا صحبت یاروں کی ہر وقت قیدِ محبت تھی نہیں جب تک کیا ہی فراغت رکھتے تھے

۸ کیا کہیے اپنے تو جنون نے شہر و بیاباں ایک کیا کوہ کن اور مجنوں اور وامق سے تو وحشت رکھتے تھے

۹ گر پڑا اُس کے در پر جب تابوت ہمارا بولے لوگ — میر رضا معلوم ہوا اب جی میں محبت رکھتے تھے

ہم کو یارب ایسے کہاں سے چشم طوفان بھرے ۲۱۹ دل کے ٹکڑے جو نکلے وہیں پُرنے جگر کے آن بھرے ۱
تیر لیا جب ہاتھ میں اُس نے خوفِ اذیت عشق سے آہ سوکھ گیا وہیں لہو اپنا ایسا نہ ہو پیکان بھرے ۲
کس کا ساتھ ملا ایسا جو بیٹھے میرے پاس نہیں اب جو مری کچھ سنتے نہیں تم کس نے تمھارے کان بھرے ۳
دائے قرینہ اس گلشن کا آہ نصیبہ عاشق کا کوئی گریباں گل سے بھرے کوئی حسرت سے داماں بھرے ۴
یچ ہے اگر تو اس کے در سے دشمن ہے جائے نہ بہرا — کیوں روٹھے ہو میر رضا ہم بھی چلے ارمان بھرے ۵
ل چشم تیری ہے فروش اور عشوہ اوباشی کرے ۲۲۰ پھر اختیار اب دل مرا کیوں کر نہ قلّاشی نہ کرے ۱
حیت صبر و قرار اپنی گئی تھوڑی ہی نہیں کہہ دے میاں دل کھول کر غم تیرا عیّاشی کرے ۲
نی تو فرصت دے فلک بعد اپنے جو کوئی سُنے — میری وفا اُس کی جفا وہ تیری شاباشی کرے ۳
ری تو لو سے پیراہن نے یعقوب آنکھ روشن کی ۲۲۱ زلیخا نے نہ پائی گرد بھی یوسف کے دامن کی ۱
ں وہ کافر ہوں اندھا دیر میں بوڑھا ہوا لیکن نہ دیکھی بت کی صورت اور نہ خدمت کی برہمن کی ۲
ں جو نکلا سگان کو تو اس کے غل مچا یا یہ صدا موتی کے خانے میں اٹھے ہو جیسے شیون کی ۳
یں تیرا توجہ تیرا لطف سدا سب پہ روشن ہے کہ ہوتا ہے چراغ آخر جو ہوا افراط روغن کی ۴
بر ہے جیکو درد عشق کی بلبل کی خاطر کو خزاں میں کرتے ہیں زینت گل کا غنچے گلشن کی ۵
یئے ہم دیر واقف حسن جاں افروز سے تیرے رہی جب رات باقی تھوڑی سی تب شمع روشن کی ۶
میہ اُس کا سا اب لے رضا لاؤں کہاں سے میں — اگرچہ اور باتوں میں کروں تقلید دشمن کی ۷
کلمۃ الحق جو کیا عشق نے ارشاد مجھے ۲۲۲ نہ رہا سوا سورۂ اخلاص سوا یاد مجھے ۱
کیا تعلق ہی نکلی کا تعلق کم ہے یہ غلط فہم عبث کہتے ہیں آزاد مجھے ۲
تیز کرتا ہے مرے قتل پہ خنجر لے وا ے کچھ بھی لذت نہ رہے ذبح کی تا یاد مجھے ۳
یاں جگر کاوی ہو داں ہوگی اگر کوہ کنی چوم لے ہاتھ مرا دیکھے جو فرہاد مجھے ۴
کیوں کے نامحرموں میں لوں گا ترے نام کو آہ گو ملے حشر کے دن رخصتِ فریاد مجھے ۵
میں تو شاگرد کے قابل بھی نہیں میر رضا — خوبی یاروں کی ہے جو کہتے ہیں استاد مجھے ۶
گالی بھی تو جو دے اسے ہاسا نہ دے ۲۲۳ پھر کیا کرے کہ عاشق مسکیں دعا نہ دے ۱
بے دست و پا ہیں خوف سے ہم ہائے کیا کریں باد سحر کسی کا جو برقع اٹھا نہ دے ۲
تم ہر کسی کو اپنا تماشا دکھاتے ہو غیرت کہیں ہمارا تماشا دکھا نہ دے ۳

۴ اپنے لیے وفا اُسے سکھلاتا ہے رقیب — یارب جفا کہیں مرے حق کی بھلا نہ دے

۵ یاروں کو ہے امید مری آہ گرم پر — ہے مجھ کو ڈر اثر کہیں اپنا جلا نہ دے

۶ پہلو میں تیرے بیٹھیں سو ایسے کہاں نصیب — یہ بس ہو سامنے سے ہی مجھ کو اٹھا نہ دے

۷ لذت نہ لیو اُس کو شہادت کے جام کی — قاتل کو دیکھتے جو سر اپنا جھکا نہ دے

۸ دوزخ سے میں جو ڈرتا ہوں اتنے لیے رضا — ہم سایہ شیخ کا کہیں مجھ کو خدا نہ دے

۱ غیر ہی سے نہیں شاکی ہوں میں دل برسے بھی ۲۲۴ میں تنہا نہیں اپنے دل مضطر سے بھی

۲ آسماں ٹوٹ پڑے کاش ترے سر پر عشق — دل کے تو داغ زیادہ ہوئے اختر سے بھی

۳ اُس کی صورت کا کھلا گل کوئی ایسا بلبل — اب کے نالے ترے ترے موثر ہیں نیشتر سے بھی

۴ جام میں حسن کو شربت دیدار بھریں — تشنگی عشق کی جاتی نہیں کوثر سے بھی

۵ اے تو بھی نہ مٹا اُس رخ گل فام کا داغ — دل کو پرچایا بہت لالۂ احمر سے بھی

۶ جی میں تھا دل میں جگہ تیرے کریں گے سو ہائے — غیر کے ہاتھ سے اٹھنا پڑا اب در سے بھی

۷ گر یہی جلوہ ترا ہے تو میں اپنی داد — درد دل کہہ چکے ہم داور محشر سے بھی

۸ آپ کی وعدہ خلافی کی اور آزردہ ہوا — بات رنجش کی ہوئی کہہ کوئی ادھر سے بھی

۹ ڈر خدا سے نہ کرلے شیخ رضا کی تکفیر — رہ گیا دل تو نہ کنعاں کے پیمبر سے بھی

۱ عرض ہے وقت سفر اُس ظالم بیداد سے ۲۲۵ اڑنے کا ڈرہ کے تک بے طاقتوں کی یاد سے

۲ نقش شیریں کا مٹے پتھر سے پر اس کا خیال — یہ نہیں ممکن کہ جائے خاطر فرہاد سے

۳ کر دیا نالوں نے ٹکڑے ٹکڑے جس کو — کیوں جرس بیٹھا نہیں تیرا گلا فریاد سے

۴ شعلے نے خس سے نہ پانی نے کیا آگ سے — آرزو نے جو کیا اپنے دل ناشاد سے

۵ مت صفیر دل سے نمک پاشی گرفتار دیر کر — اے رضا کیو چمن میں طائر آزاد سے

۶ تیرے شعروں میں رضا استاد کی سی بات ہے — ہم بھی لیویں گے صلاح اب تیرے ہی شاد سے

۱ نہ تم سمجھے نہ طاقت دل میں درد رشک سہنے کی ۲۲۶ ہم اب لاچار کہتے ہیں نہیں جو بات کہنے کی

۲ نہ تنگ آیا ہے دل اپنا طبیب اس داغ ہجراں سے — دوا کوئی دے مجھے دل کے لہو جو کر کے بہنے کی

۳ اُسے مجھ ہی پر وعدہ خلافی کی تماشا ہے — مجھے شرمندگی ہے ایسا تک اپنے جیتے رہنے کی

۴ سخن سازی میں سب قاصد کی جو پر وصل کا مژدہ — دگرنہ اُس کے آگے کس کو طاقت بات کہنے کی

وہ جیں دم یاؤ اسکا رہا ہر گز نہ جائے گا رضا مٹ جا کہ یہ عزت ہے کی ۵

مت آوے رمانہ مجھ کو ٹار سا ہے ۲۲۷ کہتے ہیں یہ بلا ہی جو تیر بے صدا ہے ۱

ذکر ئے صبا نہ کریو میری گرفتگی کا غنچوں کے تئیں نہایت اب کھلنے کی ہوا ہی ۲

چہرے سے میرے ظاہر ہوتا ہی عشق اُس کا مجھ کو بھی ساتھ میں نے کر اب پوچھنا ہی ۳

یہ غم ہی بعد میرے دیکھے گا کون تجھ کو مرنے سے جی چھپانا کیا بے سبب مرا ہی ۴

یوسف سے میں کہوں ہوں کیا ہی خواب میں نے میری بغل میں شب کو تو آکے سو رہا ہی ۵

کس کو دکھائیں گے ہم یہ رونی صورت اپنی روز جدائی جتنا تاریک ہو بجا ہی ۶

یوسف کو بس نے دیکھا وہ اور کس کو دیکھے یعقوب اور زلیخا گر کور ہوں بجا ہی ۷

جس نے اُدھر کو دیکھا پھر آپ میں نہ آیا کیا نیرا گوشہ بام دیوار قہقہہ ہی ۸

تجھ کو نہ حیف آیا افسوس ہی رضا پر ـــــ احوال میرا سن کر غیروں نے رو دیا ہی ۹

بھری اک آہ ہم سے اُن نے پوچھی جو کی سبکی ۲۲۸ بہت وقت پہ کہیے اگر تھوڑی ہی مطلب کی ۱

ہر اک سے دل کو میرے بے طرح کی ناک لگاوٹ ہی کہوں کس کس کی سینے کی بدن کی گات کی چھب کی ۲

کیا نا آشنا یک بار سارے آشناؤں سے تجھے ای آشنا یہ آشنائی مجھ سے تھی کب کی ۳

نہیں حاصل ہوا اپنا کوئی مطلب زمانے میں یہی اک ہوئی ہی گردش فلک کی اپنے مطلب کی ۴

اٹھا تو جس گھڑی سب لگے شور و فغاں اٹھنے قیامت ہی مگر قد کے ترے سائے میں کیا دبکی ۵

سننے سے جس کے اپنے منہ میں پانی بھر بھر آتا ہی ـــــ وہ ہی کون اے رضا ایسا یہ کس کی بات ہی کب کی ۶

مت شاد ہو جو تجھ کو سارا جہان دیوے ۲۲۹ آخر کو چھین لیوے جو آسمان دیوے ۱

ہو جائے دم میں فیصل بس جان دہی کا قصہ تروار کو وہ اپنی گر درمیان دیوے ۲

تھی نزع ہوئے جوں تیسے جاں گوارا اک بوسہ گر مجھے وہ شکر دہان دیوے ۳

بسمل نہیں تڑپتا قاتل کا چاہتا ہے قدموں پہ دیوے بوسہ ساتھ جان دیوے ۴

دل میں بھری ہوئی ہیں باتیں بہت سی لیکن بات اتنی ہے کہ کچھ بھی یاری زبان دیوے ۵

بلبل کے دل سے پوچھو کیا اُس پہ ہی گزرتی اک برگ گل کسی کو گر باغبان دیوے ۶

دل اُس کا چاہتا ہی چھاتی لگائے رکھیے جو نام سن کے میرا خنجر کو سان دیوے ۷

پیری و عشق بازی یارو دعا کرو تم اللہ میرے دل کو تاب و توان دیوے ۸

۹ ضامن نہ دیوے جب تک بہ قہر رضا نہ مانوں ـــــ سو بار اپنے منہ سے گر وہ زبان دیوے

۱ کیا کہئے ہو اب یارو اس عشق کی رسوائی ۲۲۰ جس کے لیے سودا ہی ہو سو ہی کہے سودائی

۲ وہ چوٹ مرے دل نے اس عشق میں ہے کھائی جوں تیر نکل تن سے جاں اپنی نہ پھر آئی

۳ ہر شام پہ ندھا دل میں اس مہ کا خیال ایسا جو صبح تلک میری آنکھوں میں نہ نیند آئی

۴ اک جانے سے یوسف کے یعقوب گئی ساری یادِ قوائی اور آنکھوں کی بینائی

غزل ا سے غزل ۳۸ تک ن اور ن ا دونوں میں ہے اس فرق کے ساتھ کہ بعض اشعار اور غزل ۳۸ کا آخری مصرع ن ا میں نہیں۔ ۳۹ سے ۲۲۶ تک صرف ن میں، ۲۲۷ سے ۲۱۱ تک دونوں میں اور ۲۱۲ سے ۲۲۰ تک صرف ن ا میں ہے۔

اُن تذکروں میں جو رضا کی زندگی میں مکمل ہوئے دیوان کے حسبِ ذیل اشعار ہیں: ۲/۴۰ (یعنی چالیسویں غزل کا دوسرا شعر) گلزارِ ابراہیم، ۱۵۳/۳ اور ۲۱۸/۲ تذکرہ شورش، ۲۷۵/۳ گلزار، ۵۸۶/۲ گلزار اور گلشنِ سخن ۲۲۰/۱ تذکرہ شورش۔

کبھی حنا کی طرح ہاتھ بھی نہ لال کیا ۲۲۱ عبث لہو مرا قاتل نے ہائے مال کیا

ترا ہمارا تو اک نئی طرح سے کل سکتا تھا ۲۲۲ ڈھلے تھا جوں جوں دن وعدے کا یاں نکا دھکتا تھا

نہیں یہ داغ سے جلتا ہے دل جگر اپنا ۲۲۳ چراغ لے کے دکھاتے ہیں غم کو گھر اپنا

شکوہ کریں کسی سے ہم ہائے کیا کسی کا ۲۲۴ اپنا ہی دل ہوا ہے دشمن ہمارے جی کا

ملے اس شوق سے ہم اور تری تلوار باہم ۲۲۵ جس طرح ملتے ہیں بچھڑے ہوئے دو یار باہم

ہم سے اگر ملول ہو غیر سے شادماں رہو ۲۲۶ اپنی بھی ہے خوشی یہی خوش رہو تم جہاں رہو

تیر بتاں کو کھا کر کہتا ہوں اے رضا میں ۲۲۷ شکر اُس خدا کا جس نے نعمت دی مجھ گدا کو

گر خوش نہ کیا مجھ کو نہیں اس کا تو غم ہائے ۲۲۸ ہوتے مرے غیروں پہ ستم ہائے ستم ہائے

تم وعدہ کر کے شام کا بیارے چلے گئے ۲۲۹ جب تک کہ دن ڈھلے یہاں آنسو نکلے گئے

سینہ مرا بہ رنگِ گل انگار رہ گیا ـــــ تم تو صبا کی طرح سے آئے چلے گئے

ہم سے نہ بولو اور سنو باتیں رقیب کی ۲۴۰ تم کیا کرو یہ خوبی ہے تا ہے غریب نصیب کی

یہ سان شمع جلاتی ہے اور رُلاتی ہے ۲۴۱ شبِ فراق عجب دن مجھے دکھاتی ہے

مجھے آگے گرفتاری ہوئی تھی ۲۴۲ نہ اتنی زندگی بھاری ہوئی تھی
رضا کا اب خدا حافظ ہے یارو — یہی مجنوں کو بیماری ہوئی تھی

بے ساقی و جامِ زندگانی ۲۴۳ ہے اپنی حرام زندگانی

آنکھوں میں کس کی زلفِ سیہ فام چھا گئی ۲۴۴ چاروں طرف جو دیکھوں ہوں اب شام چھا گئی

دیکھا جو تجھ کو ہم نے عالم کا دید بھولے ۲۴۵ دل بیچا یک نگہ پر ساری خرید بھولے
ساقی دو ہی جہبا دل لے مکر نہ جائے — ایسا نہ ہو تو اُس کو دے کر رسید بھولے
نامِ علی ہے میرے مرنے تلک زباں پر — اسم اپنے پیر کا کب دل سے مرید بھولے

نالہ جب اپنی جان سے اٹھتا ہے ۲۴۶ تب دھواں آسماں سے اٹھتا ہے
دل کراہے ہے، مگر لب ہائے — درد ایسا کہاں سے اٹھتا ہے
کس کے دل کا غبارِ حسرت ہے — نت جو یہہ کارواں سے اٹھتا ہے
گل خبر لے شتاب بلبل کی — پھر دھواں آسماں سے اٹھتا ہے
تو خفا ہو کے بزم سے مت جا — اب رضا ہی یہاں سے اٹھتا ہے

رضا خدا کرے تیری زباں درد کرے ۲۴۷ کہ حال سننے ترا اپنا کان درد کرے

۲۳۱ سے ۲۴۷ تک ن اور ن۲ میں نہیں، حسبِ تصریحِ ذیل تذکروں سے ماخوذ ہیں۔
۲۳۱ گلزار اور گلشن سخن (اس زمین میں دیوان میں غزل ہی) ۲۳۲ تا ۲۳۵ تذکرۂ عشقی ۲۳۶ ۲۳۷ و ۲۳۷ تذکرۂ شورش ۲۳۸ تذکرۂ عشقی ۲۳۹ تذکرۂ عشقی و مجموعۂ نغز ۲۳۹ مجموعۂ نغز، ۲۴۰ تا ۲۴۲ تذکرۂ عشقی، ۲۴۳ گلزار، ۲۴۴ تا ۲۴۷ تذکرہ شورش۔ کی زمین میں ن یا ن۲ میں بھی اشعار ہیں۔

ذیل کے دو شعر غلطی سے اپنے مقام پر درج نہ ہو سکے ۲/۴ ن اور ن ۲، اور ۲۶۲ ن میں ہے:
خوبی و بیگانگی کی جس گھڑی خلقت بنی ۲/۴ مجھ کو تجھ سے آشنا کر سب سے بیگانہ کیا
کیا بخت سے خوش ہوں کہ مجھے بخت سے اپنے ۲۶۲ امید کم ہے رضا اور یاس زیادہ

ضمیمہ

● تذکرۂ شورش' میں رضاؔ کا حال اس طرح درج ہے : " رضا ، میر محمد رضا عرف میر محمدی المتخلص بہ رضا۔ شاگرد میاں ضیاؔ' ولد میر جمال الدین حسین' ابن نور اللہ خاں مغفور' بن قاضی نور اللہ شوستری' مؤلف احقاق الحق و مجالس المومنین نبیرۂ مختار علی خاں مرحوم' ساکن عظیم آباد۔ در محفل مشاعرہ ارادۂ فکر شعر نمودہ' از فضل الٰہی خوب میگویند و طبیعت رسا دارند۔" نمونہ کے ۲۲ اشعار درج کیے ہیں' ان میں سے ۲۰ اشعار تو اس دیوان میں شامل ہیں۔ لیکن مندرجہ ذیل دو شعر شامل نہیں ہیں :

چشم نے رونے سے میرا راز افشا کر دیا　　دیدہ و دانستہ ہم چشموں میں رسوا کر دیا

کیا کہوں اب اے خجالت' کیا کہوں اے اضطراب　　وہ ہوا خانہ نشیں اور میں ہوا خانہ خراب

● تذکرۂ عشقی سے رضاؔ کا جو احوال صفحہ ۲ پر نقل ہوا ہے' اس میں سطر ۲۲ پر "این فن از" اور "نمودہ" کے درمیان یہ عبارت اضافہ ہوگی "فیض صحبت میر ضیاء الدین ضیاؔ تخلص"۔ اور پھر اسی سطر میں "شعر سخن" اور "داشت" کے درمیان یہ عبارت اضافہ ہوگی : کہ عبارت از غزل سرائی بیان ریختہ باشد' ذہن سلیم و طبع رسا"۔ اس تذکرہ میں نمونہ کے ۲۰ اشعار درج ہیں۔ ان اشعار میں سے مندرجہ ذیل ایک شعر اس دیوان میں شامل نہیں ہے :

مرتے ہیں ہم تو تیرے لب آب دار پر　　آب حیات ہوئے تو مارے ہیں دھار پر

مندرجہ ذیل ایک شعر جو اس دیوان کے صفحہ ۴۷ (نمبر ۳۲) کے تحت درج ہے' تذکرۂ عشقی میں یہ شعر ایک لفظ ('غم' بجائے 'دن') کے اختلاف کے ساتھ اس طرح درج ہے :

بہ سان شمع جلاتی ہے اور رلاتی ہے　　شب فراق عجب غم مجھے دکھاتی ہے

● تذکرۂ مسرت افزا : " محمد رضا تخلص ولد میر جمال الدین' ابن قاضی نور اللہ شوستری صاحب مجالس المومنین است سید علی نژاد و جوان خوش اعتقاد' شوخ طبع و ظریف' از مدتی در نواحی بنگالہ بسر میبرد۔ شاگرد میر ضیاء الدین ضیاؔ۔ میر رضا ، اشعار خوب خوب دارد لیکن فقیر از وبہ این یک بیت بسیار راضی شود :

امردوں کی مُوا ہوں حسرت میں　　میں تو غلماں ہی لُوں گا جنت میں

اس تذکرہ میں ۵ اشعار نمونہ کے طور پر پیش کیے گیے ہیں' ان میں مذکورہ بالا شعر دیوان رضاؔ کے موجودہ متن میں شامل نہیں ہے۔"

● عیار الشعرا (از خوب چند ذکا) : میر محمد رضا شوستری المعروف بمیر محمدی پٹنوی رضاؔ تخلص سید نسب' ساکن نادبومش عظیم آباد' شاگرد میر ضیاء الدین ضیا۔ در فنون پہلوانی و شمشیر بازی خیلی واقفیت دارد۔ و عالم و فاضل و شاعر فارسی و ہندی' و تحصیل علم عروض و قوافی بوجہ احسن نمودہ۔ و نایکا بھید را بر زبان اہل ہند خانہ آدم شناست.

چار شعر: ۳۳۹/۲،۱ ۳۲۵/۲،۱ - ۳۲۵/۱ 'یہ اس بت' بجائے 'اس ظالم' ۳۲۵/۴ 'جاوے' بجائے 'جاے'۔
۳۲۹/۱ 'رات' بجائے 'شام' = ۳۲۹/۱ کا مصرع ثانی ملک اتر گیا پرے بیطاقتوں کی یاد سے۔

● عمدۂ منتخبہ (تذکرۂ سرور): رضا تخلص، میر محمد، سید زادہ ایست، باشندۂ لکھنؤ، مشہور بہ میر محدی پٹنوی، شاگرد ضیاء الدین ضیا۔ در فن پہلوانی بسیار ماہر۔ تحصیل علم عربی ہم نمودہ۔ اشعار ہندی و فارسی ہر دو میگوید۔ وہم در علم عروض و قوافی ماہر است۔ از علم نایکا بھید واقفیت دارد۔

اشعار ۳۳۹/۱ ۳۲۵/۲،۱ - ۳۲۵/۱ میں 'اس ظالم بیداد' کی جگہ "یہ اس بت جلاد"

شورش عشق اور مسرت افزا سے یہ نقول جناب سلیم الدین احمد صاحب اور جناب محمود عالم (اسسٹنٹ لائبریرین، خدا بخش پٹنہ)، اور عیار الشعرا سے ترجمۂ رضا کی نقل جناب ایم حبیب خاں (لائبریرین انجمن ترقی اردو ہند، دہلی) سے ملیں، جس کے لیے ان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

جناب سید شاہ محمد اسمٰعیل
خدا بخش لائبریری، پٹنہ

مُلّا شاہ — تفسیرِ قرآن اور عربی کلام

مُلّا شاہ بدخشانی کا شمار عہدِ شاہجہانی کی نامور ہستیوں میں ہوتا ہے۔ دارا شکوہ (م ۱۰۶۹ھ / ۱۶۵۹ء)، اور جہاں آرا بیگم (م ۱۰۹۲ھ / ۱۶۸۱ء) کو مُلّا شاہ سے گہری عقیدت تھی، اسی بنا پر دونوں ان کے حلقۂ ارادت سے وابستہ ہو گئے تھے، ان کا ذکر تقریباً تمام تذکروں میں پایا جاتا ہے لیکن تفصیلی اور ترتیبی معلومات کے لئے مندرجہ ذیل دو ذرائع بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

(۱) پہلا ذریعہ جہاں آرا بیگم کا رسالہ "صاحبیہ" ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ پروفیسر محمد ابراہیم ڈار کو "آپا صاحب مولانا ماتم لائبریری احمد آباد میں ملا تھا، اس مخطوطہ کا تذکرہ اسٹوری (Storey) نے بھی کیا ہے (Storey V.I.PT I.P.1001) اس رسالے سے متعلق پروفیسر ڈار نے ایک مقالہ سپردِ قلم کیا تھا، جو ۱۹۳۷ء کے اورینٹل کالج میگزین لاہور میں شائع ہوا تھا۔

پروفیسر محمد اسلم، پنجاب یونیورسٹی، لاہور نے، اس رسالہ کے حصول کے لئے ۱۹۶۸ء، پھر ۱۹۶۹ء میں احمد آباد کا سفر کیا اور کسی طرح اس کی نقل حاصل کی، یہ رسالہ پہلی بار ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا (تعلیقات صاحبیہ)۔

(۲) دوسرا ذریعۂ معلومات دارا شکوہ کی تصنیف "سکینۃ الاولیاء" ہے، جو مُلّا شاہ کے پیر حضرت میاں میر لاہوری اور ان کے خلفاء و وابستگان کے حالات پر مبنی ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ ۱۹۴۰ء میں لاہور سے شائع ہوا، ڈاکٹر تارا چند، سابق سفیرِ ہند متعینہ ایران اور سید محمد رضا جلالی نے چار خطی نسخوں سے مقابلہ کرکے اسے مدون کیا۔ ان نسخوں میں ایک نسخہ خدا بخش لائبریری کا بھی شامل ہے۔ یہ تدوین شدہ نسخہ مؤسسہ مطبوعاتی علمی ایران سے ۱۹۶۵ء میں شائع ہو گیا ہے۔

جز ستایش معنوی ایران و پاکستان، شائع کردہ ادارۂ اوقاف پنجاب لاہور میں ڈاکٹر [illegible] لاہوری کا ایک سیر حاصل مقالہ مُلّا شاہ سے متعلق طبع ہوا ہے۔

مختصر حالات:- دارا شکوہ نے مُلّا شاہ کا نام "شاہ محمد" لکھا ہے، حضرت میاں میر [illegible]
[illegible] حضرت آخوند کے نام سے یاد کرتے تھے۔ تب ان کا

لسان اللہ تھا۔ (سفینۃ الاولیاء ص ۱۵۲)

سلسلۂ نسب یہ ہے، ملا شاہ بن مولانا عبدی بن مولانا سلطان علی بن حضرت قاضی فتح اللہ۔
مولد و وطن موضع ارکسا ہے، جو بلدۂ رستاق کا ایک گاؤں ہے اور رستاق مملکت بدخشاں میں ہے،
جیسا کہ خود ملا شاہ کا بیان ہے:

ملک من از ملکہا، ملک بدخشان آمدہ   از بلاد از روستاق و از قرا، از ارکسا

تاریخ ولادت کے سلسلہ میں تذکرے خاموش ہیں، ڈاکٹر یمین خاں لاہوری کی تحقیق یہ ہے:

"جہاں آرا بیگم نے ملا صاحب کے وارد ہند ہونے کے وقت کی عمر ۲۵ سال قرار دی ہے۔ (صاحبیہ)
اور عمل صالح میں ملا صاحب کے وارد ہندوستان ہونے کا سال ۱۰۲۳ھ بیان کیا گیا ہے، اس بنا پر
سال ولادت ۹۹۸ قرار پاتا ہے۔ (تاثیر معنوی ... ص ۳۹)

یہ بات متفق علیہ ہے کہ ملا صاحب کی ولادت بدخشاں کے گاؤں 'ارکسا' میں ہوئی، حصول علم کا سلسلہ وطن ہی میں جاری رہا، ۲۳ سال کی عمر میں گھر سے نکلے اور مزید تحصیل علم کے لئے بلخ پہنچے، تکمیل علوم کے بعد ۲۵ سال کی عمر میں وارد ہندوستان ہوئے، پہلے کشمیر میں اقامت اختیار کی، پھر لاہور آئے، مرشد کی تلاش تھی میاں میر کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے، ریاضت شاقہ میں مشغول رہے، اور مرشد کی توجہ خاص سے فیضیاب ہوئے۔ ۱۹ سال تک پیر و مرشد کی خدمت میں رہے۔ موسم سرما لاہور میں گزرتا اور موسم گرما میں پیر کی اجازت سے کشمیر چلے جاتے۔

پیر و مرشد کی وفات کے بعد مستقل طور پر کشمیر میں اقامت گزین ہوئے۔ شیر خاں کا بیان ہے:

"در آنجا علت ظاہری نیز روی نمود و اسباب بعثت صوری دست داد" (مرآۃ الخیال ص ۱۳۸)

"۱۰۷۲ھ میں لاہور میں وفات پائی۔" (ریاض الشعراء ق ۲۱۴)

"ان کا مزار آج بھی لاہور میں موچی دروازہ کے باہر موجود ہے" (تاثیر معنوی ... ص ۴۵)

عمر بھر قید تاہل سے آزاد رہے، جیسا کہ شاہجہاں نامہ میں مرقوم ہے:

"او نیز بسان پیر خود بقید از دواج در نیامد" (شاہجہاں نامہ ق ۲۱۲ ب)

خود ملا صاحب نے اپنی تفسیر میں ایک جگہ اس کا اظہار کیا ہے، 'ولا تنکحوا المشرکات حتی یومن'
کے ذیل میں لکھتے ہیں:۔ "عندنا اھل الظاھر الایمان الظاھر و عندنا اھل الباطن الایمان

الباطن"۔ پھر لکھتے ہیں :۔ "انظروا الینا و الی تجویدنا، لان فی حالۃ الشباب لم تحصل لنا الزوجۃ المؤمنۃ بالایمان المعرفتی و فی حالۃ الشیبۃ زالت القوۃ، و فیہ حکمۃ"۔

داراشکوہ اور جہاں آرا بیگم کو ملا شاہ سے والہانہ عقیدت تھی، یہ دونوں سلسلۂ قادریہ میں ان سے مُرید بھی تھے، داراشکوہ نے خود لکھا ہے :

" نسبت ارادت و بندگی و حلقہ بگوشی و فقر این فقیر بخدمت حضرت ایشان است" (سکینۃ الاولیاء ص۱۵۲) ۔

نیز جہاں آرا بیگم کا بیان ہے : " چنیں سعادتی کہ برادر عارف کامل روزی شدہ و از یُمن توجہ آن برادر باین ضعیفہ رسیدہ ہیچ کس از نسل تیمور صاحبقران نہ شدہ"۔ (صاحبیہ ص۱۰۱)

" خود شاہجہاں بھی ملا صاحب کا معتقد تھا"۔ (ریاض الشعراء ق ۲۱۴ (الف) مرآۃ الخیال ص۱۲۸)

شاہجہاں کے انتقال کے بعد جب اورنگ زیب باضابطہ تخت نشیں ہوا، تو ملا شاہ کو دہلی بلا بھیجا، وہ کشمیر چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ حاکم کشمیر نے سختی کی تو دہلی کے لئے روانہ ہوئے۔ اثنای راہ میں اورنگ نشینیٔ عالمگیر کی تاریخ پر مشتمل ایک رباعی لکھی اور راستہ ہی سے پادشاہ کی خدمت میں روانہ کی، رباعی یہ ہے :

صبح دل من چو گل خورشید شگفت | حق ظاہر شد غبار کلفت ہمہ رفت
تاریخ جلوس شاہ اورنگ مرا | ظل الحق گفت، الحق این را حق گفت

بادشاہ نے رباعی پڑھنے کے بعد، انہیں دہلی کی حاضری سے معاف کر دیا اور لاہور میں قیام کا حکم دیا، وہیں اُنہوں نے وفات پائی۔ (ریاض الشعراء ق ۴۱۱ (ب) مرآۃ الخیال ص۱۲۹، مخزن الغرائب نسخہ ۲، ص۱۰۲۵)

مُلّا شاہ کی شاعری :۔ ملا شاہ نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ انکی کُلیات میں مثنوی، غزل اور رباعی کی خاصی تعداد موجود ہے۔ خدا بخش لائبریری میں کلیات کی تین جلدیں موجود ہیں۔ دوسری جلد کے دیباچہ میں انھوں نے اپنی مثنویوں کی تعداد درج کی ہے، کہتے ہیں :

" میں نے نظامی کی مخزن الاسرار کی بحر میں بہت کچھ کاغذ سیاہ کئے ہیں لیکن مقصود تتبع ہے، نہ کہ ترفع"۔

" ابتدا میں ۱۰۰ ابیات اجمالاً بسم اللہ کی تعریف میں لکھی ہیں، پھر بسم اللہ کے ہر حرف کی تعریف میں ۱۰۰-۱۰۰ ابیات، اس کے بعد ۳۰۰ ابیات خلوت کی تعریف میں اور ۳۱۲ ابیات محبت کی

تعریف میں، پھر ۱۰ ابیات خاتمہ کے عنوان سے لکھی ہیں۔ان ابیات کا مجموعی تعداد ۳۰۶۲
ہوئی۔اس رسالہ کا نام 'رسالۂ بسم اللہ' رکھا اور اپنی مثنویات کے لئے اس کو بطور بسم اللہ
رکھا'۔ پھر 'شاہنامہ' کی بحر میں ۳۶۵۴ ابیات لکھیں جو حمد و نعت اور منقبت پر مشتمل ہیں۔"
" اس کے بعد نظامی کی خسرو شیریں کی بحر میں ۷۰۵۷ ابیات لکھیں۔ اس طرح یوسف زلیخا
اور رسالۂ دیوانہ نام کے دو رسالے ترتیب پائے۔" اس کے بعد تحفۃ العراقین کی بحر میں رسالہ
ولولہ ۱۵۰۶ ابیات پر مشتمل مکمل ہوا۔ بعد ازاں 'سبحۃ الابرار' کے وزن پر رسالۂ جوش اور
رسالۂ تعریف مقامات تکمیل پذیر ہوا، جس میں ۲۴۶۲ ابیات ہیں۔ پھر سنائی کے حدیقہ کے وزن
پر ۴۷۳۰۱۰ ابیات پر مشتمل رسالۂ نسبت اور رسالۂ شاہیدی کی تکمیل ہوئی۔" قصاید، غزلیات،
رباعیات، شرح رباعیات اور مکتوبات ان کے علاوہ ہیں۔"

(مخطوطہ کلیات آزاد فصاحت ۲ ف ۱ (ب)

رسالۂ بسم اللہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بسم اللہ الرحمن الرحیم خال و خط و زلف و قد مستقیم
سلسلۂ موئیش ز آتش بلند کردہ نگاہش دل آتش سپند

پھر بسم اللہ کی تعریف کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، چند اشعار یہ ہیں:

بسملہ در خانۂ دل یک چراغ راہنما گم شدہ را بر سراغ
بسملہ بر فرق کتابت سر می فتد اوّل بہ رخ او نظر
اوّل ہر سورۂ قرآن بود ابروی بر دیدہ نمایان بود
آن کلماتند کہ چار اند یار ہر یکی زیشان بزند بر صد ہزار
روی بہارش ہمگی پر گل است پر ز گلشن دامن جز و کل است
باغ از و تازہ ز روی بہار سبز تر از سرو لب جو ئبار

بسم اللہ کی باسے رحیم کی میم تک ہر حرف پر خامہ فرسائی کی ہے۔ بسم میں جو الف مقدر ہے، اس سے
متعلق چند شعر نقل کیے جاتے ہیں:

می خوم اندان الف گم کلیم بسم اللہ الرحمن الرحیم

این ہمہ قند بہر چہ پنہان شدی — باش نمایان چہ شد ار جان شدی
ستر تو بی ستر کند راز ما — پارہ شود پردۂ آواز ما

خاتمہ کا اتمام ان اشعار پر ہوتا ہے :

حرف من این نیست کہ سنجیدہ نیست — یک کسی را بہ غش دیدہ نیست
سال ہزار و پنجاہ است و ہفت — ہفت دگر از ان ہشت رفت

اس سے یہ معلوم ہوا کہ مثنوی کا یہ حصہ ۷ محرم ۱۰۵۸ھ کو مکمل ہوا۔ (مخطوطات کلیات ج ۲، ق ۲۴۲ ب)

صاحب ریحانۃ الادب نے ملا شاہ کے اشعار کی تعداد ۵۰ ہزار لکھی ہے : "اشعار ملا شاہ بسیار و شمارۂ آنہا بالغ پنجاہ ہزار بودہ، لاکن اصول بحر و قافیہ را چندان رعایت نمی کرد" (ریحانۃ الادب ج ۵ ص ۱۵۳)

والہ داغستانی ان کی مثنوی کے متعلق لکھتے ہیں : "مولانا را چند مثنویست مشتمل بر حقایق و بیان معارف نیز ما تم حروف رسیدہ ولکن در ہر چند ورق انتقال بحری فرمودہ و بعد از چند ورق باز بحر دیگر توجہ نمودہ اند و در رعایت قافیہ نیز چندان مبالغہ ندارند" (ریاض الشعرا ق ۲۱۵)

ایسی کمزوری کہیں کہیں نظر آ جاتی ہے۔ پھر بھی بہترے اشعار ابدار اور جاندار ہیں۔ جیسا کہ محمد صالح رقم طراز ہیں : "اغلب اوقات از ان عرفان مآب اشعار آبدار سر زدہ، ابداع انواع معانی و انشاء اقسام سخن از مثنوی و قصیدہ و غزل و رباعی نمودہ" (عمل صالح ق ۴۲۲)

مجھے اس مضمون میں صرف ملا شاہ کی تفسیر قرآن اور کلام عربی پر روشنی ڈالنی ہے۔ اس لئے ان کے حالات اور ان کے کلام پر تفصیلی گفتگو سے صرف نظر کرتے ہوئے ان کی شاعری کے مختلف نمونے پیش کرنے پر اکتفا کر رہا ہوں۔

کہتے ہیں کہ انسان کے لئے عشق ہی آب حیات ہے، اپنے ظلمات میں کیوں ڈھونڈ رہا ہے :

ہمہ را سینہ سوز آب حیات — جستہ آب حیات در ظلمات
بلکہ آن آب روشنی بدہد — چشم روشن کہ نیست کو بدہد
آب در سینۂ تو حاصل تست — چونکہ نزدیک دیدۂ دل تست
ہست آب حیات عالمگیر — خیرہ گشت است چشم عالم پیر

قصیدہ کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں :-

لفظ معنی گردد و معنی بلفظ آید ترا　　چشم معنی بین شود، ہرگاہ با لفظ آشنا
سلطنت خواہی بعرفان آ کر از عشق دولی　　کار نکشاید اگر با عشق آری التجا
آتش ما سوخت عالم را و خاکستر نشد　　آتش ما را نباشد ہیچ گہ روی فنا

غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

زچراغ نیست درین خانہ ویرانۂ ما　　روشن از آتش عشق تو شدہ خانۂ ما
آری این راست کہ مرغیم، ولی سیمرغیم　　دام ما تا چہ بود، تا چہ بود دانۂ ما
درپی خانہ، جانانۂ ما شد ہمہ عمر　　بود خود خانۂ ما، خانۂ جانانۂ ما

عارف مدان اگر ز ملامت سلامت است　　یعنی علامتِ رہ عرفان ملامت است
راہِ طلب بہ صبر بسر می‌رود ہمہ　　این دانہ را ثمر شدن از استقامت است
رفتن بروی آب و ہوا ہیچ نیست شاہ　　از خود خلاص یافتن اینجا کرامت است

دل اگر دریا شود، یک قطرۂ دریا شود　　قطرۂ دریای دل، دریای بی ہمتا شود

اہلِ دل را ز دو عالم چہ تمنا باشد　　دل کہ پیشش دو جہان قطرۂ دریا باشد

مست می نیست کہ گہ مست و گہی مخمور است　　مست خود مست مدام است بہر جا باشد

شود زیک دل روشن، ہزار دل زندہ　　زیک چراغ توان صد چراغ روشن کرد

چند رباعیاں: زنہار بہیرزہ تخم اسرار مپاش　　ترسم کہ شود مزرع اسرار تو فاش
خواہی ز شریعت بحقیقت افتی　　بی شرع مباش و بستۂ شرع مباش

ساقی اگرم می ندہی می میرم　　ور ساغرش از کف بنہی می میرم
پیمانہ ہر کہ پر شود می میرد　　پیمانۂ من چو شد تہی می میرم

صوفیست کہ محرم است در خانۂ شہ　　صوفیست کہ دارد خبر از منزل رہ
صوفیست نہ ہفتاد و دو ملت آگہ　　خود گفت کہ: الصوفی لا مذہب لہ

تصانیف: ملا شاہ کی تصانیف جو اب تک معلوم ہو سکی ہیں اور مخطوطات کی صورت میں موجود ہیں، ان کی فہرست ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

کلیات ملا شاہ مشتمل بر سہ جلد؛ خدا بخش لائبریری میں موجود ہے۔ جلد اول تفسیر قرآن

جلد دوم۔ مثنویات، جلد سوم مثنویات، غزلیات، قصاید، رباعیات اور کلام عربی پر مشتمل ہے۔

۲۔ 'دیوان شاہ'، ۲۲۳ اوراق پر مشتمل برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ یہ دیوان مثنوی، قصیدہ، رباعی اور غزل پر مشتمل ہے۔ ابتدا: "درشرح آمد چہار عنصر ظاہر ؛ تا تافت برآن چہار نور باہر" فہرست نگار نے لکھا ہے کہ: "ہمیں اس مخطوطہ سے اس کا علم ہوا کہ صاحب تذکرہ نے سنش گنج نامی کتاب ۱۰۵۵ھ میں اور سورۂ یوسف کی تفسیر ۱۰۵۷ھ میں لکھی تھی (Br.Mus. II P. 990)

۳۔ 'مثنویات ملا شاہ' ۲۷۳ اوراق پر مشتمل انڈیا آفس کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ اس مخطوطہ میں دس مثنویاں ہیں۔ (انڈیا آفس لائبریری کیٹلاگ ج ۲، ص ۸۶۲، نمبر ۱۵۹۰)

۴۔ 'دیوان ملا شاہ' کا ایک نسخہ برلن لائبریری میں موجود ہے۔ جس میں غزلیات و رباعیات کے علاوہ مکتوبات بھی شامل ہیں۔

غزلیات کی ابتدا: حمد آن را کہ مرا دیدن رویش دادا ؛ در توفیق برین بستہ، خود بکشا دا

رباعیات " : ذاتی کہ شد اُو نہ قدس اعلی نازل ؛ یعنی ز عالم مطلق بمقید مائل

مکتوبات " : "انسان موفق بطلب و ریاضت راہی گذرگاہ عرش رب العالمین میسر شد" (برلن نمبر ۹۳۶)

۵۔ رباعیات و شرح رباعیات ملا شاہ کے نام سے ایک مخطوطہ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے کتبخانہ میں موجود ہے، یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے غیر معمولی نسخہ ہے، شاعر نے ہر رباعی کے ذیل میں اس کی شرح منظوم قطعہ کی صورت میں درج کی ہے، ابتدا کے ۳۲ اوراق تک نثر میں بھی شرح لکھی ہے۔ پہلی رباعی یہ ہے:

درشرح آمد چہار عنصر ظاہر ؛ تا تافت برآن چہار نور باہر
در معرفت ظہور آن نور چہار ؛ شد شرح رباعی العناصر ناصر

(پنجاب یونیورسٹی لائبریری کیٹلاگ ج ۱، ص ۲۳۵، نمبر ۵۰۳ (تاثیر معنوی ایران در پاکستان ص ۵۹)

۶۔ 'مثنویات ملا شاہ' کا بھی ایک نسخہ پنجاب یونیورسٹی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ یہ مخطوطہ ۹ ہزار ابیات پر مشتمل ہے، اس میں ۳۴۵ اوراق ہیں۔

(پنجاب یونیورسٹی کیٹلاگ ج ۱، ص ۳۵۸، نمبر ۵۰۵ نیز تاثیر معنوی ... ص ۵۵)

خدابخش لائبریری میں موجود ہر سہ جلد کی تفصیلات :

کلیات ملا شاہ کے عنوان سے تین جلدیں لائبریری میں محفوظ ہیں، تینوں جلدیں ایک ہی کاتب کی تحریر کردہ ہیں، کتابت خوشخط نستعلیق میں ہے، عبارت زریں جدول کے مابین ہے، ابتدائی صفحات مزین و منقش ہیں، پیمانہ یہ ہے: ۱۰ × ۶½، ۷½ × ۴ انچ۔

جلد اول قرآن مجید کی چند سورتوں کی تفسیر و ترجمہ پر مشتمل ہے، دیباچہ میں مصنف نے اس کے دو نام لکھے ہیں۔ تفسیر شاہ اور شاہ تفاسیر، دونوں مادہ ہائے تاریخ ہیں، انہیں ذیل رباعی میں پیش کیا ہے:

میگفت مرا کسی کہ تاریخ بجو تفسیر شاہ را وگفتم کہ بمو
تفسیر شاہ یک عدد کم آمد گفت این دل من شاہ تفاسیر بگو

اس طرح اس تفسیر کا سال تکمیل ۱۰۵۷ھ قرار پاتا ہے۔

مختلف تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ ملا شاہ نے تفسیر قرآن کی ابتدا کی تھی اگر حیات نے وفا نہ کی اور صرف ایک پارہ کی تفسیر مکمل ہو سکی، ہمارے اس مخطوطہ سے اس کی نفی ہوتی ہے، یوں تفسیر تو ناتمام رہی لیکن سورۂ یوسف کے علاوہ ابتدائی تین پاروں سے زیادہ کی تفسیر اس مخطوطہ میں موجود ہے، افسوس ہے کہ درمیان سے اوراق غائب ہونے کے سبب یہ حصہ بھی ناقص حالت میں موجود ہے، تفصیل درج ذیل ہے۔ (اس جلد میں اوراق کی مجموعی تعداد ۷۶ ہے)

تفسیر / ترجمہ / نکات کا موجود حصہ	ان آیات کی تفصیل پر مشتمل اوراق غائب ہیں
ق ۱ (ب) ـ ۲ (الف) دیباچہ بزبان عربی	
ق ۲ (ب) ـ ۳ (الف) تفسیر بسم اللہ	
ق ۳ (الف) ـ ۵ (ب) تفسیر سورۂ فاتحہ	
ق ۶ (ب) ـ ۵۴ (الف) تفسیر سورۂ بقرہ	۶-۱۳، ۲۶-۳۷، ۱۱۴-۱۲۸
ق ۵۴ (الف) ـ ۶۷ (الف) تفسیر سورۂ آل عمران	۱۵۴ ۱۸۳
ق ۶۸ (ب) ـ ۷۶ (ب) تفسیر سورۂ یوسف	۳۱ ۱۱۰

تفسیر میں عربی اور فارسی دونوں کا استعمال ہوا ہے، بعض حصوں کی تفسیر صرف عربی میں ہے اور بعض کی صرف فارسی میں، اسی طرح بعض جگہ عربی اور فارسی دونوں سے کام لیا گیا ہے، تشریح و تفسیر

بسم اللہ کی تفسیر اور اس سے متعلق نکات عربی میں ہیں، پھر لکھتے ہیں کہ بسم اللہ کے سلسلہ میں ہماری ایک کتاب ہے، جو بسم اللہ اور اس کے حروف کی تعریف پر مبنی ہے اور تین ہزار ابیات پر مشتمل ہے۔ ہم نے اس کا نام رسالۂ بسم اللہ رکھا ہے اور اس کی ابتدا یہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم — نعال دنعال ذرعت و قد مستقیم

[یہ رسالہ کلیات کی دوسری جلد میں شامل ہے]

اس کے بعد بسم اللہ کے جزو قرآن ہونے سے متعلق فقہاء کے مذاہب پر روشنی ڈالی ہے۔

تفسیر سورۂ فاتحہ: آیات کا ترجمہ فارسی میں ہے۔ پھر مختصر تفسیر، اس کے بعد نکات ہیں، چند نکات عربی میں ہیں۔ ترجمہ کا انداز یہ ہے: "الحمدُ للہ" ستودن بہ نیکی و پاکی خاص مر ذاتی را است کہ مستجمع صفات کاملہ است، مالک یوم الدین، یعنی متصرف روز جزا است، ایاک نعبد، یعنی ترا می پرستیم، وایاک نستعین، خاص از تو یاری می خواہیم۔

چند نکات بطور نمونہ: رب العٰلمین کے ذیل میں:

نکتہ، تربیت او عام است شریعت، یا خاص است طریقت، یا اخص است حقیقت نکتہ، یا عام است علما، یا خاص است عملا، یا اخص است بترکہما محویتہ فی الذات۔

صراط الذین انعمت علیہم کے ضمن میں رقمطراز ہیں: نکتہ، یعنی صلحا، یعنی اہل شریعت وسلکا، یعنی اہل طریقت، و عرفا یعنی اہل حقیقت، یعنی عاما وخاصا واخصا،

یہ تین مدارج اکثر آیات کے ضمن میں بیان ہوئے ہیں۔

تفسیر سورۂ بقرہ: پارۂ اول میں فارسی ترجمہ کے ساتھ نکات کا سلسلہ جاری ہے۔ ترجمہ کا انداز یہ ہے: ھدی للمتقین الذین یؤمنون بالغیب یعنی این کتاب ہدی است مر متقیان را، آنچنان متقیانی کہ ایمان می آرند بغیب۔

نکتہ بضمن متقین، یعنی پرہیزگاران، پرہیز از گناہ، چنانچہ در شریعت است، یا پرہیز از مراد خود، چنانچہ در طریقت است، یا پرہیز از خود چنانچہ نزد اہل حقیقت است۔

پارۂ اول کے اختتام پر نکات کا سلسلہ ختم کر دیا ہے، ترجمہ اور مختصر تفسیر کا سلسلہ جاری ہے۔

زبان فارسی ہے، کہیں کہیں عربی کا بھی استعمال ہے، لکھتے ہیں :

" ولقد غیرنا الاسلوب فی تفسیر ھذا الجزء من القرآن تنشیطا للاذھان " پھر آیت نمبر ۲۰۲ کے بعد طوالت کے خیال سے ترجمہ کا سلسلہ ترک کر دیا ہے، بلکہ نکات پیش کئے ہیں، لیکن نکتہ کا لفظ مذکور نہیں ہے۔ لکھتے ہیں :

" ولقد ترکت الترجمۃ لوضوحہا عند اولی الالباب، ربما لاحظۃ الاطناب فی النصف الآخر من ھذا الجزء الثانی من کلامہ تعالیٰ واکتفیت فی ھذا بقولی کما ھو المرقوم، ثم التفت الی النکات بترک لفظ النکتۃ "

سورۂ بقرہ کے خاتمہ پر یہ تحریر ہے : " ولا تغفل عما قلنا عن نکات ھذا التفسیر فان فیہ النفع الکثیر، خصوصا لطالب اللہ الکبیر "

تفسیر سورۂ آل عمران : مختصر تفسیر کے ساتھ کہیں کہیں نکات پیش کئے ہیں، زبان عربی و فارسی اشعار بھی استعمال کئے ہیں۔

تفسیر سورۂ یوسف : ترجمہ و تفسیر کی زبان فارسی ہے۔ رکوع اول کا بیشتر حصہ منظوم ہے، مابعد کا ترجمہ و تفسیر نثر میں ہے، بعض آیتوں کا آزاد ترجمہ ایک بیت یا ایک مصرع میں دیا ہے، ابتدا :

بنام آنکہ یوسف سرخ رو زوست   کہ در خاطر کنی زان از ان دوست
رسولان را بسوی خود کشیدہ   بہ یک تن، محمدیت دیدہ
دلم بر سورۂ یوسف چو بشگفت   خدایش بہترین قصہ ہا گفت

ترجمہ کی شان : قال قائل منھم لا تقتلوا یوسف والقوہ فی غیابۃ الجب یلتقطہ بعض السیارۃ = گفت گوئیندۂ از ایشان مکشید یوسف را و اندازید در قعر چاہ تا بر گیرد او را بعض از سا ئران راہ گذر۔

بیشتر نکات تصوف کے رنگ میں ہیں، کہیں ادیبانہ و شاعرانہ انداز فکر سے بھی کام لیا ہے، مثلاً وجاءت سیارۃ کے ضمن میں لکھتے ہیں :

نکتہ : " السیارۃ کنایۃ من الکواکب التی فی حوالیھا القمر، حالہ

ولهٰذا قال سيّارةٌ ولم يقل
يعني چلہ، تمر يعني يوسف، سيّارہ صاحب توفيقات وكذا يعني قافلہ
قافلة او راحلة او رفقة "

نثر میں ترجمہ الفاظ کی رعایت کے باوجود سلیس ہے، البتہ منظوم ترجمہ الفاظ کی رعایت سے کہیں کہیں
آزاد ہو جاتا ہے۔ چند مثالیں درج کی جاتی ہیں:

وراودته التي هو في بيتها عن نفسه = ع دگر مقصود خود را خواست آن زن، نثر: درخواست
یوسف را آن زنی کہ یوسف در خانہ اش بود، از نفسش یعنی از کامش۔

وشهد شاهد من اهلها = ع گواہی داد یک طفل خدا دوست، نثر: گواہی داد گواہی
دہندہ از کسان آن زن۔

شاہ تفاسیر پر ایک نظر: قرآن کریم ایک ذو جہات کتاب ہے، جو اپنے ظاہر و باطن کے
ہر پہلو سے معجزہ ہے۔ یہ معانی کا ایک سیلِ ناپیدا کنار ہے، جس کے عجائب و غرائب کا شمار حیطۂ انسانی
سے باہر ہے۔ امام بوصیری فرماتے ہیں:

لها معانٍ كموج البحر في مددٍ   وفوق جوهره في الحسن والقيم
فما تعدّ ولا تحصى عجائبها   ولا تسام على الإكثار بالسأم

اس بحر بیکراں کے غواص کبھی نہیں تھکتے اور اس گلستان ہمیشہ بہار کو خزاں کے جھونکے کبھی
چھو نہیں سکتے۔ تفسیروں پر تفسیریں لکھتے جاؤ، اس کے معانی کا سیلاب رکنے نہ پائے گا، کسی نے الفاظ و
تراکیب پر نظر ڈالی، کسی نے معانی و بلاغت کے پھول چنے، کسی کو منطق و فلسفہ کے حقائق کی تلاش رہی،
تو کسی کو معرفت و سلوک کے انوار کی طلب رہی۔

علامہ ابن عربی (م ٦٣٨ھ = ١٢٤٠ء) اپنی تفسیر قرآن کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں:
"ایک عرصہ تک میں نے تلاوتِ قرآن کو اپنا معمول بنا لیا اور معانی و مفاہیم کے تدبر میں مشغول رہا،
لیکن شرحِ قلب کی نعمت میسر نہ ہوئی۔ ایک وقت آیا کہ میں قرآن سے مانوس ہو گیا اور اس کی حلاوت سے آشنا
ہوا، اس طرح میں انبساطِ قلبی اور نشاطِ روحانی کی اس منزل کو پہنچ گیا کہ ایک ایک آیت کے تحت اتنے معانی
مجھ پر منکشف ہونے لگے کہ ان کے بیان سے نطقِ انسانی عاجز ہے اور ان کے ضبط و حفظ سے قوتِ بیانی قاصر ہے

ترجمہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہوا کہ:

ما نزل القرآن اٰیۃ الا ولہا ظہر وبطن ولکل حرف حد ولکل حد مطلع۔

قرآن کی جو آیت بھی اتاری گئی ہے اس کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہے، ہر کلمہ کی ایک حد ہے اور ہر حد کے لئے ایک مطلع ہے۔

"تو میں نے سمجھ لیا کہ ظاہر سے مراد تفسیر ہے، باطن سے تاویل، اور حد کے معنی یہ ہیں کہ جہاں تک فہم کی رسائی ہو، جو مشاہدہ کی منزل تک پہنچا دے۔" (تفسیر ابن عربی ج ۱، ص ۳)

صاحب تفسیر عرائس البیان اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے امام جعفر صادق کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

کتاب اللہ علی اربعۃ اشیاء العبارۃ والاشارۃ واللطائف والحقائق فالعبارۃ للعوام والاشارۃ للخواص واللطائف للاولیاء والحقائق للانبیاء۔

کتاب اللہ کے چار پہلو ہیں، عبارت، اشارت، لطائف اور حقائق، تو عبارت عوام کے لئے ہے، اشارت خواص کے لئے، لطائف اولیاء کے لئے اور حقائق انبیاء کے لئے۔

پھر ظاہر، باطن، حد اور مطلع کی توضیح حضرت علی مرتضیٰ کے ارشاد سے کرتے ہیں:

فالظاہر تلاوۃ والباطن فہم والحد ہو احکام الحلال والحرام والمطلع ہو مراد اللہ من العبد

ظاہر تلاوت ہے اور باطن فہم تک رسائی، حد سے مقصود حلال و حرام کے احکام ہیں اور مطلع کا مطلب یہ ہے کہ جو بات اللہ تعالیٰ بندے سے چاہتا ہے۔ (عرائس البیان ص ۳)

صاحب روح المعانی مذکورۃ الصدر حدیث کے ضمن میں لکھتے ہیں:

ان ظاہرہا ما ظہر من معانیہا لاہل العلم بالظاہر وباطنہا ما تضمنہ من الاسرار التی اطلع علیہا ارباب الحقائق ومعنی قولہ ولکل حرف حد ان لکل حرف منتہی فیما اراد اللہ تعالیٰ من معناہ ومعنی قولہ ولکل حد مطلع ان لکل غامض من المعانی

آیات کے ظاہر سے مراد وہ معانی ہیں، جو علمائے ظاہر پر ظاہر ہوتے ہیں۔ باطن سے مقصود وہ اسرار ہیں، جو معنی ظاہری کے ضمن میں ارباب حقائق پر منکشف ہوتے ہیں۔ لکل حرف حد کا مطلب یہ ہے کہ ہر لفظ کی ایک انتہا ہے جو اللہ تعالیٰ اس کے معنی سے مراد لیتا ہے۔ اور لکل حد مطلع کے معنی یہ ہیں کہ ہر غامض

والاحکام مطلعا یتوصل بہ الیٰ معرفتہ ویوقف علی مرادہ	معنی اور حکم کے لئے ایک مطلع ہے جس کے ذریعہ اس کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور اس کی مراد سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ (روح المعانی ج ۱ ص ۷)

اسی بنا پر اہل علم کی مختلف النوع تفاسیر کے ساتھ ارباب تصوف نے بھی اپنے رنگ میں تفسیریں لکھی ہیں۔ اس نوع کی تفسیروں میں علامہ ابن عربی کی تفسیر قرآن اور فتوحات مکیہ علامہ آلوسی کی روح المعانی وغیرہ شامل ہیں، تفسیر حسینی، تفسیر مظہری، عرائس البیان اور دوسری متعدد تفسیروں میں بھی یہ رنگ نمایاں ہے۔ تصوف کے حقائق و مشاہدات کے پیش نظر لکھی جانے والی تفاسیر ہیں۔ چند قابل ذکر تفسیریں اور بھی ہیں:

ایک قدیم تفسیر ابوعبدالرحمٰن محمد بن الحسین بن موسیٰ السلمی الازدی النیشاپوری الصوفی (م ۴۱۲ھ ۱۰۲۱ء) کی بنام "الحقائق فی التفسیر" موجود ہے، بعد کے مصنفین نے اس سے استفادہ کیا ہے۔ اس کا ایک مخطوط لائبریری کا میں موجود ہے جو ۸۲۳ھ کا نوشتہ ہے۔

شیخ کمال الدین ابوالغنائم عبدالرزاق بن جمال الدین بن احمد الکاشی السمرقندی (م ۷۳۶ھ - ۱۳۳۶ء) نے دو تفسیریں اسی طرز پر لکھی ہیں۔ ایک کا نام "حقائق التاویل فی دقائق التنزیل" ہے اور دوسری کا نام "تاویلات القرآن" ہے، موخر الذکر کا مخطوط لائبریری میں ہے۔

علامہ آلوسی اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:

واما کلام السادة الصوفیة فی القرآن فھو باب من الاشارات الیٰ دقایق تنکشف علی ارباب السلوک ویمکن التطبیق بینھا وبین الظواھر المرادة وذلک من کمال الایمان ومحض العرفان۔	حضرات صوفیہ کے اقوال قرآن کے بارے میں، ان اشارات سے تعلق رکھتے ہیں، جن سے ارباب سلوک پر حقائق کا انکشاف ہوتا ہے نیز ان دقایق کی تطبیق ظاہر معنی سے بھی ممکن ہو اور یہ بات اسی وقت ممکن ہے، جب ایمان کامل اور عرفان خالص نصیب ہو۔

پھر لکھتے ہیں کہ ایسی بات ہرگز نہیں ہے کہ صوفیہ کا یہ اعتقاد ہو کہ ظاہر معنی سرے سے مراد نہیں ہیں اور محض باطن معنی مراد ہیں، یہ تو ملاحدہ باطنیہ کا خیال ہے اور اس طرح وہ لوگ شریعت کی بالکلیہ نفی کرتے ہیں۔

بھلا صوفیائے کرام کو اس سے کیا واسطہ، وہ تو ظاہر معنی کی حفاظت کی تلقین کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ظاہر معنی کو اولیت حاصل ہے۔ کیونکہ احکام ظاہری سے واقفیت حاصل کئے بغیر باطن معنی تک رسائی کا خیال بھی جہل ہے:

من ادعیٰ فہم اسرار القرآن قبل احکام التفسیر الظاھر فھو کمن ادعیٰ البلوغ الی صدر البیت قبل ان یجاوز الباب۔

جو شخص تفسیر ظاہری کے احکام کی واقفیت سے قبل اسرار قرآنی کو سمجھنے کا دعویٰ کرے۔ اس کی مثال اس شخص جیسی ہے، جو دروازے سے گزرنے کے قبل گھر میں پہنچ جانے کا دعویٰ کرتا ہو۔

ظاہر معنی کی اہمیت بیان کرنے کے بعد باطن معنی کے متعلق یوں رقمطراز ہیں:

فلا ینبغی لمن له ادنیٰ مسکۃ من عقل بل ادنیٰ ذرۃ من ایمان ان ینکر اشتمال القرآن علیٰ بواطن یفیضھا المبدأ الفیاض علیٰ بواطن من شاء من عبادہ

جس شخص کو عقل کا ادنیٰ حصہ ملا ہو، بلکہ ایمان کا ادنیٰ ذرہ نصیب ہو، اس کے لئے مناسب نہیں ہے کہ قرآن کے باطن معانی پر مشتمل ہونے کا منکر ہو۔ مبدأ فیاض ان معانی کو، اپنے بندوں میں سے جس کے باطن پر چاہتا ہے، افاضہ فرماتا ہے۔

شاہ تفاسیر: ملا شاہ کی تفسیر اگرچہ نامکمل ہے اور مختصر ہے، لیکن علامہ آلوسی کے بیان کردہ حدود کا فی الجملہ لحاظ رکھا گیا ہے۔ جہاں تک ترجمہ کا تعلق ہے، اس میں ظاہر معنی سے کام لیا ہے۔ تفسیری مضامین خال خال ہیں۔ زیادہ حصہ نکات پر مشتمل ہے جن کا تعلق ظاہر معنی اور باطن معنی دونوں سے ہے۔ مثلاً ایاك نعبدُ کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"یعنی بعد از فراغ انواع حمد... وبعد از توصیف ذاتہ تعالیٰ بالالوھیتہ والربوبیتہ والرحمۃ والمالکیتہ نشتغل بالعبادۃ"

پھر کہتے ہیں کہ ہر چند تحمید و توصیف بھی عبادت ہے، لیکن عبادت مخصوصہ جس کا ظہور نماز میں ہوتا ہے، اس کی نوعیت جداگانہ ہے، نمازی سب سے پہلے اِنّی وَجہتُ پڑھتا ہے۔ پھر اللہ اکبر کہہ کر متوجہ الی اللہ ہوتا ہے اور ما سوی اللہ سے صرف نظر کر لیتا ہے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:

"پس نماز ابن جماعت یعنی اول ترتیب بعد از ان فراغ ... بالنفس الکاملۃ و دوستان[illegible]

فاذا لایرضی بخطاب ایاک نعبد بطریق الشہود' یعنی بازمید اردآن توجہ خاص را بجانب تعالیٰ"

زاہد' سالک اور عارف کی توجہ الی اللہ میں کیا فرق ہے' بیان کرتے ہیں:

"اگر زاہد است متوجہ بحض یاد حق است' دران وقت اگر یاد رفت' نماز رفت' اگر سالک است توجہ او صرف محبت است' اگر دران وقت آن توجہ رفت محبت رفت' محبت رفت نماز رفت۔ اگر عارف است توجہ او بدیدن آن روا است کہ خود ہم درمیان نیست۔۔۔ پس اگر این نیست' عارف عارف نیست یعنی نمازی نیست۔"

متصوفانہ نکات بالعموم ظاہر معنی سے مربوط رہتے ہیں' اور پہلے ظاہری احکام بیان کرنے کے بعد سالکانہ و عارفانہ نکات پر خامہ فرسائی کرتے ہیں' لیکن بعض مقام ایسے بھی ہیں کہ لطائف و نکات تاویلات باردہ بن جاتے ہیں۔ ایسا ہی ایک مقام ختم اللہ علیٰ قلوبہم کی تفسیر میں آتا ہے۔ اتفاق یہ ہے کہ ہمارے اس مخطوطہ میں وہ حصہ موجود نہیں ہے۔ رشید خان لودھی' مرآۃ الخیال' میں لکھتے ہیں:

"ملا در زمان اقامت کشمیر تفسیر بزبان اہل تصوف شروع نمودہ بود و مدار را مطلقا بر تاویل گذاشتہ ۔۔۔ از انجملہ شرح یک آیہ از عجائبات زوان گفت برسبیل نقل درین اوراق ثبت میگردد"

پھر ختم اللہ علیٰ قلوبہم الیٰ عذاب عظیم کے ظاہری معنی جو جمہور مفسرین نے بیان کئے ہیں' اسے نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"این آیہ بیاید در شان اولیاء اللہ باشد و معنیش چنین بود کہ ختم اللہ علیٰ قلوبہم مہر نہاد خدای تعالیٰ بر دلہای اولیای خود تا ساختہ آن فضای باصفا کہ بحکم قلب المومن عرش اللہ تعالیٰ۔۔۔ وعلیٰ سمعہم و بر گوشہای ایشان کہ دریچہ ہای شہرستان قلعۂ تنند تا از دخل کلمات لاطائل مسدود می مانند' وعلیٰ ابصارہم غشاوۃ و بر بصرہای ایشان پردہ است از سرادق عظمت و جلال و جلباب حسن لایزال کہ در تماشای آن بجمال ناسوت و ملکوت نظر نمی گمارند۔ ولہم عذاب عظیم و مراویشان راست شربتہای بزرگ و در حرہ و حلاوت انتہیٰ ظاہر درین مقام خاشاک عذاب بمعنا

از عذب گرفتہ کہ بمعنی آب صاف شیریں آید" (مرآۃ الخیال ص ۱۴۰، نزہتہ الخواطر ص ۹، مجمع الغرائب، ج ۲، ص ۱۰۲۳)

طلاق، عدت، نکاح ثانی اور رضاعت سے متعلق آیات کی تفسیر میں ظاہر معنی کے ساتھ، اس کے باطن معنی جو بیان کئے ہیں، وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ یعنی زوجین سے متعلق احکام کو ظاہر معنی کے طور پر بیان کیا ہے اور مرشد و مسترشد کے تعلقات کو باطن قرار دیا ہے، اور ہر آیت کے ضمن میں دونوں پہلوؤں سے وضاحت کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔

قرآن کریم کے فارسی تراجم جو اس وقت ہمارے پاس موجود ہیں۔ ان کو سامنے رکھتے ہوئے ملا شاہ کے ترجمہ کا جائزہ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے سامنے اس وقت پہلا ترجمہ وہ ہے جو شیخ سعدی شیرازی (م ۶۹۱ھ - ۱۲۹۲ء) کی طرف منسوب ہے۔ دوسرا وہ ہے جو ملا حسین واعظ کاشفی (م ۹۱۰ھ - ۱۵۰۰ء) کی تفسیر حسینی سے ماخوذ ہے، اور تیسرا ترجمہ شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ - ۱۷۶۲ء) کا ہے۔

واذ قال ربك للملئكة إني جاعل في الارض خليفه ط قالوا اتجعل فيها من يفسد فيها ويسفك الدماء، ونحن نسبح بحمدك ونقدس لك ط قال اني اعلم ما لا تعلمون ○ ترجمہ منسوب بہ شیخ سعدی:

" و یاد کن چون گفت پروردگار تو، مر فرشتگان را کہ بدرستی من آفریننده ام، در زمین جانشینے را گفتند آیا می آفرینی در زمین کسی را کہ فساد کند در آن، و بریزد خونہا، و ما تسبیح می کنیم ترا بستایش و بپاکی یاد می کنیم ترا، گفت بدرستی من میدانم آنچہ شما نمی دانید" (پانچ ترجمہ والا قرآن مجید، اقبال پرنٹنگ ورکس دہلی)

ترجمہ ملا حسین واعظ کاشفی:

" و یاد کن چون گفت پروردگار تو، مر تمام فرشتگان را، بدرستی کہ من آفریننده ام، در زمین، بدلی، گفتند، آیا می آفرینی، در زمین، کسی را کہ فساد کند در زمین، و بریزد خون، و حال آنکہ ما بپاکی یاد کنیم ترا بامر تو، و ذکر می کنیم ترا بپاکیزگی، گفت خدای بدرستی کہ من می دانم، آنچہ شما نمی دانید

(تفسیر حسینی، مطبع احمدی)

ترجمہ شاہ ولی اللہ دہلوی :-

" و یاد کن چون گفت پروردگار تو، بفرشتگان کہ من آفرینندہ ام در زمین خلیفہ، گفتند آیا می آفرینی در زمین کسی را کہ تباہی کند در وی' و خون ریزی کند' و ما تسبیح می کنیم بحمد تو' و بپاکی اقرار می کنیم برای تو' فرمود ہر آئینہ میدانم آنچہ شما نمی دانید -"

(پانچ ترجمہ والا قرآن مجید)

ترجمہ ملا شاہ :-

" وقتی کہ گفت پروردگار تو' مر ملائکہ را بدرستی کہ من میگردانم در زمین بدلی' گفتند فرشتہا آیا خلق میکنی در زمین کسی را کہ فسادی کند در زمین و می ریزد خونہا' وحالانکہ ما بپاکی یاد می کنیم' ترا با مر تو و ذکر می کنیم ترا بپاکیزگی' گفت خدای تعالیٰ بدرستی کہ من می دانم' آن چیزی را کہ نمی دانید شما آنرا "

ان میں سے دو ترجمے ملا شاہ کے عہد سے قبل کے ہیں اور ایک ترجمہ ان کے بعد کا ہے۔ لیکن سلاست و روانی میں ان کا ترجمہ بھی دیگر تراجم کے ہم پلہ ہے۔

نکات کے سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مصطلحات سے بالعموم کام نہیں لیا ہے اور نہ فنی مسائل سے بحث کی ہے' بلکہ زبان سلیس اور انداز بیان سادہ ہے۔

بحیثیت مجموعی یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اگر اس عام فہم تفسیر کے ساتھ یہ ترجمہ مکمل ہوجاتا تو قرآن مجید کے فارسی تراجم و تفاسیر میں ایک مفید اضافہ ہوتا۔

ملا شاہ کا عربی کلام : کلیات ملا شاہ کی تیسری جلد کے آخر میں " دیوان عربی" کے عنوان سے ملا شاہ کا عربی کلام بھی شامل ہے۔ یہ دیوان ق ۲۶۸ (ب) تا ۲۷۷ (ب) یعنی ۱۰ اوراق پر مشتمل ہے' ابیات کی تعداد کم وبیش ۹۰۰ ہے۔

ملا شاہ کا فارسی کلام جس معیار کا ہے' وہ بات عربی کلام میں نہیں۔ عربی شاعری میں بالعموم قصیدہ کی ہیئت استعمال ہوتی ہے' حماسہ و مراثی کا مضمون ہو یا ادب و نسیب کا موضوع ہر ایک کے لئے قصیدہ کا قالب کام آتا ہے۔ مثنوی' مثلث' مخمس یا ہیئت کے اعتبار سے کوئی دوسری صنف کم استعمال ہوتی ہے۔

ملا شاہ نے جدت طرازی سے کام لیا ہے کہ فارسی اصناف سخن کا تتبع کرتے ہوئے، قصیدہ، غزل، مثنوی اور رباعی کی ہیئت کا استعمال کیا ہے۔

ابتدا قصائد سے کی ہے، ۲۷ قصیدے تقریباً ۴ اوراق پر مشتمل ہیں۔ ہر قصیدہ کا پہلا شعر درج کیا جاتا ہے:

۱۔ اعتبار اتک فی الکل لدارت دعہا — عدمات تتجلی لک قمر فاد فعہا

۲۔ ان قلت ما الخلاص عن حالة الخراب — فالذب بدل تحقیق کالطین والتراب

۳۔ وجود القید فی الحب نجاۃ — ثبوت للموت فی العشق حیواۃ

۴۔ لیس للحرف حاصل الحارث — یحرق الحاصل هو الماکث

۵۔ قلت للناصح دفقالم انت الرائث — انا فی عالم خیر بشهود الوارث

۶۔ بارک اللّٰہ لمن کان له المعراج — وهو المیل الی حضرتنا الا قراج

۷۔ لون المریض عشقادال علیه حالا — الحال ما تبین لو یکتم الصریح

۸۔ مضی زمانک ما من مقید التشیخ — لقی عنانک فی قبض من له التوبیخ

۹۔ صدیق خضر فی ایت الوضوء بالتجدید — تواضعا فخذ الاسم حضرۃ التوحید

۱۰۔ عرفت ربی من ربی اننی التلمیذ — له تعالیٰ خاصًا اخص بالتاخیذ

۱۱۔ ورأی العین ما ئری الاغیار — ثانی اثنین اذ هما فی الغار

۱۲۔ الاترون بالاسفار یا اولی الاقطار — قطارکم کقطار الحمار فی الاسفار

۱۳۔ قلبنا الیوم انجلی من جلوۃ شمس الشموس — ایها العقال لا تغفلن من عکس العکوس

۱۴۔ ارمیک فی طلب اللّٰہ بالطریق الخاص — طریق خاص الی اللّٰہ ما سوی الاخلاص

۱۵۔ ولا نقول لکا ندع لنا التفویض — لعل انک لا تلتقی لنا بنقیض

۱۶۔ وما سعیت بفرط الجهاد والتفریط — هما التمام حولهن فاسع بالتسقیط

۱۷۔ عینا عن طرف للمشرق طار الطالع — عالم الغیب به صار علینا اللامع

۱۸۔ یقینک الشیخ جل عن للطلب فارغ — صلواۃ اهل یقین عکس شرع البالغ

۱۹۔ تحی لنا بطریق الکلام نفس حرف — ولا تحی لنا و لنت آدم صالوں

۲۰- نقوم مسجدھی ونسجد فی الطاق — بہ العلیم علیم بعالم الاطلاق

۲۱- ولا سواک بین التراب والافلاک — ظہورکا ھو فی الکل ولا الہ سواک

۲۲- بوصول المطلب نحن لک الدلال — نحن دلال لکا و انت لہ المدلال

۲۳- لم تدل امالک نفسک مالم یعلم — نفسک الحق لک العلم بہ وقع تدم

۲۴- نور اللہ بنورکا ھو اتی بالنون — قلبنا بالقلم لفظا ھو موزون

۲۵- غفلۃ مسجدھم للصلوٰۃ قامو — لقیام الغفلۃ لیس لھم اصل وضو

۲۶- رأیت اللہ فی الکل لا الہ سواہ — بحق اشھد ان لا الٰہ الا اللہ

۲۷- حکایۃ ھی موقوفۃ بفھم زکی — وفی الزکی نظرما الطمع لطبع الدنی

اس کے بعد غزلیات کا عنوان ہے، مشتمل بر ق ۲۷۱ (ب) ــ ۲۷۳ (ب)۔

پہلا شعر :- حمدت حمد اللہ کان منیارا — صدور دام فیھا القلوب طیارا

آخری ":- شکرت للہ یا شاہا صاحب العالم — وتمت الغزلیات کانت العربی

غزلیات کے بعد رباعی کا عنوان ہے (ق ۲۷۳ (ب) ــ ۲۷۵ (الف)

پہلی رباعی فی الحمد: الحمد لمن علینا طلبا — اعطی طلبا رأیت حا الاعجبا
آتی بسلوکہ لنا بعد طلب — من بعد سلوکہ وجد ناطربا

ہر رباعی کا ایک عنوان مقرر کیا ہے، جیسے: فی النعت، فی التقویٰ، فی تعریف العارف، وغیرہ۔ آخری رباعی یہ ہے:

لا مادۃ فی العلم العربی — علم العربی یاتینی فی طلبی
لا اعلم بل اعلم لو کان العلم — قد کان حجاب فیضہ ابو العجبی

سب سے آخر میں "دیوانچہ مثنوی" ہے۔ پہلی مثنوی کا ابتدائی شعر یہ ہے:

بسم اللہ النور والضیاء — الحمد اللہ الکبریاء
المدح لاحمد اُمّی لقب — منقبتی صحبۃ اھل الطرب

مثنویاں فارسی مثنویوں کی بحر پر لکھی گئی ہیں، سرنامہ پر اس کی نشاندہی کرتے گئے ہیں۔ دوسری

مثنوی" فی بحر الحدیقہ" کا پہلا شعر:

فیك مطلوب منك فتح الباب — فی ید الله مطلب الطلاب

تیسری مثنوی" فی بحر المثنوی المعنوی" پہلا شعر:

قلت لك یا صاحبی یا صاحبا — ھل تقول فی جوابی عبدنا

چوتھی مثنوی" فی بحر شاھنامہ" پہلا شعر:

لنا منك داء ومنك الدواء — بحق الدوا طالنا عمرنا

پانچواں مثنوی" فی بحر یوسف زلیخا" پہلا شعر:

الھی انت مختار علینا — وما من اختیارات لدینا

چھٹی مثنوی" فی بحر سبحۃ الا سرار" پہلا شعر:

لله الحمد اتینا بلقا — یلقا وھولنا عین بقا

آخری مثنوی "خاتمہ" کے عنوان سے ہے، پہلا شعر:

شاھنا لیس مکانہ بالله — لیس لہ صوت وقلنا یا شاہ

آخری شعر یہ ہے:

اقرأہ کل صباح و مساء — اقلہ واجعل رأس الرد ساہ

مُلّا شاہ کے عربی کلام کی زبان تو عربی ہے، لیکن اسلوب بیان اور تراکیب بالکلیہ فارسی ہیں۔ بحریں بھی وہی استعمال کی ہیں جو فارسی میں مستعمل ہیں، اشعار کا موضوع بیشتر تصوف ہے۔ لیکن بعض اشعار عروضی اور نحوی قواعد سے آزاد ہیں اور بعض اشعار کے مفہوم تک پہنچنا دشوار ہے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں:۔

یقینکا الکش یجیل عن الطلب فالغ — صلوۃ اھل یقین عکس شرع المبالغ

اس شعر میں عکس شرع سے مراد عرش ہے، یعنی اہل یقین کی نماز عرش پر پہنچ کر ہوتی ہے۔

اسی غزل" کا دوسرا شعر بھی فارسی لہجہ میں پڑھا جائے گا:

صفاء قلب عن اللوث اولاً لابد — وفی الاخیر بتعریفہ کن الصانع

مزید چند شعر پیش خدمت ہیں:

دواء عشقك لوکان فی بساط الارض — لکنت فی طلبہ ھا سار حیارا

عمہم یسئلون متفقون   عن نباھم وفیہ مختلفون
ورأی العین ما رأی الاغیار   ثانی اثنین اذ ھما فی الغار

قصائد، غزلیات، رباعیات کی تقسیم کے باوجود مضمون اور انداز بیان میں یکسانیت ہے، تقریباً سارا کلام ان کے صوفیانہ خیالات اور نصائح پر مشتمل ہے۔

دیوان عربی کا کوئی دوسرا نسخہ سامنے نہیں ہے، اس لیے متن کی صحیح قرأت دشوار ہے، اور یہ فیصلہ کرنا ممکن نہیں کہ اغلاط میں ناقل کی عنایتوں کا کتنا دخل ہے اور نقل مطابق اصل کس قدر ہے، اسی بنا پر متن کی تصحیح سے صرف نظر کرتے ہوئے، اشعار اصل کے مطابق نقل کر دیئے گئے ہیں۔

کلیات ملا شاہ کی ہر سہ مجلدات کے مضامین کی تفصیلات کے لئے دیکھیں:

(۱) لائبریری کیٹلاگ ج ۳، ص ۱۲-۱۱۴ (۲) تاثیر معنوی ایران در پاکستان حالات وتصنیفات کے لئے مزید حوالے: (۳) صاحبیہ (۴) سکینۃ الاولیاء ص ۱۵۲ (۵) عمل صالح ج ۳ ص ۳۷۶ (۶) پادشاہ نامہ ج ۱، ص ۳۳۱ (۷) ریاض الشعرا ق ۱۱۴ (۸) مرآۃ الخیال ص ۱۲۹ (۹) دبستان ج ۳، ص ۲۸۴ (۱۰) خزینۃ الاصفیاء ص ۱۷۲ (۱۱) نگارستان سخن ص ۴۴ (۱۲) صبح گلشن ص ۴۴۴ (۱۳) روز روشن ص ۴۰۷ (۱۴) مخزن الغرائب ج ۲، ص ۱۰۲۵ (۱۵) تذکرہ حسینی ق ۱۰۶-۱۰۷ (۱۶) اسپرنگر اودھ کیٹلاگ ص ۱۲۸ (۱۷) سی-اے اسٹوری ج ۱، حصہ ۲- ص ۹۹۸- ۱۰۰۹- (۱۸) برلن کیٹلاگ نمبر ۹۴۶ (۱۹) برٹش میوزیم کیٹلاگ ج ۲، ص ۶۹۰ (۲۰) انڈیا آفس کیٹلاگ نمبر ۱۵۸۰ (۲۱) ریحانۃ الادب ج ۵، ص ۳۸۲-۳۸۳ (۲۲) پنجاب یونیورسٹی کیٹلاگ ج ۱، حصہ ۲، ص ۲۵۷-۲۵۸ (۲۳) نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۱۶۴- ۱۶۵

●●

حکیم سید ظل الرحمن
صدر شعبۂ علم الادویہ اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی

مطبوعات ابن سینا

مختلف موضوعات سے متعلق ابن سینا کی تصانیف مشرق و مغرب میں کثرت سے طبع ہوئی ہیں۔ اصل متن کے علاوہ ان کے تراجم کی اشاعتوں کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ ان میں سے بعض ترجموں کا تعلق مکمل کتاب یا جزوی حصوں سے ہے۔ تراجم یا شروح و حواشی سے قطع نظر یہاں صرف اس کی مطبوعہ تصانیف سے واقفیت و آگاہی مقصود ہے:

(الف) فلسفہ و طبیعیات سے متعلق ابن سینا کے رسائل کا ایک مجموعہ ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۰ء میں قسطنطنیہ سے طبع ہوا۔ اس میں درج ذیل ۹ رسائل شامل ہیں:

(۱) الطبیعیات من عیون الحکمۃ (۲) رسالۃ فی اجرام العلویۃ (۳) رسالۃ فی القوی الانسانیۃ وادراکاتہا۔ (۴) رسالۃ فی الحدود (۵) رسالۃ فی اقسام العلوم العقلیۃ (۶) رسالۃ فی اثبات النبوۃ و تاویل رموزہم و امثالہم (۷) رسالۃ النیروزیۃ فی معانی الحروف الہجائیۃ (۸) رسالۃ فی العہد (۹) رسالۃ فی علم الاخلاق۔

اس کے آخر میں قصہ سلامان و ابسال جسے حنین بن اسحاق نے یونانی سے عربی میں ترجمہ کیا تھا، شائع ہوا ہے۔ یہ مجموعہ ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء میں بمبئی سے اور ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۷ء میں قاہرہ سے بھی طبع ہوا ہے لیکن ان اشاعتوں کے آخر میں قصہ سلامان و ابسال شامل نہیں ہے۔

(ب) دائرۃ المعارف حیدرآباد سے "مجموعہ رسائل الشیخ الرئیس" کے نام سے ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۵ء میں ایک مجموعہ طبع ہوا ہے جو سات رسایل پر مشتمل ہے: (۱) رسالۃ الفعل والانفعال فی تاثیر القوی الجسمانیۃ (۲) رسالۃ فی ذکر اسباب الرعد۔ (۳) رسالۃ فی سر القدر (۴) رسالۃ العرشیۃ فی التوحید (۵) رسالۃ فی السعادۃ (۶) رسالۃ فی الحث علی الذکر رسالۃ الذکر، (۷) رسالۃ فی الموسیقی۔

(ج) سات رسایل کا ایک مجموعہ بعنوان "مجموعۃ الرسایل" ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء میں قاہرہ سے طبع ہوا: (۱) علم الاخلاق، (۲) رسالۃ العہد (۳) القوی الانسانیۃ وادراکاتہا (۴) اقسام العلوم العقلیۃ (۵) رسالۃ فی السر القدر (۶) رسالۃ المبدأ والمعاد (۷) بیان الجواہر النفیس۔

(د) ۱۳۳۵ھ/۱۹۱۷ء میں قاہرہ سے "جامع البدائع" کے نام سے ایک مجموعہ شائع ہوا ہے۔ اس میں ابن سینا کے بارہ[12] رسائل حسب ذیل ہیں: (۱) رسالۃ الصلوٰۃ (۲) رسالۃ فی تفسیر الصمدیہ (۳) رسالۃ فی تفسیر المعوذۃ الاولیٰ (۴) رسالۃ فی تفسیر المعوذۃ الثانیۃ (۵) رسالۃ تضمن سوال الشیخ ابو سعید بن ابی الخیر من الشیخ الرئیس ابن سینا۔ (ان سوالات کا تعلق زیارت مقابر، کیفیت زیارت اور اس کی حقیقت و تاثیر سے ہے جن کا شیخ الرئیس نے جواب دیا ہے) (۶) رسالۃ فی الشفاء من خوف الموت،

(۷) رسالۃ فی القضا والقدر (۸) رسالۃ فی العشق (۹) رسالۃ حی بن یقظان (۱۰) رسالۃ الطیر (۱۱) رسالۃ اجوبۃ الشیخ الرئیس عن مسائل ابی الریحان البیرونی (ستہ عشر مسالۃ) (۱۲) رسالۃ جواب الشیخ الرئیس علی سوال ابی حسین احمد السہلی عن علۃ قیام الارض فی وسط السماء۔

(۵) ابن سینا کے رسائل تصوف پر مشتمل لیڈن سے چار جلدوں میں ایک مجموعہ شائع ہوا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے:

جلد اوّل:۔ رسالۃ حی بن یقظان لیڈن ۱۸۸۹ء۔ جلد دوم: الانماط الثلاث الآخرۃ من الاشارات و التنبیہات مع شرح مختار من کتاب حل مشکلات الاشارات والتنبیہات لنصیر الدین طوسی وتتلوھا رسالۃ الطیر۔ لیڈن ۱۸۹۱ء جلد سوم: رسالۃ فی العشق۔ رسالۃ فی ماہیۃ الصلوٰۃ۔ کتاب فی معنی الزیارۃ وکیفیۃ تاثیرہا۔ رسالۃ فی دفع الغم من الموت۔ لیڈن ۱۸۹۴ء۔ جلد چہارم: رسالۃ فی القدر، لیڈن ۱۸۹۹ء

(و) حاشیہ شرح ہدایۃ اثیریہ ملا صدرا مطبوعہ تہران ۱۳۱۳ھ میں ابن سینا کے حسب ذیل ۱۳ رسالے طبع ہوئے ہیں: (۱) اسئلۃ الشیخ ابی سعید بن ابی الخیر عن الشیخ الرئیس مع اجوبتھا (۲) تفسیر آیۃ الدخان (۳) تفسیر سورۃ التوحید (۴) تفسیر سورۃ الفلق (۵) تفسیر سورۃ الناس (۶) اسئلۃ بہمن یار عن الشیخ مع اجوبتھا (۷) رسالۃ فی معرفۃ الاشیاء (۸) رسالۃ فی سر القدر فی جواب سوال بعض الناس (۹) رسالۃ فی الاخلاق (۱۰) رسالۃ فی العہد (۱۱) رسالۃ فی القوی الانسانیۃ (۱۲) رسالۃ فی السحر والطلسمات وغیرہا وبیان حقیقۃ کل واحد منہا (۱۳) مسائل اربعۃ من تصانیف الشیخ الرئیس فی امر المعاد۔

(ز) کتاب کنوز الفوائد، مؤلفہ ملا عباس علی قزوینی مطبوعہ تہران ۱۳۰۸ شمسی میں ابن سینا کے تین رسالے طبع ہوئے ہیں: (۱) تفسیر فواتح السور (۲) کلام فی الحلو والحث علی تصفیۃ الباطن (۳) سوالات عشر۔

(ح) استنبول سے ۱۹۳۷ء میں لاطینی خط میں ایک مجموعہ "بیوک ترک فیلوزوف وطب استادی ابن سینا شخصیتی واثر یری حقندہ تدقیق لر" کے نام سے عربی متن و ترکی ترجمہ کے ساتھ طبع ہوا ہے، اس میں ۳ رسالے ہیں: (۱) رسالۃ حی بن یقظان (۲) کتب الشیخ الرئیس ابو علی بن سینا الی الشریف ابی الحسین علی بن ابی الحسین (مقالۃ تشتمل علی احکام الادویۃ القلبیۃ)، (۳) رسالۃ فی ماہیۃ الحزن واسبابہ۔

(ط) کتاب "ارسطو عند العرب" مؤلفہ عبد الرحمٰن بدوی، مطبوعہ قاہرہ ۱۹۴۷ء حصہ اوّل) میں ابن سینا کے درج ذیل رسالے چھپے ہیں: (۱) شرح حرف اللام (۲) شرح کتاب اثولوجیا المنسوب الی ارسطو (۳) تعلیقات علی حواشی کتاب النفس لارسطو (۴) کتاب المباحثات (۵) رسائل خاصۃ لابن سینا (۶) رسالۃ العہد لنفسہ۔ ان مجموعوں کے علاوہ علیحدہ طبع ہونے والی کتابوں کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ الاشارات والتنبیہات:۔ پہلی مرتبہ ۱۸۹۱ء میں میخائیل بن یحیٰی کی سعی سے لندن سے اور دوسری

مرتبہ تین جلدوں میں ۱۹۴۸ء میں قاہرہ سے طبع ہوئی۔ ڈاکٹر احسان یار شاطر نے ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء میں تہران سے اس کا فارسی ترجمہ شائع کیا۔ اس سے پہلے اشارات کا ایک فارسی ترجمہ تہران سے ۱۳۱۶ شمسی میں چھپ چکا تھا۔

(۲) **الشفا** : الفن الاوّل من الطبیعیات، الفن الثالث عشر من الالٰہیات درحاشیہ ملاصدرا و جمال خوانساری مطبوعہ تہران ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۵ء۔ الشفا۔ المدخل۔ الاب قنواتی، محمود الخضیری مطبوعہ قاہرہ ۱۹۵۲ء

(۳) **النجاۃ** : (مختصر الشفا) پہلی مرتبہ قانون کے ذیل میں ۱۵۹۳ء میں روم سے طبع ہوئی۔ اشاعت قاہرہ ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۳ء، اشاعت ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء۔ لاطینی ترجمہ مطبوعہ ۱۹۲۶ء۔ تتمہ النجاۃ فارسی ترجمہ حسین احمد تربیت، محمد عاصی کمال عینی مطبوعہ روس ۱۹۸۰ء۔ (۴) اسباب حدوث الحروف، محی الدین خطیب مطبع مؤید قاہرہ ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء و ڈاکٹر پرویز ناتل خانلری دانش گاہ تہران ۱۳۳۳ شمسی۔ (۵) **الحکمۃ المشرقیہ** : ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء میں منطق المشرقیین والقصیدۃ المزدوجۃ فی المنطق کے ساتھ مصر سے طبع ہوئی۔ (۶) **الارجوزۃ فی الطب** یا الارجوزۃ السینائیۃ با شرح ابن رشد: مطبوعہ لکھنؤ ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء۔ اس سے قبل کلکتہ سے یہ ۱۸۲۹ء میں طبع ہوا ہے۔ حکیم عبدالعزیز بٹالوی نے جواہر النفیس فی شرح ارجوزۃ الشیخ الرئیس کے نام سے اس کا اردو ترجمہ مع شرح کیا ہے جو شائع ہو چکا ہے۔ (۷) **الارجوزۃ فی المنطق** یا الزر المنطق یا میزان النظر یا القصیدۃ المزدوجۃ یا القصیدۃ المعرضۃ: مطبوعہ بون ۱۸۳۶ء و در ضمیمہ المنطق المشرقیۃ مطبوعہ مصر ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء۔ (۸) **ابطال احکام النجوم**: مطبوعہ بلجیم ۱۸۵۵ء۔ (۹) **الادویۃ القلبیۃ**: مطبوعہ استنبول ۱۹۳۷ء۔ مطبوعہ تاشقند ۱۹۶۶ء مع متن عربی و ترجمہ ازبکستانی۔ اردو ترجمہ شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی مطبوعہ ایران سوسائٹی کلکتہ ۱۹۵۶ء، انگریزی ترجمہ ہمدرد فاؤنڈیشن کراچی ۱۹۸۲ء۔ (۱۰) **اسرار الصلوٰۃ**، مطبوعہ تہران ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۶ء درحاشیہ شرح اشارات نصیر الدین طوسی۔ (۱۱) **السیاسۃ** معلوف الیسوعی بیروت ۱۹۰۶ء بار دوم ۱۹۱۱ء۔ (۱۲) **اقسام الحکمۃ**، لکھنؤ ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۱ء، دہلی ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء۔ (۱۳) **پنج رسالہ فارسی و عربی** مرتبہ ڈاکٹر احسان یار شاطر مطبوعہ تہران ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء (۱۴) **ترجمہ رسائل ابن سینا فارسی**، ضیاء الدین مطبوعہ تہران ۱۳۱۸ شمسی۔ (۱۵) **تدابیر المنزل** والسیاسۃ الاہلیۃ: مطبوعہ بغداد ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۹ء؛ جلد ۹ مجلہ مشرق بیروت ۱۹۰۶ء۔ بار دوم بیروت ۱۹۱۱ء با شرح فرانسیسی تحت عنوان فلاسفۃ العرب القدماء۔ (۱۶) **تفسیر سورۃ الاخلاص والفلق**: مطبوعہ قاہرہ (در جامع البدائع) و مطبوعہ دہلی ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۳ء۔ (۱۷) **تفسیر سورۃ التوحید**: در مجموعہ جامع البدائع قاہرہ ۱۹۱۷ء و درحاشیہ شرح ہدایۃ اثیریہ مطبوعہ تہران۔ (۱۸) **تفسیر سورۃ الناس**: در مجموعہ جامع البدائع قاہرہ و درحاشیہ شرح ہدایۃ اثیریہ تہران ۱۳۱۳ھ/۱۸۹۵ء و دہلی [illegible]۔ (۱۹) **تفسیر ثم استوی الی السماء**: مطبوعہ تہران ۱۳۱۳ھ۔ درحاشیہ شرح ہدایۃ الحکمۃ۔ (۲۰) دانش نامہ علائی منطق، [illegible] ۱۹۵۱ء (۲۱) دانش نامہ طبیعیات، سید محمد مشکوٰۃ

۱۳۳۱ ہجری شمسی / ۱۳۷۱ھ ہجری قمری۔ (۲۲) دانش نامہ علائی ریاضیات: مجتبیٰ مینوی ۱۳۳۱ شمسی / ۱۳۷۱ھ۔ (۲۳) **دانش نامہ علائی الٰہیات:** ڈاکٹر محمد معین مطبوعہ تہران۔ دانشنامہ علائی تصحیح و حاشیۂ احمد خراسانی تہران ۱۳۱۵ شمسی۔ فارسی ترجمہ مایۂ دانش علائی مشہور بحکمت علائی (دو جلد) مطبوعہ حیدرآباد ۱۳۰۹ھ / ۱۸۹۱ء۔ (۲۴) **دفع المضار الکلیۃ عن الابدان الانسانیۃ** (کتاب التدارک لانواع خطاء التدبیر) مطبع بولاق قاہرہ سے ۱۳۰۵ھ / ۱۸۸۷ء میں محمد بن زکریا رازی کی کتاب "منافع الاغذیہ و دفع مضارہا" کے حاشیہ پر طبع ہوئی ہے۔ ترجمہ فارسی بنام موجز عظیم النفع ترجمہ تدارک الخطا شیخ حسین انصاری المخاطب بہ حاذق خاں مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۲ء۔ ترجمہ لاطینی (Alpagus) ۱۵۴۷ء۔ (۲۵) **دفع الہم عند وقوع الموت یا الشفاء من خوف الموت:** مطبوعہ لیڈن ۱۸۹۹ء۔ مطبوعہ قاہرہ ۱۳۳۵ھ / ۱۹۱۶ء و مطبوعہ بیروت ۱۹۱۱ء باشرح فرانسیسی۔ (۲۶) **رسالۃ الاضحویۃ** بتصحیح سلیمان دنیا قاہرہ ۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء۔ اس کا ایک عمدہ تنقیدی متن اکبر باغبان فردوسی اور کمال علینی کی کوشش سے ۱۹۸۰ء میں روس سے طبع ہوا۔ (۲۷) **رسالۃ الصلوٰۃ و ماہیتہا:** باشرح فرانسیسی لیڈن ۱۸۹۴ء۔ تہران ۱۳۱۵ شمسی و قاہرہ ۱۳۳۵ھ / ۱۹۱۷ء و در مجموعہ جامع البدائع۔ (۲۸) **رسالۃ الطیر:** در جامع البدائع قاہرہ و جلد چہارم مجلۃ المشرق بیروت ۱۹۰۱ء و در ضمن رسائل شیخ شہاب الدین سہروردی مطبوعہ لیپزگ شرح رسالۃ الطیر عمر بن سہلان مطبوعہ ۱۹۳۵ء (۲۹) **رسالۃ المعاد:** آقای شہابی مطبوعہ تہران۔ (۳۰) **رسالۃ النیروزیۃ:** در تفسیر ملا صدرا مطبوعہ تہران ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء و مطبوعہ شیراز ۱۳۳۱ھ / ۱۹۱۲ء۔ (۳۱) **رسالہ تشریح الاعضاء** (منسوب بہ ابن سینا) ڈاکٹر غلام حسین صدیقی مطبوعہ تہران۔ (۳۲) **رسالہ جودیہ:** محمود نجم آبادی ۱۳۷۰ھ / ۱۹۵۰ء۔ اردو ترجمہ مع متن مقدمہ و حواشی حکیم سید ظل الرحمن مطبوعہ علی گڑھ ۱۹۷۱ء۔ (۳۳) **رسالہ حی بن یقظان:** پروفیسر ہنری کربن۔ مطبوعہ مصر ۱۲۹۹ھ / ۱۸۸۱ء (۳۴) **رسالہ در حقیقت و کیفیت سلسلۂ موجودات و تسلسل اسباب و مسببات:** موسیٰ عمید تہران ۱۳۳۱ شمسی / ۱۳۷۱ ہجری قمری (۳۵) **رسالہ سکنجبین:** ترجمہ لاطینی Alpagus ۱۵۴۷ء۔ عربی متن و اردو ترجمہ حکیم تبارک کریم تکیلی کلکتہ ۱۳۹۱ھ / ۱۹۷۱ء (۳۶) **رسالہ عشق:** سید محمد مشکوٰۃ تہران ۱۳۲۰ شمسی۔ ترجمہ رسالہ عشق ضیاء الدین دری مطبوعہ تہران ۱۳۱۸ شمسی۔ باشرح فرانسیسی میخائیل بن یحییٰ مہرنی مطبوعہ لیڈن ۱۸۹۹ء و مطبوعہ قاہرہ ۱۳۳۵ھ / ۱۹۱۷ء (۳۷) **رسالہ قراضۂ طبیعیات** (منسوب بہ ابن سینا) غلام حسین صدیقی تہران ۱۳۷۳ھ / ۱۹۵۳ء (۳۸) **رسالہ کنوز المعزمین** فارسی: جلال الدین ہمائی ۱۳۳۱ شمسی / ۱۳۷۱ھ (۳۹) **رسالہ معیار العقول** در علم جر ثقیل مطبوعہ لکھنؤ و جلال الدین ہمائی مطبوعہ تہران ۱۳۷۰ھ / ۱۹۵۱ء۔ (۴۰) **رسالہ نبض:** (رسالہ رگ شناسی) مطبوعہ تہران ۱۳۱۷ شمسی باہتمام سید محمد مشکوٰۃ تہران ۱۳۳۹ شمسی۔ (۴۱) **رسالہ نفس:** موسیٰ عمید تہران ۱۳۷۱ھ / ۱۹۵۱ء۔ (۴۲) **رسالہ فی معرفۃ النفس الناطقۃ و احوالہا۔** مطبع الاعتماد قاہرہ (۴۳) **رسالہ فی الہندباء (کاسنی)**

سہیل انور استانہ ترکی (۴۴) رویتہ الکواکب باللیل لا بالنہار (انگریزی): ڈاکٹر سہیل انور مطبوعہ امریکا ۱۹۴۶ء (۴۵) زبدۃ الرمل: مطبوعہ دہلی ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء (۴۶) شرح کتاب النفس لارسطو یا رسالہ نفس۔ یہ رسالہ افضل الدین کاشانی کے نام سے منسوب رہا اور اسی کے نام سے ۱۳۱۶ھ میں تہران سے طبع ہوا۔ (۴۷) شفاء الاسقام فی علم الحروف والارقام (منسوب بہ ابن سینا) مطبوعہ مصر ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء۔ (۴۸) ظفر نامہ: (منسوب بہ ابن سینا) غلام حسین صدیقی، استاد دانش گاہ تہران (۴۹) عیون الحکمۃ: ایک مرتبہ ہندوستان اور ایک مرتبہ قاہرہ سے طبع ہونے کے علاوہ مجتبیٰ مینوی استاد دانش گاہ تہران نے ۱۳۱۳ شمسی میں اسے خاص اہتمام سے شائع کرایا۔

(۵۰) قصیدۃ العینیۃ الروحیۃ، مع کتاب بوذاسف و بلوہر مطبوعہ بمبئی ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۸ء۔ یہ قصیدہ مع ترجمہ ترکی مصطفیٰ کامل استنبول سے ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۹ء میں طبع ہوا ہے۔ اس سے قبل قاہرہ میں ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء میں بھی چھپ چکا تھا۔ رسالہ عینیۃ فی النفس مع شرح بعنوان "الروح الخالدۃ" علی نصوم الظاہر کی کوشش سے مطبع الجیش العربی الاردنی سے ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا ہے۔ (۵۱) قصیدہ فی ما یحدث من الامور والاحوال: عیون الانباء ابن ابی اصیبعہ مطبوعہ قاہرہ میں طبع ہوا ہے۔ (۵۲) ما بعد الطبیعیات: لاطینی ترجمہ وینس اڈیشن ۱۴۹۵۔ لووین ۱۹۶۱ء (۵۳) معراج نامہ: بہمن کریمی مطبوعہ تہران ۱۳۱۲ شمسی، بار دوم غلام حسین صدیقی مطبوعہ تہران (۵۴) ہدیۃ الرئیس للامیر نوح بن منصور سامانی وھی تحث عن القوی الانسانیۃ مطبوعہ قاہرہ ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء (مقالہ فی النفس یا بحث فی القوی الانسانیۃ، یا کتاب النفس یا (عشرۃ الفصول) بار دیگر مطبوعہ قاہرہ ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء۔ یہ غالباً وہی رسالہ ہے جسے موسیٰ عمید نے ۱۹۵۱ء میں شائع کیا ہے۔ (۵۵) القانون فی الطب: مکمل قانون کے علاوہ اس کے جزوی حصوں بالخصوص کلیاتی حصہ کی کثرت سے اشاعت ہوئی ہے۔ مکمل قانون اور اس کے بعض اہم تراجم کی اشاعتیں درج ذیل ہیں:— اصل عربی متن مطبوعہ روم ۱۵۹۳ء اور ۱۵۹۵ء مطبوعہ تہران ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۷ء، مطبوعہ قاہرہ ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء، مطبوعہ بولاق ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء، مطبوعہ تہران ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء، لکھنؤ ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۹ء و ۱۳۲۴ھ/۱۹۰۶ء مطبوعہ لاہور ۱۹۰۵ء۔ ترجمہ لاطینی جیرارڈ کریمونا ۱۴۷۳ء میں پہلی بار MILANO میں طبع ہوا۔ اس کے بعد ۱۵ ویں صدی سے قبل یہ ۱۸ مرتبہ شائع ہوا۔ بعد میں ۱۵۲۷ء میں VALPAGUS کا ترجمہ سامنے آیا جس کے بعد اس نئے ترجمہ کے متعدد اڈیشن نکلے۔ ان میں سے ۱۵۹۵ء اور ۱۶۰۸ء کی اشاعتیں ڈاکٹر اوسی گرونر کے انگریزی ترجمہ کلیات

قانون کے دوران پیش نظر رہیں۔ پانچوں جلدوں کا نیا لاطینی ترجمہ RIET VAN .S. VAN RIET ۱۹۶۸ء
میں لووین لیڈن سے طبع ہوا ہے ALPAGUS مکمل قانون کے لاطینی ترجمہ مطبوعہ ۱۵۵۶ء کی
تازہ اشاعت ۱۹۷۶ء تہران سے عمل میں آئی ہے۔ ترجمہ عرانی مطبوعہ نیپلز ۱۴۹۱-۲ء ترجمہ فارسی سید حسین
موسوی مطبوعہ تہران ۱۳۴۱ھ/ ۱۹۲۲ء۔ ترجمہ ازبکستانی مطبوعہ تاشقند ۱۹۵۴ء (پانچ حصوں کا یہ
ترجمہ ۳ جلدوں میں چھپا ہے)۔ ترجمہ اردو حکیم غلام حسنین کنتوری مطبوعہ نول کشور لکھنؤ جلد اول
۱۸۹۶ء جلد دوم (؟) ۱۸ جلد سوم ۱۹۰۰ء جلد چہارم ۱۸۸۶ء جلد پنجم ۱۸۸۷ء پہلی مرتبہ چھپی۔
بعد میں ان کی متعدد اشاعتیں نکلیں۔ ترجمہ انگریزی جلد اول کلیات قانون ڈاکٹر او سی گرونر، مطبوعہ لندن
۱۹۳۰۔ ترجمہ انگریزی جلد اول کلیات قانون ڈاکٹر شاہ مطبوعہ کراچی ۱۹۶۶ء۔ قانون جلد اول
کا قابل قدر تحقیقی متن ادارہ تاریخ و تحقیق طب (ہمدرد) نئی دہلی سے ۱۹۸۲ء میں طبع ہوا ہے۔

●●

حافظ رضوان اللہ آروی

حضرت نصرؔ پھلواروی

(۱۲۴۹ھ ——— ۱۲۹۵ھ)

۲۵ رمضان المبارک ۱۲۴۹ھ کو علوم و عرفان کی پھلواری میں کھلنے والا پھول، علم ظاہری میں شانِ فرد الاولیاء کا حامل تصوّف میں ان کا جانشین اور ادب و شاعری میں ان کے آئینۂ کمالات کا کامل ترین پرتو تھا۔ غرضیکہ حضرت نصرؔ نے گویا اپنی ذات کو اپنے والد ماجد کی ذات میں فنا کر دیا۔ جس کی وجہ سے آگے چل کر خود آپ کے اندر بھی شانِ فردیت نمایاں ہوئی۔ فنائیت کا یہی وہ مقام تھا جس نے بہانگ دہل آپ سے یہ شعر کہلوایا کہ :

اے نصرؔ چو گم بذاتِ فردم   من نیز چو فرد بے مثالم

علوم ظاہری کی ابتدا آپ نے اپنے والد ماجد سے کی۔ لیکن تکمیل آپ کے چھوٹے چچا مولوی شاہ حسین کے ہاتھوں انجام پذیر ہوئی۔ درمیان میں آپ کے معلّم آپ کے برادرِ کلاں شاہ نور العینؒ اور منجھلے چچا حضرت ابو تراب آشنا بھی رہے۔ فنِ حدیث پر عبور حاصل کرنے کے لئے آپ نے شاہ آلِ احمد پھلواروی مہاجر مدنیؒ کو بلوایا جو بحرِ حدیث کے کہنہ مشق شناور تھے۔ اس اعزاز میں حضرت نصرؔ کا کوئی ثانی نہیں۔

۱۲۶۳ھ میں آپ نے اپنے والد ماجد کے دستِ حق پرست پر بیعت کی اور اسی وقت جمیع سلاسل کی اجازت و خلافت سے مشرف ہوئے۔ لیکن آپ کی باطنی تعلیم و تکمیل حضرت ابو تراب قدس سرہٗ کے ذریعہ ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت نصرؔ خود کو حضرت ابو ترابؒ کا "فرزند متبنّی" کہتے تھے (دیکھئے تاریخ حبیب الہ صلا)۔ اپنے بڑے بھائی شاہ نور العینؒ کے وصال فرما جانے کے بعد ۲۹ ربیع الثانی ۱۲۶۸ھ کو حضرت نصرؔ مسندِ رشد و ہدایت پر جلوہ نما ہوئے۔ ۲۷ سال تک آپ کی ذاتِ قدسی صفات علوم و عرفان کے تشنہ کاموں کی پیاس بجھاتی رہی۔ بالآخر ۲۰ ربیع الاوّل ۱۲۹۵ھ کو ۴۶ سال کی عمر میں آپ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ آپ کا مزار باغِ مجیبی پھلواری شریف میں ہنوز زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔

حضرت نصرؔ نے اپنے پیچھے شعری کارنامے کے علاوہ نثری آثار بھی چھوڑے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے

کہ نہایت مختصر لفظوں میں ان کا تعارف کرادیا جائے۔

(۱) **نعمت عظمیٰ** : یہ حضرت کی فارسی تصنیف ہے جس میں ما بہ النزاع مسائل (مثلاً عرس واعراس، فاتحہ و نیاز، تقبیل اظفار وغیرہ) کی تشریح بڑے مدلّل اور محققانہ طور پر کی گئی ہے۔

(۲) **رسالۂ سوالات ستّہ** : یہ بھی حضرت کی فارسی تصنیف ہے اور جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے اس میں شمس آباد کے نور بازخاں نامی ایک شخص کے ان چھ سوالات کے جواب دیئے گئے ہیں جو انھوں نے بخیال تفہیم حضرت کو لکھا تھا۔ یہ سب سوالات بھی مراسم صوفیانہ ہی سے متعلق ہیں۔

(۳) **اسوۂ حسنہ** : یہ حضرت کی وہ لاجواب فارسی تصنیف ہے جس کے متعلق خود حضرت فرماتے ہیں:

"این کتاب با تحقیقات فراوان و تدقیقات بے پایان ترتیب دادہ شد" آگے چل کر لکھتے ہیں:

"نظیرش در عالم انصاف نتوان یافت" (دیکھئے کتاب ہٰذا کا دیباچہ ص۳)

یہ کتاب ہر چہار خلفائے راشدین کے مناقب میں ہے اور بہ ترتیب خلافت ان میں سے ہر ایک کی فضیلت ایک دوسرے پر ثابت کی گئی ہے۔

(۴) **شواہد الجمعہ** : حضرت کا یہ مختصر فارسی رسالہ جو ۲۲ اوراق پر مشتمل ہے، شرمندۂ طبع نہ ہو سکا۔ یہ کتاب جمعہ کی فضیلت اور اس کے جواز کے بیان میں لکھی گئی ہے۔

اس کے علاوہ جناب حکیم شعیب صاحب نے اپنی تصنیف "اعیانِ وطن" میں حضرت کے مزید نثری تصانیف کا ذکر کیا ہے جیسے: رسالہ فضیلتِ اسلام، رسالہ سوالاتِ خمسہ، رسالہ حلاوتِ قلوب، در فضیلتِ خب برکات وغیرہ۔ لیکن غالباً اب یہ سب کتابیں مرورِ ایام کے ساتھ ناپید ہو چکی ہیں۔

ایامِ طفلی ہی سے حضرت نصرؔ کی طبیعت شاعری کی طرف راغب تھی۔ اس پر پھلواری کے علمی و ادبی ماحول نے مزید جلا بخشی۔ شروع میں آپ نے اپنا کلام مولانا وحشیؔ پھلواروی کو بغرض اصلاح دکھلایا۔ آپ کا نتیجۂ فکر "دیوان معجز بیان" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ بعض اہل نظر اور دانشور حضرات کا خیال ہے کہ یہ منفرد دیوان ہے جو صرف اور صرف رسول اکرمؐ کی مدح و توصیف پر مشتمل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دیوان کا بیشتر حصہ مدحِ رسول ہی سے عبارت ہے، تاہم اس میں چند غزلیں ایسی بھی ملتی ہیں جو بزرگانِ سلف کی تعریف میں کہی گئی ہیں اور جنھیں اصطلاح میں منقبت کہا جاتا ہے۔ مثلاً حضرت علیؓ کی شان میں یہ اشعار:
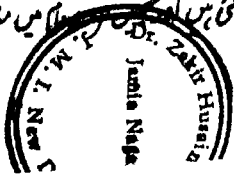
لامکاں باشد مکانت یا علیؓ | کی تواں جستن نشانت یا علیؓ
بوترابت خواند چوں پیغمبرست | عرش خاک آستانت یا علیؓ
جان پاکت عین جانِ احمد است | لحمک لحمی است شانت یا علیؓ
نصرؔ را از گفتگو خاموش کرد | لذّتِ سحرِ بیانت یا علیؓ

یا حضرت غوثِ اعظمؒ کی شان میں کہی گئی غزل کے یہ اشعار :

برتر است از عرشِ اعلیٰ پای غوث | کی بود کس ہمسر و ہمتای غوث
پشت پائی میزند بر تختِ جم | ہر گدائی در گہِ والای غوث
دیدہ را داریم فرشِ راہِ او | سرمہ می خواہم و خاکپای غوث
نصرؔ شد در ہر قدم از جان نثار | چوں خرامان شد قدِ رعنای غوث

حضرت مخدوم بہاریؒ کی ذات سے حضرت نصرؔ کو بچپن ہی سے ایک نیاز خاص حاصل تھا، جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں :

نیاز خاص بدل نصرؔ دارد از طفلی | از آں جنابِ مقدس چو بندگانِ کہین

لہٰذا ان کی شان میں حضرتِ نصرؔ نے یہ بیش بہا اشعار قلمبند کیے :

زخاصگانِ الٰہ زمان و قطبِ زمین | جنابِ حضرتِ مخدوم شاہ شرف الدین
خوشا طریقۂ فردوسیش کہ طالبِ او | یقین بداں کہ بفردوس رفت و خلد برین
ہر آنکہ خدمتِ او را بدل بجا آورد | ز لطفِ او شدہ مخدومِ اہلِ روی زمین

اپنے جدِ اعلیٰ اور بانی خانقاہ مجیبیہ حضرت تاج العارفین پیر مجیب قدس سرہٗ سے حضرت نصرؔ کو شدید قلبی تعلق اور بے پناہ محبت تھی۔ ان کی منقبت میں کہے گئے یہ اشعار آپ کے والہانہ عقیدت کے مظہر ہیں :

ما قمریٔ آں سروِ خرامانِ مجیبیم | کو کو زن ہر گلشن و جویانِ مجیبیم
پروانۂ شمع رخِ تابانِ مجیبیم | آشفتۂ آں زلفِ پریشانِ مجیبیم
ایں نشو و نمایم ہمہ از لطفِ مجیب است | حاشیۂ پروردۂ احسانِ مجیبیم
در گوشۂ بستانِ بجانیم فتادہ | بلبل صفت ای نصرؔ غزلخوانِ مجیبیم

حضرت فرد الاولیاء (پدرِ حضرت نصر) کی تعریف میں کہے گئے یہ اشعار بھی دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچے بغیر نہیں رہتے :

چون بلبلیم نغمہ سرائی ابوالحسن — ہستیم تر زبان بنوائی ابوالحسن
ای عشق یاد بادکہ ماہم ز بختِ نیک — بودیم سرفرازِ لقائی ابوالحسن
شیرین زبانی است از آن آرزوی من — خوانم ہمیشہ مدح وثنائی ابوالحسن
ای نصری گیستم کہ مرادم بمن دہند — امید میبرم بدعائی ابوالحسن

دیوان نصری کا بنظرِ غائر جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت نصر کا محبوب، معشوق، مطلوب اور مقصود سب کچھ رسول اکرمؐ کی ذات فضیلت مآب تھی۔ آتشِ عشقِ رسولؐ سے قلبِ نصر سوزاں تھا۔ حضرتِ نصر کے ابتدائے مشقِ سلوک وسخن کے یہ اشعار ہی ذاتِ محمدیؐ سے آپ کی جذباتی وابستگی اور اقلیمِ سخن پر آئندہ آپ کی جہاں گیری کا اعلان کر رہے تھے :

شمع روییت چراغ ہر خانہ — ہر دل از سوزِ عشق پروانہ
روشن از جلوۂ جمالِ توشد — ہر در و بام ما و کاشانہ
از جمالِ تو کعبہ شد قبلہ — پیش ازین ورنہ بود بتخانہ
نصری چون شد غلام درگہ تو — خسروا یک نگاہِ شاہانہ

اور پھر اسی یک نگاہِ شاہانہ کی بدولت آپ کی شاعری کو وہ ترقی اور عروج نصیب ہوا کہ آپ بر ملا ان دعوؤں کا اظہار کرنے کے قابل ہو گئے کہ :

نصری سعدی منم و حافظِ شیراز منم — شمس تبریز منم و خواجۂ عطار منم

اور : نہ سعدی مانَدَنی جامی نہ حافظ ماندنی خسرو — چو من ای نصری در آرائش شعر و سخن گشتم

اور : بود شعر و سخن بسیار شاعر بیشتر باشند — ولی چون نصری کم یابد کسی این خوش بیانی را

چونکہ یہ تخیل بشر کی حدِ پرواز سے باہر ہے کہ وہ آنحضورؐ کی صحیح تعریف اور صحیح مقام کا احاطہ کر سکے۔ لہٰذا اکثر صوفی شعراء نے یہاں پہنچ کر صاف لفظوں میں اپنے عجز سخن کا اعتراف کیا ہے۔ شمس تبریزؒ جیسا شہبازِ معرفت بھی یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ :

شمس تبریزی چہ داند نعت تو پیغمبرا — مصطفیٰ و مجتبیٰ و سیدِ اعلیٰ توئی

حضرتِ نصر کو بھی جب یہ مرحلہ درپیش ہوا، تو شرحِ کمالِ پیغمبری سے ان کا نطق و بیان بھی عاجز رہ گیا، وہ کہتے ہیں:

ناطقہ حیران شُد از شرحِ کمالِ ذاتِ تو — رتبہ ہای تو ندارد ہیچ غایت یا رسولؐ

بلاشبہ شرحِ کمالِ ذاتِ محمدیؐ سے تو حضرتِ نصر عاجز ہیں، لیکن ان کی جناب پاک میں خود اپنے دل کی تشریح بڑے کامیاب طریقہ پر کی ہے۔ حضرتِ نصر کو ذاتِ رسولؐ سے نہ صرف عشق و عقیدت بلکہ فنائیت کا تعلق تھا۔ دیکھئے حضرتِ نصر کے یہ اشعار کتنے جوش و خروش کے ساتھ فنافی الرسولؐ کی غمازی کر رہے ہیں:

ز خویش رفتم چنانکہ گویم انا محمد انا محمد — چو لوحِ دل از دوئی بشویم انا محمد انا محمد

ز نورِ او شد وجود بودم ظہور او شد ہمہ نمودم — سزد کہ گویم چو جملہ اویم انا محمد انا محمد

ز باطنِ من ندا بر آمد بطالبانِ رسول برگو — بیا بسویم بیا بسویم انا محمد انا محمد

چو نصر در خود نظر نمودم ہمہ جمالِ رخش نمودم — چو خوی او گشت جملہ خویم انا محمد انا محمد

نیز اسی قبیل کے چند اور اشعار دوسری بحر اور دوسرے انداز میں ملاحظہ ہو:

ہستم چو نورِ احمد، بر خود درود خوانم — صلِّ علیٰ محمد، بر خود درود خوانم

جسمم چو جسمِ او شد، جانم چو جانِ او شد — گشتم ہمہ محمد، بر خود درود خوانم

فانی نمودہ خود را، باقی بذاتِ اویم — گشتم یکی چو از حد، بر خود درود خوانم

اے نصر چون زبانم باشد زبانِ احمد — مارا ببین کہ از خود، بر خود درود خوانم

ویسے تو آپ کی سبھی نعتیہ غزلیں آنحضورؐ کی تعریف اور جوشِ عقیدت سے مملو ہیں۔ لیکن خاص طور پر اُن نعتوں میں حضرت نصر کا والہانہ عشق، جوشِ بیان، جدّتِ اسلوب، خوش گفتاری اور ذاتِ محمدیؐ پر بے پناہ اعتماد اپنی انتہا کو پہنچ گیا ہے، جن نعتوں میں بطور خاص اسمِ پاک محمدؐ آیا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے بھی یہ نعتیں بڑی وسعت اور تنوع کی حامل ہیں۔ مختلف پہلوؤں سے آپ کی گوناگوں اور عبقری شخصیت کا جائزہ لیا گیا ہے اور مختلف طریقوں سے آپ کی فضیلت ثابت کی گئی ہے۔ اس میں آپ کے معجزات بھی نظر آتے ہیں۔ میدانِ حشر میں آپ کی شفاعت کا نقشہ بھی کھینچا گیا ہے۔ لیلائے کی تمنا کہیں پر دبی دبی اور کہیں پر کھل کر کی گئی ہے۔ اور اپنے حالِ زار کو بیان کر کے آپ سے رحم و کرم کی التجا بھی کی گئی ہے۔ الغرض آپ کے جمالِ صورت اور کمالِ سیرت پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی

گئی ہے اور جگہ جگہ تشبیہات و استعارات کے ذریعہ کلام میں روانی، برجستگی اور دلکشی حسن بھی پیدا کی گئی ہے۔ یہاں پر ان نعتوں سے چند متفرق اشعار پیش کر کے اپنے خیالات کی تصدیق کرنا چاہوں گا:

اسیرم در خم موئی محمدؐ — سرو سودایم و ہوئی محمدؐ
خوشا آنروز و شب کز بخت بیدار — چو سگ باشیم در کوئی محمدؐ
چہ باک از ناتوانیہائ تن خویشم — چو دارم زور بازوئی محمدؐ
شدم وارستہ ای نصیرؔ از دو عالم — دلِ ما میکشد سوئی محمدؐ

ز درد ہجرِ تو دلفگارم، بیا محمدؐ بیا محمدؐ — ز شوقِ وصل تو بیقرارم، بیا محمدؐ بیا محمدؐ
ز زخم ہجرِ تو داغ داغم، ز داغ زخم تو باغ باغم — بجانہ روشن چراغ دلم، بیا محمدؐ بیا محمدؐ
صبا بگوشش اگر توانی ز نصیرِ مسکیں بگو پیامی — کہ عمرِ باشد در انتظارم، بیا محمدؐ بیا محمدؐ

بچشم رو بنمائی یا محمدؐ — بجان و دل در آئی یا محمدؐ
چرا از من جدائی یا محمدؐ — بسوئی من نیائی یا محمدؐ
خوشا روزیکہ بینم بے حجابت — ز رخ پردہ کشائی یا محمدؐ
بہ بزمت نصیرؔ تاکی ز لطفت — بود یک دم رسائی یا محمدؐ

مکین لامکاں باشد محمدؐ — نشانِ بے نشاں باشد محمدؐ
چہ پرسی در قیامت رتبۂ اُو — امامِ مرسلاں باشد محمدؐ
چہ غم داری ز عصیانِ خود ای نصیرؔ — شفیعِ عاصیاں باشد محمدؐ

خوش نصیبیم اگر یار محمدؐ باشد — نیک بختیم چہ دلدار محمدؐ باشد
ہیچ کس نیست سزاوارِ مقام محمود — بہرِ آن رتبہ سزاوار محمدؐ باشد
جلوۂ مہر و مہ و حسن و جمالِ خوبان — ہمہ را مطلعِ انوار محمدؐ باشد
عشقبازان جہان محرم رازی دارند — نصیرؔ را محرم اسرار محمدؐ باشد

یا شفیع المذنبین المستغاث المستغاث — رحمۃ للعالمین، المستغاث المستغاث
نصیرؔ در کویت فتادہ بر امید بذلات — از سگانِ تو کمین، المستغاث المستغاث

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی ایک نعت پر حضرت نصیرؔ کی دو تضمینیں ملتی ہیں۔ حضرت خواجہ

کا مطلع تھا :

درجاں چو کرد منزل جانانِ ما محمدؐ　　صد در کشاد در دل از جانِ ما محمدؐ

حضرت نصر کہتے ہیں :-　　ما بلبلیم نالاں گلزار ما محمدؐ　　ما نرگسیم حیراں دیدار ما محمدؐ

اور دوسرا مطلع ہے :-　　ما عاشقیم خستہ جانانِ ما محمدؐ　　ما تشنہ ایم و آبِ حیوانِ ما محمدؐ

گرچہ حضرت نصر کی اپنی زمین نہیں، تاہم انھوں نے اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے ۔

حضرت نصر کا ذاتِ رسولؐ سے یہ والہانہ عشق کوئی اختیاری فعل یا کسی کوشش کا نتیجہ نہ تھا بلکہ یہ آپ کی پاک طینت کا فطری تقاضا تھا وہ کہتے ہیں :

محبت تو بنای مقتضای طبع ما است　　نہ این چنین کہ بجد است و اختیاری ہست

نعت کے علاوہ خالص غزل کی زبان میں اور رمز وکنایہ کے پردے میں حضرت نصر نے ذاتِ رسولؐ کے تئیں اپنے پاکیزہ جذبات، ارفع خیالات اور نازک ترین احساسات کے ایسے ایسے نمونے دکھائے ہیں، جن کی اثر آفرینی کسی طرح مندرجہ بالا نعتوں سے کم نہیں ۔ غزل کے فورم میں نعت کی تشکیل اہل نظر جانتے ہیں کہ آسان کام نہیں ۔ لیکن حضرتِ نصر اس تلوار کی دھار پر بڑی آسانی کے ساتھ گزرے ہیں ۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ کوئی بھی غزل اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک اس کا خالق ذوقِ لطیف کو اپیل کرنے والا دماغ اور حسن کو اپنے اندر جذب کر لینے والا دل نہ رکھتا ہو ۔ حضرت نصر ان دونوں خصوصیات کے جامع تھے ۔ اور چونکہ غزل کا کینوس اس قدر وسیع ہوتا ہے کہ اس میں ایک عاشق بڑی آسانی کے ساتھ اپنے عشق کے بوقلموں کیفیات اور متنوع احساسات کے رنگ بھر سکتا ہے ۔ حضرت نصر نے اس کی وسعت سے خوب خوب فائدہ اٹھایا ہے ۔ تشبیہات و استعارات کی ندرت اپنی جگہ مسلم ہے ۔ اس تناظر میں چند اشعار ملاحظہ فرمائیں :-

ما مدا غیرتند ازین روی درخشانِ تو ہست　　سنبلستان منفعل از زلفِ پریشانِ تو ہست

دل کہ جنس بے بہا بودہ بہ اقلیم وجود　　آن متاع دل بسا ارزانِ بدکانِ تو ہست

بر امید بذلہ تو بہر ماشان بر درت　　خوش موشافی میلانِ ماہ میدانِ تو ہست

نغز و ما بشنوی گر سوی گلشن بگذری　　ہمچو بلبل قصو بیدل ہم غزلخوانِ تو ہست

ای صبا گو کوں منزلِ محبوب کجاست　　[illegible]

طاقتِ ہجر نداریم و بجان آمدہ ایم — دلِ غمگین مرا صبر چو ایوب کجاست
عجلت میل چنین از تو دلا بے ادبی ست — ہیچ دانی بکمتنائی تو منسوب کجاست
بایدت کفر کہ اوّل طلبش را طلبی — پس از ان جوی کہ آن شاہد مطلوب کجاست

بسرت کہ جز سر زلف تو بسرم سر دگری نشد — برخت کہ جز رخ تو گہی بر رخ دگری نظری نشد
چو سگم کمین سگانِ تو و زہمہ بقید رم دلی — بدرت کہ جز در پاک تو بدرِ دگر گذری نشد
دل و جان و صبر و قرار من بیکی آمد تو ز دست رفت — مجرم چنین روش کہ بنصی تو خبری نشد

بار خاطر گر نباشد با تو گویم یک سخن — کت ز شیرینی بوست بر کنی ما را دہن
لیلۃ القدر ست این یا موی تو یا دام دل — بلدر ست این یا رُدی تو لے جانِ من
روی تو یا سوی تو، یا خدا تو دل میبرد — ہر کجا دارم توئی مقصود و قبلہ ما و من
گفتمش چندین چرا نصر تو مفتون ست گفت — عشق باشد منشأ صد رنج و تکلیف و محن

ای از نگہ مستت در ہر دلی تاثیری — مدہوش نگاہ تو در صومعہ ہر پیری
آزار دل عاشق کی بہ شود از طبی — سودی ندہد ہرگز جز وصل تو تدبیری
از ہجر بجان ہستم، بی تاب و توان ہستم — در کشتن من داری ای یار چہ تاخیری
بنواز ز لطفِ خود افگن نظری سویم — چون نصر بنخچیرت آمد پی یک تیری

حضرت نصر نے اپنی شاعری کو صرف نعت و غزل ہی تک محدود نہ رکھا، بلکہ انہوں نے اپنے کلام کو "مسائل تصوف" سے بھی آشنا کیا۔ ان کے کلام سے تصوف کے رموز و نکات، اس کے تجربات، مقامات اور نظریات کی بھی نشاندہی ہوتی ہے۔ حضرت نصر پہلے صوفی تھے، بعدہٗ شاعر۔ لہٰذا ان کا جامِ شعر بادۂ تصوف سے لبریز نظر آتا ہے۔

اکثر صوفیا و عرفا کی طرح حضرت نصر نے علایقِ دنیوی سے خود کو الگ رکھا۔ توکل ان کا شعار تھا اور قناعت ان کا پیشہ۔ ان کے درج ذیل اشعار سے بخوبی اس کا ثبوت ملتا ہے:

فکر سامانی ندارم فارغم از این و آن — چون سپردم کار خود را با کریم کارساز
مرا ای نصر فکر این و آن نیست — کہ چون خود میر سامانم خدا باشد

زندگی کی بے ثباتی ہر صوفی شاعر کا خاص موضوع رہا ہے۔ کسی نے زندگی کو برق کی چشمک اور

کسی نے شرر کی لپک سے تشبیہ دی ہے۔ حضرت نصر کے نزدیک یہ ایک حباب ہے یا موج سراب:

عمر روان ست چو آب روان ہست دم زندگیم چون حباب
ز ہستیٔ خود در گمانم ہنوز کہ پندارشش ہمچو موج سراب

راہِ سلوک میں حضرتِ نصر مختلف مقامات سے گزرے۔ شبِ تنہائی آپ کے لئے نئے نئے تجربات کا پیغام لے کر آئی۔ لیکن آپ نے اس "رازِ نہانی" کو "مجلسِ اغیار" میں بیان کرنا پسند نہ کیا اور صرف یہ کہکر گزر گئے کہ:

آہ از سوزِ تو رازِ نیست پنہانی لیکن با تو احوال دلِ زار بگویم یا نہ
قصہ ہا از شب تنہائی خود ہست ولی من درین مجلسِ اغیار بگویم یا نہ
نصر را حال تباہ ست و ہمیدانی تو پیشِ آن ہمدم و غمخوار بگویم یا نہ

اور اس قبیل کے یہ اشعار بھی آپ کے مخفی تجربات اور رازہای سربستہ کی جانب اشارہ کرتے ہیں:

کس چہ داند کہ چہ سرّیست میانِ من و تو میتوان کرد مگر فاش بیانِ من و تو
تو ہم این راز نگوئی و نگویم من ہم در میانست چو سوگند بجانِ من و تو
دوستان راست حسابی و کتابی در دل کس چہ داند کہ چہ سود ست زیانِ من و تو
نصر را خلق بتو نسبت قلبی دادند شد یقین بر ہمہ بود آنچہ گمانِ من و تو

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت نصر کو استتارِ حال کا ہمیشہ خیال رہا کرتا تھا۔ تاہم جب کبھی آپ پر غلبۂ حال کی کیفیت طاری ہوتی تھی تو پورے جوش کے ساتھ مجلسِ نبویؐ میں اپنے مقام اور اپنی حضوری حالی اس طرح بیان کرتے ہیں:

من تاجدارِ ملکِ وصالِ محمدیم من صاحبِ یمین و شمالِ محمدیم
من حاملِ امانتِ عشقِ محمدیم من مظہرِ جمال و کمالِ محمدیم
من رازدارِ مجلسِ قدسِ رسالتیم من ساکنِ حریمِ وصالِ محمدیم
ای نصر سر بسری و خیالِ پری وشی من روز و شب بفکر و خیالِ محمدیم

نظریات کے اعتبار سے وحدۃ الوجود کا نظریہ صوفیانہ شاعری کا ایک جزو لاینفک بن چکا ہے۔ اوحدی کرمانی ہوں یا خواجہ فریدالدین عطار، عبدالقادر بیدل ہوں یا حضرت نصر، سب بادۂ توحید کے نشے سے سرشار دیتے ہیں۔ مسئلۂ وحدۃ الوجود بقول شبلی کے الفاظ میں صوفیانہ شاعری کی روح رواں

دیوان نصیر کا ایک اہم حصہ ہے۔ اس موضوع پر ان کا عرفانی جوش، وجدانی کیفیت سے ہم آہنگ ہو کر کیف و مستی کا ایک سماں باندھ دیتا ہے۔ خانوادۂ پھلواری شریف سے اسی نظریہ کا علمبردار رہا ہے۔ حضرت فرد بھی اسی نظریہ کے پُرزور نقیب تھے۔ وہ کہتے ہیں :

گو ہمہ جسم و جان منم، منکہ منم نہ من منم   جانِ ہمہ جہاں منم، منکہ منم، نہ من منم

اسی زمین میں حضرت نصیر اپنے جذبات کے گوہر گراں مایہ اس طرح بکھیرتے ہیں :

دردِ دل و دوا منم، منکہ منم نہ من منم   عیسیٰ جانفزا منم، منکہ منم نہ من منم
روشنیٔ قمر منم، نورِ رخِ سحر منم   مہر منم، ضیا منم، منکہ منم نہ من منم
زاہد و شیخ و برہمن، کافر و رند و پارسا   با ہمہ آشنا منم، منکہ منم نہ من منم
نصیر بگو کہ کیستم، فکر بکن کہ چیستم   مظہر کبریا منم، منکہ منم نہ من منم

نیز اسی قبیل کے یہ اشعار مزید وضاحت کے ساتھ اسی نظریہ کی تشریح کرتے ہیں :

من آن نورِ وجودم خود بخود موجود بودستم   بنورِ ذاتِ خود، خود شاہد و مشہود بودستم
منم اوّل، منم آخر، منم ظاہر، منم باطن   منم ممکن، منم واجب، بہر موجود بودستم
نہ معبود بود، نی عابد، نہ ارکانِ عبادتہا   کہ من خود معبد و ہم عابد و معبود بودستم
ز سرِّ خود چہ گویم فرد بودم نصیر چون گشتم   اگرچہ ما بری از والد و مولود بودستم

دوئی کا پردہ جب حضرت نصیر کی نظروں سے دور ہو گیا، تو انھوں نے کیا دیکھا؟ خود انہی کی زبانی سنیے :

دوئی ای نصیر چون برخاست دیدم   کہ من خود خویشتن را میپرستم

صوفیوں کا یہی وہ نظریہ تھا جس سے علمائے ظاہر شریعت سخت اختلاف رکھتے تھے اور انھوں نے ہر دور میں اس تُند و زور سیلاب پر باندھ لگانے کی کوشش کی ہے۔ کبھی کفر کا فتویٰ لگا کر اور کبھی بر سرِ دار لے جا کر۔ حضرت نصیر بھی اس کی زد سے نہ بچ سکے۔ وہ کہتے ہیں :

زان طریقی کہ برون از حدِ تحریر شدہ   محتسب در حقِ من قایلِ تکفیر شدہ

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ موضوعات سے ہٹ کر خالص فنی نقطۂ نگاہ سے دیوانِ نصیر کا جائزہ لیا جائے۔ غزلیہ شاعری جو دل کی بستگی و خستگی چاہتی ہے، وہ تو حضرت نصیر کے یہاں فراواں طور پر ملتا ہے، اس کے علاوہ ظاہری طور پر گیسوئے غزل کو سنوارنے میں جو عوامل کام کرتے ہیں، مثلاً الفاظ کی

نشست ردیف و قوافی کا دلنشیں التزام، بحروں کی ترنم ریزی اور بہجتِ اسلوب وغیرہ۔ یہ سارے عوامل کلامِ نصیر میں جاری و ساری ہیں، اور اس کا احساس خود حضرت نصیر کو بھی ہے، وہ کہتے ہیں:

نصیر در بندشِ مضمونِ غزل — چہ قدر فکر رسائی دارم

حافظ، سعدی اور حضرت فرد وغیرہ، ایوانِ غزل کے ستون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حضرت نصیر نے ان لوگوں کی کامیاب تقلید و پیروی کی ہے۔ اور ان کی غزلوں پر غزلیں کہی ہیں۔ نمونہ کے طور پر یہاں چند تضمینیں پیش کی جاتی ہیں:

حافظ

روشن از پرتو رویت نظری نیست که نیست
منتِ خاک درت بر بصری نیست که نیست
زمن دل شده از دستِ تو خونین جگرم
از غم عشق تو بر خون جگری نیست که نیست
بجز این نکته که حافظ ز تو ناخوشنود است
در سراپای وجودت هنری نیست که نیست

نصیر

از لب لعل تو شیرین سخنی نیست که نیست
ذائق از قند حدیث دهنی نیست که نیست
بلبلی نیست که افسرده و نالان نبود
چاک از دستِ غمت پیرهنی نیست که نیست
همه عشاقِ تو در خودی و شوق و طرب
بر در نصیر تو رنج و محنی نیست که نیست

حافظ

این خرقه که من دارم در رهن شراب اولی
وین دفتر بی معنی غرقِ مئے ناب اولی
من حال دل زاهد، با خلق نخواهم گفت
کاین قصه اگر گویم، با چنگ و رباب اولی

نصیر

از زاهد سر حلقه مستی مئے ناب اولی
در جبه و دستارش صافی شراب اولی
ای نصیر غم عشقش پوشیده چو حافظ کن
این قصه اگر گویم با چنگ و رباب اولی

خسرو

دیشب که میسر شد تا بود کرده تنها یکطرف
افگنده بکاکل یکطرف زلفِ پریشان یکطرف
بیچاره خسرو خسته را خون ریختن فرموده است
خلقی بجنت یکطرف، آن خوش‌خو تنها یکطرف

نصیر

در بزم میسر شد شب آن رشک لیلی یکطرف
مطرب ز مستی یکطرف، باده بمینا یکطرف
بهر نشاط او بهم ای نصیر در دستان خود
عذرهای نظم یکطرف عقدِ ثریا یکطرف

فرد

تنہا نہ ای مسیح کہ آرام تن نماند
در آرزوی لعلِ تو جاں از بدن نماند

جلوہ از حسن پیدا کردہ
عالمی بر خویش شیدا کردہ

غافل از خویش نشانم تو کجا می جوئی
فرد من جان جہانم تنہ ما یا ہو

نصر

بی تو ز ضعف طاقتِ برخاستن نماند
گوئی کہ از فراقِ تو جان در بدن نماند

خوبرویان را کہ پیدا کردہ
جلوہ خود را ہویدا کردہ

بانشانیم، نشانم، تو کجا می جوئی
گم چو عنقا ز جہانم، تنہ ما یا ہو

حضرت نصر کا سوزِ دروں جب حد سے زیادہ بڑھا تو سہل ممتنع کے ان خوبصورت اشعار کے پیکر میں ڈھل گیا۔ سہل ممتنع کے یہ اشعار بیحد جاذب توجہ ہیں۔ نیز بیان کا پیارا انداز، لہجے کا سوز، جذبات کی علاوہ اور تمنائے وصال کی تڑپ، خواندہ کو اپنی طرف متوجہ کئے بغیر نہیں رہتی:

دیوانہ ام، دیوانہ ام، من عاشقِ دیوانہ ام
تو شمع و من پروانہ ام، من عاشقِ دیوانہ ام

ہستم گدای کوئی تو، لیکن سراسر خوئی تو
ای من فدای روی تو، من عاشقِ دیوانہ ام

ای ماہ من، ای شاہ من، بشنو فغان و آہِ من
بانست رسم و راہِ من، من عاشقِ دیوانہ ام

نیز اسی قبیل کے چند اور اشعار ملاحظہ فرمائیے:

ای آرزوی جانِ من، من عاشقِ دیرینہ ام
وی جانِ من، جانانِ من، من عاشقِ دیرینہ ام

از تست ای جانانِ من، سازِ من و سامانِ من
ہم دردِ و ہم، درمانِ من، من عاشقِ دیرینہ ام

من بادلِ پژمردہ ام، خونِ دل خود خوردہ ام
افسردہ ام، افسردہ ام، من عاشقِ دیرینہ ام

موسیقیت اور غنائی آہنگ غزل کے کالبد میں قلب کی حیثیت رکھتی ہے اور حضرت نصر کی جسمِ غزل میں یہ قلب اپنی پوری زندگی کے ساتھ دھڑکتا ہوا نظر آتا ہے:

ہمہ شب خیالِ مویت ہمہ روز یادِ رویت
ہمہ دم بجستجویت، بدل است آرزویت

ہمہ خلق و کار و باری، ہمہ دل بسوی یاری
من و طوفِ آستانت، سر ماہ باد مویت

الفاظ کے حسنِ تکرار سے ترنم ریزی اور ساحرانہ کیفیت طاری کرنے میں حضرت نصر اپنا جواب نہیں رکھتے۔ یہ تکرار کبھی آخر میں ہوتی ہے، کبھی درمیان میں اور کبھی شروع میں، لیکن حیرت انگیز طور

اثر آفرینی میں کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمائیں :

بدستِ عشق دل دادم، خطا کردم، خطا کردم — کنون چون خاک برباد، چہا کردم، چہا کردم
چگویم باتو ای ناصح بجانِ خود چہ من از دل — بدامِ زلف افتادم، جفا کردم جفا کردم

بتا بے جد تو دل را کشش از سرکشش باشد — ز نوکِ خارِ مژگانت، خلش اندر خلش باشد
لبت شیرین، زبان شیرین، دہن شیرین، سخن شیرین — چگوید نصر واز ذوقش نمش اندر نمش باشد

باز آ باز آ کہ در قدوم تو شفاست — بنشیں بنشیں کہ یک نگاہِ تو دواست
تا چند از نصر چشم پوشی، زحیا — بس کن بس کن کہ بیش ازیں جور و جفاست

غزل کے علاوہ حضرت نصر نے مثنوی، قصیدہ، مخمس، اور مستزاد بھی قلمبند کیے ہیں ۔ ان کے دو خمسے بالترتیب حضرتِ فرد اور حافظ شیرازی کی زمینوں میں ملتے ہیں ۔ نمونہ کے طور پر دونوں میں سے ایک ایک بند ملاحظہ ہو :

برزمینِ فرد :- از ہجرِ تو لبکہ بیقرارم ÷ تاکی گذرد بانتظارم ÷ اینک دم چند از شمارم ÷ آخر نظری کہ چشم دارم
تا روی تو دیدہ جان سپارم

برزمینِ حافظ : آنانکہ نار را ہمہ نور و ضیا کنند — آنانکہ باد را بنفس جانفزا کنند
آنانکہ آب را گہر بے بہا کنند — آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

حضرت نصر نے دو خمسوں کی طرح دو ہی مستزاد کہے ہیں ۔ نمونہ کے طور پر دونوں کے ایک ایک شعر پیش خدمت ہے :

بر عاشق دیرینہ مدہ راہ جفا را — اے نو گل رعنا
اور من پای طلب در رہ تو ای دوست نہادم — با حسن و عقیدت

لیکن ان کا خاص جو ہر سخن غزل ہی ہے اور اسی میدان میں ان کی جولانی طبع نکھر کر سامنے آتی ہے ۔ حضرت نصر کی غزلیں تخیل میں بلندی اور خیال میں گہرائی نہ ہونے کے باوجود طرز ادا کی دلکشی، خوش گفتاری اور زبان و بیان کی حلاوت و سلاست کے اعتبار سے اس قابل ہے کہ اس کو "رسمِ ارمغاں" کا درجہ دیا جائے ۔ جہاں تک تخیل میں بلندی نہ ہونے کا سوال ہے تو اس کی توجیہ وہ خود کرتے ہیں ۔ وہ اپنے واردات قلبی کو راستی کے ساتھ سیدھے سادے انداز میں بیان کر دینے کے قائل تھے ۔ نہ وہ رنگ آمیزی کا پسند کرتے تھے ۔

نہ عبارت آرائی ۔ وہ کہتے ہیں:

ہر چہ برجان و دولت میگذرد راست بگو   سخن حق نہ مسجع نہ مقفیٰ باید

آخر میں حضرت نصرؔ ہی کے اس شعر پر اپنے مضمون کا اختتام کرتا ہوں:

ایرانیاں لب بگزند از ذوقِ نظم نصریؔ ما   بیتش برسم ارمغاں اینک خراسان میرود

حضرت نصرؔ کا دیوان معجز بیان ۴۷۹ غزلوں پر مشتمل ہے۔ جس میں ایک عربی غزل بھی ہے۔ دو مستزاد اس کے علاوہ ہیں۔ تتمہ کے بعد اس دیوان میں چند متفرق چیزیں بھی ملتی ہیں، جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:
قصیدہ نعتیہ التجائیہ فی حضرۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم ۔ مثنوی در مدحِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ۔ التجا بحضرت غوثِ اعظم قطب ربّانی، سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ ۔ سلام بحضرۃ خیرالانام علیہ الصلوٰۃ والسلام ۔ التجا در جناب حضرت امیرالمومنین علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہ ۔ ذکریست از بعض احوال خود ۔ خمسہ بر غزل والد بزرگوار خود حضرت فردؔ قدس سرہٗ ۔ مخمس بر غزل حافظ علیہ الرحمہ ۔ رباعیات (۴ عدد) ۔ ابیات و اشعار متفرقات ـــــ آپ کا دیوان معجز بیان محمد تیغ بہادر کے اہتمام سے مطبع انوار محمدی لکھنؤ سے ۱۸۸۰ء میں شائع ہوا ۔ وزیر علی انجم لکھنوی کے درج ذیل مصرعے سے تاریخ طباعت نکلتی ہے:

سر اٹھا کر بہر سال عیسوی انجمؔ لکھو
نظم نصریؔ قادری معجز بیاں چھاپی گئی

۱۸۸۰ء تخرجہ (۱)

جناب محبوب حسین
خدابخش لائبریری پٹنہ

انتخاب از بیاض

محمد بخش مرحوم[1]

(فارسی ہینڈ لسٹ نمبر ۲۳۸۷)

بر صبح بسی کشیدہ ام رنج و عذاب   وز دست زمانہ ماندہ ام در تب و تاب
وز عمر و زمانہ می چہ پرسی از من (کذا)   آن یک چو سراب است و دگر ہمچون خواب

از عمر گذشتہ جز خیالی نہ بماند   در دست فلک سوای داغی نہ بماند
از بود سوای رنج و زحمت دردی   در دل صد حیف یادگاری نہ بماند

برخیز کہ این سرای فانی ہیچ است   وین حرف معا کہ تو خوانی ہیچ است
مشغول مشو باین و آن اینجا   فارغ شو ازین کہ زندگانی ہیچ است

- تاریخ ولادت محمد بخش ۲۹ محرم ۱۲۳۰ھ مطابق ۱۶ پوس ۱۲۲۲ فصلی روز چہارشنبہ مطابق (عیسوی) ۱۸۱۵ء۔
- تاریخ وفات حضرت الوالد حضرت علی بخش خان صاحب قدس سرہ روز سہ شنبہ بوقت شب بوقت مواجب ہشت گھنٹہ تاریخ ۲۷ ربیع الثانی ۱۲۷۵ھ، مطابق ۱۴ اگہن ۱۲۶۶ فصلی موافق چہارم دسمبر ۱۸۵۸ء۔
- تاریخ وفات برادرم احمد بخش خان صاحب قدس سرہ، روز چہارشنبہ بوقت مواجب دہ گھنٹہ بست منٹ تاریخ ۲۴ جمادی الثانی ۱۲۷۹ھ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم مطابق ۱۷ دسمبر ۱۸۶۲ء موافق ۱۱ پوس ۱۲۷۰ فصلی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ا۔ بانی کتب خانہ خدا بخش کے والد

● تاریخ ولادت باسعادت بوعلی خان عرف خدابخش[1] خاں طال عمرہٗ۔ بست و سیوم جمادی الثانی ۱۲۵۸ھ روز سہ شنبہ مطابق دوم اگست ۱۸۴۲ء، موافق ۱۸ ساون ۱۲۴۹ فصلی۔ ساون بدی ۱ سمت ۱۸۹۹

● تاریخ ولادت نورالعین ابوالحسن مدعمرہٗ، ۲۹ ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ مطابق ۲۵ اکتوبر ۱۸۵۱ء موافق ۱۵ کاتک ۱۲۵۹ فصلی روز شنبہ، وقت نواخت ہشت گھنٹہ روز اسمہٗ جعفر علی۔

تاریخ ولادت باسعادت نورالعین امیرالحسن ابن محمد اسمٰعیل مدعمرہما وانند ہم رجب المرجب ۱۲۸۲ھ، مطابق ہشتم دسمبر ۱۸۶۵ء، روز جمعہ، موافق ششم پوس ۱۲۷۳ فصلی و ششم پوس سمت ۱۹۲۲ بمقام موضع ادلہن پور وقت مواجب دو گھنٹہ روز بعد نماز جمعہ۔

۱۔ میرے والد بزرگوار کی تاریخ انتقال ۳ اگست ۱۹۰۸ء، وقت ۱ بجے دن۔
میرے بھائی محی الدین صاحب کی تاریخ رحلت ۲۷ اگست ۱۹۱۰ء وقت ½ ۱۱ بجے رات۔
بوقت نیم شب ۲۵ فروری ۱۹۲۹ء میری پیاری بہن سلمیٰ ہمیشہ کے لئے مجھے داغ مفارقت دے گئی۔ (بیاض صلاح الدین خدابخش)

●●

تحائف موصولہ

ڈاکٹر (عبادت یار خاں) عبادت بریلوی (ثم لکھنوی ثم لاہوری) (پ ۱۹۲۰ء) ہمارے معروف مصنفین میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کی تالیفات و تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں:-

۱- **اقبالیات**: جشن نامۂ اقبال، اورنیٹل کالج میگزین، اقبال نمبر (شائع کردہ یونیورسٹی اورنیٹل کالج لاہور)، اقبال کی اُردو نثر (اقبال اکیڈمی، لاہور)، اقبال ــــ احوال و افکار (مکتبۂ عالیہ لاہور)، جہانِ اقبال (ادبی سوانح)، اقبال کی غزل، منظومات اقبال، اقبال کا فن (زیر طبع) ــ (ادارۂ ادب و تنقید لاہور)۔

۲- **ادبی دریافت** (مادر قلمی نسخوں کی دریافت اور ترتیب و تدوین): شکنتلا مؤلفہ مرزا کاظم علی خاں، ہفت گلشن، مادھونل اور کام کندلا (مؤلفہ مظہر علی خان ولا)۔ (اُردو دنیا، کراچی)۔ دیوان ولا (مؤلفہ مظہر علی خان ولا (ادارۂ ادب و تنقید لاہور)۔ گلزار چین، رسالۂ کائنات، مؤلفہ خلیل علی خاں اشک، شکوۂ فرنگ، مؤلفہ آغا جو شرف، بہارگلشن، مؤلفہ بینی نارائن جہان، دیوانِ مبتلا، مؤلفہ عبید اللہ خاں مبتلا (اورنیٹل کالج لاہور)۔ دیوان حیدری، حیدری، مختصر کہانیاں، تذکرۂ گلشنِ ہند، مؤلفہ سید حیدر بخش حیدری (اُردو دنیا، کراچی)۔ گلزار دانش (دفتر اوّل)، گلزار دانش (دفتر دوم)، مؤلفہ سید حیدر بخش حیدری، مرقع مخلص، مؤلفہ آنند رام مخلص، ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی انگریزی نظمیں، نقلیات ہندی جلد اوّل و دوم، مؤلفہ ڈاکٹر جان گلکرسٹ، افسانۂ عشق مؤلفہ الٰہی بخش، شوق اکبرآبادی (اورنیٹل کالج لاہور)، نالۂ درد، دیوان فارسی، مؤلفہ حضرت خواجہ میر درد، نکات الشعرا مؤلفہ میر تقی میر (ادارۂ ادب و تنقید لاہور) جشن نامہ اورنیٹل کالج جلد اوّل و دوم، خطوط عبدالحق بنام ڈاکٹر عبداللہ چغتائی (اورنیٹل کالج لاہور)۔

۳- **تحقیق و تنقید**: اُردو تنقید کا ارتقا، روایت کی اہمیت، غزل اور مطالعۂ غزل خطبات عبدالحق (انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی)، مقدمات عبدالحق، انتخاب خطوط غالب (اُردو مرکز لاہور)، تنقیدی زاویے پہلا و دوسرا ایڈیشن (مکتبۂ اردو ـــ اردو مرکز لاہور)، تنقیدی تجربے، مومن اور مطالعۂ مومن، جدید شاعری، کلیات میر، کلیات مومن، شاعری اور شاعری کی تنقید (اُردو دنیا کراچی)۔ سحرالبیان ـــ ایک تنقیدی مطالعہ: (اورنیٹل کالج لاہور)۔ غالب اور مطالعۂ غالب (رائٹرز اکیڈمی لاہور)۔ غالب کا فن: (مکتب پبلشرز، لاہور) اقبال کی اردو نثر: (اقبال اکیڈمی لاہور) اقبال ـــ احوال و افکار: (مکتبۂ عالیہ لاہور)، میر تقی میر (حیات اور شاعری): دلی اور نگ آبادی، پاکستان

کے تہذیبی مسائل، حضرت خواجہ میر درد، ادب اور ادبی قدریں، تنقید اور اصول تنقید، افسانہ اور افسانے کی تنقید، شاعری کیا ہے؟، جہانِ میر، میر کی غزل، منظومات میر، نظیر اکبر آبادی، جدید اردو ادب، فورٹ ولیم کالج کی ادبی خدمات، میرامن دہلوی، سید حیدر بخش حیدری، ڈاکٹر جان گلکرسٹ (زیر طبع) (ادارۂ ادب و تنقید، لاہور)۔

۴۔ رپورتاژ، ڈائری وغیرہ : ارضِ پاک سے دیارِ فرنگ تک : (گلوب پبلشرز لاہور) جشنِ صد سالہ اورینٹل کالج، لاہور، جشنِ اقبالؒ، نئی دہلی (اورینٹل کالج، لاہور)، آزادی کے سلسلے میں اورینٹل کالج میں تیس سال، لندن میں پانچ سال، لندن کی ڈائری، زیر طبع (ادارۂ ادب و تنقید، لاہور)

۵۔ خاکے : رہ نوردانِ شوق، آوارگانِ عشق، جلوہ ہائے صد رنگ، یارانِ دیرینہ شجر ہائے سایہ دار، زیر طبع (ادارۂ ادب و تنقید، لاہور)

۶۔ ادبی سوانح : یادِ عہدِ رفتہ (خود نوشت)، جہانِ میر، جہانِ اقبالؒ، جہانِ غالب، سر سید احمد خاں، مولانا حسرت موہانی، جگر مراد آبادی، بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق، جوش ملیح آبادی، زیر طبع، (ادارۂ ادب و تنقید، لاہور)

مستقبل کے اشاعتی منصوبے : (۱) ترتیب و تدوین : مطبوعہ و غیر مطبوعہ خطوطِ اقبالؒ (علامہ اقبال کے خطوط کی ترتیب و تدوین مع مقدمہ و حواشی)، غیر مطبوعہ خطوط بابائے اردو بنام ڈاکٹر عبادت بریلوی، غیر مطبوعہ خطوط نیاز فتحپوری، غیر مطبوعہ خطوط طاہر فاروقی، غیر مطبوعہ خطوط پروفیسر سید احتشام حسین، غیر مطبوعہ خطوط پروفیسر مسعود حسن ادیب، غیر مطبوعہ خطوط محمد حسن عسکری، غیر مطبوعہ خطوط رالف رسل، مقالات عبدالحق (اعلیٰ) (ادارۂ ادب و تنقید، لاہور)

۲۔ انتخابات : ولی، سراج، آبرو، حاتم، سودا، میر، درد، جرأت، انشا، مصحفی، میر حسن، ذوق، مومن، آتش، ناسخ، اسیر، صبا، رند، وزیر

۳۔ تنقیدی مطالعے : اردو ادب کی تاریخیں (تاریخی اور تنقیدی جائزہ)، اردو شاعری کی تنقیدی تاریخ، اردو افسانے کا ارتقا، اردو ناول کا تاریخی جائزہ، جدید اردو تنقید، اردو غزل کا ارتقا، جدید اردو غزل۔

خدا بخش لائبریری کو آپ کے مندرجہ ذیل تحائف موصول ہوئے ہیں جن کیلئے ہم عبادت صاحب کے شکر گزار ہیں:

جشن نامۂ اقبال (انگریزی و اردو)، اقبال کی اردو نثر، میر تقی میر، ولی اورنگ آبادی، سیاحت نامہ، نالۂ درد، حضرت خواجہ میر درد۔

ضیاء الدین اصلاحی
دار المصنفین شبلی اکیڈمی ۔ ۲۰ جنوری ۸۳ء

"محسن کتابوں کے" بارے میں

گرامی نامہ کا جواب بھیجنے کے بعد جرنل کا ۱۹واں شمارہ میرے نام سے آیا۔ آپ نے میری شکایت کا اتنا زیادہ اثر لیا۔ حالانکہ وہ میری ہی غلطی تھی۔ جس پر اپنی ندامت کا اس سے پہلے والے خط میں اظہار و اعتراف کر چکا ہوں' بہرحال آپ کی اس مزید خصوصی نوازش اور کرم فرمائی کے لیے تہ دل سے شکر گذار ہوں۔

اس نئے شمارہ میں عہد جدید کے رسالہ الندوہ مرتبہ سید ابوالحسن علی ندوی و مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم کے سلسلہ مضامین "مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں" سے ہر مضمون نگار کے نام کے تحت اس کی زیر مطالعہ اور پسندیدہ کتابوں کی فہرست درج کی گئی ہے' ان ہی مضامین کا مجموعہ بعد میں مولانا حافظ محمد عمران خاں ندوی نے علیحدہ کتابی صورت میں شائع کیا تھا جس کی تصریح آپ نے اپنے نوٹ میں کر دی ہے۔ مگر پتہ نہیں کیوں مندرجہ ذیل دو مضمون نگاروں کے نام چھوڑ دیئے ہیں۔ (۱) مولانا عبدالباری ندوی مرحوم سابق پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدر آباد (۲) مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم بانی جماعت اسلامی۔

بظاہر اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان حضرات نے اشخاص کی کتابوں کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن مجید کا ذکر کیا ہے۔ (حالانکہ مولانا عبدالباری نے برکلے کی ایک کتاب کا تذکرہ کیا ہے) جو ان کے نزدیک ان کی اصل محسن کتاب ہے اور اسی کا خاص اثر ان کے ذہن و دماغ اور افکار و خیالات پر پڑا۔

جن مصنفین کے نام آپ نے 'جرنل' میں دیئے ہیں ان میں سے بھی بعض حضرات نے اور کتابوں کے ساتھ اس عظیم الشان اور سب سے اہم بالشان کتاب کا تذکرہ کیا ہے' کیا آپ کے نزدیک یہ کتاب اس قابل نہ تھی کہ اس کا ذکر آتا۔

یہ صورت بھی تو ہو سکتی تھی کہ آپ کے نوٹ میں ان حضرات کے نام کے ساتھ اس امر کا تذکرہ آجاتا۔

●●

پروفیسر شاہ عطاء الرحمٰن عطاؔ کاکوی
پٹنہ

مراسلات

حسنؔ بتھوی کے بارے میں

خدابخش جرنل ۱۲ میں ڈاکٹر طلحہ رضوی برقؔ نے دیوان حسنؔ بتھوی کا تعارف کرایا ہے۔ اور بڑی کاوش سے مرآۃ العلوم جلد دوم، صفحہ ۶۷ کے کتاب نمبر ۱۹۰۲، انگریزی نمبر ۱۹۳۵ء کے اندراج کی تصحیح کی ہے (اگرچہ عنوان میں سہواً شاعر کا نام بجائے غلام حسن کے غلام حسین لکھا گیا ہے)، ڈاکٹر برقؔ نے لکھا ہے کہ غلام حسن بتھوی کا کلام کمیاب ہے۔ حالانکہ ان کا مطبوعہ دیوان (قلمی تو ہے ہی) بھی خدابخش لائبریری میں موجود ہے۔ ڈاکٹر برقؔ نے افسوس ظاہر کیا ہے کہ شاعر کی "نگارستان عشق" غالباً ناپید ہو چکی۔ حالانکہ اس کا ایک قلمی نسخہ خدابخش لائبریری میں کتاب نمبر ۴۰۲۰ پر موجود ہے۔ بلکہ اس کا مطبوعہ نسخہ بھی اسی کتبخانہ میں محفوظ ہے۔ ایک اور بات بھی ذہن نشیں رہے کہ قلمی نسخہ کتاب نمبر ۳۷۳۴ کے خاتمہ پر کاتب نے دیوان کو جلد اوّل قرار دیا ہے۔ اس لئے اس کا قوی امکان ہے کہ حسنؔ کے دیوان کی دوسری جلد بھی ہو جو اب تک ناپید ہے۔

●●

بیان ملکیت سہ ماہی خدا بخش لائبریری جرنل اور دیگر تفصیلات

مطابق فارم نمبر ۴ قاعدہ نمبر ۸

۱- مقام اشاعت : خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

۲- وقفہ اشاعت : سہ ماہی

۳-۴- پرنٹر و پبلشر کا نام : محبوب حسین

قومیت : ہندستانی

پتا : رمنا روڈ، پٹنہ ۴

۵- ایڈیٹر کا نام : عابد رضا بیدار

قومیت : ہندستانی

پتا : ڈائرکٹر خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۴

۶- ملکیت : خدابخش لائبریری، پٹنہ

میں محبوب حسین اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط پبلشر: محبوب حسین

۲۷ فروری ۱۹۸۳ء

فکر و نظر

ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، اسلام آباد کا ماہوار

علمی و دینی مجلّہ

جسمیں

قرآن ، حدیث ، فقہ ، تصوف، علم کلام کے علاوہ

تقابل ادیان ، فلسفہ، تاریخ ، ادب ، قانون ، سیاست ، معاشرت،

معیشت، طب، ثقافت اور عمرانیات

سے متعلق موضوعات پر

اِسلامی نقطۂ نظر سے تحقیقی مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔

	چندہ سالانہ	فی شمارہ
پاکستان کے لئے	۳۰ روپے	۳ روپے
دیگر ممالک کے لئے	۱۵ ڈالر	۱-۵۰ ڈالر
	۷-۵۰ پونڈ	۰-۱۵ پونڈ

اہل علم سے قلمی تعاون کی درخواست بھی ہے۔

"فکر و نظر" میں چھپنے والے مضامین کے لئے نقد یا ادارے کی

مطبوعات کی صورت میں اعزازیہ بھی دیا جاتا ہے۔

مدیر: فکر و نظر

پوسٹ بکس نمبر [illegible] اسلام آباد۔ پاکستان

نصف صدی کی علمی، ادبی، فکری، تہذیبی، سیاسی اور ثقافتی زندگی کا آئینہ نما

اُردو میں اپنی نوعیت کی اہم ترین دستاویز

— چند عنوانات —

زندگی کے ابتدائی سال ○ کلکتہ کی یادیں ○ علم و ادب کی سمتیں ○ حیدرآباد دکن کی انجمن آرائی ○ یورپ
○ یورپ سے واپسی کے بعد ○ پاکستان ناگزیر تھا ○ دنیا بدل گئی ○ افریقہ میں دو سال ○ ایران میں
چار سال ○ فلسطین میں چند مہینے ○ ... جاپان اور دیگر ملکوں کی جھلکیاں
حسن کی تلاش ○ حقیقت ... حال

صفحات ۳۲۰ .. سرورق مع جلد

بہترین گٹ اپ ـــــ متعدد یادگار تصاویر

قیمت : ۵۴ روپے

ہر اچھے بک اسٹال سے طلب کیجئے، یا ہمیں لکھیے

مکتبہ افکار رابسن روڈ، کراچی

KHUDA BAKHSH LIBRARY

JOURNAL

24

خدا بخش لائبریری
جرنل

۲۵
خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

خدا بخش لائبریری
جرنل
پٹنہ

۲۵

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

رجسٹریشن نمبر ۳۲۴۲۴/۷۷

پچیسواں شمارہ ۱۹۸۳ء

اس سہ ماہی مجلّے میں انگریزی، اُردو، فارسی یا عربی میں ایسے مضامین شائع ہوں گے، جو خدا بخش لائبریری کے نادر مواد پر مبنی ہوں، یا لائبریری سے کسی نہ کسی قسم کا تعلق رکھتے ہوں

قیمت: پندرہ روپے

سالانہ خریداری		
اندرون ملک	:	۶۰ روپے
پاکستان	:	۱۲ ڈالر
یوروپ	:	۸ پونڈ
امریکا اور دیگر ممالک	:	۲۴ ڈالر

محبوب حسین نے "پٹنہ لیتھو پریس" رمنا لین پٹنہ ۴ اور "لبرٹی پریس" پٹودی ہاؤس نئی دہلی میں چھپوا کر خدا بخش لائبریری پٹنہ سے شائع کیا

فہرست

اس شمارے کے لکھنے والے

- **نواب زادہ سید وارث اسمٰعیل**: (پ ۱۹۰۹ء) خان بہادر نواب سید محمد اسمٰعیل کے فرزند، جوانی سیاسی، سماجی کاموں میں گزری۔ ۱۹۳۳ء میں مدرسہ سلیمانیہ پٹنہ سٹی کے سکریٹری ہوئے اور ۱۹۷۰ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد ۱۹۴۷ تا ۱۹۶۰ء خدا بخش لائبریری کی مجلس انتظامیہ کے ممبر رہے۔ فی الحال خانہ نشین ہیں۔

- **جناب اختر راہی**: (پ ۱۹۴۷ء)، ایم اے (سیاسیات و تاریخ)، بی۔ ایڈ، گورنمنٹ کالج مری کے شعبۂ تاریخ سے منسلک ہیں۔ آپ کی تصانیف میں 'مسعود عالم ندوی' (سوانح و مکاتیب)، 'تذکرہ مصنفین درس نظامی'، 'مکتوبات صدر یار جنگ' اور 'کتاب نامہ شبلی' قابل ذکر ہیں۔

بقیہ کے لئے ملاحظہ ہو 'جرنل' شمارہ ۱۲، ۲۰ اور ۲۴

'محمد حسین آزاد: بحیثیت محقق' قبل ازیں 'نوائے ادب' بمبئی ۴۳-۱۹۴۲ء میں شائع ہوا تھا

محمد حسین آزاد
بحیثیت محقق

قاضی عبدالودود

قاضی صاحب کے کارناموں کو ان کی خواہش کے مطابق یکے بعد دیگرے پیش کرنے کا منصوبہ بن گیا جس میں اوّلیت مختصر/مستقل بالذات تحریروں کو دی جاتی تھی۔ ان میں بحیثیت محقق محمد حسین آزاد، عبدالحق اور غالب کا جائزہ تھا؛ کلام دلدار اور دیوان رضا عظیم آبادی کی تدوینات تھیں؛ اور ایک منتخب مجموعہ 'اثبات بہار' کی ترتیب تھی جس میں ان کی ہر نوع کی ایک تحریر شامل رہے۔ بحیثیت محقق محمد حسین آزاد والا جائزہ اور دیوان رضا کی تدوین، مکتبہ جامعہ کے لائق سربراہ شاہد صاحب کی جانسوزی سے جنوری میں قاضی صاحب کے ہاتھوں میں پہنچ چکی تھیں۔ اثبات بہار کی وہ صرف پہلی کاپی دیکھ پائے (کہ یہ ابھی کتابت کی منزلوں سے گزر رہی تھی)۔ رہے نام ذات حق کا! اور رہے نام حق کی جستجو کرنے والے اس بے لاگ محقق کا جس نے سچ کی تلاش میں، سچ سننے، سچ دیکھنے اور سچ کہنے کی ایک بار قسم کھائی تو موت تک اس کو نبھا دیا!! سچ، صرف سچ، اور سچ کے سوا کچھ بھی نہیں!!

عابد رضا بیدار

۱۵ فروری ۱۹۸۴ء

اکثریت آزاد کی نثاری کی معترف ہے مگر یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ وہ تحقیق کے مردمیدان[۲] تھے۔ اقلیت مصر ہے کہ وہ صرف ایک بڑے انشاپرداز ہی نہیں، ایک بڑے محقق بھی تھے۔ اس کتابچہ میں یہ دکھلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ حق کس کی طرف ہے۔ یہ دعویٰ نہیں کہ کل مطالب نئے ہیں اور اس کا اقرار ہے کہ ان کی ترتیب بہتر ہو سکتی تھی۔

آبِ حیات = الف کے جس نسخے کے صفحوں کے حوالے دیے گئے ہیں وہ مطبوعہ ۱۹۱۷ء ہے؛ لیکن ایسے مقامات کا جن میں چھاپے کی غلطی کا احتمال ہو سکتا تھا، نسخہ مطبوعہ ۱۸۹۶ء سے مقابلہ کر لیا گیا ہے۔ آزاد نے اشعار کو غلط طور پر جو منسوب کیا ہے اس کا ذکر مجملاً کیا گیا ہے، تفاصیل "آوارہ گرد اشعار" میں ملیں گے۔ 'انجمن' سے انجمن ترقی اردو 'م' سے کتب خانہ مشرقیہ خدا بخش پٹنہ، 'و' سے ورق، اور 'نو ل' سے نولکشور مراد ہے۔

(۱)

(۱) خالق باری کو امیر خسرو سے منسوب کیا ہے اور بی چھو (سافن) کی زبان سے کہا ہے: "بھٹیاری کے لڑکے کے لیے خالق باری لکھ دی، ذرا لونڈی کے نام پر بھی کچھ لکھ دوگے تو کیا ہوگا؟" الف ص۷۶۔ خالق باری جیسا کہ شیرانی کی تحقیقات نے قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے، امیر خسرو سے کچھ تعلق نہیں رکھتی۔ آزاد کے زمانے میں یہ بات کہ امیر خسرو اس کے مصنف ہیں، شہرت عام رکھتی تھی، اس لئے آزاد اسے باور کرنے کے لئے زیادہ قابل الزام نہیں، لیکن بھٹیاری والی حکایت خود ان کی بنائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

(۲) خسرو بی چھو کے یہاں حقہ پیا کرتے تھے الف ص۷۶۔ تنباکو خسرو کے زمانے میں ہندوستان میں نہ تھا اور یہ بات عام طور پر معلوم ہے۔ حقے سے کچھ اور مراد ہے تو آزاد کو اس کی وضاحت کرنی تھی۔

(۳) ولی کا "ابتدائی عہد شاید عالمگیر کا آخری زمانہ ہوگا" الف ص۹۲۔ ولی کا سال ولادت نامعلوم ہے۔

مگر اس میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ ان کی وفات ۱۱۱۹ھ میں ہوئی ہے (رجوع بہ ولی گجراتی مصنفہ جناب ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی ص۱۲۱)۔ عالمگیر ۱۱۱۸ھ میں فوت ہوا ہے۔ آزاد کا قول صریحاً غلط ہے۔

(۴) ولی کا رسالہ نور المعرفت تصوف میں ہے الف ص۹۳۔ یہ رسالہ چند سال ہوئے طبع ہو چکا ہے، اس کا موضوع تصوف نہیں۔

(۵) دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

الف ص۹۳ میں ہے کہ ولی نے کبھی کبھی۔۔ حافظ کی طرح بادشاہ وقت کے نام سے۔۔ شعر کو شان و شکوہ دیتے تھے۔۔ دلی کی تصنیفات میں سے ایک غزل میں کہتے ہیں: دل ولی الخ" ولی کی وفات ۱۱۱۹ھ میں ہوئی تھی، تو ظاہر ہے کہ اس کے کسی شعر میں محمد شاہ کا نام نہیں آسکتا، اس لیے کہ اس کا سال جلوس ۱۱۳۱ھ ہے۔ شعر کا مصرع یوں ہے: "اس گدا کا دل لیا دلی نے چھین" اور یہ مضمون کا ہے (گلشن گفتار ص۱۹ چمنستان شعرا ص۳۵۷)

(۶) از زلف سیاہ تو بدل دھوم پڑی ہے در خانۂ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے

الف میں ہے کہ آشا کی دریائے لطافت میں امید کی طرف منسوب ہے ص۱۲۲ یہ غلط محض ہے، انشا نے اسے فطرت کے نام سے لکھا ہے (دریائے لطافت انجمن ص۳۵ و دیگر نسخ)

(۷) مغاں مجھ مست بن پھر خندۂ قلقل ڈھو دے گا ے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے لے کے رودیگا

الف ص۱۲۲ میں بنام آرزو، لیکن کلیات میر، مرتبۂ آسی ص۸۵ میں ہے، اور نکات الشعرا ص۸۶ گلزار ابراہیم م، مجموعۂ نغز ۲ ص۲۳۲ تذکرۂ حسن ص۱۷۵ اس کے مصدق ہیں۔

(۸) سراج الدین علی خاں آرزو نے قاضی القضات کا عہدہ دربار شاہی سے حاصل کیا، الف ص۱۲۳۔ آرزو کا عہدۂ قضا سے سروکار نہیں رہا۔ موہان کے ایک بزرگ جن کا لقب سراج الدین علی خاں تھا، کلکتہ میں قاضی القضات تھے۔ آزاد نے آرزو کو قاضی القضات بنا دیا۔

(۹) مضمون اپنے استاد آرزو سے عمر میں بڑے تھے الف ص۱۰۱، یہ دور از قیاس ہے اور اس کا ثبوت موجود نہیں۔

(۱۰) الف ص۱۴۸: "جد مرحوم ایک اردو کا شعر ان (مظہر) کے نام سے پڑھا کرتے تھے:

ہوں تو سنی پر علی کا صدق دل سے ہوں غلام خواہ ایرانی کہو تم خواہ تورانی مجھے

یہ شعر معروف کے مطلع ذیل سے جو دیوان دوم میں ہے (تفصیل معیار پٹنہ شمارۂ ۳ ص۱۹۸) بہت مشابہ ہے اور غالباً اسی کی تبدیل شدہ صورت:

ہوں تو سنی ہے علی سے دوستی جانی مجھے خواہ ایرانی کہو اور خواہ تورانی مجھے

(۱۱) "اس قتل کا سبب ۔مشہور تھا کہ ۔۔ ساتویں کو علم اٹھتے تھے ، یہ (مظہر) سر راہ اپنے بالاخانے پر ۔۔ مریدوں کو لیے بیٹھے تھے ۔۔ شاید طرفین سے کچھ کچھ طعن و تعریض ہوئے ہوں ، وہ کسی جاہل کو ناگوار ہوئے ۔ ان میں کوئی سنگ دل ، فولاد خان نام سخت جاہل تھا ؛ اس نے یہ حرکت کی ، لیکن حکیم ۔۔ قاسم اپنے تذکرے میں فرماتے ہیں کہ مرزا ۔۔ اپنے کلام میں اکثر اشعار حضرت علی کی مدح میں کہا کرتے تھے ، اس پر بگڑ کر کسی سنی نے یہ حرکت کی :

نکرد مظہر اطاعتے در رفت بخاک — نجات خود بتولاے بوتراب گذاشت

عبارت حاشیہ : "عجب مشکل ہے ۔ حکیم صاحب ۔۔ خوش اعتقاد سنت جماعت تھے ، وہ کہتے ہیں سنی نے مارا ، لوگ کہتے ہیں شیعہ نے مارا ۔ خیر سنی شیعہ آپس میں سمجھ لیں ۔ میرا کام اتنا ہی تھا جو کچھ پایا کاغذ کے حوالے کیا" الف ص۱۴۷

آزاد جو کچھ پاتے اسے حوالۂ کاغذ کرتے تو اس سے کیا بہتر تھا ، لیکن جیسا کہ شیرانی نے دیباچۂ مجموعۂ نغز میں لکھا ہے ، قاسم کا "منشا بالکل برعکس ہے" قاسم کی عبارت یہ ہے "ظالمے ناحق شناس در ایام ۔۔ عاشورہ بہ تعصب مذہب بے تحقیقت کار ، نابردہ کہ دے غریق حب جناب مرتضوی بود ، چنانچہ بعضے اشعار آبدارش خاصہ ایں بیت : "نکرد مظہر الخ" بر بیگناہیش گواہی دہ ، بیگناہ شہید ساختہ" (مجموعۂ نغز ۳ ص۱۹۹) اس عبارت کا مطلب اس کے سوا نہیں ہو سکتا کہ قاتل بے سبب مظہر کو حضرت علی کا دشمن سمجھتا تھا ۔ آزاد نے مظہر کے جو اشعار مدحیہ نقل کئے ہیں ، وہ کسی متشدد سنی کی نظر میں بھی قابل اعتراض نہیں ہو سکتے ، چہ جائیکہ ان کی وجہ سے ، یا ایسے ہی دوسرے اشعار کی بناء پر کوئی سنی انھیں گردن زدنی قرار دے ۔ آزاد کے دفاع میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے حافظے نے دھوکا دیا ، مجموعۂ نغز کا ایک نسخہ خود ان کے پاس تھا اور وہ جب چاہتے اس کی طرف رجوع کر سکتے تھے ۔ آزاد کا نسخہ اب بھی کتب خانۂ دانش گاہ پنجاب میں موجود ہے ۔

(۱۲) "افسوس ہے اہل وطن کے خیالات پر جنھوں نے ۔۔ از روے اعتقاد آخر میں ایک طرہ اور بڑھایا یعنی قاتل ہم جوانی صبیح و ملیح بود کہ بدستش جان سپردند ۔ یا شاید ایسا ہی ہو ، عالم الغیب خدا ہی" الف ص۱۴۲ ۔ اگر آزاد اسے غلط نہیں سمجھتے کہ مظہر کے قتل میں ان کی حسن پرستی کو دخل تھا ، تو اظہار افسوس کی وجہ سمجھ میں نہ آئی ، لیکن سوال یہ ہے کہ عبارت فارسی جو اس طرح پیش ہوئی ہے کہ گویا بجنسہٖ کسی دوسرے شخص کی تحریر سے نقل ہوئی ہے ، کس نے لکھی ہے ۔ مجھے یقین کامل ہے کہ یہ آب حیات کے سوا کہیں اور نہیں مل سکتی ۔ "از روے اعتقاد" خاص طور پر شایان التفات ہے ؛ آزاد یہ الفاظ اس لیے لائے ہیں کہ پڑھنے والے صاحب عبارت کو سنی تصور کریں ۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ایک فرد واحد صبیح و ملیح دونوں کس طرح ہو سکتا ہے ۔

(۱۳) سودا کا ایک قطعہ الف ص۱۴۳ اور کلیات کے بعض قلمی نسخوں میں ہے، جس میں مظہر کے اشعار ریختہ کی نسبت کہا گیا ہے کہ "کتا ہے دھوبی کا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا" آزاد لکھتے ہیں کہ "نکتہ اس میں یہ ہے کہ مرزا صاحب نے ایک دھوبن گھر میں ڈال رکھی تھی" میرزا مظہر شاعر ہی نہیں، صوفی بھی تھے، اور بہتوں کو ان سے عقیدت تھی اور ہے۔ ایسے شخص کے متعلق ایسی بات کسی سند کے بغیر درج کتاب کرنا کسی طرح لائق ستائش نہیں۔

(۱۴) عالمگیر نے جان جاناں نام رکھا الف ص۱۳۸۔ اس سے قطع نظر کہ عالمگیر نے نام رکھا یا نہیں، صحیح نام جان جاں ہے اور یہ مسلمات سے ہے (نکات الشعرا ص۸۳، و دیگر کتب) اگر اصلی نام کی جگہ غلط نام ان کے زمانے میں مشہور بھی ہو گیا تھا، تو اس سے یہ کہاں ثابت ہو سکتا ہے کہ ولادت کے وقت یہی نام رکھا گیا تھا۔

(۱۵) حاتم "۹۶ برس کی عمر میں ماہ رمضان ۱۲۰۷ھ میں .. فوت ہوئے .. مگر مصحفی نے تذکرۂ فارسی میں لکھا ہے کہ ۱۱۹۷ھ میں فوت ہوئے اور ۸۳ برس کی عمر پائی الف ص۱۱۹ مصحفی نے ۱۱۹۷ھ نہیں، "یک ہزار و نود و ہفت" لکھا ہے ص۲۳ اور ان کا نکالا ہوا مادۂ تاریخ: "آہ صد حیف شاہ حاتم مرد" بھی اسی پر مشعر ہے (عقد ثریا ص۲۴)

(۱۶) آزاد باوجود اس کے کہ مصحفی کا قول ان کے سامنے ہے (اور انھوں نے عقد ثریا کو غور سے پڑھا تھا تو انھیں یہ معلوم ہو گا کہ مصحفی سالِ ولادتِ حاتم سے بےخبر نہ تھے اور ان کی وفات کے وقت دلی میں موجود تھے)، ۱۱۹۷ھ پر ۱۲۰۷ھ کو ترجیح دیتے ہیں حالانکہ ظاہرا اس کی کوئی سند ان کے پاس نہیں۔ صحیح وہی ہے جو مصحفی نے لکھا ہے، اس کی بحث معاصر ۲ ص۲۵ میں ملاحظہ ہو۔

(۱۷) سودا کے والد "میرزایان کابل سے تھے" الف ص۱۴۴، یہ بعض تذکروں میں ہے، لیکن کسی ایسے تذکرے میں جس کا مصنف سودا سے اچھی طرح واقف ہے، نہیں ملتی۔ سودا کابلی مغل ہوتے تو ہاتف کے باپ کے متعلق یہ نہ لکھتے: "وہ خرس اگر مغل کوئی ہوگا تو کابلی" (کلیات اشاعت آسی ص۱۱۴) صاحب باغ معانی (نسخۂ م) جس کے سودا سے ذاتی تعلقات تھے لکھتا ہے کہ "اصلش از بخاراست یکے از اجدادش بہ ہندوستان آمدہ در .. دہلی .. توطن اختیار نمود" (معاصر ۲ ص۱۱)

(۱۸) سودا کے والد "بطریق تجارت وارد ہند ہوئے" (الف ص۱۴۴ اس کی تردید باغ معانی کی اس عبارت سے ہوتی ہے جو ۱۷ میں نقل ہوئی ہے۔

(۱۹) سودا ۱۱۲۵ھ میں پیدا (الف ص۱۴۴، اس سے اس موقع پر بحث منظور نہیں) اور بعمر تقریباً ۷۰ سال ۱۱۹۵ھ میں [illegible] ص۱۵۱، لیکن ص۱۳۶ میں عمر ۷۵ برس، تضاد صریح ہے اور اسی کی نشاندہی مقصود ہے۔

(۲۰) نہ بھول اے آرسی گر یار کو تجھ سے محبت ہے　　نہیں ہے اعتبار اس کا یہ منہ دیکھے کی الفت ہے

(الف صفحہ ۱۹۴ میں بنام سودا اور یہ ٹھیک ہے (کلیات صفحہ ۲۰۴)، لیکن صفحہ ۱۷۶ میں بنام میر

(۲۱) بگولے سے جسے آسیب اور ہر سے زحمت ہو — ہماری خاک یوں برباد ہوا سے ابر رحمت ہے

ثابت، شاگرد فدوی کا مطلع ہے اور گلزار ابراہیم، (نسخہ ام) یکے از ماخذ آزاد اور تذکرہ شعر عظیم آبادی، نسخۂ راقم دونوں میں "برباد ہو" کی جگہ "اڑتی پھرے" ہے۔ آزاد نے اسے الف صفحہ ۷۰ میں سودا اور صفحہ ۱۹۴ میں میر کے نام سے لکھا ہے۔

(۲۲) وے صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں — اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

الف صفحہ ۱۳۱ میں بنام سودا، اور مطبوعہ کلیات سودا صفحہ ۱۰۹ میں پوری غزل موجود ہے، لیکن، یہ کرا ایک نہایت نامعتبر خطی نسخے پر مبنی ہے، قابل اعتبار نسخے اس سے خالی ہیں۔ تذکرۂ حسن صفحہ ۱۳۶ گلزار ابراہیم وغیرہ میں شیدا، شاگرد سودا کے نام سے ہے اور کوئی معقول وجہ اس کی نہیں کہ اس کا مصنف نہ سمجھا جائے۔

(۲۳) قائم سودا کے شاگرد ہونے کے بعد ان سے پھرے، سودا نے انھیں ٹھیک کیا الف صفحہ ۱۵۶ فوقی کی ہجو کلیات سودا میں ہے۔ قاسم کے قول کے مطابق دراصل قائم کی ہجو ہے (کلیات کے بعض خطی نسخوں کے عنوان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، لیکن، نہ ہجو سے اس کا پتا چلتا ہے اور نہ آزاد کے سوا کسی نے یہ لکھا ہے کہ قائم استاد سے برگشتہ ہو گئے تھے، اس لیے استاد نے ہجو کہی ۔۔ قرین قیاس یہ ہے کہ یہ تلمذ پیدا ہونے سے قبل کی ہو۔

(۲۴) برابری کا تری گل نے جب خیال کیا — صبا نے مار طمانچے منہ اس کا لال کیا

الف صفحہ ۱۷۶ میں بنام سودا، لیکن اس کا ثبوت موجود نہیں۔ تذکرۂ قدرت اللہ، شوق میں یہ مطلع نیم چند، ممنون کے نام سے ہے اور بعض مجموعوں میں پوری غزل حیدری کی طرف منسوب ہے۔

(۲۵) سودا ۱۱۸۵ھ میں لکھنؤ پہنچے، نواب شجاع الدولہ کی ملازمت حاصل کی" الف صفحہ ۱۵۱ اس زمانے میں اودھ کا دارالحکومت فیض آباد تھا، اسے چھوڑ کر لکھنؤ جانا خارج از بحث ہے۔ زمانے سے دوسری جگہ بحث کی جائے گی۔

(۲۶) تو فخر زمانۂ و نغے سا قط از و — گو ہر بدہاں داری و بے سا قط از و

ہر روز و شبے من از خدا می طلبم — مرکب د ہت و لے کہ بے سا قط از و

یہ رباعی جس کا مصنف نامعلوم ہے "تذکرۂ تقی کاشی کی اس جلد میں ہے جو ہم میں ہے ۳۲۸۹۔ یہ تذکرہ گیارھویں صدی ہجری کے نصف اول میں مکمل ہوا اور اس کا خطی نسخہ اسی زمانے کا معلوم ہوتا ہے۔ آزاد نے الف صفحہ ۱۶۵ میں لکھا ہے کہ سودا نے یہ رباعی مکیں کی ہجو میں آصف الدولہ کے سامنے

فی البدیہہ پڑھی تھی۔ الف میں الفاظ کسی قدر مختلف ہیں۔

(۲۷) رستم رہا زمیں پہ نہ سام رہ گیا ‏ مردوں کا آسماں کے تلے نام رہ گیا

الف ص۱۴۱ میں بنام سودا اور پوری غزل کلیات سودا مطبوعہ ص۳۴ میں ہے، لیکن معتبر خطی نسخے اس سے خالی ہیں۔ گلزار ابراہیم میں سوز کے نام سے ہے اور مکمل غزل دیوان سوز کے دو نسخوں (مملوکہ جناب علی حیدر و نسخۂ کوالتھ) میں میری نظر سے گذری ہے۔

(۲۸) کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ ‏ کچھ قصر دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

الف ص۱۴۲ میں بنام سودا اور کلیات مطبوعہ ص۱۳ میں اسی طرح، لیکن قائم کا شعر (بہ تبدیل بعض الفاظ) ہے جو دیوان قائم نسخۂ انڈیا آفس لندن اور تذکرۂ قائم ص۷۹ میں موجود ہے۔

(۲۹) مرزا سودا کا لڑکپن تھا اور "میر جعفر زٹلی" کا بڑھاپا۔ "ایک دن شام کے قریب میر موصوف ایک سبز رنگ جریب ٹیکتے ٹہلنے کو باہر نکلے۔ مرزا بغل میں کتابوں کا جزدان لیے سامنے سے آتے تھے۔۔ جھک کر سلام کیا، انھوں نے خوش ہو کر دعا دی، چونکہ بچپن ہی میں مرزا کی موزونی طبع کا چرچا تھا، میر صاحب کچھ باتیں کرنے لگے، مرزا ساتھ ہو لئے۔ انھوں نے کہا۔۔ ایک مصرع پر مصرع تو لگاؤ۔" لالہ در باغ داغ چوں دارد" مرزا نے سوچ کر کہا۔۔ "عمر کوتاست غم فزوں دارد" میر صاحب نے فرمایا، واہ'۔۔ دن بھر کے بھوکے تھے، وہ کھا گئے۔ مرزا نے پھر کہا۔۔ "از غم عشق سینہ خوں دارد" میر صاحب نے فرمایا۔۔ دل خون ہوتا ہے، جگر خون ہوتا ہے، بھلا، سینہ کیا خون ہوگا؟ سینہ پر زخون ہوتا ہے۔ مرزا نے پھر ذرا فکر کیا اور کہا۔۔ "چہ کند سوزش دروں دارد" میر صاحب نے کہا۔۔ ٹھیک ہے، لیکن طبیعت پر ذرا زور دے کر کہو۔ مرزا دق ہو گئے تھے، جھٹ کہہ دیا۔۔ "یک عصا سبز زیر کون دارد" میر جعفر ہنس پڑے اور جریب اٹھا کر کہا کیوں ہم سے بھی؟ دیکھ کہوں گا تیرے باپ سے۔ بازی بازی بریش بابا ہم بازی میرزا لڑکے تو تھے ہی، بھاگ گئے" الف ص۱۴۷۔

تذکرۂ میر حسن ص۷۵ میں ہے کہ میر جعفر زٹلی بیدل کے یہاں گئے وہ فکر سخن میں تھے، ملتفت نہ ہوئے، انھیں معلوم ہوا کہ بیدل "لالہ برسینہ الخ" پر مصرع لگانا چاہتے ہیں تو بولے کہ تامل کیا ہے "چوبکے سبز زیر۔۔ دارد"۔ انشاء نورتن مطبوعہ نول ص۱۰۶ میں ہے کہ اکبر نے "لالہ الخ" کہا، امیر خسرو نے یہ مصرع لگایا: "عمر کوتاہ و غم فزوں دارد" لطائف عجیبہ مصنفہ بشیر الدین احمد دہلوی مرحوم کی کسی جلد میں اس پر یہ اضافہ کیا گیا ہے کہ بیربل نے تیسرا مصرع "چوبکے سبز الخ" کہا ممکن ہے "یک عصا الخ" اس کی جگہ ہو (کتاب اس وقت پیش نظر نہیں)۔ آزاد کی حکایت اختراعی ہے۔

(۳۰) عظیما کشمیری استاد مکیں الف ص۱۴۹، انیس الاحبا مصنفہ امیں نسخۂ م و ۷ و ۸، وغیرہ میں مراحنہ مرقوم

ہے کہ عہد محمد شاہ میں اصفہان سے ہندوستان آئے۔ ان کا تخلص اکسیر تھا۔

(۳۱) فدوی نے "احمد شاہ کی تعریف میں قصیدہ کہا تو بادشاہ نے ہزار روپیہ نقد اور گھوڑا اور تلوار انعام دی" الف ص۱۵۵۔ فدوی کا دہلی جانا ہی ثابت نہیں، قصیدہ خوانی کا کیا سوال ہے۔ اس امر کا بھی کہ اور جگہ قصیدہ پڑھا، ثبوت موجود نہیں

(۳۲) فدوی کو اخیر میں لکھنؤ جانا پڑا الف ص۱۵۵۔ سودا و فدوی کا جھگڑا فرخ آباد میں ہوا۔ ان کا لکھنؤ مطلقاً ثابت نہیں۔

(۳۳) عندلیب کا رسالہ "نالۂ عندلیب" الف ص۱۸۲، م کا خطی نسخہ بڑی تقطیع کے ۱۶۱۶ صفحات میں ہے مسطر ۲۵ سطروں کا ہے و ۳ کی ایک سطر کی عبارت یہ ہے: "برائے شکار شیر و پیدا دعیان دین کیفیت و ماہیت ہنرمندی و سوارکاری و تیر اندازی آں یار دلیر و بیان حقیقت افتاد شاہ باکمال و" یہ کتاب چھپ بھی گئی ہے۔ اسے آزاد ہی "رسالہ" کہہ سکتے ہیں۔

(۳۴) اشرف علی خاں نے شعر کے اشعار کا انتخاب کیا الف ص۱۶۵ اشرف علی خاں نے شعرائے فارسی کا تذکرہ لکھا تھا، ناقص خطی نسخہ رامپور میں موجود ہے۔ سودا نے بھی اسے تذکرہ ہی کہا ہے۔

(۳۵) معتبر لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ جب گنا بیگم، دختر قزلباش خاں، امید کے حسن و جمال... اور موزونی طبع کی شہرت ہوئی" الف ص۲۱۴۔ گنا بیگم بارھویں صدی ہجری کے نصف آخر کی بہت ہی مشہور عورت ہے اور علی قلی خاں شش انگشتی متخلص بہ والہ کی بیٹی تھی، یہ بات مجموعۂ نغز ۲ ص۱۵۴ میں بھی ہے، مگر آزاد نے اس پر اعتماد نہ کیا اور زبانی روایت پر بھروسا کیا۔

(۳۶) دلہن بیگم ایک سیدزادی تھیں جنھیں محمد شاہ نے "بنظر ثواب خود بیٹی کر کے پالا تھا" یہ شجاع الدولہ کی بیاہتا بی بی اور آصف الدولہ کی ماں تھیں الف ص۲۹۴ دلہن بیگم آصف الدولہ کی ماں نہیں بیاہتا بی بی کا لقب تھا اور یہ قمر الدین خاں وزیر محمد شاہ کی پوتی تھیں۔ ان کا حال اودھ کی تاریخ میں ملتا ہے۔ شجاع الدولہ کی بیاہتا بی بی کا لقب بہو بیگم اور اصلی نام امۃ الزہرا بیگم تھا، یہ مؤتمن الدولہ محمد اسحٰق خاں کی بیٹی تھیں اور محمد شاہ کے لے پالک نہ تھیں۔ یہ بھی مسلمات سے ہے کہ مؤتمن الدولہ سید نہ تھے۔ (تواریخ اودھ از کمال الدین حیدر ص۱۹۵ وغیرہ)

(۳۷) ترجمۂ سوز الف ص۱۹۹: "یہ قطعہ بھی ایک خاص موقع پر ہوا تھا اور عجیب انداز سے پڑھا گیا:

گئے گھر سے جو ہم اپنے سویرے | سلام اللہ خاں صاحب کے ڈیرے
وہاں دیکھے کئی طفل پریرو | ارے رے رے ارے رے رے اٹکلے

چوتھا مصرع پڑھتے پڑھتے زمین پر گر پڑے، گویا پریزادوں کو دیکھتے ہیں.. ایسے ندھال تھے کہ "رے رے رے" کہتے ہوئے غش کھا کر بیہوش ہوگئے" دیوان سوز (مملوکۂ جناب علی حیدر اور نسخۂ اکو اتھ) اس قطعے سے خالی ہے اور یہ بہ تبدیل بعض الفاظ ظہور علی ظہور دہلوی (متوفی ۱۲۸۶ھ) شاگرد ذوق و احسان وغیرہ کے دیوان مطبوعہ ص۱۰۵ میں موجود ہے. میرا خیال ہے کہ انھیں کا ہے اور اصلی شکل وہی ہے جو دیوان ظہور میں ہے۔

(۳۸) سوز کے صرف ایک بیٹے داغ کا ذکر کیا ہے الف ص۱۹۵، حالانکہ سخن شعرا میں جو الف کی اشاعت سے قبل ہی چھپ چکا تھا، قدرت علی طپاں خلف سوز کا ذکر ہے ص۳۰۲

(۳۹) آزاد نے اظہار افسوس کیا ہے کہ داغ کی کوئی غزل نہ ملی۔ الف ص۱۹۵۔ گلزار ابراہیم میں جس کے دو نسخے بقول خود آزاد کی نظر سے گذرے ہیں (الف ص۱۹۵) آہ تخلص کے تحت داغ کی تین غزلیں موجود ہیں۔ میر مہدی خلف سوز کا تخلص پہلے آہ تھا، بعد کو داغ اختیار کیا۔ دیوان سوز میں ان کا مرثیہ بھی ہے، ظاہراً آزاد اس سے بے خبر ہیں۔

(۴۰) ضاحک کی وفات کے بعد سودا فاتحے کے لیے گئے، دیوان ساتھ تھا، بعد فاتحہ نوکر سے دیوان منگوا کر جو ہجویں ان کی کہی تھیں، سب چاک کر ڈالیں۔ میر حسن (پسر ضاحک) نے.. اسی وقت دیوان باپ کا گھر سے منگایا اور جو ہجویں ان کی تھیں وہ پھاڑ ڈالیں، لیکن چونکہ سودا کی تصنیف قلم سے نکلتے ہی بچے بچے کی زبان پر پھیل جاتی تھی.. سب قائم رہیں ان کا کلام کہ اسی مجلد کے اندر تھا مفقود ہوگیا" الف ص۱۸۲ یہ حکایت جس طرح بیان ہوئی ہے، صحیح نہیں ہو سکتی۔ سودا ۱۱۹۵ھ میں فوت ہوئے ہیں اور ضاحک بقول صاحب گلزار ابراہیم ۱۱۹۶ھ میں زندہ تھے۔ اس سے آزاد بھی ناواقف نہیں (الف ص۱۸۴)۔ تذکرۂ مسرت افزا ص۹۸ میں ہے کہ میر حسن نے چاہا کہ سودا کی لکھی ہوئی ہجویں مشتہر نہ ہوں، اور سودا اس پر راضی ہوئے، لیکن سودا کے کلام کو وہ قبول عام حاصل تھا کہ اخفا کی کوشش ناکام رہی۔ تذکرۂ ناصر (م) میں ہے کہ میر حسن جب سودا کے شاگرد ہوئے تو "جو مزخرفات ان کے والد (کا) تھا، دھو ڈالا، اس لئے وہ مشہور نہ ہوا" ایک توجہ طلب بات یہ بھی ہے کہ ضاحک کا اور کلام بھی باستثنائے بعض اشعار ناپید ہے۔

(۴۱) میر کی مثنوی "تنبیہ الجہّال" کا نام ص۲۱۱ الف میں تنبیہ الخیال مرقوم ہے۔

(۴۲) "اہل تحقیق" کے نزدیک فارسی میں وحشی یا فغانی اور اردو میں میر واسوخت کے موجد ہیں الف ص۲۰۹۔ فارسی میں واسوخت کوئی مستقل صنف سخن نہیں۔ وحشی کے دیوان کی دو نظمیں جنھیں واسوخت کہا جا سکتا ہے، موجود ہیں، لیکن دیوان فغانی میں نہ ایسی کوئی نظم ہے اور نہ مجھے آزاد

اور ان کے مقلدین کے سوا ایسے اصحاب کا علم ہے جو فغانی کو واسوخت کا موجد سمجھتے ہیں۔

(۴۳) تحقیق پسند اصحاب کبھی اردو میں میر کو واسوخت کا موجد نہیں کہہ سکتے۔ میر کی ولادت ۱۱۳۵ھ میں ہوا ہے اور آبرو ۱۱۴۶ھ میں فوت ہوئے ہیں۔ آبرو کا واسوخت معاصر ستمبر ۱۹۴۹ء اور معاصر حصہ ۷ میں چھپ چکا ہے اور ان کے معاصر تاجی کے واسوختوں کا ذکر فہرست اشپرنگر میں ہے۔ ایہام بندوں سے قطع نظر، سودا، حشمت اور تاباں کے واسوخت بھی موجود ہیں، اور اس صورت میں کہ یہ تینوں عمر میں میر سے بڑے تھے، کسی ثبوت کے بغیر یہ کس طرح مان لیا جا سکتا ہے کہ میر کا واسوخت ان واسوختوں سے زماناً مقدم ہے؟

(۴۴) میر نے دو واسوخت کہے الف ص۲۰۹۔ کلیات میں ۳ نظمیں ہیں جن پر بے تکلف واسوخت کا اطلاق ہو سکتا ہے: "طرز اے رشک چمن اب تری کچھ تازی ہے الخ" ص۸۳۸، "یاد ایام کہ خوبی سے خبر تجھ کو نہ تھی الخ" ص۸۴۴، "ایک دن وے تھے کہ تم کو نہ قریب آتے تھے الخ" ص۸۴۸۔

(۴۵) خواہی پیالہ خواہ سبو کر ہمیں کلال ہم اپنی خاک پر تجھے مختار کر چلے

الف ص۲۱۳ میں بنام میر، لیکن کلیات میر اس سے خالی ہے اور تذکروں میں بھی ان کے نام سے نہیں، عظیم وغیرہ کے نام سے ہے۔ میر کا بہر صورت نہیں (تفاصیل "آوارہ گرد اشعار")

(۴۶) آزاد کے ماخذ گلزار ابراہیم و مجموعۂ نغز میں میر فیض علی، فیض خلف میر کا ذکر ہے، آزاد ظاہراً ان سے ناواقف ہیں۔

(۴۷) آزاد ہوش، خلف میر سے ملے تھے، لیکن ان کا نام میر عسکری لکھتے ہیں (الف ص۲۲۴) صحیح میر حسن عسکری (ریاض الفصحا تحت تخلص زار ص۱۱۸ تذکرۂ ناصر، سراپا سخن ص۱۳)

(۴۸) "لکھنؤ کے چند عمائد اور اراکین" ایک دن میر سے ملنے آئے۔ "دروازے پر.. آواز دی، لونڈی یا ماما نکلی حال پوچھ کر اندر گئی، ایک بوریا لاکر ڈیوڑھی میں بچھایا، انھیں بٹھایا، اور ایک پرانا سا حقہ تازہ کرکے سامنے رکھ گئی۔ میر.. اندر سے تشریف لائے، مزاج پرسی وغیرہ کے بعد انھوں نے فرمایش اشعار کی۔ میر.. نے اول کچھ ٹالا پھر صاف جواب دیا کہ.. میرے اشعار آپ کی سمجھ میں نہیں آنے کے۔ اگرچہ ناگوار ہوں مگر بنظر آداب واخلاق انھوں نے اپنی نارسائی کا تو [illegible] سپرد [illegible] کی۔ انھوں نے پھر انکار کیا۔ آخر ان لوگوں نے گراں خاطر ہو کر کہا کہ.. انوری و خاقانی کا کلام سمجھتے ہیں، آپ کا ارشاد کیوں نہ سمجھیں گے۔ میر.. نے کہا کہ یہ درست ہے مگر ان کی شرحیں، مصطلحات اور فرہنگیں موجود ہیں، اور میرے کلام کے لئے فقط محاورۂ اہل اردو ہے یا جامع مسجد کی سیڑھیاں، اور اس

عشق برے ہی خیال پڑا ہے چین گیا آرام گیا دل کا جانا ٹھیر گیا ہے صبح گیا یا شام گیا

اور کہا کہ آپ بموجب اپنی کتابوں کے کہیں گے کہ خیال کی ی ظاہر کرد، پھر کہیں گے کہ ی تقطیع میں گرتی ہے، اگر... یہاں اس کے سوا جواب نہیں کہ محاورہ یہی ہے الف ص۲۱۹

اس سلسلے میں امور ذیل توجہ طلب ہیں: (الف) حکایت کی کوئی سند موجود نہیں، تفصیلات کا انبوہ بجائے خود اسے مشتبہ بناتا ہے (ب) میر اتنے کج خلق اور مصلحت نااندیش نہ تھے، جتنے اس حکایت سے ظاہر ہوتے ہیں (ج) میر کے عہد کا لکھنؤ اہل دہلی اور ان کے اخلاف سے مملو تھا، وہاں کے خواص یقیناً دہلی کے محاورات سے بے خبر نہ تھے، اور اس عہد میں دونوں مقاموں کی زبان میں اتنا فرق بھی نہ تھا، جتنا بعد کو ہوا (د) میر کے کلام میں محاورات و مصطلحات ملتے ہیں، لیکن، ان کی عظمت کا مدار ان کے استعمال پر نہیں (ہ) میر کے کلام کا بہت بڑا حصہ اب بھی معمولی اردو جاننے والے سمجھ سکتے ہیں، میر کو ہرگز اس کے متعلق یہ غلط فہمی نہیں ہو سکتی تھی کہ اہل دہلی کے سوا کوئی اسے سمجھ ہی نہیں سکتا (و)، خیال کی ی کا گرنا یا نہ گرنا زبان نہیں عروض کا سوال ہے (ز) عشق برے ہی الخ جس وزن میں ہے وہ ہند کا ایجاد ہے، فارسی عروض کی کتابوں میں یہ نہیں ملے گا اور اس وزن کے شعر فارسی میں نہیں، ظاہر ہے کہ اس کے زحافات بھی وہی ہوں گے جنھیں اہل ہند روا رکھتے ہیں۔

(ح)، میر کا کلام جن لوگوں نے بالاستیعاب دیکھا ہے، وہ کبھی اسے تسلیم نہیں کر سکتے کہ میر اپنی زبان کو "جامع مسجد کی سیڑھیوں" کی زبان سمجھتے تھے۔ وہ تو اس کے بھی روادار نہیں کہ "اجلاف" شعر کہیں (کلیات ص۸۲۵) (ط) میر کے زمانے میں لفظ خیال بر وزن فال زبانوں پر تھا، اس کا ثبوت موجود نہیں، نظم میں اس طرح بہت کم آیا ہے اور عموماً بر وزن نہال موزوں ہوا ہے۔ میر کے کلیات میں بر وزن بال صرف دو جگہ آیا ہے اور بر وزن نہال کم از کم ۲۶ جگہ (وہ اشعار جن میں خیال بترکیب فارسی آیا ہے، اس میں شامل نہیں): نہ کہہ کہ نیند میں ہے تو یہ کیا خیال کیا ص۸، میں تو اسی خیال میں بیمار ہو گیا ص۱۶، دل سمجھا نہ محبت کو کچھ ان نے کیا یہ خیال کیا، خون ہو بہ سبب آپ ہی گیا جو عشق حسن و جمال کیا ص۱۸، رہے خیال تنک ہم بھی روسیاہوں کا ص۲۰ پر مرے جی ہی کے خیال پڑا ص۳۲ نہ پوچھ خواب زلیخا نے کیا خیال لیا ص۳۲، اس کا خیال چشم سے شب خواب لے گیا ص۳۵، ہر جگہ یاں خیال ہے کچھ اور ص۴۲ کیسا چمن اسیری میں کس کو ادھر خیال ص۸۶ (۲ جگہ بطور ردیف) سارے تیرا خیال رکھتے ہیں ص۱۰۳، وگرنہ میں نہیں اب اک خیال اپنا ہوں ص۱۳۰، اور کچھ اب نہیں خیال ہمیں ص۱۷۱، یوں کوئی جی میں کچھ خیال رکھے ص۱۷۷، جی میں کیا کیا خیال آتا ہے ص۲۰۱، یکا خیال جی میں ایسا خیال اس کا ص۲۰۹، دل عجب شہر تھا خیالوں کا ص۲۵۴، خیال ہم کو بھی ہے بخت آزمائی کا ص۲۲۳، ملنا دکھوا اب خیال اپنا ہو

ص۴۹۰، رہ رہ کے ہمیں یہی خیال آتا ہے ص۳۱۳، اک شب کیا تھا یار کی زلفوں کا میں خیال ص۲۱۵ جن کو نہیں ہے تیری محبت کا کچھ خیال ص۱۵۷، معاصر حصہ ۱ میں سودا وغیرہ کے کلام سے بھی خیال بروزن نہال کی مثالیں دی گئی ہیں۔ ایک جگہ آزاد نے یہ بھی لکھا ہے کہ میر نے لفظ "خیال" میں "تصرف" کیا ہے، الف ص۲۱۲۔ اس صورت میں خیال بروزن بال کو "محاورہ" کہنا ہی ٹھیک نہیں (ی) کلیات میں شعر کسی قدر اختلاف کے ساتھ ہے۔

(۴۹) درد کا سلسلۂ مادری خواجہ بہاء الدین نقشبند تک پہنچتا ہے (الف ص۱۸۴) ۔ ناصر، نذیر، فراق مرحوم نے جو اختلاف (درد سے ہیں، میخانۂ درد میں اس کی بدلائل تردید کی ہے، اور لکھا ہے کہ مادری کی جگہ پدری چاہیئے۔

(۵۰) شاہ ہدایت الف ص۱۵۶ و ص۲۶۱۔ ہدایت اللہ خاں، ہدایت افغان تھے، انھیں "شاہ" آزاد کے سوا کسی نے نہیں لکھا۔

(۵۱) قائم درد کے شاگرد ہوئے مگر ان کے حق میں کچھ کہہ کر الگ ہوئے الف ص۱۵۶۔ یہ مسلم ہے کہ قائم اوائل میں درد کے شاگرد تھے، لیکن آزاد کے سوا کسی نے یہ نہیں کہا کہ قائم نے ان کی ہجو کہی تھی۔

(۵۲) جرات کا سال وفات ۱۲۲۵ھ قطعۂ ناسخ کے بموجب لکھا ہے الف ص۲۳۹ لیکن، دیوان پروانہ، تذکرۂ بےجگر وغیرہ میں ۱۲۲۴ھ ہے۔ اس کی شہادتیں جو ۱۳۳۶ء تک میری نظر میں تھیں ایک مقالے ("سال وفات جرات") میں درج ہیں جو غالباً ۱۹۳۶ء میں رسالۂ اردو میں چھپا تھا۔ اس کے بعد دیوان کمال شاگرد جرات نسخۂ رامپور اور دیوان نوازش نسخۂ م کے قطعات تاریخ جن سے اس کی تصدیق ہوتی ہے ملے۔

(۵۳) ناسخ کا مصرع تاریخ: "اے ہندوستان کشاعر موا" لکھا ہے الف ص۲۳۹، مگر اس پر غور نہیں کیا کہ ناموزوں ہے اور اس سے ۱۲۲۵ نہیں ۱۲۲۱ نکلتا ہے۔ کلیات ناسخ (مطبع مولائی ص۹۱) دیگر نسخے مطبوعہ) میں اسی طرح ہے، لیکن ناسخ نے ہندستان بدون واو لکھا ہوگا۔ اس طرح مصرع موزوں بھی ہو جاتا ہے اور ۱۲۲۵ مستخرج ہوتا ہے۔

(۵۴)
وہ جب تک کہ زلفیں سنوارا کیا … کھڑا اس پہ میں جان وارا کیا
کیا قتل اور جان بخشی بھی کی … حسن اس نے احسان دوبارہ کیا

الف ص۲۵۸ میں بنام میر حسن صاحب مثنوی مشہور لیکن، یہ اور اس زمین کے دو اور شعر جو الف ص۲۵۸ میں ہیں، خواجہ حسن کے ہیں (دیوان نسخۂ کلکتہ۔ شعر ثانی تذکرۂ شیفتہ ص۵۹)

(۵۵) الف ص۲۶۰ میں سالار جنگ کے بیٹے کا لقب منور فراز جنگ مرقوم ہے اور ص۴۶۰ میں گلزار ابراہیم

میرحسن کی جو عبارت منقول ہے اس میں بھی یہی ہے، لیکن، گلزار نسخۂ م میں سردار جنگ ہے، اور تذکرۂ میرحسن ص۸۵ اور مجموعۂ نغز ا ص۲۰۳ اس کا مؤید ہے۔

(۵۶) آزاد تذکرۂ گلزار ابراہیم کو اختصاراً گلزار ابراہیمی لکھتے ہیں الف ص۲۰۳ و ص۲۵۶ وغیرہ۔

(۵۷) الف ص۲۶۲ میں عظیم کی نسبت لکھا ہے کہ فقط "شد بود کا علم" رکھتے تھے اور یہ صحیح ہے، لیکن ص۲۶۱ میں انھیں ان شعرا میں شمار کیا ہے جو "نوشت خواند میں پختہ" تھے اور ص۲۰۸ میں انھیں قاسم وغیرہ کے ساتھ "علوم تحصیلی میں ماہر کامل" بتایا ہے۔ تناقض صریح ہے۔

(۵۸) قاسم، شاگرد ہدایت (مجموعۂ نغز م ص۲۲۶) کو ص۲۶ و ص۲۰۸ الف میں تلمیذ درد کہا ہے۔

(۵۹) "سراج الدولہ دلی سے مرشد آباد کے صوبہ دار ہو کر گئے الف ص۲۴۴۔ سراج الدولہ دختر زادۂ علی وردی خاں، پورب میں پیدا ہوئے اور ہمیشہ یہیں رہے، ایک لمحے کے لئے ان کا دلی جانا نہیں ہوا۔ وہاں سے مقرر ہو کر آنا غلط محض ہے (سیر المتاخرین، مظفر نامہ وغیرہ)

(۶۰) سراپا سخن میں ہے کہ مصحفی کے استاد امانی تھے الف ص۳۱۱، اس میں ہر جگہ "مانی" ص۵۴۸ وغیرہ۔ تذکرۂ ناصر میں بھی یہی ہے، مگر اسے تسلیم کرنے کے لئے قدیم تر سند کی ضرورت ہے۔

(۶۱) اس گل کے باغ میں جو حنا نے چلائی بات　　غنچوں نے مسکرا کے کہا ہم نے پائی بات

مصحفی نے "حنا" نہیں "صبا" لکھا تھا (دیوان ۲ نسخۂ م، مجموعۂ نغز ص۱۹۱)

(۶۲) "بات چلائی" پھر آزاد کو یہ اعتراض ہے کہ یہ امروہہ کی زبان ہے الف ص۲۳۴۔ آزاد زندہ ہوتے تو ان سے پوچھا جاتا کہ میر کے مصرعہائے ذیل کے بارے میں ان کی کیا رائے ہے: "قسم ہے میں نے اگر بات بھی چلائی ہو" (کلیات اشاعت آسی ص۱۲۳)، "رفتار کی جو تیری صبا نے چلائی بات" ص۲۵۶۔ "باد صبا نہ اہل چمن ہر کہیں جو ہر سے کی چلائی بات" ص۵۵۰

(۶۳) "سعادت علی خاں نواڑی میں لیٹے ہوئے میر انشا کی گود میں سر دھرا ہوا، سرور کے عالم میں دریا کی سیر کرتے چلے جاتے تھے۔ لب دریا ایک حویلی پر لکھا دیکھا: "حویلی علی نقی خاں بہادر کی" کہا کہ.. بہت خوب مادہ ہے، اسے رباعی کر دو۔ اسی وقت عرض کی:

نہ عربی نہ فارسی نہ ترکی　　نہ سم کی نہ تال کی نہ سر کی
یہ تاریخ کہی ہے کسی لڑکے کی　　حویلی علی نقی خاں بہادر کی" الف ص۲۸۶

یہ نظم کلیات انشا (نول کشور) میں ہے، لیکن اس کا سعادت علی خاں کی فرمائش سے کچھ تعلق نہیں۔ "حویلی الخ" سے ۱۲۲۷ نکلتا ہے اور جیسا کہ میرے ایک مقالے سے جس کا عنوان ہے "کچھ انشا کے بارے میں" اور جو نوائے ادب میں شائع ہو چکا ہے، ثابت ہے، انشا اس

سے پیشتر سعادت علی خاں کے یہاں سے برطرف ہو چکے تھے۔ حکایت اشعار بالا کو دیکھ کر وضع کی گئی ہے۔ انھیں رباعی کہنا بھی صحیح نہیں۔

(۶۴) "شیر برنج" الف ص۲۲۵ یہ نام صحیح نہیں، "شیر و برنج" چاہیئے، جیسا کہ خود مثنوی میں ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں انشا نے مثنوی ادبی کا تتبع کیا ہے۔ شیر و برنج جیسا کہ قاسم نے لکھا ہے (۱ ص۸۱) نان و حلوائے بہائیؒ جواب ہے خود انشا بھی یہی کہتے ہیں (دیوان نول ص۳۲۹)

چون بہائی نان و حلوا گفتہ بود　　گوہر معنی ز ہمت سفتہ بود
نسخۂ شیر و برنجش از جواب　　گفتہ انشا ہم بلے باآب و تاب

آزاد کا یہ قیاس کہ بچپن کا کلام ہے ص۲۱۶، غلط محض ہے۔ انشا نے اس کا سال تصنیف "غرو شوق کم" سے نکالا ہے = ۱۲۰۵ (دیوان ص۳۴۷)۔ ۱۲۰۵ھ میں ان کی عمر ۲۵ سے کم نہ تھی۔ عہد سراج الدولہ (۱۱۶۹ھ تا ۱۱۷۰ھ) میں صاحب گلزار ابراہیم نے انھیں مرشد آباد میں دیکھا تھا۔

(۶۵) "سید انشا پھرتے چلتے دلی میں آئے تھے، اور کچھ عرصہ رہے تھے اور جو لوگ ان معرکوں میں ان کے رفیق تھے، (معرکۂ مصحفی و انشا) ان میں سے اکثروں نے دلی کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی، چنانچہ ایک موقع پر مصحفی نے یہ قطعہ کہا جس کے چند شعر ساتویں دیوان میں ہیں۔

بعضوں کا گماں یہ ہے کہ ہم اہل زباں ہیں　　دلی نہیں دیکھی ہے زباں داں یہ کہاں ہیں"

آزاد نے۔ اشعار درج کیے ہیں الف ص۲۳۰ معرکۂ مصحفی و انشا سے جو کلام متعلق ہے وہ دیوان سوم و چہارم میں ہے، اس لیے ان اشعار کا دیوان ہفتم میں ہونا اس کی دلیل ہے کہ اس جھگڑے سے انھیں کچھ سروکار نہیں۔ مصحفی کا وطن بھی دہلی نہ تھا، اور وہ انشا کو جو اصلی دہلی والے تھے اور جو کئی سال وہاں رہ بھی چکے تھے، یہ طعنہ نہیں دے سکتے تھے کہ انھوں نے دہلی نہیں دیکھی۔ یہ اشعار ایک قطعے کے نہیں، ایک قصیدے کی تمہید کے ہیں جو منقبت میں ہے اور معاصر (دور قدیم) کے کسی شمارے میں شائع ہو چکے ہیں۔ تمہید میں ممکن ہے کہ ناسخ وغیرہ کی طرف اشارہ ہو۔

(۶۶) تعالی اللہ خاں انشا کا نوجوان بیٹا مر گیا، حواس باختہ ہو گئے، سعادت علی خاں کو سر راہ سخت کہا، انھوں نے تنخواہ بند کر دی ص۲۹۵۔ کلیات انشا، مملوکہ جناب ڈاکٹر عندلیب شادانی میں خود انشا اور دوسرے شعرا کے کہے ہوئے قطعات تاریخ وفات ہیں جو میرے مقالے "تعالی اللہ خاں، خلف انشا" (شاعر جولائی نمبر) میں شامل ہیں۔ پہلے قطعے کے بعض اشعار یہ ہیں:

نور چشم سید انشا کہ بود　　نام او سید تعالی اللہ خاں..
از سنین عمر خود تا ہشت سال　　کرد گلگشتے بہ گلزار جہاں..

روز بست و ہشتم از ذی‌حجہ بود — کز جہاں بگذشت آں سرو جہاں
سال تاریخش ز ہاتف خواستم — گفت "بر برگ گلم آمد خزاں" = ۱۲۱۶ھ

(مصرعِ تاریخ اس پر مشعر ہے کہ قطعہ خود انشا کا ہے، غیر "بر برگ گلم" نہیں کہہ سکتا، مگر انشا نے اسے اس طرح لکھا ہے کہ اس مصرعے سے قطع نظر دوسرے کی زبان سے ہے) یہ بات تو اس قطعے سے ثابت ہے کہ لڑکے کی عمر ۸ برس تھی اور ۱۲۱۶ھ میں مرا ہے! انشا کو اس کے بہت بعد سعادت علی خاں نے برطرف کیا ہے۔ میرے اس مقالے سے ثابت ہے جس کا ذکر ۳۲ میں ہے۔

۴۷) سلیمان شکوہ اس زمانے میں جب سودا و ضاحک زندہ تھے، لکھنؤ پہنچ چکے تھے۔ الف ص۱۲۳، سودا کا سال وفات ۱۱۹۵ھ ہے، اس کے دس برس بعد سلیمان شکوہ لکھنؤ گئے ہیں۔ (تواریخ اودھ از کمال الدین حیدر و دیگر کتب)

۴۸) سلیمان شکوہ مصحفی سے اصلاح لیتے تھے۔ "جب سید انشا پہنچے تو مصحفی کا مصحف طاق پر رکھا گیا" اور یہ انشا کے شاگرد ہو گئے الف ص۲۲۲۔ خود مصحفی نے تذکرۂ ہندی ص۱۲ میں لکھا ہے کہ انشا کے کہنے سے سلیمان شکوہ کے یہاں میرا گذر ہوا (تفاصیل "مصحفی و انشا" از راقم شائع کردہ اردو ادب)

۴۹) "راسخ عظیم آبادی کا دیوان میں نے دیکھا ہے۔۔ یہ ان کے مشتاق تھے۔۔ مرزا کے پاس شاگرد ہونے کو آئے، مرزا نے کہا کوئی شعر سنائیے، انھوں نے پڑھا:

ہوئے ہیں ہم ضعیف اب دید نی رونا ہمارا ہے — پلک پر اپنی آنسو صبح پیری کا ستارہ ہے

سودا نے اٹھ کر گلے لگا لیا، ص۱۷۰

(الف) نوائے وطن، مصنفہ شاد عظیم آبادی میں راسخ کا سال ولادت ۱۱۶۳ھ مرقوم ہے، لیکن اس کی سند مصنف کے پاس نہیں۔ عبرتی عظیم آبادی جو ماۂ سیزدہم کے عشرۂ دوم کے اواخر میں پیدا ہوئے تھے اور جنھوں نے راسخ کا زمانہ پایا ہے، ان کی عمر ۷۰ سال اور سال وفات ۱۲۳۲ھ بتاتے ہیں (ریاض الافکار) عبرتی سے سال وفات میں غلطی ہوئی ہے، صحیح ۱۲۳۸ھ ہے۔ مصنف تذکرۂ مسرت افزا ۱۱۹۲ھ میں پٹنہ آیا تھا اور دوران تصنیف تذکرہ میں اس کے بعد بھی یہاں پہنچا تھا، (سال اختتام ۱۱۹۵ھ) وہ لکھتا ہے کہ فدوی کا یہ نوجوان شاگرد پٹنہ میں مجھ سے اکثر ملتا رہتا تھا۔ رائے یہ ہے کہ غنیمت است و چیزے شدنی معلوم میشود" ص۸۔ کل متعلق امور پر غور کرنے کے بعد میرا قیاس ہے کہ راسخ ۱۱۷۱ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے تھے۔

(ب) م میں خود راسخ کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان ہے، اس کے ایک شعر سے جو دیوان کے کسی اور نسخے میں نہیں ہے، تلمذ فدوی ثابت ہے:

شاگرد ہیں گے حضرت فدوی کے بے شمار　　راسخ ہوں ایک میں بھی وے کس شمار میں د

تذکرۂ عشقی عظیم آبادی، ہمعصر راسخ (نسخۂ راقم) میں شاگردی فدوی کے ذکر کے بعد یہ عبارت ملتی۔ "وقتیکہ شناسائے پایۂ سخن گردید، طریقۂ پیروی کلام.. میر.. پیش نہاد ہمت ساخت، آخرِ رسوخیکہ مکنون خاطر ارادت ماثر داشت، بباریابی صحبت میر... فائز شدۂ حلقۂ انقیاد شاگرد بگوش جان انداخت" قطعی طور پر تو نہیں کہا جاسکتا، لیکن، قرینہ ہے کہ عشقی نے ۱۲۱۵ھ کے لگ بھگ ان کا ترجمہ حوالۂ قلم کیا ہے۔ دیوان راسخ مکتوبۂ مصنف میں ایک شعر اس زمانے کا ہے جب انھیں میر سے عقیدت تو تھی، لیکن ان کی زیارت نصیب نہ ہوئی تھی، اس کا مصرع آخر یہ ہے: "اور عقیدت ہے جناب میر سے مجھ کو" (یہ شعر دیوان کے اور نسخوں میں نہیں) دیوان کے کل نسخوں میں متعدد اشعار ملتے ہیں جن میں صریحاً تلمذ میر کا اقرار کیا ہے، ان میں سے یہ دو شعر دیوان مطبوعہ سے لیے جاتے ہیں:

راسخ کو ہے میر سے تلمذ　　یہ فیض ہے ان کی تربیت کا ص۲۱

شاگرد ہیں ہم میر سے استاد کے راسخ　　استادوں کا استاد ہے استاد ہمارا" ص۶

(ج) سودا نے اواسط ۱۱۹۵ھ میں رحلت کی ہے اور میر ۱۱۹۶ھ کے ربع اول میں دہلی سے پہنچے ہیں۔

(د) آزاد کی بیان کردہ حکایت بے سند ہے، دیوان راسخ مطبوعہ میں سودا کا کہیں نام تک نہیں آیا، نسخۂ مکتوبۂ راسخ میں شعر ذیل البتہ ملتا ہے:

راسخ ہے اپنی طبع کو سودا سے احتراز　　شاگرد میر ہوں مجھے سودا سے کیا غرض

(ہ) راسخ کا شعر دیوان مطبوعہ ص۱۳ اور متعدد خطی نسخوں میں اس طرح ہے کہ "پیر ہم" "ہم ضعیف" کی جگہ آیا ہے، خدا جانے اس کی وہ شکل جو آب حیات میں ہے آزاد کو کہاں ملی۔ (و) ہوتے ہیں نسخۂ مکتوبۂ مصنف سے غیر حاضر ہے اس میں ۱۲۱۷ھ یا اس کے کچھ بعد تک کا کلام ہے، کچھ تعجب اگر یہ واقعی زمانۂ پیری کا لکھا ہوا ہو۔ (ز) حکایت اختراعی ہے۔

(۷) آتش کا بھی "استاد سے بگاڑ ہوا، خدا جانے بنیاد کن کن جزئیات پر قائم ہوئی ہوگی اور ان میں حق کس کا تھا.. جہاں سے کھلم کھلا بگڑی اس کی حکایت یہ سنی گئی کہ.. مشاعرے میں طرح ہوئی دہن بگڑا، یا سمر اس میں سب نے غزلیں لکھیں، خواجہ صاحب نے غزل لکھ کر مصحفی.. کو سنائی اور جب یہ شعر سنا

امانت کی طرح رکھا زمیں نے روز محشر تک　　نہ اک مو کم ہوا اپنا نہ اک تار کفن بگڑا

گے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب　　زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجئے دہن بگڑا

نشے کے سرور میں آکر کہا کہ استاد، اس ردیف قافیے میں کوئی یہ شعر نکالے تو کلیجا نکل پڑتا ہے۔ انھوں نے ہنس کر کہا کہ ہاں میاں، سچ کہتے ہو اب تو کسی سے ایسے شعر نہیں ہو سکتے۔ بولے اس کے شاگردوں میں سے ایک نومشق لڑکے کی غزل سے توجہ بنایا اور اس میں انھیں دو قافیوں کو اس طرح باندھا:

لکھا ہے خاک کوے یار سے اک دیدۂ گریاں　　قیامت میں کروں گا گر کوئی حرف کفن بگڑا

دہن محسوس جو شے کس طرح نقشے میں ٹھیک اترے　　شبیہہ یار کھچوائی، کمر بگڑی دہن بگڑا

.. اُن شعروں میں اور ان شعروں میں جو نسبت ہے وہ .. پرکھنے والے ہی جانتے ہیں، لیکن، مشاعرے میں بہت تعریف ہوئی، پھر بھی چونکہ لڑکے کے منہ پر یہ شعر کھلتے نہ تھے .. تاڑنے والے تاڑ گئے کہ استاد کی استادی ہے۔ خواجہ صاحب اسی وقت اٹھ کر۔ مصحفی کے پاس جا بیٹھے اور غزل ہاتھ سے پھینک کر کہا کہ یہ آپ ہمارے کلیجے میں چھریاں مارتے ہیں، نہیں تو اس لونڈے کا کیا منہ تھا جو ان قافیوں میں شعر نکال لیتا۔ خیر، اس قسم کی باتیں استاد کے ساتھ بچوں کی شوخیاں اور لڑکپن کے ناز تھیں" ص۲۹۵

ریاض الفصحا میں مصحفی نے آتش کے بارے میں لکھا ہے: "از ابتداے موزونی طبع کم کم خیال شعر فارسی و ہندی ہر دو میکرد و اما میلان طبعش بطرف فارسی بیشتر بود و آں روز ہا کلام .. خود را بنظر فقیر میگذرانید، حالانکہ سن عمرش بہ بیست و نہ سالگی رسیدہ .. در نظم ریختہ .. معاصرینش (را) سبقت بر و جستن دشوار می نماید، اگر عمرش وفا کردہ .. یکے از بے نظیران روزگار خواہد شد" ص۱۷ اور دیباچۂ دیوان ششم مصحفی میں جو ۱۲۲۱ھ یا ۱۲۲۲ھ کا لکھا ہوا ہے، یہ عبارت ملتی ہے: "چوں سلسلۂ موزوناں دراز کشیدہ، حصۂ نعمت الوان ایں خواں بہ .. ناسخ مقسوم گشت .. از قفایش قدم بر قدم او .. آتش ہم در رسید و سمند تیز گام خیال را از دائرہ چرخ اثیر بیروں برد" (یہ زمانہ ہو امعارف میں چھپ چکا ہے اور جلوۂ خضر میں بھی ہے) دیباچے میں مصحفی نے یہ بھی لکھا ہے کہ دیوان ششم کی اکثر غزلیں انھیں لوگوں کے طور پر ہیں۔ ریاض الفصحا کا زمانۂ تصنیف ۱۲۲۱ھ تا ۱۲۳۶ھ ہے اور آتش کا ترجمہ میری راے میں ۱۲۲۱ھ میں یا اس کے کچھ ہی بعد حوالۂ قلم ہوا ہے۔ ریاض اور دیباچے کی عبارتوں کے مقابلے سے اس نتیجے پر پہنچنا ناگزیر ہے کہ مؤخر الذکر کی عبارت زماناً مؤخر ہے۔ اگر اس کے خلاف باور کیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ "از .. برد" ایک کم عمر نومشق شاعر کے حق میں کہا گیا ہے۔ خود مصحفی کے بیان سے ظاہر ہے کہ استادی شاگردی کا سلسلہ زیادہ دن تک قائم نہیں رہا اور ترجمۂ آتش کے قلمبند ہونے سے پیشتر ہی منقطع ہو چکا تھا۔ اگر وہ واقعہ جو مصحفی نے لکھا ہے صحیح ہے تو اس کا زمانہ تحریر ترجمہ سے قبل ہے، لیکن کفن بگڑا دہن بگڑا کی زمین میں مصحفی کی غزل دیوان ہفتم میں ہے، جس کا زمانۂ تصنیف ۱۲۲۵ھ یا اس کے بھی کچھ بعد سے شروع ہوتا ہے۔ اس زمانے میں آتش و مصحفی میں استادی شاگردی کا تعلق باقی نہ تھا۔ اس

لیے حکایت جس طرح بیان ہوئی ہے، صحیح نہیں ہو سکتی، مگر دونوں میں کچھ نہ کچھ نزاع ضرور ہوئی۔ تذکرۂ (نسخۂ م) میں ہے:

"سچ تو یہ ہے کہ مصحفی سا استاد مسلم الثبوت کم ہوا ہے، مگر زمانۂ ناہنجار نے اس عزیز کو کیا کیا نہ رکھا۔ باوجود اس کے کہ امیران نامدار اس کے شاگرد تھے، کسی نے ہمت کے موافق اس کی کفالت خدمت نہ کی۔ بڑے تو بڑے چھوٹے سبحان اللہ! غریب جو اس کے شاگرد تھے اسے خیال میں نہ لاتے، بموجب اس کے:

کس نیاموخت علم تیراز من کہ مرا عاقبت نشانہ نکرد

چنانچہ اس غزل کی تیل دقال رنجش پر .. آتش کی دال:

اس کے بھی دھیان پر نہ چڑھا رنگ شاعری سبحان کو ہم سمجھتے رہے ننگ شاعری
دشمن پہ مارے منہ جو مرا مستفید ہو نہ یہ کہ میرے ساتھ کرے جنگ شاعری
ممکن نہیں کہ شہرت سعدی مٹا سکے خواجو کا شعر غلغلۂ رنگ شاعری

یہ غزل دیوان ششم میں ہے اور اس کے وہ اشعار جو نامر نے نقل نہیں کیے، یہ ہیں:

یہ بھی نئی پسند ہے لعل سخن کو چھوڑ گر اب کوئی پسند کرے سنگ شاعری
ہرگز سنا نہ میں کہ مبارک ہوا کبھی یوزان شیر گیر کو آہنگ شاعری
دم بند کر دیا مری تحریر کلک نے ان کا جویاں بجاتے رہے زنگ شاعری
بے عقل تیرے حق میں کہے کچھ تو مصحفی تو یہ سمجھ چڑھی ہے اسے بنگ شاعری

(۱۷) سرمہ منظور نظر ٹھیرا ہے چشم یار میں نیل کا گنڈا پہنایا مردم بیمار میں
آتش کا یہ شعر اسی طرح نقل کر کے لکھا ہے کہ ناسخ نے مشاعرے میں اس کی داد دی، لیکن اسے دہرا تے ہوئے یہ ترمیم کر دی کہ "ہے" کو "جو" اور "کا" کو "گوں" بنا دیا۔ آتش نے اٹھ کر سلام کیا اور کہا "جا استاد خالیست"۔ خود آزاد کو اس پر یہ اعتراض ہے کہ ردیف "میں" نہیں "کو" ہونی چاہیے (ص ۳۶۹)۔ حکایت بالکل دور از قیاس ہے، اور کلیات آتش مصححۂ مصنف، (مطبع محمدی لکھنؤ) یہ شعر (اور اس زمین میں آتش کی کئی غزلیں ہیں اور ابیات کی مجموعی تعداد ۵۸) اس طرح مرقوم ہے:
"سرمہ منظور نظر ٹھہرا (کذا) ہے چشم یار کو نیل کا گنڈا پنھایا مردم بیمار کو" ص ۱۴۸

(۲۲) یوں نزاکت سے گراں ہے سرمہ چشم یار کو جس طرح ہو رات بھاری مردم بیمار کو

ناسخ کا یہ مطلع کلیات صـ۲۲۲ میں اسی طرح درج ہے اور اس زمین میں ان کے ۱۴ اشعار ہیں۔ آزاد نے الف صـ۳۶ میں اسے اس فرق کے ساتھ کہ " سرمہ " " بار " پر مقدم ہے ، نقل کیا ہے ، لیکن صـ۳۶۹ میں آتش کے شعر پر اعتراض کرنے کے بعد فرماتے ہیں: " اس سے زیادہ تعجب شیخ صاحب کے مطلع کا ہے . . . :

یوں نزاکت سے گراں ہے سرمہ چشم یار میں　　جس طرح ہو رات بھاری مردم بیمار میں

یہاں بھی " میں " بے معنی ہے ، " پر " ہو تو ٹھیک ہے "

(۳۳) حکیم مہدی کی معزولی کی تاریخ ناسخ نے کہی " جس کا مادہ ہے " : " کاشو برائے بختن شلغم کریختہ " الف صـ۲۵۲۔ آزاد اس کے اعداد نکالنے کی زحمت گوارا کرتے تو انھیں یہ معلوم ہوتا کہ اس سے ۱۹۵۵ برآمد ہوتا ہے۔ سال مطلوبہ ۱۲۳۵ھ صرف " کریختہ " سے متخرج ہوتا ہے۔

(۴۴)　از جائے حکیم شست برگیر　　سہ مرتبہ نصف نصف کم کن

ناسخ کی کہی ہوئی تاریخ ہے " الف صـ۲۵۲ " مگر تاریخ مختشم (نسخۂ م ۲۲۸) سے جو ناسخ کے ایک معاصر کی تصنیف ہے ، معلوم ہوتا ہے کہ صاحب رائے کی طبعزاد ہے۔ اس میں اس کی ایک اور بیت بھی ہے :

افتاد حکیم از مراتب　　تاریخ بطرز نو رقم کن

(۴۵) ناسخ کی مثنوی سراج نظم کو صـ۲۵۴ میں دو جگہ نظم سراج لکھا ہے۔ (رجوع برائے تفاصیل بہ معاصر ۲ صـ۹۳)

(۴۶) " دیوان ۳ ہیں گر دو مشہور ہیں " الف صـ۲۵۶ یہ جاننا بڑی بات نہیں کہ ناسخ کے ۳ دیوان تھے ، سراپا سخن میں ایک نہیں کئی جگہ یہ مرقوم ہے (صـ۵۵ و صـ۹۹ وغیرہ) قابل ذکر بات یہ تھی کہ دیوان ۳ کلیات مطبوعہ کے دیوان ۲ میں شامل ہے۔ (نسخۂ مطبع مولائی صـ۱۸۰) ۔ یہ نسخۂ نول میں نہیں ہے ، اس کی طرف سب سے پہلے جناب ادیب لکھنوی نے لوگوں کی توجہ منعطف کرائی ہے۔

(۴۷) " قصائد کا شوق نہ تھا ، چنانچہ نواب لکھنؤ کی تاریخ و تہنیت میں کبھی کچھ کہا ہے تو بطور قطعہ ہے " الف صـ۳۵۳ مگر صـ۳۶۵ میں ہے کہ معتمد الدولہ آغا میر نے ناسخ کو سوا لاکھ روپے قصیدے کا صلہ دیا تھا۔

(۴۸)　ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دلگیر کو　　کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

الف صـ۳۶۱ میں بنام ناسخ اور یہ غلط ہے ، صـ۳۸۰ میں وزیر کے نام سے ہے اور یہ صحیح ہے۔

(۴۹) آتش نے ناسخ کی غزلوں پر متواتر غزلیں لکھیں تو ناسخ نے کہا :

ایک عالم کہہ رہا ہے میرے دیوان کا جواب　　بو مسیلم نے لکھا تھا جیسے قرآن کا جواب

اس کا جواب آتش نے یہ دیا۔

کیوں نہ دے ہر مومن اس ملحد کے دیوان کا جواب — جس نے دیوان اپنا ٹھہرایا ہو قرآں کا جواب (الصعا
تذکرۂ نادر میں ہے کہ میواارام مشائق، شاگرد آتش نے استاد کی حمایت کے بل پر ناسخ کی ہر غزل کا جواب
تو انھوں نے "ایک جاہل الخ" اور یہ شعر کہا

کیا کلیم اللہ سے نسبت ہو اس ناپاک کو — چاہیے فرعون کو دے اپنے ہامان کا جواب

آتش نے یہ مطلع کسی شاگرد کو کہہ کر دیا:

چاہئے مومن کو دے اس نا مسلماں کا جواب — جو کہے دیوان کو اپنے ہو یہ قرآں کا جواب

(۸۰) خلیق نے کہا تھا: "لیلاف پڑھی اور اسے دودھ پلایا" کسی نے ناسخ کو سنایا تو وہ بولے کہ یوں نہیں اس طرح کہا ہوگا: "پڑھ پڑھ کے لایلاف اسے دودھ پلایا" الف ص۳۸۶ ۔ "تنقید آب حیات" (دا حال (دہی ملے گا) میں ہے کہ آزاد نے ٹھیک نہیں لکھا، خلیق کے کلام پر ناسخ کی دو اصلاحیں مشہو ایک یہ اور دوسری یہ: خلیق: "اکبر علی اللہ نگہبان تمھارا" ناسخ: پیارے مرے اللہ نگہبان تمھارا ص۵ ۔ تذکرۂ نادر میں ہے کہ خلیق نے "لیلاف الخ" پڑھا، ناسخ نے اعتراض کیا، یہ بولے کہ وزن نہیں آتا، ناسخ نے وقت کیا ہے، یوں پڑھئے: "پڑھ پڑھ الخ"

(۸۱) مومن کے حال میں نہ ان کے دیوان فارسی کا ذکر ہے نہ مجموعۂ نثر فارسی کا حالانکہ یہ تصنیف الف ۔ بہت پہلے معرض طبع میں آچکا تھا ۔

(۸۲) اصغر علی خاں، اصغر، خلف عبداللہ خاں اور اصغر علی خاں، نسیم کو آزاد ایک سمجھتے ہیں الف ص۴۲۴ وہ یہ دونوں بالکل مختلف ہستیاں ہیں، نسیم کے والد کا نام آغا علی خاں تھا (سراپا سخن ص۱۹)

(۸۳) ذوق کا کلام سن کر دیوان چندو لال نے مصرع طرح بھیجا اور بلایا مگر نہ گئے، غزل البتہ روانہ کردی، مقطع میں

آج کل گرچہ دکن میں ہے بڑی قدرِ سخن — کون جائے ذوق پر دلّی کی گلیاں چھوڑ کر

دکن سے خلعت اور ... روپے آئے، مگر ذوق نہ گئے الف ص۴۸۸ ۔ دیوان ذوق، مرتبۂ آزاد ص۴۳ یہی، لیکن ص۱۱۹ میں ہے: "دیوان چندو لعل ... نے کئی ہزار روپے بھیج کر بلا بھیجا اور مصرع اپنا طرح کا بھیجا، حضرت ... نے زمین مذکور میں دو غزلہ کہہ کر بھیج دیا اور روپیہ نہ لیا" (غزل وہی جس کا ذکر میں ہے)

(۸۴) "استاد مرحوم کے بعد ذوق سخن اور ان (حکیم آغا جان، عیش دہلوی) کے کمال کی کشش نے کھینچ کر ان کو میں بھی پہنچایا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے چند روز بعد ... انتقال کیا" الف ص۴۹۴

مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم نے حکیم آغا جان، عیش دہلوی پر جو مضمون لکھا ہے مضامین فرحت حصہ میں شامل ہے۔ اس میں انھوں نے لکھا ہے کہ دیوان عیش میں ۱۲۸۶ھ کا ایک قطعہ موجود ہے، ظاہر ہے کہ

کہنا پر یہ کہا جاسکتا ہو کہ وفات اس سے پیشتر نہیں ہوئی۔ مرزا صاحب نے عیش کی پوتی سے جو ان کی وفات کے وقت خاصی جوان تھیں، پوچھ کر یہ بتایا ہے کہ عیش کا سال رحلت ۱۲۹۷ھ ہے۔ ص۱۸۳۔ اس کا مدار عمروں کے حساب پر ہے، اس لیے امکان ہے کہ اس میں برس دو برس کا فرق ہوگیا ہو۔ بہر حال، آزاد کے قول کا غلط ہونا ہر طرح ثابت ہے۔ عیش سے آزاد نے استفادہ کیا ہے، اور دونوں ہموطن ہیں، مگر آزاد ان کے صحیح زمانۂ وفات سے قطعاً ناواقف ہیں۔

(۸۵) "میانہ قد، خوش اندام، سر پر ایک ایک انگل بال سفید، ایسی ہی ڈاڑھی، اس گوری رنگت پر کیا بھلی معلوم ہوتی تھی۔ گلے میں ململ کا کرتہ، جیسے چنبیلی کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہو" الف ص۴۸۲۔ اسے سن کر بقول مرزا فرحت اللہ بیگ، عیش کی پوتی نے کہا تھا کہ آزاد نے "دادا جان کو دیکھا تھا یا جو جی میں آیا لکھ دیا؟" مضامین ص۱۶۵، پوتی کے بیان کے مطابق: "بہت اونچا قد، نہایت سرخ و سفید رنگ، نیچی گول بھروان ڈاڑھی، کتابی چہرہ منڈا ہوا سر، ستواں ناک، بڑی بڑی آنکھیں۔۔ ہمیشہ نیچی چولی کا انگرکھا پہنتے۔۔ کرتہ تمام عمر نہیں پہنا۔ جاڑے میں فرغل یا دگلہ۔۔ فرغل تو عموماً مومی چھینٹ کی ہوتی تھی، مگر دگلہ اکثر اونی کپڑے کا ہوتا تھا۔ ایک برکا پیجامہ پاؤں میں ٹھوان چوڑے پنجے کی ریشم کے کام کی جوتی، ہاتھ میں سبز رنگ کی جریب" ص۱۸۱

(۸۶) غالب کی قاطع برہان کا جواب ساطع برہان ہے اور جواب الجواب "نامۂ غالب" یہ آزاد کو معلوم ہے الف ص۹۴۰ لیکن اس کے باوجود فرماتے ہیں: "ساطع برہان کے اخیر میں چند ورق سید عبداللہ کے نام سے ہیں، وہ مرزا حبیب (غالب) کے ہیں" ص۵۲۱۔ ایک مخالف کی کتاب میں غالب کی تحریر ایک دوسرے شخص کے نام سے، کس طرح آگئی سمجھ سے باہر ہے۔ اس سے قطع نظر، کسی کتاب میں جو قاطع کی مخالفت یا موافقت میں لکھی گئی تھی، سید عبداللہ کا نام تک نہیں آیا۔

(۸۷) "سید حبیب دو تین قصیدے، چند قطعے، چند خطوط فارسی کے اس میں ہیں کہ دیوان میں درج ہوئے تھے" الف ص۵۲۱ اس میں رباعیات، غزلیات وغیرہ بھی ہیں اور خطوط سے یہ خالی ہے۔ سبد چیں پر میرا مقالہ معنت علی گڑھ میں شائع ہو چکا ہے۔

(۸۸) مؤید البرہان الف ص۵۱۹، صحیح مؤید برہان۔

(۸۹) ہرمز د زند یا زند کا عالم تھا الف ص۵۰۰۔ ہرمز وجود خارجی سے محروم تھا (میرا مقالہ "احوال غالب" میں ملاحظہ ہو) اگر اصلی شخص تھا جب بھی زند سے قطعی ناواقف تھا، اس لئے کہ وہ خود مقر ہے کہ یہ معدوم محض ہے۔ اسی بنا پر غالب ان فرہنگ نگاروں پر معترض ہیں جو لغات زند و زح فرہنگ کرتی ہیں۔ زند ہے ہی نہیں، تو یہ لغات کہاں سے آئے؟ (درفش کاویانی ص۱۳۸)

(۹۰) آزاد کا بیان ہے کہ سراپا سخن میں ایک جگہ دبیر کے والد کا نام مرزا آقا جان لکھا ہے اور دوسری جگہ غلام حسین

الف ص۳۳ھ ۔ سراپا سخن (طبع اول) میں صرف دو جگہ دبیر کے والد کا نام آیا ہے اور دونوں جگہ غلام حسین ہے ص۱۰۱ و ص۱۷۱ ۔

"تنقید آب حیات کے نام سے ایک رسالہ میر محمد رضا (ظہیر تخلص، خمخانۂ جاوید) کا لکھا ہوا ۱۳۱۲ھ میں یا اس کے کچھ بعد اردو پریس لکھنؤ میں چھپا تھا۔ مصنف کا دعویٰ ہے کہ میں "اکثر معاملات" دبیر" میں ۱۱ برس کے سن سے شریک رہا ہوں ص۲ ۔ آب حیات کی نسبت مصنف نے یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ اس کے بعض اغلاط "جہل مفرط کا نمونہ" ہیں اور اس میں جو "افترا و اختراع" ہے وہ "شان تذکرہ نویسی سے بعید بلکہ ابعد ہے" دبیر سے متعلق جو حکایات الف میں ہیں (ان کے بارے میں) ان کا قول ہے کہ الطاف ان کے لفظ لفظ پر "ہذا بہتان عظیم" کہہ اٹھتا ہے۔ ناموراشخاص کے دشمن ہوا کرتے ہیں۔ دبیر کے معاند "بھی تھے اور ہیں، لیکن "دکسی سے کبھی ان حکایات موضوعہ کا ایک حرف بھی نہیں سنا" ص۱۳ دبیر کے والد کے نام سے متعلق جو غلط بات آزاد کے قلم سے نکلی ہے، اس پر یہ بہت چراغ پا ہو گئے ہیں اور لکھتے ہیں کہ "آغا جان دبیر کے والد کا نام تو نہیں اس شخص کے باپ کا ہوگا جو اس کا مدعی قرار پائے ص۴ ۔

(۹۱) مصنف سراپا سخن کے متعلق آزاد کا قول ہے کہ یہ "ہر شخص کے باپ میں کچھ نہ کچھ طنز کا نکتہ نکال لیتے ہیں اس لیے (دبیر کے خاندان کے باب میں نہ یقین ہے نہ شک، الف ص۳۶ھ ۔ یہ اتہام محض ہے۔ سراپا سخن میں سیکڑوں شاعر کا ذکر ہے اور ممکن ہے کہ دو چار کے بارے میں طنزیہ بات کہی ہو، لیکن، دو چار کو "ہر شخص" کس طرح کہہ سکتے ہیں۔

(۹۲) دبیر "تباہی لکھنؤ کے بعد اول ۱۲۸۵ھ میں . . مرشد آباد . . گئے اور ہمیشہ الہ آباد اور بنارس میں جاتے رہے" الف ص۱۲ھ تنقید آبحیات ص۲ میں ہے کہ "مرشد آباد جانا کیسا" مرزا صاحب نے تا مدت العمر اس شہر کا نقشہ بھی کسی کاغذ پر کھنچا ہوا نہیں دیکھا" الہ آباد و بنارس کا حال مجھے معلوم نہیں مگر یہ قابل توجہ ہے کہ آزاد ان کے عظیم آباد جانے سے مطلقاً واقف نہیں، جہاں وہ تباہی لکھنؤ کے بعد آخر آخر تک (باستثنائے بعض سال) ہر سال جاتے رہے۔ تنقید آب حیات کا ص۲ بھی اس کا مؤید ہے۔

(۹۳) دبیر کا ابتدائی زمانہ تھا، استاد کی ایک اصلاح پسند آئی۔ ناسخ کے یہاں گئے "وہ اس وقت گھر کے صحن میں مونڈھے بچھائے جلسہ جمائے بیٹھے تھے" انھوں نے ناسخ کی رائے دریافت کی، ناسخ نے استاد کی تائید کی۔ دبیر نے کہا کہ "کتابوں میں تو اس طرح آیا ہے" ناسخ نے پھر وہی کہا جو پہلے کہا تھا۔ یہ بولے "حضرت" آپ کتاب کو ملاحظہ تو فرمائیں۔ ناسخ نے جھنجھلا کر کہا "ارے تو کتاب کو کیا جانے ہمارے سامنے کتاب کا نام لیتا ہے۔ ہم کتابیں دیکھتے دیکھتے خود کتاب بن گئے ہیں" "ایسے غصے ہوئے کہ لکڑی سامنے رکھی تھی وہ لے کر اٹھے، یہ بھاگے، انھیں بھی ایسا جوش تھا کہ دروازے تک ان کا تعاقب کیا ص۲۳ھ

"تنقید آب حیات میں ہے: "یہ روایت تو بہتان عظیم سے بھی اعظم ہے . . ابھی شل میرے اس زمانے کے

کچھ لوگ زندہ بھی ہیں اور وہ سب شاہد ہیں کہ.. مرزا صاحب .. اس محلے میں جہاں ناسخ .. رہتے تھے کبھی نہیں گئے اور نہ کہیں اور موقع مباحثہ و مکالمہ کا آیا۔ مجلسوں میں نواب حسین علی خاں عصر (اثر ۹) کے یہاں مرزا صاحب پڑھتے تھے، جناب شیخ .. سننے .. آتے تھے، بعد مجلس چلے جاتے تھے.. کبھی نوبت گفتگو.. نہیں آئی۔ ہاں، اتنی بات تھی کہ وہ تمام عمر متمنی رہے کہ مرزا صاحب ہماری ملاقات کو آئیں. مگر کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ وجہ یہ.. کہ ان کو.. مصحفی و.. ضمیر.. سے کمال عناد تھا.. تمام عمر ان کا یہ قول رہا کہ ہائے مرزا صاحب ذہین، ہونہار طبیعت دار اور شاگرد.. ضمیر کا! ادھر ان کا یہ قول کہ کجا ہمارے استاد اور کجا شیخ جی!"[۶]
آزاد نے اعتراض کے بعد بھی اپنی بیان کردہ حکایت کی سند نہ پیش کی ہو، تو قول معترض کو صحیح ماننے کے سوا چارہ کیا ہے، مگر بخوبی ممکن ہے کہ میر محمد رضا کے بیان میں بعض جزئی باتیں غلط ہوں۔

۹۴) مرزا دبیر کا "عالم شباب" تھا اور میر ضمیر کا بڑھاپا۔ نواب شرف الدولہ ضمیر سے "ہزاروں روپے کے سلوک کرتے تھے" ابتدا میں ان کی وجہ سے اور پھر خود دبیر کے کمال کے باعث ان کی بھی قدر کرتے۔ ان کی مجلس میں پہلے شاگرد اور اس کے بعد استاد پڑھا کرتے تھے۔ ایک موقع پر مرزا نے ایک مرثیہ لکھا جس کا مطلع یہ ہے:
"دست خدا کا قوت بازو حسین ہے" "ضمیر نے اسے پسند کیا اور" توجہ سے بنایا" اسے زمانے میں نواب کے یہاں ایک مجلس ہونے والی تھی، یہ خواہش ظاہر کی کہ میں اسے پڑھوں گا، دبیر نے اسے قبول کر لیا اور مرثیہ "انھیں کو دیدیا" گھر واپس ہوئے تو بعض احباب سے یہ بات کہی" مسودہ پاس تھا وہ بھی سنایا، کچھ تو یاروں کا چمکانا کچھ اس سبب سے کہ.. نواب کو خبر پہنچ گئی تھی، ادھر کے اشاروں میں انعام کی ہوا آئی۔ غرض انجام یہ ہوا کہ استاد مرثیہ صاف کرکے لے گئے کہ وہی پڑھیں گے۔" مجلس ہوئی تو پہلے دبیر منبر پہ گئے اور وہی مرثیہ پڑھا جو بہت کامیاب رہا۔ ضمیر ہمیشہ تعریفوں سے شاگرد کا دل بڑھایا کرتے تھے، مگر اس بار خاموش بیٹھے رہے۔ "فکر یہ کہ اب میں پڑھوں گا تو کیا پڑھوں گا اور اس سے بڑھ کر کیا پڑھوں گا جس میں استادی کا رتبہ بڑھے نہیں تو اپنے درجے سے گرے بھی تو نہیں۔ غرض ان کے بعد یہ پڑھے اور کمال کی دستار صحیح سلامت لے کر منبر سے اترے" ص۳۵،

میر محمد رضا نے لکھا ہے کہ شرف الدولہ دو تھے، ایک سنی جو غدر میں مارے گئے انھیں مجالس سے علاقہ نہ تھا، دوسرے نومسلم جو "شبیہہ روضۂ کاظمین کے بانی ہوئے" یہ مجلسیں کرتے تھے، لیکن" ان کی قدردانی کی تخصیص جو عبارت آزاد سے نکلتی ہے" حشو محض" ہے۔ ضمیر کے دوسرے مربی" دولت و حکومت میں ان سے کہیں زیادہ تھے" اصل واقعہ یہ ہے کہ ۱۹ رمضان کی مجلس کے بعد مہاراجہ میوہ رام مخاطب بہ افتخار الدولہ، نومسلم نے ضمیر و دبیر دونوں سے اکیسویں کی مجلس کے لئے نئے مرثیے کی فرمائش کی، اور دونوں نے بشرط فرصت ہوں ہاں کر دی۔ دبیر نے شب بھر میں ایک مرثیہ: "ذرہ ہو آفتاب در بوتراب کا"

تصنیف کر کے صبح کو استاد کی خدمت میں پیش کیا، دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ضمیر نے کوئی نیا مرثیہ دکھا تھا
ایک پرانے مرثیے کے مطلع کو بدل دیا تھا اور اس میں چند بند اور "لگائے تھے" ان کا ارادہ اسی کو پڑھنے کا تھا
دبیر نے عرض کی کہ آپ میرا مرثیہ پڑھیں، آپ ہی کا فیض ہے۔ ضمیر نے انکار کیا، لیکن، میر عابد علی، بشیر شاگرد
ضمیر نے جو دبیر سے نہایت حسد رکھتے تھے کہا کہ یہ نامناسب ہے کہ شاگرد نیا اور استاد پرانا مرثیہ پڑھیں۔
ضمیر بولے کہ "ایسی باتیں میرے ذہن میں نہیں، خیر۔ یوں ہی سہی۔" پھر پورا مرثیہ دیکھ کے کہا کہ "طولانی ہے،
بہتر یہ ہے کہ اول کا ٹکڑا۔۔ تم پڑھو اور اس بند کا نشان بھی بتلا دیا کہ یہاں تک اور وہاں، سے
تا آخر میں پڑھوں گا، مجلس کے دن دبیر نے کہا کہ میں نے نیا مرثیہ نہیں کہا، مگر استاد نے کہا ہے جس
کا ایک حصہ میں اور ایک حصہ خود وہ پڑھیں گے۔ دبیر منبر پر فاتحہ خوانی کر رہے تھے کہ بشیر نے
ضمیر سے "کچھ سرگوشی کی" اور کہا کہ پہلا ٹکڑا چست ہے اور دوسرا سست، میں دبیر کو منع کیے دیتا
ہوں کہ یہ نہ پڑھیں کوئی اور مرثیہ پڑھیں۔ ضمیر نے منع کیا، مگر اس کے باوجود انھوں نے دبیر کے پاس
آکر یہ بات ان سے کہی۔ دبیر نے جواب دیا کہ کوئی اور مرثیہ تو میں ساتھ لایا نہیں، تمھارے کہنے کا اعتبار
نہیں، استاد واقعی یہ چاہتے ہیں تو آنکھ سے اشارہ کریں میں کچھ رباعیاں پڑھ کر منبر سے اتر آؤں گا۔ بشیر نے ضمیر
سے جا کر کہا کہ دبیر کہتے ہیں کہ "آج ہی تو مجھ کو امتحان استاد کا مقصود ہے، دیکھوں میرے بعد استاد کیا
کرتے ہیں"۔ ضمیر یہ سن کر آگ ہو گئے، دبیر نے جب دیکھا کہ ضمیر اشارہ نہیں کرتے تو مرثیے کا وہ حصہ
جو ان کے لیے مقرر تھا پڑھ کر منبر سے اتر گئے۔ سامعین نے خوب داد دی، ضمیر منبر پر گئے تو یہ کہا کہ "یہ مرثیہ
انھیں کا ہے، میرا نہیں، اور پھر "کسی پرانے مرثیے کے چند بند نثر آمیز پڑھے" مگر رنگ نہ جم سکا۔ مجلس کے
بعد دونوں کے لیے خلعت آئے، ضمیر نے خلعت پر ٹھوکر مار کر کہا کہ اٹھا لے جاؤ، دبیر نے بھی "خلعت
پھیر دیا اور کہا کہ میں اس شخص کو ملعون جانتا ہوں کہ استاد کے فائدے پر اپنے فائدے کو مقدم رکھے"
"تذکرۂ ناصر" میں ہے: "استاد (ضمیر) اور اس (دبیر) میں جو بے لطفی ہے ایک بزرگ کی زبانی مختصراً
بیان کرتا ہوں۔ میاں دبیر اوائل میں ایک مرثیہ اصلاح کے واسطے میر ضمیر کی خدمت میں لائے، کہیں کہیں
اصلاح دی اور بہت پسند کیا، بلکہ فرمایا کہ یہ مرثیہ ہمیں دو کہ راجہ میوارام کے یہاں ہم پڑھیں۔ اس
نے کہا بہتر میں بھیج دوں گا۔ دبیر نے اس مرثیے کی دو نقلیں لیں، ایک بھیج دی، ایک اپنے پاس
رکھی۔ دوسری روایت میں یوں ہے کہ میر صاحب نے اس سے کہا کہ اس مرثیے کو راجہ میوارام کی مجلس
میں مت پڑھنا۔ جب مجلس کا دن آیا، میر صاحب مع دبیر تشریف فرما ہوئے۔۔ دبیر سے کہا منبر پر جاؤ اور
کچھ پڑھو۔ اس ناحق شناس نے سامعین کو ہمہ تن اشک دیکھ کر وہی مرثیہ پڑھا۔ رقت اور تعریف ایسی
ہوئی کہ میر ضمیر کے پڑھنے کی گنجائش نہ رہی اور خاتمہ اسی پر ہوا"

ضمیر کی دو روایتوں میں سے ایک نا تمام ہے، اس امر سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مرثیے کی ایک نقل رکھ لینے کے بعد دبیر نے کیا کیا۔ میرے نزدیک صاحب مقدمہ آب حیات نے جس طرح اسے بیان کیا ہے، زیادہ قرین قیاس ہے۔

(۵) شرف الدولہ کی مجلس کا واقعہ بیان کر کے لکھتے ہیں: "اس دن سے دل پھر گیا، یار لوگوں نے شاگرد کو نقطۂ مقابل کر کے بجائے خود استاد بنایا اور یہی صورت ہوگئی کہ ایک مجلس میں دونوں کا اجتماع موقوف ہو گیا۔ زمانے نے.. چند روز مقابلوں سے شاگرد کا دل بڑھایا، اور آخر بڑھاپے کی سفارش سے استاد کو آرام کی اجازت دی، وہ اپنے حریف میر خلیق کے سامنے گوشۂ عزلت کا مقابلہ کرنے لگے۔" (ص ۵۳۹)

میر محمد رضا کا بیان ہے کہ مجلس کے دوسرے دن دبیر ضمیر کے یہاں گئے تو کم اتفاقی" پائی۔ شب کو ان کی مجلس میں شریک ہوئے تو بشیر اور ان کے ساتھیوں نے "بلند آواز سے بھکنا شروع کیے" دبیر نے تحمل سے کام لیا، مگر بعد مجلس بدون رخصت اٹھ کھڑے ہوئے اور راہ میں میر محمد رضا سے بولے کہ "تم نے ان مفسدوں کی باتیں سنیں؟" انھوں نے کہا کہ آپ کچھ دیر اور ٹھہرتے تو "مجھ سے کہیں نہ کسی سے تلوار چل جاتی" دبیر نے کہا کہ " استاد کے گھر میں ایسی جسارت، توبہ کرو" دو تین برس" باہم گر حجاب رہا" ادھر ضمیر نے ایک نئے شاگرد، شہرت کو نئے مرثیے کہہ کر دینے شروع کیے اور وہ تیرھویں کی مجلس میں پڑھنے لگے۔ ادھر دبیر نے گیارھویں کی مجلس میں نیا مرثیہ سنانے کا التزام کیا۔ شہرت کی مجلس تو چند مہینوں میں بند ہو گئی لیکن دبیر کی مجلس "تا حین حیات" دبیر ہوا کی۔ استاد شاگرد میں ملاپ یوں ہوا کہ حضور عالم، نواب علی نقی خاں کے یہاں مجلس تھی، جس میں "اغلب ہے کہ حسب الطلب" ضمیر بھی موجود تھے۔ دبیر نے اپنا نیا مرثیہ " اے عرش بریں تیرے ستاروں کے تصدق" پڑھنا شروع اور نواب نے داد دی تو دبیر نے ضمیر کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ " یہ سب تصدق جناب استاد کا ہے۔" بعد ختم مرثیہ منبر سے اترے تو ضمیر نے " اٹھ کر گلے سے لگا لیا اور روئے.. اپنے گھر لے گئے۔ میر محمد رضا بھی ساتھ تھے۔ استاد شاگرد میں باتیں ہوئیں تو بشیر کی "مخطا ثابت ہوئی" ضمیر بولے کہ "یہ شخص اب اس لائق نہیں کہ ہمارے یہاں آئے" دبیر نے عرض کی کہ میری خطا کے ساتھ ان کی خطا بھی معاف ہو۔ ضمیر ساکت ہو گئے اور کچھ نادم سے نظر آئے" اس دن سے کبھی رنجش درمیان میں نہیں آئی۔ ضمیر اپنے دوسرے محل میں کہ وہ معالی خاں کی سرا میں واقع تھا مجلس کرتے تھے، اس میں دبیر ہمیشہ پڑھا کیے۔ بعد وفات ضمیر سوم کی مجلس بھی دبیر پڑھے۔ میر محمد رضا نے خاتمۂ بحث ان الفاظ پر کیا ہے: "آج وہ زمانہ ہے کہ ان دونوں.. میں سے کوئی باقی نہیں، صرف ان کا فسانہ باقی ہے یا وہ لوگ.. جو ان پر تہمتیں کرتے ہیں۔ فاعتبروا یا اولی

الابصار" ص۹ و مابعد، خلیق ۱۲۶۰ھ میں فوت ہوئے ہیں (معاصر حصہ ۱ ص۱۶۱) اور ضمیر کا سال وفات ۱۲۷۲ھ ہے (معاصر حصہ ۲ ص۲۳) یہ کہیں سے ثابت نہیں کہ ضمیر خلیق کی زندگی میں گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ غالب کے ایک خط میں مذکور ہے کہ "مولانا ضمیر" نے غالب کا ایک فارسی قصیدہ واجد علی شاہ کو سنایا تھا (کلیات نثر ص۱۲۱) ان کا سال جلوس ۱۲۶۳ھ ہے۔ تذکرۂ ناصر (سال اتمام ۱۲۶۲ھ) میں ہے کہ ضمیر "عہد نصیر الدین حیدر... سے تا حضرت اقدس و اعلیٰ معزز اور ممتاز"

) دبیر نے عالم جوانی میں ایک دھوم دھام کا مرثیہ لکھا "تازہ ایجاد یہ کیا کہ.. ایک بہادر پہلوان. میدان میں لائے۔ اس کی ہیبت ناک صورت بد صورت" آمد کی آن بان اس کے اسلحۂ جنگ. ان کے طلاقت قیاس مقادیر و وزن سے طوفان باندھے" اس کا شہر میں شہرہ تھا، "مطلب کی تحریکیں اس اسلوب سے ہوئی تھیں" کہ آتش بھی باوجود پیری اس مجلس میں جہاں یہ پڑھا گیا تھا، شریک ہوئے؛ لوگ تعریفوں کے غل مچاتے رہے، گریہ و بکا بھی خوب ہوا، مگر آتش خاموش رہے۔ بعد ختم مرثیہ دبیر آتش کے پاس آئے اور بولے کہ جو کچھ میں نے عرض کیا آپ نے سنا. فرمایا، ہوں، بھئی سنا۔ انھیں اتنی بات پر قناعت کب تھی، پھر کہا آپ کے سامنے پڑھنا گستاخی ہے، لیکن آپ نے ملاحظہ فرمایا؟ انھوں نے فرمایا، بھئی، سنا تو سہی مگر یہ سوچتا یہ ہوں کہ مرثیہ تھا یا لندھور سعدان کی داستان" الف ص۵۲۹

تنقید آب حیات میں ہے کہ یہ بالکل جھوٹی حکایت ہے، آتش نے ایک مجلس میں جہاں مصنف بھی تھے، دبیر کا ایک بے نقط مرثیہ سن کر یہ البتہ کہا تھا کہ "یہ صنعت اس بے تکلفی کے ساتھ آپ کا حصہ ہے" (ص۷ و ص۸)

) دبیر کا ایک بے نقط مرثیہ ہے جس کا "مطلع" ہے " ہم طالع ہما مراد ہم رسا ہوا" اس میں اپنا تخلص "بجائے دبیر۔ عطارد لکھا ہے" الف ص۵۴۴۔ یہ مرثیہ بقول میر محمد رضا اختر کا ہے، ان کا بیان ہے کہ دبیر بے نقط مرثیے میں عطارد کے علاوہ محرر تخلص بھی لاتے ہیں ص۸۔

) تاریخ وفات دبیر ۲۹ محرم ۱۲۹۲ھ الف ص۵۱۴ میر محمد رضا کہتے ہیں کہ "شب محرم صبح ہوتے وفات پائی (کذا) اور اسی روز کہ تیسویں محرم کی تھی.. دفن ہوئے" ص۷ مصنف حیات دبیر نے خمخانۂ جاوید جلد ۳ کے لئے دبیر کا حال لکھا ہے اس میں تاریخ رحلت "۳ محرم ۱۲۹۲ھ" (ص۱۵۸) درج ہے، لیکن یہ صریحاً طباعت کی غلطی ہے، اصل میں ۳۰ ہوگا۔ اودھ اخبار سے بھی ۳۰ محرم کی تصدیق ہوتی ہے۔ (معاصر ۱ ص۱۴۲)

) دبیر کی عمر ۷۰ برس الف ص۵۳۹ خمخانۂ جاوید میں تاریخ ولادت ۷ جمادی الاولیٰ ۱۲۱۸ھ مرقوم ہے (ص۱۵۳)۔ اس حساب سے وفات کے وقت ساڑھے ۷۳ برس سے کچھ زیادہ کے تھے۔ عمرا کے

سنین وفات آب حیات میں عیسوی نہیں دیے گئے، بالالتزام ہجری ہیں، اس لیے شمسی سال کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

۱۰) "مرثیوں کے بند چالیس پچاس سے زیادہ نہ ہوتے تھے، وہ ۱۵۰ سے گزر کر ۲۰۰ سے بھی نکل گئے۔ میر صاحب (یعنی انیس)... نے کم سے کم ۱۰ ہزار مرثیہ ضرور کہا ہوگا، اور سلاموں کا تو کیا شمار ہے، رباعیاں تو باتیں تھیں" الف ص۵۴۴۔ اگر بندوں کا اوسط سو فی مرثیہ رکھا جائے تو بندوں کی تعداد ۱۰ لاکھ اور ابیات کا شمار ۳۰ لاکھ تک پہنچتا ہے۔ سلاموں اور رباعیوں کی کیا تعداد آزاد کے ذہن میں تھی، اس کا علم خدا کو ہے۔

مجموعۂ مراثی جلد ۱ تا ۴ (نول) میں ۱۰۷ مراثی بہ تفصیل ذیل ہیں: جلد ۱: ۲۹، بند ۳۶۳۷، ابیات ۱۰۹۱۱، جلد ۲: ۲۷، بند ۳۳۱۷، ابیات ۹۹۵۱، جلد ۳: ۱۹، بند ۱۹۳۸، ابیات ۵۸۱۴، جلد ۴: ۳۲، بند ۲۶۲۹، ابیات ۷۸۸۷۔ ان مراثی کے ابیات کی مجموعی تعداد ۳۴۵۶۳ ہے۔

مجموعۂ مراثی جلد ۵ مطبع جعفری میں بہ اجازت میر نفیس چھپی تھی، (چونکہ میں نے مجلدات نول سے مقابلہ نہیں کیا، یہ نہیں کہہ سکتا کہ بالکل نئے مراثی ہیں یا نہیں)، اس میں ۲۱ مراثی (۲۲۸۷ بند، ۶۸۶۱ ابیات) ہیں۔ مجموعۂ مراثی جلد ۶ مطبوعۂ مطبع دبدبۂ احمدی میں بعض مراثی پرانے ہیں مگر یہ نسخہ نولکشوری میں نامکمل ہیں، اس میں مکمل، باقی ظاہراً نئے ہیں۔ اس کے مراثی کی تعداد ۳۳ ہے (۳۳۵۷ بند، ۱۰۰۷۱ ابیات ہیں)۔

مجلدات ۱ تا ۶ میں کل ۱۶۱ مراثی ہیں اور ان کے ابیات کی مجموعی تعداد ۵۱۴۹۵ ہے۔ کل سلام ان ۶ مجلدات میں ۲۷ ہیں (جلد ۱: ۴، جلد ۲: ۱۶، جلد ۳: ۱۳، جلد ۴: ۱۰۱، جلد ۶: ۳۰)۔ رباعیوں کی مجموعی تعداد ۳۰۹ ہے (جلد ۱: ۸۶، جلد ۲: ۴۳، جلد ۳: ۴۱، جلد ۴: ۱۲۶، جلد ۶: ۱۳)

یہ خوب ممکن ہے کہ انیس کا کل کلام معرض طبع میں نہ آیا ہو، لیکن آزاد نے جو کچھ لکھا ہے وہ مبالغے کی انتہا ہے۔[1]

---

[1] آزاد نے دبیر کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے "کم از کم ۳ ہزار مرثیہ کہا ہوگا، سلاموں اور نوحوں اور رباعیوں کا کچھ شمار نہیں" الف ص۵۴۴ اس سے ظاہر ہے کہ وہ انیس کو ان سے بہت زیادہ پُرگو سمجھتے ہیں، لیکن ص۵۴۹ میں "دبیری امت" کی زبان سے انیس پر یوں طعن کرتے ہیں: "کس کا منہ ہے جو رات کو بیٹھے اور سو بند کہہ کر اٹھے؟ برس دن تک خامہ فرسائی کی اور محرم پر دس پندرہ مرثیے لکھ کر تیار رکھے تو کیا کیے، وہ بھی دوا اور بھائیوں کے مشورے ملا کر اور مباحثوں کے پسینے بہا کر" "انیسی امت" کی طرف سے اس کا جواب یہ ہوتا تھا کہ انیس ایک رات میں... ۴۰ بند کہہ سکتے ہیں، لیکن وہ یہ نہیں کہتی، یہ جواب دیتی ہے: "درست ہے جو رات بھر میں سو بند کہتے ہیں وہ بے اصول اور بے ربط ہوتے ہیں اور جب ادائے مطلب پر آتے ہیں تو اتنے بھی نہیں رہتے" ص۵۴۹۔ انیس کی سالانہ پیداوار جسے "انیسی امت" نے اس کی تردید نہ کرکے قبول کر لیا ہے، زیادہ سے زیادہ ۱۵ ہے۔ انیس کی شاعری کی عمر ۵۰ سال مانی جائے، تو مراثی کی مجموعی تعداد ۷۵۰ ہوتی ہے۔

(۲)

دیوان ذوق مرتبۂ آزاد آب حیات کے بعد طبع ہوا تھا، لیکن پہلی بار
کس سنہ میں چھپا تھا، میں یہ نہیں بتا سکتا۔ سخندان فارس (= سخن) مطبوعۂ ۱۹۰۷ء کی تمہید
سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب پہلے پہل ۱۸۸۷ء میں "مطبع کے حوالے" ہوئی تھی۔ نگارستان فارس
(= نگار) وفات آزاد کے چند برس بعد منطبع ہوئی تھی؛ جناب آغا محمد طاہر، نبیرۂ آزاد کا
قول ہے کہ نسخۂ مطبوعہ کا حرف حرف آزاد کے مسودے کے مطابق ہے ص۲۳۶

---

(۱۰۱) "شمس ولی اللہ" آب حیات (= آب) ص۸۸۔ ولی کا نام ولی اللہ ہو یا ولی محمد یا محمد ولی، لفظ "شمس" ا[illegible]
جزو نہیں۔

(۱۰۲) مصحفی کے تذکرے میں ہے کہ "سنہ... محمد شاہی عہد میں ولی کا دیوان دکن سے دہلی میں آیا" آب ص[illegible]
"... دیوان.. سنہ محمد شاہی میں دلّی پہنچے" ص۹۲۔ مصحفی نے "سن دوم" لکھا ہے اور یہ نہیں بتا[یا کہ]
دیوان کہاں سے آیا تھا (تذکرۂ ہندی ص۸)۔ میں نے تذکرۂ ہندی کے متعدد خطی نسخے دیکھے ہیں، [کسی]
میں "دوم" ہے کسی میں "سوم" نہیں۔ ولی عہد محمد شاہی میں نہیں، سنہ ۴۴ عالمگیری میں دہلی گئے تھے
(مخزن نکات ص۱۰) اور یقین ہے کہ ان کا دیوان بھی سنہ ۳ محمد شاہی سے پیشتر وہاں پہنچا ہو۔ حاتم نے محمد [شاہ]
سے پہلے دیوان کا مطالعہ نہ کیا ہو، یہ البتہ ممکن ہے۔

(۱۰۳) ولی عروض سے ناواقف تھے آب ص۸۹۔ کلیات ولی سے اس کی شہادت نہیں ملتی، حروف کا دب کر [...]

---

۵۸ وفات ولی ۱۱۱۹ھ (ولی گجراتی ص۱۵)، آغاز عہد محمد شاہ ۱۱۳۱ھ۔ یہ قریب بیقین ہے کہ ولی عہد عالمگیر میں دہلی گئے تھے، لیکن [سنہ]
کی تعیین کا مدار صرف قائم کے قول پر ہے جو ولی کا معاصر نہیں۔

تقطیع میں بالکل ساقط ہو جانا ایسی بات نہیں جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ عروض سے بے خبر تھے۔

(۱) ولی عربی نہیں جانتے تھے آب صـ۸۹ـ۔ قرائن اس کے بالکل خلاف ہیں (ولی گجراتی صـ۸۳ـ)

(۱) مضمون کا اصلی وطن جاجمؤ "علاقۂ اکبرآباد" تھا آب صـ۱۰۱ـ۔ جاجمؤ ضلع کانپور میں ہے، وطن اصلی جاجو تھا جہاں معظم و اعظم کی جنگ ہوئی تھی۔ یہ اکبرآباد یا گوالیار سے متعلق ہے۔

(۱) یک رنگ باوجود "کہن سالی" و "کہنہ مشاقی" "آخر عمر" میں مظہر سے اصلاح لیا کرتے تھے، ان کا شعر ذیل اس پر مشعر ہے:

جس کے درد دل میں کچھ تاثیر ہے　　گر جواں بھی ہے تو میرا پیر ہے" آب صـ۱۰۲ـ

(الف) "جس کے درد الخ" میں مظہر کی طرف اشارہ ہے، یہ کسی طرح ثابت نہیں، ان کے ایک دوسرے شعر میں البتہ مظہر کا ذکر ہے، مگر تلمذ کا ثبوت اس سے بھی نہیں ملتا:

یک رنگ نے تلاش کیا ہے بہت ولے　　مظہر سا اس جہاں میں کوئی میرزا نہیں

(ب) شعرائے اردو کا کوئی تذکرہ نگار یک رنگ سے ذاتی واقفیت کا مدعی نہیں؛ قرینہ ہے کہ میر کے مستقل طور پر دہلی آنے سے پیشتر ہی ان کی شمع حیات گل ہو چکی تھی۔ سال ولادت و وفات درکنار، کسی تذکرے سے یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ کیا عمر پائی تھی۔ اس صورت میں قطعی طور پر یہ کہنا کہ یک رنگ و مظہر کی عمروں میں کیا تفاوت تھا، ممکن نہیں! قرائن البتہ اس پر دال ہیں کہ یک رنگ مظہر سے پانچ چھ برس بڑے تھے (ج) آزاد یہ نہیں بتاتے کہ یک رنگ مظہر سے قبل کس سے اصلاح لیا کرتے تھے (د) تلمذ مظہر کی کوئی قابل وثوق شہادت موجود نہیں، کسی نے یہ لکھا ہے تو "یک رنگ نے تلاش الخ" سے دھوکا کھا کر لکھا ہے (ہ) آرزو کی تنبیہ الغافلین کے جو عبارات صہبائی کی قول فیصل میں منقول ہیں، ان میں سے ایک شاگردی آرزو پر مشعر ہے صـ۱۳۹ـ اور مخزن نکات اس کا مصدق ہے صـ۱۰ـ

(۱۰) بل بے ساقی تیری بے پروائیاں　　جانیں مشتاقوں کی لب پر آئیاں

آب صـ۱۳۳ـ میں بنام سودا، لیکن، بیدار کا مطلع ہے (تذکرۂ ہندی صـ۳۵ـ، مجموعۂ نغز ا صـ۱۲۲ـ، انتخاب دیوان از حسرت صـ۹ـ)۔ آب میں مصرعوں کی ترتیب صحیح نہیں، "ساقی" بھی غلط ہے، "ظالم" چاہیئے۔

(۵) بے وفائی کیا کہوں تجھ سا تجھ محبوب کی　　تیری نسبت تو میاں بلبل نے گل سے خوب کی

آب صـ۱۳۴ـ میں سودا کی طرف منسوب ہے اور کلیات مطبوعہ جلد ا صـ۱۵۹ـ میں پوری غزل موجود ہے، لیکن کلیات کے معتبر خطی نسخے اس سے خالی ہیں۔ سوز کی جو بہت سی غزلیں سودا کے کلیات مطبوعہ میں داخل ہو گئی ہیں، انھیں میں سے یہ بھی ہے تفاصیل "آوارہ گرد اشعار" کی اس قسط میں ملیں گے جو نقوش لاہور میں شائع ہونے والی ہے۔ یہ غزل دیوان سوز مملوکۂ جناب علی حیدر میں شامل ہے۔

(۱۰۹) جو ستمگر ہیں کبھی وہ پھولتے پھلتے نہیں — سبز ہوتے کھیت دیکھا ہے کبھو شمشیر کا

آب ص۲۶۸ میں بنام ناسخ، لیکن، کلیات اس سے خالی ہے۔ شعر سودا کا ہے اور کلیات نوشتۂ ۹۳
میں جو میرے پاس ہے، بشکل ذیل میں موجود ہے:

جو کہ ظالم ہے وہ ہرگز پھولتا پھلتا نہیں — سبز ہوتے کھیت دیکھا ہے کبھو شمشیر کا

(۱۱۰) غلام ضامن "رتبے کے فاضل" مرزا فاخر، مکیں کے پاس شاگرد ہونے گئے، مگر وہ ان کے "عجز انکسار" کے باوجود، کج خلقی سے پیش آئے، ناچار یہ شعر پڑھ کر اٹھ کھڑے ہوئے:

مرزا مکین مانشود چوں بکمین — ما کین است جزو اعظم مرزا مکین ما" آب ص۱۹
نگار میں شعر کی اس شان نزول کو یکقلم نظرانداز کرتے ہوئے کسی سند کے بغیر لکھا ہے کہ نورالعین، لکھنؤ جا کر مکیں سے ملا، مکیں نے اس کے کلام پر" اعتراض اور اصلاحیں جا بیجا کرکے بنیاد لڑائی کی۔ واقف نے اس پر یہ شعر کہا ص۲۲۶ ۔ اس طریق کار سے پڑھنے والوں کو یہ فیصلہ کرنے میں کہ شعر واقعاً کس کا ہے، مطلق مدد نہیں مل سکتی۔ میری تحقیقات کے نتائج حسب ذیل ہیں: غلام ضامن کا ذکر تذکرۂ علمائے ہند، مصنفۂ رحمٰن علی میں نہیں؛ روز روشن (اواخر ۱۲۹۳ھ) کے ص۴۰۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ غلام ضامن، متخلص بضامن فارسی گو، مقیم لکھنؤ معقولات میں مستعد ان زمانہ سے تھے اور اسی کتاب کے ص۲۶۷ سے مستفاد ہوتا ہے کہ انھیں معتمد الدولہ آغا میر، وزیر غازی الدین حیدر و نصیرالدین حیدر سے توسل تھا۔ ضامن نے مکیں (متوفی ۱۲۲۱ھ) کا زمانہ پایا ہوگا، لیکن، آب میں جو حکایت ہے، کسی دوسرے ذریعے سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ دیوان واقف کے مطبوعہ نسخے (لاہور و نولکشوری) اور اس کے دو مخطوطات جو کتب خانۂ مشرقیہ پٹنہ (=م) میں ہیں، شعر زیر بحث سے خالی ہیں، لیکن یہ بات کہ مکیں نے واقف کے اشعار پر اصلاحیں دی تھیں، عبرت الغافلین (کلیات سودا ۲ ص۳۲۷) سے ثابت ہے اور شعر اس اختلاف کے ساتھ کہ "ما.. بکمین ما" کی جگہ" چرا نبود در کمین ما" ہے پھلواری ضلع پٹنہ کی ایک بیاض میں جس پر وصی احمد قادری کی مہر ہے اور جو اواسط ۱۳ کی مرتب کی ہوئی معلوم ہوتی ہے، موجود ہے، اور اس کے ساتھ یہ عبارت مرقوم ہے: "ہجو مرزا فاخر مکیں از نورالعین واقف"۔ دیوان انشا (م ۲ ورق ۶۲) کا قطعۂ ذیل بھی اس پر مشعر ہے کہ نورالعین نام کے ایک شخص نے مکین وکیں میں تعلق دکھایا تھا:

فاخر مکیں کا نام سن جو کین لاوے دھیان میں — ملعون کر چھوڑ دوں اسے تب دل کو میرے چین ہو
گر نقش جو لوح کھینچے تئیں کی تقدیر پہ — پورا لعیں پڑھے اسے جو شخص نورالعین ہو

(۱۱۱) "سودا کے عہد میں بھی اسی مادۂ فاسد (ایہام) کا بقیہ چلا آتا تھا، چنانچہ.. ایک قصیدے میں

ان بزرگوں (ایہام گویان عہد محمد شاہ) کی شکایت کی ہے" اس "قصیدے" کا یہ شعر بھی آزاد نے دیا ہے:

"سو نہ ہو پرورش شانہ تو پھر ہے موسل   رامپور کی ہو کٹاری تو کہیں سیتا پھل" آب ص۱۸۱

(الف) آزاد نے مخمس کو قصیدہ کہا ہے، اس کے ۳ بند (پہلا، تیسرا اور آخری) درج ذیل ہیں:

"کمال فن سخن کہتے ہیں اس کو اکمل   پرورش لفظ کی منظور ہو جس کو اوّل
پہ نہ یاں تک کہ عبارت ہی کو کر دے مہمل   اعتقاد ان کا ہے یوں وہ جو کئی ہیں اجہل
سو نہ ہو پرورش شانہ میں تو ہو موسل"

"ریش بابا جو سنی ہے کوئی قسم انگور   شانہ و دمہ بن اس کا وہ نہ لاویں مذکور
ربط الفاظ کو معنی سے نہ دیں تا مقدور   لف و نشر ان کو مرتب جو ہو کرنا منظور
رام پور کی یہ کٹاری لکھیں اور سیتا پھل

"عالم ربط میں کتا ان سے تو میرا یہ معاش   جا ہے دشنام کہا شعر سن ان کا شاباش
لیکن اب کیونکے انھوں کا نہ کروں پردہ فاش   بتندل کرنے جب ریختہ میرا تلاش
باندھیں اس فارسی میں وہ جو نہ ہو مستعمل" (کلیات ا ص۴۰۹)

(ب) آب میں جو شعر ہے اس کا ایک مصرع بند اول اور دوسرا بند ۳ سے لیا گیا ہے اور دونوں کا متن غلط ہے۔

(ج) اس مخمس کا مکیں سے تعلق ہے، ایہام گویوں سے اس کا کچھ سروکار نہیں (معاصر حصہ ا ص۲۷)

(۳۱) "خان آرزو کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا، سودا ان دنوں میں نوجوان تھے مطلع پڑھا:

آلودۂ قطرات عرق دیکھ جبیں کو   اختر پڑے جھانکیں ہیں فلک پر سے جبیں کو

"آرزو نے فوراً یہ شعر پڑھا کہ قدسی کے مطلع پر اشارہ ہے:

شعر سودا حدیث قدسی ہے   چاہئے لکھ رکھیں فلک پہ ملک
آلودۂ قطرات عرق دیدہ جبیں را   اختر ز فلک می‌نگرد روے زمیں را

سودا بے اختیار اٹھ کھڑے ہوئے، خان صاحب کے گلے سے لپٹ گئے اور اس فکریے کے ساتھ خوشی ظاہر کی گویا حقیقتاً خان صاحب نے ان کے کلام کو مثل حدیث قدسی تسلیم کیا ہے" آب ص۱۵۲

(الف) مجموعۂ نغز جلد ا کے ترجمۂ آرزو میں ہے: "روزے در مجلس مشاعرہ کہ در خانۂ خاں.. انعقاد مے یافت، .. سودا غزل.. قدسی را بطور خود ترجم ساختہ، برخواندن ہمت گماشت.. خاں تحسین بلیغ فرمود و دراثناے توصیف بدیہتہً بہ زباں.. جاری نمود کہ: "شعر سودا حدیث قدسی ہے لکھ رکھیں چاہئے فلک پہ ملک" مرزا بے اختیار برخاستہ بر سینۂ خاں چسپید و سخن بمزاح و

طبیت کشید" ص۲۵ (ب) مجالس رنگین میں "آلودہ" سے شروع ہونے والے دونوں شعر موجود ہیں اور سودا کے سرقے کی مثال میں پیش ہوئے ہیں ص۔ فارسی شعر کا مصنف کون ہے، رنگین نے یہ نہیں بتایا، صرف یہ کہا ہے کہ کسی استاد کا ہے۔ (ج) مشاعرے کا زمانہ قاسم نے معین نہیں کیا، اور نہ یہ لکھا ہے کہ سودا اس وقت نوجوان تھے۔ یہ آزاد کا اضافہ ہے جس کا انھیں حق نہ تھا۔ آرزو وفات صفدر جنگ (ذی الحجہ ۱۱۶۷ھ) کے بعد اودھ گئے ہیں، اس وقت در اصل سودا کی عمر ۵۰ کے لگ بھگ تھی اور خود آزاد کے قول کے مطابق بھی (۱۱۲۵ھ سال ولادت آب ص۱۴۵) ۴۰ برس سے زیادہ کی تھی۔ (د) قاسم نے غزل لکھا ہے، آزاد نے اسے بلا سبب مطلع بنا دیا ہے اور کسی سند کے بغیر یہ فرض کر لیا ہے کہ مجالس کا مطلع وہی ہے جو مشاعرے میں پڑھا گیا تھا (ہ) شعر آرزو کے مصرع ثانی کی ترتیب الفاظ آب میں غلط ہے (و) "مرزا بے اختیار.. کشید" اور "سودا بے اختیار. کیا ہے" میں بدیہی تفاوت ہے (ز) فارسی شعر قدسی کے دیوان مطبوعہ اور م کے کل مخطوطات دیوان سے غیر حاضر ہے اور آزاد اور ان کے مقلدین کے سوا کسی نے اسے قدسی سے منسوب نہیں کیا۔ (ح) کلیات سودا میں کوئی ایسی غزل نہیں جو قدسی کی غزل کا ترجمہ کہی جاسکے۔ یا تو سودا نے اسے شامل کلیات نہیں کیا، یا قاسم کا بیان ہی غلط ہے۔ (ط) میرا خیال ہے کہ "آلودہ.. را" ان اشعار میں ہے جن کی طرف سودا نے اپنے لامیہ مخمس کے آخری بند (رجوع بہ بحث ۱۱۱) میں اشارہ کیا ہے۔ مجالس سے قبل کی کسی کتاب میں میری نظر سے نہیں گزرا۔

(۱۱۳) بحوالہ عبرت الغافلین سودا: "حکیم بوعلی خاں، ہاتف بنگالہ میں" آب ص۱۴۶۔ سودا نے ہاتف کو "حکیم" نہیں لکھا، اور نہ کسی اور نے یہ کیا ہے۔ سودا کے یہاں بنگالہ نہیں، بنگلہ ہے (کلیات ا ص۳۷۶) جس سے فیض آباد مراد ہے۔

(۱۱۴) "خود سودا سے زباں بزباں روایت پہنچی ہے کہ جو غزل ("قصیدہ" بقول قاسم) فارسی ان کی ہجو میں.. ندرت کشمیری نے کہی اور مرزا نے اسے مخمس کرکے اسی پر الٹ دیا، اس کے مطلع پر.. آرزو نے مصرع لگادیے تھے، باقی تمام مخمس مرزا کا ہے" آب ص۱۵۲۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ آزاد نے یہ روایت خود کسی سے سنی تھی اور اس کا سلسلہ سودا تک پہنچتا تھا، مگر یہ مجموعۂ نغز (ا ص۲۷۶) میں موجود ہے۔ قاسم کی تمہیدی عبارت یہ ہے: "عزیزے صاف گو زبانی.. سودا نقل می کنند" مجمع النفائس (م ورق ۱۸۶، ترجمۂ سروری) کی عبارت ذیل میں ندرت ہی کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے: "شنیدہ ام یکے از اہل کشمیر اصطلاحات قدیمہ و جدیدہ می نویسد۔ جمیع مرکبات صراح اللغۃ و چراغ ہدایت را داخل نمودہ بزیر دامن دیانت (؟) پنہاں ساختہ، تا دیگرے

واقف بر آں نشود"۔ انڈیا آفس کے مخطوطات فارسی کی جلد ا میں عین عطا نوشتہ عطاء اللہ، دانشوخاں متخلص بہ ندرت کا حال مرقوم ہے جو ۱۱۶۲ھ میں تمام ہوئی تھی اور جس کے دیباچے میں سراج اللغۃ بہار عجم کا خاص طور پر بحیثیت ماخذ ذکر ہے۔ قاسم نے ندرت کا نام ہدایت اللہ لکھا ہے، لیکن صحیح عطاء اللہ ہی ہوگا اور یہی عین عطا ہے جو آرزو کے عتاب کا باعث ہوئی ہے۔

(۱۱۵) غنچہ سودا کے غلام کا نام تھا آب ص۱۵۴۔ اس کا ثبوت موجود نہیں۔

(۱۱۶) میر، پسر میر عبداللہ آب ص۲۰۳۔ یہ بات اواسط ۱۸۵۰ء سے قبل کسی نے نہیں کہی۔ ذکر میر ص۶۳ سے ثابت ہے کہ میر کے والد کا نام محمد علی تھا۔

(۱۱۷) میر میر عبداللہ کی پہلی بی بی سے تھے، وہ مرگئیں تو خان آرزو کی بہن سے شادی کی آب ص۲۰۳۔ آزاد کے بیان کی تردید کیلیے یہ کافی ہے کہ میر کے سوتیلے بھائی جو آرزو کے بھانجے میر سے بہت بڑے تھے (ذکر میر ص۵۹)

(۱۱۸) میر متوفی ۱۲۲۵ھ نے سو برس کی عمر پائی آب ص۲۰۷۔ نوادر الکملا کے اس اقتباس سے جو مقدمۂ کلیات میر نوشتۂ آسی مرحوم میں شامل ہے (ص۸ و ص۹) ثابت ہے کہ وہ ۱۱۳۵ھ میں پیدا اور نوے برس کی عمر میں فوت ہوئے تھے۔ اس کتاب کا اقتباس نہ بھی ہوتا تو ذکر میر اس کی تغلیط کے لئے کافی تھی کہ عمر سو برس کی تھی۔

(۱۱۹) کہن سال بزرگوں سے سنا کہ جب میر محمد تقی نے میر تخلص رکھا تو ان کے والد مانع ہوئے آب ص۲۰۳ ذکر میر ص۵۴ و ص۵۵ سے ثابت ہے کہ اپنے والد کی وفات کے وقت میر دس گیارہ برس کے تھے، اس وقت تخلص رکھنا خارج از بحث ہے۔

(۱۲۰) منت کے متعلق یہ معلوم ہوا کہ ان کا وطن سونی پت ہے تو میر نے کہا: "سید صاحب، اردوے معلی خاص دلی کی زبان ہے، آپ اس میں تکلیف نہ کیجئے، اپنی فارسی وارسی کہہ لیا کیجئے" آب ص۲۱۲۔ اس کی کوئی سند موجود نہیں۔ خود میر دہلوی نہیں، اکبرآبادی تھے، اور ان کے متعدد تلامذہ دہلوی نہ تھے۔ منت کا مولد بھی سونی پت نہ تھا، دہلی تھا (عقد ثریا)

(۱۲۱) سعادت یار خاں، رنگین شاگرد ہونے گئے، میر نے کہا: "آپ امیرزادے، میرزادے ہیں، نیزہ بازی تیراندازی کی کثرت کیجئے، شہسواری کی مشق فرمایئے، شاعری دلخراشی و جگرسوزی کا کام ہے، آپ اس کے درپے نہ ہوں"۔ بہت اصرار کیا تو بولے: "آپ کی طبیعت اس فن کے مناسب نہیں، آپ کو نہیں آنے کا۔ خواہ مخواہ میری اور اپنی اوقات ضائع کرنی کیا ضرور ہے؟" آب ص۲۱۴۔ اس کی بھی سند نہیں، اور خلاف قیاس ہے۔

(۱۲۲) معلوم ہوتا ہے کہ میرؔ کو تاریخ گوئی کا شوق نہ تھا۔ علیٰ ہذا القیاس مرثیہ بھی دیوان میں نہیں "آب حیات"
کلیات مطبوعہ میں مراثی نہیں، لیکن کلیات کے خطی نسخوں میں بکثرت مراثی ہیں، جن کا مجموعہ جناب
سید مسیح الزماں نے شائع کر دیا ہے؛ تفاصیل اس مجموعے کے مقدمہ میں ملیں گے۔

(۱۲۳) دعویٰ بڑا ہے سوزؔ کو اپنے کلام کا جو غور کیجئے تو ہے کوڑی کے کام کا

اس شعر کے متعلق لکھا ہے کہ دیوان سوز میں جو مثنوی ہے اس کے آغاز کا شعر ہے آب ص۱۹
شعر کا مثنوی سے کچھ تعلق نہیں، (معاصر ا ص۱۴۶)

(۱۲۴) کتر ین کا نام آب کے ص۱۱۲ میں دو جگہ میر خاں لکھا ہے، صحیح پیر خاں ہے (مجموعۂ نغز و عیار الشعرا)

(۱۲۵) مائل شاگرد قائم آب ص۲۰۸، لیکن خود قائم نے مخزن نکات میں انھیں قدرت کا شاگرد لکھا ہے ص
تلمذ قدرت کا ذکر ضروری تھا۔

(۱۲۶) "ایک دن اختلاط میں" فغاں کا کپڑا شجاع الدولہ کے ہاتھ سے جل گیا، یہ رنجیدہ ہو کر عظیم آباد چلا
آب ص۲۴۲۔ آزاد نے حوالہ نہیں دیا، لیکن انھوں نے یہ بات تذکرۂ ہندی سے لی ہے۔ آزاد
کے بیانات میں جو تفاوت ہے تذکرے کی عبارت ذیل سے ظاہر ہو گا: "بملازمت۔۔ شجاع الدولہ
رسیدہ یکے از مقرباں گردید۔ دریں حال نزدے (نزدیکی ؟) روزے نواب وزیر دستش را در
اختلاط از قفس سوختند، آب در دیدہ گردانید و ہیچ نگفت و آخر بایں حرکت آزردہ شدہ
بطرف عظیم آباد رفت" ص۱۴۰

(۱۲۷) ایک دن شتاب رائے نے از راہ طنز یا سادہ مزاجی فغاں سے کہا: "نواب صاحب ملکۂ زمانی کو
درانی کیوں کر لے گیا ؟" انھیں ناگوار ہوا، افسردہ ہو کر بولے: "مہاراج، جس طرح سیتا جی کو
لے گیا تھا اسی طرح وہ لے گیا" آب ص۱۲۶ ملکۂ زمانی محمد شاہ کی بی بی اور اس کی دوسری زوجہ صا
کی خالہ زاد بہن۔ مؤخر الذکر کی بیٹی حضرت محل سے احمد شاہ نے بجبر عقد کیا، تو یہ دونوں اپنی مرضی
حضرت بیگم کے ساتھ گئیں۔ (تاریخ عالمگیر ثانی مجہول المصنف م ۴ ۱ ۲ ۲ ص۲۲۰) آزاد کو حقیقت
نہ تھا، لیکن یہ بات شتاب رائے کے متعلق فرض نہیں کی جا سکتی۔ اس سے قطع نظر، وہ ایک شا
آدمی تھا، شاہی خاندان کی ایک خاتون کے بارے میں ایسی بات شاید ہی اس کی زبان سے نکل

(۱۲۸) ۱۲۷ میں جو سوال و جواب درج ہے اس کے متعلق لکھا ہے کہ فغاں نے اسی دن سے دربار جا
آب ص۱۲۷۔ فغاں و شتاب رائے کی ناچاقی کا حال آزاد کے سوا کسی نے نہیں لکھا۔ اس کی
اصلیت ہوتی تو عظیم آباد سے تعلق رکھنے والے تذکرہ نگار اس کا ضرور ذکر کرتے۔

(۱۲۹) ترجمۂ فغاں میں میاں جگنو سے متعلق جو شعر ہے (آب ص۱۲۵) وہ دیوان فغاں کے کسی نسخے:

اور آزاد نے شعر کے بارے میں جو حکایت لکھی ہے وہ بھی آب کے سوا کہیں نہیں ملتی۔

(۱۳۰) دیوان "میر حسن اب نہیں ملتا" آب ص۲۵ دیوان غزلیات وفات آزاد کے بعد طبع ہوا ہے، لیکن تلاش کرتے تو انھیں بکثرت خطی نسخے ملتے۔ مجھے پندرہ سولہ نسخوں کے وجود کا علم ہے اور ان میں سے حسب ذیل میری نظر سے گزرے ہیں: کتب خانۂ رضائیہ کے دو نسخے، ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کا نسخہ، نسخۂ ناقص جدید العہد ملک راقم، نسخۂ دوم، نسخۂ جناب زکی الحق پٹنہ، عکس نسخۂ برٹش میوزیم۔

(۱۳۱) مصحفی نے "دو تذکرے شعرائے اردو کے لکھے .. ایک .. فارسی کا" آب ص۳۱۱ "تذکرے خوب لکھے ہیں.. اور ان میں اپنے کل شاگردوں کی بھی فہرست دی ہے" ص۳۱۳، ترجمۂ ناسخ میں لکھا ہے کہ "تلمذ مصحفی والی روایت" قابل اعتبار نہیں، کیونکہ انھوں نے اپنے تذکرے میں تمام شاگردوں کے نام لکھ دیے ہیں، ان کا نام نہیں، ص۳۴۶

(الف) آزاد نے عقد ثریا یقیناً اور تذکرۂ ہندی غالباً دیکھا تھا، لیکن ریاض الفصحا ان کی نظر سے گزرا ہو اس کا کوئی قرینہ نہیں۔ یہ بات کہ دو تذکرے شعرائے اردو کے ہیں۔ سراپا سخن ص۵۴ سے ماخوذ ہے، لیکن، ریاض عقد ثریا و تذکرۂ ہندی کا تکملہ ہے اور اسے اردو فارسی دونوں سے تعلق ہے (ب) یہ صحیح نہیں کہ مصحفی کے تذکرے میں ان کے تلامذہ کی فہرست ہے، ان کے تذکروں میں کسی کا ذکر نہ آنے سے لازماً یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ وہ ان کا شاگرد نہ تھا۔ وہ آخری تذکرے کی تکمیل کے بعد بھی زندہ رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس کے بعد جو شعرا حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے ہیں، ان کا نام ان تذکروں میں بحیثیت شاگرد نہیں ہو سکتا۔

(۱۳۲) چالیس برس کا ہے چالیس کے لائق — تھا مرد معمر کہیں دس بیس کے لائق
استاد کا کرتے ہیں امیراب کے مقرر — ہوتا ہے جو دربان کہ سائیس کے لائق

مصحفی سلیمان شکوہ کے استاد تھے اس علاقے کا خاتمہ ہوا اور چند روز بعد تنخواہ گھٹی تو مصحفی نے یہ اشعار کہے۔ آزاد نے ان کے علاوہ اس زمین کے دو اور اشعار دیے ہیں آب ص۳۱۷ مصحفی سلیمان شکوہ کے استاد نہ تھے، اور یہ اشعار ان کے یہاں سے برطرف ہونے کے بعد بہت بعد کے ہیں، ان کا ان اشعار سے کچھ سروکار نہیں (مصحفی و انشا از راقم۔ اردو ادب)

(۱۳۳) جرأت نے "زبان فارسی کی طرف خیال بھی نہ کیا" آب ص۲۴ انیس الاحبا (نسخۂ دوم) فارسی گویوں کا تذکرہ ہے جو جرأت کے ایک معاصر نے لکھا ہے، اس میں ان کے فارسی اشعار موجود ہیں، از آں جملہ:

تنہا نہ دل ز عشق تو بیتاب گشتہ است — چنداں گریستم کہ دلم آب گشتہ است

بے روے تو اسے سر دلم آرام ندارد — ایں صبح فراق تو مگر شام ندارد
کس نیست در جہاں کہ دو کس را یکے کند — عشق است اینکہ شعلہ دو خس را یکے کند

(۱۲۴) "جرأت نے قصیدہ وغیرہ اقسام شعر پر ہاتھ نہ ڈالا" آب ص۲۸۹ شاید ہی کوئی قسم شعر جس میں جرأت کے معاصرین کا کلام موجود ہے، ایسی ہو جس کا نمونہ کلیات جرأت میں نہیں؛ غزل، قصیدہ ترکیب بند، ترجیع بند، مخمس، مثنوی، رباعی، قطعہ، واسوخت، ریختی، مرثیہ سب کچھ ان کے یہاں ملتا ہے تین قصیدے جو کلیات مملوکۂ ریاض حسن خاں خیال مرحوم میں جو اب غالباً ان کے بھتیجے جناب احمد حسن خاں کے پاس ہے، شامل ہیں، ان کے افتتاحی مصرع یہ ہیں: "بھلا بشر کی پھر اوقات کا ہو کیونکہ نباہ" "کھلے گی آبلۂ دل کی ایک بار گرہ" "فلک سے زمیں ..ل جا" (آخری مصرعہ میری بیاض میں ٹھیک نقل نہیں ہوا)۔

(۱۲۵) "مثنوی مادۂ عالی.. اگرچہ وہ بڈھے ہوکر بھی بچوں سے آگے دوڑتے تھے، مگر یہ بھی اوائل عمر کی معلوم ہوتی ہے" آب ص۲۷۵ یہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں، خود مثنوی سے معلوم ہوتا ہے کہ سعادت علی خاں کی مسند نشینی (۱۲۱۲ھ) بعد کی ہے، اس وقت انشا اپنی عمر کے پانچویں عشرے میں تھے۔

(۱۲۶) آزاد نے نشاط کا قطعہ نقل کیا ہے جس سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ انشا ۱۲۳۳ھ میں فوت ہوئے تھے آب ص۲۶۹ یہ قطعہ کہیں اور نہیں ملتا، آزاد کو یہ بتانا تھا کہ انھیں کہاں ملا۔ اس سے قطع نظر، مصحفی کے ایک قطعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سال وفات ۱۲۳۲ھ ہے ("مصحفی و انشا")؛ میرے نزدیک یہی مرجح ہے۔

(۱۲۷) ناسخ نے پہلے پہل مشاعرے میں غزل پڑھی تو اس وقت مُنظر و گرم زندہ تھے اور مرزا حاجی، قتیل اور حاجی محمد صادق خاں، اختر نے بڑی قدر دانی کی آب ص۲۷۷ (بروایت رقمی) مُنظر کا سال وفات ۱۲۱۷ھ ہے (معاصر حصہ ا ص۱۵۹)، اس بنا پر ابتدائی غزلخوانی کا زمانہ ۱۲۱۷ھ یا اس سے کچھ پیشتر ہے اور یہ قرین قیاس بھی ہے، اس لیے کہ مصحفی کے دیوان ششم کے دیباچے کی تحریر سے قبل ہی ناسخ کی استادی مسلم ہو چکی تھی، لیکن، قریب بہ یقین ہے کہ اختر اس وقت لکھنؤ میں نہ تھے، اور ہوں بھی تو ان کی عمر اتنی کم تھی کہ ان کی تعریف کا کوئی خاص وزن نہیں ہو سکتا تھا۔ اختر کا سال پیدائش ۱۲۱۰ھ ہے (معاصر ا ص۱۰۷)۔ "حاجی محمد صادق خاں اختر" میں "حاجی" یا جامع کی غلطی ہے، یا آزاد کا سہو، "حاجی" کہیں اور نہیں ملتا، سب انھیں "قاضی" لکھتے ہیں۔

(۱۳۸) ناسخ کے خطوط کسی نے چرا لیے تو تاریخ کہی: " سیاہ باد روے حاسدِ من " آبِ حیات ص۳۴۹
آزاد نے یہ نہیں لکھا کہ اس سے کون سا عدد نکلتا ہے ، وہ اگر اس پر غور کرتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ
اس سے ۱۲۸۶ مستخرج ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس سے ناسخ کی زندگی کے کسی واقعے کا تعلق نہیں ہو سکتا۔
کلیات (مطبع مولائی ص۲۵۲) میں "حاسدِ من" کی جگہ "آں خائنِ " ہے اور اس صورت میں ۱۲۳۵ برآمد
ہوتا ہے اور یہی کلیات میں مرقوم ہے۔
(۱۳۹) " پھر چار خط جانے سے ، تاریخ کہی مصرع: صد حیف تلف چہار نامہ " آب ص۳۶۸ ۔ کلیات ناسخ میں
یہ اور اس سے قبل والی تاریخ یکے بعد دیگرے درج ہے اور اس کے ساتھ بھی ۱۲۳۵ مرقوم ہے۔
مادۂ تاریخ آزاد نے غلط لکھا ہے ، قطعہ یہ ہے:

ز سود یکفتہ ہزار خاسرا ہے واے — ہم ریخت پر و بال حامہ اے واے
گفتند چو خط تلف بگفتم تاریخ — صد حیف تلف چہار نامہ اے واے

قطعات کی بنا پر یہ کہنا ممکن نہیں کہ ایک ہی واقعے کی دو تاریخیں ہیں ، یا ان کا دو مختلف واقعات
سے تعلق ہے۔ " صد حیف تلف چہار نامہ " سے ... نکلتا ہے " صد حیف... اے واے " سے
۱۲۳۵ مستخرج ہوتا ہے۔ دو سو کی کمی کس طرح پوری ہو سکتی ہے ، اس کا پتا نہیں چلتا۔
(۱۴۰) ناسخ کو " قصائد کا شوق نہ تھا ، چنانچہ نواب لکھنؤ کی تاریخ و تہنیت میں کبھی کچھ کہا ہے تو قطعہ ، " آب
ص۳۵۳ " وہ قصیدہ کہتے تو خوب کہتے مگر .. اس طرف توجہ نہ کی " ص۳۵۴ مگر ص۳۶۸ میں قصیدے
کا صلہ پانے کا ذکر ہے ، اور ان کا ایسا قصیدہ جو کلیات مطبوعہ میں شامل نہیں ، جناب مسعود حسن
رضوی کی نظر سے گزرا ہے جیسا کہ انھوں نے اپنی کتاب (متعلق آب) میں لکھا ہے۔ کلیات میں مدح
و تہنیت کی ایسی نظمیں موجود ہیں ، جن کے ابیات میں کوئی خاص ربط نہیں اور یہ مثنوی یا غزل
کی شکل میں ہیں (ص۳۴ ص۳۴ وغیرہ)
(۱۴۱) مرزا حاجی " نہایت رسا اور .. باتدبیر شخص تھے .. سعادت علی خاں اور .. رزیڈنٹ کے
درمیان واسطہ ہو کر اکثر مقدمات سلطنت کو رو براہ کرتے تھے ، لاکھوں .. کی املاک بہم پہنچائی
تھی .. اپنے گھر میں بیٹھے اہلِ عالم کو امیرانہ شان دکھلاتے تھے " آب ص۳۴۵ ۔ آزاد نہ یہ جانتے ہیں
کہ مرزا حاجی کون تھے اور نہ انھیں اس کی واقفیت ہے کہ ان کے اور ناسخ کے کیا تعلقات تھے۔ ان
کے والد مرزا جعفر کو رزیڈنٹ سے توسل تھا ، خود یہ سعادت علی خاں کے زمانے میں چنداں
اہمیت نہیں رکھتے تھے ، ان کے بعد البتہ کچھ دنوں ان کا عروج رہا۔ کمال الدین حیدر قیصر التواریخ
میں لکھتے ہیں: " نواب (آغا میر) نے .. ناسخ .. جو مرزا (حاجی) مرحوم کے رازِ مقرب خاص تھے

اوران کا فروغ و رشد سارا شہر جانتا ہے کہ ان کے گھر سے.. حاصل ہوا لطبع دنیا.. موافق و متوسل کیا، انھوں (ناسخ) نے کبھی ندامت سے ہاتھ اٹھایا اور بظاہر حیلۂ آبرو ریزی حاکم وقت سے جان کر آمد و رفت بالکل مرزا کے پاس آنے کی ترک کی، اس کے سوا اپنا رسوخ سمجھ کر درپے تخریب اپنے ولی نعمی (مرزا حاجی) ہوئے" ص ۶۹

(۲۳) ہندوستانی الہ آباد (بابت جنوری و اپریل ۱۹۴۷ء) میں شیرانی کا ایک مقالہ "دیوان ذوق میں مولانا آزاد کے اضافے" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس میں انھوں نے آزاد کے لکھے ہوئے کاغذات کی بنا پر جو انھیں آغا محمد باقر سلیمانی، نبیرۂ آزاد سے ملے تھے، یہ دعویٰ کیا ہے کہ دیوان ذوق، مرتبۂ آزاد کی ۱۴ غزلیں جن کے ابتدائی مصرعے ذیل میں درج ہیں، خود آزاد کی طبعزاد ہیں۔ بعض کاغذات کے بلاک بھی مقالے میں شامل ہیں۔ اس مقالے کے مطالعہ کے بعد یہ ممکن نہیں کہ کوئی انصاف پسند شخص ان سے اختلاف کرے: "ہم سے ظاہر و پنہاں جو اس غارت گر کے جھگڑے ہیں" (دیوان طبع ۱۹۲۲ء ص ۱۳۷) "خدا نے میرے دیا سینہ لالہ زار مجھے" ص ۲۲۶ "مرض عشق جسے ہو اسے کیا یاد رہے" ص ۲۲۶ "چشم قاتل نہیں کیونکہ نہ بھلایا درہے" ص ۲۲۷ "تدبیر نہ کر فائدہ تدبیر میں کیا ہے" ۲۲۸ "پھر یہ وا سے ستگر بیشتر ایسے نہ ہوتے تھے" ص ۲۲۹ "نہ کھینچو عاشق تشنہ جگر کے تیر پہلو سے" ص ۲۲۹ "برق میرا آشیاں کب کا جلا کر لے گئی" ص ۲۳۰ "تدر رقم سے وصف جبیں ہے صنم پر ہے" ص ۲۳۱ "ذکر مژگاں جس کا تیرے رو برو نکلا کرے" ص ۲۳۱ "خم ابرو ترا جب یار نظر آتا ہے" ص ۲۳۲ دکھلا نہ خال ناف تو اے گلبدن مجھے" ص ۲۳۲ "مار کر تیر جو وہ دلبر جانی مانگے" ص ۲۳۵ "نہ دیں گواہی جو داغ کہن نہیں دیتے" ص ــــــ ۱۴ غزلوں کے متعلق تو ثبوت موجود ہے، آزاد کے مرتبہ دیوان ذوق میں خود ان کا اور کلام بھی ہو تو تعجب نہیں۔

(۴۳) شیرانی اسی مقالے میں جس کا ذکر ۲۴۲ میں آیا ہے لکھتے ہیں: "غزل اول، اس غزل کے واسطے مولانا فرماتے ہیں: "عالم شباب کی غزل ہے.. بادشاہ کو پسند آگئی تھی.. کشش کی مقاطیس بہت ہی لگائی مگر استاد نے کبھی نہیں چھوڑی۔ حکیم احسن اللہ خاں.. بڑے مقرب تھے.. انھیں یہ غزل بہت پسند تھی، حضور کے سامنے انھیں کی زبان سے نکل گئی تھی (دیوان.. ص ۱۳۷)۔ بیانات بالا میں سے ایک پر بھی مہر تصدیق نہیں لگائی جا سکتی۔ مولانا.. عالم شباب کی نوشتہ بتاتے ہیں، ساتھ ہی یہ بھی لکھتے ہیں کہ بادشاہ کو پسند تھی۔ اس حساب سے.. تخت نشینی کے بعد لکھی گئی ہوگی۔ یہ مان کر کہ پہلے سال جلوس ۱۲۵۳ھ میں لکھی گئی تھی، ذوق کی عمر اس وقت ایک کم پچاس برس کی ہونی چاہیے.. یہ.. شیب کا زمانہ ہے، نہ شباب کا.. غزل کے مقطعے میں بادشاہ پر صاف صاف حملہ ہے، اگر حکیم

احسن اللہ خاں چاہتے بھی تو بادشاہ تک پہنچانے کی جرات نہ کر سکتے تھے۔ نہ غزل ایسی اعلیٰ پائے کی ہے کہ جس کے واسطے بادشاہ اور ذوق کے درمیان رسا کشی ہوتی، لیکن، بادشاہ مانگتے کہاں سے اور استاد دیتے کہاں سے، جب اس زمانے میں اس غزل کا وجود ہی نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس .. کے مصنف خود .. مولانا ہیں .. اس دعوے کے ثبوت میں وہی کاغذ جس پر مولانا نے .. اس کا مسودہ اپنے خط میں تیار کیا ہے پیش کیا جا سکتا ہے .. س .. کو نہ شعروں کا بلاک جس میں مقطع بھی آگیا ہے، یہاں شامل کر دیا گیا ہے۔ مقطع میں .. حسب معمول ظفر کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے .. یہ صرف ۹ شعر کی غزل ہے لیکن ۲۴ جگہ بنظر درستی و اصلاح اس پر قلم پھیرا گیا ہے اور ہر تبدیلی پہلی تبدیلی سے بہتر و روشن تر ہے۔ اگر اس کو مسودہ نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے؟" مقطع یہ ہے:

ذوق مرتب کیونکے ہو دیواں شکوۂ فرصت کس سے کریں
باندھے گلے ہیں ہم نے اپنے آپ ظفر کے جھگڑے ہیں

(۴۴) جس ہاتھ میں خاتم لعل کی ہے گر اس میں زلف سرکش ہو
پھر زلف بنے وہ دست موسیٰ جس میں اخگر آتش ہو

آزاد آب حیات میں لکھتے ہیں: ذوق نے نصیر سے اصلاح لینی بند کر دی تھی، لیکن، آمد و رفت جاری تھی کہ ایک دن ذوق نے غزل جا کر سنائی جس کی نصیر نے تعریف کی اور جیسے مشاعرے میں پڑھنے کے لئے کہا۔ مشاعرے میں مطلع ان کی زبان سے نکلا ہی تھا کہ نصیر نے آواز دی، بھئی، میاں ابراہیم، مطلع بھئی، میاں ابراہیم، مطلع تو خوب کہا" ذوق کا بیان ہے کہ اس وقت مجھے کھٹکا ہوا کہ "مطلع کے سرے پر سبب خفیف کی کمی ہے اور ساتھ ہی لفظ بھی سوجھا" پہلے انھوں نے مصرع اول "جس" کے بغیر پڑھا تھا دوبارہ پڑھا تو اس لفظ کا اضافہ کر دیا۔" اس پر اس قدر حیرت ہوئی کہ انھوں نے جانا شاید پہلے عمداً .. چھوڑ دیا تھا، مگر اعتراض ہوا کہ "یہ بھرنا جائز ہے" ذوق نے جواب دیا کہ "وا بحریں آسمان سے نہیں نازل ہوئیں .." یہ تقریر مقبول نہ ہوئی مگر پھر منیر مرحوم (پسر نصیر) نے اس پر غزل کہی، [illegible]
اس حکایت سے نصیر کی عداوت تو ظاہر ہے لیکن اس میں بڑی قباحت یہ ہے کہ "جس" کا چھوٹ جانا محض عروضی سقم نہ تھا، نظم کی جگہ نثر بھی ہوتی تو اس لفظ کا وجود ضروری تھا۔ آزاد کی نظر اس پر کس طرح پڑی، اس کا پتا نہیں، لیکن دیوان ذوق میں انھوں نے اس واقعے کو دوسری طرح بیان کیا ہے، چاہئے تھا کہ آب کی عبارت بھی بدل دی جاتی اور دیوان و آب دونوں میں صراحتہً بتایا جاتا کہ حکایت کی نئی شکل کہاں ملی اور پرانی پر اسے ترجیح دینے کی وجہ کیا ہے، لیکن، آزاد اس سے قاصر ہے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ ترک اصلاح کے بعد آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا کہ ذوق نے ۲ غزلیں جا کر سنائیں نصیر

نے دوسری کی خاص طور پر تعریف کی اور کہا کہ مشاعرے میں اسے پڑھنا۔ مشاعرہ ہوا تو طرحی غزل سنانے کے بعد ذوق نے نصیر سے کہا: "اجازت ہو تو فرمایش کی تعمیل کروں" اور ان کے ہاں کہنے پر دوسری غزل کا پہلا مطلع پڑھا۔ اس کے مصرعے دوم کی ابتدا میں لفظ "پھر" چھوٹ گیا تھا، نصیر نے معمول سے زیادہ تعریف کی اور مطلع پھر سنانے کو کہا تو انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور دوبارہ پڑھا تو لفظ "پھر" اپنی جگہ پر موجود تھا۔ نصیر "خوش ہو گئے" اور لوگوں کو خیال ہوا کہ پھر کا حذف شوخی طبع کی بنا پر تھا، مگر حقیقت یہ تھی کہ "آپ ہی چوٹ کھائی آپ ہی اس کا توڑ کیا۔" ص۱۷۲۔ دونوں شکلوں کے اختلافات حسب ذیل ہیں: (الف) پہلی کے راوی ذوق ہیں، گو آزاد نے یہ نہیں بتایا کہ انھیں بلاواسطہ معلوم ہوئی تھی یا بالواسطہ۔ دوسری کے راوی کا مطلقاً ذکر نہیں (ب) پہلی میں صرف ایک غزل کا ذکر، دوسری میں دو (ج) پہلی میں نصیر سے اجازت اور ان کی فرمایش کی طرف اشارہ نہیں، دوسری میں ہے۔ (د) پہلی میں صراحتاً مرقوم ہے کہ مصرع اول میں لفظ "جس" چھوٹ گیا تھا، دوسری میں مصرع دوم سے لفظ پھر کے حذف ہو جانے کا ذکر ہے اور مصرع اول سے مطلقاً بحث نہیں (ہ) پہلی میں یہ بات نہیں کہ نصیر نے دوسری بار مطلع پڑھوایا تھا، دوسری میں ہے (و) دونوں سے یہ ظاہر ہے کہ نصیر کا مقصد ذوق کو ذلیل کرنا تھا لیکن پہلی میں کوئی بات ایسی نہیں جو اس بنیادی نکتے کے منافی ہو، دوسری میں نصیر کا خوش ہونا اس کے خلاف پڑتا ہے (ز) بحر پر اعتراض اور منیر کا ذوق کی زمین میں غزل کہنا صرف پہلی شکل میں ہے دوسری میں نہیں۔ حکایت کی دونوں شکلیں مصنوعی ہیں۔

(۱۴۷) ذوق کے حال میں جون لفنسٹن کا ذکر آیا ہے، یہ بقول آزاد معاہدہ کرنے کی غرض سے عازم سندھ و کابل ہوئے تھے (آب) ص۱۴۴۔ بکلینڈ کی کتاب[1] سے معلوم ہوتا ہے کہ صحیح نام ماؤنٹ اسٹورٹ الفنسٹن تھا، جون الفنسٹن اس کا باپ تھا ص۱۳۷۔

(۱۴۸) مثنوی باد مخالف "حریفوں کے جلسے میں پڑھی گئی تو بجائے اس کے کہ .. یہاں سے اپنی زیادتیوں کا عذر کرتے، ایک نے عمداً کہا کہ اس مثنوی کا نام کیا ہے، معلوم ہوا کہ باد مخالف، دوسرے نے گلستاں کا فقرہ پڑھا: یکے از صلحا را باد مخالف در شکم پیچید" اور سب ہنس دیے آب ص۵۲۶۔ اس حکایت کی سند موجود نہیں، ایسا ناخوشگوار واقعہ ہوا ہوتا تو غالب مثنوی کا نام بدل دیتے۔ میری رائے میں فرضی حکایت ہے۔

(۱۴۹) "مولوی فضل حق" کی عادت تھی کہ کوئی بے تکلف دوست آتا تو خالق باری کا یہ مصرع پڑھتے: بیا برادر آؤ رے بھائی۔ ایک دن غالب ملنے گئے تو یہی مصرع پڑھ کر بٹھایا۔ اتنے میں "مولوی صاحب کی بندی" آ کر بیٹھ گئی غالب نے کہا کہ اب وہ دوسرا مصرع بھی فرما دیجیے: "بنشیں مادر بیٹھ ری مائی"

---

[1] ڈکشنری آف انڈین بایوگرافی

اس کی بھی کوئی سند نہیں اور ظاہرا اختراعات آزاد سے ہے۔

(۱۴۸) غالب کی "غزلوں کا دیوان مع دیوان قصائد کے ۱۸۳۳ء میں مرتب ہو کر نقلوں کے ذریعے سے اہل ذوق میں پھیلا اور اب تک کئی دفعہ چھپ چکا ہے" آب ص ۵۲۰ یہ عبارت غلط فہمی پیدا کرنے والی ہے غالب کے کلیات میں صرف قصائد اور غزلیات نہیں، مثنویات، قطعات، رباعیات وغیرہ بھی ہیں کلیات میں قصائد اور غزلیات الگ الگ ہیں تو یہی حال دوسرے اصناف سخن کا بھی ہے۔ زمانۂ ترتیب صحیح ہے یا نہیں، اس سے اس موقع پر بحث نہیں۔

(۱۴۹) غالب کا دیوان اردو ۱۸۴۹ء میں مرتب ہو کر چھپا" آب ص ۵۱۴ اردو دیوان پہلی بار سید محمد خاں کے مطبع میں شعبان ۱۲۵۷ھ مطابق اکتوبر ۱۸۴۱ء میں چھپا تھا۔ ظاہر ہے کہ زمانۂ ترتیب اس سے قبل ہوگا (انتخاب غالب ص ۳۳۹)

(۱۵۰) جھجر میں ایک "فرومایہ" سا شخص اسد تخلص کرتا تھا، اس کا مقطع سن کر اس تخلص سے بھی بیزار ہو گیا:

اسد تم نے بنائی یہ غزل خوب ۔ ارے او شیر ہو رحمت خدا کی" آب ص ۸۸

جھجر کے اسد کا ذکر کہیں اور نہیں ملتا، دہلی غالب تخلص کا ایک گمنام شاعر البتہ گزرا ہے (گلستان سخن) شعر کی صحیح شکل جو تذکرۂ ہندی و مجموعۂ نغز کے علاوہ اردوئے معلی ص ۱۵۸ و ص ۲۷۴ میں موجود ہے، یہ ہے:

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی
مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

اس کے مصنف جیسا کہ تذکروں میں ہے اور خود غالب نے بھی لکھا ہے (اردوئے معلی ص ۲۷۴) میر امانی اسد تھے۔ یہ دہلی کے رہنے والے اور سودا کے شاگرد تھے اور ان کی وفات ولادت غالب (۱۲۱۲ھ) سے بہت پہلے ہوئی تھی (تذکرۂ ہندی) یہ کہیں سے ثابت نہیں کہ اس شعر کا سننا تبدیل تخلص کا باعث ہوا تھا۔

(۱۵۱) آب کی اشاعت اول میں مومن کا ترجمہ نہ تھا، اس پر اعتراض ہوا تو آزاد نے اشاعت دوم میں ان کا حال کسی سے لکھوا کر شامل کتاب کیا، مگر انھیں یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی کہ لکھنے والا کون ہے۔ اس صورت میں وہ باتیں جو بے سند درج ہیں، قبول نہ کی جائیں تو منکر پر اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ ظاہرا آزاد کی نظر میں ہر راوی یکساں طور پر معتبر تھا اور وہ دوسروں سے بھی متوقع تھے کہ اس مسلک کو تسلیم کر لیں۔ انھوں نے جن اصحاب کو صراحۃً معتبر لکھا ہے ان میں وہ بزرگ بھی تھے جن سے انھیں یہ معلوم ہوا تھا کہ گنا بیگم امید کی بیٹی تھی۔

(۱۵۲) آب[۱] میں میر انیس کا حال ص۲۱۵ سے ص۲۴۹ تک پھیلا ہوا ہے، لیکن، آزاد نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کب فوت ہوئے تھے، حالانکہ ان کی رحلت آب کی اشاعت اول یعنی انطباع کے چند ہی سال قبل ہوئی تھی اور ۱۸۷۴ء (سال وفات انیس) کے اردو اخبار وں کے علاوہ دوسری زبانوں کے اخباروں میں بھی اس کی اطلاع چھپی ہوگی۔ (اودھ اخبار میں اس کے متعلق جو کچھ شائع ہوا تھا اس کے تفاصیل معاصر حصہ ۱ میں ملاحظہ ہوں)۔

(۱۵۳) "محمود غزنوی جب ہندوستان آیا اور آم کھایا تو بہت بھایا، مگر نام سن کر کہا سخت ستم ہے کہ ایسا لطیف میوہ اور نام میں یہ فحش، اسے نغزک کہنا چاہئے کہ اسم با مسمّیٰ ہو" سخن ص۲۰۔ اگر محمود نے لفظ آم سنا تھا تو یہ فحش نہیں کوئی دوسرا نام اسے بتایا گیا تھا اور وہ فحش تھا تو آزاد کو اس امر کی طرف اشارہ کرنا تھا۔ اس سے قطع نظر، یہ ثابت نہیں کہ نغزک نام محمود کا رکھا ہوا ہے۔

(۱۵۴) "عروض فارسی کی کتابیں ۶۰۰ھ کے پس و پیش لکھی گئیں" سخن ص۲۶۔ قزوینی مقدمہ المعجم فی معاییر اشعار العجم میں لکھتے ہیں، "چوں .. بہرامی از شعرائے سلطان محمود غزنوی و پسرش.. مسعود کہ مصنف .. اورا از عروضیان عجم مے شمرد.. وچوں البہرامی السرخسی از شعرائے غزنویہ صاحب تالیفات عدیدہ در علم عروض و قافیہ چوں کتاب غایۃ العروضیین (یا غایۃ العروضین)، کہ شمس قیس (مصنف المعجم) .. ظاہراً آں را در دست داشتہ .. و کتاب مجستہ نامہ در علم عروض کہ عوفی در لباب الالباب بدو نسبت می دہد.. وچوں امام حسن قطان از فحول ائمۂ خراساں و معاصر رشید وطواط کہ واضع دو شجرۂ اخرم و اخرب است برائے تسہیل استخراج اوزان بیت دو چہار گانۂ رباعی و اورا مختصرے بودہ در علم عروض کہ مصنف دریں کتاب دو شجرۂ مذکورہ ازاں نقل می کند وغیر ایں جماعت از فضلا و ائمہ کہ اسامے ایشاں و مؤلفات ایشاں بما نہ رسیدہ است، ولیکن از سوء اتفاق ایں کتب .. بواسطۂ تواتر انقلابات .. بکلّی از میاں رفتہ است"

(۱۵۵) "یہ قاعدہ ہے کہ ژند کی ذ جب سر لفظ پہ ہو تو فارسی میں دال پڑھی جاتی ہے" سخن ص۳۲۔ "ژند" (زند) سے اوستائی زبان مراد ہے اور اس زبان یا کسی اور ایرانی زبان میں خواہ وہ پرانی ہو یا نئی کوئی کلمہ صرف ذال سے شروع نہیں ہوتا۔ اوستائی ذال ؤ تو آخر کلمہ میں بھی آتی ہے۔ (کاتھا از آقائے پور داؤد ص۱۹)

(۱۵۶) اجنبا "فارسی قدیم" میں ـ بے حرکت، الف نفی کا ہے سخن ص۱۱۔ اجنبا کی جگہ اجنباں چاہیے اور

---

[۱] مندرجات آب حیات کی تنقید ابھی ختم نہیں ہوئی، قسط سوم و چہارم میں بھی اس سے بحث ہوگی۔

یہ فارسی نہیں، دساتیری ہے۔

(۱۵۷) فارسی قدیم میں اخواستی = بے ارادہ سخن ص۱۰۱ یہ بھی دساتیری ہے۔

(۱۵۸) آمیز (کذا) جو کبھی نہ مرے" سخن ص۱۰۱ غالب نے درفش کاویانی میں امیرے تا میرندہ لکھا تھا، لیکن جب مطالبہ کیا گیا تو اس کی سند نہ دے سکے۔ فرہنگیں اس سے نا آشنا ہیں اور درفش و سخن کے سوا کہیں اور میری نظر سے نہیں گزرا۔ واضح رہے کہ درفش میں کسرہ و تشدید نہیں۔

(۱۵۹) فرشاد فارسی قدیم میں تحفہ، نذرانہ، تبرک، سنسکرت میں پرساد" سخن ص۸۴ فارسی میں یہ لفظ میری نظر سے نہیں گزرا، درفش کاویانی میں ہے، مگر اس کا اعتبار نہیں۔

(۱۶۰) انگارہ فارسی میں آگ کا دہکتا ہوا ڈلا سخن ص۹۲ یہ معنی فارسی میں نہیں،

(۱۶۱) ہوا فارسی ہے سنسکرت میں وایو سخن ص۹۲ یہ مسلمات سے ہے کہ ہوا (باد) عربی ہے۔

(۱۶۲) سیب زمینی آلو کو کہتے ہیں، یہ بعینہ ترجمہ ہے پوٹے ٹوکا۔ پس معلوم ہوا فرانس کے رستے سے پہنچا ہے" سخن ص۱۹ پوٹے ٹو ایک قدیم امریکی لفظ کی تبدیل شدہ صورت ہے جو انگریزی میں مروّج ہے۔ سیب زمینی اس کا نہیں، فرانسیسی POMME DE TERRE کا لفظی ترجمہ ہے۔

(۱۶۳) پشوتن کیانیوں کے خاندان میں ایک شاہزادہ ہوا ہے کہ اس نے عمر جاوید پائی ہے بعض لوگ اسے کاؤس کا بیٹا کہتے ہیں" نگار ص۱۱۱ یہ گشتاسپ کا بیٹا اور اسفندیار کا بھائی تھا کسی نے اسے پسر کاؤس نہیں لکھا۔

(۱۶۴) دساتیر کی زبان کے متعلق: "یہ خرد استا سے بھی پہلے کی زبان معلوم ہوتی ہے، مملکت کے کسی علاقے کی پیدا کرتے ہے، اس طرح زور پکڑ گئی ہو گی جس طرح یہاں ایک زمانے میں پالی ہو گزری" سخن ص۳ (الف) دساتیر مطبوعہ آزاد کے پاس تھی، اور ان کا نسخہ آج کل کتب خانۂ دانش گاہ پنجاب میں ہے۔ سخندان فارس کے مصنف کو غائر نظر سے اس کا بالاستیعاب مطالعہ کرنا تھا، مگر، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اسے سرسری طور پر کہیں کہیں سے دیکھا تھا۔ اس کے انطباع کے بعد مستشرقین یورپ نے اس کی زبان اور مطالب کی نسبت جو کچھ لکھا تھا، ظاہرا وہ اس سے بھی ناواقف تھے، حالانکہ سخن میں جا بجا اہل یورپ کی تحقیقات (متعلق ایران قدیم) سے استفادے کا ذکر ہے (ب) دساتیر خود اور اس کے ماننے والے مدعی ہیں کہ اس میں جو صحف اور پند نامہ ہے وہ فرازبن نواد یعنی آسانی زبان میں ہے، اور ترجمہ و تفسیر اواخر عہد ساسانی کی فارسی دری میں ہے۔ صحف پیمبروں پر نازل ہوئے تھے، جن میں پہلا آباد اور آخری ساسان پنجم ہے۔ یہی ساسان

پنجم دساتیر کا مترجم و مفسر بھی ہے۔ دساتیر کے مطابق آبادیوں کی حکومت .... ۳ سال رہی۔ (سفرنگ دساتیر ص۱۴۴)۔ دساتیر کے ماننے والوں کو یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ اس کا پہلا صحیفہ اس سے بھی پیشتر کا ہے (ج) آزاد نے خردہ اوستا کے متعلق لکھا ہے کہ یہ عہد خسرو سے بھی پہلے کی کتاب ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ متن دساتیر ان کے نزدیک کس عہد کی زبان میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انھیں اس کی خبر ہی نہیں کہ دساتیر اپنی زبان کی نسبت کیا کہتی ہے اور دساتیر کے بموجب آباد کا زمانہ کب تھا۔ (د) زبان دساتیر کو پراکرت سے تشبیہ دینا بھی خوب ہے۔

(۱۶۵) اس دعوے کے ثبوت میں کہ تسلط اسلام سے قبل بھی ایران میں شعر کہا جاتا تھا بحوالۂ آرزو لکھا ہے: "سلاطین قدیمہ میں سے فرہوش .. کے دربار میں گروہ کثیر اہل سخن کا حاضر رہتا تھا، ان میں سے شید وش .. نے ایک موقع پر بادشاہ بیگم کے حق میں کہا۔

زن شاہ است در داؤ رگرد ا گوز دارد ندارد بیم از کس

اسی کتاب میں .. ہے کہ زبان قدیم میں درد اور شجاعت اور گرد ابمعنی سمندر تھا" سخن ص۲۶۱، (الف) اس سے قطع نظر کہ اثبات دعوٰی میں بارھویں صدی ہجری کے ایک مصنف سے استناد فضول ہے، آرزو کثیر التصانیف شخص تھے، ان کی کتاب کا نام بتانا تھا، مگر میرا خیال ہے کہ یہ حکایت انھوں نے براہ راست آرزو کی کسی کتاب سے نہیں لی (ب) حکایت مجمع النفائس و ۲ میں بحوالۂ دبستان مذاہب مرقوم ہے لیکن متن شعر مجمع و دبستان میں سخن سے مختلف ہے۔ "درداؤ" کو مجمع ایک لفظ نہیں (ج) مجمع و دبستان دونوں میں فرہوش کو آبادی خاندان کا بادشاہ لکھا ہے۔ اگر یہ آبادی دور کے بالکل آخر میں تھا جب بھی اسے ایک ارب سے زیادہ سال گزرے ہیں۔ (سفرنگ دساتیر ص۶۰) اس زمانے میں انسان کہاں تھا جو شاعری ہوتی اور اگر تھا تو کیا اس عہد کی وہی زبان ہو سکتی تھی جو "زن شاہ الخ" کی ہے؟

(۱۶۶) سال وفات رودکی ۳۴۳ھ سخن ص۲۶۶، لیکن، نگار ص۸ میں تیرھویں صدی ہجری کی مفتاح التواریخ کے حوالے سے ۳۰۴ھ لکھا ہے۔ مفتاح ایسی کتاب نہ تھی کہ اس کی بنا پر تبدیل رائے کی جاتی۔ ظاہرا آزاد نے ۳۴۳ھ محض اٹکل پچو لکھ دیا تھا؛ مفتاح میں مختلف سنہ جو دیکھا تو اسی کو صحیح سمجھے حقیقت یہ ہے کہ دونوں غلط ہیں درست ۳۲۹ھ ہے جو سمعانی کی کتاب (متعلق انساب) میں ہے اور جسے پہلے پہل قزوینی منظر عام پر لائے ہیں۔

(۱۶۷) اے آنکہ طعنہ کردی در شعر رودکی — ایں طعنہ کردن تو ز جہل است و کودکی
کانکس کہ شعر داند داند کہ در جہاں — صاحبقران ملک سخن است رودکی

نگار ص۸ میں بنام (قیقی) لیکن نظامی عروضی کا قطعہ ہے (لباب الالباب ۲ ص۷)۔ لباب میں "نو جہل است و کودکی" کی جگہ "زجہل و زکودکیست" اور "ملک سخن الخ" کے عوض "شاعری استاد رود کیست"۔

(۱۶۸) اسدی طوسی، استاد فردوسی و مصنف گرشاسپ نامہ، وقصائد مناظرہ نے فردوسی کے ۴ برس بعد ۴۶۵ھ میں وفات پائی سخن ص۲۸۲، نگار میں اس کا مستقلاً ذکر نہیں، لیکن ترجمۂ فردوسی میں اسے رودکی کا "ہمعصر" بتایا ہے ص۱۰ اور فردوسی کا سال وفات ۴۱۱ھ یا ۴۱۶ھ لکھا ہے ص۱۹۔
(الف) اسدی رودکی کا "ہمعصر" ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ ۴۶۵ھ میں (رودکی کے ۱۴۰ سال بعد مطابق سخن) وفات پائے؟ (ب) فردوسی کا سال وفات وہی ہے جو آزاد نے لکھا ہے اور اسدی اس کے ۴ برس بعد مرا ہے تو اس کا سال رحلت ۴۶۵ھ کس طرح ہو سکتا ہے؟
(ج) اسدی تخلص کا ایک شاعر گذرا ہو یا دو، یہ ممکن نہیں کہ گرشاسپ نامہ کا مصنف فردوسی کا استاد رہا ہو۔

(۱۶۹) بہت سی کہانیاں لوگوں نے بنا رکھی ہیں، بلکہ کتابوں میں بھی ہیں جو "لائق اعتبار نہیں، لیکن چونکہ مؤلف کو لازم ہے جو حال یا لوگوں کا خیال معلوم ہو سب پر ظاہر کرے اور اس کے جھوٹ اور سچ پر رائے دے اس واسطے بطور لطیفہ لکھا جاتا ہے" اس کے بعد آزاد نے لکھا ہے کہ رستم نے بطور شکریہ فردوسی کو دفینے کا حال بتایا۔ اور اس سلسلے میں بعض کا یہ قول نقل کیا ہے کہ دربار محمود سے محرومی پر فردوسی نے رستم کی بھی ہجو کہی تھی، جس کا ایک شعر یہ ہے:

منش کردہ ام رستم داستاں   وگرنہ یلے بود از سیستاں

اس پر رستم نے دفینے کا حال خواب میں بتایا نگار ص۱۹۔ فرضی حکایات کے بیان کرنے میں مضایقہ نہیں، لیکن، مآخذ کا ذکر لازم ہے، آزاد اسے غیر ضروری سمجھتے تھے۔ ہجو رستم کا ذکر میں نے کہیں اور نہیں دیکھا اور نہ آزاد کا دیا ہوا شعر فردوسی کے نام سے کسی اور جگہ میری نظر سے گزرا ہے۔

(۱۷۰) محمود نے فصد کھلوائی، عنصری نے فی البدیہہ یہ قطعہ کہہ کر سنایا: آمد آں رگزن مسیح پرست الخ سخن ص۲۸۹ یہ قطعہ عنصری کا نہیں، تفاصیل کے لئے آوارہ گرد اشعار کی وہ قسط دیکھیے جو خاور ڈھاکہ میں چھپی تھی۔

(۱۷۱) فرخی نے ترجمان البلاغت "صنائع شعری" میں لکھی سخن ص۵۔ اس میں بہت سے ایسے صنائع بھی ہیں جس کا استعمال نثر میں ہو سکتا ہے۔ یہ کتاب ۱۹۴۹ء میں پہلی بار استانبول میں طبع ہوئی۔ یہ نسخہ ۵۰۷ھ کے خطی نسخے پر مبنی ہے۔ اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مصنف

فرخی ہیں، محمد بن عمر الرادویانی ہے۔

(۱۷۱) نظامی گنجوی نے ویس ورامین کا قصہ محمود ابن محمد ابن ملک شاہ کے نام سے لکھا تھا، لوگ اسے تصنیف نظامی عروضی کہتے ہیں اور یہ غلط ہے۔ اکثر مصنفوں کی رائے یہ ہے کہ ابتدائی مشق ہے" نگار ص۶۶ ویس ورامین کو دولت شاہ نے ترجمۂ عروضی میں اس کی طرف منسوب کیا ہے (تذکرہ ص۶۰) لیکن ترجمۂ نظامی گنجوی میں اس بنا پر اس کی تردید کی ہے کہ عروضی عہد ملک شاہ میں تھا اور یہ اس کے پوتے محمود ابن محمد کے زمانے کی ہے ص۱۳۰، اسی جگہ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ نظامی گنجوی کے عہد شباب کی تصنیف ہے۔ یہ سب غلط محض ہے؛ حقیقت "مزدیسنا و تاثیر آں در ادبیات فارسی" مصنفۂ آقائے محمد معین کے اقتباس ذیل سے معلوم ہوگی: "فخرالدین اسعد گرگانی از گویندگان نامبردار سدۂ پنجم ہجری (حاشیہ: معاصر طغرل بک بن محمد بن میکائیل سلجوقی ۴۳۲ - ۴۵۵) و ناظم.. ویس و رامین است۔ این منظومہ چنانکہ در مقدمۂ آن اشارہ کند، بزبان پہلوی تالیف شدہ بود و فخرالدین آں را.. بنظم دری ترجمہ کردہ.. از قرائنے کہ در ہمیں مقدمہ درج است، استنباط می شود کہ این داستان را در فاصلۂ سالہائے ۴۴۲ و ۴۴۶ .. منظوم کردہ" ص۳۳۸۔ ویس و رامین فخر گرگانی کے نام سے سخن کی اشاعت سے بہت پہلے کلکتے میں چھپی تھی اور آج سے چند سال پیشتر ایران میں طبع ہوئی ہے۔ دولت شاہ نے اس کے متعلق فاحش غلطی کی ہے، لیکن تیرھویں صدی کے ہندوستانی تذکرہ نگار تک اصل حال سے واقف ہیں (رجوع بہ خلاصۃ الافکار م د (مخزن الغرائب م) نظامی عروضی یا نظامی گنجوی کو اس مثنوی سے کچھ سروکار نہیں۔

(۱۷۲) ظہیر فاریابی کا دیوان "ہمیشہ کمیاب اور عزیز الوجود ہے، کسی شخص کا شعر ہے:

دیوان ظہیر فاریابی   در کعبہ بدزد اگر بیابی" نگار ص۱۵

درویش دہکی نے جامی کی ہجو میں ایک مثنوی کہی تھی جس میں ان پر سرقے کا الزام لگایا تھا، اس کا ایک شعر یہ ہے:

اے باد صبا بگو بجامی   کاے دزد سخنوران نامی

آزاد کا نقل کردہ شعر بھی اسی مثنوی میں شامل ہے (مجمع النفائس مصنفۂ آرزو م د ۱۴۰)۔ درویش کی غرض ہرگز یہ نہیں کہ ظہیر کا دیوان کمیاب ہے۔ اور یہ حقیقت ہے بھی نہیں، ایک بار ایران میں اور دوبار مختلف طور پر ہندوستان میں چھپ چکا ہے۔ اس کے خطی نسخے بھی کثرت سے ملتے ہیں۔

(۱۷۳) بخم نشست فلاطون زشرم آب نشد   بحیرتم کہ فلاطون شد و شراب نشد

یہ اور اس زمین کا ایک اور شعر نگار ص۱۵ میں بنام ظہیر فاریابی، لیکن دیوان ظہیر کی کل مطبوعہ اشاعتیں ان اشعار سے خالی ہیں، اور بخم الخ دیوان نعمت خان عالی کے مطبوعہ (نولکشوری ص۲۲۴) اور خطی نسخوں (م میں ۱۲)

میں موجود ہے۔

(۱۷۵) آب صفحہ ۱۵ میں یہ مصرع امیر خسرو کے نام سے ہے: "بنشستہ چوں در پالکی نہ چرخ کبار آمدہ" لیکن سخن صفحہ ۲۱۲ میں پورا شعر طغرا کی طرف منسوب کیا ہے۔ صحیح یہی ہے اور یہ شعر کلیات طغرا م و ۳۴۰ میں موجود ہے۔ اس طویل قصہ میں جس کا یہ جزو ہے (۲۷۷ ابیات) ہندی عنصر بہت نمایاں ہے، ورق ۳۲۸ میں ایک شعر جو ہولی سے متعلق ہے درج ذیل ہے:

شد وقت ہولی باختن با رنگ و بو پرداختن   محمود را چو گلبن ساختن باغ ارم خوار آمدہ

اعتراض آزاد کے طریق کار پر ہے کہ پہلے ایک غلط بات کہی، بعد کو متضاد بیان دیا، لیکن اس کی ضرورت محسوس نہ کی کہ سند پیش کریں۔

(۱۷۶) سال وفات عرفی ۹۹۹ھ نگار صفحہ ۹۹ اور یہ صحیح ہے، لیکن صفحہ ۱۰۰ میں ہے کہ دشمنوں نے اشعث الطامع سے تاریخ نکالی۔ اس سے ۹۹۱ بر آمد ہوتا ہے، یا تو عرفی سے اس کا کچھ تعلق ہی نہیں، یا اس کے ساتھ کوئی اور لفظ تھا جو آزاد نے نہیں لکھا۔

(۱۷۷) فیضی نے سالہا سال کاشی میں برہمن بن کر علم شاستری حاصل کیا، استاد کو اس کا علم ہوا تو یہ وصیت کی کہ "گائتری منتر اور ۴ بید" کا ترجمہ نہ کرنا، فیضی نے اس پر عمل کیا نگار صفحہ ۱۰۱ یہ محتاج ثبوت ہے۔

(۱۷۸) سرمد شہر ٹھٹھہ میں ایک ہندو بچے پر عاشق ہوا۔ نگار صفحہ ۱۹۶، ٹھٹھہ مصحف ٹھٹھہ (دبستان مذاہب نولکشور صفحہ ۲۲۲)

(۱۷۹) نگار ترجمۂ کلیم: "شیدا وغیرہ" کہتے تھے وہ لوگ بڑے خوش نصیب تھے جنھوں نے کلیم کی ملک الشعرائی نہ دیکھی" صفحہ ۱۸۵ ایضاً ترجمۂ شیدا: "جب" کلیم کے بعد محمد قلی سلیم ملک الشعرا ہوا تو شیدا کہا کرتا تھا خوشا نصیب ان شعرائے مرحوم کے جنھوں نے سلیم کی ملک الشعرائی کا بار نہ اٹھایا" صفحہ ۱۸۶ (الف) کلیم کے متعلق جو کچھ مرقوم ہے وہ بے سند نہیں، لیکن یہ قول شیدا کا تھا، "وغیرہ" آزاد کا اضافہ ہے (ب) کلیم کی وفات ۱۰۶۱ھ میں ہوئی، مادۂ تاریخ نگار صفحہ ۱۸۱ میں بھی درج ہے، گو سنہ اس کے ساتھ مرقوم نہیں۔ سلیم ۱۰۵۷ھ میں راہی عدم ہوا ہے (معاصرہ صفحہ ۱۵۵) اور شیدا اس سے بھی پہلے اس دنیا سے رخصت ہوا ہے، سلیم کا کلیم کے بعد ملک الشعرا ہونا اور شیدا کا اس پر کڑھنا بالکل خارج از بحث ہے۔ سلیم کسی اور زمانے میں بھی اس عہدے پر فائز نہیں ہوا اور خود آزاد نے بھی نگار میں جو اس کا مستقل ترجمہ دیا ہے اس میں اس کا ذکر نہیں۔

(۱۸۰) کلیم عہد جہانگیر میں وارد ہند ہوا، بعد اس کے ایران گیا اور پھر شاہجہاں کی سلطنت میں آیا۔ "توفیق رفیق طالب آمد" تاریخ اس کی کہی" مادۂ تاریخ کے بعد ۱۰۴۲ھ مرقوم نگار صفحہ ۱۸۱۔ (الف) "توفیق آمد" سے ۱۰۴۲ نہیں، ۱۰۴۳ نکلتا ہے، مگر مادۂ تاریخ صرف "توفیق رفیق طالب" ہے،

جیساکہ قطعۂ ذیل سے جو دیوان کلیم (م ۳۴۲) میں ہے، ظاہر ہے:

طالب ز ہوا پرستی ہند — برگشت و سوے مطالب آمد
تاریخ توجہ عراقش — "توفیق رفیق طالب" آمد ۱۰۰

(ب) ۱۰۲۳ھ جو نگار میں ہے، عہد شاہجہانی نہیں، عہد عالمگیری ہے اور اس وقت کلیم زندہ بھی نہ تھا۔ (ج) "توفیق رفیق طالب" سے ۱۰۲۸ مستخرج ہوتا ہے اور ۱۰۲۸ھ عہد جہانگیری کا ہے (د) قطعہ سے بالکل واضح ہے کہ مادۂ تاریخ ہند سے "عراق" جانے کا ہے، ایران سے ہند واپس آنے کا نہیں۔

(۸۱) چو مہر تو دارم چہ حاجت بمہرم — مرا مہرداری بہ از مُہرداری

کلیم مُہردار شاہی تھا، گوشہ نشینی اختیار کی اور یہ شعر لکھ بھیجا نگار ص۱۸۔ کلیم نہیں، طالب آملی مُہردار شاہی تھا اور یہ شعر اسی کا ہے۔ پوری نظم اس کے دیوان (م ۲۹۴) میں موجود ہے۔ یہ ۶۶ اشعار پر مشتمل ہے اور اس کی بیت اول غیر مصرع ہے۔ چو مہر الخ ۶ و ۱۲ میں ہے۔

(۸۲) "کلیم" "قدسی کے بعد ملک الشعرا ہوا اور شاہجہان نامہ میں ہے کہ کلیم ملک الشعرائی کے خطاب سے سرفراز تھا جو ۔۔ قدسی آیا۔ اگرچہ حق ملک الشعرائی کا خطاب اس کے لئے تھا، مگر چونکہ نام نکل گیا تھا اس لیے وہی مشہور رہا،" نگار ص۱۸۵۔ ترجمۂ قدسی میں صراحتہً خطاب ملنے کا ذکر نہیں، لیکن آخر میں مرقوم ہے: "شاہجہاں کے ایام سلطنت میں قدسی فوت ہوا، اور بعد اس کے کلیم ملک الشعرا ہوا" ص۱۹۳۔ حقیقت یہ ہے کہ کلیم ملک الشعرا ہو چکا تھا کہ قدسی وارد ہند ہوا اور کلیم سے قبل فوت ہوا۔ اس کی ملک الشعرائی خارج از بحث ہے۔ عبارت ذیل عمل صالح کی ہے، شاہجہاں نامے کی نہیں: "(کلیم) بخطاب ملک الشعرائی امتیاز یافت، اگرچہ استحقاق این منصب۔۔ قدسی داشت، اما از پیدا کردن پیش از رسیدن حاجی (قدسی) او باین خطاب سرفرازی یافتہ بود، تا دم آخر بر و بحال ماند و تغیرے بدان راہ نیافت۔" (معاصرہ ص۱۵۳) یہ مصنف ع، ص کی رائے ہے کہ قدسی کلیم کے مقابلے میں ملک الشعرائی کا زیادہ مستحق تھا۔ اس کی بنا پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قدسی کو بھی یہ خطاب ملا تھا۔

(۸۳) صائب ۱۰۸۶ھ میں فوت ہوا اور سرخوش نے خبر سنتے ہی تاریخ کہی "صائب وفات یافت" (۱۰۸۱ ہجری) نگار ص۱۷۱۔ کلمات الشعرا ص۶۵ میں ۱۰۸۰ھ اور مادۂ تاریخ سے ۱۰۸۱ ہی نکلتا ہے۔ ۱۰۸۶ھ بھی غالباً صحیح نہیں۔

(۱) عالمگیر موسوی خاں متخلص بہ فطرت و موسوی کی "بہن کو باصرار عقد نکاح میں لایا" نگار ص۲۲۳۔ یہ غلط محض ہے، یہ اشتباہ ہے کہ وہ عالمگیر کا ہم زلف تھا، شاہنواز خاں کی بیٹی جو اعظم شاہ کی خالہ تھی اس کے نکاح میں تھی (ترجمۂ انگریزی مآثر الامرا جلد ۲ ص۳۲۲)

(۱۸۵) موسوی خاں مذکور کے دو تخلصوں کا ذکر کیا ہے لیکن تیسرے تخلص معز کو جو تذکروں (از آں جملہ نکات الشعرا صـ۱۲) اور دیوان (م ۳۵۵ و ۵۷) سے ثابت ہے، نظر انداز کر دیا ہے:

"سودائی کند بکسے وصل او معز داد یم نقد جاں بہ تمنا لمن لمن"

(۱۸۶) ناصر علی ذوالفقار خاں، "سپہ سالار عالمگیر" کی مدح میں "قصیدہ" کہہ کر لے گیا، مطلع ہی پڑھا تھا کہ ذوالفقار خاں نے "ایک لاکھ روپیہ مع خلعت و جواہر" انعام دیا اور کہا کہ آگے نہ پڑھیے، میرا خزانہ ان اشعار کی "قیمت کے لئے کافی نہیں، اور ہاتھی پر سوار کر کے رخصت کیا" مطلع:

اے شان حیدری زجبیں تو آشکار نام تو در نبرد کند کار ذوالفقار

کہتے ہیں کہ ناصر علی جب وہاں سے نکلا تو اول انعام کے لئے نواب کے ملازم اور پھر رستے میں لوگ گرد ہو گئے، اس نے بھی ہاتھی ہی پر سے .. تمام روپیہ لٹانا شروع کیا .. مکان پر پہنچ کر اترا تو فیلبان نے کہا کہ میرا انعام مرحمت ہو۔ ادھر ادھر دیکھ کر کہا جاؤ یہی ہاتھی تمھارا انعام ہے نگارستان صـ۱۱۳ (الف) تذکرۂ طاہر نصر آبادی طبع ایران صـ۳۲۶ و مجمع النفائس و ہمیشہ بہار (م) میں "جبیں" کی جگہ "نشان" گر خوش گو، آزاد بلگرامی (خزانۂ عامرہ) وغیرہ نے "جبیں" ہی لکھا ہے (ب) وہ نظم جسے آزاد نے قصیدہ کہا ہے دیوان ناصر علی (نظامی و نولکشوری) اور خزانۂ عامرہ وغیرہ میں موجود ہے۔ یہ غلطی اوروں سے بھی ہوئی ہے (مثلاً صاحب ہمیشہ بہار)، لیکن چونکہ یہ ۔ ابیات پر مشتمل ہے، اس پر لفظ قصیدہ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ خزانۂ عامرہ، گل رعنا، سفینۂ خوش گو میں اسے غزل کہا ہے۔ مقطع کا مصرع ا یہ ہے: ناصر علی تراز تو خواہد مراد و بس (ج) ناصر علی و ذوالفقار خاں کی حکایت ہمیشہ بہار (عکس صـ۱۲) سے قبل کی کسی کتاب میں میری نظر سے نہیں گزری، اور اس کی وہ شکل جو آزاد نے پیش کی ہے کہیں اور نہیں ملتی (د) خطاب ذوالفقار خاں ۱۱۰۱ھ میں ملا تھا، اور میر بخشی گری ۱۱۱۹ھ عالمگیر میں حاصل ہوئی تھی (مآثر الامرا) ناصر کی وفات ۱۱۰۸ھ میں ہوئی ہے (کلمات الشعرا) ظاہر ہے کہ ذوالفقار خاں ناصر علی کے دوران حیات میں "سپہ سالار" نہ تھا (ہ) ہمیشہ بہار میں ہے کہ خلعت، ہاتھی اور "زر نقد خطیر" ید بیضا آزاد بلگرامی م: ایک ہاتھی اور مبلغ خطیر" خوش گو: ہاتھی، خلعت اور دس ہزار نقد مجمع النفائس: ہاتھی اور ۵ ہزار نقد، خزانۂ عامرہ آزاد بلگرامی: بحوالۂ سفینۂ بیخبر بلگرامی ہاتھی اور ۳۰ ہزار۔ آزاد کہتے ہیں کہ میر کاظم منصب دار اورنگ آبادی مجھ سے کہتے تھے کہ میں نے متصدیان ذوالفقار خاں سے دریافت کیا تھا، ۳۰ ہزار ملے تھے۔ مخزن الغرائب: ایک لاکھ اور ہاتھی۔ گل رعنا شفیق: ہاتھی، ۳۰ ہزار نقد، خلعت وغیرہ، مآثر الامرا: ایک ہاتھی مبلغ خطیر" عشق: ۳۰ ہزار اور ہاتھی، ایک قول کے مطابق ایک لاکھ، دوسرے اقوال کے بموجب

پانچ یا دو ہزار۔ مصنف کی رائے ہے کہ جب "بخشی الممالک" اور اشعار پڑھنے سے مانع آئے تو ایک لاکھ ہی صحیح ہوگا۔ میرے خیال میں آرزو کا قول درست معلوم ہوتا ہے؛ ذوالفقار خاں اس زمانے میں بخشی الممالک نہ تھے (و) مطلع سن کر اور اشعار پڑھنے سے روکنا، سفینۂ خوشگو، ید بیضا، مجمع النفائس اور مآثر الامرا میں نہیں؛ غالباً پہلا تذکرہ جس میں یہ مذکور ہے سفینۂ بیخبر ہے جس سے خزانۂ عامرہ میں نقل ہوا ہے ایسی ہی ایک حکایت ایک ایرانی شاعر کے بارے میں جس کا نام اس وقت یاد نہیں آتا میری نظر سے گزرا ہے (س) ناصر علی نے کیا کیا، اس کا ذکر ہمیشہ بہار میں یوں ہے: "تمام مبلغ تا بخانہ رسید بذل و ایثار نمود" خوش گو: "زر خطیر در راہ ایثار کرد، مشت مشت بر دو طرف فشاند" مجمع النفائس: "بخانہ آمدہ بمردم تقسیم نمود، فیل بسپاہی مفاس" ید بیضا و مآثر الامرا اس باب میں خاموش ہیں، خزانۂ عامرہ میں ہے کہ جو کچھ ملا تقسیم کر دیا (س) اسے شان حیدری الخ تذکرۂ طاہر نصر آبادی مطبوعہ میں وارستہ، چغتائی، معاصر سلیم سے منسوب ہے، اور اس کے ساتھ یہ عبارت ہے: "در مدح ذوالفقار خاں بیگ قربیگی قندہار گفتہ" ص۴۳۶ مگر مخطوطہ ملام میں یہ شعر موجود نہیں۔ (ح) اس شعر کے تذکرۂ نصر آبادی کے مطبوعہ نسخے میں ملنے سے ساری حکایت مشکوک ہو جاتی ہے۔ اس کے متعلق مزید تحقیقات کی ضرورت ہے، مثلاً یہ کہ تذکرہ کب ختم ہوا، شعر الحاقی تو نہیں، دیوان ناصر علی کے معتبر خطی نسخوں میں موجود ہے یا نہیں، شعر زیر بحث کو کسی اور نے وارستہ کی طرف منسوب کیا ہے یا نہیں۔

(۱۸۷) سرخوش کہتا ہے کہ میں، ناصر علی اور بیدل جامع مسجد دہلی کے حوض کے کنارے بیٹھے شعر خوانی کر رہے تھے کہ سرمد پہنچا اور ہنس کر یہ شعر سنایا:

دیر است کہ آوازۂ منصور کہن شد　　اکنوں سر تو جلوہ دہم دار و رسن را

دوسرے شعر کی فرمائش ہوئی تو اس نے یہ شعر پڑھا: "سر جدا کرد از تنم شوخیکہ با ما یار بود الخ" اس کے دوسرے ہی دن قتل ہوا نگار ص۱۹۸، سرمد بقول آزاد ۱۰۷۰ھ میں مقتول ہوا ہے، (نگار ص۱۹۹) اس وقت تک نہ ناصر علی دہلی پہنچے تھے نہ بیدل۔ مؤخر الذکر کا سال ولادت اور سال عزم دہلی از بہار بقول خود علی الترتیب ۱۰۵۴ھ اور ۱۰۷۵ھ ہے (کلیات ص ۸۸۹)۔ مزید یہ کہ حکایت زیر بحث سرخوش کے کلمات الشعرا سے غیر حاضر ہے۔ شعر میں غالباً "اکنوں" کی جگہ حق ہے۔

(۱۸۸) دیوان بیدل میں ایک لاکھ اشعار، مگر ایک شعر کسی کی تعریف میں نہیں نگار ص۲۰۱۔ کلیات کا جو ضخیم نسخہ م میں ہے، اس میں ایک لاکھ سے بہت کم اشعار ہیں، اور مدحیہ کلام کثرت سے ہے (رحم ص۱۸۹)

(۱۸۹) مرزا عبد القادر بیدل آغاز شباب میں اعظم شاہ کے نوکر تھے، کسی امیر نے یہ کہا کہ "ان سے زیادہ

آج کل کوئی شاعر نہیں" شاہزادے نے اظہار تعجب کیا کہ آج تک میری مدح نہیں۔ اس کا ایما ہوا کہ قصیدہ لکھیں" تاکہ زور طبیعت معلوم ہو اور بموجب اس کے اضافۂ منصب کیا جائے" یہ فوراً مستعفی ہو گئے" دوستوں نے بہت سمجھایا مگر قبول نہ کیا، نہ پھر کسی کی نوکری کی، ڈاڑھی مونچھ منڈا کر آزاد ہو گئے"، نگار ص۱۷۷۔ خوش گو جو دوسرے تذکرہ نگاروں کے مقابلے میں بیدل سے بہت زیادہ واقفیت رکھتا تھا۔ اس کا قول ہے کہ بیدل اعظم شاہ کے ساتھ مست (کذا) سال رہے، "جذبہ" غالب ہوا تو بعذر مرض مستعفی ہوئے۔ اعظم شاہ نے بیدل کو جو "نشان" بھیجا تھا وہ خوشگو نے ان کے پاس دیکھا تھا۔ اعظم شاہ نے لکھا تھا کہ قوٹی درست ہیں تو استعفا مناسب نہیں۔ خوشگو کہتا ہے کہ بیدل کا جواب رقعات بیدل میں ہے (سفینۂ خوشگو، م ترجمۂ بیدل) رقعات بیدل، کلیات بیدل کے خطی نسخۂ م میں شامل ہے۔ (اس کے سرسری مطالعہ میں مجھے ایک خط اس کے متعلق ملا، مگر اس کا مکتوب الیہ خود اعظم شاہ نہیں)۔ آزاد نے جو وجہ استعفا بیان کی ہے، اور کتابوں میں بھی ہے اور وہ اس کے موید نہیں، لیکن کلیات بیدل اس کا مکذب ہے۔ اس میں اعظم شاہ کی مدح میں جو منظومات ہیں ان میں ایک قصیدہ بھی ہے جس کی بیت ذیل میں اس کا نام آیا ہے:

"ثنا و اثبات صاحبقراں سلطاں محمد اعظم آں — کز گل مدحش زباں دارد بجنت در آستیں" ۲۴۷ا

(۱۹) "بیدل ایک دن "قمرالدین خاں وزیر بادشاہ" کے یہاں گئے، وہ نماز پڑھ رہے تھے کہ "نواب محمد امین خاں" آگئے۔ یہ "چار ابرو کی صفائی کیے" تو لاسی لئے بیٹھے تھے۔ نواب نے نام پوچھا اور اس سے مسلمان ہونا معلوم ہوا تو چیں بجبیں ہو کر بولے" ریش دبرت چرا تراشیدی؟" بیدل نے اسی وقت یہ شعر کہہ کے پڑھا:

ریش دبروت خویش تراشیدہ ایم ما — لیکن دل کسے نخراشیدہ ایم ما

محمد امین خاں "رکن بادشاہی" تھے اور "ان کے ہاتھ سے رنج و راحت ظلم و انصاف سب کچھ ہوتا رہتا ہے" وہ اسے طعن سمجھے اور گفتگو بڑھنے لگی۔ قمرالدین خاں ڈرے کہ کہیں کسی کا خون نہ ہو جائے۔ نماز توڑ کر آئے بیدل کا تعارف محمد امین خاں سے کرایا اور بیدل سے کہا: "نواب سے ملاقات کیجئے، وزیر الممالک بہت سخن فہم اور معنی شناس ہیں" نگار ص۱۷۹ (الف) آزاد نے قمرالدین خاں کو "وزیر بادشاہ" اور محمد امین خاں ابتدائے حکایت میں "رکن بادشاہی" اور آخر میں "وزیر الممالک" کہا ہے۔ سلطنت مغلیہ کا قاعدہ تھا کہ ایک وقت میں ایک ہی وزیر ہوا کرتا تھا، گو بعض اوقات کوئی شخص اس کی نیابت پر بھی متعین کیا جاتا تھا۔ وزیر کے بعد میر بخشی کا عہدہ تھا، مگر اسے وزیر نہیں کہا جاتا تھا۔ بیدل کے زمانۂ آخر میں محمد امین خاں وزیر تھے ان کی وفات کے بعد آصف جاہ اور ان کی علٰحدگی پر قمرالدین خاں کو یہ عہدہ ملا تھا۔ بیدل نے ان دونوں کی وزارت کا زمانہ نہیں پایا (ب) قمرالدین خاں محمد امین خاں مذکور کے بیٹے تھے۔ آزاد

اس سے بالکل ناواقف معلوم ہوتے ہیں (ج) آزاد نے واقعہ جس طرح بیان کیا ہے، کہیں اور نہیں ملتا، تذکرۂ حسینی (م و ۱۵) میں جس کا مصنف بڑا افسانہ دوست ہے، یہ اس طرح درج ہے:
بیدل آصف جاہ کے یہاں گئے تھے کہ وہاں محمد امین خاں پہنچے، انھوں نے ایک "فقیر ریش و بروت تراشیدہ" کو دیکھا تو دریافت کیا کہ کون ہیں۔ آصف جاہ سے معلوم ہوا کہ بیدل ہیں تو "استکراہاً" ان سے پوچھا: "ہمیں را فقیری نامیدۂ کہ ریش و بروت تراشیدۂ؟" بیدل نے جواب دیا: "ریش خود تراشیدہ ام، دل کسے نخراشیدہ ام" (یہ نثر ہے، آزاد کے یہاں نظم) صاحب تذکرہ کا بیان ہے کہ اس پر "خان مزبور... دست بخنجر گذاشت، مرزا.. ازیں طرف مشتے بر داشت" آصفجاہ نے صلح کرادی۔

(۱۹۱) ایک کابلی سوداگر کے سب انار گل گئے، چند دانے جو باقی رہ گئے تھے بطور نذر بیدل کے پاس لایا۔ انھوں نے اسے شعر ذیل لکھ کر دیا کہ نواب لطف اللہ خاں کے پاس لے جائے۔

بخیۂ کفشم اگر دنداں نما شد عیب نیست   خندہ دارد چرخ ہم بہ ہرزہ گردیہائے من

"نواب اسے حسن طلب سمجھے کہ شاید مرزا کی جوتی ٹوٹ گئی ہے اور نہایت غنیمت سمجھے۔ اسی وقت ایک لاکھ روپیہ بھیج دیا میرزا نے کل روپیہ اسی.. کو دیدیا" (نگار ص۱۵) لطف اللہ خاں ابن شکر اللہ خاں (اور اسی سے بیدل کے تعلقات تھے) اتنا دولت مند نہ تھا کہ لاکھ روپے اس طرح بھیج دیتا اور نہ بیدل اتنے فیاض تھے کہ اتنی بڑی رقم سوداگر کو دیدیتے۔ اختراعی حکایت ہے۔

(۱۹۲) آہ سرکردۂ ارباب سخن   از غم آباد جہاں خرم رفت
گفت تاریخ وفاتش ہاتف   میرزا بیدل ازیں عالم رفت

نگار ص۱۸ میں یہ قطعہ اسی طرح ہے، لیکن خزانۂ عامرہ م میں "آہ" کی جگہ "سو" "ہاتف" کے عوض "آزاد" اور "ازیں" کے بدلے "از" ہے۔ "ازیں" ہو تو ۱۱۹۳ اور "از" ہو تو ۱۱۳۳ نکلتا ہے۔

(۱۹۳) بیدل کا سال وفات ۱۱۹۳ھ ہے نگار ص۱۸، صحیح ۱۱۳۳ھ اور یہ متفق علیہ ہے۔ سفینۂ خوشگو میں متعدد تاریخیں ہیں، جن میں سے ایک جو خود خوشگو کی کہی ہوئی ہے، یہ ہے: "یوم پنجشنبہ چہارم ماہ صفر"

(۱۹۴) "بڈھے بڈھے آدمیوں سے جو اس (بیدل) کے قریب زمانے میں موجود تھے، سنا گیا کہ.. بہت قوی تھا.." نگار ص۱۷۔ آزاد جن کی پیدائش ۱۲۴۵ھ کی ہے (نقوش شخصیات نمبر ص۱۰) ایسے آدمیوں سے نہیں مل سکتے تھے، مگر آزاد کے نزدیک سال وفات ۱۱۹۳ھ ہے اور اس صورت

میں یہ مستبعد نہیں۔

(۱۹۵) بیدل کی قبر پران کا دیوان رکھا رہتا ہے نگار ص۱۸۱ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ زمانۂ آزاد میں یہ کیفیت تھی لیکن، اس سے بہت پہلے وہ مکان جہاں ان کا مزار تھا، "ویران محض" ہو چکا تھا (عقد ثریا ص۱۱)

(۱۹۶) "خان آرزو کے طرفدار، شاہ لدھا بلگرامی نے شیخ کے پاس جاکر بے اظہار نام یہ شعر بہ ہمانۂ اصلاح پیش کیا: "بتے دارم کہ باشد از حیا مشاطگی تنگش الخ" (ننگش ؟) شیخ نے مسکرا کر کہا کہ معلوم میشود کہ از کاسہ لیسان حرامزادۂ اکبرآبادیست" نگار ص۲۱۴ ۔ (الف) سید لطف اللہ عرف شاہ لدھا بلگرامی (آزاد بلگرامی کے پیر) صوفی تھے، مگر ان کا شاعر ہونا ثابت نہیں۔ بتے دارم الخ کا مصنف نہ معلوم کون ہے (ب) شاعر بلگرامی (خال آزاد) کی تبصرۃ الناظرین سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ لدھا کی وفات ۱۱۴۳ھ میں ہوئی تھی (م ص۳۲۷)۔ حزیں، جیسا کہ نگار ص۲۰ میں ہے ۱۱۴۶ھ میں وارد ہند ہوئے تھے، ظاہر ہے کہ ان کا حزیں سے ملنا ممکن نہ تھا (ج) حزیں و آرزو میں علمی و ادبی منازعہ تھا، آرزو نے کبھی دشنام طرازی سے کام نہیں لیا، کوئی وجہ نہیں کہ حزیں گالی گلوچ پر اتر آتے جناب ڈاکٹر انور سہائے انور نے جو آرزو پر ایک بسیط تحقیقی مقالے کے مصنف ہیں، معاصر حصۂ ۱ ص۳۹ میں لکھا ہے کہ محسن (میر کا بھتیجا اور آرزو کے بھانجے کا بیٹا، یہ آرزو کا بڑا معتقد تھا) محاکمات الشعرا میں حزیں کا نام ہمیشہ احترام سے لیتا ہے، حزیں کا رویہ وہ رہا ہوتا جو آزاد کہتے ہیں کہ تھا، تو محاکمات میں اس کا ردِ عمل ضرور نظر آتا۔

(۱۹۷) آزاد رجم الشیاطین کے مطالعے کے مدعی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ حزیں کی طرف سے آرزو کی تنبیہ الغافلین کا جواب ہے اور اس کے دیباچے میں ان کی طرف ان الفاظ میں اشارہ ہے: "یکے از جرگۂ حرامزادگان اکبرآباد" ص۲۱۳۔ جناب انور کا قول ہے کہ یہ نہ ہندوستان کے کسی کتب خانے میں ہے اور نہ کسی فہرست مخطوطات میں اس کا ذکر ہے۔ گمان غالب ہے کہ... لکھا ہی نہیں گیا، حزیں اور آرزو کے جانبدار اور محسن اس سے بے خبر ہیں۔ تنبیہ کی اشاعت کے ۷ برس بعد آرزو نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ کسی ایرانی یا ہندوستانی نے اس کا رد نہیں لکھا (معاصر ا ص۴۳) میرے نزدیک یہ متیقن ہے کہ حزیں نے جو آرزو کو اپنا حریف نہیں سمجھتے تھے، تنبیہ کا جواب نہیں لکھا۔ صاحب صبح گلشن (اواخر مادۂ ۱۳) کا بیان ہے کہ رجم سیالکوٹی مل، وارستہ کی جانب سے آرزو کی کتاب کا جواب ہے (ترجمۂ وارستہ)۔ وارستہ آرزو پر اعتراض سے نہیں چوکتا، لیکن وہ ان کا احترام ملحوظ رکھتا ہے۔ اس کا شمار نصیریان حزیں میں بھی نہیں، خود اس نے حزیں پر اعتراض کیے ہیں (بیاد عجم ا ص—)۔ وہ اگر تنبیہ کا رد لکھتا بھی تو اس کا نام رجم الشیاطین نہ رکھتا۔ یہ کتاب اگر وجود خارجی رکھتی ہے تو کوئی اور شخص اس کا مصنف ہے۔

(۱۹۸) دربارۂ آرزو بحوالۂ خزانۂ عامرہ: "باپ .. اور ماں کی طرف سے محمد غوث گوالیاری سے سلسلۂ خاندان ملتا ہے"۔ نگار ص۲۱۰ خزانۂ عامرہ م و ۹۴ میں صراحۃً مرقوم ہے کہ آرزو کے والد کا سلسلۂ نسب کمال الدین خواہر زادۂ چراغ دہلی تک پہنچتا تھا۔ خود آرزو نے بھی یہی لکھا ہے (مجمع النفائس م و ۴۴)

(۱۹۹) "محمد شاہ .. خود اس کی ملاقات کو آیا، شیخ .. بوریے پر بیٹھا تھا، کنارہ اس کا اٹھا کر ایک قطعہ الماس بقدر کف دست نکالا اور سامنے رکھ کر کہا:

برگ سبز است تحفۂ درویش   چہ کند بینوا ہمیں دارد

محمد شاہ نے چند مرتبہ کئی لاکھ روپیہ بنام ضیافت دینا چاہا، شیخ نے یہی کہا کہ بسیر ہندوستان آمدہ ام برائے گدائی نیامدہ ام"۔ نگار ص۲۱۲ شجاع الدولہ آصف الدولہ کو ساتھ لے کر ملنے گیا اور اشرفیوں کے دو خوان پیش کئے۔ حزیں نے "پیش خدمت" کو اشارہ کیا کہ "چیزے برائے سرشار صاحبزادہ بیارید" وہ ویسے ہی ۱۱ خوان اشرفیوں کے لے آیا۔ ص۲۱۳ یاریاں صحبت میں سے ایک کی زبانی روایت ہے کہ ایک حجرے سے جہاں بالکل زر پڑے تھے، اور یہ بات نوکر کو اچھی طرح معلوم تھی، زر پڑ لانے کو کہا، وہ "چند توڑے" لے آیا ص۲۱۶ "شیخ .. قناعت اور پاس وضع میں لاثانی تھا۔ دربار محمد شاہی سے بھی اس کی مدد ہوتی تھی۔ امرائے عہد خصوصاً نواب اودھ و مرشد آباد و بہار و بنگالہ وغیرہ اس کی خدمت کرنے .. سعادت سمجھ کر خفیہ سلوک کرتے تھے۔ جہلا .. اسے دست غیب سمجھتے تھے" ص۲۱۶۔ (الف) محمد شاہ اور حزیں کی ملاقات نہیں ہوئی (عقد ثریا ترجمۂ حزیں) اور ہوتی بھی تو اتنا بڑا ہیرا حزیں کہاں سے لاتے کہ نذر کرتے۔ یہ بات نگار کے سوا کہیں اور نہیں ملتی (ب) "محمد شاہ نے چند .. نیامدہ ام" اور "دربار محمد شاہ .. تھے" میں تناقض صریح ہے، مگر آزاد کو اس کا احساس نہیں (ج) حقیقت یہ ہے کہ مختلف ذرائع سے اس کی مدد ہوتی تھی، مگر نہ اتنی کہ اشرفیوں کے ۱۱ خوان نثار کر سکے۔ "دست غیب" کو خود آزاد نہیں مانتے۔ مجمع النفائس میں لکھا ہے کہ "عمدۃ الملک قریب بیست لک دام جید از بادشاہ برائے او گرفتہ، پس بجمعیت گذرانید" و ۱۲۳ (د) "نواب .. بنگالہ" مرشد آباد بنگالہ میں شامل ہے، اس لیے آزاد کی عبارت درست نہیں۔

(۲۰۰) نگار بحوالۂ سیر المتاخرین: "بادشاہ نے بہت التجا سے وزارت تک دینی چاہی، مگر .. قبول نہ کی" ص۲۱۷ (الف) غلام حسین، مصنف سیر بقول خود ۱۱۴۰ھ میں متولد ہوئے تھے (سیر ص۹۴۰) اور جس وقت حزیں وارد ہند ہوئے، طفل مکتب نشین تھے، اگر وزارت اوائل ہی میں پیش کی گئی تھی، تو ان کی عمر ایسی نہ تھی کہ ذاتی علم سے اس کا ذکر کر سکیں۔ حملۂ نادری کے بعد کی بات ہے، تو اس وقت عمدۃ الملک (عمدۃ الملک وغیرہ کے ذریعے وزارت مکرر پیش کی سیر ص۱۱۶) خود خواہان وزارت

تھے، بلکہ محمد شاہ نے ان سے وعدہ بھی کر لیا تھا۔ موتمن الدولہ اپنے معتمد سے جو عمدۃ الملک کا ہم مذہب اور متوسل تھا، مشورہ کیا تو اس نے یہ جواب دیا: " ہر چند عمدۃ الملک امیر ابن الامیر صاحب جرات صائب تدبیر است، اما آصف جاہ و اعتماد الدولہ را جمیع اقویاے ہند بنظر امیدمے بینند و اطاعت آنہارا سرمایۂ حصول مآرب ..خود میدانند۔ باعتماد امثال مامردم بر ہم زدن اینہا بنظم.. دولت خواہ مقرون بصلاح نیست " (سیر ص۸۴۸ ـ) (ب) حزیں شاعر اور ذی علم شخص تھے، لیکن نہ خود انتظامی صلاحیت کا اظہار کر چکے تھے اور نہ ان کے خاندان کے ارکان تدبر اور ملک داری کے لئے شہرت رکھتے تھے؛ ایسے شخص کو وزارت پیش کرنا بعید دور از قیاس ہے۔ (ج) حزیں جس وقت دہلی پہنچے ہیں اعتماد الدولہ قمر الدین خاں (آصف جاہ کے رشتہ دار اور سمدھی) وزیر تھے، اور اواخر عہد محمد شاہ تک یہی اس عہدے پر رہے۔ یہ دونوں اس زمانے کے مقتدر ترین امیر تھے، ایک شاعر کے لئے جو ادبی حلقوں سے باہر چنداں شہرت بھی نہیں رکھتا تھا، ان دونوں سے بگاڑ مول لینا دیوانگی ہوتی (د) غلام حسین اور ان کے مقلدین کے سوا اس پیشکش کا کسی نے ذکر نہیں کیا اور میرے نزدیک اس کی کچھ اصل نہیں۔

(۳۴)

۴) آزاد کی عام روش ہے کہ اشعار دیکھ کر حکایات وضع کر لیتے ہیں۔ کلیات میر میں ایسے اشعار جن میں مختلف فرقوں کے نوجوانوں یا لڑکوں کا ذکر ہے، بہت ہیں، جن میں سے بعض یہاں پر نقل کیے جاتے ہیں:

کیفیتیں عطار کے لونڈے میں بہت تھیں   اس نسخے کی ہم کو نہ رہی کوئی دوا یاد   ص۲۶۲

میر کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب   اسی عطار کے لڑکے سے دوا لیتے ہیں   ص۵۰۲

سجدہ کریں ہیں سن کر او باش سارے اس کو ۔۔۔ سید پسر وہ پیارا ہے گا امام بانکا ص۱۱

ترش رو بہت ہے وہ زرگر پسر ۔۔۔ پڑے ہیں کھٹائی میں مدت سے ہم ص۲۸۹

وہ صوفی کا کم ملتا ہی میل دل اور مری بہت ۔۔۔ کوئی کہے اس سے ملنے میں تجھ کو کیا ہم ڈھولیں ہیں ص۵۰

آزاد نے عطار بچے سے متعلق اشعار دیکھے (غنیمت ہے کہ سید پسر وغیرہ کے بارے میں جو اشعار ہیں، ان پر ان کی نظر نہیں پڑی) تو پہلے یہ لکھا: "معلوم ہوتا ہے کہ.. طبیعت کبھی کبھی شگفتہ بھی ہو جاتی تھی، چنانچہ ایک عطار کی دکان پر بیٹھا کرتے تھے، وہ نوجوان تھا اور خوش پوشی کا اسے شوق تھا، چنانچہ اس کا دل خوش کرنے کو فرماتے ہیں: "کیفیتیں الخ" آب اشاعت ا ص۲۳۸ ("میر کیا سادے الخ" حاشیے میں بدون عبارت نثر)، لیکن، اس سے جی بھر گیا تو اشاعت ثانی میں ان کے قلم سے یہ نکلا: "محلے کے بازار میں عطار کی دکان تھی، آپ بھی کبھی کبھی اس کی دکان پر جا بیٹھتے تھے۔ اس کا نوجوان لڑکا بہت بناؤ سنگار کرتا رہتا تھا۔ میر.. کو بڑا معلوم ہوتا تھا، اس پر فرماتے ہیں "کیفیتیں الخ" کسی وقت طبیعت شگفتہ ہو گئی ہو گی جو فرماتے ہیں "میر کیا سادے الخ" ص۲۲۱۔

(۲۰۲) سخن ص۶۴ میں عبارت ذیل کے متعلق بتایا گیا ہے کہ گلستان میں ہے: "چہ حرامزادہ مردمانند کہ سگہا را بستہ اند و سگہا را گشادہ" مجھے شبہ ہوا تو میں نے ایک نولکشوری نسخہ اور وہ نسخہ جو کلیات سعدی مرتبہ فروغی طبع ایران میں شامل ہے دیکھا، اور یہ عبارت ان میں نہ ملی۔ اگر کسی نسخے میں کسی صاحب کی نظر سے گذری ہو، تو براہ کرم مجھے مطلع فرمائیں۔

(۲۰۳) آبرو کے "شعر جب تک پیر مکھن، پاکباز کے کلام سے چپڑے نہ جائیں تب تک مزا نہ دیں گے، اس لیے پہلے ایک شعر ان کا ہی لکھتا ہوں" آب ص۹۷۔ آزاد نے آبرو کا صرف ایک شعر ایسا دیا ہے جس میں "مکھن میاں" کو یاد کیا ہے، اور ان کا سجع جو آبرو نے کہا تھا، وہ اس کے علاوہ ہے۔ آبرو و پاکباز کے تعلقات کیسے ہی کچھ نہ رہے ہوں، آبرو کے کلام سے لطف اٹھانے کے لیے پاکباز کے اس شعر کا دیکھنا جو آب میں ہے، قطعاً غیر ضروری ہے اور صرف رعایت لفظی کا شوق عبارت بالا کے لکھے جانے کا ذمہ دار ہے۔ اس سے قطع نظر، پاکباز کو "پیر مکھن" کسی نے نہیں لکھا "میر مکھن" صحیح ہے (فہرست اشپرنگر ص۲۵۷)

(۲۰۴) ولی کا دیوان پیرس اور لندن میں چھپ گیا ہے آب ص۹۳۔ جہاں تک لندن کا تعلق ہے، آزاد کا قول غلط ہے، پیرس نسخہ دتاسی کا مرتب کردہ ہے اور ۱۸۳۳ء میں طبع ہوا تھا۔

(۲۰۵) صاحب نوطرز مرصع کا نام میر محمد عطا حسین خاں ہے آب ص۲۵ دیباچۂ نوطرز مرصع (غالباً "ناکمل") تذکرۂ مسرت افزا میں نقل ہوا ہے، اس میں نام میر محمد حسین عطا خاں ص۱۵۹، خود صاحب تذکرہ نے صرف

حسین عطا خاں لکھا ہے ص۱۸۔

(۱۷) نوطرز مرصع ۱۷۹۸ء = ۱۲۱۳ھ عہد آصف الدولہ میں ختم ہوئی آب ص۲۵۔ آصف الدولہ کی موت ربیع الاول ۱۲۱۲ھ = ستمبر ۱۷۹۷ء میں واقع ہوئی۔ ۱۷۹۸ء = ۱۲۱۳ھ عہد آصف الدولہ سے تعلق نہیں رکھتا۔ اس سے قطع نظر، یہ کتاب سودا کے دوران حیات میں مکمل ہو چکی تھی (اردو نثری داستانیں از ڈاکٹر گیان چند جین ص۱۴۶)

(۱۸) میرامن نے ۱۲۱۷ھ میں باغ و بہار لکھی، اور انھیں دنوں میں اخلاق محسنی کا ترجمہ کیا۔ "ساتھ ہی جان گلکرسٹ.. نے انگریزی میں قواعد اردو لکھی"، ۱۲۱۸ھ میں پریم ساگر اور بیتال پچیسی وجود میں آئیں "لیکن اس نقارۂ فخر کی آواز کو کوئی دبا نہیں سکتا کہ میر انشاء اللہ خاں پہلے شخص ہیں جنھوں نے ۱۲۲۲ھ میں قواعد اردو لکھ کر ایجاد کی ٹہنی میں ظرافت کے پھول کھلائے" آب ص۲۶۔ اس موقع پر ادر امور سے بحث نہیں، دکھانا صرف یہ ہے کہ گلکرسٹ کی قواعد اردو ۱۲۲۲ھ سے قبل ہی لکھی جا چکی تھی اور آزاد کو اس کا اقرار ہے تو یہ کس طرح لکھا کہ انشا پہلے قواعد نگار ہیں۔ یہ مطلب تو ہو نہیں سکتا کہ انشا سے پہلے کسی نے قواعد میں ظرافت کی آمیزش نہیں کی۔ اگر یہ مراد ہے کہ اردو بولنے والوں میں ان سے پہلے قواعد کی کتاب کسی نے نہیں لکھی، تو یہ المعنی فی بطن الشاعر کا مصداق ہے۔

(۱۹) آب ص۹۰ میں ولی کو شاہ گلشن کا مرید لکھا ہے۔ نورالمعرفت میں مرید نہیں شاگرد ہے۔ آزاد کے بیان کی تصدیق نہیں ہوتی۔

(۲۰) احسن ایہام گو معاصر آبرو کا نام محمد احسن لکھا ہے آب ص۱۰۶، لیکن خود آب میں یہ مصرع نقل ہوا ہے: "یہی مضمون خط ہے احسن اللہ" اور دیباچۂ دیوان زادۂ حاتم کا جو خلاصہ درج ہے اس میں بھی احسن اللہ ہے ص۱۱۱۔ تذکروں سے قطع نظر کرکے مزید ثبوت کے طور پر دیوان تاباں کا یہ شعر پیش کیا جاتا ہے:

"آبرو یک رنگ نا جی احسن اللہ اور ولی ریختہ کہتے نہ تھے تاباں مرے سودا کی طرح" ص۱۸

(۲۱) "شاہ حاتم نے بڑی کوشش کرکے ان رنگ امیزیوں (ایہام) سے اردو کو پاک کیا چنانچہ ان کے حال میں معلوم ہوگا" آب ص۷۱۔ حاتم خود ایہام بند اور مقلدین آبرو میں تھے، لیکن جب مظہر، سودا وغیرہ ایہام کے مخالف ہوئے تو انھوں نے بھی اس صفت کو برتنا بند کر دیا۔ یہ اس معاملے میں بھی مجتہد نہیں مقلد ہیں (دیوان زادۂ حاتم کے دیباچے کا جو خلاصہ آب ص۱۱۱ میں ہے اور مکمل دیباچے میں بھی) ایک لفظ ایہام کے خلاف نہیں اور خود آزاد نے بھی ان کے ترجمے میں حاتم کی مخالفت ایہام کا مطلقاً ذکر نہیں کیا۔

(۲۲) "خیال ان انکھڑیوں کا چھوڑ مت مرنے کے بعد بھی دلا آیا جو تو اس میکدے میں جام لیتا جا" آب ص۱۴۱ آزاد نے اسے سودا کے نام سے لکھا ہے، لیکن سوز کا شعر ہے" (آوارہ گرد اشعار" اگست ۱۹۶۷ء کا جزو کراچی)

(۲۱۲) جرأت کے باپ کا نام حافظ امان لکھنے کے بعد، یہ تحریر کیا ہے کہ "ان کے خاندان کا سلسلہ رائے امان محمد شاہی سے ملتا ہے، اور امان کا لفظ اکبری زمانے سے ان کے خاندان کے ناموں کا خلعت چلا آتا ہے" آب ص ۲۳۶ "امان" نہیں "مان" چاہیے۔ مفید المخلص مصنفہ شاہ غلام علی (شاہ عزیز اللہ دہلوی متوفی ۱۱۸۴ھ کی اولاد سے تھے) کے ایک قدیم نسخے میں یہی ہے۔ آب میں ایک گلی کا نام رائے مان کا کوچہ لکھا ہے (ص ۲۳۶) یہ بھی "مان" کا مصدق ہے۔ آزاد نے رائے مان کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ پڑھنے والا یہ گمان کر سکتا ہے کہ حافظ مان کے باپ یا دادا تھے، لیکن یہ دونوں بقول شاہ غلام علی حقیقی بھائی تھے اور حافظ مان نے نادر گردی میں شاہ غلام علی کے اجداد میں سے کسی کے یہاں پناہ لی تھی (مفید المخلص ورق)

(۲۱۳) ناسخ ۱۲۵۴ھ میں چونسٹھ پینسٹھ برس کی عمر میں مرے (آب طبع اص ۳۶۳) لیکن طبع ما بعد میں ہے: "لوگ کہتے ہیں ۶۴، ۶۵ برس کی عمر تھی مگر رغمی سلمہ اللہ لکھتے ہیں کہ تقریباً سو برس کی عمر ہوگی۔ اکثر عہد سلف کے معرکے اور نواب شجاع الدولہ کی باتیں آنکھوں سے دیکھی بیان کرتے تھے" ص ۳۶۳ یہ پتا نہ چلا کہ آزاد دونوں میں سے کسے ترجیح دیتے ہیں، ان راویوں کو جن کا نام وہ نہیں بتاتے یا رغمی کو۔ رغمی اور آزاد کے زمانۂ پیدائش کو دیکھتے ہوئے آصف الدولہ سعادت علی خاں کا وقت بھی "عہد سلف" کہا جا سکتا ہے اور اس کے لیے مطلقاً ضروری نہیں کہ ناسخ کی عمر "تقریباً ۱۰۰ برس" تسلیم کی جائے۔ رہے شجاع الدولہ تو وہ اواخر ۱۱۸۸ھ میں فوت ہوئے ہیں، اور ان کے آخری زمانے کی باتیں وہ شخص بھی چشم دید بیان کر سکتا ہے، جو ان کی موت کے وقت چار پانچ سال کا تھا۔ رغمی کوئی خاص بات اس زمانے کی بتاتے اور وہ ایسی ہوتی کہ ایک کمسن بچہ ان کا راوی نہیں ہو سکتا تو اور بات تھی۔ میری رائے میں نہ چونسٹھ پینسٹھ ٹھیک ہے، نہ "تقریباً سو برس" مصحفی نے ریاض الفصحا میں ناسخ کی عمر ۳۶ سال لکھی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ۲۰ سال سے شعر کہتے ہیں۔ مصحفی نے دیوان کے دیباچے میں (رجوع بہ ۷۰)، جو ۱۲۲۴ھ میں مسطور ہوا تھا، اعتراف کیا ہے کہ یہ طرز خاص کے موجد ہیں اور میں خود اور آتش و حیثی ان کے مقلد ہیں۔ اگر ناسخ کا ترجمہ ریاض کے سال آغاز یعنی ۱۲۲۱ھ میں یا اس کے کچھ ہی بعد سپرد قلم ہوا ہے، تو ناسخ کی پیدائش، ۱۱۸۵ھ کے لگ بھگ ٹھہرتی ہے۔ مصحفی کا بیان صحیح ہے تو یہ آخری حد ہے، ولادت اس سے پیشتر کی نہیں ہو سکتی؛ رغمی کا قول صحیح ماننے میں یہ خرابی ہے کہ یہ مصحفی کے ہم عمر (عمر ۱۰۰ مانی جائے، تو بڑھے) اور انشا و رنگیں و قتیل سے کئی سال بڑے قرار پاتے ہیں۔ اس بنا پر کہ ریاض کا اختتام ۱۲۳۶ھ میں ہوا ہے، یہ کہا جائے کہ ۱۲۲۱ھ کے چند سال بعد ان کا ترجمہ قلم بند ہوا تھا، تو ناسخ کو اس مرتبے پر پہنچنے کے لیے کہ مصحفی سا کہنہ مشق شاعر جو سادہ گوئی کو پسند کرتا ہو، ان کے کلام کی مقبولیت دیکھ کر ان کے تتبع پر مجبور ہو، کافی وقت نہیں ملتا (دیباچۂ دیوان ۶)۔ میری رائے میں یہ بہت قرین قیاس ہے کہ یہ ۱۱۸۴ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے، اس حساب سے انھوں نے ۷۰ برس کی عمر پائی۔

(۲۱۴) "دیوان .. میں غزلوں تاریخوں کے سوا اور قسم کی نظم نہیں" آب ص۳۵۳ کلیات ناسخ (مطبع محمدی و مطبع نظامی) میں کئی سو اشعار کی ایک مذہبی مثنوی موجود ہے، جو ان نول کشوری نسخوں سے جو میری نظر سے گزرے ہیں، غیر حاضر ہے۔ یہ مثنوی بیس پچیس سال قبل الگ سے کتابی شکل میں بھی چھپی تھی۔ کلیات مطبوعۂ مطبع محمدی سے متعلق اطلاع جناب سید مسعود حسن رضوی سے ملی ہے۔

(۲۱۵) "اس عہد تک لکھنؤ بھی آج کا لکھنؤ نہ تھا .. ذوق کا یہ مطلع جب وہاں پڑھا گیا:

خبر کر جنگ نوفل کی تو مجنوں اہل ہاموں کو
کبادہ تا جیا کھچوائے شاخ بید مجنوں کو

سب نے اسے بے معنی کہا، شیخ صاحب (ناسخ) نے جنگ نوفل کا واقعہ اور کبادہ کھینچنے کی اصطلاح بتائی، پھر سب نے تسلیم کیا، لیکن یہ امر نہ کچھ دلی والوں کے لیے موجب فخر ہے نہ لکھنؤ والوں کے لیے باعث بخش، آخر دلی بھی ایک دن میں شاہجہاں آباد نہیں ہو گئی تھی، میر تقی اور مرزا رفیع پیدا ہوتے ہی میر اور سودا نہیں ہو گئے" آب ص۳۰۱ اگر جس وقت یہ شعر لکھنؤ گیا ہے ذوق کی عمر ۲۵ سال کی تھی تو یہ سعادت علی خاں کا آخری زمانہ تھا، اور وہاں قتیل سا فارسی داں موجود تھا جو ہندوستان گیر شہرت کا مالک تھا اور جس کے مقابلے کا کوئی ایران شناس اس زمانے میں دہلی میں نہ تھا؛ رہے علما یعنی مصطلحہ تو اس وقت مفتی غلام حضرت، مرزا حسن علی (صغیر) محدث، سید دلدار علی، ظہور اللہ فرنگی محلی، احمد انوار الحق، عبد الوالی، نور الحق وغیرہ ما موجود تھے اور بحر العلوم لکھنوی زندہ تھے گو ان کا قیام وہاں نہ تھا۔ عہد سعادت علی خاں میں ہوس شاگرد مصحفی نے لیلی و مجنوں کا قصہ بطور مثنوی لکھا جس میں نوفل کی جنگ کا حال بھی شامل ہے (نول ۱۸۸۵ء ص۳۰) واضح رہے کہ اس موضوع پر نظامی کی جو مثنوی ہے اس میں بھی اس جنگ کا مذکور ہے۔ کبادہ "کمان بسیار نرم کہ آنرا چند جا چاک زنند تا از زور بیفتد و نہایت نرم گردد اعم از آنکہ چلۂ آں رودہ باشد کہ ایں در مشق تیر اندازی بکار آید و خواہ .. از زنجیر باشد کہ در ورزش کشتی گیراں بکار آید و کمان فولاد نیز ہمیں است و در عرف ہندوستان لیزم گویند .. محسن تاثیر! .. در پنجۂ کشا کش گردون کبادہ" (بہار عجم جلد ۱ ص۲۹)۔ یہ بات کہ لکھنؤ میں ناسخ کے سوا نہ کسی کو جنگ نوفل کا حال معلوم تھا اور نہ کوئی کبادہ کھینچنے کی اصطلاح سے واقف تھا، مضحکہ خیز ہے۔

(۲۱۶) ولی کا دیوان دلی پہنچا تو "گیت موقوف ہو گئے، قوال معرفت کی محفلوں میں انھیں کی غزلیں گانے بجانے لگے، ارباب نشاط یاروں کو سنانے لگے" آب ص۹۲ یہ سب الہامی باتیں ہیں، ان کا ثبوت موجود نہیں۔ "موقوف ہو گئے" خاص طور پر قابل توجہ ہے۔

(۲۱۷) "۱۲۴۵ھ و ۱۸۲۸ء میں اسد اللہ الغالب کی رعایت سے غالب تخلص اختیار کیا" آب اشاعت ۲ ص۵۰،

ایضاً اشاعت اول ۱۲۴۴ھ ۱۲۴۴ھ ۱۸۲۸ء کے مطابق نہیں، یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ ایک ہی واقعہ (تبدیلِ تخلص) دو مختلف زمانوں میں کیونکر ظہور میں آیا۔ تبدیلِ تخلص ان دونوں سنوں سے قبل کی بات ہے، چنانچہ بھوپالی نسخۂ دیوان میں غالب تخلص کی غزلیں ہیں۔

(۲۱۸) معتمد الدولہ آغا میر ناسخ کے "با اخلاص شاگرد" تھے آب ص ۳۴۲، ۱۸۳۱ء میں انھوں نے قصیدے کا صلہ سوا لاکھ روپیہ دیا، ناسخ مرزائی صاحب کے حوالے کر دیا، یہ سمجھ کر کہ رُپے ناسخ ہی کے گھر میں ہیں، چور نے نقب لگائی اور ناکام ہو گیا، ناسخ نے تاریخ کہی:

دزد در خانۂ ناسخ چو زدہ نقب امشب نہ زر و سیم نہ بد مس خجل آمد بیروں

بہر تاریخ مسیحی چو بریدم سر دزد دزد از خانۂ مفلس خجل آمد بیروں

آب ص ۲۹۸ "معتمد الدولہ اور ان کے بیٹے ہمیشہ خدمت کو حاضر رہا کرتے تھے" ص ۳۴۲ (الف) آغا میر شاعر ہی نہ تھے، شاگردی کا کیا سوال ہے۔ ان کے بیٹے البتہ شاعر تھے (ب) آزاد نے صراحۃً نہیں لکھا، لیکن صاف ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک لکھنؤ کا واقعہ ہے (ج) آغا میر ۱۸۲۸ء میں یا اس کے کچھ ہی بعد معزول ہو کر روانۂ کانپور ہو چکے تھے۔ ۱۸۳۱ء میں وہ لکھنؤ میں تھے کہاں کہ ناسخ کو قصیدے کا صلہ دیتے۔ خود ناسخ بھی اس زمانے میں وہاں نہ تھے۔ کہنے والے یہ کہہ سکتے ہیں کہ انعام کانپور میں ملا اور رُپے مرزائی صاحب کو لکھنؤ بھیجے گئے، مگر سوال یہ ہے کہ اس کا ثبوت ہی کیا ہے کہ سوا لاکھ رُپے ملے، محض آزاد کا بیان، تو اس کی حقیقت ظاہر ہو چکی ہے۔ قصیدے پر انعام ملا ہو گا مگر اتنی بڑی رقم خلافِ قیاس ہے۔ مزید یہ کہ انعام لکھنؤ میں ملا ہو گا جب وہ وزیر تھے۔ مرزائی صاحب کے یہاں امانۃً رُپے رکھوانا کہیں سے ثابت نہیں۔ (د) قطعۂ تاریخ کا کوئی تعلق زرِ انعام سے نہیں۔

(۲۱۹) واردات دردؔ کی شرح علم الکتاب ہے جس میں ۱۱۱ رسالے نالۂ درد، آہ سرد، درد دل، سوز دل، شمع محفل وغیرہ ہیں آب ص ۸۵ علم الکتاب م کو میں نے جا بجا سے دیکھا ہے، یہ رسائل نہیں، ابواب پر منقسم ہے، باب کے واسطے دردؔ نے لفظ "وارد" استعمال کیا ہے۔ درد دل وغیرہ کا اس کتاب سے کچھ سروکار نہیں، یہ غلط محض ہے کہ یہ اس کے مختلف اجزا کے نام ہیں۔

(۲۲۰) متن آب ص ۳۴۳ میں لکھا ہے کہ ناسخ فیض آباد میں پیدا ہوئے، لیکن حاشیے میں مرقوم ہے کہ زغمی کہتے ہیں کہ باپ کے ساتھ لاہور سے آئے تھے۔ زغمی امین اللہ طوفان کے بیٹے تھے جو ناسخ کے دوست تھے۔ تذکرۂ ابن طوفان میں جو اواسط مائۂ سیزدہم کا لکھا ہوا ہے صراحۃً مذکور ہے کہ ناسخ کی ولادت فیض آباد میں ہوئی تھی ص ۔ میرا خیال ہے کہ یہ تذکرہ زغمی نہیں ان کے بھائی کی تصنیف ہے، بہر حال، اس کا مصنف ناسخ کے دوران حیات میں جو کچھ لکھتا ہے وہ اس پر جو زغمی بقول آزاد کم و بیش نصف صدی بعد کہتے ہیں، ترجیح رکھتا ہے۔

(۱) ص۳۵۱ و ص۳۵۲ میں ناسخ کے حیدرآباد بلائے جانے کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس کی سند پیش نہیں کی۔ اس صورت میں کوئی وجہ نہیں کہ اسے قبول کیا جائے۔

(۲) ناسخ کے پٹنہ آنے (آب ص۳۵۲) کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ثبوت موجود نہیں۔

(۳) "سودا کا کلیات ہر جگہ مل سکتا ہے۔ حکیم سید اصلح الدین خاں نے ترتیب دیا تھا اور اس پر دیباچہ بھی لکھا تھا" آب ص۱۵۲۔ کلیات شورش ۱۸۵۷ء سے کچھ قبل پہلی بار دہلی میں چھپا۔ اس کا آغاز دیباچۂ ظہور علی سے ہوتا ہے، اس کے بعد قصیدۂ شاگرد سودا مع عبارات نثر ہے اور اس کے بعد عبرت الغافلین۔ کلیات نظم سے پیشتر اصلح الدین کا دیباچہ ہے جو سودا کے دوران حیات میں حوالۂ قلم ہوا تھا مطبوعہ کلیات اصلح الدین نہیں، بلکہ غلام احمد کا مرتب کیا ہوا ہے۔

(۴) کلیات سودا میں ۲۴ مثنویاں ہیں آب ص۱۵۲۔ کلیات مطبوعہ میں جو چھوٹی بڑی مثنویاں ہیں ان کی تعداد ۲۴ سے زیادہ ہے۔ ان میں سے کئی دراصل سودا کی نہیں، مثلاً مثنوی سرما قائم کی ہے اور لاٹھی سے متعلق مثنوی ممتاز کی ہے۔ مفصل بحث آیندہ۔

(۱) "ایک دیوان غزلوں کا بے جوان کے سامنے رائج ہوگیا تھا، دوسرا تتمہ ہے کہ پیچھے مرتب ہوا" آب ص۳۸۹ فراغ سے آتش کے ایسے گرم و پسندیدہ اشعار سنے گئے جو کلیات مروجہ میں حاضر نہیں۔ سبب یہ کہ آتش ایک صاحب کے مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے اور غزلیں پڑھ کر انھیں کے حوالے کر دیا کرتے تھے۔ وفات آتش کے بعد شاگرد دیوان مرتب کرنے لگے تو بہت سی غزلیں انھیں سے ملیں "عمداً یا ان کی بے اعتنائی سے بعض اشعار دیوان میں نہ آئے۔۔ وہ شاگرد۔۔ ناسخ کے تھے، اس لیے بدگمانی لوگوں کو گنہگار کرتی ہے" ص۳۹۶۔

(الف) آتش کے ایسے اشعار جو کلیات مروجہ میں درج نہیں، ممکن ہے کہ ہوں، لیکن ناسخ کا کوئی شاگرد اس کا ذمہ دار نہیں۔ صرف آتش ہی کا کلیات ایسا نہیں جو کل کلام مصنف پر حاوی نہیں، ایسے بہت سے کلیات موجود ہیں (ب) آتش ۱۲۶۲ھ میں فوت ہوئے ہیں۔ ان کا کلیات خود ان کا تصحیح کیا ہوا ۱۲۶۱ھ میں مطبع محمدی نے چھاپا تھا اور یہ دو دواوین پر مشتمل ہے۔ خواجہ عشرت نے آب بقا میں کلیات کی اشاعت ثانی (مطبع علوی ۱۲۶۸ھ) سے یہ عبارت نقل کی ہے: "اگرچہ سابقاً در عہد مصنف قالب طبع یافتہ بود، حالا بار دیگر بسعی موفور۔ غزلیات بقیہ از دیوان اضافہ نمودہ مع قطعات وفات مصنف ترتیب دادہ" ص۱۸۱۔ خیال آتا ہے کہ اشاعت ۲ بھی میری نظر سے گزری ہے، لیکن اس کا امکان ہے کہ یہ حافظے کا دھوکا ہو۔ بہر حال میں نے دونوں اشاعتوں کا مقابلہ نہیں کیا کہ یہ پتا چل سکے کہ اشاعت ۲ میں زائد کلام کتنا ہے۔ (ج) آزاد ان معاملات سے بالکل بے خبر ہیں، اور مشاعرے کے متعلق جو کچھ ان کے قلم سے نکلا ہے، ان کے اختراعات سے ہو تو عجب نہیں۔

(۲) "ہر زبان کے اہل کمال کی عادت ہے کہ غیر زبان کے بعض الفاظ میں اپنے محاورے کا کچھ نہ کچھ تصرف کر لیتے

ہیں" آب ص۱۹۵۱، اس کی مثالیں جو دی ہیں ان میں یہ شعر بھی ہے:

ساقی سہیں کو تری دیکھ کے گوری گوری — شمع مجلس میں ہوئی جاتی ہے تھوری تھوری

اس شعر میں کئی بدیسی لفظ ہیں، لیکن کوئی ایسا نہیں، جس میں سودا نے تصرف کیا ہو۔ "تھوڑی" دیسی لفظ گوری کا قافیہ آیا ہے، تو یہ سقم قافیہ ہے اور اس کو اکفا کہتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ یہ شعر غیر زبان میں سودا کے تصرفات کی مثال میں پیش ہوا ہے۔

(۲۲۷) دختِ رز سے کہا میخانے میں شب رندوں نے — آج تو خوب ہی خشکے تری سوکن کو لگے

آب ص۵۰۱ میں اس شعر کی تعریف ہے اور اسے احسان دہلوی سے منسوب کیا گیا ہے۔ مخزنِ فوائد مولفہ نکہت دہلوی (دختِ کو بیرن) احسان کا یہ قطعہ ہے:

دُختِ رز کہتی ہے سبزی تو مجھے لگتی ہے زہر — اے تم چاہنے اس سوت کو بیرن کو لگے

ساقیا اس کی تشفی میں بہر کیفیت یہ کہہ — بس کئی ایسے ہی خشکے تری سوکن کو لگے

دیوانِ احسان میں تو نہ آب والا شعر ہے نہ مخزن والا قطعہ، لیکن مجھے یاد ہے کہ مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم نے احسان پر جو مقالہ لکھا تھا، اس میں قطعہ موجود ہے، اور آزاد پر اعتراض بھی ہے۔

(۲۲۸) "سیامک جسے اہل ایران شت وخشور وخشوراں، برگزیدۂ یزداں، خدیو جہاں، شاہنشاہ پیشداد کہتے ہیں" سخن ص۶۔ زردشتی روایات اور شاہنامۂ فردوسی کے مطابق سیامک نہ نبی ہے نہ بادشاہ۔ دساتیری اسے نبی مانتے ہیں، لیکن اس کی بادشاہی کا دساتیر میں بھی ذکر نہیں۔ دساتیر و شاہنامہ دونوں اس پر متفق ہیں کہ باپ کی زندگی ہی میں قتل ہوا تھا۔ پیشدادی خاندان کی ابتدا ہوشنگ سے ہوتی ہے اور دساتیری اسی کو وخشوراں وخشور یعنی پیمبر پیمبراں کہتے ہیں۔ لفظ شت صاحب دساتیر کا اختراع ہے۔

(۲۲۹) "زرتشت نے روما سے علوم حاصل کیے تھے اور اضلاع شام سے خروج کیا تھا" سخن ص— یہ لا یعنی باتیں ہیں۔ شام و روما سے زرتشت کو کبھی کچھ سروکار نہیں رہا۔ زردتشت کے حالات پر جو کتاب جیکسن نے انگریزی میں لکھی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

(۲۳۰) "سال گذشتہ کی ایک تصنیف سے منکشف ہوا کہ زرتشت ساسانیوں کے عہد میں سنہ عیسوی سے تقریباً ۵۰۰ برس پہلے ہوا ہے اور اس کی تصنیف اوستا تھی۔۔ کہتے ہیں کہ اس کے ۲۰ باب تھے، ۱۹ گم ہو گئے، ایک وندیداد باقی ہے۔ جن لوگوں نے اکیسواں باب بھی کہا ہے وہ غلطی ہے پیغمبر اسلام کے قصائل و معجزات سن کر اس قسم کے مضامین پیچھے لکھے گئے اور اوستا کا اکیسواں باب کہلائے" سخن ص۳۲ خدا جانے آزاد کن ماخذ سے کام لیتے ہیں، مشکل سے ایران قدیم کے متعلق کوئی صحیح بات ان کے قلم سے نکلتی ہے۔ دینکرد سے یہ ثابت ہے کہ اوستا کے ۲۱ دفتر تھے (آزاد نے دفتر ۲۱ کی نسبت جو کچھ لکھا ہے وہ کسی یورپی کی تصنیف میں میری نظر سے نہیں گذرا، کسی

غیر معتبر ہندوستانی نے لکھا ہو تو لکھا ہو)۔ ان میں سے وندیداد مکمل موجود ہے، باقی یا تو بالکل ضائع ہو گئے یا ان کے کچھ اجزا موجود ہیں۔

(۲۳۳) خردہ اوستا" کا ترجمہ ہے اور دیباچے میں لکھا ہے کہ ساسان پنجم نے کلام الٰہی سے دری میں ترجمہ کیا" سخن ص۲۹۔ اصل و ترجمہ کا نمونہ: "نمس دوده فیروزگر بادمینوئی خورشید امرگ رایومند خرہ ہمند ارودند اسپ ہمت دہیخت دیہورشت" = "بزرگ و فیروز منشباد مینوئی خورشید بے مرگ خالص نورمند خردمند قوی اسپ بہ نیک نیت نیک گفتار نیک کردار نماز بردن" (سخن ص ـــ) ڈاکٹر محمد معین "مزدیسنا و تاثیر آں در ادبیات پارسی" میں لکھتے ہیں: "آذربد مہراسپند، موبد موبدان زمان شاپور دوم ـــ ایں کتاب ساختہ ہیں کہ دو آں بہ اے نماز و ادعیہ و اتعات روز و ایام متبرک ماہ و اعیاد مذہبی سال و دیگر مراسم و اوقات خوش و ناخوش کہ در طی زندگانی پیش آید.. مطالب و ادعیۂ آں از اوستائے بزرگ استخراج شدہ است جز آنکہ بمناسبت دعا و نماز ہر موقع در آغاز و انجام تصرفاتے کردہ اند و بعدہا نیز بشمارۂ ایں ادعیہ افزودند ـــ ہمۂ مندرجات خردہ اوستا بزبان اوستائی نیست بلکہ قسمت بزرگے از آں بزبان پازند و متعلق بازمنۂ متاخر است۔ بسیارے از نسخ خطی خردہ اوستا دارائے دعاہائے میباشند کہ در نسخ دیگر نیست" ص۲۳۲۔ ساسان پنجم دساتیر کا فرضی مترجم و مفسر (بزبان دری) ہے، اور ترجمہ و تفسیر دساتیر میں عربی کا ایک لفظ نہیں آیا، آزاد کو یہ نہ سوجھا کہ اس کے ترجمۂ خردک اوستا میں عربی الفاظ خالص، نور، اور قوی کہاں سے آ گئے۔ ساسان مذکور خسرو پرویز کا معاصر بتایا گیا ہے (دساتیر) یہ عربی الفاظ اس عہد کی کسی ایرانی کتاب میں نہیں ملتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ملا فیروز نے دساتیر شائع کی تو ان کی طرح کچھ اور زردشتی بھی اس فریب میں آ گئے کہ یہ ایرانیوں کی آسمانی کتاب ہے، اور اس کے بعد خردہ اوستا کے جو بعض فارسی تراجم بمبئی میں شائع ہوئے، ان میں دساتیر کے اقتباسات بھی تھے؛ اور ناشر نے ان کے متعلق لکھا تھا کہ اصل کا ترجمہ ساسان پنجم نے کیا تھا۔ آزاد یہ سمجھے کہ ساری خردہ اوستا ساسان ہی کی ترجمہ کی ہوئی ہے۔ خردہ اوستا کا ترجمہ آقائے پور داؤد نے بھی کیا ہے اور یہ چھپ گیا ہے۔ اس کے مقدمے میں بھی خردہ اوستا کی اصل سے بحث ہے (ص۲۶)۔ آقائے موصوف کی خردہ اوستا میں "خورشید نیایش" کی جو عبارت پازند ہے وہ آزاد کی نقل کردہ عبارت سے مختلف ہے ص۱۰۱۔

(۲۳۴) ناصر علی کے چند اشعار جو سرخوش کو بیاض فطرت میں ملے بعض ان میں سے لکھے جاتے ہیں (سخن ص۱۶۲) کلمات الشعرائے سرخوش ص۱۰۶ میں ناصر علی کے منتخب اشعار سے قبل یہ عبارت درج ہے "ایں چند شعر خوش کردۂ میر معز (فطرت) وغیرہ اعزۂ صاحب کمال است"۔ ظاہر ہے کہ یہ پتا چلانا ممکن نہیں کہ فطرت کے منتخب کردہ اشعار کون سے ہیں اور دوسروں نے کون سے اشعار چنے تھے۔ بیاض فطرت کا ترجمۂ ناصر علی میں کہیں نام بھی نہیں آیا۔

یہ اسو، درکنار، سخن ص۱۶۲ میں ناصر علی کے جو اشعار ہیں وہ کلمات سے غیر حاضر ہیں۔

(۲۲۳) آخر گل اپنی صرف درمیکدہ ہوئی — پہنچے وہاں ہی خاک جہاں کا خمیر ہو

یہ شعر گلشن بیخار، مصنفۂ شیفتہ میں جہاں دار کے نام سے ہے۔ مگر دیوان ذوق مرتبۂ آزاد میں بھی بتبدیل بعض الفاظ موجود ہے (ص۹۲)۔ اس سلسلے میں امور ذیل شایان توجہ ہیں: (الف) گلشن بیخار ذوق کے دوران حیات ہی میں دو تین بار آغا محمد باقر، پدر آزاد کے مطبع میں چھپا تھا۔ اور یقین ہے کہ ذوق کی نظر سے بھی گزرا ہوگا۔ اگر شیفتہ نے سہواً ذوق کا شعر جہاندار سے منسوب کر دیا تھا، تو اسی زمانے میں اس کی تصحیح ہو جاتی۔ ذوق کے اشعار پر اہل مطبع کی خاص توجہ رہی تھی، چنانچہ بہت سے اشعار جو شیفتہ نے نہیں لکھے تھے، اہل مطبع نے اپنی طرف سے شامل تذکرہ کر دیے ہیں۔ تفاصیل کے لیے راقم کا مقالہ "گلشن بیخار" ملاحظہ ہو، جو نوائے ادب میں شائع ہو چکا ہے (ب) ظہیر و انور وغیرہ نے جو دیوان ذوق مرتب کیا تھا اس سے یہ شعر غیر حاضر ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ذوق کو اس سے کچھ تعلق نہیں۔

(۲۲۴) ولی کی ایک "مثنوی مختصر معرکۂ کربلا کے حال میں ہے" آب ص۹۳ کلیات ولی میں صرف دو مثنویاں ہیں، اور ان میں معرکۂ کربلا کا ذکر درکنار اس کی طرف اشارہ تک نہیں۔

(۲۲۵) ایران میں ملیدے کو چنگالی کہتے ہیں سخن ص۲۴ یہ صحیح نہیں، برہان قاطع جلد ۲ مرتبۂ ڈاکٹر محمد معین ص۶۲۵ میں ہے: "چنگال .. نان گرمی را گویند کہ با روغن و شیرینی در یکدیگر مالیدہ باشند و آنرا چنگالی (صرف ایک ن) نیز گویند"

(۲۲۶) "بعض الفاظ فارسی کے اول میں الف اصلی ہے، بعض میں زائد۔ کیا عجب .. کہ .. جس لفظ کا پہلا حرف ساکن سنا ہو، اپنے تلفظ کی آسانی کے لیے اول ایک الف متحرک لگا دیا ہو، وہ زائد مشہور ہو گیا۔ جیسے اشکم شکم، اشتر شتر دونوں طرح بولتے ہیں۔ آج کون کہہ سکتا ہے کہ ان میں کہاں الف اصلی ہے اور کہاں عرب کا عطیہ ہے" سخن ص۵۶۔ اشکم و اشتر دونوں میں الف اصلی ہے، (حاشیۂ برہان قاطع جلد ۱ ص۱۳۸ و ص۱۴۰)۔ الف زائد بھی ہوتا تو اس کا عربوں سے کیا واسطہ؟

(۲۲۷) "عربی لفظوں سے فارسی طور پر اشتقاق .. فہم سے فہمیدن .. شم سے شمیدن" سخن ص۲۲۶ فارسی میں شمیدن ایک مصدر ضرور ہے، لیکن اس کا عربی شم سے کچھ تعلق نہیں۔ (رجوع بہ برہان قاطع وغیرہ)

(۲۲۸) "ایک صاحب نے ان کے سنانے کو کہا کہ شراب پینی سخت گناہ ہے۔ آپ نے سن کر کہا کہ بھلا جو پیے تو کیا ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ادنیٰ بات یہ ہے کہ دعا قبول نہیں ہوتی۔ مرزا نے کہا کہ آپ جانتے ہیں، شراب پیتا کون ہے؟ اول تو وہ کہ ایک بوتل ہو، شام کی باسامان سامنے .. ہو، دوسرے بےفکری، تیسرے صحت۔ آپ فرمائیے کہ جسے یہ سب کچھ حاصل ہے اسے اور کیا چاہیے جس کے لیے دعا کرے" آب ص۳۰ خود غالب

نے یہ لطیفہ اس طرح لکھا ہے: "ایک مولوی وعظ میں شراب کی مذمت کر رہے تھے، فرمانے لگے ادنیٰ برائی یہ۔ کہ جب تک اس کی بو۔ منہ سے آتی ہے، دعا نہیں قبول ہوتی۔ میں نے کہا کہ مولوی صاحب آدمی۔ شراب جب پیے گا کہ ۳ باتیں۔ میسر ہوں گی، پہلے تندرستی، پھر دولتمندی پھر خاطر جمعی۔ اب آپ انصاف کریں جب یہ تینوں۔ موجود ہوئیں ایسی اور کیا چیز باقی رہی کہ انسان اس کی تمنا۔ اور اس کے ملنے کے واسطے دعا کرے" (انتخاب غالب ص۳۹)

۴۳) "فارسی لفظوں کو عربی لفظوں کے قالب میں ڈھال لیتے ہیں مثلاً۔ براس حریف،۔ جام طبیب" سخن ص۱۲۲ طبیب اردو میں میر حسن و افسوس وغیرہ کے یہاں ملتا ہے، لیکن عام طور پر مروّج نہیں، بعض غیر محتاط ہندوستانی فارسی گویوں نے بھی اسے استعمال کیا ہے، لیکن نہ تو محتاط ہندوستانی فارسی گو اسے برتتے ہیں اور نہ کسی ایرانی کے یہاں پایا جاتا ہے۔ اسے مثال میں پیش کرنا نہ تھا۔

۴۴) اہل زباں نے۔ بعض الفاظ عربی ہیں۔ ساکن کو متحرک باندھا۔ ناصر خسرو: "اگر بھوے بود دردے صفوکن الخ" مصرع و قرن آز کرمت در دو جہاں بردہ نواست الخ" سخن ص۱۲۹ دوسرا شعر اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ پڑھنے والا اسے ناصر خسرو کا سمجھے گا، لیکن وہ انوری کا ہے، اور وہ مصرع جس میں قرن آیا ہے دراصل اس طرح ہے: "واے دو قرن از کرمت بردہ جہاں برگ و نوا" (کلیات انوری م ۲۲۶ و ۱۲)۔ قرن صحیح باندھا ہے۔

۴۵) آرزو کے ایک شعر پر حزیں معترض ہوئے، اس کی خبر آرزو کو ملی، وہ بہت خفا ہوئے حزیں کے پاس "اول تو کس و ناکس کو بار نہ تھی، عمائد و اراکین اگر جاتے تھے تو بپاس آداب زیادہ گفتگو بھی نہ کر سکتے۔۔ پھر جا کے مباحثہ اور وہ بھی اعتراض اس کے کلام پر۔ اس واسطے جس جلد گر کی دوکان دکان پر شیخ کی کتابیں جاتی تھیں، وہاں۔۔ آرزو نے راہ نکالی۔ اتفاقاً شیخ نے اپنی کسی کتاب کے ورق پر ایک غزل لکھی تھی اور اس کے گرد ایک سانپ کھینچا تھا۔ لطیفہ۔۔ یہ۔۔ کہ گویا یہ خزانہ اور سانپ۔۔ یہ اسے حفاظت۔۔ آرزو نے اول اس کے مطلع ہی پر اعتراض کیا کہ سانپ کا سر کچلنا چاہیے اور چند اعتراض اور بھی لکھے تاکہ شیخ کی نظر سے گذرے بعد ازاں۔۔ شاگردوں کو زبانی اس کے اشعار پر اعتراضات بتانے شروع کیے۔۔ بلکہ شیخ کے دیوان کے رد میں۔۔ تنبیہ الغافلین لکھی اس میں۔۔ ۴ شعروں پر اعتراض۔۔ ہے" نگار ص۱۱۲، تنبیہ الغافلین لکھنا صحیح (تعداد اعتراضات سے ۲ [illegible] ہوگی)، باقی سب کچھ بازاری گپ۔ آرزو نے مجمع النفائس میں حزیں کے یہاں ان سے ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ خدا جانے آزاد آرزو کو کیا سمجھتے ہیں ان کا شمار عمائد دہلی میں تھا اور انھیں خطاب خانی بھی ملا تھا۔

۴۶) فاریاب علاقۂ ترکستان میں ہے نگار ص۱۱۹ معجم البلدان جلد ۳ ص۸۴۴ میں فاریاب سے متعلق یہ عبارت ہے: "مدینۃ مشہورۃ بخراسان من اعمال جوزجان۔۔ و من فاریاب الی بلخ ستۃ مراحل"

(۲۴۳) قصۂ مہر و وفا ظہیر فاریابی کی تصنیف ہے، نگار ص۵۱ ۔ مہر و وفا رشیدی سمرقندی کا ہے (تذکرۃ الشعرا از دولت شاہ طبع یورپ ص۱۱۰)۔

(۲۴۴) آرزو حنفی تھے اور میر شیعی اور اس پر نازک مزاجی غضب، با غرض کسی مسئلے پر بگڑ کر الگ ہو گئے" (حاشیہ: "میر کلو، عرش ... سے معلوم ہوا") آب اشاعت ا ص۲۱۹، "آرزو ... ہو گئے" (حاشیہ: میر کلو عرش ... سے معلوم ہوا) آب اشاعت ا ص۲۱۹ "آرزو ... ہو گئے" (حاشیہ ندارد) اشاعت ۲ ص۲۰۳ حاشیے میں ایک ضروری بات تھی، جو ظاہر ہے سبب حذف ہوئی۔ مگر یہ بات کہ بگاڑ اختلاف عقائد کی وجہ سے ہوا ذکر میر سے ثابت نہیں۔ اس سے کچھ اور اسباب کا پتا چلتا ہے۔

(۲۴۵) "لگا کے برف میں ساقی صراحی مے لا — جگر کی آگ بجھے جلد جس سے وہ شے لا"

آب ص۱۷۲ میں جو حکایت اس کے متعلق درج ہے اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔

(۲۴۶) جامی بہارستان میں سلمان ساوجی کی بہت تعریف کرتے ہیں، "مگر کہتے ہیں کہ سرقہ کرتا تھا اور خصوصاً کمال اسمٰعیل کی چوری بہت کرتا تھا" نگار ص۱۳۶ بہارستان (کلیات جامی م ۱۸۰) "وی را معانی خاصہ بسیار است و بسا اوقات و بسیارے از معانی استادانہ بہ تخصیص کمال اسمٰعیل در اشعار خود ایراد کردہ چوں آں در صورت خوبتر و اسلوب مرغوب تر واقع شدہ محل طعن و ملامت نیست" و ۴۵۶۔ اس کے بعد جامی کا وہ قطعہ ہے جس میں انھوں نے کہا ہے کہ شاہد معنی کو پہلے سے بہتر لباس پہنایا جائے تو اچھا ہے۔

(۲۴۷) دیوان ذوق مرتبۂ آزاد ص۲۵۵ میں سکندر کی رباعی جو تذکرۂ قاسم م و ۱۳۷ میں ہے، بہ تبدیل بعض الفاظ درج ہے۔ یہ انور وغیرہ کے مرتبہ دیوان میں نہیں اور آزاد کے سوا کوئی اسے ذوق کی ملک نہیں سمجھتا:

اے زاہدو کیا تم سے جھگڑا کر لوں میں — ناحق کو دل اپنا یہ کروں کیوں خوں میں
میخوارہ و بت پرست کہتے ہو مجھے — ہوں میں ہوں جو کچھ کہ ہوں میں، ہوں میں

(۲۴۸) "تناسخ کا مسئلہ اُن (ایرانیوں) میں بھی تھا، چنانچہ جو شخص بے گناہ کو مارے اسے دوسری ولادت میں اس کا عذاب اٹھانا پڑتا تھا" سخن ص۲۱ آب ص۳۳ میں بھی ہے کہ "تناسخ کا مسئلہ دونوں (ہندو اور ایرانی) میں یکساں تھا" زردشتی قیامت کے قائل ہیں، تناسخ سے انھیں کچھ سروکار نہیں۔ تناسخ دساتیری عقیدہ ہے، اس سے مفصل بحث اس مقالے میں ہوگی جو دساتیر پر لکھا جا رہا ہے۔

(۲۴۹) سخن ص۲۱ سے (۲۴۸) میں جو عبارت نقل ہوئی ہے، اس کے بعد یہ الفاظ آتے ہیں: "ہمارے تصوف نے اس خیال کو زندہ کیا:

ہفصد و ہفتاد قالب دیدہ ام — ہم چو سبزہ بارہا روییدہ ام

کلیات رومی ص۴۴۵ میں ایک غزل ہے جس کے ۳ شعر یہ ہیں:

اے پسر اندر سپہر ہفتمیں ۔۔۔ با ملائک سالہا گر دیدہ ام
گر بگویم شرح جان خویش را ۔۔۔ نہصد و ہفتاد قالب دیدہ ام
تو مپرس تا مرا ز حال زندگی ۔۔۔ ہم چو سبزہ بارہا روییدہ ام"

مسلمانوں میں تناسخیہ فرقہ گزرا ہے، لیکن صوفی تناسخ کو نہیں مانتے۔ رومی کے اشعار میں توحید وجودی کا بیان ہے۔ آزاد نے شعر جس طرح دیا ہے، مشہور اسی طرح ہے، مگر شہرت صحت کا ثبوت نہیں ہو سکتی۔

(۲) سیامک پسر کیومرث سخن ص۱۰۲، دساتیر و شاہنامہ میں اسی طرح، لیکن اصلی زردشتی روایت کے بموجب اس کا پوتا اور دختر زادہ تھا (بندہش) مسلمان مورخ بھی اس سے ناواقف نہ تھے۔ حمزہ اصفہانی تاریخ ملوک الارض (طبع کلکتہ) میں لکھتا ہے: "سیامک بن مشی بن کیومرث (ص۲۰ ۲)" اس کتاب میں دختر کیومرث کا بھی ذکر ہے۔

(۳) "اجرام آسمانی کی عظمت واجب اور تغیرات عالم میں انھیں موثر سمجھتے .. دبستان مذاہب میں ے سیاروں کی صورتیں لکھی ہیں" سخن ص۱۰۲۔ دبستان میں اس سلسلے میں جو کچھ مرقوم ہے اس کا تعلق زردشتیوں سے نہیں، دساتیریوں سے ہے (مقالۂ دساتیر میں مفصل بحث ہوگی)

(۴) آزاد کے بیان کے مطابق عہد اکبر شاہی (آغاز ۱۲۲۱ھ) میں منت ظفر کے یہاں جایا کرتے تھے، آب ص۱۸۸، لیکن یہ مائۂ سیزدہم کے عشرۂ اول ہی میں راہی عدم ہو چکے تھے (معاصر ۸ ص ـ)

(۵) آب ص۲۴۵ میں بے سرو سامانی کے عالم میں عازم لکھنؤ ہونے، گاڑی میں زبان کے بگڑ جانے کے متعلق گفتگو، مشاعرے میں شرکت یہ سب مصنوعی باتیں ہیں۔ میر آصف الدولہ کے بلائے ہوئے گئے۔ تھے اور اخراجات سفر انھیں پیشگی مل گئے تھے۔ قطعہ بھی جو ص۲۰۶ میں میر کی طرف منسوب ہے، نہ کلیات میر میں ہے اور نہ کسی اور کتاب میں۔ میں ان امور سے نقوش میں بالتفصیل بحث کر چکا ہوں۔

(۶) انشا مرشد آباد سے دہلی آئے آب ص۲۶۲ ۔ یہ غلط محض ہے۔ مرشد آباد سے کئی جگہ ہوتے ہوئے فیض آباد پہنچے اور وہاں کئی سال مقیم رہے، اس کے بعد لکھنؤ جانا ہوا ہوگا (تذکرۂ میر حسن و سفینۂ ہندی وغیرہ)

(۷) آتش کے "کلام میں بعض الفاظ ایسے ہیں جو دلی اور لکھنؤ کی زبان میں پورب پچھم کا فرق دکھاتے ہیں۔ دلی والے اندھیری کہتے ہیں اور انھوں نے اندھیاری باندھا ہے" آب.. ص۳۹۴۔ اندھیارا یا اندھیاری خاص لکھنؤ کا لفظ نہیں، تاباں کہتا ہے: "کچھ نظر آتا نہیں جب رات اندھیاری ہوئی" (دیوان ص۱۸۹) میر کا مصرع ہے "جو جلتے رہے کہ اندھیاری" (کلیات ص۹۴۳)

(۸) "اکثر بزرگ پرانے پہاڑ مشاق.. فراق..، قاسم،.. شکیبا،.. عظیم بیگ، اور.. محب..، حافظ عبدالرحمن خاں احسان وغیرہ موجود تھے، سب ان کے دعوے سنتے تھے اور بعض موقع پر اپنی بزرگی سے ان کی طنزوں کو برداشت کرتے تھے مگر خاموش نہ کرسکتے تھے" ص۳۰۸۔ نصیر کا سال پیدائش معلوم

نہیں، لیکن قرائن کہتے ہیں کہ ۱۱۷۱ھ اور ۱۱۷۵ھ کے مابین پیدا ہوئے۔ مصحفی نے ریاض الفصحا میں ان کی عمر ۷۰ سے متجاوز بتائی ہے اور لکھا ہے کہ دہلی میں میر خرم کے یہاں جو مشاعرے کیا کرتا تھا، ان میں "چندے" شریک ہوا کیے اور اس زمانے میں ان کا کلام مبتدیانہ تھا۔ یہ بات ۱۱۹۸ھ یا اس سے بھی قبل کی ہے (سال ورود لکھنؤ ۱۱۹۸ھ)۔ اوروں سے قطع نظر، احسان کو جوان کے مقابلے میں بزرگ و کہنہ مشق دکھایا گیا ہے، مطلقاً بے اصل ہے۔ ۱۲۲۶ھ میں فوت ہوئے ہیں اور ان کی ولادت ۱۱۸۳ھ یا اس کے لگ بھگ ہوئی تھی (مزید بحث آیندہ)

(۲۵۷) افراسیاب نے بیٹے کے اغواسے سیاوش کو قتل کرا دیا ص۲۹۔ سیاوش کے قتل میں افراسیاب کے بیٹے کو دخل نہ تھا، بہکانے والا اس کا بھائی گرسیوز تھا (شاہنامۂ فردوسی جلد اول ص۲۲۵ و مابعد)

(۲۵۸) اہل تحقیق نے لکھا ہے کہ "پہلوی۔۔ ایران میں ایسی ہے جیسے ہندوستان میں کوئی مہذب پراکرت اور ایک پہلو اس کا عرب سے بھی ملا ہوا ہے" سخن ص۲۵۔ آزاد نے "اردائے ویراف" کی جو عبارت نقل کی ہے اس میں "مین" آیا ہے، آزاد کہتے ہیں کہ یہ عربی ہے؛ بعض دوسرے الفاظ کے متعلق بھی یہی کہا ہے۔ پہلوی کا عربی سے تعلق نہیں اور نہ یہ کسی واقف کار نے لکھا ہے۔ لفظ "مین" جسے آزاد عربی سمجھتے ہیں، ہزوارش ہے؛ اس کی بحث ان انگریزی کتابوں میں آچکی تھی، جو سخن سے قبل تصنیف ہوئی تھیں، لیکن آزاد جو ایران کی قدیم زبانوں کے مورخ اور ان کے تعلقات باہمی کو دکھانے والے ہیں، اس سے قطعاً بے خبر ہیں کہ ہزوارش کیا ہے۔ ہزوارش کا بیان ہوگ، دارمستٹر، وسٹ، پور داؤد وغیرہ کی تصانیف میں ملاحظہ ہو۔

(۲۵۹) مینو خرد کی نسبت لکھا ہے کہ "یہ زرتشتیوں کے کسی ایسے فرقے کی کتاب ہے جو دیوتاؤں اور موثر و توانا روحوں کو بھی یزداں کہتا تھا" سخن ص۲۹۔ زرتشتیوں کا کوئی فرقہ ایسا نہیں جو "دیوتاؤں" کو مانتا ہو، ان کے نزدیک اہورا مزدا خالق کل ہے۔ آزاد کو دھوکا اس سے ہوا کہ پہلوی میں یزت (جمع یزتاں) فرشتوں کی ایک قسم ہے جس کا رتبہ امشا سپند سے کم ہے۔ مینو خرد میں دیوتاؤں کو ہرگز یزداں نہیں کہا گیا، فرشتوں کو کہا گیا ہے۔

(۲۶۰) انیس کی زبان سے ذوق کے بارے میں "میاں سید میر کے بعد پھر دلی میں ایسا شاعر کون ہوا ہے؟" افادۂ آزاد "بزرگوں سے زبان بزبان خواجہ میر درد کے لیے یہی نام ان کی زبان پر چڑھا ہوا تھا معلوم ہوا کہ اس عہد کے لوگ انھیں میاں خواجہ میر کہتے تھے" ص۲۴۵۔ آب ص۱۸۶ میں مرقوم ہے کہ "سید انشا نے بھی لکھا ہے کہ خواجہ میر اثر مرحوم" (طبع اول ص۱۹۰ میں بھی یہی)۔ لطف یہ کہ آب ص۱۸۵ میں چھوٹے بھائی کا نام محمد میر لکھا ہے۔ اظہار رائے کی ضرورت نہیں، مگر حقیقت کا بیان لازم ہے۔ درد کا نام خواجہ میر اور اثر کا محمد میر تھا۔

(۲۶۱) غالب ۱۸۳۰ء میں کلکتہ گئے آب ص۵۰۳ غالب بتاریخ ۱۹ فروری ۱۸۲۸ء (راہ میں کئی جگہ ٹھہرتے ہوئے) کلکتہ پہنچ چکے تھے (ذکر غالب طبع ۳ ص۵۰)

(۲۶۲) "دلی میں میر۔۔ نے ایک مثنوی کہی، اپنے تئیں اژدہا قرار دیا اور شعرائے عصر میں سے کسی کو چوہا کسی کو سانپ، کسی کو بچھو، کسی کو کنکھجورا وغیرہ وغیرہ ٹھیرایا۔۔ اس قصیدے کا نام اجگرنامہ قرار دیا اور مشاعرے میں لاکر پڑھا" آب ص۲۱۰۔ اسے ص۲۱۱ میں مثنوی کہا ہے اور نام پہلے اژدرنامہ اور اس کے بعد اجگرنامہ لکھا ہے۔ مثنوی کو قصیدہ کیوں کہا، سمجھ میں نہ آیا۔ یہ دعویٰ بھی محتاج ثبوت ہے کہ اس کا نام میر نے اجگرنامہ بھی رکھا تھا۔

(۲۶۳) خسرو کے حال میں جتنی حکایتیں آب میں درج ہیں، محض بازاری گپیں ہیں؛ بعض کا ذکر سابق میں آچکا ہے، بقیہ کی طرف یہاں اشارہ کیا جاتا ہے: چار پنہاریوں کی حکایت ص۲۷، سلطان جی کے مہمان کا واقعہ ص۷۵، دھنیے کا معاملہ۔ بعض اوقات داستانوں کا پیش کرنا بھی بے محل نہیں ہوتا، مگر یہ سمجھ کر کہ داستان ہے۔ بازاری گپوں کو روایات صحیحہ کا مرتبہ دینے والا مصنف محققین میں محسوب نہیں ہو سکتا۔

(۲۶۴) خسرو کا جو کلام آب میں ہے، اس میں کوئی چیز ایسی نہیں جسے ان کی طرف منسوب کرنے کی کوئی معقول وجہ موجود ہو۔ صفت ملمع والی غزل تو میرے خیال میں شیرانی نے ثابت کر دیا ہے کہ ان کی نہیں۔

(۲۶۵) رنگیں کے بیان کے مطابق آزاد نے جو انشا کے ۳ رنگ دکھائے ہیں ان کا آغاز اس طرح کیا ہے: "خان موصوف کہا کرتے تھے" (آب ص۲۹۶) مگر یہ بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ خود آزاد کو وہ باتیں جو اس کے بعد انھوں نے لکھی ہیں، کس سے معلوم ہوئیں۔ بہرحال، جو واقعات بیان کیے ہیں ان میں سے یہ تو صحیح ہے کہ انشا آخر عمر میں مجنوں ہو گئے تھے، اور کسی کا ثبوت موجود نہیں۔ "کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں الخ" یہ غزل جو آزاد کی نظر میں انشا کے زمانۂ آخر کی ہے، مصحفی کے تذکرۂ ہندی میں جس کا اختتام ۱۲۰۹ھ میں ہوا ہے اس کے کچھ اشعار موجود ہیں۔

(۲۶۶) تربوز والی حکایت میں آزاد نے انشا سے کہلوایا ہے "ظالم کی قید میں ہوں، سو دربار کے گھر سے نکلنے کا حکم نہیں" ص۲۹۶۔ آزاد نے ص۲۹۲ میں بھی ایک منظوم فارسی رقعے کے متعلق لکھا ہے کہ "اس سے۔۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت گھر سے نکلنا بند تھا" اس کے آخری اشعار یہ ہیں:

هنوز قید نداری چو سرو آزادی — بہر کجا کہ دست می کشد سرا فرازی
تو سر بمہر منا ہمچو نامۂ شاہاں — اگرچہ فرقۂ مخصوص مطلب رازی
بایں جریمہ کہ حاضر بخدمتت نشدم — توقع اینکہ ز چشم خودم نیندازی
بدون حکم وزیر الممالک اے آغا — چساں کنم حرکت تو کریست یا بازی

نماز روزہ معافست عذر اگر باشد ۔۔۔ بگو براے چہ دیگر بہ شکوہ پردازی
بعید نیست پے سیر اگر بجانبِ من ۔۔۔ قدم گذاری گاہے ز لطف بنوازی

قید ہونے کا مدار اسی نظم پر ہے، مگر اس میں قیود ملازمت کی طرف اشارہ ہے۔ یہ بات کہ سعادت علی خاں نے انشا کو دربار کے سوا کہیں اور جانے کو منع کر دیا تھا، کہیں سے ثابت نہیں۔ اور خلاف قیاس ہے۔

(۲۶۷) انشا کے "دیوان فارسی کا یہی حال ہے باتوں ہی باتوں کا مزا ہے، جس غزل کو دیکھو دوا یرانی ہیں کہ کھڑے باتیں کر رہے ہیں اور فقط مسخرا پن، مضمون کو دیکھو تو کچھ بھی نہیں" آب ص۲۷۴ دیوان فارسی کلیات مطبوعہ میں شامل ہے۔ (ص۲۷۳ تا ص۳۰۲) اس میں ایک مصرع بھی ایسا نہیں، جس میں مسخرا پن ہو۔ شاعری کا پایہ کچھ بلند نہیں، لیکن یہ غلط ہے کہ کوئی مضمون ہی نہیں، محض باتیں ہی باتیں ہیں چند اشعار ملاحظہ ہوں:

مشرب رندانہ میداریم و میجوشیم ما ۔۔۔ باشمیم تندِ مے چوں خم ہم آغوشیم ما ص۲۷۴
حق محیط از شش جہت باشد ہنوز آگہ نیم ۔۔۔ تا مقابل ہاکہ ایم و باکہ ہمدوشیم ما
کیستیم و از کجا شد اتفاق آمدن ۔۔۔ ما نمیدانیم انشا خود فراموشیم ما
چناں افگند آہم در تزلزل عرش اعظم را ۔۔۔ کہ وہم صور اسرافیل شد عیسی مریم ما
وارستگی نگر کہ مقید بننگ نیست ۔۔۔ ایں جابسان نکہت گل، ہیچ رنگ نیست ص۲۷۷
گام نخستیں وحشتم از سدرہ بالا تر زند ۔۔۔ سوزد فروغ نور اگر جبریل آنجا پر زند ص۲۸۳
از بہر قطع ساختن از ما سواے دوست ۔۔۔ چوں لاے نہی صورت مقراض عالمیم ص۲۹۵

(۲۶۸) آزاد کا بیان ہے کہ انشا نے غزل ذیل: "اک طفل دبستاں ہے فلاطوں مرے آگے الخ" اس مشاعرۂ دہلی میں پڑھی تھی جس کا ذکر آب ص۲۶۲ میں ہے، اس کا حال انھوں نے تقریباً سب کا سب تذکرۂ قاسم سے لیا ہے، لیکن اس غزل کے متعلق اس میں ایک لفظ بھی نہیں۔ کسی دوسرے ذریعے سے بھی آزاد کے قول کی تصدیق نہیں ہوئی۔

(۲۶۹) "قتیل کے رقعوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۲۵ھ میں وہ (انشا) موقوف ہو کر خانہ نشین ہوئے تھے، مگر معلوم نہیں ہوتا کہ یہی آخری خانہ نشینی تھی یا اس کے بعد پھر بھی بحال ہوئے تھے" آب ص۲۶۹ موقوفی کا صحیح سنہ میرے اس مقالے میں ہے جو "کچھ انشا کے بارے میں" کے عنوان سے نواے ادب میں شائع ہو چکا ہے۔ برطرفی کے بعد بحالی کا ذکر کسی نے نہیں کیا۔

(۲۷۰) "راقم کے پاس جو ان (مصحفی) کے دیوان ہیں ان میں سے ایک پر دیوان ہفتم لکھا ہے اور ایک دیوان اور ہے اس میں سید انشا کے جھگڑے بھی ہیں، یہ آٹھواں ہوگا کہ سب سے اخیر ہے" آب ص۳۱۱ بیشک مصحفی کے آٹھ اردو دیوان ہیں؛ مصحفی و انشا کے معارضے سے متعلق جو اشعار ملتے ہیں وہ دیوان

سوم یا چہارم میں ہیں، اور یہ جھگڑا ۱۲۱۳ھ یا اس سے کچھ قبل ہی ختم ہو گیا تھا۔ مصحفی کا آٹھواں دیوان جس کا ایک نسخہ کتب خانۂ مشرقیہ پٹنہ میں ہے، ان کی زندگی کے آخری ایام کی تصنیف ہے، اور اس میں غالباً ۱۲۳۳ھ کے بعد کے اشعار ہیں، انشا اس کے قبل ہی فوت ہو چکے تھے، اور اس کا مصحفی و انشا کے جھگڑوں سے کچھ سروکار نہیں۔ آزاد کا قیاس کہ جو دیوان (دیوان ہفتم کے علاوہ) ان کے پاس تھا اور جس میں "انشا کے جھگڑے" ہیں وہ دیوان ہشتم ہوگا، داد طلب ہے۔ جسے وہ آٹھواں دیوان سمجھتے تھے، فی الواقع دیوان سوم ہے اور اس کی غزلیں آب میں موجود ہیں۔

(۲۷۱) "یہ سمجھ لو کہ جن الفاظ پر ہم لوگوں کے بہت کان کھڑے ہوتے ہیں، یہی ان کے اوائل عمر یا جوانی کے کلام ہیں، منشی احمد حسن.. میر.. کے شاگرد رشید تھے، ان کی زبانی ڈپٹی کلب حسین خاں.. فرماتے تھے کہ اکثر الفاظ جو میر.. پہلے دوسرے دیوان میں کہہ گئے ہیں وہ چوتھے پانچویں میں نہیں ہیں، جو دوسرے تیسرے میں ہیں وہ پانچویں چھٹے میں نہیں، بہر حال اخیر عمر میں ان کی زبان کا وہ انداز ہو گا جو کہ.. انشا مصحفی جرات کی زبان کا ہے" آب ص ۱۳۶ احمد حسن نام کے کسی شاگرد میر کا نام تذکروں میں نہیں ملتا، لطف یہ کہ انھیں شاگرد رشید کہتے ہیں اور تخلص تک نہیں بتاتے۔ مختلف دواوین کی زبان میں اختلاف کی نسبت ذاتی تحقیقات نہ کرنا کا پیش کرنے تھے ایک مجہول الاحوال شخص کی رائے درج کرنا لاحاصل ہے۔

(۲۷۲) "خان آرزو وہی شخص ہیں جن کے دامن تربیت سے ایسے شایستہ فرزند پرورش پاکر اٹھے جو.. اردو کے اصلاح دینے والے کہلائے.. یعنی مرزا جانجاناں، مرزا رفیع، میر تقی، خواجہ میر درد وغیرہ" ص ۱۲۱ اس موقع پر مجھے صرف مظہر سے بحث ہے، وہ ہرگز ان لوگوں میں شمار نہیں کیے جا سکتے جو آرزو کی آغوش تربیت میں پلے ہیں، آرزو مجمع النفائس (م) میں ان کا ترجمہ اس طرح لکھتے ہیں: "جانجاناں، مظہر تخلص، آنچہ از زبانش مسموع است آنست کہ نام اصلی جانجاں است، والدش محمد جان نام داشت، نظر بر آں بجانجاں موسوم گردانیدہ، حالا بجانجاناں شہرت گرفتہ۔ از عنفوان (کذا) کہ والدش ودیعت حیات سپردہ بفقر و فنا مشغول است، چنانچہ در خدمت بزرگے از سلسلۂ نقشبندیہ داخل طریقہ گشتہ، بعد ازاں کسب فضائل صوری و معنوی نمودہ، الحال کہ عمرش بہ پنجاہ (ایک لفظ غائب) ہیشہ در استحکام مراتب صوفی گری ساعیست، بلا ایں ہمہ از شور عشق ظاہری گاہے خالی نبود، با وجود تقید مذہب کمال توسع مشرب دارد۔ در دقت فہم و ذکائے طبع یکتائے لیل و نہار بلکہ بےمثل روزگار است حدت طبیعت و جودت بر تہ دارد کہ بمصداق ایں مصرع است مصرع کہ سخن نگفتہ باشی بسخن رسیدہ باشی" از ابتدائے نوشتگی با فقیر کمال اخلاص و ارتباط بود۔ بیشتر گاہ گاہے ریختہ کہ شعر آمیختہ ہندی و فارسی است، بطریقہ خاصہ می گفت، حالا خلاف زی خود دانستہ ترک گفتہ۔

بعضے از تلامذ خود را تربیت بسیار کردہ حتیٰ کہ بعضے میگویند خود گفتہ داد، واللہ اعلم۔ ہر چند شعر دوں مرتبہ " اوست در نیولا انتخاب اشعارش نوشتہ می شود" اگر آرزو کو مظہر کی تربیت میں دخل ہوتا تو وہ اس کا ذکر ضرور کرتے۔ وہ " نیکی کن و بہ دریا انداز" کے قائل نہیں، خوش گو کے متعلق اسی کتاب میں لکھتے ہیں: " ایں عاجز ہم در تربیت او تقصیر از خود راضی نشدہ و نیست" پیام اکبرآبادی غالباً ان کی شاگردی کے منکر تھے، آرزو ان کے بارے میں تحریر کرتے ہیں: " در اکبرآباد با فقیر خیلے محشور بود باہم نشستیم و شعر می گفتیم۔ دریں ضمن اگر امدادے ہم از ایں عاجز بظہور میرسید دور نبود، ویک دو رسالہ دیگر (کذا) نیز پیش فقیر خواندہ بجیع) تنبیہ الغافلین میں مظہر نے ضمنی طور پر اپنے ریختہ گو تلامذہ آبرو، مضمون و یکرنگ کا ذکر کیا ہے، مظہر ان میں بھی شامل نہیں۔ (قول فیصل صــ)

(۲۷۴) "مصحفی نے بڑھاپے میں پھر شادی کی تھی" انشا نے اپنی ہجو میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے آپ صـ۱۳ بڑھاپے کی) شادی کا ثبوت موجود نہیں، یہ بات خود مصحفی کے بیان سے جو ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی کتاب (متعلق مصحفی) میں نقل ہوا ہے ثابت ہے کہ جس زمانے میں مصحفی و انشا میں جھگڑا ہوا ہے، اس سے بہت قبل ان کی زوجہ کی وفات ہو چکی تھی اور اس وقت تک انھوں نے کوئی دوسری شادی نہیں کی تھی۔ یہ بھی واضح رہے کہ معارضے کے وقت مصحفی کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔

(۲۷۴) شجاع الدولہ نے سودا کو طلب کیا تھا تو خط میں " برادر من مشفق مہربان من" لکھا تھا آپ صـ۱۵۔ ہوا خواہان مکین جو کہ میں سودا کو ذلیل کرنا چاہتے تھے کہ سعادت علی خاں کی سواری آ نکلی اور وہ اپنے ساتھ ہاتھی پر بٹھا کرلے گئے۔" آصف الدولہ حرم سرا میں دسترخوان پر تھے، سعادت علی خاں اندر گئے اور کہا کہ بھائی صاحب، بڑا غضب ہے، آپ کی حکومت اور شہر میں یہ قیامت! آصف الدولہ نے کہا کیوں بھئی، خیر باشد، انھوں نے کہا کہ مرزا رفیع جس کو باوا جان نے برادر من اور مشفق مہربان کہہ کر خط لکھا، آرزوئیں کرکے بلایا اور وہ نہ آیا آج وہ یہاں.. ہے اور اس حالت میں.. کہ اگر اس وقت میں نہ پہنچتا تو شہر کے بد معاشوں نے اس.. کو بے حرمت کر ڈالا تھا" صـ۱۶۷ یہ بات کہیں سے ثابت نہیں کہ شجاع الدولہ نے سودا کو خط لکھا تھا، ظاہر ہے کہ اس صورت میں اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ القاب مذکورہ کا ثبوت ہے یا نہیں۔ سعادت علی خاں اور آصف الدولہ کی گفتگو آزاد کے اختراعات سے ہے (" سودا اور مکیں " معاصر ا صـ۸۲) نزاع سودا مکین کے قبل ہی سے سودا اودھ کے درباری شاعر تھے۔

(۲۷۵) احمد بخش خاں، الٰہی بخش خاں، معروف کے برادر بزرگ اور سرپرست تھے لیکن آزاد نے ان کی آپس کی گفتگو اس طرح لکھی ہے کہ یہ گمان ہوتا ہے وہ معروف ہی کو عمر میں بڑا سمجھتے تھے۔ احمد بخش خاں

کہتے ہیں: "یہ لوگ اس طرح کا بوجھ اٹھائیں تو چھاتی ترق جائے" چھوٹے بھائی مسکرا کر بولے کہ "ہاں تو آپ کی چھاتی میں بھی آیا ہوگا" بڑے بھائی نے "شرما کر آنکھیں نیچی کر لیں۔ پھر چھوٹے بھائی نے اس طرح نصیحت کی "آخر امیر زادے ہو، خاندان کا نام ہے یہی کرتے ہیں، مگر اس طرح نہیں کہا کرتے" اس گفتگو کے متعلق آزاد نے لکھا ہے کہ اس طرح باتیں کرتے تھے، جس طرح بچے بزرگوں سے کرتے ہیں۔ آب ص ۲۴۹۔ یہ مسلمات سے ہے کہ احمد بخش خاں عمر میں بڑے تھے اور معروف ان کے وظیفہ خوار تھے۔ بڑے چھوٹے بھائی میں اس قسم کی گفتگو جیسی آب میں درج ہے، حد درجہ خلاف قیاس ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ معروف ان اشخاص میں بھی نہ تھے، جو بالکل تارک دنیا ہو گئے ہوں اور جن کی ولایت ان کے معاصرین میں مسلّم ہو۔

سودا اور شاہ عالم کے تعلقات منقطع ہوئے تو سودا نے مخمس شہر آشوب "کہا میں آج یہ سودا سے کیوں ہے ڈانواں ڈول" کہا "سید رد ظاہر بین کہتے ہیں کہ بادشاہ اور دربار.. کی ہجو ہے غور سے دیکھو تو.. اپنے وطن کا مرثیہ کہا ہے" آب ص ۱۵ سودا کے مربی عماد الملک تھے جن کے تعلقات شاہ عالم سے ان کے زمانۂ ولیعہدی میں اچھے نہ تھے اور یہ انھیں کے ڈر سے دہلی سے بھاگے تھے۔ نظم زیر بحث کا کچھ تعلق شاہ عالم سے نہیں، عالمگیر ثانی کے عہد میں لکھی گئی ہے۔ اس کی شان نزول جو آزاد نے بتائی ہے، فرضی ہے۔

تصنیف مخمس (۱۷۶۲) کے ذکر کے بعد: "مرزا دل شکستہ ہو کر گھر میں بیٹھ رہے۔ قدرداں موجود تھے کچھ پرواہ نہ ہوئی، ان میں اکثر رؤسا و امرا خصوصاً مہربان خاں اور بسنت خاں خواجہ سرا تھے وہی بسنت خاں جن کی تعریف میں قصیدہ کہا ہے: "کل حرص نام شخصے سودا پہ مہرباں ہوا الخ" ان لوگوں کی بدولت ایسی فارغ البالی سے گزرتی تھی کہ ان کے کلام کا شہرہ.. شجاع الدولہ نے لکھنؤ میں سنا تو کمال اشتیاق سے "برادر من مشفق مہربان من" لکھ کر خط مع خرچ سفر بھیجا" آب ص ۱۵ بسنت خاں خواجہ سرا شاہ عالم کے عہد سے قبل کے امرا میں ہے۔ مہربان خاں فرخ آباد میں احمد خاں بنگش کے یہاں ایک بڑے عہدے پر ملازم تھے اور جیسا کہ تذکرۂ قائم (ترجمۂ مہربان خاں رند) سے ثابت ہے سودا عماد الملک کی معیت میں فرخ آباد گئے تو وہاں ان سے توسل پیدا ہوا۔ سودا و عماد الملک کے تعلقات سے آزاد قطعاً بے خبر ہیں اور یہی حال بعض دوسرے مربیان دہلی کا ہے، حالانکہ کلیات مطبوعہ کا سرسری مطالعہ بھی ان کے علم کے لیے کافی ہوتا۔

شجاع الدولہ نے سودا کو طلب کیا (۱۷۷۲) تو انھیں دہلی چھوڑنا گوارا نہ ہوا "جواب میں فقط اس رباعی پر حسن معذرت کو ختم کیا:

سودا پے دنیا تو بہر سو کب تک ‏ آوارہ ازیں کوچہ باں کو کب تک

حاصل یہی اس سے نہ کہ دنیا ہووے ‏ بالفرض ہوا یہ بھی تو پھر تو کب تک"

دہلی کے قدر داں مرگئے تو "چند روز" فرخ آباد جاکر رہے، وہاں سے شجاع الدولہ کے پاس گئے۔ وہ بہت اعزاز سے ملے، لیکن بے تکلفی سے یا طنزاً رباعی مذکور کا ذکر کیا اور اسے پڑھا۔ "سودا بپاس وضعداری پھر دربار نہ گئے، یہاں تک کہ شجاع الدولہ مرگئے" ص۱۵۰

(الف) ناصر کہتا ہے کہ سودا فرخ آباد میں تھے کہ "شقۂ خاص" طلب میں پہنچا، سودا نے رباعی "سودا پے دنیا الخ" لکھ کر بھیج دی، جس سے شجاع الدولہ گراں خاطر ہوئے۔ میری رائے میں امر باہمی کا شجاع الدولہ سے تعلق مطلقاً ثابت نہیں اور نہ اس کی سند موجود ہے کہ شجاع الدولہ نے دہلی یا فرخ آباد سے سودا کو طلب کیا تھا، مگر فرخ آباد سے بلوانا بعید از قیاس نہیں۔ (ب) ناصر لکھتا ہے کہ ضاحک نے سودا کے قصیدے کو اس طرح اٹھا کر ان کی ہجو ہوگیا، اسے سن کر سودا فیض آباد پہنچے۔ (ان دونوں میں کیا گذری یہ میرے مقالے "میر ضاحک دہلوی" میں درج ہے)۔ شجاع الدولہ گراں خاطر تھے مگر اس کے باوجود بمقتضائے جوہر شناسی اچھی طرح پیش آئے۔ فیض آباد جانے کی یہ وجہ شایان پذیرائی نہیں۔ فرخ آباد میں قدر دانی کا سامان نہ رہا یا کم ہو گیا تو سودا بطلب یا بےطلب فیض آباد گئے اور شجاع الدولہ کے درباری شاعر ہوئے۔ مدحیہ نظمیں متعدد کلیات میں موجود ہیں۔ آزاد کا بیان غلط محض ہے۔

(۲۷۹) آزاد کو اس پر تعجب ہے کہ مجموعۂ سخن (تالیف لکھنؤ) میں سودا کا عالم شباب میں وارد لکھنؤ ہونا مذکور ہے۔ آب ص۱۵۲۔ حیرت اس پر ہے کہ آزاد کو اس کی خبر نہیں کہ صاحب مجموعۂ سخن سے بہت پہلے شیفتہ دہلوی یہی لکھ چکے ہیں (گلشن بیخار ص۔۔)۔ اس سے قطع نظر، یہ واقعی غلط ہے کہ عالم شباب میں لکھنؤ پہنچے۔

(۲۸۰) "تذکرہ شعرائے اردو کا۔۔ نایاب ہے" آب ص۱۵۲ "تعجب ہے کہ۔۔ سودا نے ان کے اشعار۔۔ کو سعدی شیرازی کے نام پر لکھا ہے" ص۵۶، اور ص۱۲۲ میں مرقوم ہے کہ تذکرۂ سودا میں "اس زلف سیہ فام الخ" آرزو سے منسوب ہے۔

(الف) "نایاب" اگر "ناپید" کے معنی میں ہے تو آزاد کو یہ بتانا تھا کہ تذکرۂ سودا کے وجود کا علم کس طرح ہوا اور وہ باتیں جو اس کے حوالے سے لکھی ہیں انھیں کہاں ملیں۔ اگر اس سے "کمیاب" مراد ہے تو یہ اطلاع دینی ضرور تھی کہ کہاں ہے تاکہ دوسرے بھی اس سے مستفید ہو سکیں (ب) حقیقت یہ ہے کہ یہ باتیں انھیں تذکرۂ قاسم میں ملیں، لیکن نہ معلوم کس وجہ سے انھوں نے اس کا ذکر نہیں کیا (ج) قاسم نے کسی جگہ صراحۃً یہ نہیں لکھا کہ تذکرۂ سودا میری نظر سے گزرا ہے اور صرف دو جگہ (دو ہی باتیں جو آب میں ہیں) اس کا حوالہ دیا ہے۔ میرے نزدیک یہ تذکرہ وجود خارجی سے محروم ہے۔

(۲۸) نکات الشعرا شائق شعر کے لیے بہت مفید ہے اس میں شعراے اردو کی بہت سی باتیں اس زمانے کے لوگوں کے لیے دیکھنے کے قابل ہیں مگر وہاں بھی اپنا انداز قائم ہے۔ دیباچے میں فرماتے ہیں کہ یہ اردو کا پہلا تذکرہ ہے (عبارت حاشیہ " یہ بھی میر۔ کا دعوٰی ہے ورنہ اس سے پہلے بھی تذکرے مرتب ہو چکے ہیں") اس میں ایک ہزار شاعر کا حال لکھوں گا، مگر ان کو نہ لوں گا جن کے کلام سے دماغ پریشان ہو۔ ان ہزار میں ایک بیچارہ بھی طعنوں اور ملامتوں سے نہیں بچا۔ ولی۔۔ کے حق میں فرماتے ہیں " وے شاعریست از شیطان مشہور تر " (اس کے بعد مکترین کے ردّ عمل کا ذکر) آب ص۲۱۱

(الف) یہ بات بڑی حیرت انگیز ہے کہ ادبیات اردو کا مورخ ایسے تذکروں سے واقف ہو جو نکات سے قبل مرتب ہو چکے تھے، اور ان کا نام نہ بتائے (ب) ولی کے متعلق جو بات لکھی ہے وہ نکات کے خطی اور مطبوعہ نسخوں میں جو میری نظر سے گزرے ہیں یا جن کے متعلق میں نے معلومات فراہم کیے ہیں، نہیں ہے، اور اس میں کچھ شک نہیں کہ آزاد نے تذکرۂ قاسم سے لی ہے۔ قاسم نکات کے متعلق بھی صراحتہً نہیں لکھتا کہ میں نے اسے دیکھا ہے، اور کہیں اور اس کا حوالہ نہیں دیتا۔ قریب بہ یقین ہے کہ خود اس نے اس کا مطالعہ نہیں کیا اور سنی سنائی بات سپرد قلم کر دی ہے، مگر اس کا امکان ہے کہ میر نے ولی کے بارے میں یہ لکھا ہو کہ " وے شاعریست از شیطان مشہور تر " اور لوگوں کو برا معلوم ہوا تو انھوں نے اسے تذکرے سے خارج کر دیا۔ (ج) نکات کے موجودہ نسخوں میں کم و بیش ۱۰۰ شاعروں کا ذکر ہے، لیکن آزاد ہزار لکھتے ہیں اور خود میر کا قول (اپنے الفاظ میں) اس سلسلے میں نقل کرتے ہیں، حالانکہ میر نے کوئی ایسی بات سپرد قلم نہیں کی۔ میرا خیال ہے کہ آزاد نے یہ بات کہ نکات میں تقریباً ۱۰۰ شاعروں کا ذکر ہے فہرست اشپرنگر ص۱۷۶ میں دیکھی اور اس پر قناعت نہ کر کے ۱۰۰ کو ۱۰ سے ضرب دے کر حاصل ضرب پیش کر دیا۔ یہ بات انھیں نہ سوجھی کہ احمد شاہی عہد میں (زمانۂ تصنیف نکات) اردو کے ہزار شاعر کہاں سے آئے۔ " مگر ان کو۔۔ پریشان ہو " نکات کی عبارت : " مطبع ناقص معروف اینہم نیست کہ از احوال اکثر آنہا ملال اندوز گردد " (فہرست اشپرنگر ص۱۷۶) مگر یہ عبارت شعراے دکن سے متعلق ہے (ح) " ان ہزار میں ایک بیچارہ بھی طعنوں اور ملامتوں سے نہیں بچا " حد درجہ غیر ذمہ دارانہ بیان ہے۔

(۲۹) " اہلی شیرازی کے شعر پر مصرع لگا کر مثلث کا ایجاد اپنی زبان میں دکھاتی ہیں " آب ص۲۳۰ اس کے بعد اس شعر کی تضمین " امروز یقین شد کہ نداری سر اہلی الخ " اور اس کے معاً بعد یہ مثلث : کیا کہوں میں عاشق و معشوق کا راز و نیاز ناقہ را میراند لیلیٰ سوے خلوت گاہ ناز ساربان در رہ حدیٔ میخواند و مجنوں می گریست " کلیات ولی طبع ۱۹۲۷ء ص۲۸۹ میں مثلث موجود ہے۔ میر کے ہمعصر میر ضیا دہلوی، استاد میر حسن کا ایک مثلث میں نے دیکھا ہے جو ان کے دیوان میں جو میں مرتب کر رہا ہوں ملے گا۔ " ناقہ را میراند الخ " اہلی نہیں، جامی کا شعر ہے (دیوان ص ۰)

(۲۸۳) "ایک رسالہ خود اس کی تصنیف سے میرے ہاتھ آیا۔ سب کے کلام لغو سمجھ کر اس کا خلاصہ لکھتا ہوں یہ .. بدخشاں میں دیکھا گیا.. تاریخ ہفت اقلیم میں بھی خلاصہ اس کا مندرج ہے" نگار ص۲۷۔
آزاد نے جس رسالے کا خلاصہ پیش کیا ہے وہ محض جعلی ہے (مقدمۂ دیوان ناصر خسرو طبع جدید منے و تاریخ ادبیات جلد ۲ از براؤن)۔ یہ رسالہ آتش کدۂ آذر میں بھی نقل ہوا ہے جو ہندوستان میں پہلی بار ۱۲۹۹ میں چھپا تھا۔
ہفت اقلیم تاریخ کی کتاب نہیں۔

(۲۸۴) بلغار (روس) میں گذر ہوا، سفر میں نہایت تکلیف اٹھائی چنانچہ اس قطعے سے کہ شاعرانہ ہے مگر اشارا اس کا پایا جاتا ہے:

همه جور من از بلغاریانست ... که با دائم همی باید کشیدن
گنه بلغاریان را نیز هم نیست ... بگویم گر تو بتوانی شنیدن
خدایا این بلا و فتنه از تست ... ولیکن کس نمی آرد چخیدن
همی آرند ترکان را ز بلغار ... ز بهر پردهٔ مردم دریدن
لب و دندان آن خوبان چون ماه ... بدین خوبی نبایست آفریدن
که از عشق لب و دندان ایشان ... بدندان هم نمی باید گزیدن

اس سے میں قسط ۱۴ میں بحث کروں گا کہ ناصر خسرو بلغار گیا تھا یا نہیں، اس موقع پر یہ دکھانا ہے کہ اس قطعے سے ہرگز یہ ثابت نہیں کہ وہاں گیا تھا اور سفر میں تکلیف اٹھائی تھی۔ وہ حسینانِ بلغار کی وجہ سے اس کے دل پر جو گزر رہی تھی، اس کا ذکر کر رہا ہے اور یہ حسین وہ ہیں جو بلغار سے ایران لائے گئے ہیں۔

(۲۸۵) "صاحب آتش کدہ صاف اس (عرفی) کے کلام کو برا کہتا ہے اور ناپسند کرتا ہے اور اس پر سندا چند شعر مثنوی کے درج کیے ہیں" نگار ص۹۹ آذر کی رائے یہ ہے: "در مراتب کمالات گوے سبقت از معاصرین ربودہ دیوانش بنظر رسیدہ، ہر چند که طریقۂ تازہ که خارج از طریقۂ شعرائے ماسبق بودہ اختیار کردہ اتفاقاً بسیار خیالات خوب و عبارات مطلوب دارد۔ در باب استعارہ اصرار بسیار دارد بحدیکه مستمع از معنی مقصود محاقل می شود۔ از آنجملہ مثنوی در برابر مخزن الاسرار .. که بسیار بد گفته .. مثنوی ناتمامے در خسرو شیرین داشتہ اگر عیب استعارۂ خنک بسیار نداشت، بد نگفته بود۔ قدرے معقول از آنجا نوشته شد و قصائد و غزل و رباعی نیز آنچه بطریق استادان صاحب فن بود نوشته می شود" (آتش کدہ طبع کلکتہ ص۲۶۵)

(۲۸۶) محاورات عربی کے فارسی تراجم کے ذیل "چشم بریدہ از آں" بھی ہے سخن ص۲۳۴ یہ ممکن ہے صحیح ہو، لیکن جب ساسان پنجم کی عبارت میں "بترش دید" موجود ہے، تو آزاد کو جو اسے معاصر خسرو پرویز سمجھتے ہیں یہ کہنے کا حق نہیں۔

(۲۸۷) "کوئی نہیں کہتا کہ میں نے اس (رودکی) کا دیوان دیکھا .. ایران .. میں جہاں دیکھا وہاں چند معمولی قصیدوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ ان میں بھی بعض قصیدے قطران کے ہیں" (سخن ص۲۶۶)۔ میرا خیال ہے کہ دیوان رودکی

ایران میں سخن کی اشاعت سے پیشتر معرض طبع میں آ چکا تھا۔ بہر حال، مجمع الفصحا میں اس کا ذکر ہے اور یہ آزاد کے ماخذ میں سے ہے۔ مطبوعہ نسخے اور ان خطی نسخوں کا جو ملتے ہیں یہ حال ہے کہ اس میں بعض نہیں، تقریباً کل قصائد قطران کے ہیں۔ رودکی کا بہت کم کلام اس میں ہے۔ اس سے مفصل بحث سرڈینی سن کے ایک مقالے اور احوال و اشعار رودکی مصنفۂ آقائے سعید نفیسی میں ہے۔

(۲) جرأت "۱۲۱۵ھ میں لکھنؤ پہنچے" اور سلیمان شکوہ کے ملازم ہوئے آب ص۲۳۷۔ جرأت ۱۱۹۸ھ میں جب مصحفی وارد لکھنؤ ہوئے ہیں، وہاں موجود تھے ("مصحفی و جرأت" از راقم، معاصر حصۂ ۲) اور مصحفی کے تذکرۂ ہندی کی تکمیل (اس کا زمانہ ۱۲۰۹ھ) سے پیشتر سلیمان شکوہ کے نوکر ہو چکے تھے۔

(۳) ایک شخص نے جو ایران سے تازہ تازہ آیا تھا، شاہجہاں کی عمارت اور اس کی تعریف میں صائب کے قصیدے کا ذکر کیا جس میں یہ شعر ہے۔

چوں لباس غنچہ تنگی می کند بر دوش گل　　　بر شکوہ ایں عمارت پرنیان آسمان

فطرت نے اس کے سامنے اس کی قباحت ظاہر کی، "سرخوش جس نے اس کی صحبت سے شاگردوں کی طرح فیض پایا تھا، کہا کہ "چوں لباس غنچۂ نشگفتہ تنگی می کند الخ" میر نے سن کر کہا کہ اب ٹھیک ہوا" نگار ص۱۴۳۔ سرخوش نے کلمات الشعرا میں لکھا ہے کہ فطرت نے صائب کے سامنے مصرع اکا قبح دکھایا اور وہ "تامل بسیار" کے بعد قائل ہو گئے تھے (ص۹۸) کلمات میں یہ نہیں کہ عمارت کس کی تھی اور کسی شخص نے جو ایران سے آیا تھا فطرت کے سامنے یہ شعر پڑھا تھا۔ کلمات میں یہ بھی نہیں کہ شعر جس نظم کا ہے وہ قصیدہ ہے یا قطعہ۔

(۴) میر عبدالولی (عزلت) سورتی کو میر عبدالولی سوزنی لکھا ہے نگار ص۱۸۰۔

(۲) انوری کے قصیدے "گر دل و دست بحر و کان باشد الخ" کی یہ شان نزول لکھی ہے کہ عالم جاہ خاطل تھا، لیکن نان شبینہ کا محتاج، "شاعر بادشاہی" کا جاہ و حشم دیکھ کر یہ قصیدہ لکھا اور کسی طرح بادشاہ کو سنایا نگار ص۲۱۳، لیکن اس قصیدے میں یہ اشعار موجود ہیں جو اس شان نزول کی تردید کرتے ہیں:

"خسرو بندہ را چہ دہ سال است　　　کہ ہمے آرزوئے آں باشد
کز ندیمان مجلس ار نشود　　　از مقیمان آستاں باشد"

کلیات انوری (م ۷۶) میں یہ اشعار ورق ۲ یا ۳ میں ہیں، اور اس معاملے سے براؤن کی تاریخ جلد ۲ اور تنقید شعر العجم مصنفۂ شیرانی میں بھی بحث کی گئی ہے۔

(۹) خسرو کی "خالق باری جس کا اختصار آج تک بچوں کا وظیفہ ہے کئی بڑی بڑی جلدوں میں تھی" آب ص۱۵ یہ بات کسی اور نے نہیں کہی اور اس میں بہت بڑا مبالغہ ہے۔

(۱۰) آب ص۲۸۰ میں جرأت کی ایک غزل ہے جس کی ردیف "آئے" اور قوافی یار، مزار وغیرہ ہیں، حاشیے میں اس

پر اعتراض ہے کہ "آئے کہیں واحد ہے، کہیں جمع ہو گیا ہے" یہ ردیف کا عیب کسی اور کو معلوم نہیں، آزاد کا اختراع سے ہے۔

(۱۹۴) آئینہ رخ کو ترے اہل صفا کہتے ہیں　　اس پہ دل اٹکے ہے میرا اسے کیا کہتے ہیں

جرات کا یہ شعر آب ص۲۲۲ میں ہے اور مصرع ثانی میں لفظ اس پر لہ مرقوم ہے۔ حاشیے میں یہ عبارت درج ہے کہ "میرے شفیق قدیم حافظ ویران فرماتے ہیں" ویران کیا فرماتے ہیں اس کا کچھ پتا اس عبارت سے نہیں چلتا۔ اشاعت ا ص۲۵۸ کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہوا کہ اس میں مصرع اول کی جگہ یہ الفاظ ہیں: "پہلا مصرع یاد نہیں اور دوسرا بھولتا نہیں" اشاعت ۲ کے حاشیے میں جو عبارت ہے اس سے کسی طرح یہ اطلاع نہیں مل سکتی کہ مصرع اول آزاد کو ویران سے حاصل ہوا، یہ بھی میرا قیاس ہے، کوئی قطعی بات نہیں کہ آزاد یہ اطلاع دینی چاہتے تھے۔

(۱۹۵) "تاباں مزاجداں تھے اشعار اور لطائف کہتے۔ حضرت سن کر خوش ہوتے۔ کوئی بات سب کے سامنے کہنی خلاف ادب ہوتی۔ دست بستہ عرض کرتے کچھ اور بھی عرض کیا چاہتا ہوں، حضرت مسکرا کر اجازت دیتے، وہ کان کے پاس منھ لے جاتے اور چند کلمے چپکے چپکے ایسے گستاخانہ کہتے کہ سوا اس پیارے عزیز کے کوئی نہیں کہہ سکتا جسے بزرگوں کی محبت نے گستاخ کر دیا ہو۔ پس حضرت مسکراتے اور فرماتے کہ درست ہے، پھر وہ اسی قسم کی کچھ اور باتیں کہتے، آپ پھر فرماتے یہ بالکل درست ہے جب تاباں اپنی جگہ پر آ بیٹھتے تو پھر حضرت خود کہتے کہ ایک بات کا کہیں خیال نہیں رہا، تاباں پھر کان کے پاس منھ لے جاتے اس وقت اس سے بھی تیز تر کوئی لطیفہ آپ اپنے حق میں کہتے اور اپنے پیارے عزیز کی ہمزبانی کا لطف حاصل کرتے" آب ص۱۳۹ (آزاد نے اس کے متعلق دو حاشیہ لکھا ہے جس سے　　　میں بحث کی گئی ہے۔)

(الف) دیوان تاباں میں مظہر سے عقیدت کا کسی جگہ اظہار نہیں، ان کی دو فارسی غزلوں کو تاباں نے مخمس البتہ کیا ہے جو دیوان میں موجود ہیں۔ میں اسے تسلیم کرتا ہوں کہ ابتدا میں تاباں و مظہر کے گہرے تعلقات تھے لیکن تاباں نے حشمت کی تعریف ایسے انداز میں کی ہے کہ مجھے یہ گمان ہوتا ہے کہ دونوں کے تعلقات منقطع ہو گئے تھے:

"کمالوں میں جن کے نہیں کچھ قصور	وے سب طفل مکتب ہیں اس کے حضور"	ص۲۵۸
"کرے فقر کا اس کے گر قیل و قال	تو شبلی و عطار کی نہیں مجال"	ص۲۵۹
"کسی کو کہاں اس سے ہے برتری	کہ ہے نام اس کا محمد علی"	ص۲۶۰
"کوئی آج اس کے برابر نہیں	وہ سب کچھ ہے الا پیمبر نہیں"	
"زیادہ کہوں وصف میں اس کا کیا	بصورت ہے انساں بمعنی خدا"	

"کوئی آج الخ" درد مند کا شعر ہے جس کی تاباں نے تضمین کی ہے، درد مند کا شعر جو اس کے ساقی نامہ میں ہے، مدح مظہر میں ہے۔ اسے حشمت کی تعریف میں صرف کرنا بے سبب نہیں ہو سکتا تاباں کے اشعار ذیل بھی قابل توجہ ہیں

یہ جو ہیں اہل ریا آج فقیروں کے بیچ	کل گنیں گے حمقا ان ہی کو پیروں کے بیچ	
ذکر یا ہے نہیں آپ کو گنتا کچھ کم	ذکر ارّہ جیسے آتا ہے فقیروں کے بیچ	ص۱۸۹
شیخ دل میں کرے ہے نند کے مہیوں کا حساب	نام کو تس پہ کھتا ہے لکیروں کے بیچ	
کہتا ہے نماز پڑھ کے کوئی دل خواہ	ہو کوئی مرید صاحب حشمت واہ	ص۲۶۳
بیٹھا ہے اسی فکر میں لے کر تسبیح	کیا شیخ کی اوقات ہے سبحان اللہ	

(ب) آزاد نے جو جزئیات بیان کیے ہیں، اختراعی ہیں، ان کے پاس کوئی ذریعہ ان کو معلوم کرنے کا نہ تھا۔

۱) آزاد کے اس بیان کا کہ مہر نیمروز کے کچھ اجزا بہادر شاہ کی طرف سے تاریخ نویسی پر تقرر کے قبل ہی لکھے گئے تھے آب ص۲۰ کوئی ثبوت موجود نہیں، اور یہ غلط ہے۔

۱) سعدی کی گلستان کے متعلق مومن نے جو تنقیص آمیز رائے صدر الدین خاں کے یہاں ظاہر کی تھی، اس کا جواب احمد الدین نے دیا تھا آب ص۱۲۶ ظہور علی، ظہور دہلوی جو مومن اور بعض دیگر اساتذۂ دہلی سے تلمذ رکھتے تھے، صاحب دیوان مطبوعہ ہیں؛ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ خود مومن کے یہاں گزرا تھا اور احمد الدین نہیں، ظہور نے یہ بات کہی تھی کہ قرآن میں بھی تو قال قال کے سوا کچھ نہیں۔

۱) جمات کے متعلق میر کا فقرہ بحوالہ تذکرۂ قاسم آب ص۱۴۱ میں منقول ہے۔ قاسم نے "چوما چاٹا" لکھا تھا آزاد نے اس پر اصلاح دے کر "چوما چاٹی" بنا دیا ہے۔

۱) مرزائی صاحب جن کے پاس شیخ صاحب کے رُپے امانت رہے تھے، ایک امیر شرفائے لکھنؤ میں سے تھے آب ص۱۴۷ مرزائی صاحب کا شمار امرائے لکھنؤ میں نہ تھا۔ ناصر نے ان کی خوبصورتی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ کم سن تھے کہ ناسخ ان پر فریفتہ ہو گئے تھے۔ ایک بار ناسخ سے قرض مانگا لکھ کر بھیج دیا:

"چہ پروا از زر و دینار داری که دارالضرب در شلوار داری"

(شائق کے بعض اشعار ناصر نے نقل کیے ہیں، جو ناسخ کی محبت کو بہت برے رنگ میں پیش کرتے ہیں)۔ ناسخ نے انھیں محسن الدولہ کی داروغگی (مشاہرہ تقریباً سو رُپے) دلوادی تو یہ بڑی بدگمانی کا موجب ہوا اور یہ لکھنؤ میں معشوق ناسخ مشہور ہو گئے۔ "تا نباشد چیزکے مردم نگویند چیزہا" اوائل عہد نصیر الدین حیدر میں یہ برطرف ہوئے۔ ناسخ نے انھیں چند قطعہ مکانات اور دکانیں خرید کر دیدی تھیں ان کی بسر اوقات زمانۂ تحریر حاشیہ میں انھیں سے تھی (تذکرۂ ناصر حاشیۂ ترجمۂ سید ارام، شائق)۔ تواریخ اودھ جلد ا مصنفہ کمال الدین حیدر ص۲۴۸ میں ہے کہ مرزائی صاحب کا مشاہرہ ۲۰۰ تھا۔ میری رائے میں جو رقم تذکرۂ ناصر میں ہے وہ زیادہ قرین قیاس ہے۔ کلیات ناسخ کے بعض قطعات میں ناسخ نے ان کے بیٹے کو "نور چشم" کہا ہے۔

۱) ناسخ کے غسل صحت کی تاریخ: شود صحت ہمایوں و مبارک ۱۲۳۵ھ آب ص۳۶۸۔ "شود صحت الٰہی" سے ۱۱۸۹ نکلتا ہے۔ قصور ناسخ کا نہیں، آزاد کا ہے جو لفظ "الٰہی" = ۴۶ کو حذف کر گئے (رجوع بکلیات ناسخ ص)۔

حرفِ آخر

توضیحات و اضافات (۱۹) آب اشاعت ثانی میں سودا کی عمر ایک جگہ ستر ۷۰ دوسری جگہ چھپتر مرقوم ہے
اشاعت اول میں دونوں جگہ چھپتر ہے ص۱۵۱ و ص۱۴۴ (۷۹) خود درد نے علم الکتاب (م، و ۶۳۳) میں لکھا ہے کہ ان کا پدری سلسلہ
بوساطت خواجۂ نقشبند امام حسن عسکری پر منتہی ہوتا ہے، اور اپنے جد مادری کا نام میر سید محمد حسینی قادری بتایا ہے،
(۹۳) آب اشاعت ا میں ناسخ و دبیر کا واقعہ یوں مرقوم ہے: "شیخ.. کا بڑھاپا تھا اور.. ضمیر.. کی مرثیہ گوئی جوانی
پر تھی.. دبیر.. ایک مصرع میں استاد کی اصلاح سے ناراض ہوئے، شیخ.. کے پاس جاکر کہا کہ میں نے یہ کہا ہے

اور استاد نے اس طرح اصلاح دی ہے۔ شیخ.. نے کہا کہ.. درست بنایا ہے۔ مرزا.. نے فرمایا کہ کتاب میں
اس لفظ کے معنی یہی ہیں جو میں عرض کرتا ہوں۔ شیخ.. نے کہا کہ نہیں، جو تمھارے استاد نے بنایا اسی طرح
درست ہے۔ مرزا.. نے پھر کہا کہ آپ کتاب ملاحظہ فرمائیں۔ شیخ.. لکڑی لے کر مارنے کو اٹھے اور کہا کہ بتدی
لڑکا ہوکر استاد کی تردید میں کتاب دکھاتا ہے۔ ارے کتابیں دیکھتے دیکھتے ہم آپ کتاب ہو گئے ہیں تو کتاب
کو کیا جانے! مرزا.. ڈر کر بھاگے۔ شیخ.. کو اتنا جوش تھا کہ چند قدم تعاقب کیا، مگر وہ نوجوان لڑکے تھے،
بھاگ گئے" ص۳۲۷ (۱۳۱) آزاد نے تذکرۂ ہندی دیکھا ہوگا مگر قریب بیقین ہے کہ آب کی تصنیف کے وقت
ان کے سامنے نہ تھا (۱۳۶) آب اشاعت ا میں نشاط کا قطعہ نہیں۔ ص۱۲۱ کے حاشیے میں مسطور ہے کہ "معلوم
ڈتاسی ایک تذکرہ نویس فرانس کے ہیں، ان کی تصنیف سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۳۰ھ ہجری میں فوت ہوئے"
دتاسی کی تاریخ ادبیات جلد ۲ ص۳۵ میں یہ ہے کہ انشا کی وفات شورش ۱۸۵۷ء سے پیشتر ہوئی۔ (۱۴۴) دساتیر
پر میرا ایک مقالہ جلد شائع ہوگا۔ خود دساتیر کے مطابق آبادیوں کی سلطنت کب تک رہی اس کا صحیح حال اس
سے معلوم ہوگا۔ اس کے مطابق جو زمانہ سفرنگ میں ہے وہ کم ہے (۱۷۰) مرتب فرہنگ اسدی طبع ایران نے
کتاب کے کل نسخوں کے (جو انھیں ملے) مندرجات کہیں کہیں درج کرنے کا التزام کیا ہے، لیکن "آمد
آں رگزن الخ" جو فرہنگ اسدی طبع یورپ میں موجود ہے، مقدم الذکر سے غیر حاضر ہے۔ دیوان مسعود سعد
سلمان طبع جدید ص۶۳۵ میں بھی یہ قطعہ ہے۔ (۱۷۳) دیوان ظہیر کی اشاعت کلکتہ صرف ایک بار چھپی ہاشاعت
ایران کے متعلق میں قطعی طور پر کچھ کہنے سے قاصر ہوں، اشاعت لکھنؤ ایک سے زیادہ بار طبع ہوئی ہے (۱۹۴)
میرا مدعا ہے کہ آزاد ۱۱۹۳ھ کو صحیح سالِ وفات سمجھے، اور اس صورت میں یہ کہتے ہیں کہ ان کی ملاقات ایسے
لوگوں سے ہوئی جو بیدل کے قریبی زمانے میں نہ تھے، انھیں قباحت محسوس نہ ہوئی۔ وہ ۱۱۳۳ھ کو
صحیح سمجھتے تو یہ کہنے کی جرأت نہ کرتے (۱۹۷) ڈاکٹر انور کی نظر سے محاکمات الشعرا کے چند ابتدائی اوراق گزرے
تھے اور ان کا بیان انھیں پر مبنی ہے (معاصر ا ص۲۹)، دیباچے کے بعض حصص کی نقل انھوں نے براہ کرم
مجھے بھی بھیجی تھی۔

دکھاؤ ۲۸۲/۲ اعجاز + ناقہ : ناز + ساربان : مجنوں نی گریست ۲۸۲/۳ تمنی آمد ۲۸۴/۴ خوبان ۲۸۴/۶ تمنی باید ۲۸۳/۷ ابلہ در ۲۸۷/۶ جگہ ۲۹۴/۴ اہل ان ۲۹۵ / الف ۸ العمم بعنی ۲۹۵ / الف ۸ نظر نذر ۲۹۵/الف ۱۳ نقش نقش ۲۹۵/الف ۱۳

مزید برآں : ایک 'ہ' کی جگہ 'دو' کا جا بجا استعمال : کاتب صاحب کو ان کی ایک 'ہ' واپس کر دیجیے مثلاً "تشبیہہ' والہہ وغیرہ۔

اضافہ : ۳/۱۷ بارِغ معانی : یہ تذکرہ (بخش معاصرین) خدا بخش لائبریری کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ ۱۱۰/۴ نگار = نگارستان فارس ۱۵۲/۱ سخندان فارس نمبر ۱۵۲-۱ ۱۶۶ نگارستان فارس ۱۹۶ ۲۰۰- بعد میں آب، سخن،، نگار اور دیوان ذوق ملے جلے چلے ہیں۔ ۱۵۲/۲ سخن = سخندان فارس ۱۵۲/۳-۴ "تو... وہ" قلمزد سمجھا جائے "اشارہ کرنا تھا" کے بعد "کرتر کی لفظ ہے" اضافہ کیجیے۔ ۱۶۱- پورا جملہ قلمزد سمجھا جائے۔ ۱۶۴ دساتیر پر قاضی عبدالودود کا مقالہ نقوش۔ اور خدا بخش لائبریری جرنل نمبر ۲ میں۔ ۲۸۲/۴ - ۵ دیوان ضیا مرتب نہ ہو سکا۔ اب اصل نسخہ کا بھی نشان نہیں ملتا۔ ۲۸۴/۸ قسط ۴ نہیں لکھی گئی۔

●●

ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن
اسسٹنٹ لائبریرین خدا بخش لائبریری پٹنہ

غزلیات صفیر بلگرامی

'صفیر بلبل' کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخوں کا تقابلی مطالعہ

خدا بخش لائبریری میں اُردو کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے۔ جس کا ہینڈ لسٹ نمبر ۵۳ ہے۔ اس کے شروع صفحہ پر کتاب کا نام 'صفیر بلبل' درج ہے جس سے بظاہر پتہ چلتا ہے کہ اس میں صرف 'صفیر بلبل' ہی کا ایک نسخہ ہے۔ اس کے علاوہ اُردو ہینڈ لسٹ میں اس مخطوطہ کا جو نام تحریر کیا گیا ہے وہ بھی غزلیاتِ صفیر مسمیٰ بہ صفیر بلبل کے تحت درج ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس میں صفیر بلبل کے علاوہ ایک اور نسخہ ہے جو اُردو کے ایک شاعر حشمت کی غزلوں پر مشتمل ہے۔[1]

غزلیات حشمت : یہ ورق ۳۲ الف تا ورق ۳۹ ب اور فی صفحہ ۱۱ - ۱۳ سطور پر مشتمل ہے۔ گویا یہ کُل ۸ ورق میں ہے۔ خط شکستہ اور کتابت ۱۱ نومبر ۱۸۶۲ء کی ہے۔ اس میں حشمت کی کل ۱۲ غزلیں ہیں جو مجموعی طور پر ۹۲ اشعار پر مشتمل ہیں۔ اس کے خاتمہ کی مندرجہ ذیل عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ یہ نسخہ مولوی محمد بخش خاں والد محترم خدا بخش خاں بانیٔ خدا بخش لائبریری پٹنہ کی فرمائش پر خود حشمت نے اپنے ہاتھ سے ۱۸۶۲ء میں لکھا ہے۔ خاتمہ کی عبارت ملاحظہ ہو :

"الحمد اللہ کہ بتاریخ یازدہم نومبر ۱۸۶۲ء نقل این چند غزل مَن تیج سرائے تُرد لیدہ بیان حشمت تخلص حسب ارشاد نکتہ دان رموز سخن ماہر ہر فن قدرشناس ہر زبان دہر جناب مولوی محمد بخش خاں صاحب دام ظلہ۔ بریدی این اوراق برداشتہ شد۔ فقط"

اس کی غزلیں گرچہ حروف تہجی کے لحاظ سے ردیف وار مرتب نہیں ہیں تاہم مندرجہ ذیل حروف کی ردیف کے اشعار پائے جاتے ہیں جیسے ردیف الالف کی پانچ غزلیں، ردیف الیاء، ردیف النون، ردیف الدال کی ایک ایک غزل، ردیف الیاء کی چار غزلیں [illegible] ردیف الالف کی سب سے پہلی غزل کا مطلع ہے

ہو گیا لب، وحشت دل کا مداوا ہو گیا
خط مسلسل یار یا ترقی کا نسخا ہو گیا

آخری غزل [illegible]

غزلیات صغیر : ۳۱½ اوراق اور فی صفحہ ۱۲ اسطور پر مشتمل ہے۔ کتابت ۱۱ ربیع الثانی ہ میں ہوئی ہے۔ خط نستعلیق ہے۔ اس میں اُردو زبان کے مشہور شاعر اور مصنف سیّد فرزند صغیر بلگرامی (۱۳۰۷ھ) کی غزلیں ہیں۔ جن کے اشعار کی مجموعی تعداد ۶۳۴ ہے۔ یہ خود صغیر بلگرامی کے ہاتھ کا لکھا نسخہ ہے جو مولوی محمد بخش خاں والد مرحوم خدا بخش خاں بانی خدا بخش لائبریری پٹنہ کی فرمائش پر لکھا گیا ہے۔ ں میں وہی اشعار تحریر کئے گئے ہیں جو بر وقت زبان قلم پر آسکے۔ جیسا کہ صغیر بلگرامی نے نسخہ کے خاتمہ میں تحریر کیا ہے۔ خاتمہ کی عبارت ملاحظہ ہو :

"الحمد للہ والمنّۃ کہ یہ چند خذف ریزے مسمّٰی بہ صغیر بلبل کہ مخزونہ خاطر فاطر بندہ سیّد فرزند احمد صغیر حسینی بلگرامی تھے۔ حسب فرمائش مولوی صاحب عنایت و شفقت فرمائی بندہ مولوی محمد بخش خاں صاحب زاد مجدہٗ کی سطح قرطاس پر آئے۔ مگر افسوس ہے کہ مولوی صاحب نے عامی سے اس وقت فرمائش کی کہ جب حقیر کے پاس اس مسافرت میں کچھ نہیں ہے۔ ناچار جو کچھ افکار دیرینہ کے دل میں تھے لکھے گئے۔ ان شاء اللہ مکان پر جا کر فرمائش مولوی صاحب کی بطریق احسن انجام کی جاوے گی۔ اب تو خدا کا نام لے کر ان اجزا کو بتاریخ یازدہم ربیع الثانی روز دو شنبہ ۱۲۷۹ھ تمام کرتا ہوں۔ رکشن دلان دیدہ ور سے چشم الطاف کی امید ہے۔ باقی گفت و شنید ہے۔ اگر کوئی شعر پسند طبع والا ہو عاصی کو دعائے خیر سے یاد کریں۔ فقط۔ (اس کے بعد صغیر بلگرامی کا دستخط ہے)

اس نسخہ میں ورق ۱ تا ۳۱ الف جو غزلیں ہیں وہ حروف تہجی کے لحاظ سے الف تا یا ی کی ردیف پر مشتمل ہیں۔ لیکن الف اور ب کے بعد ت، ث، ج، ح، خ کی ردیف کے اشعار نہیں ہیں۔ پھر د کے بعد ذ اور ر کے بعد ز، س، ش، ص، ض، ط، ظ، ع، غ، ف، ق، ک اور ل کی ردیف کے اشعار بھی نہیں ہیں۔ اس کے بعد م کی ردیف کے اشعار شروع ہو گئے ہیں۔ جو اشعار موجود ہیں ان میں سب سے زیادہ الف اور یا ی ردیف کے اشعار ملتے ہیں۔ اور سب سے کم ب کے (یعنی چھ) اور د کے (یعنی چار) اشعار پائے جاتے ہیں۔

سب سے پہلی غزل اس طرح شروع ہوتی ہے :

جانانِ مضامیں پہ ہے سایہ ربِ سبحاں کا ٭ بناطرز الٰہی بسم اللہ سے تاج اپنے دیواں کا

ق ۳۱ ب پر خمسہ حقیر صغیر بر غزل وزیر کے عنوان کے تحت صغیر بلگرامی کے خمسہ کے اشعار ملتے ہیں۔ اس کے بعد کے متفرقہ اشعار ورق ۳۰ الف پر پائے جاتے ہیں مخمسہ کے شکل سات بند کے اشعار ہیں جو مندرجہ ذیل شعر

شروع ہوتے ہیں :

منہ ہو بر بلاشبدیز ہوس سے ہم عناں ہو کر ٭ نہ سرا تناو تھا ہم پائی گرد کارواں ہو کر

غزلیاتِ صفیر جو صفیر بلبل کے نام سے مشہور ہے اس کا مطبوعہ نسخہ بھی عام طور پر ملتا ہے۔ اس وقت میرے سامنے جو نسخہ ہے وہ ۱۲۸۰ھ کا چھپا ہوا ہے۔ ڈاکٹر ظفر اوگانوی (شعبۂ اُردو کلکتہ یونیورسٹی) نے صفیر بلگرامی پر ایک مستقل علمی و تحقیقی کتاب لکھی ہے۔ جو "صفیر بلگرامی — غالب کا عظیم المرتبت شاگرد" کے نام سے ۱۹۷۶ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آچکی ہے۔ اسی میں موصوف اس قلمی نسخہ کے بارے میں لکھتے ہیں :

"صفیر بلبل کا ایک قلمی نسخہ بھی خدا بخش اورینٹل لائبریری میں موجود ہے۔ یہ نسخہ صفیر کا خود نوشتہ ہے۔ انھوں نے بہ ایمائے مولوی محمد بخش والد خدا بخش خاں بانی کتبخانہ خدا بخش ت ۱۲۰۷ھ تیا مرتب کیا تھا۔ اس میں ۴۰ صفحے ہیں اور نسخہ مکمل ہے۔"[1]

آگے چل کر مطبوعہ اور قلمی نسخے کا تقابلی مطالعہ اس طرح پیش کرتے ہیں :

"چونکہ صفیر بلبل کی اشاعت قلمی نسخے پر درج شدہ تاریخ سے ایک سال کے بعد ہوئی ہے اس لئے مطبوعہ نسخہ میں اضافہ کا ہونا ایک فطری امر تھا۔ قلمی نسخے میں اشعار کی تعداد نسبتاً کم ہے اور مخمس بر غزل سحر اور خبر، رباعیات و پہیلیاں بھی اس میں موجود نہیں ہیں۔ طباعت کے وقت یہ صنفیں بڑھادی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ قلمی اور مطبوعہ نسخے میں مابہ الفرق کوئی خاص بات نہیں ہے۔"[2]

یہاں ظفر اوگانوی کی تین باتیں قابل توجہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ قلمی نسخہ کی کتابت ۱۲۰۷ھ میں ہوئی جب کہ اس کی کتابت ۱۲۷۹ھ میں ہوئی جیسا کہ خاتمہ کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ قلمی نسخہ کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ وہ ۴۰ صفحہ پر مشتمل ہے۔ یہ قطعاً غلط ہے کیونکہ صفیر بلبل کا نسخہ جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے وہ ورق ۱ ب سے شروع ہو کر ورق ۳۱ الف پر ختم ہو گیا ہے۔ پھر ورق ۳۱ ب سے خمسہ کے اشعار شروع ہو گئے ہیں۔ لیکن اس کے متعلقہ اشعار صرف ورق ۴۰ الف پر پائے جاتے ہیں۔ غالباً اسی آخری ورق (۴۰) کو دیکھ کر ڈاکٹر ظفر اگانوی کو دھوکہ ہوا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ

۱۔ صفیر بلگرامی۔ غالب کا عظیم المرتبت شاگرد ص ۱۲۱ ۲۔ ایضاً ص ۱۲۲

۳۲ الف سے غزلیاتِ حشمت کا نسخہ شروع ہوگیا ہے لہٰذا ورق ۷۳ ب پر ختم ہوا ہے۔ دونوں نسخوں کے کاتب الگ الگ ہیں اور نشان کتابت بھی قطعاً ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اس کے باوجود تعجب ہے کہ دونوں کو ایک نسخہ سمجھ لیا گیا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ قلمی نسخہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اشعار کی کمی کے علاوہ مابہ الفرق کوئی خاص بات نہیں ہے۔ میرے خیال میں قلمی نسخہ کے بارے میں یہ رائے بھی ناقص ہے۔ کیونکہ مجموعی طور پر اشعار کی کمی کے باوجود اس میں خاصی تعداد میں ایسے اشعار ملتے ہیں جو خود مطبوعہ نسخہ میں نہیں پائے جاتے اور یہ قلمی نسخہ کی ایسی خوبی ہے جس سے نہ صرف قلمی اور مطبوعہ کے درمیان بنیادی طور پر فرق ظاہر ہوتا ہے۔ بلکہ قلمی نسخہ کی افادیت، اہمیت اور قدر و قیمت کافی حد تک بڑھ جاتی ہے۔ مندرجہ ذیل سطور میں اس کی تفصیلات پیش کی جا رہی ہیں۔

(۱) قلمی نسخہ میں کچھ غزلیں ایسی ملتی ہیں جو مطبوعہ نسخہ میں نہیں ملتیں۔ اور یہ غزلیں ایسی ہیں جن کے اشعار نہایت خوبصورت اور دلچسپ ہیں۔ یہاں صرف تین غزلیں نمونہ کے طور پر تحریر کی جا رہی ہیں:

ردیف المیم کے تحت مطبوعہ نسخہ میں ۴ غزلیں ہیں جو کل ۱۹ اشعار پر مشتمل ہیں[۱]۔ لیکن اس کے برخلاف قلمی نسخہ میں صرف ایک غزل ہے جو ۹ اشعار پر مبنی ہے اور یہ ایسی غزل ہے جو مطبوعہ نسخہ میں نہیں ملتی۔ غزل ملاحظہ:

مشک افشاں شش جہت میں ہے ہوای بلگرام ۔۔۔ کوچہ کا کل گر ہے کوچہای بلگرام
خلد کی جانب جو جاتی ہے ہوای بلگرام ۔۔۔ کہتا ہے رضواں بھی جنت ہے فدای بلگرام
زیر بار رہتے ہیں ہر دم کو چہای بلگرام ۔۔۔ ساکن فردوس اعلا ہیں گدای بلگرام
مردہ دل جو ہیں پھڑک اٹھتے ہیں جب اک تان پر ۔۔۔ ہیں مسیحائے زماں نغمہ سرای بلگرام
مالک حوران و غلماں ہیں وہاں کے خوبرو ۔۔۔ شہ نشین باغ جنت ہیں سرای بلگرام
روز و شب بارہ مہینے ہے بہار ادس جا مقیم ۔۔۔ تازہ رکھتی ہے دل و جاں کو فضای بلگرام
ماشاء اللہ چشم بدور ایک سے اک خوب ہے ۔۔۔ طعنہ زن ہیں مہر و مہ پر مہ لقای بلگرام
جو درو ایوان ہے وہ اک مطلع انوار ہے ۔۔۔ صبح صادق سے نہیں ہر کم صفای بلگرام
یا خدا بستی رہے بستی یہ تا دور قیام ۔۔۔ ہے صفیر اپنی زباں پر یہ دعای بلگرام[۲]

۱- ص ۶۰-۶۱ ۔۔۔ ۲- ص ۲۱

ردیف اللال کے تحت مطبوعہ نسخہ میں دوؔ غزلیں درج ہیں۔ پہلی غزل ۵ اشعار پر اور دوسری ۷
عار پر مشتمل ہے۔ اس کے برخلاف قلمی نسخہ میں صرف ایک غزل ہے جو ۴ اشعار پر مشتمل ہے اور یہ ایسی غزل ہے
مطبوعہ نسخہ میں موجود نہیں ہے۔ غزل ملاحظہ ہو :

گھر جو میرا کریں جناب آباد　　خوب آباد ہو، خراب آباد

دل کی بستی بھی خوب ہے یارب　　ہے یہ شہر انتخاب آباد

گیسو و رخ سے ترے رہتے ہیں　　گبر و مسلم ہے نقاب آباد

دل بتوں سے ہے مثل دیر آباد　　اب کسے آباد ہے یہ خیر آباد

ردیف الہامی کے تحت مطبوعہ نسخہ میں ۶ غزلیں ہیں جو ۸۹ اشعار پر مشتمل ہیں۔ لیکن قلمی میں صرف ایک
ل ہے جو ۱۳ اشعار پر مشتمل ہے اور یہ ایسی غزل ہے جو مطبوعہ نسخہ میں موجود نہیں ہے۔ غزل ملاحظہ ہو :

نکہتِ رخسار ہے موجِ صبا پر حاشیہ　　زلف مشکیں ہے تری کالی گھٹا پر حاشیہ

بوئے تن ہے نکہت بادِ صبا پر حاشیہ　　پیرہن تیرا صنم گل کی قبا پر حاشیہ

زلف پیچاں تیری ہر کالی بلا پر حاشیہ　　چشم فتاں تیری دیوان قضا پر حاشیہ

آہ میری ہو گئی غوغائے محشر سے بلند　　آنکھ میری ہے جو طوفانِ بلا پر حاشیہ

تاب میں چاندی سوا فزوں ہے ترے کپڑے سفید　　یہ سنہرا رنگ ہے، رنگِ طلا پر حاشیہ

بے سبب سبزہ نہیں نکلا رخِ پُر نور پر　　ہے خطِ مشکیں ترا شمس الضحٰی پر حاشیہ

خاک کوئے یار ہے اکسیر اعظم سے فزوں　　بو علی لکھ رکھے قانونِ شفا پر حاشیہ

خواب سے اس کو جگایا جب کہ میں نے صبح وصل　　ہو گئی شرم اور چشم نیم وا پر حاشیہ

آہ سے عشاق کی اڑتا ہے ہر دم ای پری　　ہے دوشالے کا ترے پرّاں ہوا پر حاشیہ

ایک ساغر پینے میں کیا کیا نزاکت خرچ کی　　لکھ دیا اس شوخ نے متنِ ادا پر حاشیہ

خون سے عشاق کے ہو جائے گا سرخ ایک دن　　چھوڑ دے خیاط اس گل کی قبا پر حاشیہ

اس غزل سے اے صغیر بلبل گلزار قدس　　چڑھ گیا دیوان ارباب ذکا پر حاشیہ

(۳) مطبوعہ نسخہ کے آخر میں مخمس اشعار موجود ہیں اور دو مخمس بر غزل خواجہ وزیر، مخمس بر غزل

جناب سحر، خمسہ بر غزل غلام حسنین قدر بلگرامی اور خمسہ بر غزل سید محمد مہدی خبر بلگرامی پر مشتمل ہیں۔
اس کے برخلاف قلمی نسخہ میں صرف ایک ہی خمسہ کے اشعار ہیں اور وہ خمسہ صفیر بر غزل وزیر ہے۔
لیکن یہ خمسہ ایسا ہے جس کے اشعار مطبوعہ نسخہ میں موجود نہیں ہیں۔ خمسہ کے اشعار ملاحظہ ہوں:

نہ ہو برباد شبدیز ہوس سے ہم عناں ہو کر — نہ سر اتنا اوٹھا ہم پای گرد کارواں ہو کر
مٹے گا ایک دن نقش قدم سا بے نشاں ہو کر — چلا ہے اور دل راحت طلب کیا شادماں ہو کر
زمیں کوے قاتل رنج دے گی آسماں ہو کر

شریک آرزو محو تماشائے بتاں ہو کر — معین صد ہوس ہم پائی نقش رہرواں ہو کر
تری کے راستے سے ہم رہ اشک رواں ہو کر — چلا ہے اور دل راحت طلب کیا شادماں ہو کر
زمیں کوے قاتل رنج دے گی آسماں ہو کر

جفا و جور جب تم اپنے مشتاقوں پہ کرتے تھے — اسی دن کے لئے ہم پیشتر سے یار ڈرتے تھے
یہی خطرے ہمارے دل میں آگے سے گزرتے تھے — اسی خاطر تو قتل عاشقاں سے منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کارواں ہو کر

روانہ ہو چکی تھی ساتھ قاصد کے شکیبائی — مگر تقدیر حسب مدعا پھر اوس کو یاں لائی
اگر سچ پوچھئے تو ہے یہی وجہ توانائی — جواب نامہ کیا لایا، تن بے جاں میں جاں آئی
گیا یاں سے کبوتر، واں سے آیا مرغ جاں ہو کر

نہیں نقصا ہے آساں برہمن کا جدا ہونا — بہت دشوار ہے اے یار دشمن کا جدا ہونا
مسافر سے نہیں ہے سہل رہزن کا جدا ہونا — غضب ہے روح سے اس جامۂ تن کا جدا ہونا
لباس تنگ ہے اُترے گا آخر دھجیاں ہو کر

وہ چھٹنا اقربا کا اور مسکن کا جدا ہونا — وہ احباب و پسر کا، دختر و زن کا جدا ہونا
بہت ہے شاق سب سے وقت مردن کا جدا ہونا — غضب ہے روح سے اس جامۂ تن کا جدا ہونا
لباس تنگ ہے اُترے گا آخر دھجیاں ہو کر

جوانی میں پہن کر تنگ کپڑے جبکہ میں نکلا — نہایت اینڈتا پھولوں کے بل ہر سمت پھرتا تھا
قضا ناگہ پکاری اس کسوت پہ نہ اترانا — غضب ہے روح سے اس جامۂ تن کا جدا ہونا

لباس تنگ ہے اُوترے گا آخر دھجیاں ہو کر

(۴) کچھ غزلیں ایسی ہیں جن کے بعض اشعار تو قلمی اور مطبوعہ دونوں نسخوں میں یکساں طور پہ پائے جاتے ہیں، لیکن بعض اشعار ایسے ہیں جو قلمی نسخہ میں تو موجود ہیں۔ لیکن مطبوعہ نسخہ میں نہیں ہیں۔ چند اشعار نمونہ کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔ قلمی اور مطبوعہ میں سب سے پہلی غزل مندرجہ ذیل شعر سے شروع ہوتی ہے:

جانانِ معنا میں پر ہے سایہ ربِ سبحاں کا   بناطغرائی بسم اللہ سے تاج اپنے دیوان کا

اس کے بعد دوسرے شعر میں اختلاف ہوگیا ہے۔ کیونکہ مطبوعہ نسخہ میں مندرجہ ذیل شعر ہے:

سراپا مندرجہ گیا جس وقت مضمونِ قدِ جاناں کا   لقب ہوجائے گا دیوانِ محشر اپنے دیواں کا[۱]

جبکہ اس کے بجائے قلمی نسخہ میں یہ شعر ہے:

لیا ہے تنگ یوسف کو یہ آغوشِ تصور میں   بعینہ دیدۂ یعقوب پر عالم ہے زنداں کا[۲]

مطبوعہ نسخہ ص۱ کے حاشیہ پر ایک غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے:

دلِ صد پارہ وابستہ ہوا زلفِ چلیپا کا   رگِ لیلیٰ سے شیرازہ بندھا دیوان سودا کا

یہ غزل ۹ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہی غزل قلمی نسخہ میں بھی ملتی ہے جس میں کل ۲۴ اشعار ہیں۔ مطلع اور ۸ اشعار میں تو دونوں نسخے یکساں ہیں، لیکن بقیہ ۱۵ اشعار ایسے ہیں جو صرف قلمی نسخہ میں موجود ہیں چند اشعار ملاحظہ ہوں:

چلی پامالیٔ عاشق کو تا موی کمر پہونچی   خدا حافظ ہے نکلا پاؤں اب زلفِ چلیپا کا

نقاب الٹو اگر تم گلشنِ رخ سے تماشا ہو   بنے بلبل ابھی مرغِ نظر اہلِ تماشا کا

ادھر آئی سیاہی تیرے دل کی صاف گالوں سے   رخِ پُر نور پر نشو و نما ہے خطِ زیبا کا

بنا ہے مرغِ بسم اللہ ہر مرغِ نظر اپنا   نظارہ جب کیا ہے مصحفِ رخسارِ جاناں کا

یہ تیرا تیر نکلے میرے دل میں پھر نہ نکلا چارہ سازوں سے   خیالِ دون زخمی نظروں کا مگر رینہ ہے مینا کا

وہ زخمی ہوں کرلے جرّاح مجھ پہ روئے گا دشمن   بنے گا دیدۂ پر اشک سوزن کا ترسے تا کا

بسوعت آگے پہنچا کوچۂ جاناں میں صحرا سے   جو ڈھونڈے آبلے طلاح کھُلا گویا مرے پا کا

اشاروں سے تری آنکھوں کی زندہ ہوتی ہیں مردم   حرہ ہے غنچۂ مریم بپوٹا لب مسیحا کا

دہاں عنقا صفت پنہاں سخن مشہور ہے ان کا   دہان تنگ ہے یا آشیانہ مرغِ عنقا کا[۳]

۱- ص ۱   ۲- ص ۱۲   ۳- بمبئی فورٹ نقش نسخہ دیو   ۴- ص ۹۴

ردیف الیاء کے تحت مطبوعہ نسخہ میں ایک غزل ۷ اشعار پر مشتمل ہے جس کا مطلع یہ ہے :[1]

بناگوش صنم پر دیدنی ہے شان کاکل کی　　بیاضِ صبح پر تحریر ہے یہ خط سنبل کی

یہی غزل قلمی نسخہ میں بھی ملتی ہے۔ مگر اس میں صرف ۷ اشعار ہیں اور ۳ اشعار ایسے ہیں جو مطبوعہ نسخہ میں نہیں ہیں۔ وہ اشعار یہ ہیں :

خطِ رخ پر دلآویزی غضب ہے تیرے کاکل کی　　خط گلزار کے ہے، گرد جدول خط سنبل کی

ترے رخ کے تصور میں گلوں کا ذکر کرتی ہے　　یہ اوڑتی سی خبر ہے کوچۂ منقار بلبل کی

ترے خال ذقن پر صاف جادوگر کا شبہ ہے　　ذقن پر تیرے پھبتی ہو رہی ہے چاہ بابل کی[2]

۱۔ ص ۳۱　　۲۔ ص ۳۲

سلیم الدین احمد
اسسٹنٹ لائبریرین
خدابخش لائبریری پٹنہ

شاہ ولی اللہ دہلوی کے مخطوطات خدابخش لائبریری میں

شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ[1]) کی تصنیفات اسلامی علوم کی تقریباً سبھی شاخوں کو محیط ہیں۔ مثلاً قرآن کا ترجمہ وتفسیر، اصول تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، عقائد، تصوف، تذکرہ، نیز مذہبی اور سیاسی مکتوبات وغیرہ۔ آپ کی تصنیفات میں سے ایک تعداد اُن کتابوں کی ہے جو طبع ہو چکی ہیں اور عام شہرت کی حامل ہیں، ایک تعداد وہ ہے جو مخطوطات کی شکل میں کہیں کہیں پائی جاتی ہیں اور طباعت واشاعت کی محتاج ہیں اور ایک تعداد ایسی بھی ہے جن کے صرف ناموں ہی کا حوالہ ہمیں ملتا ہے۔ اس پس منظر میں شاہ صاحب کی تصنیفات کی صحیح تعداد کا تعین مشکل ہے۔

شاہ صاحب کے قدیم تذکرہ نگار، رحیم بخش دہلوی نے شاہ صاحب کی ۴۶ تصنیفات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے: "شاہ صاحب کی تصنیفات کثرت سے ہیں . . . . لیکن افسوس یہ ہے کہ باوجود تحقیقات کے چند مشہور کتابوں کے علاوہ اور کسی کا پتہ نہیں چلتا"[2] اور یہ کہ انھوں نے "صرف انھیں کتابوں کا ذکر کیا ہے جو مطبوع ہو کر شرق سے غرب تک نہایت وقعت سے مشہور ہو چکی ہیں"[3] لیکن ان کی مذکورہ ان مطبوعہ کتابوں

۱۔ رحیم بخش دہلوی: حیات ولی ص [illegible]؛ سرکیس نے معجم المطبوعات العربیہ والمعربہ میں آپ کی تاریخ وفات ۱۱۷۶ھ دی ہے۔ لیکن کتاب المقتبسات کے حوالے سے لکھا ہے کہ آپ کی وفات ۱۱۸۰ھ میں ہوئی۔ حدیقۃ الاولیا مؤلفہ مفتی غلام سرور (نولکشور) ص ۱۰۸، اور ہدیۃ العارفین جلد ۱، ص ۷۷، میں ۱۱۹۰ھ ہی سال وفات دیا گیا ہے۔ لیکن مناظر احسن گیلانی نے اپنی کتاب تذکرہ شاہ ولی اللہ ص [illegible] میں نہایت صحیح قول شاہ عبدالعزیز کا نقل کیا ہے کہ آپ کی تاریخ وفات "او بود امام اعظم دین" سے نکلتی ہے یعنی ۱۱۷۶ھ۔ خدابخش لائبریری کے توضیحی کیٹلاگ ۲۳، ص [illegible] [illegible] ظاہر ہے۔

۲۔ حیات ولی ص ۳۹۵ ۳۔ حیات ولی ص [illegible]

میں سے بھی ایک تعداد ایسی ہے جو بالکل نایاب ہے، اُن کا کہیں حوالہ نہیں ملتا۔ ڈاکٹر سید اطہر عباس رضوی،
شاہ صاحب پر اپنی تصنیف میں لکھتے ہیں کہ "چند مصنفین ان کی تصنیفات کی تعداد دو سو سے زائد بتلاتے
ہیں ... مشہور و معروف کتابوں کی تعداد تقریباً پچاس ہے۔ لیکن ان میں سے نصف محض چند یا پانچ صفحات پر
مشتمل، مختصر رسالے ہیں"[1] لیکن ڈاکٹر رضوی نے مشہور و معروف پچاس تصنیفات میں سے صرف اکتالیس
تصنیفات (مکتوبات کو چھوڑ کر) کا ہی حوالہ دیا ہے۔ جس میں یہ صراحت بھی نہیں ملتی کہ ان میں سے کون کون
سی تصنیفات طبع ہو چکی ہیں۔ مولانا منظور نعمانی نے شاہ صاحب پر اپنے مختصر مگر جامع مقالہ میں شاہ صاحب
کی چوالیس تصنیفات کا حوالہ دیا ہے[2] جن میں ۳۴ کے بارے میں یہ صراحت بھی کر دی ہے کہ یہ طبع ہو چکی
ہیں۔ حکیم محمود احمد برکاتی نے شاہ صاحب پر اپنی تصنیف میں مطبع کے نام اور سن طباعت کی تفصیل
کے ساتھ ایسی چوالیس کتابوں کا حوالہ دیا ہے، جو طبع ہو چکی ہیں اور مزید سترہ ایسی کتابوں کا حوالہ دیا ہے[3]
جو اب تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہو سکی ہیں، جن میں سے تیرہ کے بارے میں انھوں نے یہ وضاحت بھی کی
ہے کہ ان کتابوں کے صرف نام ہی معلوم ہیں، یہ نہ صرف یہ کہ طبع نہیں ہوئی ہیں، بلکہ یہ تک معلوم نہیں کہ یہ
مخطوطات کی شکل میں کہاں کہاں پائی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر مظہر بقا صاحب نے شاہ صاحب پر اپنی تصنیف میں شاہ
صاحب کی کل تصانیف کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے اور ان کی ۶۰ تصنیفات کا حوالہ دیا ہے، جن میں
سے چوالیس کتابوں کے بارے میں یہ وضاحت بھی کی ہے کہ یہ طبع ہو چکی تھیں[4]۔ اس مقالہ میں شاہ صاحب
کی صرف ان تحریروں کا تعارف و تذکرہ مقصود ہے جو مخطوطات کی شکل میں خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہیں۔

روایت حدیث کی سندیں شاہ صاحب کی اپنی تحریریں: خدا بخش لائبریری میں
شاہ صاحب کی طرف سے دی گئی روایت حدیث کی ایسی دو سندیں محفوظ ہیں، جو شاہ صاحب کی اپنی تحریر
میں اور ان کے دستخط کے ساتھ ہیں۔ ایک سند بخاری کے ایک ایسے نسخے کے آخر میں دی گئی ہے، جس کی کتابت جامع
مسجد دہلی میں آپ کے زیر نگرانی انجام پائی اور جس کی تصحیح بھی آپ نے کی تھی۔ روایت حدیث کی یہ سند مرقومہ
۱۱۵۹ھ، آپ نے اپنے شاگرد شیخ محمد بن شیخ پیر محمد بن شیخ ابو الفتح الحرمی البلگرامی ثم الہ آبادی کو دی ہے،

۱۔ ڈاکٹر اطہر عباس رضوی: شاہ ولی اللہ اور ان کا عہد (۱۹۸۰ء) معرفت پبلشنگ ہاؤس آسٹریلیا۔
۲۔ منظور نعمانی: شاہ ولی اللہ نمبر، ص [illegible] ۳۔ حکیم محمود احمد برکاتی: شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان، ص [illegible]
۴۔ ڈاکٹر مظہر بقا: اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ، ص [illegible]

(بخاری کے اس نسخے کے کاتب بھی ہیں۔ اس سند کے آخر میں شاہ رفیع الدین کا ایک نوٹ بھی ہے، جو اس طرح ہے " این خط والد بزرگوار است بلا شبہ۔ کتبہ الحقیر شاہ رفیع الدین " اس سند کا عکس الخیر الکثیر مطبوعہ ڈابھیل کے آغاز میں شائع ہو گیا ہے۔[1]

دوسری سند مرقومہ ۱۱۶۰ھ، ایک رسالہ " الفضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الامین " کے آخر میں شاہ صاحب نے اپنے شاگرد شیخ محمد کو دی ہے۔ یہ بھی شاہ صاحب کی اپنی تحریر میں ہے۔ جس کا متن اس طرح ہے:

" الحمد للہ قد قرأ علی ہذہ الرسالۃ علیہا صاحب النسخہ اخونا الصالح الشیخ محمد احسن اللہ تعالیٰ واصلح حالہ فاجزت لہ روایتہا ... علی ان ضبطہا بعض شئی من الخلل فی ضبط الاسماء لا سیما فی اسماء المغاربہ۔ کتب ہذا السطور مولفہا الفقیر ولی اللہ عفی اللہ عنہ فی اوائل محرم ۱۱۶۰ھ آخر ساعۃ من یوم الجمعۃ "

الفضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الامین :- یہ ایک اہم رسالہ ہے جس کی کتابت نہ صرف یہ کہ شاہ صاحب کی زندگی ہی میں ہوئی، بلکہ شاہ صاحب نے اس کی تصحیح بھی فرمائی اور اس کے آخر میں اس رسالہ کے کاتب کو روایت حدیث کی سند بھی مرحمت فرمائی۔ اس رسالہ میں جو ۱۸ اوراق پر مشتمل ہے اور خط نستعلیق میں ہے، حدیث مسلسل کو جمع کیا گیا ہے۔ مشتملات اس طرح ہیں:-

" الحدیث المسلسل بالاولیۃ، الحدیث المسلسل بقرأۃ سورۃ الصف، الحدیث المسلسل بقول انی احبک فقل، الحدیث المسلسل بالمصافحۃ، الحدیث المسلسل بالحفاظ المتقنین فی علم الحدیث، الحدیث المسلسل بالفقہاء الحنفیہ، الحدیث المسلسل بالفقہاء الشافعیہ، الحدیث المسلسل بالفقہاء المالکیہ، الحدیث المسلسل بالفقہاء الحنابلہ، الحدیث المسلسل بالاشاعرۃ، الحدیث المسلسل بالمکیین، الحدیث المسلسل بالمشارقۃ، الحدیث المسلسل بالمغاربۃ، احادیث مسلسلہ بائمہ اہل البیت، احادیث مسلسلہ بالآباء، اربعون حدیثاً مسلسلاً بالاشراف، احادیث مسلسل بالمحدثین، الحدیث المسلسل

۱- محمود احمد برکاتی : شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان ص ۴۹

بالحسن، احادیث مسلسلہ بحرف العین فی اوّل اسم کل راو، الحدیث المسلسل بالقراء، الحدیث المسلسل باشعراء، الحدیث المسلسل بیوم العید، حدیث مسلسل بنسبۃ کل راو الی شیٔ من بلد او قبیلہ"۔ یہ رسالہ ابھی تک طبع نہیں ہو سکا ہے[1]۔

فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن:۔ فارسی زبان میں قرآن مجید کا یہ آسان ترجمہ دو جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد میں آغاز قرآن سے سورۂ مریم تک کا ترجمہ و تفسیر ہے جو ۴۳۲ اوراق پر مشتمل ہے۔ دوسری جلد میں، جو ۴۳۳ اوراق پر مشتمل ہے، سورۂ طٰہٰ سے آخر قرآن تک کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ دیباچہ میں اس بات کی تصریح ملتی ہے کہ یہ ترجمہ عربی زبان سے نابلد لوگوں کے لئے اور خاص طور پر ہندوستانیوں اور مبتدیوں کے لئے لکھا گیا ہے۔ مزید اس بات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے کہ آپ کے دوست خواجہ محمد امین کے تعاون سے یہ تفسیر عوام میں کافی مقبول ہوئی اور بہت سے مدارس میں داخل نصاب ہوئی۔ کاتب صفی اللہ بن شیخ فقیر اللہ نے تفسیر کے آخر میں مشکل الفاظ کی ایک فرہنگ بھی دیدی ہے جس کے دیباچے میں لکھا ہے کہ تفسیر کے حواشی پر انھیں بہت سے نوٹ عربی و فارسی زبان میں لکھے ہوئے ملے، جسے انھوں نے جمع کر کے پڑھنے والوں کے فائدے کے لئے مسودہ بہ مسودہ ترتیب دیدیا ہے۔ کتابت خط تعلیق میں ہے اور سنہ کتابت ۲۷ ربیع الثانی ۱۱۸۱ھ ہے۔ گویا انہوں شاہ صاحب کی وفات کے بعد کا ہے، جسے کاتب نے اپنے پیر محمد عاشق کے حکم پر لکھا تھا۔ اس کے ترجمہ کا آغاز شاہ صاحب نے ۱۱۵۰ھ میں کیا تھا اور اس کی تکمیل ۱۱۵۱ھ میں ہوئی تھی یہ تفسیر متعدد بار طبع ہو چکی ہے۔

فارسی میں قرآن کے اس ترجمے کی اہمیت کا اندازہ الیانع الجنی (۷۹) کے اس قول سے ہوتا ہے کہ:

وقد نسج علی منوالہ ابنہ عبد القادر فاحسن الترجمہ الی ھندیہ للقرآن اقتباسا من مشکاتہ ولقد سھل الترجمۃ من بعدہ علی الناس قد وقاً بہ ومن تبعہ وھو اوّل من اتقن ھذا ودوّن اصولہ[2]"

مقدمہ فتح الرحمٰن: یہ اہم مقدمہ آپ کے ترجمہ قرآن فتح الرحمٰن، کے ساتھ شامل ہے اسے یہاں ایک علیحدہ رسالے کے طور پر لیا گیا ہے۔ فرق اتنا کیا گیا ہے کہ اس کے اختتام پر ایک دعا

۱۔ ڈاکٹر مظہر بقا صاحب نے لکھا ہے کہ یہ رسالہ طبع ہو چکا ہے (ص ۶۶)، لیکن محمود احمد برکاتی صاحب نے لکھا ہے کہ یہ طبع نہیں ہوا ہے اور یہی زیادہ صحیح قول معلوم ہوتا ہے۔

۲۔ ۱۱۲۱ تا ۱۲، ص ۱۷۵

ال کی گئی ہے، جسے قاری کو تلاوت قرآن پاک کے بعد پڑھنا چاہیئے۔ دعا یہ ہے: " صدق اللہ
صدق اللہ علی العظیم وصدق رسولہ الکریم الخ" کتابت خط تعلیق میں ہے۔ تعداد اوراق آٹھ ہے
یہ نسخہ ۱۳ ویں صدی کا معلوم ہوتا ہے۔

مصفی شرح موطا: یہ امام مالک کی مشہور کتاب موطا جو مدینے کے علما کے اجماع پر مبنی مسلم قانون اور
ن کے تعامل پر سب سے قدیم دستاویز ہے، کی فارسی شرح ہے۔ حاشیہ پر جابجا نوٹ اور تشریحیں ہیں۔ کتابت پاکیزہ
ط نستعلیق میں ہے اور سنہ کتابت ۱۲۰۶ھ ہے۔ کاتب کا نام سید بہادر علی لکھنوی ہے۔ تعداد اوراق ۳۰۲ ہے۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ خدا بخش لائبریری کی توضیحی فہرست میں کتاب کے اخیر میں دیے ہوئے
چند تاریخی قطعات کا حوالہ دے کر لکھا گیا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف ۱۱۷۹ھ میں مکمل ہوئی۔ لیکن یہ بات
درست نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ شاہ صاحب تو ۱۱۷۶ھ ہی میں انتقال فرما چکے تھے۔ دوسرے یہ کہ کتاب کے
اخیر میں دیے تاریخی قطعات جن سے ۱۱۷۹/۱۱۸۰ھ کی تاریخیں نکلتی ہیں، اس کتاب سے متعلق نہیں
ہیں۔ کتاب کے اختتام کے بعد کاتب نے تین اوراق میں تین مختلف نوٹ شامل کر دیے ہیں، جو اسے کہیں سے
ل گئے ہیں۔ پہلا نوٹ شاہ عبدالعزیز کا ہے، جس میں انھوں نے موطا کے درس سے فراغت کی تاریخ دی ہے،
جس درس میں ان کے بھائی شاہ رفیع الدین، خواجہ محمد امین، بابا فضل اللہ وغیرہ شریک درس رہے تھے۔
دوسرا نوٹ شیخ محمد عاشق کا ہے، جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ امام مالک کے رسالہ صراط المستقیم، و شرح
طریق القویم کو شاہ صاحب ترجمہ و ترتیب کے بعد کچھ دوسرے رسائل کے ساتھ شائع کرنا چاہتے تھے
کہ متعلقاً فی شرح الموطا کا مسئلہ درپیش آ گیا اور ساتھ ہی ساتھ انھوں نے اس شرح کا درس دینا بھی
شروع کر دیا۔ لہٰذا اس مصروفیت کے باعث یہ کام رہ گیا۔ تیسرا نوٹ خود شاہ ولی اللہ کا ہے جس میں
آپ نے خواجہ محمد امین الکشمیری کو چند احادیث شہید متداولہ کی سند دی ہے۔ یہ نوٹ کاتب نے جہاں
سے نقل کیا ہے اس کی تاریخ کتابت کے تاریخی قطعات بھی نقل کر دیے ہیں، جس کو غلطی سے تاریخ
تصنیف سمجھ لیا گیا ہے۔

لائبریری میں اس کا ایک اور نسخہ بھی ہے جو کتاب کا نصف آخر ہے۔ اس کا آغاز کتاب البیوع
سے ہوتا ہے۔ تعداد اوراق ۲۱۲ ہے۔

ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء: یہ شق نقد پر ایک جامع تصنیف ہے

جو فارسی زبان میں ہے ۔ دیباچہ میں شاہ صاحب نے صراحت کی ہے کہ چونکہ ان کے زمانہ میں شیعی فرقہ نے خلفاء اربعہ کی خلافت کے سلسلہ میں بہت سے لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس لئے یہ کتاب لکھ کر خلفاء کی اہمیت اور ان کی ضرورت پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ کتاب قرآنی آیات اور احادیث نبویؐ پر مبنی ہے۔ کتاب کو دو مقصدوں میں تقسیم کیا گیا ہے، جن کے ذیل میں پھر کئی فصلیں ہیں۔ لائبریری میں اس کتاب کے دو نسخے ہیں۔ دونوں ہی نسخے خط تعلیق میں ہیں۔ پہلا نسخہ ۵۰۶ اوراق پر مشتمل ہے، جس کا کاتب حاجی گل محمد ہے۔ کتابت ۱۲۱۳ھ کی ہے ۔ دوسرا نسخہ ناقص الآخر ہے، اور ۳۸۰ اوراق پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا ایک نسخہ آصفیہ لائبریری میں بھی موجود ہے۔ یہ کتاب طبع ہو چکی ہے۔ مولانا منظور نعمانی نے اسکی اہمیت پر مولانا عبدالحی فرنگی محلی کا قول نقل کیا ہے کہ "اس موضوع پر پہلے سے اسلامی لٹریچر میں ایسی کوئی کتاب موجود نہیں ہے"[1] کشف الغطا کے نام سے اس کتاب کا اردو میں ترجمہ بھی ہو گیا ہے۔ مطلبی ڈاکٹر اسماعیل اس کتاب کا عربی میں ترجمہ کرا رہی ہے ۔

فوز الکبیر فی اصول التفسیر و فتح الخبیر: اصول تفسیر پر یہ ایک اہم تصنیف ہے۔ پوری کتاب کو پانچ ابواب پر تقسیم کیا گیا ہے ۔ پانچواں باب کہ "در ذکر جملہ صالحہ از شرح غریب قرآن و اسباب نزول آن کہ مفسر را حفظ آن قدر ضرور است و خوض در تفسیر بدون حفظ آن ممنوع و محظور" ہے کے بیچ ضمیمہ کر دیا گیا ہے۔ یعنی اس باب میں قرآن مجید کے مشکل و غریب لغات بہل الفاظ میں حل کئے گئے ہیں، اور جا بجا قرآنی آیات کی تفسیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح و مشہور احادیث اور صحابہ کرام کے مستند اقوال سے کی گئی ہے۔ اس باب کو ایک مستقل حیثیت دے کر ایک الگ رسالہ کی صورت دے دی گئی ہے۔ لکھتے ہیں کہ: "و این باب بجلد علاحدہ شروع کردہ شد تا رسالہ باشد مستقل، اگر کسی خواہد جدا نویسد والناس فیما یعشقون مذاہب" چنانچہ اسی رسالہ کا نام آپ نے "فتح الخبیر بما لا بد من حفظہ فی علم التفسیر" رکھا ہے۔ لائبریری میں اس کتاب کے تین نسخے ہیں۔ تینوں خط نستعلیق میں ہیں اور تیرھویں صدی کے معلوم ہوتے ہیں۔ پہلا ۱۳۷ اوراق، دوسرا ۱۱۸ اوراق، اور تیسرا ۱۸۹ اوراق پر مشتمل ہے۔ تیسرے نسخے کے ورق ۱۷۹ (ب) پر شاہ صاحب نے اپنی دو تصانیف "تاویل الاحادیث" اور "فتح الرحمٰن" کا حوالہ دیا ہے۔ ورق ۱۸۰ بالکل سادہ ہے۔ پانچویں باب کا عنوان اور آخر حصہ غائب ہے۔ خاتمہ

۱- الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر ص ۳۸۶

ی یہ کتاب متعدد بار طبع ہو چکی ہے۔ پانچویں باب کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو گیا ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ: شاہ صاحب کی یہ معرکۃ الآرا تصنیف فقہ، حدیث، اخلاق، تصوف اور فلسفہ پانچوں علوم کا خلاصہ و عطر ہے، اگرچہ کتاب کا اصل موضوع فقہ اور حدیث ہی ہے۔ اس کتاب کو لکھنے کا خیال مکہ میں ———— پیدا ہوا، اور آپ کے شاگرد اور دوست شیخ محمد عاشق (شاہ صاحب کے ماموں شیخ عبداللہ کے فرزند) کی درخواست پر دلی میں یہ خیال پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس کتاب میں آپ نے حدیث و فقہ کے ارتقائی پہلوؤں اور شرعی احکام کے نفاذ کے دلائل کا جائزہ لیا ہے۔

۳۵۷ اوراق پر مشتمل یہ مطالعہ نسخہ نہایت پاکیزہ نستعلیق میں ہے۔ کتابت ۱۲۴۰ھ کی ہے۔ یہ کتاب متعدد بار طبع ہو چکی ہے۔ اس کے طبع شدہ کئی نسخے لائبریری میں موجود ہیں۔ اس کتاب کا اردو میں ترجمہ بھی ہو گیا ہے۔

المسوی شرح الموطا: یہ کتاب امام مالک کی مشہور تصنیف موطا کی عربی شرح ہے جس کی فارسی شرح بھی آپ نے مصفیٰ شرح موطا کے نام سے لکھی تھی جس کا بیان اوپر گزر چکا ہے۔ اس شرح میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ ہر حدیث کے ذیل میں متعلقہ حدیث کی مختلف علما نے جو تشریحیں کی ہیں انھیں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے ساتھ ہی ہر باب میں امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کے اختلاف رائے کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ یہ شاہ صاحب کی ۱۱۶۴ھ کی تصنیف ہے۔ لائبریری میں اس کتاب کے دو نسخے ہیں پہلا نسخہ جو ۳۲۲ اوراق پر مشتمل ہے پاکیزہ نسخ میں ۱۲۶۵ھ کا ہے۔ اس کے کاتب کا نام القاضی عبدالرحمٰن بن قاضی اسمعیل ہے۔ دوسرا نسخہ ۶۸۷ اوراق پر مشتمل ہے۔ خط نستعلیق میں لکھا ہوا یہ نسخہ ۱۲۶۲ھ کا ہے۔ یہ کتاب طبع ہو چکی ہے۔

الانصاف فی بیان سبب الاختلاف: یہ ایک اہم تصنیف ہے جس میں صحابہ، تابعین، محدثین اور فقہا کے درمیان اختلافات کی وجوہ پر بحث کی گئی ہے۔ کتاب پانچ ابواب پر منقسم ہے۔ چوتھے اور پانچویں باب میں چوتھی اور مابعد کی صدیوں کے فقہا کے مختلف خیالات پر بالخصوص بحث کی گئی ہے۔ ورق ۱۸ (ب) پر شاہ صاحب نے اپنے شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم (م ۱۱۴۵ھ) کے واسطے سے امام شافعی (م ۲۰۴ھ) کے خیالات کا فقہ کے بعض اصل اصولوں سے متعلق بیان حوالہ دیا ہے۔

لائبریری میں اس کے دو نسخے ہیں پہلا نسخہ ۲۴ اوراق پر ہے، خط نستعلیق میں ہے، اور

نسخہ تیرھویں صدی کا معلوم ہوتا ہے۔ سر ورق پر مشتملات کی فہرست بھی ہے۔ کتاب کے آخر میں شاہ صاحب کی تصنیف عقد الجید کے مشتملات کی فہرست بھی دی ہوئی ہے۔ دوسرا، تیسرا اور چوتھا نسخہ علی الترتیب ۳۹، ۷۲ اور ۳۵ اوراق پر مشتمل ہے۔ سبھی خط نستعلیق میں ہیں اور تیرھویں صدی ہجری کے ہیں۔ پانچواں نسخہ جو ۲۶ اوراق پر مشتمل ہے خط نستعلیق میں تیرھویں صدی ہجری کا لکھا ہے۔ اس اعتبار سے قابل ذکر ہے کہ اس کے آخری تین اوراق پر 'وتر' کی نماز کے بارے میں ائمہ اربعہ کے خیالات پیش کیے گئے ہیں۔ چھٹا نسخہ ۱۴ ورق پر مشتمل ہے۔ اور خط نسخ میں ہے۔

یہ کتاب متعدد بار طبع ہو چکی ہے۔ اس کتاب کا اُردو میں 'کشاف' کے نام سے ترجمہ بھی ہو گیا ہے۔

عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید: اجتہاد اور تقلید پر یہ ایک اہم تصنیف ہے۔ شاہ صاحب نے اس میں اس بات پر بحث کی ہے کہ مسلمان کس طرح فقہ کے چار اسکولوں میں بٹ گئے ہیں۔ دوسرے باب میں شاہ صاحب نے مسلمانوں کو اس بات کی تاکید کی ہے کہ وہ کسی ایک اسکول سے اپنے آپ کو منسلک کرلیں۔ اس کتاب کے لائبریری میں تین نسخے موجود ہیں۔ تینوں ہی نسخے خط نستعلیق میں تیرھویں صدی ہجری کے ہیں۔ پہلا نسخہ ۱۹ اوراق پر مشتمل ہے اور نیلے حاشیوں کے اندر لکھا ہوا ہے۔ پہلے ورق پر ایک دوسرے خط میں ایک تحریر ہے کہ مصنف کا انتقال ۱۱۸۰ھ میں ہوا، جو ظاہر ہے کہ صحیح نہیں۔ ورق ۲۰ الف سادہ ہے۔ دوسرا نسخہ ۲۲ اوراق پر مشتمل ہے اور تیسرا ۲۳ اوراق پر۔ اس نسخے کے آخری ورق پر تحفۂ اثنا عشریہ (تصنیف شاہ عبدالعزیز بن شاہ ولی اللہ کے حوالے درج ہیں) شاہ صاحب کی یہ تصنیف طبع ہو چکی ہے۔

قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین: یہ ایک مشہور سُنّی تصنیف ہے جس میں پہلے دو خلفا حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے قابل تعریف اوصاف کا تذکرہ کیا گیا ہے اور بعد کے دونوں خلفا حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علیؓ پر احادیث اور اولیاء کے کلام کی روشنی میں ان کی برتری ثابت کی گئی ہے! ساتھ ہی اس نظریئے پر بھی بحث کی گئی ہے کہ ان کی روحیں رسول اللہ صلعم کی روح سے نکلی ہوئی روشنی سے مل گئی ہیں۔ دیباچہ میں مصنف نے صراحت کی ہے کہ یہ کتاب انھوں نے اپنے بھائی خواجہ محمد امین کی درخواست پر لکھی ہے۔

اس مخطوطہ کا ایک نسخہ پبلک لائبریری کلکتہ اور ایک آصفیہ لائبریری میں بھی موجود ہے۔ کتاب

لیق میں ہے۔ سنہ کتابت درج نہیں، نسخہ تیرھویں صدی کا معلوم ہوتا ہے۔ یہ کتاب طبع ہو چکی ہے۔

سطعات : تصوف پر یہ ایک مختصر لیکن جامع رسالہ ہے، جس میں علم الٰہی و اصطلاحات یا کا ذکر ہے۔ اور تصوف کے رموز و اشارات کی نہایت آسان توضیح ہے۔ یہ رسالہ ۱۶ اوراق پر ل ہے۔ کتابت خط نستعلیق میں ۱۲۶۸ھ کی ہے۔ اس کا ایک نسخہ آصفیہ لائبریری میں بھی موجود ہے۔ ناب طبع ہو چکی ہے۔

رسالہ مقدمہ سنیہ فی الانتصار الفرقۃ السنیہ : شیعہ فرقے کے جواب میں خاص یر اقامت کے مسائل پر یہ ایک اہم تصنیف ہے۔ جا بجا قرآن و حدیث اور متقدمین و متاخرین کے اقوال پیش کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک طبع نہیں ہو سکی ہے۔ ۴۵ اوراق شتمل یہ کتاب ۱۲۶۸ھ کی ہے اور خط نستعلیق میں ہے۔ آغاز کتاب کے ایک یا دو ورق غائب ہیں۔ اس اب کا ایک مختصر سا حصہ مولانا مہدی حسن مفتی دار العلوم دیوبند کے پاس ہے اور اس کا ایک قلمی نسخہ یدیہ لائبریری ٹونک میں بھی محفوظ ہے۔ لائبریری کے نسخے کا آغاز اس طرح ہے : "..... وعلیل صدری ویذھب بما ذکر من الکتب ... فتقرر فی خاطری ان اظہار مفاسدھم و ابطال مقاصدھم..."

مقدمہ فی قوانین الترجمہ : قرآن مجید کے مترجمین کے لیے قوانین و ضوابط پر مشتمل یہ مختصر رسالہ ہے۔ دیباچہ میں شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ انھوں نے یہ قوانین و ضوابط اس وقت وضع کیے تھے، جب وہ خود قرآن کا فارسی میں ترجمہ کر رہے تھے۔ تیرھویں صدی کا یہ نسخہ ۱۰ اوراق پر مشتمل ہے۔

الاربعون : اس مختصر رسالے میں شاہ صاحب نے ایسی چالیس حدیثیں جمع کی ہیں جو انھوں نے اپنے شیخ ابو طاہر المدنی بن شیخ ابراہیم الکردی سے روایت کی ہیں۔ جن کی سند رسول اللہ صلعم تک پہنچتی ہے۔ لائبریری میں اس کے دو نسخے ہیں۔ پہلا نسخہ سات اوراق پر مشتمل ہے۔ امتیاز کے لیے ہر حدیث کا آغاز لال روشنائی سے کیا گیا ہے۔ اس نسخے کا کاتب محمد اللہ خان ہے۔ آخر رسالہ میں دعائے قنوت اور چند حدیثیں، نیز قرآن کی چند آیتیں درج ہیں جن کا مضمون اخلاقیات ہے۔ دوسرا نسخہ چار اوراق پر مشتمل ہے۔ دونوں نسخے خط نستعلیق میں ہیں اور تیرھویں صدی کے ہیں۔ یہ رسالہ طبع ہو چکا ہے۔

۱۔ بحوالہ کیٹلاگ کتب خانہ سعیدیہ ٹونک۔ مرتبہ مولانا محمد عمران خان

رسالہ شاہ ولی اللہ : یہ ایک مختصر لیکن جامع رسالہ ہے، جس میں شیخ محی الدین ابن عربی کے نظریہ وحدۃ الوجود اور شیخ احمد سرہندیؒ کے نظریۂ وحدۃ الشہود کا بھرپور تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ دیباچے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ رسالہ آپ نے اسمٰعیل بن عبداللہ آفندی کے خط کے جواب میں لکھا تھا۔ عبداللہ آفندی نے یہ دریافت کیا تھا کہ کیا وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے نظریوں کے درمیان کوئی تطابق پیدا کیا جا سکتا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے یہ ثابت کیا ہے کہ دونوں نظریئے بنیادی طور پر منفرد ہیں۔ رسالے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے : " من العبد الضعیف احمد المدعو بولی اللہ بن عبدالرحیم الدہلوی عفی اللہ عنہ ووفقہ لما یحب ویرضاہ الی آفندی اسمٰعیل بن عبداللہ الرومی ثم المدنی... اما بعد فانی احمد الیکم اللہ الذی ...."

لائبریری میں اس رسالے کے دو نسخے موجود ہیں۔ ایک نسخہ ۱۱ اوراق کا ہے اور دوسرا ۹ اوراق کا۔ دونوں ہی تیرھویں صدی ہجری کے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ ابھی تک طبع نہیں ہو سکا ہے۔

اعلام الاریب بحدوث بدعۃ المحاریب : یہ ایک اہم رسالہ ہے جس میں مسجد میں محراب کا ہونا بدعت ہے یا نہیں، اس مسئلہ پر احادیث اور ائمہ کے اقوال کی روشنی میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ اس رسالے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔ " الحمد للہ رب العالمین ھذا جزء لطیف سمیتہ اعلام الاریب بحدوث بدعۃ المحاریب لان قوما خفی علیہم کون المحراب فی المساجد بدعۃ وظنوا انہ کان فی المسجد النبی صلی اللہ علیہ وسلم ولم یکن فی زمانہ محراب قط ولا فی زمان الخلفاء الاربعۃ .... "

یہ رسالہ ۸ اوراق پر مشتمل ہے۔ خط نستعلیق میں تیرھویں صدی کا نسخہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ رسالہ ابھی تک طبع نہیں ہو سکا ہے، ورنہ ہی اس رسالے کا حوالہ ہی کہیں ملتا ہے۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ علامہ سیوطی کا بھی بالکل اسی نام سے ایک رسالہ کا مخطوطہ ہے۔

رسالہ حسن العقیدہ : اس رسالے میں شاہ صاحب نے اہل سنت کے طریقے پر اپنے عقیدے کی وضاحت کی ہے۔ یہ شیعہ حضرات کے اس الزام کے رد میں ہے کہ آپ اہل بیت کے مخالف تھے۔ کتاب میں مصنف یا کتاب کے نام کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ لیکن کتاب کے آغاز اور اختتام کو دیکھ کر اس مجموعے میں شامل رسائل کی جو فہرست ملتی ہے اس میں اس رسالے کو شاہ عبدالعزیز کی تصنیف

قرار دیا گیا ہے۔ لیکن ورق ۹۵ (ب) پر اس بات کی صراحت ملتی ہے کہ رسالہ 'حسن العقیدہ' شاہ صاحب کی ہی تصنیف ہے۔

کتاب ۱۳ اوراق پر مشتمل ہے۔ کتابت پاکیزہ نسخ میں ہے۔ تیرھویں صدی ہجری کا نسخہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ رسالہ طبع ہو چکا ہے۔

القول السدید فی مسائل الاجتہاد والتقلید : یہ ایک مختصر رسالہ ہے جس کا عام تذکروں میں حوالہ نہیں ملتا۔ اس رسالے میں اجتہاد اور تقلید کے مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ اس رسالے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے : " اللھم ارنا الحق حقا واحد نالا تباعہ وارنا الباطل باطلا .... اما بعد فھذہ تعلیقۃ اذکر فیھا ملخص رای فی بعض مسائل الاجتہاد والتقلید۔" یہ رسالہ ۷ اوراق پر مشتمل ہے، تیرھویں صدی کا نسخہ ہے اور کچھ کرم خوردہ حالت میں ہے۔ یہ رسالہ غالباً طبع نہیں ہو سکا ہے۔

ڈاکٹر مظہر بقا نے لکھا ہے کہ یہ رسالہ شاہ ولی اللہ کی تصنیف نہیں ہے۔ لیکن تصنیف کس کی ہے اس بارے میں کچھ نہیں لکھے۔ لائبریری میں جو نسخہ موجود ہے، اس میں رسالے کے اندر شاہ صاحب کا کہیں نام نہیں ملتا لیکن رسالے کا آغاز جس انداز میں ہوا ہے اس سے یہی پتہ چلتا ہے کہ یہ شاہ صاحب کی تصنیف ہے جو مسائل اجتہاد اور تقلید پر ان کی ایک تعلیق ہے۔ اسلوب نگارش اور طریقہ استدلال بھی شاہ صاحب کے انداز کا ہے۔

یہ رسالہ لائبریری میں ایک مجموعہ کتب میں شامل ہے۔ یہ مجموعہ تین کتابوں پر مشتمل ہے۔ پہلی کتاب

۱۔ خدا بخش لائبریری کیٹلاگ میں اس خیال کا اظہار کیا گیا ہے کہ اس رسالہ کا مصنف شاہ صاحب کا کوئی دوست یا شاگرد ہے اور اس خیال کی بنیاد یہ بنائی گئی ہے کہ 'حدائق الحنفیہ' میں شاہ صاحب کی تصانیف کی فہرست میں اس رسالے کا حوالہ نہیں ملتا اور یہ کہ شاہ عبد العزیز کی تصانیف کی فہرست میں بھی اس رسالے کا حوالہ نہیں ملتا ہے۔ لیکن ———— یہ خیال صحیح نہیں۔ یہ رسالہ شاہ ولی اللہ کی ہی تصنیف ہے۔ مولانا رحیم بخش (حیات ولی)، حکیم محمود احمد برکاتی (شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان) اور ڈاکٹر محمد ... الفرقان ... شاہ صاحب کی تصانیف میں اس کا حوالہ دیا ہے۔

۲۔ ڈاکٹر مظہر بقا : اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ۔ ص ۹۶-۹۵

شاہ صاحب کی مشہور تصنیف " الانصاف " ہے۔ اور دوسری کتاب بھی مختصر " القول السدید " ہے اور تیسری کتاب شاہ صاحب کی تصنیف " عقد الجید " ہے ۔ کاتب نے تینوں ہی کتاب کے بارے میں آغاز کتاب میں لکھا ہے کہ یہ تینوں رسالے شاہ صاحب کی تصنیف سے ہیں۔

لمحات : یہ زہد و تصوف پر ایک مختصر مگر نہایت جامع رسالہ ہے۔ یہ کل ۳۲ اوراق پر مشتمل ہے ۔ کتابت خط نستعلیق میں ہے اور یہ نسخہ ۱۲۶۸ھ کا ہے۔ یہ رسالہ طبع ہو چکا ہے۔

رسالہ نظم صرف میر : میر سید شریف جرجانی کے مشہور رسالہ " صرف میر " کو شاہ صاحب نے نہ صرف یہ کہ منظوم کر دیا ہے ، بلکہ اس میں بہت سی اصلاحات بھی کی ہیں اور ان میں اپنی طرف سے بہت کچھ اضافہ بھی کیا ہے ۔ یہ رسالہ شاہ صاحب نے اپنے فرزند شاہ عبدالعزیز کے لیے اس وقت لکھا تھا ، جب انھوں نے صرف کے قواعد پڑھنا شروع کیے تھے ۔ اس بات کی صراحت رسالے کے دیباچہ میں کی گئی ہے۔ یہ رسالہ کل ۶ اوراق پر مشتمل ہے ۔ کتابت ۱۲۵۵ھ کی ہے اور خط نستعلیق میں ہے ۔ یہ رسالہ متعدد بار طبع ہو چکا ہے۔

تحریر اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف : یہ ایک مشہور رسالہ ہے۔ جس میں شاہ صاحب نے اپنے حالات قلمبند کیے ہیں۔ یہ صرف ۴ اوراق پر مشتمل ہے اور تیرھویں صدی کا نسخہ ہے۔ یہ رسالہ طبع ہو چکا ہے۔

●●

پروفیسر شاہ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی
خدا بخش لائبریری، پٹنہ

تصحیح و اضافہ

مسامحات مرآۃ العلوم (جلد سوم)

(اس سلسلے کے لئے ملاحظہ ہو جرنل ۳۰)

(۱۲۶) صفحہ ۲۹ - کتاب نمبر ۲۲۰۵، نام کتاب خسرو شیریں - فہرست میں سطور کی تعداد ۱۵ بتائی گئی ہے - یہ سہ مصرعی ہے حاشیہ پر ۲۰ سطریں ہیں - اس کا اضافہ کیجیے - مزید برآں کیفیت میں اس کی بھی اطلاع ضروری ہے کہ اس میں ۷ تصاویر مختلف اوراق میں ہیں -

(۱۲۷) صفحہ ۳۰ - کتاب نمبر ۲۲۴۳، نام کتاب رباعیات عمر خیام - فہرست میں کتاب کے اوراق کی تعداد ۱۱۰ ظاہر کی گئی ہے - حالانکہ اس کی تعداد صرف ۱۰۱ ہے -

(۱۲۸) صفحہ ۳۶ - کتاب نمبر ۲۰۷۱، نام کتاب شاہنامہ دفتر چہارم - فہرست میں پروگریس نمبر کا کالم خالی ہے - اس میں ۳۲۱۴ لکھئے -

(۱۲۹) صفحہ ۵۳ - کتاب نمبر ۳۳۶۹، نام کتاب مثنوی روم دفتر پنجم - فہرست میں اس کتاب کا سلسلہ وار نمبر اور کتاب نمبر بھی نمایاں طور پر پڑھے نہیں جاتے ان کو بالترتیب ۲۶۷۸ اور ۳۳۶۹ پڑھیے -

(۱۳۰) صفحہ ۵۶ - کتاب نمبر ۲۹۷۶، نام کتاب مجموعہ اشعار - فہرست میں نمبر کتاب ۲۹۷۶ غلط ہے - یہ صرف مجموعہ اشعار ہی نہیں، اس میں نثر کے بھی کچھ حصے ہیں، جو مختصر قصوں پر مشتمل ہیں - کیفیت کے کالم میں اس کا اندراج ہونا چاہیے -

(۱۳۱) صفحہ ۶۲ - کتاب نمبر ۳۹۲۲، نام کتاب پند نامہ، فہرست نگار نے مصنف کا نام فریدالدین عطار بتایا ہے - حالانکہ نہ یہ پند نامہ ہے اور عطار کی تصنیف - یہ ایک مناجات ہے مصنف کا نام معلوم نہیں -

(۱۳۲) صفحہ ۶۵ - کتاب نمبر ۲۹۰۷، نام کتاب مجموعہ غزلیات معہ تحفۃ النصائح - یہ کتاب مجموعۂ غزلیات ہی نہیں بلکہ اس میں قطعات، رباعیات اور دیگر اصناف سخن مختلف شعرا کے ہیں - مزید براں اردو شعرا کے بھی کچھ کلام لئے ہیں - مثلاً سودا، ذوق وغیرہ کے ساتھ تحفۃ النصائح، مصنفہ یوسف گدا بھی ہے جیسا کہ فہرست سے ظاہر ہے - صرف اس کتاب کا کاتب غلام نبی ہے اور تاریخ کتابت ۱۲۲۲ھ - یہ مکمل کتاب ایک ہی نہیں ہے اور طرز تحریر میں اختلاف پایا جاتا ہے - اس لیے فہرست

میں پوری کتاب کو ایک ہی کاتب کے نام سے منسوب کر دینا غلط ہوگا اور تاریخ کتابت کی تعیین بھی آسان نہیں۔ کتابت کی تاریخ فہرست میں بارہویں صدی ظاہر کی گئی ہے۔ "تحفۃ النصائح" کی تاریخ کتابت تو ۱۲۱۵ھ ہے (یعنی تیرھویں صدی) قیاس چاہتا ہے کہ پوری بیاض تیرھویں صدی کی مرتب کردہ ہو۔

(۱۳۳) صفحہ ۷۶۔ کتاب نمبر ۲۴۴۳، نام کتاب "مجموعۂ غزلیات"۔ اس کتاب کا نام غلط اندراج ہوا ہے۔ کیفیت کے کالم میں یہ اطلاع ہے کہ "مشتمل بر کلام قاسم دیوانہ، علوی، رفیع، افصح"۔ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ان شعراء کے سوا اور کسی کا کلام نہیں۔ حالانکہ اس میں ان شعراء کے علاوہ اور بھی بہتیرے شعراء کے انتخابات ملتے ہیں مثلاً صائب، ناصر علی، اور دیگر شعرا بھی موجود ہیں۔ اس لیے اس کا صحیح نام "بیاض" ہونا چاہیئے۔

(۱۳۴) صفحہ ۷۹۔ کتاب نمبر ۳۰۰۳، نام کتاب "انتخاب غزلیات"۔ فہرست نگار نے اس کو غزلیات سمجھا ہے۔ حالانکہ یہ ترجیع بند ہے۔ یہ اطلاع بھی دینا تھی کہ یہ کتاب ۳۰۰۲ کے ساتھ مجلد ہے۔

(۱۳۵) صفحہ ۷۹۔ کتاب نمبر ۳۹۶۹، نام کتاب "افسانۂ دل و جاں"۔ فہرست میں نہ کاتب کا نام ہے نہ مصنف کا۔ مصنف کا نام منعم اور کاتب کا نام رلو گلاب سنگھ کھتری پوری ساکن قصبہ پرگنہ مقصود۔

(۱۳۶) صفحہ ۷۹۔ کتاب نمبر ۲۹۶۱، نام کتاب "محاربۂ اکبر شاہ" فہرست نگار نے اس مثنوی کے اوراق کی تعداد ۱۸ بتائی ہے۔ دراصل یہ ایک بیاض ہے جس میں "۱۰۱" اوراق ہیں اور ان میں زیادہ تر نثر کے انتخابات ہیں۔ صرف ۳ صفحوں میں مثنوی کا انتخاب ہے جس کا عنوان ہے "داستان محاربہ اکبر بادشاہ" تصنیف فیضی فیاضی۔

(۱۳۷) صفحہ ۸۰۔ کتاب نمبر ۳۵۵۶، نام کتاب "ثمر مراد"، کیفیت کے خانہ میں یہ عبارت "۳۵۵۵ کے ساتھ جلد" اضافہ کیجئے۔

(۱۳۸) صفحہ ۸۱۔ کتاب نمبر ۳۸۸۷، نام کتاب "حربۂ حیدری"۔ فہرست میں مصنف کا نام محمد رفیع باذل مشہدی لکھا ہے۔ حالانکہ باذل اس کا مصنف نہیں۔ وہ "حملۂ حیدری" کا مصنف ہے۔ یہ تصنیف محمد احسن نامی ایک شاعر کی ہے جس نے اسے باذل کے تتبع میں لکھا تھا۔ کتاب مذکور کو باذل کی تصنیف سمجھنا غلط ہے۔

(۱۳۹) صفحہ ۸۲۔ کتاب نمبر ۳۸۷۳، نام کتاب "دستور العشاق"، کتاب کا نمبر ۳۸۷۲ [illegible]

اور دستور العشاق کے ساتھ " و دیگر مثنویاں " اضافہ کیجئے ۔

(۱۴۰) صفحہ ۸۳ - کتاب نمبر ۲۳۳۲ ، نام کتاب دیوان آزاد - فہرست میں مصنف کا نام مرزا سلطان محمد آزاد سرخوش لکھا ہے - حالانکہ جب تخلص آزاد ہے تو سرخوش کا اضافہ غیر متعلق معلوم ہوتا ہے - فہرست نگار نے دیباچہ نہیں دیکھا اس میں دیوان کی تعریف میں " سرخوشی بخش دماغ حریفان و ظریفان " لکھا ہے - سرخوشں تخلص نہیں ۔

(۱۴۱) صفحہ ۸۳ - کتاب نمبر ۲۵۸۲ ، نام کتاب دیوان حسن ، اس کتاب کو میر غلام حسن کی تصنیف قرار دیا گیا ہے - اور میر غلام حسن سے فہرست نگار کی مراد میر حسن دہلوی صاحب مثنوی سحر البیان ہیں - کیونکہ کیفیت کے خانہ میں برای نسخہ دیگر کے لئے کتاب نمبر ۲۰۱۹ کا صاف حوالہ دیا گیا ہے جبکہ خود کتاب نمبر ۱۹۰۲ کا مصنف بھی نیز اس دیوان اور صفحہ ۸۴ پر مندرج دیوان (کتاب نمبر ۳۲۷۴) کا مصنف بہار کا ایک مشہور شاعر میر شاہ غلام حسن مجیبوی (گیا) ہے ۔

(۱۴۲) صفحہ ۸۳ - کتاب نمبر ۲۷۰۶ ، نام کتاب دیوان برہمن مع کلام قدسی و عرفی - فہرست میں سال کتابت سنہ ۱۹ جلوس محمد شاہ مطابق سنہ ۱۱۴۰ھ لکھا ہے - حالانکہ ۱۱۴۰ھ غلط ہے - کتاب میں ۱۱۴۹ھ صحیح درج ہے - دوسری بات یہ ہے کہ اس کتاب میں جو قدسی و عرفی کے کچھ کلام شامل ہیں وہ کسی دوسر کاتب کے لکھے ہوئے ہیں اور ان کا سن کتابت معلوم نہیں ۔

(۱۴۳) صفحہ ۸۳ - کتاب نمبر ۲۸۸۸ ، نام کتاب دیوان آزریں ، فہرست میں اس کا نام غلط مندرج ہے - یہ دیوان نہیں بلکہ مستقل ایک مثنوی ہے جو کاشی کی تعریف میں ہے - اس کا خط بھی نستعلیق نہیں بلکہ شکستہ آمیز تعلیق ہے - فن کے کالم میں غزلیات کی بجائے مثنوی چاہیئے - مصنف کا نام مے لال زریں نہیں بلکہ آزریں ہے -

(۱۴۴) صفحہ ۸۴ - کتاب نمبر ۳۴۳۰ ، نام کتاب دیوان سلطان ، فہرست میں کتابت کے کالم میں جگہ خالی ہے ، اس میں صاحب علم ، چاہیئے - سنہ کتابت ۱۲۵۳ھ بھی غلط اندراج ہے ، ۱۲۳۵ھ چاہیئے -

(۱۴۵) صفحہ ۸۴ - کتاب نمبر ۳۵۳۰ ، نام کتاب دیوان فدہ ، سنہ کتابت کے کالم میں تیرھویں صدی ہے مگر فہرست نگار نے خود بتایا ہے کہ یہ شاعر کا نسخہ ہے اور شاعر نے تاریخ کتابت بکم ذی الحجہ میں لکھی ہے جس سے [illegible] کالم میں [illegible] ہونا چاہیئے -

(۱۴۶) صفحہ ۸۷ - کتاب نمبر ۳۳۴۳، نام کتاب دیوان ظہیری، فہرست میں کاتب کا نام موسیٰ کاظمی، صحیح نام موسیٰ کاظم، کتابت کی تاریخ بھی غلط مندرج ہے۔ ۱۲۳۰ھ کی جگہ ۱۲۳۵ھ چاہیئے۔ خط نستعلیق نہیں بلکہ شکستہ آمیز ہے۔ فن کے کالم میں غزلیات غلط۔ دیوان میں قصاید اور رباعیات بھی ہیں۔

(۱۴۷) صفحہ ۸۸ - کتاب نمبر ۲۳۶۰، نام کتاب دیوان فطرت، اس کتاب کا پروگریس نمبر ۵۶۴۳۴ نہیں بلکہ ۵۶۲۳۶ ہے۔

(۱۴۸) صفحہ ۸۹ - کتاب نمبر ۳۳۵۴، نام کتاب دیوان کاشفی، مصنف کے نام کے ساتھ "کلپی" لکھا ہے، صحیح "کالپی"، سنہ کتابت بجائے تیرہویں صدی کے بارہویں صدی چاہیئے۔

(۱۴۹) صفحہ ۸۹ - کتاب نمبر ۷۷۶۶، نام کتاب دیوان کامل۔ فہرست میں کاتب کا نام 'رمضان علی' بتایا ہے۔ صحیح 'افضل علی'۔

(۱۵۰) صفحہ ۹۰ - کتاب نمبر ۳۹۴۵، نام کتاب دیوان مشربی۔ فہرست میں سنہ کتابت ۱۱۰۰ھ غلط ہے۔ صحیح ۱۱۵۷ھ۔

(۱۵۱) صفحہ ۹۲ - کتاب نمبر ۲۸۱۳، نام کتاب رام چند، فہرست میں رام چند۔ کتاب کا نام غلط ہے۔ اس کو یا تو مثنوی رام چند پڑھیئے یا جو اس مثنوی کا نام 'تصویر محبت' ہے اس کو اضافہ کیجیے۔ فہرست میں کاتب کا نام نہیں لکھا، حالانکہ کتاب میں کاتب کا نام محمد حسین خاں مرقوم ہے۔ سنہ کتابت فہرست میں بارہویں صدی بتایا گیا ہے حالانکہ اس کی کتابت ۱۲۶۶ھ میں ہوئی (جو تیرھویں صدی ہے)۔

(۱۵۲) صفحہ ۹۲ - کتاب نمبر ۳۵۵۲، نام کتاب رفعت۔ کتاب کا نام 'رفعت' نہیں بلکہ یہ مثنوی رفعت ہے اور اس کا نام 'انجمن خلوت' ہے۔ کاتب کا نام شیخ غلام محمد لکھا ہے جو کاتب کا نام نہیں بلکہ شاعر کے جدّی کا نام ہے جو حقیقتاً کاتب نہ تھے۔ اس مثنوی کا ایک اور نسخہ بھی ہے۔ دیکھیے فہرست صفحہ ۹۹ کتاب نمبر ۳۹۳۴۔

(۱۵۳) صفحہ ۹۲ - کتاب نمبر ۳۸۹۳، نام کتاب زبدۃ الفواد۔ دراصل یہ کلیات قدیم کا جزو اوّل ہے۔ فن کے کالم میں اس کو مثنوی میں شمار کرنا غلط ہے۔ خود فہرست نگار کی اطلاع جو کیفیت میں ہے اس سے اس کی کیفیت ظاہر ہے۔

(۱۵۴) صفحہ ۹۳ - کتاب نمبر ۳۳۴۰، نام کتاب صلتی نامہ۔ فہرست میں صلتی نامہ اور شاعر کا نام صلتی خاں صفدر غلط لکھا ہے۔ کتاب کا نام 'صفی نامہ' ہے۔ شاعر کا نام معلوم نہیں۔ نواب صفی خاں کے حالات کی داستان نظم کی گئی ہے۔ فہرست میں کتابت کا سنہ تیرھویں صدی دیا ہے۔ حالانکہ یہ کتاب عہد اورنگ زیب میں جلوس ۳۶ سال میں لکھی گئی جو مطابق ہے ۱۱۰۴ھ کے۔

(۱۵۴) صفحہ ۹۳۔ کتاب نمبر ۵ ۳۳۳، نام کتاب قصاید بخاری۔ فہرست میں قصاید بخاری کے اندراج سے شبہ ہوسکتا ہے کہ 'بخاری' شاعر کا تخلص ہے۔ بخاری لال کے نام کا جزو تو ہے مگر تخلص مجروح ہے۔ اس لیے کتاب کا صحیح نام 'قصاید مجروح' ہونا چاہیے تھا

(۱۵۵) صفحہ ۹۳۔ کتاب نمبر ۴۳۹۷، نام کتاب غزلیات و تحریرات (مختلف) فہرست میں اس کتاب کے صفحات کی تعداد ۱۰ بتائی ہے اور سطور کی ۱۷۔ حالانکہ پوری کتاب "۱۵۹" اوراق پر مشتمل ہے اور سطور کی تعداد بھی مختلف ہے۔ اس کتاب میں راجہ الفتی کی جو فارسی اور اردو غزلیات ملتی ہیں وہ صرف پندرہ اوراق میں ہیں۔ باقی کتاب ساری کی ساری مختلف نثری تحریرات پر مشتمل ہے۔ اس لیے اس کو بیاض سمجھنا چاہیے، نہ کہ غزلیات کا مجموعہ۔

(۱۵۶) صفحہ ۹۴۔ کتاب نمبر ۲۹۸۸، نام کتاب قصاید جعفر۔ یہ کتاب نہ صرف قصاید پر مبنی ہے بلکہ اس میں قطعے اور چند فارسی اور اردو کی غزلیں بھی ہیں۔ اس کتاب کا عنوان 'کلام جعفر' لکھنا تھا۔

(۱۵۷) صفحہ ۹۴۔ کتاب نمبر ۴۰۷۶، نام کتاب کاغذ نامہ۔ فہرست میں مصنف کا نام نہیں لکھا۔ مصنف کا نام معلوم نہیں مگر راقم تخلص ہے۔ فن کا کالم فہرست میں خالی ہے۔ یہ غزلیات کا مجموعہ ہے۔ ردیف "کاغذ"

(۱۵۸) صفحہ ۹۵۔ کتاب نمبر ۲۸۹۵، نام کتاب کلیات ناظم۔ شاعر کا تخلص ناظم نہیں بلکہ کریم ہے اس لئے اس کتاب کا صحیح نام 'کلیات کریم' ہے۔

(۱۵۹) صفحہ ۹۶۔ کتاب نمبر ۳۳۷۲، نام کتاب کلیاتِ نوا۔ فہرست نگار نے پوری کتاب کو 'کلیات نوا' لکھا۔ حالانکہ اس کے آخر میں سعادت اللہ سعادت کا بھی کلام ہے۔ پوری کتاب کا کاتب شیو پرشاد ہے جو سعادت کا شاگرد ہے۔ فہرست میں اس کتاب کا سالِ کتابت ۱۲۷۰ھ قرار دیا ہے، حالانکہ یہ کسی مولود سعادت کی تاریخ ہے۔ کتابت کا سال ۱۸۶۳ء ہے جو مطابق ہے ۱۲۸۰ھ کے۔

(۱۶۰) صفحہ ۹۶۔ کتاب نمبر ۳۵۴۵ نام کتاب کوہ قاف، فہرست میں اس کا اندراج مثنوی کی حیثیت سے ہے حالانکہ یہ غزلوں کا مجموعہ ہے جس میں ہر شعر کے آخر کا حرف "ق" ہے

(۱۶۱) صفحہ ۹۷۔ کتاب نمبر ۳۳۳۶، نام کتاب گنج شائگاں۔ مصنف کے نام کے ساتھ لفظ 'عظیم آبادی' کا اضافہ کیجیے۔ اس کا ایک نسخہ اور بھی ہے جس کا نمبر ۲۶۶۳ ہے (دیکھیے صفحہ ۹۰ فہرست ہذا)

(۱۶۲) صفحہ ۹۷۔ کتاب نمبر ۱۷۰۸، نام کتاب تجلیات (نسخہ ناقص)۔ فہرست نگار نے نسخہ ناقص کتاب کا

نام سمجھا ۔ حالانکہ یہ کلمۂ توصیفی کاتب کا لکھا ہے ۔ اس کتاب کا دوسرا نام " دہ باب " بھی ہے ۔ اس کا نسخہ کتاب نمبر ۵۰۷۲ ' کیفیت کے خانہ میں اضافہ کیجیے ۔

(۱۶۴) صفحہ ۹۸ ۔ کتاب نمبر ۲۳۸۰ ' نام کتاب مثنوی مجہول الاسم ۔ فہرست نگار نے صرف ایک مثنوی سمجھ کر کیفیت ناقص الطرفین درج کر دیا ۔ حالانکہ اس کتاب میں تین مثنویاں الگ الگ ہیں ۔ ایک مثنوی تخلص کی ہے ۔ دوسری مثنوی ساقی نامہ کے طور پر ہے مصنف نامعلوم ' تیسری مثنوی دستور العشاق نام کی جو ناقص

(۱۶۵) صفحہ ۹۸ ۔ کتاب نمبر ۲۳۵۲ ' نام کتاب ' مثنوی ' یہ مثنوی سرے سے فارسی زبان میں ہے ہی نہ اس کا اندراج اُردو کی فہرست میں ہونا چاہیے تھا ۔

(۱۶۶) صفحہ ۹۸ ۔ کتاب نمبر ۲۳۷۹ ' نام کتاب مجموعۂ اشعار و مکتوبات ۔ نام سے اشتباہ ہو سکتا ہے کہ پوری کتاب نظم میں ہو ۔ حالانکہ یہ کتاب تقریباً ساری کی ساری نثر میں ہے اور جا بجا ناگری حروف میں مطالب بیان کیے گئے ہیں اور ضمناً چند اوراق نظم فارسی میں ہیں جن کی الگ سے کوئی حیثیت نہیں ا کتاب کا اندراج فارسی منظومات کے سلسلہ میں غلط ہے ۔

(۱۶۷) صفحہ ۹۸ ۔ کتاب نمبر ۳۱۷۶ ' نام کتاب ' مجمع الحقایق ' یہ کتاب کا نام صحیح نہیں ۔ اس میں چند مثنویاں ہیں ۔ مصنف کا نام صرف عبداللہ نہیں بلکہ عبداللہ عمر ہے اور تخلص سابق ۔ اس کتا صحیح نام ' مثنویات سابق ' ہونا چاہیے ۔

(۱۶۸) صفحہ ۹۸ ۔ کتاب نمبر ۲۳۵۰ ' نام کتاب مخزن الواصلین ۔ فہرست میں مصنف کا تخلص مظہر الحق ہے ۔ یہ تخلص نہیں بلکہ عرفیت ہے ۔ فہرست میں اس کتاب کو مثنوی بتایا ہے ۔ حالانکہ یہ منظوم بزرگان دین وغیرہ کی ہیں جو قطعات اور مثنویوں کی شکل میں ہیں ۔ ان کو محض مثنوی سمجھنا نادرست یہ نسخہ کسی مطبوعہ نسخہ سے نقل کیا گیا ہے ۔ فہرست میں اس کا سال کتابت ۱۲ ویں صدی کا دیا گیا ہے ۔ حالانکہ اس کی کتابت ۱۹۵۶ء کی ہے ' جو چودھویں صدی کے مطابق ہے ۔ نسخہ میں کاتب کا نام نہیں ۔

(۱۶۹) صفحہ ۹۹ ۔ کتاب نمبر ۲۵۹۵ ' نام کتاب مثنوی مغنی ۔ کتاب کا اصلی نام ' تیمور نامہ ' ہے اور مصنف ہاتفی ۔ کیفیت کے خانے میں " ناقص الآخر " بڑھائیے ۔ اس فہرست میں اس نسخہ کا ایک اور نسخہ کا اندراج موجود ہے ۔ کتاب نمبر ۲۲۸۴ صفحہ ۹۴

) صفحہ ۱۰۰۔ کتاب نمبر ۳۵۱۹، نام کتاب نقد نامہ۔ فہرست میں مصنف کا نام شیخ پیر محمد کرنوی درج ہے۔ حالانکہ مصنف کا پورا نام محمد عبدالحی ابن قاضی سالم کیرانوی انصاری ہے۔ فہرست میں تعداد اوراق ۷۹ بتایا ہے۔ حالانکہ تعداد ۶۹ ہے۔

) صفحہ ۱۰۱۔ کتاب نمبر ۳۸۳، نام کتاب بہارستان۔ دراصل اس کتاب کا نام "بہارستان آچار" ہے۔ مصنف بلگرام کے ہیں اور تخلص شوقی۔ آچار کی صفت میں غزلیں اور چند مثنویاں ہیں۔

(۱) صفحہ ۱۰۲۔ کتاب نمبر ۲۹۶، نام کتاب مثنوی۔ فہرست میں اس مثنوی کے صفحات تو ٹھیک لکھے ہیں مگر سطور کی تعداد بجائے ۲۲ کے ۱۱ بنا لیجئے۔

(۱۰) صفحہ ۱۰۲۔ کتاب نمبر ۳۹۲۲، نام کتاب "مولود شریف مع غزوات و معجزات"۔ اسی کتاب کا اندراج اسی فہرست کے صفحہ ۲۹۲ پر موجود ہے۔ دونوں جگہ اس کتاب کا کوئی مقام نہیں۔ یہ فارسی زبان میں نہیں بلکہ اردو میں ہے۔

(۱۷) صفحہ ۱۰۲۔ کتاب نمبر ۳۵۹۸/۱۹، نام کتاب "نظم"، مصنف کا نام شیخ علی حزیں۔ فن کے کالم میں مثنوی لکھیے۔

(۱۷) صفحہ ۱۰۲۔ کتاب نمبر ۳۹۹۲/۸، نام کتاب "نظم"۔ یہ نظم فارسی میں نہیں بلکہ ایک مناجات منظوم بزبان اردو ہے جو ایک فارسی نثر کے رسالے کے ساتھ منقول ہے۔ اب جو نئی جلد بندی ہوئی ہے اس میں اس کا نمبر ۳۹۹۲/نحوی ہے۔

(۱۷) صفحہ ۱۰۲۔ کتاب نمبر ۲۸۵/۲، نام کتاب "نظم"، فہرست نگار نے مصنف کا نام نعمت خان عالی کہا ہے اور اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عالی کے اشعار ہوں گے۔ حالانکہ اس کے صرف دو اشعار ہیں۔ پھر ایک رباعی کسی دوسرے کی ہے۔ پھر کئی اشعار "سوزِ بینی" کے عنوان سے ہیں۔ پھر دو شعر قاب کے ملتے ہیں۔ چند فارسی پہیلیاں ہیں۔ ان کو نعمت خان عالی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ سارے منتخبات نثر کی ایک کتاب "وقایع جہانگیر بادشاہ" کے آخر میں ثبت ہیں۔

(۱۸) صفحہ ۱۰۴، کتاب نمبر ۳۱۴۰، نام کتاب ادب نفائس۔ کیفیت کے خانہ میں لکھا ہے کہ یہ کتاب مولانا نعیم، شیخ محمد علی خواجہ جنبلی وغیرہ کے کلام پر مشتمل ہے۔ لیکن یہ اطلاع صحیح نہیں۔ یہ بیاض نثری اقتباسات پر مشتمل ہے۔

(۱۹) صفحہ ۱۰۴۔ کتاب نمبر [illegible]، نام کتاب بیاض اشعار۔ یہ مصنف کو کاتب بتلایا گیا ہے لیکن یہ غلط ہے

یوسف خان کاتب نہیں، بلکہ یہ کتاب اس کی فرمائش پر مرتب کی گئی ہے۔

(۱۷۹) صفحہ ۱۰۵ - کتاب نمبر ۳۴۸۲، نام کتاب بیاض۔ مصنف کے خانہ میں سید ابن مرتضیٰ بلگرامی لکھا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ یہ بیاض امیر حیدر کی ملکیت ہے اور انھیں کی لکھی ہوئی ہے، جسے انھوں نے سید ابن مرتضیٰ بلگرامی کو عنایت کی تھی۔

(۱۸۰) صفحہ ۱۰۵ - کتاب نمبر ۳۴۲۷ - نام کتاب بیاض (متفرقات) کیفیت کے خانہ میں 'نسخہ جات' کا اضافہ کیجیے۔

(۱۸۱) صفحہ ۱۰۵ - کتاب نمبر ۳۴۶۵ - نام کتاب بیاض (متفرقات) 'تعداد اوراق ۲۵۰ غلط ہے۔ یہ بیاض صرف ۳۴ اوراق پر مشتمل ہے۔

(۱۸۲) صفحہ ۱۰۶ - کتاب نمبر ۲۲۸۷، نام کتاب بیاض و نسب نامہ خدا بخش خاں مرحوم، کاتب کے خانہ میں محمد بخش لکھا ہے، جو غلط ہے۔ اس کا کاتب 'تسلیم' ہے۔

(۱۸۳) صفحہ ۱۰۶ - کتاب نمبر ۱۳۴۳، نام کتاب بیاض رنگین۔ اس بیاض میں 'مثنوی صاحب عالم مارہروی' بھی شامل ہے۔ اسمائے کتب کے خانہ میں اس کا اضافہ کیجیے۔

(۱۸۴) صفحہ ۱۰۷ - کتاب نمبر ۳۵۴۸، نام کتاب لطائف الخیال، مصنف کے خانہ میں محمد نصیر نصرت لکھا ہے جو غلط ہے۔ یہ اس کتاب کا کاتب ہے۔ یہ بیاض مرزا صالح ناصر کی مرتب کردہ ہے۔

(۱۸۵) صفحہ ۱۰۷ - کتاب نمبر ۳۵۰۵، نام کتاب مجموعۂ نظم۔ تعداد اوراق ۱۰۹ غلط ہے۔ یہ کتاب ۱۱۴ اوراق پر مشتمل ہے۔

(۱۸۶) صفحہ ۱۳۶ - کتاب نمبر ۲۸۷۱، اس جلد میں چار مخطوطات ہیں۔ فہرست میں صرف تین ہی کا ذکر ہے۔ فہرست میں ان کے نام یہ ہیں: (۱) ۲۸۷۱/۱، نام کتاب 'نصاب بدیع'۔ (۲) ۲۸۷۱/۱، نام کتاب 'نصاب الصبیان'۔ (۳) ۲۸۷۱/۲، نام کتاب 'نصاب مثلث'، ان تینوں کتابوں کے علاوہ ایک کتاب اردو بھی ہے اس کا نمبر ۲۸۷۱/۱ ہے اور اس کا نام 'نصاب طفلاں' ہے۔ مصنف کا نام ملا سعد۔ اوراق کی تعداد ۲۳ اور سطور ۱۵۔ مزید براں نصاب بدیع کے مصنف کا نام فہرست میں نہیں۔ بڑھا لیجیے۔ کاتب کا نام بھی نہیں۔ حسین بخش ساکن رمضان پور لکھیے۔ اسی طرح نصاب مثلث کے مصنف کا نام بھی فہرست میں نہیں۔ بڑھا لیجیے اور سنہ کتابت ۱۲۲۵ فصلی۔

●●

اس موقع پر ایک بات اور واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ کیوں علی قاسم خاں نے اصل ورثا نواب علی ابراہیم خاں کو محروم کیا اور اس کا کیا سبب تھا۔ چونکہ نواب صاحب مرحوم ایسٹ انڈیا کمپنی اور اس سے قبل سرکار مرشد آباد کی ملازمت میں تھے نواب میر قاسم کے زمانہ میں دیوان کل یعنی وزیر اعظم کے عہدہ پر سرفراز ہوئے۔ بعد زوال میر قاسم [illegible] سیاسی وجوہ سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم ہوئے اور بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز رہے اس لئے جو جاگیر [illegible] حکومت سے حاصل کیا تھا وہ اپنے بھائی علی قاسم خاں کے نام کر دیا چار پرگنہ بست ہزاری جو ۲۰ ہزار [illegible] مونگیر میں اور دو پرگنہ ضلع پٹنہ و گیا میں ایک راجگیر پرگنہ اور دوسرا میرے دماغ میں محفوظ نہیں ہے ان پرگنوں کی آمدنی دو لاکھ سالانہ سے زیادہ تھی اس کا انتظام علی قاسم کرتے تھے اور نواب صاحب بطور نگراں [illegible] نواب علی ابراہیم کے بعد ان کا حاصل قبضہ کل جائداد پر علی قاسم خاں کا قبضہ ہو گیا اور اصل وارث کو لاوارث کر دیا۔ یہ سبب ہے جو ان کی اولاد کو مجہول النسل کہتا-

[illegible] سبب شیخ صاحب ان کے ہم پلّہ نہ قرار دیئے گئے افسوس کی بات ہے۔ اودھ، یوپی اور بہار میں
بہت سے خاندان ہندو سے مسلمان ہوئے۔ اودھ میں سب سے اوّل نمبر کا مسلم اسٹیٹ حسن پور ہے جس کی نسل ہندو
ہے۔ یہ پہلے نمبر پر مسلم اسٹیٹ ہے، کل تعلقداروں میں اس کا نمبر ۹ ہے اور دیگر اسٹیٹ بھی ہیں مثلاً:
کٹوارہ وغیرہ یوپی میں چھتاری اور باگپت وغیرہ پھر یہ عذر ناقابل فراموش بہار میں ہسوا راج، پہلے
ہندو خاندان بھومیہار برہمن کا تھا۔ آج ماشاء اللہ راجہ نصیر الدین حیدر خاں کا ہے جو وزیر حکومت ہیں۔
اس کے علاوہ اور بھی خاندان ہیں۔ تبدیل مذہب کوئی بات نہیں ہے۔ یہاں شہر گیا میں اقبال الدولہ
بہادر کا خاندان اور رانی سعیدہ کا خاندان موجود ہے۔ میری اس صاف بیانی کو معاف فرمائیں گے۔ صحیح
بات عرض کرنے میں تقیہ نہیں کرتا بلکہ صاف بیان کرتا ہوں۔

مجھے چند خاص تعلق اس خاندان سے ہیں۔ سب سے پہلا خاندانی سلسلہ پیدا ہوا کہ راقم کی پھوپھی
وحید النساء بیگم عرف شہزادی بیگم دختر جناب حاجی سید محمد حسین خاں عرف خورشید نواب صاحب کی شادی سید محمد صاحب ابن
سید عباس صاحب متوفی وقف اسٹیٹ دلہن بندی بیگم گلزار باغ سے ۱۳ دسمبر ۱۹۰۹ء میں ہوئی۔ دوسری شادی حسین آباد میں
حلیمۃ النساء بیگم جو جسٹس سید سرور علی عرف سنجر نواب سلمہٗ کی حقیقی پھوپھی ہیں۔ دختر نواب زادہ سید اکبر حسین
علی خاں کی شادی فروری ۱۹۲۳ء محمد جابر علی خاں خلف اصغر نواب زادہ دلدار علی خاں صاحب ہوئی جن کے صاحبزادے
پانچ ہیں۔ محمد علی خاں، حیدر علی خاں، وقار علی خاں، انور علی خاں، مسعود علی خاں ہیں۔ داماد جسٹس
سید سرور علی خاں عرف سنجر نواب سلمہٗ خود میرے دو فرزند منجھلے اور چھوٹے کی شادی اسی خاندان میں ہوئی۔
منجھلے لڑکے سید قاسم علی اسمٰعیل سلمہٗ کی شادی مہر آرا بیگم بنت مصطفیٰ علی خاں ابن احمد نواب صاحب سے
۱۳ دسمبر ۱۹۵۶ء کو ہوئی اور چھوٹے لڑکے سید ولایت علی اسمٰعیل سلمہٗ کی شادی مریم منور بیگم بنت سید اعظم
حسن جعفری بریلوی سے ۱۹۶۷ء میں ہوئی۔ میری منجھلی بہو اور چھوٹی بہو کا بہت قریبی رشتہ ہے۔

مطبوعاتِ جدیدہ

دانشوری

ششماہی "افکار" علیگڑھ (ایڈیٹر: ابوالکلام قاسمی) ۱۹۸۵ء

پچھلے شمارہ میں نئے عہد کے متعدد معتبر لکھنے والے اس میں موجود ہیں۔ دانشور کے فرائض پر ایک مذاکرہ کی بحث بھی اس میں شامل ہے (وحید اختر، محمد انس، شہریار، اقتدار عالم اور اطہر پرویز) اور ایک دلچسپ رپورتاژ "دکھن سا نہیں ٹھار سنسار میں" (قرۃ العین حیدر) قابلِ ذکر ہے۔

دانشوری بحث سے چند اقتباسات درج ذیل ہیں:۔

— "دانش ور کی سیدھی سادی تعریف یہ ہوگی: وہ جو دانش کے لیے کسی نہ کسی عنوان سے اپنے کو وقف کرتے ہیں۔"
(وحید اختر)۔

— "لغوی اعتبار سے دانش ور: انٹلکچول کے معنی ہیں: (۱) ذی فہم، دانا (۲) عقلی یا عقل سے متعلق (۳) عقل کے ذریعہ ادراک کیا ہو، یا عمل میں لایا ہو (۴) قوتِ ادراک رکھنے والا (۵) عقل سے بھرپور (۶) اعلیٰ عقل رکھنے والا۔ .... میرے خیال میں انٹلکچول کی جامع تعریف یہ ہے کہ وہ صرف عقل کو اپنا رہنما مان کر سماج کی بہبودی کے لیے نئے نظریات پیش کرے یا نیا طرزِ فکر اختیار کرے، یا جانے بوجھے افکار پر نئی روشنی ڈالے۔" (محمد انس)

— "ہندوستانی معاشرہ میں دانشوروں کا رول دوسرے عوامل کے علاوہ بڑی حد تک دانشوری کی اس منفی روایت سے بھی متاثر ہوتا ہے، جو عہدِ قدیم سے لے کر موجودہ دور تک ہماری تہذیبی تاریخ میں جاری و ساری ہے۔ ابوالفضل نے اس روایت کی نشاندہی کرتے ہوئے آئینِ اکبری میں لکھا ہے کہ ہندوستان میں تقلید کی تیز ہواؤں کے درمیان "چراغِ خرد" پر افسردگی طاری ہے۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ "یہ لوگ (ہندوستانی اہلِ دانش) تحقیق و استفسار کے رویہ کو کفر کا پیش خیمہ قرار دیتے ہیں انھوں نے اپنے والدین، اساتذہ، رشتہ داروں، دوستوں یا ہمسایوں سے جو کچھ سن لیا ہے اس پر یقین رکھنے کو رضائے ایزدی تصور کرتے ہوئے ہر اس شخص کو جو ان باتوں پر یقین نہ رکھتا ہو، ملحد اور زندیق کا خطاب دینے میں عار نہیں کرتے۔" ابوالفضل کی تشخیص کے مطابق سولہویں صدی میں اہلِ دانش کے اسی رویے کے نتیجے میں سماجی نفاق خصوصاً مذہبی تفرقے اس حد تک بڑھ گئے تھے کہ خونریزی کو "غازۂ دین داری" کا درجہ حاصل تھا۔ ہمارے معاشرے کے اسی تقلیدی مزاج کا یہ نتیجہ تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ

ہندستانی دانشورانہ روایت سائنس اور دوسرے عقلی علوم سے یکسر بے تعلق ہوتی گئی، اور بالآخر سترھویں اور اٹھارویں صدی کے دوران جب یورپ میں نت نئی سائنٹفک دریافتوں کے ذریعہ صنعتی انقلاب کے لیے میدان ہموار ہو رہا تھا، ہندستان میں "چراغ خود" کی وہ ٹمٹماتی ہوئی لو، جس کی افسردگی کا ابوالفضل نے مرثیہ پڑھا ہے اور موہوم ہوتی چلی گئی ۔" (اقتدار عالم خاں)

"ہو سکتا ہے ایک انسان دانشمند ہو اور دانشور نہ ہو، یعنی اپنی دانش کو کسی طرح ظاہر نہ کرتا ہو جس سے وہ معاشرہ جس میں وہ رہتا ہے فیضیاب ہو۔ وہ صرف سوچتا ہو، غور و فکر کرتا ہو، اس کی فکر اپنی ذات تک محدود ہو، لیکن جب وہ میڈیم تلاش کر لیتا ہے تو دانشور ہو جاتا ہے ۔" (اطہر پرویز)

" آج ہم ہندستان میں جس دور سے گزر رہے ہیں، یہ اقدار کی پامالی کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ ہر شعبۂ زندگی میں یہی ہو رہا ہے۔ ہمارے ملک کے پاسبان جب چناؤ لڑتے ہیں تو بنیوں سے سود پر قرض لے کر لاکھوں روپے صرف کرتے ہیں اور منتخب ہو جانے کے بعد ایک سال کے اندر اندر اس قرض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ ہمارے فلاحی کاموں کے ٹرسٹی آنریری خدمات انجام نہیں دیتے، اس کا معاوضہ بڑی رقموں کی شکل میں وصول کرتے ہیں۔ زندگی کے ہر شعبے میں رشوت کا بازار گرم ہے۔ ہماری دانش گاہوں میں علم کی دوڑ نہیں، مناصب اور روپے پیسے کی دوڑ ہے۔ مدرسے کاروبار میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ کیا ایسے موقع پر صرف دانشورانہ باتیں کرنے سے کام بن سکتا ہے، جب ہر گھر میں چور گھسے ہوں تو کیا صرف "جاگتے رہو" کہنے سے چور بھاگ جائیں گے ؟" (ایضاً)

●●

بے نام

ہجرت (پاک) کی شعری دانشوری

سرشار صدیقی، پاکستان کے معروف شاعر کا تیسرا مجموعہ کلام، جس کا ایک مختصر انتخاب اس کا بہترین تعارف ہوگا۔

محیط :-

دیارِ طائف، گواہ رہنا / کہ تیری نامہرباں زمیں پر / وہ برگزیدہ ترین انساں / جو شفقتوں کے ہالے کر / محبتوں کے سلام لے کر / کلام و شرحِ کلام لے کر / مثال موجِ صبا گیا تھا / یہ چاہتا تھا / ریگ زاروں کے بطن میں / جو کلی نمو آشنا نہیں ہے / جسے خود اپنے وجود کا کچھ پتا نہیں ہے / وہ مسکرائے / مسکرائے تو تپتے صحراؤں کو پیامِ بہار آئے۔

وہ برگزیدہ ترین انساں / یہ چاہتا تھا / ضمیرِ شب میں جو روشنی کی کرن چھپی ہے / خود اپنے ادراک نفی ہے / یقینِ عرفانِ ذات پائے / سوادِ تاریک جگمگائے۔

جو پھول لے کر گیا تھا / اُس روشنی کو / تیری زمین پر بسنے والے لوگوں نے / بارشِ سنگ سے نوازا / ظہورِ روشنی نے / تیری زمین پر بسنے والے لوگوں کے حق میں / پھر بھی دعائے توفیق و آگہی کی / کہ ان کی رحمت عظیم تر تھی!

وہ آیۂ نور و نکہتِ مہرباں کی صورت / تری زمیں سے زماں میں پھیلا / مکاں میں اور لامکاں میں پھیلا / وہ روشنی کائنات ہے اب! وہ تو گلِ شش جہات ہے اب!!

زود پشیماں :-

یہ شہر بھی / تیرے شہر سے مختلف نہیں ہے / جدا نہیں ہے / وہاں بھی رسمِ وفا نہیں ہے / یہاں بھی رسمِ وفا نہیں ہے۔

وہاں بھی بے سائباں گھروں پر / شدید برستے تھے بارشوں میں / یہاں بھی دیوار و در گرے ہیں / خود اپنے آنگن کی سازشوں میں / وہاں بھی موسم کی شدتیں تھیں / یہاں بھی آب و ہوا وہی ہے /

وہاں بھی معبود، سیم و زر تھا / یہاں بھی سب کا خدا وہی ہے۔

وہاں یہ تھا / وہم بے یقینی / جو اپنا پروردہ گماں تھا / ہر اک حقیقت تھی دھندلی دھندلی / تمام منظر دھواں دھواں تھا۔

فصیلِ نفرت عبور کر کے / یہاں جو آیا / تو عبرتِ اعتبار ہوں میں / کہ اپنے خود ساختہ یقیں کا / شکار ہوں میں!

دھوپ گھڑی :-

کبھی دن نکلے کبھی شام ڈھلے / کبھی سایہ میرے آگے ہو / کبھی پیچھے ہو / کبھی پاؤں تلے / یہ وقت بھی کس کا دوست ہوا / کبھی تھم جائے / کبھی ساتھ چلے / کبھی شبنم شبنم میرا بدن / کبھی سورج سورج انگ جلے / دن سخت تھا لیکن ختم ہوا / جُگ بیت گیا! میں وقت کی بازی جیت گیا!!

اب سر پہ کھڑی ہے / رات کڑی / میں فرض کا قرض اُتار آیا / یہ کس کی عمر ملی تھی مجھے / یہ کس کی عمر گزار آیا / مرا مُنھ چھوٹا / مری بات بڑی / میں دھوپ گھڑی!!!

نجات :-

حسین فردا کی آرزو میں / مرا یقیں / کب سے زندگی کی صلیب پر / انتظار کی گرد ہو چکا ہے / یہ شعلۂ اعتبار / فانوس زیست میں / سرد ہو چکا ہے / مرے خدا! / دل کی سرزمین پر / کوئی مسیحا اُتار / جو قتل گاہِ جاں میں / امید کا معجزہ دکھائے۔

نہیں تو اے آسمان والے / زمیں سے جس طرح تُو نے / ساری مسرّتوں کو / صداقتوں کو اٹھا لیا ہے / مرے یقین کی یہ بے کفن لاش بھی اٹھا لے۔

بُت :-

ترے سارے وعدے سچے تھے / تجھے مجھ سے کتنی محبت تھی! / ترا کھیتوں کھیتوں چرچا تھا / مری پنگھٹ پنگھٹ شہرت تھی / تری سکھیوں کو تھا رشک بہت / ہر زخم سے سینہ خالی تھا / مجھ نقش خلوص و مہر و وفا / جو نقش تھا نقش خیالی تھا۔

اور آج، کہ دفتر میں بیٹھا / میں اک افسر کہلاتا ہوں / اُن کھیتوں اور کھلیانوں کو! / ان سکھیوں اور جوانوں کو / اُس پنگھٹ اُن چوپالوں کو / سبزہ کا ذ سنیالوں کو / جب

پلٹ کر دیکھتا ہوں / تھوڑا پتھر ہو جاتا ہوں۔

اس درد سے کب جانبر ہوں گا / میں کب پورا پتھر ہوں گا ــــ

تیسرا جنم :

میں گود سے گور تک کا لمبا سفر / خود اپنی صلیب اٹھائے سلامتی سے گزار آیا / محبتوں، شفقتوں کے بیچ میں / دشمنوں کو پکار آیا / لہو، لہو تھا / مگر تبسم بہ لب / عدم کے دیار آیا / میں سرخرو تھا / کہ قرض ہستی اُتار آیا۔

تو پھر یہ کس جُرم کی سزا ہے / کہ تیسری بار / اس صدی میں / مجھے عذابِ حیات میں مبتلا کیا ہے / کہ جس زمانے میں / حرفِ حق / زہرِ آگہی سے زیادہ معتوب ہو چکا ہے / کہ جس زمانے میں / پیار مصلوب ہو چکا ہے۔

میں اب بھی سچ بولنے کا عادی! مری زباں پہ ہے آج بھی پیار کی منادی !!

پس پردہ :

تم کو کس نے دی ہے یہ دولت / جس کی بدولت / تم نے سبھو کے کارکنوں کو / دُنیا ہی میں جنت دی ہے / اور عقبیٰ کی بشارت دی ہے / کس نے بہایا یہ سرمایہ / جس کی زد میں / مذہب، مسلک، مشرب، غیرت / سب ہی خس و خاشاک ہوئے ہیں / قدریں اور عقیدے / سارے جل کر راکھ ہوئے ہیں / کب تک وہ معشوق چھپے گا / وقت کے پردۂ زنگاری میں / سرمایہ داری کی حمایت / شاید شرعی عیب نہیں ہے / مرشد ؟ / ہم سب جانتے ہیں / یہ سارا معجزہ ڈالر کا ہے / کوئی دستِ غیب نہیں ہے۔

شرقِ اوسط :

تیل جب تک دفینوں کی صورت رہا / موجۂ نیل ہو / یا فرات اور دجلہ کی لہریں / دَف و چنگ پہ رقص کرتی رہیں / نہرِ سوئز کی تخلیق سے / نہرِ سوئز کی تطہیر تک / امن یا امن تھا / شیخ، محلوں کی عیاشیوں میں مگن / جبر و عودد زیتون میں گم رہے / قوم روتی رہی / اعدِ تاریخ تلوار سرہانے رکھے ہوئے / چین کی نیند سوتی رہی /

بو ترابوں کے بیٹوں کی مٹی کی بُو / ابن مریم کے بچوں کی حرص و ہوس کا نشانہ بنی /

آسمانی خداوند کے حکم سے / گوتر ابوں کے بیٹوں کی مٹی جہاں ابنِ مریم کے بچوں کے ہاتھ آ گئی / ان کی مٹی سے / چشمہ اُبلنے لگا تیل کا / اور اس طور آغاز ہونے لگا / اک نئے دَور کا / اک نئے کھیل کا / کشت و خوں / قتل و غارت گری / جبر و ظلم و ستم جس کا انجام تھا۔

وادیٔ نیل سے / اُردن و شام و بغداد کے سبزہ زاروں تلک / کوہساروں تلک / ریگ زاروں تلک / صرف بربادیاں! صرف محرومیاں!! صرف ویرانیاں!!!

اس خموشی کے سنسان جنگل سے بھی / ایک آواز آتی رہی / اُمِ کلثوم گاتی رہی ●

سفیرِ بہاراں :

اے نخلِ نیم سبز / تری خشک شاخ پر / اس موسمِ بہار کا / یہ آخری ثبوت / سچائی کی صلیب پہ یوں سرفراز ہے / گویا جہانِ لالہ و گل کا جواز ہے / اس موسمِ بہار کا / یہ آخری گلاب / مٹی میں مِل گیا تو / کبھی اس زمین پر / پھر رنگ و بُو کا / کوئی پیمبر نہ آئے گا / تیرے نمو کا بحر بھی اے نخلِ نیم سبز / پندارِ آرزو کی طرح ٹوٹ جائے گا۔ ●

دیارِ بندہ نواز :

وہ زباں جو رختِ سفر بھی تھی / وہ زمیں جو سایۂ سر بھی تھی / وہ زباں بھی گردِ سفر ہوئی / وہ زمیں بھی خاک بسر ہوئی / کہ وہ رہ روی کا مزاج تھا / کہ وہ راستوں کا خراج تھا۔

مگر آ کے منزلِ شوق پر / یہ کھلا، کہ لے دلِ معتبر / وہ تمام جذبے بکھر گئے / وہ تمام ولولے مر گئے / یہ مآلِ شوقِ نبرد ہے / کہ جبیں پہ وقت کی گرد ہے۔

نہ زمیں ملی۔ نہ زباں ملی! "جو اماں ملی تو کہاں ملی"!! ●

نیا مدینہ :

زمین ہم سے چھوٹی تھی / تو ہم نے سوچا تھا / جو اپنے عہد کی تاریخ کے مسافر ہیں / وہ سیلِ وقت کو جغرافیہ سے کیا ناپیں / بشکلِ ابرِ بہاراں / برنگِ موجِ صبا / ہم اہلِ فیض / کبھی ریگ زارِ صحرا میں / کبھی مہکتی ہوئی وادیوں کی دنیا میں / جہاں بھی پہنچے / پیامِ حیات لے کے گئے / حرارتِ نفس کائنات لے کے گئے / جہاں سے اُٹھے / ہجومِ صفات چھوڑ گئے / جہاں سے کوچ کیا نقشِ ذات چھوڑ آئے / تمام خاک نشینوں کا ایک ہی مسلک / تمام عرش مکینوں کا ایک ہی کردار /

زمیں سے رشتہ کبھی استوار ہی نہ کیا / خدا سے بڑھ کے خدائی کو پیار ہی نہ کیا / وطن کو ماں تو کہا / ماں سے ماسوا نہ کہا / وطن کا بُت تو تراشا۔ اُسے خدا نہ کہا۔

اسی وراثت وجدان کا نتیجہ تھا / زمین چھوڑ کے / ہم بے زمین لوگوں نے / بڑے وقار ذلک آگہی سے سوچا تھا / ہماری نسل سے بھی / پیمبروں کا پُرانا چلن نہیں چھوٹا / وطن کا نام تو چھوٹا / وطن نہیں چھوٹا۔

زمین ہم سے چھُٹی ہے / تو ہم یہ سوچتے ہیں / ہماری طرح / جنھوں نے وطن کو چھوڑا تھا / وطن کے لفظ کا بُت / پہلی بار توڑا تھا / ان اہلِ مکّہ کی قسمت عجیب قسمت تھی / فراخ جن پہ ہوئے اجنبی در و دیار / کشادہ تر ہوئے ناآشنا دلوں کے حصار۔

وہی تو ہم ہیں / ہمارا عجیب رنگ ہوا ! کہ یہ "ہمارا مدینہ" تو ہم پہ تنگ ہوا !!●●

اختر راہی
لوہسر شرفو، واہ کینٹ

مکرمی! تسلیم ونیاز

گرامی نامہ اور جرنل کے دو شمارے (۱۹-۲۰) موصول ہوئے، شکریہ۔

رئیس نعمانی صاحب "محسن کتابوں وغیرہ کے بارے میں" رقم طراز ہیں:

"شاہ رفیع الدین کی ایک کتاب کا نام 'تکمیل الاذہان' چھپا ہے۔ عمران خان صاحب کی کتاب میں بھی اسی طرح ہے اور غالباً یہ غلطی وہیں سے چلی ہے۔ شاہ رفیع الدین کی کتاب کا صحیح نام غالباً "تشحیذ الاذہان" ہے۔ 'تکمیل الایمان' شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی کتاب کا نام ہے۔ عبیداللہ سندھی صاحب نے یہ مضمون اپنے کسی شاگرد کو املا کرایا ہوگا اور اس شاگرد کو التباس ہوا، جس کو عمران خان صاحب نے مارک کیے بغیر شائع کر دیا۔" (ص: ۹۱ - شمارہ ۲۰)-

شاہ رفیع الدینؒ کی کسی کتاب کا نام "تشحیذ الاذہان" نہیں۔ اُن کی کتاب کا نام "تکمیل" درست ہے۔ گو تذکرہ نگاروں نے اسے "کتاب التکمیل" اور "تکمیل الصناعۃ" بھی درج کیا۔ یہ عربی کتاب عبدالحمید سواتی صاحب کی کوشش سے ادارۂ نشر واشاعت مدرسہ نصرۃ گوجرانوالہ سے شائع ہو چکی ہے۔ اس سے پہلے نواب صدیق حسن خان مرحوم "ابجد العلوم" اس کے تین ابواب نقل کر چکے تھے۔

امید کہ آپ بخیر ہوں گے۔

والسلام

۲/۴ ۱۹۸۳ء

PUBLICATIONS OF KHUDA BAKHSH LIBRARY, PATNA

—::—

No.	Title	Author	Price
1.	Khuda Bakhsh Library : An Introduction	by Scott O'Connor	Rs. 10/-
2.	Khuda Bakhsh (Biography)	by S. Khuda Bakhsh & Jadunath Sarkar	Rs. 10/-
3.	Contemporaries in Chronograms (Persian)	by Hasrat Azimabadi	Rs. 10/-
4.	My Criticism—A Retrospect (Urdu)	by Prof. Kalimuddin	Rs. 10/-
5,	Sufi Literature in the Sultanate Period	by Dr. Bruce Lawrence	Rs. 10/-
6.	Maktub & Malfuz Literature-As a Source of Socio-Political History	by Prof. S. H. Askari	Rs. 10/-
7.	Reconstruction of Islamic Chronology	by Dr. Hashim Amir Ali	Rs. 10/-
8.	Persian Language and Literature in India	by Dr. Nazir Ahmad	Rs. 10/-
9.	Shamsul Bayan : An early Urdu Dictionary	by Mirza Jan Tapish	Rs. 10/-
10.	Bagh-i-Ma'ani' : A Biographical Dictionary of 18th Century Persian Poets	by Naqsh Ali	Rs. 10/-
11.	Majma'un-Nafais : Biographical Dictionary of 18th Century Persian Poets	by Khan Arzu	Rs. 10/-
12.	Suhuf-i-Ibrahim : Biographical Dictionary of 18th Century Persian Poets	by Ali Ibrahim Khalil	Rs. 10/-
13.	Masnavi Tasweer-i-Mahabbat	by Shamsuddin Faqir	Rs. 10/-
14.	Presidential Address of the 1st Session of the U. P. Congress	by Pt. Motilal Nehru	Rs. 10/-
15.	Rich & Valuable Contribution of India to Persian Literature	by Dr. S. A. H. Abidi	Rs. 10/-
16.	Urdu Literature as selected from Old Periodicals Vol. I (Adeeb, Allahabad)	...	Rs. 45/-
17.	Urdu Literature Vol. II (Al-Asr, Lucknow)	...	Rs. 45/-
18.	Urdu Literature Vol. III (Subh-i-Ummid, Lucknow)	...	Rs. 45/-
19.	"Miyar" of Qazi Abdul Wadood, in 1936, (Urdu)	...	Rs. 45/-
20.	Catalogues of Arabic & Persian Manuscripts of Khuda Bakhsh O. P. Library, Vols, 1-3,7,8,19,29-34		Rs. 35/- (Each)
21.	Hand List of Persian Arabic Manuscripts	3+3 Vols	Rs. 60/-
22.	" " Urdu Manuscripts		Rs. 10/-

KHUDA BAKHSH LIBRARY

JOURNAL

25

KHUDA BAKHSH ORIENTAL PUBLIC LIBRARY
PATNA

٢٦ — ٢٧

خدابخش لائبریری

جرنل

پٹنہ

۲۶ ۲۷

خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

رجسٹریشن نمبر ۲۳۳۳۴/۷۷

شمارہ چھبیسواں ستائیسواں ۱۹۸۳ء

اس سہ ماہی مجلے میں انگریزی، اُردو، فارسی یا عربی میں ایسے مضامین شائع ہوں گے جو خدابخش لائبریری کے نادر مواد پر مبنی ہوں، یا لائبریری سے کسی نہ کسی قسم کا تعلق رکھتے ہوں۔

قیمت : ۳۰ رُپے

سالانہ زرخریداری			
	اندرون ملک	:	۶۰ رُپے
	پاکستان	:	۱۲ ڈالر
	یوروپ	:	۸ پونڈ
	امریکا اور دیگر ممالک	:	۲۴ ڈالر

محبوب حسین نے "پٹنہ لیتھو پریس، دریاپور، پٹنہ ۴" اور "لبرٹی پریس، پٹودی ہاؤس، نئی دہلی" میں چھپوا کر خدابخش لائبریری، پٹنہ سے شائع کیا

فہرست

●●

اس شمارے کے لکھنے والے

- جناب حنیف نقوی : (پ ۱۹۳۵ء تقریباً) بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو سے منسلک ہیں۔ تذکروں کے جائزوں پر مشہور کتاب کے علاوہ آپ کی متعدد تحقیقی کتابیں اور درجنوں مقالے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔
- ڈاکٹر محمد کلیم سہسرامی : (پ ۱۹۳۰ء تقریباً) ڈھاکہ یونیورسٹی بنگلہ دیش سے لسانیات میں ایم۔ اے۔ تہران (ایران) سے ڈی۔ لٹ، راج شاہی یونیورسٹی بنگلہ دیش کے شعبۂ لسانیات میں پروفیسر کے عہدے پر فائز ہیں۔

(بقیہ کے لئے ملاحظہ ہو جرنل شمارہ ۱۲، ۱۹ اور ۲۴)

جدید غزل گو

۱۹۴۱ء کی ایک دستاویز

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ

پیشگفتار

صدی کی چوتھی دہائی کے خاتمہ پر کون ممتاز ترین غزل گو تھے جن کے ہاتھوں آزادی کے آس پاس اُردو غزل کس منزل میں تھی، یہ دستاویزی مجموعہ اسی سوال کا جواب ہے۔ دستاویز یہ اس لیے بنگیا ہے کہ: "یہ شعرا کا خود انتخاب کیا ہوا کلام ہے۔" انتخاب کے ساتھ حالات بھی سب شعرا کے فراہم کیے ہوئے ہیں، خواہ انھوں نے خود اپنی طرف سے انھیں لکھا ہو یا دوسرے کی طرف سے۔" ان شعرا کی اُسی زمانے کی تصاویر فراہم کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے اور ہر ایک کی خود نوشتہ ایک تحریر کی بھی، تاکہ اس کی دستاویزیت اور بھرپور ہو جائے۔

اس مجموعہ کی پیشکش نہ افتخار آور ہے نہ اعتذار طلب! سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے: یہ ترتیب بنیادی طور سے نیاز فتحپوری نام کے اس مَن چلے باذوق البیلے اڈیٹر کی دین ہے جس نے اپنے پرچے 'نگار' کے ذریعہ ستھرے ادبی ذوق کی ایسی جوت جگائی کہ اس اک چراغ سے کتنے چراغ جل اُٹھے! افتخار کا منصب اگر ہے تو نیاز کے لیے! یوں اعتذار کا بھی چنداں موقع نہیں کہ چالیس سال سے اُوپر ہونے کو آئے اس خزانے کو مدفون ہوئے، جسے ایک بار پھر ہم اہلِ ذوق میں بانٹنے لے آئے ہیں؛ اور اس طور سے لائے ہیں کہ نیاز کے زر و جواہر کو اور زیادہ صیقل کرکے، روشن بنا کے پیش کیا جائے۔ اس کے لیے ان سب شعرا کی تصویریں اور تحریریں تلاش کی گئیں۔ یہ تصویریں/تحریریں ممکن حد تک اس دستاویز کی ہمعصر ہوں، یہ آمیزہ تیار کرنے میں ہمیں سب سے زیادہ مدد رامپور (ریاست) کے ادبی ذوق سے ملی جس نے 'نگار' سے (بلا حوالہ) استفادہ کرتے ہوئے 'نگار' میں شامل ۳/۴ شعرا کو رامپور بلا کے انھیں سُن کے ان کا کلام، ان کی تحریریں اور تصویریں حاصل کرکے ایک مرقع 'اوراقِ گل' کے نام سے 'نگار' کے کچھ ہی بعد شائع کیا تھا۔ 'نگار' ۱۹۴۱ء میں سامنے آیا۔ 'اوراق'

۱۹۴۱ء میں ! بزمِ نگار میں ''دو بزرگوں کی عدم شرکت پر سخت افسوس'' کا اظہار کیا گیا تھا ۔ یہ
سائل دہلوی اور صفی لکھنوی تھے ۔ ہم نے ان دونوں کو بھی اس بزم میں لا بٹھایا، اور نیاز کے
منصوبے کی تکمیل کر دی ۔ سائل و صفی کا خود انتخاب کیا ہوا کلام اور خود فراہم کئے ہوئے حالات
ن دوسری معاصر دستاویز 'اوراقِ گل' سے لے لیے گئے ۔

نیاز کو جس کمی پر افسوس تھا وہ ہم نے پوری کر دی، ہمیں جس کمی پر افسوس ہے وہ ہمارے
بعد آنے والے پوری کر لیں گے ۔ کمی یہ ہے کہ علی اختر اور افسر کی تحریریں ہمیں نہ مل سکیں،
سید امیٹھوی کی نہ تحریر ملی نہ تصویر ۔ ناطق لکھنوی کی تصویر و تحریر ملی بھی تو پیش کرنے کے لائق نظر نہ آئی ۔
ایک کمی اور ! نیاز نے خاصا معروضی ہونے کے باوجود اصغر گونڈوی کو نظر انداز کر کے
اپنے 'بشر' ہونے کا ثبوت دیا تھا ۔ ہم نے نیاز کے احترام میں ان کی اصل اسکیم میں ترمیم کرنا مناسب
نہ جانا ۔ چنانچہ اصغر اب بھی اس مجموعہ میں نظر نہیں آئیں گے، لیکن اس دستاویز کی کسی بھی اگلی
یا ذیلی پیشکش میں اصغر کو نظر انداز کرنا قرینِ انصاف نہ ہوگا، اگر ان کا اپنا انتخاب اور خود نوشت
حالات میسر آسکیں ۔ اسی درجہ کا ایک اور ہمعصر بھی نیاز سے چھوٹ گیا ۔ اس کی وجہ شاید یہ رہی ہو
کہ بحیثیت شاعر ان کی ایسی شہرت نہ تھی اور ان دنوں ان کا دیوان مرتب نہ ہوا تھا ۔ یہ اقبال احمد خاں
سہیل تھے، ذاکر (صاحب) رشید (صاحب) مثلث کی بنیادی لکیر !
ایک کمی ۱۹۸۴ء میں یہ بھی محسوس کی جائے گی کہ وہ شاعر جو ۱۹۴۷ء سے قبل ہی ابھرنے
لگے تھے اور آزادی کے بعد تو غزل کی آبرو بنے ؛ اور، اسی طرح ان کے بعد کی تیسری پیڑھی کے
ممتاز غزلگو : ان کے لیے اس پیشکش کے ساتھ ایک ذیلی حصے کا اہتمام ضروری تھا ! ضروری ہے !!
اب یہ جب جس کے ہاتھوں ہو جائے !!!
ایک کمی اور بھی رہ گئی ! اس دستاویز میں شامل شعرا کا یہ انتخاب گویا ۱۹۴۰ء کے اواخر تک کا
ہے ۔ اس کے بعد ان میں سے اکثر دیر تک زندہ رہے اور خاصا کہا بھی ۔ ضمیمہ کے طور پر (آخر تک کے
حالات کے ساتھ) بعد کے کلام کا انتخاب بھی آجاتا تو بہتر تھا ۔ اور بھی بہتر ہوتا اگر ۱۹۴۰ء تک کے کلام
کو سامنے رکھ کے جو اچھے اشعار خود شاعر سے چھوٹ گئے تھے وہ بھی ضمیمے کا

جز و بناد یے جاتے۔ غالب کے کئی درجن بہترین اشعار ان کے خود انتخاب کیے ہوئے کلام سے غیر حاضر ہیں؛ یہی میر کا حال ہے۔ تو اس دستاویز میں شامل شعرائے کرام اس 'بشریت' سے کیسے بچ نکلتے۔

نیاز نے دو نثری مضمون شامل اشاعت کیے تھے، ایک خود اپنا 'بزم نگار' اور دوسرا 'اُردو کا رنگ تغزل' "نقاد" کے پردہ نشیں نام سے مگر: فراق کی تحریر کہیں چھپائے چھپتی ہے!

نیاز نے ۳۱ پھولوں کا گلدستہ بنایا۔ ان کے دو 'ارمانوں (صفی، سائل) کو شامل کر کے یہ ۳۳ کی تعداد ہوئی۔ یہ تعداد ۴۰ تک پہنچ سکتی تھی! اختر صہبائی، امین حزیں، ماہر القادری، ساغر نظامی، اثر رامپوری، سید آل رضا متوازی دستاویز 'اوراق گل' میں شامل پائے جاتے ہیں۔ نیاز نے اپنے مجموعہ میں انھیں جگہ نہ دی تو ان کے ذوق پر کوئی حرف نہیں آیا۔ لیکن کم سے کم تین شاعر محض اس لیے ان کے شریک بزم نظر آتے ہیں کہ 'نگار' نیاز کا پرچہ تھا؛ جسے چاہتے شامل کرتے، کون ان کا دامن گیر ہوتا! اتنا اچھا کام کرنے والے کو اتنا حق (CONCESSION) تو دینا ہی ہوگا!!

اندازہ ہے ۳۵/۴۰ ایسے ممتاز شاعر عہد مابعد میں موجود ہیں جنھیں اس دستاویز کے کسی بھی COMPANION VOLUME یا ذیلی پیشکش میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا!

۱۹۴۱ء دستاویز کی مانند اگر ۱۹۸۴ء دستاویز مرتب ہو سکی تو یہ غزلگویوں میں میکش، عبدالمجید شاد عارفی، راز یزدانی، بسمل سعیدی، عندلیب شادانی، عبدالمجید حیرت، ادیب سہارنپوری، شاعر لکھنوی، عرشی بھوپالی، قابل اجمیری، آل احمد سرور، خورشید الاسلام، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی، احمد ندیم قاسمی، مجید امجد، جذبی، فیض، سردار، مخدوم، شاہد صدیقی، خورشید جامی، شکیب جلالی، اطہر نفیس، پروین شاکر، احمد فراز، شہزاد احمد، حسن نعیم، ظفر اقبال، بلیغ، وارث فہمی، جالب، افتخار عارف، معصوم رضا راہی، حفیظ میرٹھی اور کلیم عاجز پر مشتمل ہو سکتی ہے۔

اور ایک فہرست مزید کے مطابق وجد، مجاز، جاں نثار اختر، جمیل مظہری، مجروح

تاباں اور ناصر کاظمی بھی اس میں شامل کیے جاسکتے ہیں؛ اور ، ایک اور رائے کے مطابق :
' اوراق گل ' کے متروکہ شعرا ماہر القادری ، رضا لکھنوی ، ساغر نظامی ، اثر رامپوری ، امین حزیں '
اثر صہبائی کو بھی اس ذیلی پیشکش میں شامل کیا جاتا زیادہ نامناسب نہ ہوگا۔ امکان ہے کہ ۱۹۴۱ دستاویز
کی اس اشاعت کے بعد ارباب ذوق کی طرف سے چند مناسب اجنبی نام مزید سامنے آسکیں !

نیاز نے اسے صرف غزل تک محدود کردیا۔ انھیں اس میں کچھ زیادہ نقصان بھی نہ ہوا۔
لیکن اس پیشکش کے VOLUME COMPANION کے سلسلے میں کچھ عجیب سا لگے گا اگر انتخاب کلام
میں مخدوم ، سردار ، فیض ، ندیم ، جذبی ، ساحر ، اجتبیٰ رضوی ، اختر الایمان ، سرور اور خورشید الاسلام
کی نظمیں چھوڑ دی جائیں یا اختر انصاری کے قطعات یا امجد حیدرآبادی کی رباعیات —— یا اب آخری دور
کے احمد فراز ، عارف ، جالب ، راہی اور پروین کی نظمیں !

اس پیشکش کی ترتیب نیاز کے ' نگار ' (خود نوشت و انتخاب ' ۳۱ شعرا) رام پور کے ' اوراق گل '
(تصویر و تحریر ، ۲۳ شعرا ' خود نوشت و انتخاب کلام ' ۲ شعرا) کے بنیادی کام کے ماسوا شبیر حسن خاں ابن دل شاہجہاں پوری
(دل کی تحریر) نغمۂ دل (دل کی تصویر) عرفان عباسی (ناطق لکھنوی ' تحریر و تصویر) رشید حسن خاں (ناطق گلاؤٹھی
کا مجموعۂ کلام ؛ تحریر و تصویر کے لیے) محمد حسین خاں (تاجور کا خط) نثار احمد فاروقی (تاجور کی تصویر) منتخب افسانے '
مرتبہ تاجور (افسر کی تصویر) نقوش (فانی و یگانہ کی تحریر) ترانہ (یگانہ کی تصویر) فانی کا مجموعۂ کلام (فانی کی
تصویر) آجکل ۱۹۴۶ء (آسی کی تصویر) انیس شاہ جیلانی ۔ مبارک شاہ جیلانی ؛ بیاض مبارک (آسی کی تحریر)
صبا ' حیدرآباد ۱۹۶۰ (علی اختر کی تصویر) کی مرہون منت ہے۔ اور ' سب سے بڑھ کے اس میں شاہد صاحب '
مکتبۂ جامعہ کے لائق سربراہ ' کی محنت و محبت شامل رہی ہے ۔ ہم ان سب کے شکر گزار ہیں ۔

عابد رضا بیدار

●●

فہرست

آرزو لکھنوی (وفات ۱۶ر اپریل ۱۹۵۱ء)

آرزو لکھنوی

سید انور حسین عرف منجھو صاحب المتخلص بہ آرزو۔ ولادت ۱۲۸۹ھ۔ آپ کے جد اعلیٰ ہرات کے رہنے والے تھے جو اورنگ زیب کے زمانہ میں ہندوستان آئے اور اہل سیف میں ملازم ہوئے۔ پہلے اجمیر میں قیام کیا، پھر لکھنؤ آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

آپ کے والد میر ذاکر حسین یاس تخلص فرماتے تھے اور اچھے شاعروں میں ان کا شمار ہوتا تھا، آپ کے بڑے بھائی یوسف حسین قیاس بھی سخن گو اور سخن سنج تھے۔ جناب آرزو کو بہت کمسنی سے شعر کا ذوق تھا اور جب ان کے والد ماجد کو ان کے شوق کا حال معلوم ہوا تو اُستاد جلال لکھنوی کے پاس لے گئے اور ان کا شاگرد کرا دیا۔ اسوقت آرزو صاحب کی عمر ۱۳ سال کی تھی اور لکھنؤ میں جلال کا طوطی بول رہا تھا۔

رفتہ رفتہ آرزو صاحب کی مشق سخن اتنی بڑھی کہ جلال مرحوم اپنے شاگردوں کی غزلیں انھیں کو اصلاح کے لئے دینے لگے یہاں تک کہ جلال کے بعد لوگوں نے انھیں کو جلال کا جانشین مان لیا۔

آپ کے تین دیوان فغان آرزو، جان آرزو اور سریلی بانسری شایع ہو چکے ہیں۔ فغان آرزو میں ۱۵ برس سے ۵۰ سال تک کی غزلیں ہیں اور جان آرزو میں اسکے بعد کی۔ سریلی بانسری آپ کی شاعری کے تیسرے دور کی چیز ہے جس میں فارسی عربی الفاظ کے استعمال سے قصداً احتراز کیا گیا اور نظیر اکبرآبادی کی زبان میں شاعری کی گئی ہے۔

آپ نے بضرورت معاش ڈرامے بھی بہت سے لکھے ہیں اور اسی سلسلے سے آپ عرصہ سے کلکتہ میں مقیم ہیں۔

آپ مذہباً اثنا عشری ہیں، اور خصایل واطوار کے لحاظ سے حد درجہ منکسر مزاج۔ آپ موجودہ دور میں اُس عہد کی یادگار ہیں جب شاعر نے شاعری کا پیشہ اختیار نہ کیا تھا لیکن قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اب یہی کسب معاش کا ذریعہ ہے، آرزو صاحب کے شاگردوں کی تعداد بھی کافی ہے۔ آرزو صاحب نے خود اپنے کلام کا جو انتخاب فرمایا ہے وہ یہ ہے:

دو تسلی تم ابھی دکھ جھیل چکے دل ٹوٹ گیا — اب ہاتھ ملے سے ہوتا ہے کیا جب ہاتھ سے ناوک چھوٹ گیا

نہ ہواؤں پہ بنیاد ہے طوفاں کی — یا تم نہ حسیں ہوتے یا میں نہ جواں ہوتا

بہار کچھ نہیں گو ہے وہی بہار — دل کیا اُجڑ گیا کہ زمانہ اُجڑ گیا

ں سے کبھی ضعف میں اس طرح ا،
جیسے کہ اک فرض ادا ہوگیا،

ی میری معنی خیز تھی اسے آرزو کتنی
کہ جس نے جیسا چاہا ویسا افسانہ بنا ڈالا

ب رازِ دل چھپاتا ہے بے سود آرزو
لی میں نے ٹھنڈی سانس تو وہ مسکرا دیا

شکوں سے راز کھلتا گیا خون آرزو کا
آنکھوں تک آتے۔ آتے رنگ اُڑ گیا لہو کا

نعشۂ ترک تعلق میں بھی رسوائی ہے
اُلجھے دامن کو چھڑاتے نہیں جھٹکا دیکر

رکیں آنکھیں تو پایا تجھ کو اے پردہ نشیں،
وسعتِ حدِ نظر سے دور لیکن دل کے پاس

سید میں ماجرائے تنہائی،
آپ کہتے ہیں آپ سنتے ہیں،

ل ہیں وہ ایذا دینے میں پانی سے لگی بھڑکاتے ہیں
جانے کو نہیں کہتے منہ سے رو رو کے مجھے سمجھاتے ہیں

لی کشش کو اب بھی، گلشن سے ہے تعلق
کچھ پتیاں قفس تک اُڑ اُڑ کے آرہی ہیں

متحاں عشق میں منظور ہے غمخواروں کا
اک ذرا ہوش میں آجاؤں تو دیوانہ بنوں

ونے پہ مرے ہنستے کیا ہو بے سمجھے نہ دیوانہ جانو
دل کس سے لگایا ہے تم نے تم درد کسی کا کیا جانو

یوس وہ دل ہر پہلو سے آخر کہو کس کا ہو کے رہے
جس کو نہیں اپنا سمجھوں جسکو نہ تمھیں اپنا جانو

ک عدم کے جانے والو وقت سفر کا ایک نہیں
تم ابھی ٹھیرو ہم کو ہے جانا بیچ سے سر کو رستا دو

توں سے تسلی تھی دل کو وعدہ پہ بھروسا ہو نہ سکا
پھر ہو گئی ویسی ہی حالت جب پاس سے وہ سمجھا کے اُٹھے

شبنم کے آنسوؤں پر کیا ہنس رہے ہیں غنچے
ان سے تو کوئی پوچھے کب تک ہنسا کریں گے

یا سوزِ محبت میں جفا ضبط نے کی ہے
در بند ہے اور چار طرف آگ لگی ہے

زیائے بیٹھا ہوں سینے میں راکھ کا اک ڈھیر
نہ دل ہے اب نہ جلے دل کی آہ کا شعلہ

آگ دل میں لگی نہ ہو جب تک
آنکھ اشکوں سے تر نہیں ہوتی

رات مزے کی اور یہ غفلت
ساری جوانی سوتے گزری

آرزو جام کو جھجک کیسی
پی لی اور دہشتِ گناہ گئی،

ہوتے ہیں جو آج یہ قول و قسم بر وقت نہ کچھ کام آئینگے
جب دلمیں بدی آجائے گی الزام لگائے جائینگے

در اصل تماشا گاہ جہاں خود ایک حجابِ غفلت تھا
چھپنے لگے دلکش نظارے اب پردہ اُٹھتا جاتا ہے

مرے غم نے ہوش اُنکے بھی کھو دئے
وہ سمجھاتے سمجھاتے خود رو دئے

بھروسا تھا کہ وہ عہدِ وفا سے منہ نہ موڑیں گے
خبر کیا تھی کہ نازک ہاتھ یہ زنجیر توڑیں گے

نہیں معلوم اے یارانِ عہدِ زندگی کچھ بھی
ہمیں کس کس نے چھوڑا ساتھ ہم کس کس کا چھوڑینگے

ے سانس نہ آکر دل میں ہے زخم — ٹیس اُٹھی ہے جب ہوا لگی ہے
ب تو خیر اُن کی حال پُرسی پر — دل اُمنڈ آیا اشک بھر آئے
ے وہ پھر سے ہوگئے غم جو فلک نے تھے دئے — جس نے کہ ہنس کے بات کی ہم بھی پھوٹ کے رو دئے
کے یہ اور کچھ کہا نہ گیا، — کہ ہمیں آپ سے شکایت ہے،
کا نقش ہے وہ نقش جو مٹکر اُبھرتا ہے — جنھیں دل سے بھلاؤگے وہ پیہم یاد آئیں گے
ہے خموشی مری اسی قابل — جتنا چاہے بُرا بھلا کہئے
ا بیچینیاں رہتی ہیں دوری ہو کہ نزدیکی — نہیں معلوم اس بیتاب دل کا مدعا کیا ہے
شمت عارضی سے ہے سرائے دہر کی رونق — یہ ہے اک کارواں جس پر بھری محفل کا دھوکا ہے
کی حدیں بڑھالی ہم نے آزادی کی حد — یوں دیا جھٹکا کہ حلقے کھنچ گئے زنجیر کے
چھپکر دیکھنے والے کی کیا جانئے کیا حالت دیکھی — آئینہ ہاتھ سے چھوٹ پڑا اور پھر کے مری صورت دیکھی
ت ساری جسے آنکھوں میں بسر ہوتی ہے — آپ کیا ہیں اُسے دُنیا کی خبر ہوتی ہے
ا ہے ناصح کہ واپس جاؤ اور میں سادہ لوح — پوچھتا ہوں خود اُسی سے کوئے قاتل کا پتا،
ق میں سو بار نالہ آکے لب تک رُک گیا — بات اکیلے کی نہیں تھی دو دلوں کا راز تھا
کہتے ہیں میں تیرے گھر مہماں تھا — یہ سچ ہے تو اسے بیخودی میں کہاں تھا
، دل ہی میں تھا جس کو ہم ڈھونڈتے تھے — یہ سب سچ ہے ہمدم مگر دل کہاں تھا
پنچ لایا تھا یہ کس عالم سے کس عالم میں ہوش — اپنا حال اپنے لئے جیسے کوئی افسانہ تھا
لی کی چھاؤں سی اِدھر آئی اُدھر گئی — جھپکی پلک کہ ختم تھا موسم بہار کا
لموت آرزو اُن کا ہے حرفِ بے آواز — مرے سوال کا لیکن جواب [illegible] سکا
کر تلاشِ اثر تیر ہے لگا نہ لگا — جو اپنے بس کا نہیں اُس کا آسرا نہ لگا
سینے میں دل ہے تو بارِ محبت، — اُٹھے یا نہ اُٹھے اُٹھانا پڑے گا
بت نہیں آگ سے کھیلنا ہے — لگانا پڑے گا بجھانا پڑے گا،
سی جسکی طینت ہوگی، ویسا ہی سب کو بتائیگا — داغی آئینہ جب دیکھوگے، دھبہ منھ پر آئیگا
مل کا خواہشمند بنے کیوں حسن کا سچا پروانہ — دل سے لگی ہے لاگ تو اک دن، خود شعلہ بنجائیگا،
ڑی دُشمنی کر گئے دوست بنکر — اب اُن سے سوا دل ستاتا رہے گا
لمہ جھپکی کہ منظر ختم تھا برقِ تجلّے کا — ذراسی نعمت دید اُس کا بھی یوں رائگاں ہونا

اللہ اللہ حسن کی یہ پردہ داری دیکھئے — بھید جس نے کھولنا چاہا وہ دیوانہ ہوا

میں عرضِ حال میں جب تک زبان کو روکوں — تری بدلتی ہوئی چتونوں نے کیا نہ کیا

معمہ بنگیا رازِ محبت آرزو یوں ہی — وہ مجھسے پوچھتے جھجکے مجھے کہتے حجاب آیا

جس میں کیفِ غم نہیں باز آئے ایسے دل سے ہم — یہ بھی دینا ہے کوئی سمے تو نہ دی ساغر دیا

اُن کو جلدی، آرزو میں دم بخود اس سوچ میں — سب سے کہنے کا کہوں کم کرکے افسانے سے کیا

دُکھ تو کیا ہمدم بٹا لیتے مگر اتنا ہوا — بیکسی میں بات کرنے کا سہارا ہوگیا

جواب دینے کے بدلے وہ شکل دیکھتے ہیں — یہ کیا ہوا مرے چہرے کو عرضِ حال کے بعد

وہ عمر کی مدت ہی کتنی، جو سانس کی آمد و شد پر تھی — کل منزلِ ہستی طے کرلی، آگے نہ بڑھے اک گام سے ہم

تم ایسا عہد شکن آرزو سا ناامید — کہو جو سچ بھی تو آتا ہے اعتبار کہاں

عشق پر بھی چھا گئیں رعنائیاں — اُف تری توڑی ہوئی انگڑائیاں

کثرتِ وحدت ہے نیرنگِ جمال — جتنے شعلے اُتنی ہی پرچھائیاں،

تھا حریفِ خلوتِ جاناں خودی کا امتیاز — آنکھ جب کھولی یہی دیکھا کہ تنہائی نہیں

اس جہانِ عنصری میں ہے قفس اندر قفس — چھوڑ دینا تھا نشیمن پہلی ہی پرواز میں

اُن کی صورت کو دیکھتا ہوں میں — اپنی قسمت کو دیکھتا ہوں میں،

جو محبت کرے وہ مارا جائے — رسمِ اُلفت کو دیکھتا ہوں میں،

وہ تو کچھ مسکرا کے ہو گئے چُپ — ایک اُلجھن میں پڑگیا ہوں میں

تھے قبل اسیریِ قفس بازوؤں کا زور — ٹوٹے ہوئے کچھ پر کہ نشیمن میں پڑے ہیں

بھلاوے دے رہا ہے شوقِ حسرت آفریں مجھکو — وہاں باتیں ہی باتیں اور یہاں سب کچھ یقیں مجھکو

فوقِ ظلمات پہ ہے میرے سیہ خانے کو — شمع ہے اور نظر آتی نہیں پروانے کو

چاکِ دامانیِ یوسفؑ کو ہنسی میں نہ اُڑا — کہیں دُہرا دے نہ کوئی اسی افسانے کو

اُلفت بھی عجب شے ہے جو درد وہی درماں — پانی پہ نہیں گرتا جلتا ہوا پروانہ

کل آرزو اک در پر سر پھوڑ کے روتا تھا — میں نے جو کہا یہ کیا ہنسنے لگا دیوانہ

ہاتھ سے کس نے ساغر پٹکا موسم کی بے کیفی پر — اتنا برسا ٹوٹ کے بادل ڈوب چلا میخانہ بھی

حسن و عشق کی لاگ میں اکثر چھیڑ اُدھر سے ہوتی ہے — شمع کا شعلہ جب لہرایا اُڑ کے چلا پروانہ بھی

کچھ سہارا چاہتی ہے عاشقی کی زندگی، — بے نیازی تیرے صدقے ناز بیجا ہی سہی

کاڑ پہ بھی تو ہے اُن سے حسنِ ظن باقی
سخن تمام ہے اور حاصلِ سخن باقی

ِزاں نچوڑ چکی ہے بہار کا دامن
سوائے رنگ نہیں بوئے یاسمن باقی

ہنس ہنس کے جو ہر بات کو افسانہ بنا دے
وہ تو جسے چاہے اُسے دیوانہ بنا دے

بچے رہنے کو وہ ملا ہے گھر کہ جو آفتوں کی ہے رہگزر
تمھیں خاکساروں کی کیا خبر کبھی نیچے اُترے ہو بام پر

و ترے عمل کا چراغ ہے وہی بے محل ہو تو داغ ہے
نہ جلا کے بیٹھ اُسے صبح سے نہ بجھا کے سو اُسے شام کو

رُخ کا مرے تغیرِ غم کی کتاب سمجھو،
لی ٹھنڈی سانس جس جا اُلٹا ورق وہیں سے

جمع ہوئے ہیں کچھ حسیں گرد مرے مزار کے
پھول کہاں سے کھل گئے دن تو نہ تھے بہار کے

جاتے کہاں ہیں آپ نظر دل سے موڑ کے
تصویر نکلی پڑتی ہے آئینہ توڑ کے

چھینا تھا چھلکتا ہوا جام اُس نے جھٹک کر
کیا مفت کا دھبّہ مرے دامن میں لگا ہے

اُس کوچے میں اک شیشہ تھا پڑا ٹھوکر جو لگی ما تھا ٹھنکا
کھوئے ہوئے دل کو پہچانا اور وہ بھی کب پہچانا ہے

اب میری خموشی بھی پُر درد فسانا ہے
یعنی وہ نہیں سُنتا غم جس کو سُنانا ہے

جذبِ نگاہ شعبدہ گر دیکھتے رہے
دنیا اُنھیں کی تھی وہ جدھر دیکھتے رہے

پاؤں کو لغزش ہے لب پر شورِ نوشا نوش ہے
جتنی پیمانے میں اب باقی ہے اتنا ہوش ہے

خلوت کدۂ دل کا بھرم جائے گا اے شوق
آواز نہ دینا کہ یہاں کوئی نہیں ہے

وہ ایسے غافل نہیں کہ سوچیں جو کچھ ہوا تھا بجا کہ بیجا
ہم ایسے کافر نہیں کہ سمجھیں اُنھیں ہماری خبر نہیں ہے

غم دیا ہے کہ مسرت دی ہے
سب میں اک طرح کی لذت دی ہے

برائے نام یہ نام و نمود و نقشِ فانی ہے
وگرنہ موج کیا گرداب کیا جو کچھ ہے پانی ہے

تجربے سب ہیچ ہیں قانون سب بیکار ہیں
ہر زمانہ اک نیا پیغام لیکر آئے ہے

جس پہ اُن کی نگاہ ہو جائے
سانس کھینچے تو آہ ہو جائے

پاک نکلے وہاں سے کون، جہاں
عذر خواہی گناہ ہو جائے

اظہارِ مدعا کے لئے آسرا ہے شرط
جب تک وہ دیکھتے رہے آنسو بہا گئے

دُھوپ سہ لینا ہے اچھا بارِ احساں کون اُٹھائے
چھاؤں اک گرتی ہوئی دیوار ہے میرے لئے

اسی چمن میں کہ وسعت ہے جس کی نامحدود
نہیں پناہ کی جا ایک آشیاں کے لئے

ان لی کس نے اپنی ہار بڑھ کے تھکن بتائے گی
میں یہیں تڑپ کے جاؤں گا تو وہیں مسکرائے جا

آگ سے پانی نکالے یہ دلّی کا کھیل ہے
دوسرا چھالا اُٹھا جب ایک پھوٹا ہو چکا

کھا کے چرکے ہنسو یہ بات ہے اور   آرزو جی ہی جانتا ہوگا،

جو دیکھے گا روتے مجھے تم کو ہنستے   مری بات چھوڑ دتمھیں کیا کہے گا،

بناوٹ کو چاہت کے سانچے میں ڈھالا   بڑی چوٹ کھائی ارے مار ڈالا

اُسی کے نہ ملنے سے جی پر بنی ہے   یہ کاہے کو سمجھے مرا بھولا بھالا

اب ایسے نہ تھے ہم کہ چھیڑو تو رو دیں   بہا ہوگا کوئی کلیجے کا چھالا،

سکھ میں بھی دیکھے ہیں دکھ، جی اس سے ہو کھٹکا ہوا   پاس بیٹھا ہوں ترے اور دھیان ہے بھٹکا ہوا

میں سوچ ہی میں تھا کہ لگی ہے کہاں پہ چوٹ   اک ہوک یوں اُٹھی کہ ٹھکانا بتا دیا

بے سہارے دل کا سہارا کچھ نہ پوچھ   سوتے ہیں ہاتھ اک سرہانے دھر کے ہم

وہ ٹل نہیں سکتی جو پہونچنے کی گھڑی ہے   چلتا رہے گلیوں میں کہ بیٹھا رہے گھر میں

چاہ نے اندھا کر رکھا ہے، اور نہیں تو دیکھنے میں   آنکھیں آنکھیں سب ہیں برابر، کون نرالی آنکھیں ہیں

آنکھ اُس نے پھرا کے رت پلٹ دی   ہنستے ہوئے پھول رو رہے ہیں،

اک تم نہیں آرزو تو کیا ہے   ہونے ہیں جو کام ہو رہے ہیں،

بیٹھے تکتے تو ہیں کنکھیوں سے   یہ نہیں پوچھتے کھڑے کیوں ہو،

وہ گلی میں بھی نہیں دے گا ٹھہرنے کی جگہ   آرزو بس جاؤ بھی مرتے ہیں مرنے کی جگہ

ہمنے چڑھتی دھوپ بھی دیکھی ہے، ڈھلتی دھوپ بھی   پاس بٹھلائیں جو وہ یہ بھی ہے ڈرنے کی جگہ

چبھتے ہوئے دیکھا ہے نہ کانٹا نہ کوئی پھانس   اے سانس بتا دے یہ ہے کاہے کی کھٹک سی

آرزو اُس کا جینا کیا ہے، ہاں دن پورے کرنا ہے   بیٹھا ہو جو آس لگا کر، ان ہونی کے ہونے کی

کھلنے کی آس میں یہاں، ڈال گئے تھے اک کلی   رو کے اُٹھا رہے ہیں آج، پنکھڑیاں ملی دلی

یہ ہے تیرے گھائل کا اب سانس لینا   چھری اک کلیجے میں جیسے چبھو لی

کس نے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ جھٹکا پانی   جھوم کر آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی

آئے دن اچھا نہیں اک باولے کو چھیڑنا   مرنے کا آرزو جس دن اُسے جھک آ گئی

کالی گھٹا میں کوندا لپکا رو کے جو کوئل کوک گئی۔   جتنی گہری سانس کھنچی تھی اُتنی لمبی ہوک گئی

سانپ کے چھالے میں بس ہوگا ان میں پیا امرت ہی امرت   ہائے ری آنکھیں دیکھ کے جنکو پیاس اُڑی اور بھوک گئی

چاہت کا پھل ایسا ہے جیسے جل جائے کھیتی بوئی ہوئی   کیا ہوتا ہے آنسو پونچھنے سے چھپتی نہیں آنکھیں روئی ہوئی

اپنے لئے متوالی ہے کیسی یہ نہ پوچھو   وہ آنکھ کہ جو دوسروں کی نیند اڑا دے

، ایک ہی ہونا تو یہ اَن بَن نہیں اچھی

کو کہہ سکتے ہیں کیا جو دیس سے پردیس ہیں

س کو پوچھو کس لئے تھا یہ روکے ہنسنا نہیں کے رونا

رسے نکلی جو ناؤ بچکر تو پار اُترنے میں کھائی ٹھوکر

سے اُٹھ کے بھی وہ جائیں، روکیں بھی آنکھ مار کے

ہتے : تم الگ تھلگ، ہم نہ گزرتے آپ سے

ہی تھی چھیڑ کر جو آپ، کہنے نہ دی وہ بات بھی

شلاتے ہیں جو مجھ کو بات اپنی وہ مکر کے

رنے کو رات دن کے آنسو کہاں سے آئیں

لی سے تری رک کے بڑھتے ہیں آگے

راٹوٹتے دیکھا سب نے، یہ نہیں دیکھا ایک نے بھی

ن سے اوجھل ہے تو ان آنکھوں میں،

پپ ایک پہیلی ہے، سوچوگے تو بوجھوگے

بتا دے گی بھید آرزو نیند اڑ کر

کہانی ہو کبھی چوٹ تو دکھ اور کا سمجھیں

چھڑکے پوچھو، پوچھ کے سمجھو، سن کے نہ ایسی بات سناؤ

دو گھڑی کو دے دے کوئی اپنی آنکھوں کی جو نیند

مٹ بھی سکتی تھی کہیں بے روئے چھاتی کی جلن

بند آنکھیں کبھی کرتا ہوں جو سونے کے لئے

کچھ بھنور کو جو کہیں، پھیر سمجھ کا جانو

سچ ہے میں مانگنے میں جھجکا تھا

چاہت کے کٹھن رستے کرتے ہیں لہو پانی

جہاں بھر سہارا ہو جھوٹا ہی جھوٹا

دھیان اُن کا ساتھ ہی گئے، جین جی کا اُنکے پاس

دوڑتی لہریں ہیں، اُٹھتے بلبلے پانی کے ہیں،

میرا سا نہ بن تو مجھے اپنا سا بنہ

لائے آنکھیں بند کر کے اور اکیلا چھوڑ دے

اک اَن کہی دکھ بھری کہانی دکھا دی تم کو اُلٹ پلٹ کے

بڑھا کے رکھا تھا پاؤں جس پر، وہی لگا ر گرا ہے جھپٹ کے

اب رہے کون آپ میں، دوڑ پڑے پکار کے

چپکے سے کہنے والی بات کہنا پڑی پکار کے

تم نے کھٹکتی پھانس کو چھوڑ دیا اُبھار کے

منہ اُن کا دیکھتا ہوں اک ٹھنڈی سانس بھر کے

دو ایک بوندیں گرنا وہ بھی ٹھہر ٹھہر کے

ادھر آنے والے اُدھر جانے والے،

کس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا، کس کا سہارا ٹوٹا ہے

رات کیسی کہ دن اندھیرا ہے،

تم سے وہی کہنا ہے، جو سب سے چھپانا ہے

کہ جو رات چھوٹی تھی، اب کیوں بڑی ہے

وہ ہنس رہے ہیں اور یہاں جی پہ بنی ہے

آس لگا کر کہنے والا اپنا سا منہ لیکر رہ جائے

پاؤں پھیلا دوں گلی میں تیری سونے کے لئے

آگ کو پھلا لیا بچا ہا بھگونے کے لئے

نیند بھی آتی ہے کانٹے ہی چبھونے کے لئے

کم تھے ہم آپ ہی کیا ناؤ ڈبونے کے لئے

دینے والے نے ہاتھ روکا ہے

تلوے کا چبھا کانٹا آنکھوں سے نکالا ہے

وہاں چاند کیسا گہن ہی گہن ہے

کہئے اب اپنا کسے کس کو پرایا جانئے

آگے آنکھوں کے ہے جو، اُس سب کو دھوکا جا

عبدالباری آسی (وفات ۱۰ رجنوری ۱۹۴۶ء)

عبدالباری آسی نولکشور بکڈپو

لکھنؤ

ظفرآباد الناطی حسن جعفر

آسی الدنی

میرا نام عبدالباری۔ تخلص آسی، ابن منشی خلیفہ حسام الدین احمد حسام تلمیذ مرزا غالب۔ ابن مولوی شیخ خدا بخش ماجر۔ ابن شیخ عبدالحکیم عاشق عرف میاں شغن معاصر و ہم جلیس میر تقی میر مرحوم۔ الدن ضلع میرٹھ تحصیل باپوڑ مولد ہے۔ سنہ ۱۸۹۳ء قصبہ مذکور میں جو شرفا کی ایک بہت قدیم بستی ہے، پیدا ہوا۔ اور سنہ ۱۸۹۹ء میں میرا سلسلۂ تعلیم شروع ہوا۔ ابتدائی کتابیں اپنے والد سے پڑھیں۔ فارسی کی تکمیل مولوی حافظ برکت علی سے کی اور عربی کی سید سراج احمد صاحب سراج مرحوم سے۔ مولانا محمود حسن صاحب محدث دیوبندی سے بھی بعض کتب حدیث و فقہ کا استفادہ کیا۔ سنہ ۱۹۰۸ء میں دہلی میں حکیم نواب جان مرحوم سے کتب طب پڑھیں۔ اور اُن کے مطب میں نسخہ نویسی بھی کرتا رہا۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں شاہجہاں پور میں دو برس تک فارسی پڑھانے پر مامور رہا۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں اس سے جی گھبرا گیا تو دفتر اخبار ہمدرد دہلی مولانا محمد علی کے یہاں کام کرتا رہا۔ جس زمانہ میں جالب صاحب اُسکے اڈیٹر تھے، میں بھی وہیں تھا۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں ہمدرد کی مالی حالت نہایت نازک صورت اختیار کر چکی تھی اس لئے وہاں سے دل برداشتہ ہوا اور ۳ دسمبر سنہ ۱۹۱۹ء کو لکھنؤ چلا آیا اور ابتک یہیں ہوں۔

میری شاعری کی ابتدا کسی ترغیب و تشویق کی ممنون احسان نہیں ہوئی۔ بلکہ اُسوقت سے جبکہ میں انشا، خلیفہ داد، ہورام وغیرہ پڑھتا تھا۔ شوق کی آگ دل میں لگی ہوئی تھی۔ تا اینکہ ایک روز کہیں جاتے ہوئے یہ شعر خود بخود موزوں ہو گیا:

کیا تم نے زخمی کیا دل ہمارا　　　بڑا تیر مارا بڑا تیر مارا

یہ واقعہ غالباً سنہ ۱۹۰۴ء کا ہے اس کے بعد قریب قریب روز شعر کہتا رہا اور سنہ ۱۹۰۶ء تک بغیر کسی تخلص کے مشق سخن جاری رہی۔ ایک روز ایک دوست نے صلاح دی کہ تم عاصی تخلص رکھ لو۔ اتفاق سے اُسی زمانہ میں مولانا سید سراج احمد صاحب مرحوم نے مشق سخن کرانا شروع کی۔ کوئی طرح دیدی اور اس پر سب کو طبع آزمائی کا حکم دیدیا۔ چنانچہ پہلی طرح یہ تھی:

مسافر ہے تو عقبے کا ارے نادان پردیسی

اس پر میں نے بھی شعر کہے جو اس وقت مجھے یاد نہیں۔ اب یہ بات چھپنے والی نہیں رہی تھی۔ اس موزوں طبعی کی خبر میرے والد مرحوم کو بھی خبر ہو گئی۔ وہ خود فارسی اور اُردو کے خوشگو شاعر تھے ۔ اگر پدر نتواند پسر تمام کند۔ انھوں نے ایکبار یہ طرح دی:

اُٹھا ؤ گٹھری سنبھالو بستر کر رات اب کچھ نہیں رہی ہے

میں نے غزل کہکر سنائی۔ خوش تو ہوئے۔ مگر کہا کہ ابھی بہت کمی ہے۔ اس کے بعد کبھی کبھی کسی شعر پر اصلاح دیتے رہے۔ میں بیشتر فارسی کے دیوانوں اور اپنے پردادا مرحوم کا دیوان دیکھتا رہا۔ اُسوقت نہ اس ضخیم مجلد کتاب کی مجھے کچھ زیادہ قدر تھی، نہ اُن کے کلام سے کچھ زیادہ لطف اندوز ہوتا تھا۔ بلکہ اُس کے حواشی کی عبارتیں دیکھکر مزا آتا تھا۔ کہیں لکھا تھا کہ یہ غزل میر تقی میر کی غزل پر کہی اور میر صاحب کو سنائی، میر صاحب نے اس کی بڑی داد دی کہیں یہ تھا کہ میر صاحب نے میری اس غزل پر غزل کہی اور میری غزل سے اچھی نہ کہہ سکے اور میں نے اُن کے اس شعر پر اعتراض کئے۔ کہیں قائم کی ملاقات کا حال۔ کہیں سوداؔ کی بات چیت۔ غرض فارسی کے دیوانوں اور اس دیوان کو اپنا مبصر بنا رکھا تھا۔ ان کے بعد سب سے پہلے اُردو میں مرزا غالب کا دیوان پڑھا۔ اور اُس کو اپنے والد سے سمجھا اور اس کے معانی پر پورا عبور حاصل کیا۔ پھر گلزار نسیم کو سبقاً سبقاً پڑھا۔ تا اینکہ ۱۹۱۰ء میں مولانا سید ابوالحسن صاحب ناطق سے ملاقات ہوئی۔ مولانا میرے عزیز قریب بھی ہیں اسی وجہ سے ان کی ہمشیرہ کی شادی میں شرکت کے لئے گیا تھا۔ وہاں روز و شب شعر و شاعری کا چرچا رہا اور مولانا کا یہ شعر سنکر:

اب اس کو کیا کرے کوئی اگر تم کو نہ باور ہو بتو کہتا تو جاتا ہوں مسلماں ہو تو کافر ہو

میں اس شعر کو سنکر ایسا وارفتہ ہوا کہ مولانا سے اصلاح کی استدعا کی۔ مولانا نے از راہ مہربانی منظور فرمایا اور سب سے پہلے میرے تخلص میں اصلاح فرمائی یعنی عاصی کے بجائے آسی تجویز کیا۔ اور اس کے بعد ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۲ء تک اپنا کلام اُن کو دکھاتا رہا۔ بعد کو مولانا نے اتنا دل بڑھا دیا کہ جس پر مجھے بذات خود ناز ہے۔ اس حساب سے شاعری کے تین خانوادوں سے فیضیاب ہوا ہوں۔

مولانا سید سراج احمد صاحب سراجؔ مرحوم، تلمیذ میاں یزدانی میرٹھی۔ مولانا منشی شیخ خلیفہ حسام الدین احمد صاحب حسامؔ تلمیذ مرزا غالب مرحوم۔ مولانا سید ابوالحسن صاحب ناطقؔ تلمیذ مرزا داغؔ۔ اس ضمن میں نے اس بات کو خود نظر انداز کر دیا ہے کہ میں نے براہ راست دو غزلوں پر داغؔ مرحوم سے بھی اصلاح حاصل کی جو شاید اب بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔ مگر اصل استفادہ صرف ناطقؔ صاحب کی ذات سے حاصل کیا۔

میں نے شاعری کے مختلف مشاقوں اور مختلف اسکولوں کا اتباع کیا ابتدا میں ناسخ کے رنگ پر بہت سی غزلیں کہیں۔ بعدہ اس کی قباحتیں ذہن نشین ہوئیں تو مولانا حالی کے رنگ میں شعر کہے۔ ایک زمانے میں یہ سودا ہوا کہ ہر شعر میں کوئی محاورہ نظم ہونا چاہیئے۔ ایک زمانے میں ایہام و تناسب مرغوب طبع رہا۔ جس کی مولانا ناطقؔ نے تنبیہ فرمائی

ہیں سخت ممانعت کی۔ اس کے بعد مرزا داغ کے رنگ میں نہایت رنگین اور روزمرہ میں ڈوبے ہوئے شعر کہنے لگا اور [illegible]
کی غزلیں قریب قریب سب اسی انداز کی ہیں۔ مگر ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ آگیا اسوقت یہاں انجمن معیار کا زور و شور تھا
اور اساتذہ لکھنؤ مرزا غالب کے رنگ میں طبع آزمائیاں فرما رہے تھے۔ میں بھی اُسی مروجہ شاہراہ پر چل نکلا۔ اگرچہ بعد کو
بہت جلد میری سمجھ میں آگیا کہ:— کاین رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است — میں نے بین و بکا اور رثائی
کی شاعری کو الوداع کہدیا۔ اس کے بعد فلسفیانہ انداز مرغوب ہوا۔ مگر جلد تر یہ معلوم ہو گیا کہ اگر شاعری کو محض فلسفے اور
تصوف کی جولانگاہ بنا دیا جائے تو شاعری سے اس کو دور کا لگاؤ بھی نہیں ہوتا۔ میر کے انداز سخن کا میں پہلے بھی شیدائی
تھا اور اب بھی ہوں، مرزا غالب اور مرزا داغ کا رنگ میرے لئے پہلے بھی قابل اتباع تھا اور اب بھی ہے۔ مگر ان سب میں
سے میں کسی کا پابند نہیں۔ اب میرا مذہب شعر یہ ہے کہ شعر خواہ کسی کے طرز پر ہو۔ کیسی ہی نادر ترکیبیں بہترین الفاظ اور بدیع
استعارات اور تشبیہیں اس میں صرف کی گئی ہوں۔ مگر پھر بھی کوئی ندرت بیان اثر اور جوش کلام ضرور شامل ہو۔ اگر اسکی
تہ میں ایک قسم کی شگفتگی، طنز، کنایہ، تعریض وغیرہ کی جھلک بھی نظر آجائے تو سبحان اللہ۔ شاعر اگرچہ اصناف سخن میں
سے کسی ایک صنف خاص کا زیادہ دلدادہ ہو تو کوئی ہرج نہیں مگر اُس کی مشق ہر صنف کلام میں ہونا چاہئے عشق و محبت کے
جذبات اثر و تاثیر سے کوئی شعر خالی نہ ہو۔ پھر اثر کے معنے صرف سوگوارانہ بیان اور موت کے تلخ مناظر پیش کرنا نہیں جیسا کہ اکثر
حضرات کا خاص دستور ہے کہ پوری غزل میں کوئی شعر ایسا نہیں ہوتا کہ وہ سوائے مرگ مایوسی کے زندگی کے ایک خوش انجام
لمحے کی بھی تصویر پیش کر سکے۔ یہی میرے خیال ہیں اور انھیں باتوں پر نگاہ رکھتے ہوئے میں شعر کہتا ہوں۔ میرا کلام غزل۔
نظم۔ قصیدے۔ مثنوی۔ رباعیات وغیرہ تمام اصناف سخن میں بہت کافی ہے۔ مگر رباعی اور غزل میری سب سے زیادہ
محبوب چیز ہے۔

میری تصانیف میں اکثر ناول بھی ہیں اور شرح دیوان غالب جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔ شرح تحفۃ العراقین۔ ترجمہ
و شرح دیوان حافظ۔ ترجمہ فرہنگ اندراج لغت اُردو اور تین تذکرے خاص چیزیں ہیں اور عام تصنیفات کی تعداد
تیس بتیس تک پہونچتی ہے جن کو صراحتاً لکھنا بیکار ہے۔

میرے شاگردوں کی تعداد سو ڈیڑھ سو تک ہے۔ یوں تو سب خوش فکر خوش گو ہیں، مگر شوکت تھانوی۔ امین سلونوی۔
عمر انصاری۔ شہید بدایونی۔ زخمی لکھنوی۔ حیرت لکھنوی۔ اسد الہ آبادی۔ آزاد لکھنوی، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

زبان کے متعلق میرا خیال ہے کہ صرف لکھنؤ یا دہلی کا زباندان یا اہل زبان ہونا قابل استناد و لایق فخر نہیں بلکہ دہلی
اور لکھنؤ دونوں شہروں کی زبان پر کم از کم اتنا عبور ضرور ہے کہ وہ دونوں زبانوں میں فرق و امتیاز کر سکے۔

میری ابتدائی مشق کے دو دیوان مرتب ہو چکے تھے مگر اب میں اُن کو ضایع کر چکا۔ اب ایک دیوان اُردو غزلیات کا
ایک نظموں اور ایک رباعیات کا تیار ہے۔ جن کی طبع کی نوبت ہنوز نہیں آئی۔ البتہ قطعات اور رباعیات کا مجموعہ بصائر

چھپ چکا ہے۔ میں نے یہ انتخاب اس حصہ سے کیا ہے جو سنہ ۱۹۲۴ء سے پہلے تک کا ہے۔ ورنہ اس خیال میں کہ کس شعر کو لکھوں اور کس کو چھوڑوں، شاید مجھ سے یہ انتخاب کبھی نہ ہو سکتا۔ اب میرا انتخاب ملاحظہ ہو:

عبدالباری آسی - ۹ر اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء

کھل گیا دنیا پہ رازِ حسن و عشق، وہ ہنسے مجھ کو پسینا آ گیا،
جب چمن میں کچھ انقلاب ہوا اک نہ اک آشیاں خراب ہوا
جہاں اپنا قصہ سنانا پڑا وہیں ہم کو رونا رلانا پڑا،
بڑا دکھ دیا گردشِ چرخ نے کہ احباب کو آزمانا پڑا،
جو چھٹے تو پھر ملیں گے نہ چھٹے تو یہ سمجھنا یہ سلام آخری ہے تجھے اے بہار اپنا
روتے ہیں چارہ گر اور دیکھنے والے چپ ہیں، ہائے بگڑی ہوئی حالت ترے بیماروں کی
دام خالی نظر آتا ہے مگر اے صیاد آ رہی ہے ابھی آواز گرفتاروں کی
دل کشی نظارۂ دنیا میں کافی ہے مگر دل کہاں سے لاؤں، جینے کے لئے دل چاہئے
آتے ہی انساں کے گونج اٹھا طلسم کائنات ذرے ذرے سے صدا آئی ہمیں دل چاہئے
دل رہینِ آرزو ہے آرزو مرہونِ یاس، گھر ہمیں برباد کرنے کو بنانا چاہئے
غضب ہی ڈھا گیا آسی یہ کہنا اُس شکووں پر تم ایسے کون سے وہ تھے تمھیں ہم یاد کیا کرتے
غرورِ حسن غنی تھا تو کیوں ادھر آیا ہمارا دل کوئی آئینۂ جمال نہ تھا
مجھے تو یاد نہیں ہے کوئی خوشی ایسی شریک جس میں کسی طرح کا ملال نہ تھا
جہاں کے صدمۂ پیہم کو کیا کہیں آسی ہمارے زخموں کی قسمت میں اندمال نہ تھا
اچھا ہوا کہ چھوٹی خود ہم سے فکرِ دنیا جتنا خیال کرتے اتنا ملال ہوتا
اُس سال فصلِ گل میں اُجڑا تھا بنتے بنتے، رہتا تو آشیاں کو اب ایک سال ہوتا
ہزاروں طرح اپنا درد ہم اسکو سناتے ہیں مگر تصویر کو ہر حال میں تصویر پاتے ہیں
بجھا دے اے ہوائے تند مدفن کے چراغوں کو سیہ بختی میں یہ اک بدنما دھبا لگاتے ہیں
مرتب کر گیا اک عشق کا قانون دنیا میں وہ دیوانے ہیں جو مجنوں کو دیوانہ بتاتے ہیں
اُسی محفل سے میں روتا ہوا آیا ہوں اے آسی، اشاروں میں جہاں لاکھوں مقدر بدلے جاتے ہیں
پھول ہنس ہنس کر دکھاتے ہیں جہاں کو داغِ دل مختلف شکلیں ہیں اظہارِ غم و آلام کی

ہجومِ حشر میں تھی بھیڑ بہت کچھ لیکن،
مجھ کو پہچان کے چھوڑا مری رسوائی نے

بےخبر انجمنِ ناز میں سونے والے
رات بھر تجھ کو پکارا مری تنہائی نے

ہو گئے سلسلۂ ضبط کے ٹکڑے آسی
ایک جھٹکا جو دیا عشق کی رسوائی نے

جو توڑا ہے تو پھر تم اُس کے اجزا جوڑتے کیوں ہو
خدا جانے مرے دل میں کہاں کیا تھا کہاں کیا تھا

مرادورِ گزشتہ بھی یونہی گزرا ہے اے ہمدم
بنا رکھی تھی اک صورت خوشی کی شادماں کیا تھا

پہلو سے چلا تھا دل تو خون کا قطرا سمجھتا
آنکھوں میں پہونچتے ہی دریا نظر آتا ہے

ہمیں ناواقفِ رسمِ چمن تھے اے قفس والو
فلک سے عہد لے لیتے تو فکرِ آشیاں کرتے

نہ پڑا عشق میں تکمیل کا ساماں کرنا
ہاتھ خود سیکھ گئے چاک گریباں کرنا

بےخبر دلکشیِ دہر کو الزام نہ دے،
تیری فطرت نے سکھایا ہے تجھے عصیاں کرنا

خاروخس جمع کرے نام نشیمن رکھدے،
جس کو منظور ہو گلشن کو بیاباں کرنا

قیامت ہو گیا رازِ طلسمِ عشق کا کھلنا
ذرا سی زندگی اور اس قدر دشوار ہو جانا

خوشی شرمِ نگاہِ مصلحت اندیش کی ورنہ
مجھے منظور تھا رسوا سرِ بازار ہو جانا

خوش نوایانِ چمن مٹ نہیں سکتے صیاد
چار مٹ جائیں گے تو چار نمایاں ہوں گے

موجدِ طرز ہے سر وحشیِ آشفتہ مزاج
سو کے سو طرح کے دامان و گریباں ہوں گے

غنچے بےحس ہیں یہ اندازِ جنوں کیا جانیں،
وقت آئے گا تو ہم چاک گریباں ہوں گے

تقاضیِ فریبِ معاصی نہ پوچھئے
جنت بنا کے رکھدی گنہ گار کے لئے

ایک حالت پر نہ رہنے پائیں دل کی حسرتیں
تم نے جب دیکھا نئے انداز سے دیکھا مجھے

ابتدا وہ تھی کہ دُنیا تھی ملامت گر مری
انتہا یہ ہے کہ کوئی کچھ نہیں کہتا مجھے

شوق سے دنیا میں عشرت کی تمنا کیجئے،
پہلے اک امروزِ بے فردا تو پیدا کیجئے

عہد وفائے دوست بجا لیکن اے ندیم،
کیونکر کہوں کہ بھول گیا آسماں مجھے

کلیاں تمام باغ کی کھل جائیں آج ہی،
کل تک یہاں ٹھہرنے کی فرصت کہاں مجھے

ہر جلوہ گہِ عام میں بے پردہ نہ آنا
ہر دل کو زمانے میں مرا دل نہ سمجھنا

ہستیِ بے ثبات سے طعنے دئے مجھے
کچھ بھی نہیں میں صرف ترا اعتبار ہوں

شرابِ زیست ابھی سیر ہو کے پی بھی نہیں،
کہ سن رہا ہوں صدائیں شکستِ ساغر کی

ہزار طرح تخیل نے کروٹیں بدلیں
قفس قفس ہی رہا پھر بھی آشیاں نہ ہوا

جس در پہ زمانے کے تغیر سے اُدھر تھا، اِس وقت بھی میرا سرِ شوریدہ وہیں ہے

کہتے ہیں کہ امید پہ جیتا ہے زمانا وہ کیا کرے جس کو کوئی امید نہیں ہے

نصیحت کو آتے ہیں غمخوار آسی گریباں کو پھر آج سینا پڑے گا

وہ پھر وعدہ ملنے کا کرتے ہیں یعنی ابھی کچھ دنوں ہم کو جینا پڑے گا

بحثِ ردوقبول اس سے جدا ہے لیکن جو کیا ہم نے وہ آسان نہیں تھا کرنا

ادب آموز ہے میخانہ کا ذرہ ذرہ، سیکڑوں طرح سے آجاتا ہے سجدا کرنا

عشق پابندِ وفا ہے نہ کہ پابندِ رسوم، سر جھکانے کو نہیں کہتے ہیں سجدا کرنا

جو پھول آتا ہے گلشن میں گریباں چاک آتا ہے بہارِ رنگ و بو میں خون دیوانوں کا شامل ہے

آتے ہی فصلِ گل سے بھیجی نویدِ وحشت گلشن کا پتہ پتہ میرا مزاجداں ہے

سب مہیا ہیں مرے زہر میں سامانِ طرب اب فقط دیر ہے قسمت کے بدل جانے کی

اِس فقیری میں یہ حالت مرے انکار کی ہے بادشاہی کہیں مل جائے تو آفت ہوجائے

آلام زندگی کی حقیقت نہ پوچھئے لاکھوں تو ایسے ہیں جو مجھے یاد بھی نہیں،

اے دشمنِ مروت کچھ حق بھی ہے ہمارا برسوں ترے لئے ہم احباب سے لڑے ہیں

دشتِ عدم سے وحشت لائی ہے سوئے ہستی دونوں جہاں ہمارے روندے ہوئے پڑے ہیں

خوش تو ہوں مرنے سے لیکن اے دعائے مستجاب اک ذرا بیوقت یہ ارمان پورا ہوگیا،

مجھے احساس کم تھا ورنہ دورِ زندگانی میں مری ہر سانس کے ہمراہ مجھ میں انقلاب آیا،

رہ گئی دل میں تو کیا حال کرے گی دل کا وہ شکایت کبھی لب تک جو نہ لائی جائے

نقش برآب زندگی لایق دشمنی نہ تھی، موجِ صبا نے کیا کیا توڑ کے دل حباب کا

ہزاروں نغمۂ دلکش مجھے آتے ہیں اے بلبل مگر دنیا کی حالت دیکھ کر چپ ہوگیا ہوں میں

دکھا دیں گے جہاں کو آہ عالم سوز کی طاقت قفس بھی ہے ابھی کچھ روز اور ہم بھی قفس میں ہیں

کھلا یہ راز بزمِ ناز کا پردہ اُٹھانے پر کہ جس پر تیرا دھوکا تھا وہ اک تصویر تھی میری

ہوا احساس پیدا میرے دل میں ترکِ دنیا کا مگر کب جبکہ دُنیا کو ضرورت ہی نہ تھی میری،

سکوت افزا ہے خوابِ مرگ خالی ورنہ اے آسی رہی ہے موت بنکر مدتوں تک زندگی میری،

اپنی حالت کا خود احساس نہیں ہے مجھ کو میں نے اوروں سے سنا ہے کہ پریشان ہوں میں

اے غمِ دوست بتادے مجھے مرضی اپنی جتنی خواہش ہو تری اُتنا پریشان ہوں میں

ہیں کچھ خرابیاں میری تعمیر میں ضرور — سو مرتبہ بنا کے مٹایا گیا ہوں میں

دیکھتا ہے نہ عمارت کو نہ ویرانے کو — جس جگہ پڑ رہا، نیند آگئی دیوانے کو

مثالِ گردِ رہ مسکن کہاں ہے ہم غریبوں کا — گھڑی بھر کے لئے تھک کر جہاں بیٹھے وہیں گھر ہے

نئی راہیں بتاتا ہے نئے رستے دکھاتا ہے، — نہیں معلوم ظالم عشق رہزن ہے کہ رہبر ہے

رنگِ نشاط دیکھ کر مطمئن نہ ہو — شاید کہ یہ بھی ہو کوئی صورت ملال کی
گلشن بہار پر ہے ہنسوا سے گلو نہ ہو — جب تک خبر نہ ہو تمہیں اپنے مآل کی
احساس اب نہیں ہے مگر اتنا یاد ہے — شکلیں جُدا جُدا تھیں عروج و زوال کی

صاف کہتے ہوئے ڈرتا ہوں حکایت اپنی — خوف مایوسیٔ اربابِ نظر بھی ہے مجھے
مجھ سے دُنیا کی محبت نہیں چھٹتی آسی — ورنہ ہونے کو تو اللہ کا ڈر بھی ہے مجھے

یہ سب فریب ہے نظرِ امتیاز کا، — دُنیا میں ورنہ کوئی بھی اچھا بُرا نہیں
اب کون ہے رموز محبت کا راز داں — اک ہم رہے ہیں، ہم کو کوئی پوچھتا نہیں

اور آگے بڑھ ذرا اے ہمتِ مردانہ آج — ہے کوئی پردے میں یا آواز ہی آواز ہے
حیرت آبادِ وفا میں آئے لاکھوں انقلاب — جو مرا دل تھا وہ اب آئینہ دارِ ناز ہے
جتنی عالی ہے ترے قصرِ معلّے کی زمیں — اُتنی ہی سجدوں میں میرے قوت پرواز ہے

رفتہ رفتہ یہ زمانے کا ستم ہوتا ہے — ایک دن روز مری عمر سے کم ہوتا ہے
باغ روتا ہے اسیرانِ قفس کو شاید — دامن سبزہ و گل صبح کو نم ہوتا ہے
ہاتھ رکھے ہے دم نزع جگر پہ کوئی، — اب نہ بڑھتا ہے مرا درد نہ کم ہوتا ہے

قید سے پہلے بھی آزادی مری خطرے میں تھی، — آشیانہ ہی مرا صورت نماے دام تھا
واہمہ خلاق اور آزادی کا حُسن افزا سرور — ہر فریب رنگ کا پہلے گلستاں نام تھا
ضعف آہوں پر بھی غالب ہو چلا تھا اے اجل — تو نہ آتی تو یہ میرا آخری پیغام تھا
دیدۂ خوننابہ افشاں میرا اُن کے سامنے — بیخودی کے ہاتھ سے چھوٹا ہوا اک جام تھا

حشر کیا ہے وہی اقرار خدائی کرنا — اک نئے بھیس میں پھر روزِ الست آتا ہے
مکتبی پر تو طلب حسن ازل ہے دنیا — اس میں جو آتا ہے آئینہ بدست آتا ہے
نامرادی نے مٹایا مری ہمت کا غرور، — جو خیال آتا ہے اب دل میں وہ پست آتا ہے

ناسخ کو بڑا ناز ہے تدبیر پہ آسی — قدرت تو کسی شخص کی محکوم نہیں ہے

سمجھتا ہوں کہ دنیا میں ہمیشہ رنج سہنا ہے
مگر پھر کیا کرو آسی اسی دُنیا میں رہنا ہے

مناسب خیر رکھیں زخم دل پر چارہ گر مرہم
مرے نزدیک تو کوئی خدا سے لڑ نہیں سکتا

مقام عبد کا معبود سے جُدا ہی رہا،
بتوں سے ہو نہ سکا کچھ، خدا خدا ہی رہا

یہ زندگی حسرت آفریں ہے اسی کا رونا ہے ہمکو ورنہ
کبھی گنیں گے اگر تو شاید خوشی سے کچھ رنج کم ہی ہوں گے

ہمارے نالے بھی چند دن تو چمن میں مل جل کے گانے والو
تمہاری محفل میں تو ہمیشہ یہ نغمۂ زیر و بم رہیں گے

ہزاروں بار کوشش کر چکا ہوں،
نہیں چھپتیں محبت کی نگاہیں

میں چپ بیٹھا ہوا ہوں اور یہ معلوم ہوتا ہے
کہ جیسے اک زمانہ کہہ رہا ہے داستاں میری

عجب کیا ہے جو رہبر بھی نہ پہونچے کوئے دلبر میں
مری تقدیر بھی شامل ہے اب اُسکے مقدر میں،

تغافل کا گلا کیا میں تو اے ساقی یہ کہتا ہوں
کہ پیاسوں کی نظر سے بال پڑ جاتا ہے ساغر میں

ہوا یہ ہے کہ نیکی کرکے دنیا میں خطا پائی،
سنا یہ تھا کہ پاداش عمل ملتی ہے محشر میں

دُنیا میں کوئی غم کے علاوہ خوشی نہیں
وہ بھی ہمیں نصیب کبھی ہے، کبھی نہیں

کیوں اے وفورِ جذبۂ طاقت ربائے دل
کیا واقعی میں قابلِ فریاد بھی نہیں

تعئینِ حدِ صبر کروں کس امید پر
تکلیف ایک حال پہ ٹھہری ہوئی نہیں

دھوکا نہ کھاؤ چارہ گرو واقعات سے
پہلو میں دل نہیں ہے تو کیا درد بھی نہیں

اے بدگماں شاید دنیا پہ صبر کر
فطرت کو تیرے ساتھ کوئی دشمنی نہیں

پھر بڑھ چلا تلاطمِ طوفانِ آرزو،
حالانکہ ڈوب کر ابھی اُبھرا نہیں ہوں میں

مارا ہوا ہوں بے حسیٔ جوشِ یاس کا
مرہونِ التفات تمنا نہیں ہوں میں

ہو چکا تھا روشناسِ واقعاتِ انقلاب
میں نے ہر آغاز کو سمجھا کہ انجام آگیا

کھلا دورِ اسیری میں کہ رنگ آسماں کیا تھا
چمن کیا تھا چمن کے پھول کیا تھے آشیاں کیا تھا

وہ محشر ہی سہی اے عمر رفتہ
نہ آنا چاہیئے تھا تجھ کو جا کے

بہار زندگی آخر ہے شاید
گریباں مل گیا دامن میں آکے

سمجھ تو لی ہے دنیا کی حقیقت
مگر اب اپنا دل بہلا رہا ہوں،

تو کیوں مجھے مایوس کئے دیتا ہے ناصح
کیا تو نے مرا خط جبیں دیکھ لیا ہے،

بیتاب سا پھرتا ہے کئی روز سے آسی
بیچارے نے پھر تم کو کہیں دیکھ لیا ہے

اچھے ہوئے زمانے کے بیمار سیکڑوں
دل وہ مریض ہے جو ابھی زیر غور ہے

چھوڑا ہی کیا ہے لوٹنے والوں نے میرے پاس　　اک زندگی سو وہ بھی کوئی دن کی اور ہے

اب میں کیا تم سے اپنا حال کہوں　　بخدا یاد بھی نہیں مجھکو

زندگانی کا آسرا ہے یہی　　درد مٹ جائے گا تو کیا ہوگا

آنکھ پھر ہو رہی ہے اشک آلود　　خون کچھ دل میں رہ گیا ہوگا

بے ساختہ اُٹھی جو وہ توبہ شکن نگاہ　　خود مجھ کو شک ہوا کہ مسلماں نہیں رہا

فصل بہار ذوق نظر عالم شباب　　اب کیا خبر رہا ہے کہ ایماں نہیں رہا

جو خطا میں نے اُٹھا رکھی ہے کل کے واسطے　　آج ہی بیتاب ہے فرد عمل کے واسطے

اُتنے ہی دست شوق میں پھول چنے ہوئے ملے　　جتنے کسی غریب نے پھول چنے بہار میں

یہ جانتا ہوں کہ خاک آشیاں نہیں ہوتی　　مگر جلے ہوئے تنکوں کو چن رہا ہوں میں

مٹا کے صفحۂ ہستی سے اپنا نام و نشاں　　زمانے بھر میں ترا نام لکھ چلا ہوں میں

ٹھہر گیا اسی مرکز پہ انقلاب آسی　　شکست دل کی صدا بن کے رہ گیا ہوں میں

مری ہستی نے کیا تھا مجھ کو حیرت کے سپرد　　میں نے ہستی کو سپرد طاق نسیاں کر دیا

اے مرے دردمند دل سن مری ایک بات سن　　اس کو نہ بھولنا کبھی جس نے تجھے بھلا دیا

نغموں ہی کی تخصیص نہیں اہل طلب میں　　سننے پہ کوئی آئے تو نالہ بھی مزا دے

شوخیاں معمورۂ ہستی کی حد سے بڑھ چلیں　　پھینک دوں دو چار ذرے اپنے ویرانے سے کیا

چمک جاؤ اے شام غم کے ستارو　　مصیبت کے مارو پہ احسان ہوگا

ترا کفر معلوم ہے مجھ کو آسی　　ارے تو بھلا کیا مسلمان ہوگا

خدا جانے اب دل کہاں جاکے ٹھہرے　　بڑے انقلابات سے ہو رہے ہیں

جھوٹا نہیں کہتے ہیں تجھے ہم مگر آسی　　جیسا تو بتاتا ہے وہ ایسا تو نہیں ہو

متاع زندگی کے دینے والے یہ تو سمجھا دے　　کہ اتنا بوجھ سر پر رکھ کے لیجانا کہاں ہوگا

زندگی مورد آفات ہوئی جاتی ہے　　جس سے ڈرتے تھے وہی بات ہوئی جاتی ہے

کوئی ناصح ہے کوئی دوست ہے کوئی غمخوار　　سب نے ملکر مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے

عمر فانی ہے تو پھر موت سے ڈرنا کیسا　　اک نہ اک روز یہ ہنگامہ ہوا رکھا ہے

بہت علاج کیا درد عشق کا لیکن　　وہی مآل ہوا جو مآل ہوتا ہے

ہر خطا پر ہو ندامت پھر ندامت پر خطا　　کچھ دنوں یوں زندگی کا دور ہونا چاہئے

دیکھیئے کس کی خطا ہے کس کے سر الزام ہے
موت غفلت کر رہی ہے زندگی بدنام ہے

روتی ہے شبنم کلی دل تنگ ہے گل سینہ چاک
کیا اسی مجموعۂ غم کا گلستاں نام ہے

تڑپے بھی مضطرب بھی ہوئے وقت قتل ہم
سب کچھ سہی تمہارا تو دامن بچا دیا

آسی نے ہم کو حال سنایا تھا اپنا رات
اُس خانماں خراب کی باتیں بھی خوب ہیں،

منزل کے رہنے والو کیا دیکھتے ہو ہم کو
آسودۂ مکاں تم ۰۰ ماندۂ سفر ہم

یہ راز ہے اے حریص دنیا تجھے کچھ اسکی خبر نہیں ہے
اُسی کا گھر ہے تمام دنیا کہ جس کا دنیا میں گھر نہیں ہے

تونے بدنام کیا درد وفا کو آسی
سیکڑوں بار سُنے ہیں ترے نالے میں نے

کچھ اُن کو ہمارا پاس نہیں جو چاہتے ہیں کہہ جاتے ہیں
ہم سنتے ہیں سر دُھنتے ہیں منہ تکتے ہیں رہ جاتے ہیں

نہ تھی خرابۂ دُنیا میں اتنی وسعت بھی
کہ بیٹھ کر کسی گوشے میں رو لیا کرتے

دل شکوہ سنج کثرتِ درد نہاں نہ تھا
لیکن یہ جب کی بات ہے جب آسماں نہ تھا

جینا پڑا امید وفا پر تمام عمر
حالانکہ جان دینے میں کوئی زیاں نہ تھا

رسوا ہوئے مگر دل مضطر کو کیا کریں
مرنا پڑا وہیں ہمیں مرنا جہاں نہ تھا

وہیں تک، ہمارے وفاؤں کی حد ہے
جہاں تک مٹا دیں مٹا دینے والے

بچیں گے تو پھر ایک کوشش کریں گے
جلا دیں نشیمن جلا دینے والے

اگر دل سلامت رہیگا تو آسی
بہت مل رہیں گے دغا دینے والے

اُن کو یہ غصہ کہ میں اُن کی گلی میں کیوں گیا
مجھ کو یہ حیرت کہ کیونکر شکل پہچانی مری

تمنا کو خموشی دی خموشی کو زباں تونے
مکمل کر کے چھوڑی بے بسی کی داستاں تونے

تجاہل سے مرے نام ونشاں کے پوچھنے والے
وہیں رہتا ہوں میں ڈھونڈا نہیں ابتک جہاں تونے

یقین رکھ کہ یہاں ہر یقین میں ہے فریب
بقا تو کیا ہے فنا کا بھی اعتبار نہ کر

نقش ہستی بنی نظر تیری،
نہ گئی یاد عمر بھر تیری

ساتھ ہر سانس کے مرے دل سے
آ رہی ہے ابھی خبر تیری

اب جُدائی میں یاد آتی ہے
گفتگو بات بات پر تیری

اتنا مجھے مجبور نکر، ناصح غمخوار
ایسا نہ ہو دامن بھی گریباں میں سل جائے

میں اپنے دل سے کہتا ہوں کہ اتنا درد کچھ کم ہے
مرا دل مجھ سے کہتا ہے کہ اکثر یوں بھی ہوتا ہے

جراحت ہائے دل میں، برق میں، گلہائے خنداں میں
بہر صورت وہ انداز تبسم کار فرما ہے

بہت شکوے کئے بیدردیوں سے — مگر پھر آسماں تو آسماں ہے

کیا بات ہے اے اہل قفس رنگ چمن کی — ہم نے بھی کسی وقت میں دیکھی ہیں بہاریں

دئے فریب مقدر نے بار بار مجھے — ہر اک خزاں کو سمجھنا پڑا بہار مجھے

ثبوت ہے یہ تمنا کی سادہ لوحی کا — بغیر وعدے کے رہتا ہے انتظار مجھے

اسی کا نام ہے شاید جنون عشق آسی، — کہ ایک نشہ سا سر پہ سوار رہتا ہے

جب مری امروز کو اندیشۂ فردا نہ تھا — یہ زمیں ایسی نہ تھی، یہ آسماں ایسا نہ تھا

دل کو شکوا کہ مرے درد کا درماں نہ ہوا — ہم پشیمان کہ اور اس کے سوا کیا کرتے

اب تک تو محبت میں وہ ساعت نہیں آئی — جس روز وہ رونے پہ مرے ہنس نہ دیا ہو

بیم ورجائے عشق میں اکثر حضور دوست — جنبش ہوئی لبوں کو بغیر التجا کئے

بیربطئ آل تمنا نہ پوچھئے — اک انتہا ہوئی ہے، بغیر ابتدا کئے

بتخانہ نگاہ ہے دنیائے آب و رنگ — بنتی نہیں کسی سے یہاں بے خطا کئے

الٰہی کس کو پکاریں کہاں نکل جائیں — کھلی ہے آنکھ شب انتظار باقی ہے

جو ذرہ ہے اس ذرہ پہ اک نقش جبیں ہے — کیا ساری زمیں کوچۂ جاناں کی زمیں ہے

سبھی کچھ کیا خودکشی رہ گئی، — وفا میں ذرا سی کمی رہ گئی

ہو رہا ہوں ہدف ناوک ظلم اصنام — صرف اتنی سی خطا پر کہ مسلماں ہوں میں

ہم کو پہلے بھی نہ تھا تیرا بھروسہ اے عمر — ہم نے دیکھا تھا چھلکتے ہوئے پیمانے کو

یہ کیسی بدشگونی ہے جو میں محسوس کرتا ہوں — کہ ہوں اور پھر نہیں معلوم ہوتا اُسکی محفل میں

نہایت ہی بُرا وقت آگیا ہے دیکھئے کیا ہو، — ضرورت نالے کی ہے اور سکت باقی نہیں دل میں

شاید نہ ہوئی ہو کسی لغزش پہ ندامت — دل ہی تو ہے یارب کوئی معصوم نہیں ہے

جنوں نقاش وہم زیست ہے دھوکا نہ کھا غافل — مقید کردیا ہے تجھ کو اک کاغذ مصور میں

صدائے صور اسرافیل نے دھوکا دیا آسی — میں جس دنیا سے بھاگا تھا وہی دنیا ہے محشر میں

آبرو زیر قناعت تھا در فیض کریم — یہ بھی میری کامیابی تھی کہ ناکام آگیا

اب [illegible] یہی ہے کہ ترا در کہیں مل جائے — آمادہ ہے دل باندھ کے احرام تمنا

کھلی نہیں ہیں زمانے پہ چوریاں میری، — میں بزم سے ترا نقشہ اُتار لایا ہوں

ہمیں مجانہ جو دور حیات کا کرتے — تو روز حال کو ماضی بنا دیا کرتے

اثرؔ لکھنوی (وفات ۶ جون ۱۹۶۷ء)

اثرؔ لکھنوی

مرزا جعفر علی خاں (خان بہادر۔ ایم۔ بی۔ ای) - ۱۲؍ جولائی سنہ ۱۸۸۵ء کو لکھنؤ میں ولادت ہوئی، کٹرہ ابوتراب میں آبائی مکانات ہیں جو لکھنؤ کا مشہور محلہ اور شرفا اور نجبا کا مرکز ہے، فارسی کی درسی کتابیں پڑھ کر سنہ ۱۸۹۶ء جوبلی ہائی اسکول (اب انٹرمیڈیٹ کالج ہے) میں داخل ہوئے، سنہ ۱۹۰۲ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کرکے کیننگ کالج لکھنؤ میں داخل ہوئے، سنہ ۱۹۰۴ء میں ایف۔ اے اور سنہ ۱۹۰۶ء میں بی۔ اے پاس کیا، ایک سال ایم اے کا کورس پڑھا اور ایل ایل بی کی تیاری کی، قانون سے طبیعت میں مناسبت نہیں پائی اور یہ سلسلہ چھوڑ دیا۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں براہ راست بعہدۂ ڈپٹی کلکٹری تقرر ہوا، جولائی سنہ ۱۹۴۰ء مستقل کلکٹر کے عہدے سے پنشن ہوئی، مگر اُسی کے بعد اڈیشنل کمشنر الہ آباد کے عارضی عہدے پر تقرر ہو گیا

جن آغوشوں میں اثرؔ نے پرورش پائی وہ حقیقت میں زبان کا گہوارہ تھے، اسلاف خاندان شاہی سے متوسل لہذا اشرف الاشراف تھے اور بر بنائے زبان "ثقات کٹرہ" کے لقب سے مشہور تھے لکھنؤ کے طبقۂ اعلیٰ میں اُن کا شمار تھا، اُنھی کا اثر ہے کہ اثرؔ کو اپنی زبان سے خاص اُنس ہے انگریزی زبان کے فاضل ہیں مگر کبھی تحریر یا تقریر میں انگریزی الفاظ بغیر ضرورت صرف نہیں کرتے۔

اثرؔ کے خاندان میں شاعری کا ذوق فطری ہے۔ زانوئے تلمذ مرزا محمد ہادی صاحب عزیزؔ مرحوم کے سامنے تہ کیا، جن سے قدیم خاندانی مراسم تھے۔

اثرؔ صاحب کا انتخاب ملاحظہ ہو:

وہ گزرا ادھر سے جو بیگانہ وار
چراغِ لحد جھلملانے لگا

کیا حسرت دیدار ہے، ہر بار یہ سمجھا
گویا کبھی دیدار میسر نہ ہوا تھا

جن خیالات سے ہو جاتی ہے وحشت دونی
کچھ انھیں سے دلِ دیوانہ بہلتے دیکھا

شوق بڑھتا گیا گناہوں کا
لذت انفعال نے مارا

یہ اتفاق تو دیکھو بہار جب آئی
بہارِ جوشِ جنوں کا وہی زمانہ تھا

نظریں اُٹھیں اور اُٹھ کے جھکیں تمکنت کے ساتھ — گویا یہی جواب تھا میرے سوال کا

ایسی تو بہ سے تو بیخوار ہی رہنا تھا اخترؔ — دل پہ اک ہاتھ ہے، اک ہاتھ میں ساغر ٹوٹا

ہم نے رو رو کے رات کاٹی ہے — آنسوؤں پر یہ رنگ تب آیا

کوئی موسم ہو، سماں ہو کہ تغیر کوئی — تم کو جب دیکھ لیا، وقت فراموش ہوا

میں نے کہا کچھ نہیں، سے لے قسم ہمنشیں — آپ ہی کچھ زیرلب کہکے خفا ہوگیا

فریاد کا شنوا کوئی نہیں، بیکس کا سہارا کوئی نہیں — کچھ دیکھ لیا اس دنیا میں کچھ حشر میں دیکھا جائیگا

تم نے پوچھا اس طرح حالِ دلِ خانہ خراب — یاد اب کچھ بھی نہیں، ابتک بہت کچھ یاد تھا

یہ کون مغنّی تھا، یہ کس کا تھا فسانہ — کہتے ہیں دھواں جنبشِ مضراب سے نکلا

صیاد نے چھیڑا دہیں افسانۂ گلشن — جب قصد اسیروں نے کیا ترکِ فغاں کا

مقدر نے جو پہونچایا بھی اُن کے آستانے تک — یہی دل ہے تو ہم کو ہوش سجدے کا کہاں ہوگا

نیاز مندِ محبت گناہگار ہوئے — فلک کی سمت دمِ اضطراب دیکھ لیا

ہمواریٔ وفا سے اُٹھنے لگا تھا دم — خوش ہوں کہ تم نے قصد کیا امتحان کا

وہ غور بات بات پہ، وہ شک بھری نظر — یارب نہ مجھ سے صاف ہو دل بدگمان کا

چمن ہے، شاخِ گل ہے، آشیاں ہے، پھر نہیں کچھ بھی — غضب ہے طائرِ آزاد کا بے بال و پر ہونا

زلیخا کا تھا ہاتھ، یوسف کا دامن — حیا نے یہیں تک گریبان جانا

دلِ شرمزدہ ہر چند کانپ کانپ اُٹھا — نگہ سے اُن کی مگر اجتناب ہو نہ سکا

حیا شیوۂ حسن، ادب شرطِ الفت — ملے بھی تو آپس میں پردا رہیگا

ممکن ہوتا تھا بہر حال تو پھر عیب نہ تھا — کہ حریفِ لب اظہار بھی ارماں ہوتا

ڈبڈبا آئیں خود بخود آنکھیں — بارہا ایسا اتفاق ہوا

ادھر دیکھ لینا، اُدھر دیکھ لینا — پھر اُن کی طرف اک نظر دیکھ لینا

وہ میرا نہ کہنے میں کہہ جانا سب کچھ — وہ اُن کا اچانک ادھر دیکھ لینا

اخترؔ عرضِ حال اُس سے بے سوچے سمجھے — کہا تھا کہ پہلے نظر دیکھ لینا

سمجھ تو عرضِ تمنا کی مصلحت ہمدم — ترش رہنے سے وہ اور بدگماں ہوتا

ہائے کیا چیز ہے محبت "بھی" — دل کسی حال میں بُرا نہ ہوا

گلوں کی گود میں جیسے نسیم آکر مچل جائے — اسی انداز سے اُن پر خمار آنکھوں میں خواب آئے

یہیں سب کو پھر پھر کے آنا پڑے گا　　محبت کو مرکز بنانا پڑے گا،

جہاں کی ہر اک شے ہے فانی، مگر　　بنانے میں کیا کیا تکلف کیا

اک شوقِ مسلسل کی محویت مدہوشی،　　دنیائے محبت میں امروز د فردا تھا

ہر اک رہگزر میں ہیں سرگوشیاں　　خدا جانے کس پر ستم ہوگیا

حیف وہ ملتفت نہیں ہوتا　　حال تو آشکار ہے اپنا،

عشق سے لوگ منع کرتے ہیں　　جیسے کچھ اختیار ہے اپنا،

پوچھنے والے دردِ پنہاں کے　　اپنے چہرے کا رنگ بھی دیکھا؟

اب وہ در ہے نہ وہ جبینِ نیاز　　سجدۂ مستجاب نے مارا

دوڑا دے نبضِ خاک میں بھی روحِ زندگی　　کیسی نشاط اور غمِ روزگار کیا

کھینچتے یوں بھی ہیں بیتابیٔ دل کا نقشہ　　موج سے موج کا مل مل کے جدا ہو جانا

شکوہ لذت کے لئے ہے، ورنہ وہ کافر وہ ہے　　دل دکھانے سے اثر جو اور پیارا ہوگیا

نگہِ شوق لگاتار نہ یوں دیکھے جا　　ہو گئے سرخ وہ لبہائے مے آلود بہت

یہاں تک ہوا یہ دل خرابِ محبت　　کہ آنکھوں سے چھلکے شرابِ محبت

رگوں میں ہو سانس لیتا ہے گویا　　اب اس حد پہ ہے اضطرابِ محبت

صبا گنگنائی، فضا گونج اٹھی　　جہاں دل نے چھیڑا ربابِ محبت

رہے داغ ہو کر، بہے خون ہو کر　　اثر ہے وہ دل کامیابِ محبت

کوئی دل پر ہاتھ رکھکر اٹھ گیا　　ہاتھ اب دل سے اٹھاؤں کس طرح

بھولنے والے سے کوئی پوچھتا　　میں تجھے دل سے بھلاؤں کس طرح

اب کہاں سینہ کاویٔ حسرت　　اب کہاں دلخراشیٔ بے سود،

اب کہاں اضطرابِ تاب شکن　　اب کہاں شوقِ مرحلہ فرسود

اب کہاں راز داریاں غم کی　　اب کہاں خندہائے اشک آلود

آج کچھ مہربان ہے صیاد　　کیا نشیمن بھی ہوگیا برباد

آرزو تھی کہ وہ ادھر دیکھیں،　　ہوش رخصت ہوئے، مبارکباد!

ہر سانس ایک تازہ جراحت کا ہے پیام　　نشتر بنی ہوئی ہے رگِ جاں ترے بغیر

صورتِ موج ہو سرگرمِ سفر　　ساحل آجائے تو کترا کے گزر

جو جلوہ بہار میں اُبھری   ہم اسیروں کی حسرت پرواز
بحر سے ہمکنار ہوتا تھا   اے تنک ظرفیٔ حباب فروش

ہر سانس دے رہی ہے پیغام صد تمنا   ہر جنبش مژہ ہے عرض ہزار آغوش
تھے جو خفا، ہیں وہ خفا آج تک   کیوں ہیں خفا؟ یہ نہ کُھلا آج تک

میرے دل و دماغ پہ چھائے ہوئے ہو تم   ذرے کو آفتاب بنائے ہوئے ہو
افسانہ کہہ رہی ہیں پریشاں نگاہیاں   کیا راز ہے جو دل میں چھپائے ہوئے ہو؟

کاہیکو ایسے ڈھیٹ تھے پہلے، جھوٹی قسم جو کھاتے تم   غیرت سے آجاتا پسینا، آنکھ نہ ہم سے ملاتے
حیف تمھیں فرصت ہی نہیں ہے، ورنہ کیا کیا حسرت تھی   حال ہمارا سن لیتے اور اپنا حال سناتے
وضع بھی کوئی شے ہے آخر، دل کو آخر سمجھانا تھا   در سے کسی کے اکبار اُٹھکر، کاش دوبارہ نہ جاتے

اُس نے کس لطف سے پوچھا کہ آخر کیسے ہو   بیخودی کا ہو برا کہدیا کچھ یاد نہیں

میں نہ ہوں تو وہم باطل دہر ہے   اس پریشاں خواب کی تعبیر ہوں

رقصاں ہے نسیم برگ گل پر   شبنم میں ہے گھنگھروں کی چھن چھن
غنچوں کے بدن میں سنسنی ہے   مستی میں چھوا صبا نے دامن

دیکھ لینے دے ذرا بیخودی شوق مجھے   کوئی ہے بھی مرے پہلو میں کہ تنہا ہوں میں

سرور بن کے نظر پر وہ چھائے جاتے ہیں   ادائے خاص سے بیخود بنائے جاتے ہیں
آخر اُٹھائے گئے آج اُس کی محفل سے   ہمیں یقین تھا یہ بے بلائے جاتے ہیں

جب سے اُن سے آنکھ لڑی ہے آنکھوں میں اپنی خواب نہیں   اُس پہ مصیبت یہ ہے ہمدم صبر کی دل کو تاب نہیں
پوچھنے والے تو نے پوچھا، لطف کرم، احسان کیا   لب پر آئے حرف تمنا، عشق کے یہ آداب نہیں
اہل دل سے پوچھو آخر کیا لذت ہے ناکامی میں   ہاتھ اُٹھا بیٹھے مطلب سے، مطلب گو نایاب نہیں

تاثیر پیش رو تھی، باب قبول وا تھا   مانگی گئیں نہ مجھ سے مانگی ہوئی دعائیں

ہاں جلوہ گر ہو تجھ پہ نچھاور کے واسطے   صبح دمیدہ پھول بھرے ہے کنار میں

جیسے وہ سن رہے ہیں بیٹھے ہوئے مقابل   اور درد دل ہم اپنا اُن کو سنا رہے ہیں
پھر ہم کہاں، کہاں تم، جی بھر کے دیکھنے دو   اللہ کتنی مدت تم سے جدا رہے ہیں

یوں اُن کی یاد ہے دل حیراں سے لئے ہوئے   جیسے نسیم غنچۂ گل سے کنار میں

اشک مژگاں پہ رہ گیا ہوگا،   میرے غمخانے میں چراغ کہاں

وہ خمار آلودہ آنکھیں دیکھ کر   موج مے لینے لگی انگڑائیاں
زندگی اور زندگی کی یادگار   پردہ اور پردے پہ کچھ پرچھائیاں

ل ہے اُس کو بہت کچھ مرے تڑپانے میں   وہ جو لذت ہے ترے نام کے دُہرانے میں
سمجھتا ہوں تری جلوہ گری کا منشا   لطف ہے ساغر لبریز کے چھلکانے میں
اثر سچ ہے کہ سب وعدے ہیں اُسکے جھوٹے   کچھ عجب لطف ہے رُک رُک کے قسم کھانے میں

راستے بند ہیں کدھر جائیں   تم ہو پیش نظر، جدھر جائیں
اب میں سمجھا مراد جنت سے   آپ جس راہ سے گزر جائیں

یہ محسوس ہوتا ہے راتوں کو اکثر   کہ سنسار سے کچھ سُنا چاہتا ہوں

اثر تیرے کوچے سے بچ بچ کے نکلا   ابھی ہوش اتنا ہے دیوانگی میں

اُس گھڑی دیکھو اُن کا عالم   نیند سے جب ہوں بھاری آنکھیں
کون اثر کی نظر میں سمائے   دیکھی ہیں اُس نے تمھاری آنکھیں

کہتے کچھ ہو، کرتے کچھ ہو   دیکھتے جاؤ اپنی باتیں
ایک نہ اک دن آئیں گی مجھ پر   جس کی ہوں گی جیسی باتیں
تیرے سوا پھر کس کو سناؤں   جان کے دشمن، تیری باتیں

ں ہوں آزار کا خوگر، اُسے منظور نہیں   مہرباں ضد سے جو ہو جائے تو کچھ دور نہیں،
، وہ عالم ہے ترے دردِ محبت کے نثار   التفات نگہ ناز بھی منظور نہیں،،
ٹ رہا ہے چمن اور آہ نہیں کر سکتے   پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی مجبور نہیں،

ی ترک تمنا پر، کبھی عرض تمنا پر   محبت کو محبت سے پشیماں دیکھ لیتا ہوں

ہتھیلی سے مل جائیں وہ آنکھیں دیکھو   نے یوہیں بھرتے ہیں اس طرح کے پیمانوں میں

ا بہت کہ اُس سے کہیں تیرا دکھ اثر،   وہ تو ہے تیرے نام سے بیزار، کیا کریں

یں کچھ دھواں سا اُٹھ کے فوراً پھیل جاتا ہے   قفس میں یاد جب آتا ہے میرا آشیاں مجھکو
اب سجدے کروں، دل کو سنبھالوں یا پڑھوں نالے   نظر آتا ہے کوسوں سے کسی کا آستاں مجھکو

آئیں تو شکیب بھی آئے، قرار بھی،   جو ساتھ لے گئے ہیں شکیب و قرار کو

رسوئے زمیں ہے گوشۂ دامن ہے ہاتھ میں   معاذ اللہ کوئی کیا کہے ایسے پشیماں کو

وہ کیا تھا ازرہ اُلفت، طنز سمجھ کر روٹھے ہو   ہم بھی ہیں نادم اپنی خطا پر، آؤ تم بھی جانے دو

یادِ دل گم گشتہ میں ٹھنڈی سانسیں بھرتا تھا — ہنس کے ستمگر کہتا کیا ہے بات ہی کیا ہے جانے دو

خوبیِ ناز تو دیکھو کہ اُسی نے نہ سنا — جس نے افسانہ بنایا مرے افسانے کو

ابھی اُلجھن میں نہ لکھا اُنھیں ابتک نامہ — کوئی مضمون شکایت کا رقم ہولا نہ ہو

کہتے ہیں حال اخترؔ اب نہیں دیکھا جاتا — کوئی حیلہ سے پئے تجدید ستم ہو کہ نہ ہو

ناموس عشق کا سہ دست گدا نہ ہو — یارب دعا میں شائبۂ التجا نہ ہو

جب تقاضا نیند کا ہو اور تنہائی نہ ہو — اُف وہ کیفیت کہ جو بھی اور انگڑائی نہ ہو

دل وہی دل ہے کہ جس کی زندگی ہو اضطراب — غم وہی غم ہے کہ تم سے بھی مسیحائی نہ ہو

حال پوچھا تھا تو اس طرح نہ پوچھا ہوتا — رہ گئی عرض تمنا کی تمنا مجھ کو

کھوئے ہوئے سے رہنماؤں کو، روتے پھرنا راتوں کو — جو ہیں عاقل وہ کیا سمجھیں عشق و جنوں کی باتوں کو

موج بادہ رنگیں ہے، اس قدر کہاں رنگیں — اُس کے لعل لب دیکھو جب وہ مسکراتا ہو

پھول ڈوبا ہوا گلاب میں تھا — اُف وہ چہرہ حجاب آلودہ

فانوس کے پردے میں تو شمع کی تھرائی — اللہ رے انداز جانسوزیِ پروانہ

سب تیری بدولت ہے جو زیست میں لذت ہے — اے باعث محرومی، اے ہمت مردانہ

نہ رہا جب کوئی پردہ باقی، — بن گئی تیری تمنا پردہ،

وہ سوز و ساز محبت کا آخری منظر — کنار شمع فسردہ، مزار پروانہ

تمام عمر اخترؔ جس کی راہ دیکھی تھی — ادھر سے آج وہ گزرا تو مثل بیگانہ،

اُٹھا دے قید سبو و شراب و ساغر کی — بلند اور ذرا کر مذاق رندانہ

جنوں کے جوش میں اپنی بلائیں لیتا ہے — کہا جو ناز سے تم نے اخترؔ کو "دیوانہ"

گزرا ہوا زمانہ خارج ہے زندگی سے — کیوں یاد کر رہا ہے گزرا ہوا زمانہ

دیکھو نہ آنکھ بھر کے کسی کی طرف کبھی — تم کو خبر نہیں جو تمھاری نظر میں ہے

جھلملاتے ہوئے تارے کیا ہیں ؟ — ملگجے پھول ترے بستر کے

اے حسیں ہم واقف آداب مجلس ہیں، مگر — اس قدر پیار آ گیا منھ تیرا تکتے رہ گئے

تیری مرضی ہو جہاں بھیج دے اے داور حشر — مجھسے دہرائی نہ جائیں گی خطائیں اپنی

آستاں بوسیِ دلدار نہیں قسمت میں — آؤ اک سجدہ سر راہگزر ہو جائے

دل مجھے سنبھالے تھا، دل کو میں سنبھالے تھا — ناگہاں ہوا آئی جانب گلستاں سے

لیے کلام رہی سہی، رشک سے مر رہا ہوں میں — کیوں کہو بات بات پر "دیکھو بھلا سا نام ہے"

ادب لاکھ تھا پھر بھی اُس کی طرف — نظر میری اکثر بھٹکتی رہی،

قاصد پیام اُن کا نہ کچھ دیر ابھی سنا — رہنے دے محوِ لذتِ ذوقِ خبر مجھے

جب کہا اُس نے مدعا کہئے — سوچتے رہ گئے کہ کیا کہئے

جانتا ہوں کہ نشیمن نہیں باقی صیاد — پھر بھی اک لطف خلش حسرتِ پرواز میں ہے

ز ہے کہ تصور کی ترے جلوہ گری ہے — دیوانہ ہوا جاتا ہوں، آواز سنا دے

خاکسترِ پروانہ میں بھی آگ دبی ہے — اے بادِ صبا دیکھ کے دامن کی ہوا دے

بے وفا ٹوٹے ہوئے دل کو مرے نام نہ رکھ — حسن ہے دل کے لئے، عیب ہے ساغر کے لئے

اک روز دل میں تیری محبت تھی جاگزیں، — اب تو ہی تو ہے، تیری محبت نہیں رہی

میں کیا سناؤں دردِ محبت کا ماجرا — حد ہوگئی کہ تم سے شکایت نہیں رہی

ایک سجدے سے زیادہ عشق میں جائز نہیں — ورنہ آلودہ جبینِ بندگی ہو جائے گی

ظہورِ عشق، حقیقت طراز تھا، ورنہ — یہ دلکشی کہیں دار و رسن میں آئی ہے

مذاقِ عشق ہو کامل تو صورتِ شبنم — کنارِ گل میں رہے اور پاکباز رہے

دلیلِ راہِ محبت ہے شوقِ بے پایاں — خود اپنے نقشِ قدم پر سرِ نیاز رہے

ہوا تو حشر کے دن اُن کا سامنا لیکن — ہجومِ عام میں کیا عرضِ مدعا کرتے

وہ بے وفا ہیں کہ ہم بے وفا، خدا جانے — حیات ختم ہے اور اُن کی آمد آمد ہے

دل سے رخصت ہر اک امید ہوئی — آج ہم غمزدوں کی عید ہوئی

دور سے گاہ گاہ ایک نگاہ! — اس کو بھی مدت، مدید ہوئی،

دلِ غمدیدہ کانپ کانپ اُٹھا — یاس کے بعد جب امید ہوئی

شبِ انتظار گزر گئی، خلشِ انتظار کی ہے وہی — بھری نیند ہے مری آنکھوں میں مگر آنکھیں ڈھونڈتی ہیں خواب ہے

اب آئے بہار یا نہ آئے — آنکھوں سے لہو ٹپک رہا ہے

کس نے وحشی اثر کو چھیڑا — دیوار سے سر پٹک رہا ہے

کچھ روز یہ بھی رنگ رہا انتظار کا، — آنکھ اُٹھ گئی جدھر بس اُدھر دیکھتے رہے

پھر اثر ہیں اور توجیہ ستم، — پھر بڑھا ربط اُس بتِ عیار سے

پھر نہ آئے جو وعدہ کر کے گئے — آج کا دن ہے اور وہ دن ہے

رن کہتا ہے کہ موت انجام ہونا چاہیئے
زندگی کا زندگی پیغام ہونا چاہیئے

برے ہونٹوں کا تبسم، تیری آنکھوں کا خمار
ان کو بھی ساقی شریک جام ہونا چاہیئے

میں کہوں کیا وہ شوخ کیا سمجھے
بے کہے کاشش مدعا سمجھے

ایک اُچٹتی سی نگہ پر ہے یہ بیتابیٔ دل
حال پوچھے کوئی اسوقت تو مشکل ہو جائے

میں مرگ و زیست اس کے سوا جانتا نہیں
آیا تری پناہ میں تیری پناہ سے

تاثیر درد دل میں یارب کہاں کی بھر دی
اُس نے بھی آج آخر چپکے سے آہ کر دی

تعبیر حرف و صوت کوئی کس طرح کرے
عالم تمام اک سخنِ نا تمام ہے

وہ کام کر بلند ہو جس سے مذاق زیست
دن زندگی کے گنتے نہیں ماہ و سال سے

آغازِ محبت کی لذت انجام میں پانا مشکل ہو
جب دل کو مسوسے رہتے تھے اب ہاتھ لگانا مشکل ہو

جو عشق کے فن کے ماہر ہیں اُن سے پوچھو، تم کیا جانو
کب اشک بہانا مشکل ہے اور کب پی جانا مشکل ہو

تری نظر نہیں ہوتی حریف شوخی کی
نظر سے آج یہ کس کو گرا دیا تو نے

خطا معاف مری بیکسی پہ کر کے نظر
کچھ اور حوصلۂ غم بڑھا دیا تو نے

دم خواب ہے دست نازک جبیں پر
کرن چاند کی گود میں سو رہی ہے

مشکل سے جو اُٹھی تھیں پلکوں کے سہارے سے
ملتے ہی اُن آنکھوں کے جھک جانے کو کیا کہئے

جب دل کے دھڑکنے میں آغوش کی تنگی تھی،
آغاز محبت کے افسانے کو کیا کہئے

ہائے اُن کی شوخیاں اور شوخ کی رسوائیاں
دیکھتے تھے وہ ہمیں، ہم اُن کو کیونکر دیکھتے

اُن کے آنے کی بندھی تھی آس جب تک ہمنشیں
صبح ہو جاتی تھی اکثر جانب در دیکھتے

وہ دل ہی کیا جو دید کا ساماں نہ کر سکے
نظارے کو تمام گلستاں نہ کر سکے

ایماں غلط، اصول غلط، ادعا غلط
انساں کی دلدہی اگر انساں نہ کر سکے

مژگاں سے یوں ٹپک پڑا اک اشک غم آخر
ٹپکا ہو جیسے جام کسی بادہ خوار سے

کچھ دیر فکر عالم بالا کی چھوڑ دے
اس انجمن کا راز اسی انجمن میں ہے

نظر اُس حسن تاباں تک بآسانی نہیں جاتی
مگر جا کر پلٹتی ہے تو پہچانی نہیں جاتی

ہوئی مدت کہ اُس نے ناز سے دامن کو جھٹکا تھا
ابھی تک موجۂ گل کی پریشانی نہیں جاتی

مری حسرت نہ پوچھو، شمع سوزاں کی طرف دیکھو
کہ ہے بے آشیاں لیکن پرافشانی نہیں جاتی

جو بستر ہو تو اُس در پر، جو تکیہ ہو تو اُس در کا،
نہیں جاتی اثر فکر تن آسانی نہیں جاتی

سہمی ہوئی تھی صبح کی پہلی کرن کی طرح
اُن کی طرف نگاہ جو پہلے پہل گئی

کچھ اور بڑھ گئی ہیں پریشاں نگاہیاں
دم بھر جو تیرے غم سے طبیعت بہل گئی

ہنوز آوارہ و رسوا ہے کوئے ناشکیبی میں
نہ سمجھا عشق شوریدہ کہ دل تیرا شبستاں ہے

ابھی جلووں کی حاجت ہے پئے تسکین نظارہ
ابھی چشم تماشا سے جو پنہاں تھا وہ پنہاں ہے

مقصود زندگی کا بیداری خودی ہے
اس سے بے خبر وگرنہ بے سود زندگی ہے

محرومیوں کے ہوتے سرشاری تمنا
کچھ اُن کی شوخیاں ہیں کچھ اپنی سادگی ہے

کبھی ہم جو اُس بزم میں بول اُٹھے ہیں
تو اک شور تا دیر برپا رہا ہے

اثر کو وہ خنجر سے دھمکا رہے ہیں
وہی اپنے سائے سے ڈر جانے والے

تیرے نثار تو بھی اپنی زباں سے کہہ دے
اک خلق مجھکو تیرا دیوانہ کہہ رہی ہے

اک تڑپ سی ہے کہ الٰہی توبہ
گو نہیں اشک، روانی ہے وہی

اتنی ہو مخمور اے چشم جاناں
پھولوں میں تلنے لگے خوش نگاہی

اللہ ری بدگمانی، دیتا ہوں جب دعائیں
کہتا ہے چپکے چپکے اس میں بھی کچھ دغا ہے

یہ بھیگی رات اور یہ برسات کی ہوائیں
جتنا بھلا رہا ہوں وہ یاد آرہا ہے

عشق ہے اک نشاط بے پایاں،
شرط یہ ہے کہ آرزو نہ رہے

تم کو ہے فکر تن آسانی اثر
زندگی قربانیوں کا نام ہے،

وہ جلد جلد بدلتا ہوا زمانہ ہے
کہ آج ہے جو حقیقت وہ کل فسانہ ہے

نہ پوچھ سادگی شوق، مان جاتا ہوں
یہ جانتے ہوئے وعدہ فقط بہانہ ہے

چل گیا اُس نگاہ کا جادو
کہہ گئے دل کی بات کیا کہئے،

جب تک اُس کی بات کا میں دوں جواب
اتنے عرصے میں قیامت ہوگئی

یاد کر لے بھولنے والے مرے
اب تو بچھڑے ایک مدت ہوگئی

دلنوازی میں بھی ایذا ہے، محبت کی قسم
تجھکو فرصت جو کبھی شغل ستمرانی دے

کچھ تری چشم فسوں ساز کا ایما نہ کھلا،
لب مینوش کو تکلیف گل افشانی دے

آؤ شیرازۂ ہستی کو پریشان کردیں
یوں کہ اُس زلف کو پیغام پریشانی دے

نہ جانے بات یہ کیا ہے تمھیں جب دل سے دیکھا ہے
مری نظروں میں دنیا بھر حسیں معلوم ہوتی ہے

اپنی لذت میں گم ہوئے تھے
اب خموشی سخن سے بہتر ہے

احسان دانش (وفات ۲۱ مارچ ۱۹۸۲ء)

احسان دانش

میرا نام احسان الحق ہے اور والد کا نام قاضی دانش علی۔ سنہ پیدائش ۱۹۱۴ء ہے۔ آبائی وطن قصبہ باغپت ضلع میرٹھ ہے، والد صاحب وہاں سے سکونت ترک کرکے کاندھلہ چلے آئے تھے۔ کاندھلہ (ضلع مظفرنگر یو۔پی) میرے نانا ابوعلی شاہ صاحب کا وطن ہے جو ایک معمولی سپاہی تھے۔

میرے والد قاضی دانش علی اچھی خاصی جائداد کے مالک تھے لیکن کم علمی اور شرافت نے تمام جائیداد سرمایہ دار اقرباء کے قبضہ میں پہونچادی اور جب میں نے ہوش سنبھالا تو میرے والد صاحب ایک ٹھیکہ دار کے پاس مزدوروں کے جماعت دار تھے اور جب ٹھیکہ ختم ہو جاتا تھا تو خود بھی بیلچے اور پھاوڑے سے مزدوری کرنے میں دریغ نہ کرتے تھے۔

اسکول میں مجھے تیسری جماعت تک تو کوئی احساس نہ ہوا لیکن جب تیسری جماعت پاس کر چکا تو مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ والد نے والدہ سے کہا کہ احسان نے تیسری جماعت تو پاس کرلی ہے اب چوتھی جماعت کی کتابوں کے لئے رقم کہاں سے آئے۔ والدہ یہ سنکر کچھ دیر تک تو خاموش رہیں اور پھر جس قدر تانبے کے برتن تھے لاکر ڈھیر لگا دیا اور کہا کہ ہم مٹی کے برتنوں میں بھی کھانا کھا سکتے ہیں لیکن احسان کو یہ عمر کہاں نصیب ہوگی۔

یہ دیکھ کر مجھے پہلی دفعہ والدہ کی محبت اور اپنی مفلسی کا احساس ہوا، میرے غریب والدین چوتھی جماعت کے بعد مجھے تعلیم نہ دلا سکے اور میں بھی اپنے والد صاحب کے ہمراہ مزدوری پر جانے لگا۔

میرے والد صاحب کو اول سے کتابیں سننے کا شوق ہے چنانچہ میں تمام دن مزدوری کرتا اور شام کو اپنے والد صاحب اور اُن کے چند دوستوں کو جو شام کو بیٹھک میں آجایا کرتے تھے کتابیں پڑھکر سناتا۔ فسانۂ عجائب، آرائش محفل، قصہ ممتاز الف لیلہ۔ اور فسانۂ آزاد، اور منظوم کتب میں سے مثنوی میر حسن، نل دمن، دیوان میر تقی، دیوان نظیر اکبرآبادی اور کلام انیس کا مطالعہ اُنھیں دنوں کا ہے اور یہ تمام کتابیں قبلہ قاضی محمد ذکی صاحب ذکی مرحوم کے کتب خانہ سے آتی تھیں جو میرے اُستاد تھے۔

قاضی محمد ذکی کاندھلہ کے رؤسا میں سے تھے اور پرانی وضع کے بہترین شاعر اور شاعر سے زیادہ انسان مہمان نوازی دوست پروری اور شاعرانہ و ابادیوں اُن میں بدرجہ اتم موجود تھا عمر کے آخری تیس پینتیس سال تک وہ گوشہ نشین رہے

اور ۱۹۳۰ء میں انتقال ہوا لاولد ہونے کے باعث اُن کی تمام ترجائیداد پر ہنوز حکومت کا قبضہ ہے۔

مجھے مزدوری کی کمیابی نے میونسپلٹی کی چپراس باندھنے پر مجبور کردیا لیکن افسران کے برتاؤ اور اعزہ کی سفاکی نے وطن ترک کرا کے لاہور لا پھینکا اُس وقت میرے والد ضعیفی کے باعث مزدوری کے قابل نہ رہے تھے۔

لاہور میں آکر بھی مجھے اُسی آبائی کام یعنی معماروں کے پاس اینٹیں اُٹھانے کی مزدوری کے سوا کوئی ذریعہ معاش نہ ملا دیال سنگھ کالج کی لائبریری، پنجاب یونیورسٹی کا دفتر و لیبارٹری کے علاوہ اور بہت سی عمارات پر مجھے مزدوری کرنے کا فخر حاصل ہے۔ کتابیں پڑھنے کا مجھے اول سے ایسا چسکا تھا کہ مزدور دوپہر کو آرام کیا کرتے تو میں کتابیں پڑھنے میں مصروف رہتا کبھی کبھی اس عالم میں دیکھ کر ٹھیکہ دار کہا کرتا کیوں بے احسان منشی بنے گا؟ اور میں یہ سنکر خاموش ہوجاتا۔

مزدوری سے ترقی کرتا رفتہ رفتہ معماری تک پہونچ گیا لیکن اسوقت مجھے پستی اور بلندی میں اچھا خاصا امتیاز ہوگیا تھا چنانچہ علم کو مقصدِ زندگی قرار دیکر معماری تو ترک کی اور لاہور کی مشہور سیرگاہ شملہ پہاڑی پر چوکیداروں میں نوکر ہوگیا۔ وہاں شام کے سات بجے سے میں ڈیوٹی پر جاتا اور صبح سات بجے تمام رات پاسبانی کرکے اپنے مکان پر لوٹ آتا۔

مکان میں کئی جے پور کے دیہات کے مزدور رہتے تھے اور میرے حصہ میں اُس مکان کا ایک غسلخانہ تھا جس کا کرایہ میں چھ آنہ مہینہ ادا کرتا تھا، جگہ کی قلت کے باعث اُس میں چارپائی کی گنجائش نہ تھی اس لئے ایک بوریا ہی میرا بستر تھا، اُن دنوں سے آج تک میں زمین پر سوتا ہوں۔

چوکیداری کی راتوں کا سناٹا مفت کی سرکاری روشنی اور مصروف تنہائی مجھے ابھی تک نہیں بھولتی۔ اُن دنوں چار سو ساڑھے چار سو صفحات کا یومیہ مطالعہ میری زندگی کا معمول تھا۔

چوکیداری کی جگہ تخفیف میں آجانے کے بعد مجھے ریلوے دفتر میں چپراسی کی جگہ ملی اُسوقت چند لکھے پڑھے آدمیوں سے میرے تعلقات ہوگئے تھے شعر و شاعری کا شوق یوں تو مجھ میں اول سے قبلہ قاضی محمد ذکی صاحب ذکی کے فیضِ صحبت سے بیدار تھا اور جب کوئی اچھا شعر سنتا تو بیتاب ہوجاتا مصرعے تو اکثر اور کبھی کبھی پورا شعر اور بعض اوقات دو دو تین تین شعر بلا تکلف ہوجایا کرتے تھے لیکن چونکہ اپنے شاعر ہوجانے کا یقین نہیں تھا اس لئے نہ تو وہ شعر محفوظ ہیں اور نہ یاد کہ شعر کب سے کہتا ہوں۔ گھر اور دوستوں میں بھی کوئی ایسا شخص نہ تھا جسے یہ خیال ہوتا، لاہور کے دورانِ تعلیم میں بھی میرے دوست توقیر طاہر گنگوہی کے سوا کوئی ایسا نہیں جس نے میری حوصلہ افزائی کی ہو اور وہی شخص مجھے پہلی بار کھینچ تان کر لاہور کے ایس۔ پی۔ ایس کے ہال کے مشاعرہ میں لیکر گیا اور مجھ سے میری ایک غزل پڑھکر پبلک سے روشناس کرایا اور اُسی دن سے مجھے یہ بھی احساس ہونے لگا کہ میں شاعر ہوسکتا ہوں اور اُسی بنا پر مطالعہ میں اس قدر منہمک ہوگیا کہ آج تک چوبیس گھنٹے میں سے صرف چار گھنٹے آرام کرتا ہوں اگرچہ مشق کے طور پر اشعار تو نہ جانے کتنے کہے ہوں گے لیکن جو کہتا تھا اُن میں توقیر طاہر صاحب جو اچھا شعر سمجھتے تھے وہ رکھ لیتے تھے اور جو بے معنے ہوتا وہ ضایع کردیتے۔ وہ شاعر ہوں یا نہ ہوں

لیکن شعر فہم ایسے اچھے ہیں کہ اُن کے انتخاب کو ہر بیدار دماغ پسند کرتا ہے۔ میرا آج تک کا جس قدر کلام ہے وہ تمام تر جناب توقیر طاہر کی توجہ اور احتیاط کا نتیجہ ہے۔

تفریح پسند دوستوں اور دفتر میں کلرکوں کے روپیہ نے مجھے چپراس سے دستبردار کر کے باغبانی پر مجبور کیا اور میں گورنمنٹ ہاؤس لاہور میں ایک باغبان کی معاونت میں کام کرنے لگا لیکن عہدہ داران کی بخی خدمات اور جمعداروں کی بیجا چاپلوسی کی خواہش نے بہت جلد یہ کام بھی چھڑوا دیا اور پھر میں بیس روپیہ ماہانہ پر گیلانی بکڈپو میں ایک عرصہ تک ملازمت کرتا رہا لیکن پھر تنخواہ میں تاخیر شروع ہوئی اور ہوتے ہوتے یہاں تک نوبت پہونچی جب چار ماہ تک تنخواہ سے محروم رہا تو وہاں سے بھی دامن کش ہوا اور مکتبۂ دانش کے نام سے اپنا ذاتی کتبخانہ قایم کیا اب اُسی کی تعمیر میں اپنی تمامتر قوتوں سے منہمک ہوں۔

میرا سرمایۂ شعری زیادہ تر نظموں پر مشتمل ہے، لیکن چونکہ خواہش صرف غزلوں کے انتخاب کی ہے اس لئے جو کچھ کہی ہیں ان میں سے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

احسانؔ دانش۔ ۱۹ر اگست سنہ ۴۰ء

نظر پہ جلووں کی حکمرانی دلوں پہ مایوسیوں کا پانی
اگر چھڑا لے امید دامن کہاں ٹھکانا ہے آدمی کا

زمیں کے ذروں پہ خواب طاری فلک پہ تاروں کی بند آنکھیں
یہ زندگی کی سحر ہے کیسی سماں ہے سب شامِ زندگی کا

ہو ختم اب جانکنی کا منظر نگاہ سجدے میں جھک گئی ہے
خدا خدا کر کے مدتوں میں خمار ٹوٹا ہے زندگی کا

دلوں کے دِ ولتکدے ہیں خالی وفا کے جوہر نہیں کسی میں
دہائی اے دشمنوں دہائی فریب خوردہ ہوں دوستی کا

ہر ایک سجدہ ہوا نمایاں خودی کے دامن پہ داغ بنکر
خدا سے بھی منحرف ہوں جب سے مآل دیکھا ہے بندگی کا

خدا کی دین ہے وہ عجزِ عشق بھی جس میں،
غرورِ حسن کے انداز پائے جاتے ہیں

فغاں فغاں! کہ جنھیں مارِ آستیں کہئے
وہ لوگ میرے رفیقوں میں پائے جاتے ہیں

مری وفا پہ نہ جا حسن کی شکست کو نہ دیکھ!
تری جفا کے قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

اگرچہ اب مجھے غم راس آگیا لیکن،
کسی کے لطف و کرم یاد آئے جاتے ہیں

وصال و ہجر کے پردے میں رات دن احسانؔ
حیات و موت کے خاکے بنائے جاتے ہیں

خیال سود و زیاں عبث ہے گھرا ہوا ہے الم کا بادل
بدلنے والا ہے وقت گردش جو مسکراتا ہو مسکرا لے

عبادتیں کر کے اپنے آگے دعا میں دستِ سوال کیسا
سر تکبر کبھی تو آخر خدا کی درگاہ میں جھکا لے

میں اُسکی شانِ کرم کے صدقے دیا بھی احسانؔ مجھکو کیا کیا
خموشیوں کی فغان پیہم، سکوں کی آہیں نظر کے نالے

وصل کا خواب کجا لذتِ دیدار کجا،
ہے غنیمت جو ترا درد بھی حاصل ہو جائے

ضبط بھی صبر بھی امکان میں سب کچھ ہے مگر — پہلے کمبخت مرا دل تو مرا دل ہو جائے
آہ اس عاشقِ ناشاد کا جینا اے دوست — جس کو مرنا بھی ترے عشق میں مشکل ہو جائے

شباب ہو محبت سے مانوس ہو کر — مآلِ محبت سے گھبرا رہا ہوں،
نہ جانے محبت کا انجام کیا ہے — میں اب ہر تسلی سے گھبرا رہا ہوں

ہیں قصرِ محبت کے معمار دونوں، — نگاہوں کا دھوکا، دلوں کی خرابی
ہر اک شئے میں تم مسکراتے ہو گویا — ہزاروں حجابوں میں یہ بے حجابی،
ابھی تک نگاہوں میں چھائی ہوئی ہے — وہ مستی میں ڈوبی ہوئی نیم خوابی،

ب تو ہر دھڑکن کسی کے پاؤں کی آواز ہے — دل میں یارب کون معروفِ خرامِ ناز ہے
ماصلِ صد گفتگو ہے عشق میں مہرِ سکوت — ہر نگاہِ آرزو فریاد بے آواز ہے
الب خلد نظر، جشنِ بہاراں پر دیپول ا — یہ چمن کے دردناک انجام کا آغاز ہے،
پاندکیا شئے ہے ترا دھندلا سا اک نقشِ قدم — چاندنی کیا ہے تری گردِ خرامِ ناز ہے
شق کا وجدان ہر پہلو سے ہے بے قید و بند — حُسن کو جس رُخ سے دیکھوگے اسیرِ ناز ہے
سے مجھے ان ڈوبتے تاروں سے پھر آواز دے — سو گیا عالم تمنا گوش بر آواز ہے
رفشانی کا جہاں جبریل کو یارا نہیں — عشق کو ان رفعتوں میں رخصتِ پرواز ہے

ہماری رضا جوئیوں کو دعا دے — ترے ناز کو بے نیازی سکھا دی
مری آرزو ہے وہ تعمیرِ خستہ، — وفا نے بنائی تغافل نے ڈھا دی
ترے حُسن کی آتشیں چشمکوں کو، — جگر نے سراہا نظر نے دعا دی
رہا گرچہ احسان دشمن زمانہ — مٹے اس طرح اُن پہ ہستی مٹا دی

تھی آرزو کبھی کہ جبیں آستاں پہ ہو، — اب تو یہ ہے جبیں نہ رہے آستاں رہے
اس دل کا جس میں دفن ہیں مقتول حسرتیں — آخر ترا خیال بھی کیوں بدگماں رہے
احسان اس ہجومِ تصور کو کیا کروں، — یہ بجلیاں بھی ساتھ رہیں ہم جہاں رہے

ہونچنے ہی کو ہیں مترِ سکوں تک مضمحل نبضیں، — تمہیں ہنستا ہے ہنس لو دو گھڑی حالِ پریشاں پہ
ل میں زندگی کی ضو سے دُنیا جگمگا اُٹھی، — قضا نے قہقہہ مارا مگر انجامِ انساں پر
یں گلشن کہیں قوسِ قزح کی رنگ افشانی — حکومت ہے تری رعنائیوں کی چشمِ انساں پہ
کرنا تھا ترے دیوانگانِ عشق کر گزرے — سحر اب حشر تک ہستی رہے چاکِ گریباں پہ

میں نازِ ناخدا احساںؔ آخر کیوں اُٹھاؤں گا
بھروسا ہے مری غرقابیوں کو زورِ طوفاں پر

ہوتے جدا نہ کاش ابھی گلستاں سے ہم
پردہ اُٹھا رہے تھے بہار و خزاں سے ہم
تم جس گھڑی سے تھے بچھڑنے کے واسطے
اب اس گھڑی کو ڈھونڈ کے لائیں کہاں سے ہم
منسوخ کفر و دیں کے فسانے ہیں اس جگہ
باہر ہیں اب احاطۂ کون و مکاں سے ہم
آغاز کا ثبوت نہ انجام کا یقین،
ایسے کٹے ہوئے ہیں کسی داستاں سے ہم
احساںؔ کھُلنے والا ہے بابِ حریمِ قبر
اُترے کھڑے ہیں توسنِ عمرِ رواں سے ہم

وہ سو کر اُٹھ رہے ہیں اللہ اللہ کیا نظارا ہے
قیامت نے ابھی کروٹ بدل کر سر اُبھارا ہے
جوانی نے اُسے اس خوش مذاقی سے سنوارا ہے
نہ عرضِ شوق کی جرأت، نہ ضبطِ غم کا یارا ہے،
سحر ہوتے ہی وہ اس طرح شرما کر سدھارا ہے
کہ مجھکو عمر بھر اب رنجِ محرومی گوارا ہے
کہاں صحرا نوردی اور کہاں دیدار کی حسرت
مری دیوانگی تیرے تغافل کا اشارا ہے،
معطر سانس، چہرہ رشکِ گل، مستی بھری آنکھیں
جوانی ہے کہ اک سیلابِ رنگ و بو کا دھارا ہے
تمھاری یاد ہے میری کتابِ غم کا دیباچہ
خدا رکھے یہی ٹوٹے ہوئے دل کا سہارا ہے
ستم کو کیا ستم سمجھوں جفا کو کیا جفا جانوں ؟
وہی جورِ آشنا جب زندگانی کا سہارا ہے ؟
ہوا مغموم، منظر مضمحل، ماحول افسردہ
مجھے اے ناخدا کس گھاٹ تونے لا اُتارا ہے؟
وفا کی آرزو لغزش ہے اک خوش اعتقادی کی
مجھے احساںؔ اکثر دوستوں نے مل کے مارا ہے

مہتاب کے جلوؤں میں اُف سوئی ہوئی کلیاں
آغوشِ گلستاں ہے تصویرِ ہم آغوشی
جلوؤں سے ترے روشن قندیلِ تخیل ہے،
احساںؔ سے کب ہوگی احسان فراموشی

وہ عشق خاکِ عشق ہے، وہ حُسن خاکِ حُسن ؟
جو قید ہو فسانۂ ہجر و وصال میں
ہو سوئے آسماں جو دعا کے لئے بلند
یہ پستیاں کہاں مرے دستِ سوال میں

خزاں کو دے مرے گلزار کے لئے تکلیف
ہے یہ بہار کا ہنگامہ ناگوار مجھے
ستم کہ یہ ہے مرے جبر و اختیار کا حال
نہیں ہے جبر سی شئے پر بھی اختیار مجھے
بڑا کرم ہے کہ بخشا ہے اک دلِ بیتاب
مگر گھٹا کے جنوں کر نہ شرمسار مجھے
کہیں فریبِ نظر ہے کہیں فریبِ خیال
نہیں طلسمِ دو عالم پر اعتبار مجھے
دلِ حزیں تری گہرائیوں میں پچھلی رات
پکارتا تھا مرا کون غمگسار مجھے
وہ دل پہ چھایا ہے احساںؔ یاس کا عالم
صدائے سازِ طرب بھی ہے ناگوار مجھے

مجھے چپ سمجھنے والے تجھے کیا خبر کہ گم ہے، ترے نغمۂ سحر میں مرا نالۂ شبانہ
تجھے کس طرح بتاؤں کہ ہے محترم کہاں تک مرے عشق کی نظر میں ترے حسن کا زمانہ
غم ہجر بے اثر ہے جو ہو ذوقِ وصل کامل مجھے یادِ گلستاں میں ہے قفس بھی آشیانہ
یہ اُڑی اُڑی سی رنگت یہ کھُلے کھُلے سے گیسو تری صبح کہ رہی ہے تری رات کا فسانہ

ترے فیضِ قدم سے اے بہارِ گلستاں پرور! بقدرِ چاک دل چاکِ گریباں دیکھ لیتا ہوں
نشیمن کے وہ بے ترتیب تنکے ہائے کیا شے تھے قفس میں آج تک خوابِ گلستاں دیکھ لیتا ہوں
نظر کرتا ہوں جب عقبیٰ کے حیراں کن فسانوں پر شبِ ہستی میں اک خوابِ پریشاں دیکھ لیتا ہوں
اسیری میں سکوں مشقِ تصوّر کا کرشمہ ہے، چمن اندر چمن تا حدِّ امکاں دیکھ لیتا ہوں
نہیں احساںؔ اب وہ مجلسِ احباب پہلی سی میں اب انساں سے پہلے ظرفِ انساں دیکھ لیتا ہوں

آرزو اک جرم ہے جس کی سزا ہے زندگی زندگی بھر آرزوؤں کو پشیماں کیجئے
ذرّے ذرّے میں ہیں احساںؔ اسکے جلوے آشکار دیکھئے اور دیکھ کر تکمیلِ ایماں کیجئے

عشق کو تقلید سے آزاد کر دل سے گریہ، آنکھ سے فریاد کر
اے خیالوں کے مکیں نظروں سے دور میری ویراں خلوتیں آباد کر
حسن کو دنیا کی آنکھوں سے نہ دیکھ اپنی اک طرزِ نظر ایجاد کر

بھٹکا ہوں اپنی منزلِ مقصد سے بارہا آسان جان کر کبھی دشوار دیکھ کر
غربت کی دوپہر میں خیالِ وطن نہ پوچھ! گر گر پڑا ہوں سایۂ اشجار دیکھ کر
احساںؔ جس مکاں میں کبھی جشنِ شوق تھا روتا ہوں اُس کے اب در و دیوار دیکھکر

خلوت میں زور پر ہے صنم سازیٔ خیال نظارہ سے عزیز حجابِ نظر ہے آج
پھیلا دیا ہے عشق نے دامِ فریبِ جذب ہر برق بیقرار شکارِ نظر ہے آج
احساںؔ دل میں یاس ہے چہرے پہ بیکسی پنجاب میں یہ قیمتِ علم و ہنر ہے آج
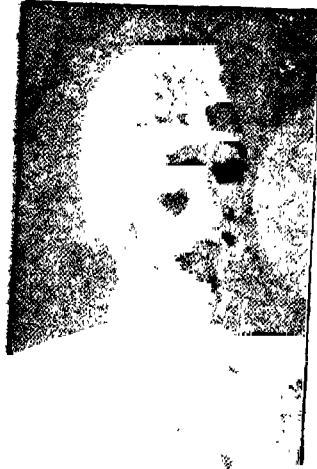
علی اختر۔ اختر (۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان چلے گئے، اور وہیں وفات پائی)

علی اختر اختر

میرا نام علی اختر ہے اور وطن علیگڑھ۔ [illegible] میں بمقام ریاست رامپور پیدا ہوا۔ کچھ دن علیگڑھ میں تعلیم پائی اور اُس کے بعد ننہال کے تعلق سے آگرہ سینٹ جانس کالج میں رہا۔

فارسی اور عربی کا درس مولانا نصیر الدین صاحب سے حاصل کیا تھا اور اُس زمانہ کی مروجہ تکمیل کے بعد اسکول میں داخل کیا گیا تھا۔ کالج کے ابتدائی ایام ہی میں سل میں مبتلا ہو گیا، جس کی وجہ سے ایک سال تک تعلیم بند رہی، پھر حالات بدل گئے اور طبیعت اُدھر رجوع نہ ہو سکی۔ غالباً [illegible] یا [illegible] سے حیدرآباد میں بہ سلسلۂ ملازمت مستقلاً قیام پذیر ہوں۔

شعر مجھے خود یاد نہیں کہ کس عمر سے کہہ رہا ہوں، میرے گھر میں شعر و ادب کی فضا پہلے سے مرتب تھی اس لئے میری شاعرانہ فطرت کو اس سے بہت مدد ملی۔ شاید (۱۴) (۱۵) سال کی عمر کے دو شعر حافظہ میں ہیں، جنھیں ذیل میں لکھتا ہوں:

قفس میں سمجھے تھے ہم کہ حالت رہین امن و اماں رہیگی　　کسے خبر تھی کہ برق اب بھی نگاہ بر آشیاں رہے گی

ڈوبی ہوئی پاتا ہوں، نبض دل دیوانہ　　ہلکی سی پھر اک جنبش اے جلوۂ جانانہ!

لیکن ایک عجیب بات یہ ہے کہ میرے خاندان کے دوسرے افراد، خود دو بزرگ عام طور پر وہی داغ اور امیر کے راستوں پر چل رہے تھے، لیکن اس نوع کی شاعری سے مجھے ابتدا ہی میں کوئی دلچسپی نہ ہو سکی [illegible] وغیرہ کے ابتدائی نمبروں میں بھی میری نظمیں شایع ہوتی رہتی ہیں، یہ واقعہ بھی شاید [illegible] یا [illegible] کا ہے۔ چنانچہ 'بہار کا آخری پھول' کے عنوان سے جو نظم لکھی اُسے قبول عام بھی حاصل ہوا تھا۔ یہ ہیں میرے مختصر حالات۔

اب انتخاب ملاحظہ ہو:

علی اختر اختر

میں ترے عشووں سے آشنا ہوں یہ راز پنہاں سمجھ رہا ہوں　　کہ میری اس نارسی میں بھی ہے کوئی اشارہ ضرور تیرا

حریف آگاہ عشق کب تھے یہ راز تو نے انھیں بتایا　　نہ جانے کیوں میری وحشتوں سے اُلجھ پڑا اضطراب تیرا

دل کی آرزو کی تھی درد بے دوا پایا
کیا سوال تھا میرا اور کیا جواب اُن کا

عشق کی لطافت کو خاکِ طور کیا جانے
مجھ پہ تھی نظر اُن کی مجھ سے تھا خطاب اُن کا

عالم تمنا ہے، خواب کا سا اِک عالم
شوق نا تمام اپنا، عشوہ کامیاب اُن کا،

منت کش نظارہ ہے جب تک نگہ شوق
نظارۂ نقابِ رُخِ جاناں نہ رہے گا،

کبھی مقابلِ ذکر تھا حالِ دل
اب آزاد شرح و بیاں ہوگیا،

کوئی اور طرزِ ستم سوچئے،
دل اب خوگرِ امتحاں ہوگیا،

بیگانۂ احساس سہی سینۂ ہستی
جیتے ہیں کہ مایوس ہوا بھی نہیں جاتا

بیخودی نے توڑ دیں جب عشق و عرفاں کی حدیں
خود بخود برہم نظامِ دانش و دل ہوگیا

بیگانۂ شوقِ جلوہ گری وہ حسن خود آرا نہ ہوسکا
آئینہ سے نظریں ہٹ نہ سکیں، آئینہ سے پردا ہو نہ سکا

نہیں کچھ منحصر اس پر کہ غم سہنا نہیں آتا
مجھے اے تلخیِ ایام خوش رہنا نہیں آتا

رہی مظلوم چپ پر، شادمانی کا گماں کیوں ہو
کہ نا اُمیدیوں سے زخم کو بہنا نہیں آتا

نہانِ اعتبار میں، اسیرِ دامِ ہوش ہوں،
گماں سے ہے اضطراب پہ سکونِ اضطراب کا

محبت نام ہے احساسِ غم کی اک لطافت کا
کہ غم ہوتا ہے احساسِ غم پنہاں نہیں ہوتا

عشق حریفِ جاں سہی، فکرِ مآل کا رکیا،
دانش خود فریب کون ؟ ہوش کا اعتبار کیا

حیف وہ رند نامراد جس نے اُٹھا کے جام سے
ہاتھ سے پھر گرا دیا، رنجِ خمار دیکھ کر

تجھ سے حیات و موت کا مسئلہ حل اگر نہ ہو
زہرِ غمِ حیات پی موت کا انتظار کر

دیکھ بساط اُلٹ نہ جائے عالمِ عقل و ہوش کی
چاک نہ اے جنونِ شوق پردۂ امتیاز کر

عشق، بقدرِ آرزو تشنۂ زخم ہے ابھی
تیرِ نگاہِ ناز کو اور بھی دل نواز کر

اب وہ مآل کچھ سہی، شمع جلی تو ایک رات
آہ کہ بجھ کے رہ گئے پہلے ہی امتحاں سے ہم

جنوں نے فاصلہ رکھا، نہ کوئی عشق و عرفاں میں
گریباں کے عوض اب ہاتھ اُلجھتا ہے رگِ جاں میں

کہاں کا ہوش کیسی آگہی، اِس بزمِ امکاں میں،
مگر اِک نیم بیداری سی ہے خوابِ پریشاں میں

یہ بجلی ہے کہ رقصِ جلوۂ گل خیز ہے، ہمدم
قفس میں ہوں، مگر میرا نشیمن ہے گلستاں میں

دل میں اب تابِ ضبط بھی تو نہیں،
آپ کیوں یاد آئے جاتے ہیں،

دل کے اکثر فسانہ ہائے جمیل،
آنسوؤں میں سنائے جاتے ہیں

آہی جاتا ہے نشیمن کا خیال
میں اسیری میں بھی آزاد نہیں

کب ہوئی آپ کو توفیقِ کرم ، ،
آہ جب طاقتِ فریاد نہیں ،

نہ محدود جلوے نہ محرومِ نظر ہیں
مرے دل کو ناحق پریشانیاں ہیں

بتا اے جنوں گریبانِ خرد کو
یہ دانائیاں ہیں کہ نادانیاں ہیں

وضع کی ہے جنوں نے نسبت خاص
تار دامن میں اور رگِ جاں میں

ظرفِ وحشت کی یہ بھی خامی ہے
ورنہ قیدیں کہاں ہیں زنداں میں

دیکھنا محرمِ اسرارِ حیات،
اس فسانے کی حقیقت دل میں

مقام اور بھی ہیں دانش آزما لیکن
طلسمِ ہستیِ فانی ترا جواب نہیں

حُسن فریبِ دیدۂ و دل ہی، دیدۂ و دل ہیں حُسن فریب
دیوانے یہ عالمِ رنگیں، صبح نہیں یا شام نہیں

اُنکے جلوے عام ہیں لیکن آنکھیں ہیں سرگرمِ تلاش
اب یہ خطا ہو آنکھوں کی یا اُنکے جلوے عام نہیں

عشق کہتا ہے کہ اب اک نئی دُنیا اختر
خود ہی تخلیق کروں، خود ہی پھر آباد کروں،

توڑ دے دل میں کوئی تیز سا نشترِ مطرب
روح خوابیدہ ہے نغموں کا یہ ہنگام نہیں

زحمتِ التفات کی آپ نے آہ، کیا کیا
اب وہ لطافتیں کہاں حسرتِ انتظار میں

کہاں کہاں ہے تری جستجو میں آوارہ
مری نظر کہ ابھی آشنائے راز نہیں

مری خطا ہے کہ میں ناشناسِ لذتِ درد
سمجھ رہا تھا ترا درد دلنواز نہیں،

بکھر رہے ہیں ابھی سے حیات کے اجزا،
ابھی تو دوش پہ وہ کاکلِ دراز نہیں

نغمۂ درد چھیڑ کر انجمنِ حیات میں
عشق نے جان ڈال دی پیکرِ کائنات میں

دعوتِ رقص جلوہ عام اور یہ نگاہِ ناتمام
خود وہ حریفِ شوق ہیں پردۂ التفات میں

جو ازل سے ہے فضا میں گرمِ رقص
سینۂ ہستی کی وہ فریاد ہوں

شرحِ اسباب گرفتاری نہ پوچھ
میں کسی کا جلوۂ آزاد ہوں

اللہ رے بیخودی، خبرِ دو جہاں نہیں
اب زندگی بہ قیدِ زمان و مکاں نہیں

بہلا نہ ہم صفیر مجھے کیسے مان لوں ،
بجلی گری ہے جس پہ مرا آشیاں نہیں

جاری ہے دل میں دعوتِ مژگاں کا اہتمام
یعنی ہنوز سعیٔ جنوں رائگاں نہیں

اُس کی تلاش ہے مجھے رہگزرِ مجاز میں،
حُسن بھی اک حجاب ہے جس کے حریمِ ناز میں

عقل ہے پھر حریفِ عشق اب یہ بساط اُلٹ نہ دو،
پردہ اُٹھا کے آنہ جاؤ عالمِ امتیاز میں

مطربِ خوشنوا مجھے نشترِ تیز چاہئے
یہ تو نوائے درد ہے نغمہ کہاں ہے ساز میں

میرے جنونِ خام کا بے اثری مآل ہے
نالۂ دردمند میں ورنہ اثر کہاں نہیں

میرے ہی آنسوؤں سے کیا فیضِ جنوں ہے آشکار
دل کے لہو سے زینتِ دیدۂ تر کہاں نہیں

یہاں تو گلستاں بھی ہیں گردش سے نہیں خالی
نہ جانے پھول کیا سمجھے ہوئے ہیں مسکرانے کو

وہی کچھ خواب ہوں گے اور کچھ اوہامِ بیداری
جہاں سے چھیڑئے کمبخت دنیا کے فسانے کو

زندگی کیا ہے جو دل ہو تشنۂ ذوقِ فنا
یعنی یہ پردہ تو اُٹھ سکتا ہے آسانی کے ساتھ

گفتگوئے صورت و معنی ہے عنوانِ حیات
کھیلتے ہیں وہ مری فطرت کی حیرانی کے ساتھ

تم نے ہر ذرے میں برپا کر دیا طوفانِ شوق
اک تبسم اس قدر جلووں کی طغیانی کے ساتھ!

دل کی آبادی ہے اختر دل کی بربادی کا نام
اک تعلق ہے مری ہستی کو ویرانی کے ساتھ

لذتِ غم التفاتِ یار نے برباد کی،
ترکِ بیداد آہ اک تمہید تھی بیداد کی،

مسکرائے وہ مجھے یاد آ گیا پیمانِ ضبط،
رہ گئی شرما کے گستاخی لبِ فریاد کی

میں نے کب چاہا تھا رسوائی کے ساماں ہو گئے
اُن کے جلوے میری ہستی میں نمایاں ہو گئے

اس تکلف سے ملایا سازِ مطرب کے نثار
دل کے سب کانٹے گلستان در گلستاں ہو گئے

دل سے تھا ہنگامۂ ہستی اب اختر دل کہاں
ساز ادھر ٹھہرا اُدھر نغمے پریشاں ہو گئے

سلامت مرے دل میں گھر کرنے والے
مرے غم کو پائندہ تر کرنے والے

وہ نغمے سُنا آج پھر حسنِ مطرب
حقایق کو زیر و زبر کرنے والے

دلوں میں آگ بھری ہے غمِ نہانی کی
بہت گراں ہے یہ قیمت حیاتِ فانی کی

ہنوز دل میں ہے اک پرتوِ نشاطِ دوام
بہت قلیل تھیں گو ساعتیں جوانی کی

فریبِ رنگ پہ قایم ہے دہر کی بنیاد
خیال محوِ طلسمِ خیال ہوتا ہے

مبارک ہیں اُس دل کی ویرانیاں
جو تیرے تصور سے آباد ہے

نطق بخشنے والے آج شرم رہ جائے
سرگزشتِ دل ہے اور میری بےزبانی ہے

گرم رقص ہیں اختر ناتمام سے اجزار
زندگی حقیقت میں خوابِ زندگانی ہے

ہنستا ہے عشق غفلتِ اربابِ ہوش پر
دُنیا ہے چند خوابِ پریشاں لئے ہوئے

میری نگاہِ شوق کو یہ کس نے بخشدیں
حیرانیاں، لطافتِ عرفاں لئے ہوئے

بر سرِ لطف ہو گر اُن کی نگاہ
خطِ پیمانہ رگِ جاں ہو جائے

عام ہو جائے اگر لذتِ غم
ذرۂ خاک بیاباں ہو جائے

میں یقین کرم پہ ہوں مجبور،
وہ سراپا ستمگر ہی سہی

وہ ادھر مسکرا کے دیکھ تو لیں،
اک ادائے فسونگری ہی سہی

کروٹیں لیتی ہے پھولوں میں شراب
ہم سے اس فصل میں توبہ ہوگی،

حشر آئے گا نہ جانے کب تک
زندگی اور ابھی رسوا ہوگی،

ہے وہی اہتمامِ جلوہ ہنوز
اُن کو ارماں ہیں خود نمائی کے

وعیدِ موت ہے وعدہ حیات سرمد کا
ترے خیال کی دُنیا میں کون مرتا ہے

یہ کس کے جلوۂ مطرب نے ساز چھیڑ دیا
کہ ذرّہ ذرّہ زمانے کا وجد کرتا ہے

بن سکا درمانِ محرومی نہ اُن کا التفات
تھم گئے آنسو مگر آنکھوں کو ویراں کر گئے

مسکرائے یوں مری آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر
وہ مری فطرت کی حیرانی کو عرفاں کر گئے

فریب صورت عالم نہیں ہے جلوۂ معنی
حقیقت خود اسے افسانہ در افسانہ کرتی ہے

دُنیا کی شورشوں سے مرجھا چلی ہیں نبضیں،
ہاں مطرب محبّت! اک نغمہ جوانی

غم فنا سے لیا عیشِ جاوداں میں نے
متاعِ عشق کو اتنا کیا گراں میں نے

مری بلا کو ہوا جاتی ہوئی بہار کا غم
بہت لٹائی ہیں، ایسی جوانیاں میں نے

حریم کعبہ بنا دی وہ سرزمیں، میں نے
ترے خیال میں رکھدی جہاں جبیں میں نے

مجھی کو پردہ ہستی میں دے رہا ہے فریب
وہ حُسن جس کو کیا جلوہ آفریں میں نے

چٹک میں غنچے کی وہ صوت جانفزا تو نہیں
سُنی ہے پہلے بھی آواز یہ کہیں میں نے

رہینِ منزلِ وہم و گماں رہا اخترؔ،
اسی میں ڈھونڈھ لیا جادۂ یقیں میں نے

اک بسیط احساس، اک شوق نمایاں چاہئے
عشق کی نبضوں میں رقص موج طوفاں چاہئے

اک نئی ہستی، نئی تعمیر دوراں چاہئے
میں ترے قرباں پھر اب تجدید پیماں چاہئے

موت کے اسرار سے اے عشق اُلٹ دے اب نقاب
منظرِ ہستی کا یہ رُخ بھی نمایاں چاہئے

منزل ہستی کی عبرت دیکھ لی
اے مجاز اپنی حقیقت دیکھ لی

روتا ہوں کہ بیگانۂ تکمیل ہے اب بھی
وہ بے اثری جو مرے شیون کے لئے ہے

چاہے تو گدائے درِ میخانہ کو ساقی
اک جام میں سر حلقۂ میخانہ بنادے

کب تک یہ اجتناب، یہ صبر آزما حجاب
اب لطف ہے اسی میں کہ پردا اُٹھائیے

رہی ہے اس قدر میری رفیقِ شامِ تنہائی
کہ مجھکو نامرادی سے محبّت ہوتی جاتی ہے

آ پہونچی ہے جان کی خرابی
اے عشق نوید کامیابی!

کر چکا اب گلہ جو رنجا یاں کوئی
درد کی آڑ میں ہے سلسلہ جنباں کوئی

آنہ جائے جو تمھیں سیرِ جنوں ہو منظور
آج پھر کرنے کو ہے دعوتِ مژگاں کوئی

جب نہ ہوا کوئی کفیل، موت کفیل ہو گئی
میری حیات مختصر، مرگ طویل ہو گئی

ذکرِ آل چھیڑ کر تو نے غضب کیا ندیم
ساعتِ عیش تھی ہی کیا اور قلیل ہو گئی

روحِ آزادی پہ اک بندِ گراں دیکھا کئے
ہم قفس میں پھر بھی، خوابِ آشیاں دیکھا کئے

اک جہانِ گفتگو تھا وہ سکوتِ منفعل،
شکوہ کیا کرتے یہ اندازِ بیاں دیکھا کئے

وسعتِ ہستی و عدم گوشۂ دل میں بند ہے
عشق کی منزلِ حیات عرش سے بھی بلند ہے

کچھ اس نگاہ سے دیکھا تھا مجھ کو ساقی نے
چھٹی شراب مگر شانِ بے خودی نہ گئی

جتنی ہے قریب منزلِ یار
اے دل اُتنی ہی دور بھی ہے

جب میں نے سُنا ہے نام اُن کا
دل پر اک چوٹ سی لگی ہے

ترک کیجئے وہمِ ہستی اور فنا ہو جائیے
اس کشاکش میں یہی صورت ہے اِک آرام کی

رہینِ دردِ عشق ہے، حیات ہو کہ موت ہو
یہ جنس کائنات میں حقیر بھی گراں بھی ہے

خوشا احساسِ غم، دُنیا نے لی ہیں کروٹیں کیا کیا
مجھے راحت نہیں ملتی مجھے تسکیں نہیں ہوتی

منزلِ دیدۂ بینا ہے حقیقت نہ مجاز
کعبہ بن جائے ترا دل کہ صنم خانہ بنے

کھوئے ہوئے ہیں اہلِ عقل حیرتِ بے قیاس میں
مسئلۂ حیات بھی عقدۂ سرنوشت ہے

اگر آگاہِ ہستی فطرتِ مجبور ہو جائے،
بقدرِ لفظ و معنی ذرہ ذرہ طور ہو جائے

تمھارے زخمیوں کا پوچھنا کیا، یہ اگر چاہیں،
تو ان کے خون کا ہر قطرہ اک منصور ہو جائے

نہیں اے ہمنفس بے وجہ میری گریہ سامانی
نظر اب واقفِ رازِ تبسم ہوتی جاتی ہے

جہاں افسانۂ ہستی میں ہے اُلجھا ہوا اختر
حقیقت پردۂ اسرار میں گم ہوتی جاتی ہے

تلاشِ ناتمامِ شوق ہے نا آشنا دل سے
میں جتنا متصل ہوں دور ہوں اُتنا ہی منزل سے

حریفِ جادۂ دشوار بن اور مسکراتا جا
کہ مشکل اصل میں بنتی ہے صرف احساسِ مشکل سے

سپاسِ نعمتِ غم روز و شب ادا کر کہ ہے یہی رازِ شادمانی
بہار کچھ بھی نہیں یہ نکھرا ہوا سا اک جلوۂ خزاں ہے

رازِ حیات کھل سکا کچھ بھی نہ اخترِ حزیں
ہوش ہے یہ کہ بیخودی، عقل ہے یا جنون ہے

تجلیِ حیات ہے ہنوز بطنِ خاک میں
پھرا ہوں دل کو کارواں بہ کارواں لئے ہوئے

نہاں ہیں میری خاک میں گداز دل کی رفعتیں ٹھہر گیا ہوں میں زمیں پہ آسماں لئے ہوئے
دور نہیں ہیں عشرتیں سرحد اشک و آہ سے راز نشاط پوچھئے میرے دل تباہ سے

درد نہاں بقدر شوق دیجئے، یا نہ دیجئے شکوا ہے مجھکو آپ کی پرسش گاہ گاہ سے
میری قسمت میں خدا جانے کہاں سے آگئے وہ جو خم ہیں آپ کی زلف پریشاں کے لئے

ہر قدم دیتی ہے دُنیا، دعوت عرفان راز ذرہ ذرہ اک جہاں ہے فکر انساں کے لئے
مری نگاہ سے چھپ کر خوشا رعایت ذوق مری نگاہ پہ بجلی گرائی جاتی ہے،

مشاہدات حقیقت کو ہے بہت اختر وہ اک کلی جو چمن میں کھلائی جاتی ہے
فریب جلوہ کہاں تک بروئے کار رہے نقاب اُٹھاؤ کہ کچھ دن ذرا بہار رہے

جنوں کا رخ ہے حریم حیات کی جانب الٰہی پردۂ اوہام اعتبار رہے
میں تری حیرتِ معصوم کے صدقے یہ نہ پوچھ موت کیوں درد کا درماں نظر آتی ہے مجھے

مستی شوق کے قرباں کہ اب اُن کی صورت اپنی صورت میں نمایاں نظر آتی ہے مجھے
مری دانست میں خواب گراں ہے رازِ بیداری کہ بیداری مجھے خواب گراں معلوم ہوتی ہے

قفس میں کیوں چلی آتی ہے یادِ گلستاں ہمدم کوئی بجلی قریبِ آشیاں معلوم ہوتی ہے
اِک صبر شکن احساس بلا اک درد بھری تقدیر ملی جو خواب ازل میں دیکھا تھا اُس خواب کی یہ تعبیر ملی

ہنستی ہوئی کلیوں کے رُخ سے اُٹھے جو تبسم کے پردے حسرت ہی کا ایک عالم دیکھا، عبرت ہی کی اک تصویر ملی
پہونچی ہے رفتہ رفتہ کہاں انتہائے عشق اب دل میں اک لطافت غم ہے بجائے عشق

ٹوٹا نہیں ہنوز حجاب فریبِ ہوش اک نغمہ اور مطربِ رنگیں نوائے عشق
زاہد تری سمجھ میں نہ آئے گا یہ مقام نا آشنائے کفر و یقیں ہے نماز عشق

سمجھا ہے اِک حقیقت باطن جسے مجاز ہے خود وہی حقیقتِ باطن مجاز عشق
مری بیخودی ہے اُن آنکھوں کا صدقہ چھلکتی ہے جن سے شراب محبت
اُلٹ جائیں سب عقل و عرفاں کی بحثیں اُٹھا دوں ابھی گر نقابِ محبت
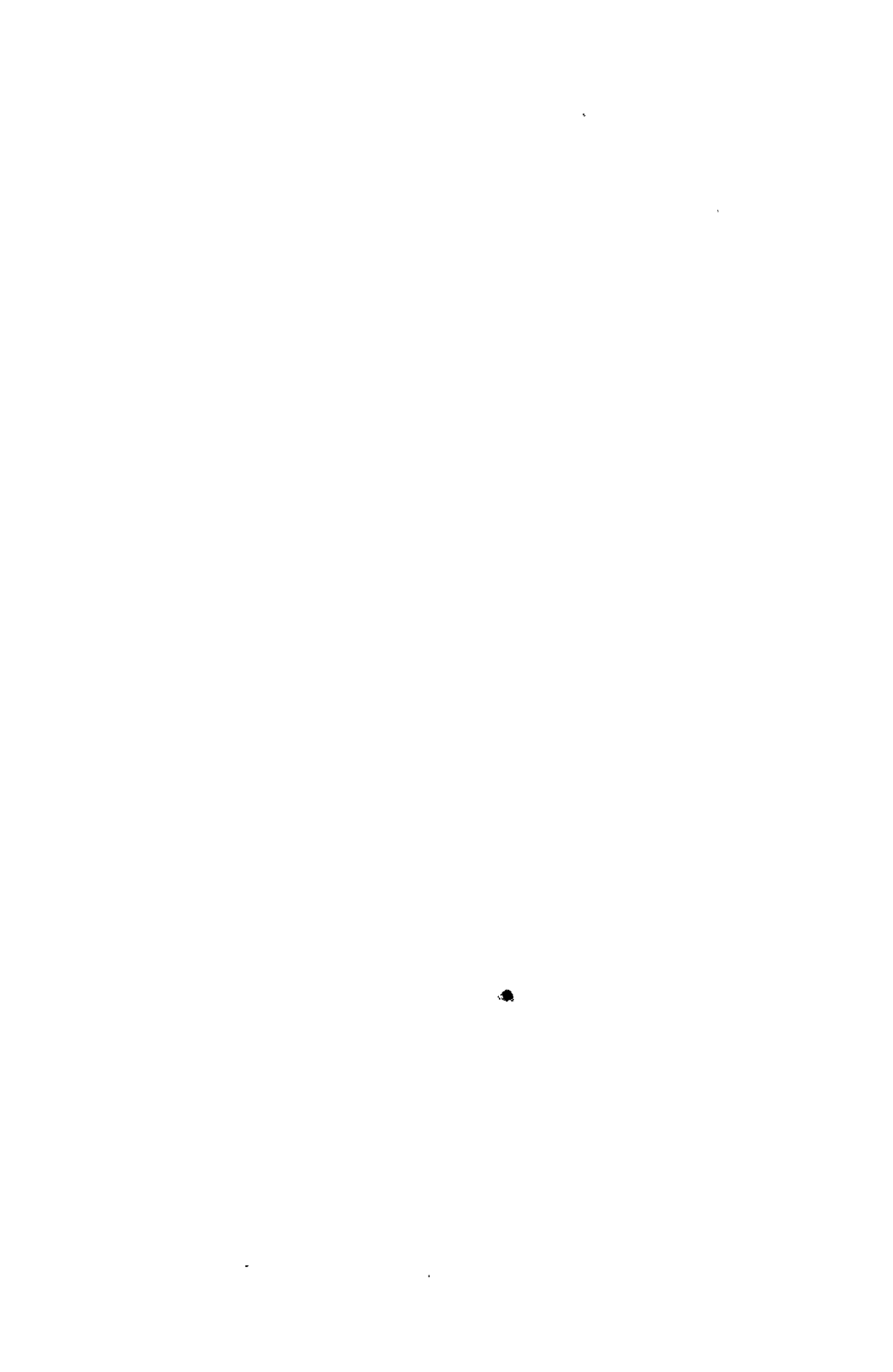
اختر شیرانی   (وفات ۹ ستمبر ۱۹۴۸ء

نہ بھول کر بھی تمنائے رنگ و بو کرتے
چمن کے پھول اگر تیری آرزو کرتے!

مسرت! آہ تو بستی ہے کن ستاروں میں!
زمیں پہ عمر ہوئی تیری جستجو کرتے!

ایاغ بادہ میں آکر وہ خود چھلک پڑتا
مگر اس کے رند ذرا اور ہاؤ ہو کرتے!

انھیں مفر نہ تھا اقرارِ عشق سے، لیکن،
حیا کو ضد تھی کہ وہ پاس آبرو کرتے!

جناب شیخ پہنچ جاتے حوضِ کوثر تک
اگر شراب سے میخانے میں وضو کرتے

پکار اٹھتا وہ آکر دلوں کی دھڑکن میں
ہم اپنے سینوں میں گر اُسکی جستجو کرتے

جنونِ عشق کی تاثیر تو یہ تھی اختر
کہ ہم نہیں وہ خود اظہارِ آرزو کرتے!

اختر شیرانی
ریاست رامپور۔

اختر شیرانی

میرے حالات :

ریاست ٹونک میں پیدا ہوا۔ لاہور میں ہوش سنبھالا اور شاید یہیں کے اخبارات کو سب سے پہلے میرے انتقال کی خبر شایع کرنے کا موقع ملے گا —— !

اختر

انتخاب غزلیات

کِس کو دیکھ کر، دیکھا ہے میں نے بزمِ ہستی کو
کہ جو شے ہے خدائی میں حسیں معلوم ہوتی ہے

ہے جام خالی تو پھیکی ہے چاندنی کیسی
یہ سیلِ نور، ستم ہے، شراب ہو نہ سکا !

یہ مے چھلک کے بھی اُس حسن کو پہونچ نہ سکی،
یہ پھول، کھل کے بھی اُس کا شباب ہو نہ سکا،

کون آیا، مرے پہلو میں یہ خواب آلودہ !
زلف برہم کئے، با چشمِ حجاب آلودہ !

کس نے بستر پہ بٹھایا، یہ مجھے، شرما کر
کس کے ہاتھوں میں ہے لرزش یہ حجاب آلودہ!

کس کو شکوہ ہے، مرے عشق سے رسوائی کا؟
کس کا لہجہ ہے بایں لطف، عتاب آلودہ !

محبت کے اقرار سے شرم کب تک ؟
کبھی سامنا ہو تو مجبور کر دوں !

ترے دل کو ملنے کی خود آرزو ہو !
تجھے اس قدر، غم سے رنجور کر دوں !

نہیں زندگی کو وفا، ورنہ اختر
محبت سے دنیا کو معمور کر دوں،

عبادت ہے، اک بیخودی سے عبارت
حرم کو مئے مشکبو سے بسا دیں !

جوانی ہو گر جاودانی تو یا رب !
تری سادہ دنیا کو جنت بنا دیں !

شبِ وصل کی بیخودی چھا رہی ہے !
کہو تو ستاروں کی شمعیں بجھا دیں !

اُنھیں اپنی صورت پہ یوں ناز کب تھا
مرے عشقِ رسوا کو اختر دعا دیں !

ہوئے ناکام، ہوس کار بنے کیوں اختر
یادِ سلمیٰ میں جوانی کو گنوا دینا تھا

ے گیسوئے سلمیٰ پہ بڑھے ہات اختر — یوں گدایانہ تماشائے لبِ بام نہ کر

نا یہ نغمہ، ستاروں کی چھاؤں میں مطرب ! — کہ رات بھر کی ہے اک روشنی، شباب نہیں !

باب مٹ چکا، یادِ شباب باقی ہے — ہے بو شراب کی، ساغر میں اب شراب نہیں !

خوابِ نوشیں میں ہے وہ جانِ بہار — نور و نکہت کی داستانِ خموش !

نائے خواب میں تاروں سے کھیلنے والے ! — ہماری آنکھ بھی شب بھر ستارہ بار رہی !

نہ گزرا وہ یاسمن بو، جدا ہوئی ہمکنار ہو کر — مگر ابھی تک ہمارے پہلو میں نکہتِ یاسمن ہے باقی

اُس کے عہدِ شباب میں جینا !؟ — جینے والو ! تمھیں ہوا کیا ہے ؟

اک محبت تھی، مٹ چکی یارب ! — تیری دُنیا میں اب دھرا کیا ہے ؟

ٹیکیاں سی لینے لگا، دل میں نشاطِ طفلی، — آج یاد آ گئے بھولے ہوئے افسانے چند !

ظاہر، ہم ہیں بلبل کی طرح مشہور، ہرجائی — مگر دل میں گدازِ فطرتِ پروانہ رکھتے ہیں

مجھے میخانہ تھراتا ہوا محسوس ہوتا ہے — وہ میرے سامنے شرما کے جب پیمانہ رکھتے ہیں

د، بہاروں میں نہاں، رنگِ خزاں دیکھتے ہیں — دیدۂ دل سے وہی، سیرِ جہاں دیکھتے ہیں !

لب پردہ ہے غموں کا، جسے کہتے ہیں خوشی، — ہم تبسم میں نہاں، اشکِ رواں دیکھتے ہیں !

نۂ غم جگائے جا، حشرِ ستم اُٹھائے جا ! — نیچی نظر کئے ہوئے، بام پہ مسکرائے جا !

دل مرا سر بسر گداز، تیری حیا عدوئے راز ! — مجھ سے بھی ضبطِ غم نہ ہو، تو بھی نظر چرائے جا !

رودِ جہاں سے ساقیا ! سرد ہوا ہے دل مرا — برف و شراب کی جگہ، برق و شرر پلائے جا !

سایۂ ابر ہے شباب، حاصلِ زندگی خراب ! — عمر ہے مختصر تو ہو، عمرِ طرب بڑھائے جا !

مجھے اپنی پستی کی شرم ہے، تری رفعتوں کا خیال ہے ! — مگر اپنے دل کو میں کیا کروں، اسے پھر بھی شوقِ وصال ہے !

س ادا سے کون یہ جلوہ گر سرِ بزمِ حسنِ خیال ہے ؟ — جو نفس ہے مستِ بہار ہے، جو نظر ہے غرقِ جمال ہے !

ں بتاؤں واعظِ خوش نوا ! ہے جہان و خلد میں فرق کیا؟ — یہ اگر فریبِ خیال ہے، وہ فریبِ حسنِ خیال ہے !!

شق، کہ جس کے دین میں، صبر و سکوں حرام ہے، — ایک نظر کا کام ہے، ایک اثر کا نام ہے !

نان میں مے کی زاہدا ! اس کے سوا میں کیا کہوں — میرے لئے حلال ہے، تیرے لئے حرام ہے !

ائے طلب کے واسطے، کوئی نئی زمیں بنا ! — وادیٔ مہر و ماہ تو، لغزشِ نیم گام ہے !

بھلا کیونکر نہ ہوں راتوں کو نیندیں بیقرار اُس کی ! — کبھی لہرا چکی ہو، جس پہ زلفِ مشکبار اُس کی !

فسانے نازکی، میں نے شکایت ہائے گیسوں کی تھی — مجھے جینے نہیں دیتی، نگاہِ شرمسار اُس کی !

نہیں عذر، زاہدو! لاکھ مرتبہ جائیں طوفِ حرم کو ہم! — مگر ایک شرط ہے، میکدہ نہ ملا کرے ہمیں راہ میں!
جو مزاجِ دل نہ بدل سکا، تو نظامِ دہر کا کیا گلہ؟ — وہی تلخیاں ہیں ثواب میں، وہی لذتیں ہیں گناہ میں!
گلۂ ستم کی مجال تو ہے پر آہ اس کو میں کیا کروں؟ — یہ جو ایک بجلی سی بیقرار ہے اُن کی نیچی نگاہ میں!
نہیں یادِ عیش و ملالِ عمرِ گزشتہ کی کوئی داستاں — مگر آہ چند وہ ساعتیں، جو بسر ہوئی ہیں گناہ میں!

کوچہ گردی میں کٹیں، شوق کی کتنی راتیں! — ڈھونڈتے تھے جسے، وہ ماہِ خراماں نہ ملا
یوں تو ہر در پہ لپکتے نظر آئے دامن، — کھینچتے ناز سے جس کو وہی داماں نہ ملا!
درِ جاناں پہ فدا کرتے دل و جاں اختر — وائے برحالِ دل و جاں، درِ جاناں نہ ملا!

کس کی آنکھوں کا لئے دل پہ اثر جاتے ہیں! — میکدے ہات بڑھاتے ہیں، جدھر جاتے ہیں!

کیا کہہ گئی کسی کی نظر، کچھ نہ پوچھئے! — کیا کچھ ہوا ہے دل پہ اثر، کچھ نہ پوچھئے!

بہشتوں پہ ہنستی ہے، دنیائے فانی! — جوانی کی رنگیں ہیں کتنی سہانی!
ستم ہے کہ اے دل! نہیں جاودانی، — حسینوں کا حسن اور ہماری جوانی!
ترا حسن! پروردۂ رنگ و بو ہے! — بہاروں میں کھیلی ہے تیری جوانی!

یہ بے رخی ہے تو "اپنے خیال" سے میں بھی! — تری جوانی کی راتیں، تباہ کر دوں گا!

دل میں خیالِ نرگسِ جاناں نہ آ گیا! — پھولوں سے کھیلتا ہوا دیوانہ آ گیا!

پارسائی کی جواں مرگی نہ پوچھ! — توبہ کرنی تھی کہ بدلی چھا گئی!
سازِ دل کو گدگدایا، عشق نے! — موت کو لے کر جوانی آ گئی!

عمر بھر کی تلخ بیداری کا ساماں ہو گئیں، — ہائے وہ راتیں کہ جو خوابِ پریشاں ہو گئیں!
عمر بھر، کم بخت کو پھر نیند آ سکتی نہیں — جس کے سینے پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں!

یا یہ دل دکھاتا ہے، یا وہ جی لبھاتا تھا! — یہ بھی اک زمانہ ہے، وہ بھی اک زمانہ تھا!

اُن رس بھری آنکھوں میں، حیا کھیل رہی ہے — دو زہر کے پیالوں پہ قضا کھیل رہی ہے!

غم خانۂ ہستی میں ہیں، مہماں کوئی دن اور — کر لے ہمیں تقدیر پریشاں کوئی دن اور

دنیا ہے سیہ خانۂ غم، شمع جلا دے! — اُٹھ ساقیِ مہوش، مجھے پیمانہ اُٹھا دے!

نہ بھول کر بھی تمنائے رنگ و بو کرتے! — چمن کے پھول، اگر تیری آرزو کرتے!
مسرت! آہ تو بستی ہے کن ستاروں میں؟ — زمیں پہ عمر ہوئی، تیری جستجو کرتے!!
ایاغِ بادہ میں آ کر، وہ خود چھلک پڑتا — گر اُس کے مست، ذرا اور ہاؤ ہو کرتے!

غرورِ عشق کی تاثیر تو یہ تھی اختر، کہ ہم نہیں وہ خود اظہارِ آرزو کرتے!

کشکول ہو یا ساغرِ جم، نشّہ ہے یکساں شاہانہ پیئے جا کہ فقیرانہ، پیئے جا!
اِس فکر کی بستی میں ہے مستی ہی سے ہستی دیوانہ بن اور با دلِ دیوانہ پیئے جا!

دیکھ سکتا ہے بھلا کون، یہ پیارے آنسو! میری آنکھوں میں نہ آجائیں، تمھارے آنسو!
صبحدم دیکھ نہ لے کوئی یہ بھیگا آنچل! میری چغلی کہیں کھا دیں نہ تمھارے آنسو!
ہجر ابھی دور ہے، میں پاس ہوں اے جانِ جہاں! کیوں ہوئے جاتے ہیں بے چین تمھارے آنسو!

یاد آؤ مجھے للّٰہ نہ تم یاد کرو! میری اور اپنی جوانی کو نہ برباد کرو!
شرم رونے بھی نہ دے، بیکلی سونے بھی نہ دے اِس طرح تو مری راتوں کو نہ برباد کرو!
میرے پردیسیو! سیکھی ہے یہ کس دیس کی ریت جو تمھیں یاد کرے، تم نہ اُسے یاد کرو!
حد ہے پینے کی کہ خود پیرِ مغاں کہتا ہے اِس بُری طرح جوانی کو نہ برباد کرو!

قبر پہ آئی ہے وہ پیکرِ ناز! عمرِ فانی کو دے کوئی آواز!
زندگی کی حقیقت، آہ نہ پوچھ! موت کی وادیوں میں اک آواز!

عشق کا موسم، غم کی ہوائیں، اف ری جوانی، ہائے زمانے! دل میں تمنا، لب پہ دعائیں، اف ری جوانی، ہائے زمانے
صحنِ چمن اور بادہ پرستی، رات کا منظر، عالمِ مستی! قدموں پہ ساغر، سر پہ گھٹائیں، اف ری جوانی، ہائے زمانے
گھر پہ کسی کے رات گزرنا، اور وہ اُس کا صبح کا ڈرنا! "دیکھو کنیزیں دیکھ نہ پائیں"۔ اف ری جوانی، ہائے زمانے
ایک گلی سے روز گزرنا، گرچہ کسی سے بات نہ کرنا! سینے میں دھڑکن، منہ پہ ہوائیں، اُف ری جوانی، ہائے زمانے
گھر پہ وہ اک مہ پارہ کا آنا، بات نہ کرنا، آنکھ چرانا! دل کو خلش، تنہا کبھی پائیں، اُف ری جوانی، ہائے زمانے

اِنھی غم کی گھٹاؤں سے خوشی کا چاند چمکے گا اندھیری رات کے پردوں میں، دن کی روشنی بھی ہے!

تا دامنِ آنسوؤں کو ہے مدت سے جستجو آرامگاہِ گوشۂ داماں کو کیا ہوا؟

آگیا وقت کہ آنکھیں ہوں نثارِ سلمیٰ وہ نظر آتے ہیں آثارِ دیارِ سلمیٰ!

آکہ ہم بھی اک ترانہ جھوم کر گاتے چلیں، اِس چمن کے طائروں کی ہمزبانی پھر کہاں!
ایک ہی بستی میں ہیں، آساں ہے ملنا آملو! کیا خبر لے جائے دورِ آسمانی پھر کہاں!
پھول چُن، دل کھول کر عیش و طرب کے پھول چُن! موسمِ گل پھر کہاں، فصلِ جوانی پھر کہاں!

ہاتھوں پہ جھوم جھوم کے بادل نہیں اُٹھے، گیسو بکھر رہے ہیں عروسِ بہار کے

مخمورِ خواب، بسترِ گل سے اُٹھے ہیں وہ، انگڑائی لی ہے باغ میں صبحِ بہار نے

میرے ارمانوں سے کہتی ہے اجل — اس قدر سامان! دو دن کے لئے!
اُن کی صحبت کا تصور اور ہم! — زندگی، دھوکا تھی، کچھ دن کے لئے!

شب کو پہلو میں جو وہ ماہ سیہ پوش آیا، — ہوش کو اتنی خبر ہے کہ نہ پھر ہوش آیا!
اُن کا زانو تھا مرا سر، مرا دل ہاتھ اُن کا — بیخودی تیرا برا ہو! مجھے کب ہوش آیا!
دو گھڑی ہو بھی گئی گر غم فردا سے نجات — چٹکیاں لیتا ہوا دل میں غم دوش آیا!

آرزو وصل کی، رکھتی ہے پریشاں کیا کیا! — کیا بتاؤں کہ مرے دل میں ہیں ارماں کیا کیا!
اب وہ راتیں نہ وہ باتیں نہ ملاقاتیں ہیں — محفلیں خواب کی صورت ہوئیں ویراں کیا کیا!
دشت غربت میں رُلاتیں ہیں ہمیں یاد آکر — اے وطن! تیرے گل و سنبل و ریحاں کیا کیا!

چاند کے ٹکڑے بھی نظروں میں سما سکتے نہ تھے — کیا بتائیں ہم ترے در کے گدا کیوں ہو گئے!

اے صبا کون سے گلزار سے تو آتی ہے — تجھ سے اُس غنچہ دہن کی مجھے بو آتی ہے!

کسی یاد میں آنسو بہائے تھے نہ کبھی — میں آج کیوں مرے پروردگار روتا ہوں

میرا ہر شعر ہے اختر مری زندہ تصویر — دیکھنے والے نے ہر لفظ میں دیکھا ہے مجھے

اُمیدامیٹھوی

میرا نام محمد علی، کنیت ابوالکمال، تخلص، اُمید ہے۔ میں قصبہ گڑھ امیٹھی ضلع سلطان پور کا رہنے والا ہوں اور اسی قصبہ میں ۳؍ فروری ۱۸۷۸ء کو پیدا ہوا۔

میرے مورث اعلیٰ حضرت حافظ سید رسول اور سید سالار مسعود غازی کے والد بزرگوار ایک ساتھ ولایت غزنی سے مع اہل و عیال ہندوستان آئے اور والیِ ریاست پرتاب گڑھ کی ارادت مندیوں سے متاثر و مجبور ہو کر موضع خالصہ ضلع پرتاب گڑھ میں سکونت پذیر ہو گئے، اسوقت سے یہ موضع سادات خالصہ کے نام سے مشہور ہے۔

میرے دادا میر خدا بخش صاحب خالصہ سے ترک سکونت کر کے قصبہ امیٹھی میں آباد ہو گئے اور میرے والد سید علی حسن مرحوم چند روز ریاست امیٹھی میں ملازمت کرنے کے بعد ملازمت سے دستکش ہو کر ایک مختصر سرمایہ سے عطر تیل کی تجارت شروع کر کے ایک معمولی مگر خوش حال زندگی بسر کرتے تھے اور یہی تجارت اُن کی آخر عمر تک ذریعہ معاش رہی میرے خاندان کے بقیہ افراد اب بھی خالصہ میں آباد ہیں اور کاشتکارانہ و زمیندارانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ میں نسباً سید ہوں اور میرا سلسلۂ نسب جناب زین العابدین ابن امام حسین۔ ابن حضرت علی کرم اللہ وجہہ تک پہونچتا ہے۔ میں مذہباً حنفی ہوں۔

میری ابتدائی تعلیم امیٹھی ہی میں مولوی برکت علی شاہ سے اور اسکولی تعلیم منشی عباس علی صاحب سے ہوئی درسیات فارسی میں نے مولوی محمد رضا صاحب بریلوی سے پڑھیں۔

میں ۱۸۹۳ء میں لکھنؤ آیا یہاں آکر میں نے عربی کی ابتدائی کتابیں حاجی مولانا امیر علی صاحب مترجم فتاویٰ عالمگیری کے اور ادب و فن عروض کی چند کتابیں مولوی حکیم سید عبدالحی صاحب ناظم ندوۃ العلما سے پڑھیں۔ فارسی کی تکمیل خاص طور پر ملا علی محمد شیرازی سے کی، جو مٹیا برج کلکتہ سے برداشتہ خاطر ہو کر لکھنؤ میں قیام پذیر رہے تھے۔

مجھے شعر و شاعری کا شوق ابتدا ہی سے تھا اور جس زمانہ میں لکھنؤ آیا ہوں اُسی زمانہ میں اُردو فارسی اشعار بے تکلف موزوں کر لیا کرتا تھا اور جب خواجہ عزیز الدین مرحوم لکھنوی کو میں نے اپنے چند فارسی اشعار سنا کر فارسی کلام پر اصلاح کی خواہش ظاہر کی تو عزیز مرحوم نے فرمایا کہ "میاں یہ تو بتاؤ تم نے فارسی کہاں اور کس سے پڑھی ہے" ؟

میں نے ملا علی محمد شیرازی کا نام لیا۔ عزیز مرحوم، ملا علی محمد صاحب سے ناواقف نہ تھے بیحد خوش ہوئے۔ ارشاد ہوا کہ میں حاضر

ہوں شوق سے اپنی غزلیں مجھے دکھاؤ سناؤ، لیکن بھائی عاشقانہ کلام کا مزہ جوانی میں ہوتا ہے سو میاں اب کہاں ؏

چوں پیر شدی حافظ از میکدہ بیروں شو

میں نے گستاخانہ مگر مجبورانہ طور پر عرض کیا حضرت! تو پھر کوئی جوان ہو کر کیا کرے، خواجہ مسکرا کر خاموش ہو رہے غرض جب تک خواجہ زندہ رہے عظیم الشان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور اپنا فارسی کلام انھیں کو دکھلاتا رہا میرے کلام کا زیادہ حصہ فارسی ہی میں ہے جس کا آج کوئی پرسان نہیں۔

قصیدہ و غزل خویش را بجا امید

کہ یکسر از صلہ و داد بے نیاز آمد

۱۸۹۸ء میں منشی سجاد حسین صاحب اڈیٹر اودھ پنچ سے ملا اور ایک عرصہ تک اودھ پنچ کی نامہ نگاری کرتا رہا منشی سجاد حسین مرحوم مجھ پر نہایت شفقت فرماتے تھے میں ایک حد تک مرحوم کا احسان مند ہوں اُردو زبان کے متعلق بہت کچھ میں نے اُن سے سیکھا ہے منشی جی پر پایان عمر میں فالج گرا جس کی وجہ سے وہ قریب قریب لکھنے پڑھنے سے معذور ہو گئے تھے ہاتھ میں رعشہ تھا بات چیت بھی بہ تکلف کرتے تھے میں اس زمانہ میں ان کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا اور ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۱ء تک تو برابر بحیثیت آنریری سب اڈیٹر کام کرتا رہا اور جبکہ میں ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ سے تبدیل ہو کر گونڈہ چلا گیا تو اودھ پنچ بند کر دیا گیا کتب خانہ پنجاب کے کسی شخص کے ہاتھ منشی جی کے ایما سے فروخت کر ڈالا گیا اور چند دنوں بعد منشی جی بھی انتقال کر گئے۔

۱۸۹۸ء سے ۱۹۱۱ء تک بہ سلسلۂ ملازمت میں لکھنؤ ہی رہا اس زمانہ قیام لکھنؤ میں چند لکھنوی احباب کے اصرار سے لکھنؤ کے شاعروں میں بھی شریک ہونے لگا۔ اور بفحوائے خاک از تودۂ کلاں بردار، اپنا اُردو کلام حکیم ضامن علی جلال مرحوم کو دکھلانے لگا۔ لیکن یہ اُستادی اور شاگردی کا سلسلہ باقاعدہ عرصہ تک قایم نہ رہ سکا کیونکہ میں اپنی فارسی دانی اور افتادِ طبیعت کی وجہ سے نئی نئی ترکیبیں استعمال کرنے کا خوگر اور ہمارے حضرت جلال دہی سیدھی سادہ اُردو غزل گوئی کے دلدادہ تھے نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن اسم با مسمےٰ جلال نے فرمایا:۔

"حضرت! آپ دہی میرزا نوشہ کی طرح برابر جھاڑ جھنکاڑ میں چلے جا رہے ہیں مجھے آپ کا یہ اسلوب بیان پسند نہیں"

عرض کیا گیا اگر جناب میرے کلام میں کوئی فنی قباحت ملاحظ فرمائیں تو اصلاح کریں، اُردو زبان کی اگر کچھ خامیاں نظر آئیں تو درست کر دیں صرفی نحوی غلطیوں پر متنبہ کریں اور اگر یہ کچھ نہیں ہے تو میں اپنے خیالات کی اصلاح آپ سے نہیں چاہتا۔ اس انداز بیان کو آپ سخت اور گستاخانہ کہہ سکتے ہیں، لیکن اس کے معقول ہونے میں تو شاید آپ کو بھی کلام نہ ہو بہرحال جلال مرحوم یہ سنکر خاموش رہے۔ مگر دو ہی چار دن بعد نہایت شفقت سے فرمانے لگے کہ تم اب اپنا اُردو کلام بھی فارسی کی طرح مولانا رقیب ہی کو دکھلا دیا کرو۔

مولانا محمد حنیف علی صاحب انصاری رقیب مرحوم شاہ آبادی سے مجھسے کافی مراسم دوستانہ تھے اور خواجہ عزیز کی

پیرانہ سالی کی وجہ سے میں اپنا فارسی کلام انھیں کو دکھلایا اور سنایا کرتا تھا۔ مولانا رعب بھی سنہ ۱۳۰۶ھ میں جلالؔ مرحوم کے شاگرد ہو چکے تھے اور مجھ سے نہ صرف استادانہ و شاگردانہ تعلقات تھے، بلکہ وہ میرے مخلص دوست بھی تھے اور اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ان سے میں نے اکثر اپنی علمی و ادبی خامیوں کو پختہ کیا اور فن طب کی چند فارسی کتابیں مولانا سے پڑھیں۔ مولانا رعب کے انتقال کے بعد شعر و شاعری سے میرا دل اُچاٹ ہو گیا تھا اور پھر میں نے کبھی شوق سے مشاعروں میں شرکت نہیں کی۔ انتخاب یہ ہے:۔

ابوالکمال امید امیٹھوی

ب فرقت کی بھی داد اے خلیل بے نیازی دے — ترے بس میں ہے: ب بھی آگ کو گلزار کر دینا،
ب تو ایسا بھی نہیں کوئی جو اُن سے پوچھے، — آپ نے کھو کے مجھے غیر کو پا یا کیا،
پ سے روٹھ کے امید کہاں جائیں گے — بے بلائے ابھی آتے ہیں منانا کیا،

مجبوریاں بھری ہیں مرے اختیار میں — اور اختیار کہتے ہیں؟ کس اختیار کو،

کوئی ہم سے نہ ہم کسی سے خوش — کون ہو ایسی زندگی سے خوش،
یہ نہ پوچھو کہ اس زمانے میں، — کون ہے کس کی بندگی سے خوش،
کیا ہم اپنی خوشی سے ناخوش ہیں — تم ہو کیوں میری ناخوشی سے خوش
خوش نصیبی کا اس کی کیا کہنا، — تم ہو دنیا میں جس کسی سے خوش
وعدہ کل کا ہے لیکن اے امید — تم نظر آتے ہو ابھی سے خوش

ن بھولے پن کے صدقے اتنا نہیں سمجھتے — جیتا رہے گا کوئی کب روز امتحاں تک
ید رو دے تو کیا لطف دل لگی کا،، — اتنا ہی گدگدا دو آئے ہنسی جہاں تک

ائی شبنم، گل ہنسا غنچہ کھلا میرے لئے — جس سے جو کچھ ہو سکا اس نے کیا میرے لئے
ی ہی ہوں، کبھی ایسا بھی کرتا ہے خیال، — حشر تک بیٹھی رہے گی کیا قضا میرے لئے
ستی موہوم کا اف رے فریب اعتبار — گرچہ سب کچھ تھا مگر کچھ بھی نہ تھا میرے لئے
م ہے یوں تو مری بربادیوں کا واقعہ — وہ بھی تو کہہ دیں کہ کوئی مر مٹا میرے لئے
نے والے رو دئے اور رونے والے ہنس پڑے — دل کے ہاتھوں جو نہ ہونا تھا ہوا میرے لئے

زوں قصے ہوس کے ہو گئے مقبول عام، — داستان اہل درد اب عرض کے قابل نہیں،
بنے مانا دوستی کا ماحصل ہے دشمنی، — تیری اُلفت تو وہ شے ہے جس کا کچھ حاصل نہیں
ستی عاشق حجاب جلوۂ معشوق ہے — یہ جو اُٹھ جائے تو پردہ پھر کوئی حائل نہیں

حسن بے پروا دماغِ امتحاں رکھتا نہیں   فیصلہ عشق و ہوس کا ورنہ کچھ مشکل نہیں
اس نگاہ لطف ہی سے کیوں نہ چل کر پوچھئے   کون سی ہے وہ خطا جو عفو کے قابل نہیں

بہار بیخزاں ایسی ہے اور یہ رنگ مجبوری   گریباں ہی میں منھ ڈالے گریباں دیکھتا ہوں میں

یہ ظلم بے پناہ کہ سنتا ہوں میرے بعد   اب وہ ستم شعار ستمگر نہیں رہا

محبت میں ہر چند جی کا زیاں ہے   مگر میں یہ باتیں کہاں دیکھتا ہوں
یہی تیری جنت ہے؟ اے تیری قدرت   کہاں کی بہاریں کہاں دیکھتا ہوں
ارے چشم بد دور، امید صاحب   یہ آج آپ کو میں کہاں دیکھتا ہوں

نام سُنکر خوشی کا اے امید   رنج ہوتا ہے اب خوشی کیسی

کوئی ہوش ہی میں نہ تھا ورنہ ساقی   جو کہنا نہ تھا کہہ گیا سرخوشی میں

فرطِ سجود غیر سے خستہ ہے جب وہ سنگ در   اپنی جبین شوق کو داغ کوئی لگائے کیوں
دل کی کلی گلاب سے پہلے کھلے تو ہے مزہ   ورنہ بہار اور بھی آکے ہمیں ستائے کیوں
آپ ہی یہ بتائیے آپ کی بات بات پر   پہلے تھی واہ واہ کیوں اب ہوئی ہائے ہائے کیوں

وفا و مہر و مروت، صداقت و انصاف   خبر نہیں کہ یہ باتیں ہیں کس زمانے کی
وہ زود رنج ہے اور زود رنج بھی کیسا؟   جو روٹھ جائے تو جرأت نہ ہو منانے کی

خوشی تو اُن کی خوشی ہے کہ جس سے سب خوش ہیں   ہمارے دل کی خوشی کیا ہوئی ہوئی نہ ہوئی
یہ اور بات ہے رنجیدہ ہو گئے امید   تری طرف سے تو خاطر میں کچھ کمی نہ ہوئی

کل تک جو پوچھتا تو اک بات بھی تھی ظالم   اب کس کو پوچھتا ہے امید اب کہاں ہے
وہ آخر رو دئے کیوں؟ میں نے تو اتنا ہی پوچھا تھا   کبھی امید کو ہنستے ہوئے بھی تم نے دیکھا ہے

ارے سود و زیاں دیکھا نہیں جاتا محبت میں   یہ سودا اور سودا ہے یہ دنیا اور دنیا ہے

عجیب بات ہے امید دل کی باتوں کا   نہ اعتبار انھیں ہے نہ اعتبار مجھے

کل تک تو ان کے وعدۂ فردا کا عذر تھا   اب آج کیا اجل سے بہانہ کریں گے ہم
سمجھے نہ تھے کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا   ہنسنے پہ اپنے آپ ہی رویا کریں گے ہم
پھینک آئیں ہم کہاں دل خانہ خراب کو   تم نے تو کہدیا کہ اسے کیا کریں گے ہم

یہ لطف ذوق اسیری نہیں کہ اے صیاد   قفس میں آگ لگا دیں ہم آشیاں کے لئے

زندگی ہے اپنے قبضے میں نہ اپنے بس میں موت   آدمی مجبور ہے او کس قدر مجبور ہے

لذ سے ہوں خجل لیکن کبھی تیری طرح زاہد   خدا بن کر نہیں کی ہے خدا کی بندگی میں نے

نازہے یہ کہ محبت میں بڑا صبر کیا،   پوچھئے صبر نہ کرتے تو بھلا کرتے کیا

دل کی اُلجھن نہ پوچھئے امید   ہم نہ خلوت کے ہیں نہ محفل کے

خدا کے ہاتھ ہے شرم ان کی لنترانی کی   عجیب شان مرے عرض مدعا کی ہے

افسانے میں بھی رحمت حق کے سنا کیا،   اک گوشے میں الگ مے و ساغر لئے ہوئے

دل کا بھیدی جان کے تم کو دل کا حال بتاتے ہیں   ہم کو موہ لیا ہے امید ایک فریدآبادی نے

آپ کل گزرے ہیں جس راہگزر سے پہلے   وہیں بیٹھا ہے کوئی جا کے سحر سے پہلے

جب سے دیوانے ترے آئے ہیں اسوقت کی پوچھ   کیا کبھی تھی کوئی دیوار بھی در سے پہلے

ہم نہ کہتے تھے، محبت کا بُرا ہے سودا   دیکھ لینا تھا تمھیں اپنی نظر سے پہلے

پھر انتظار کی لذت نصیب ہو کہ نہ ہو   خدا کرے کوئی خط کا جواب رہنے دے

تصورات کی دُنیا ہے اپنے مطلب کی   کچھ اور دن ابھی رُخ پر نقاب رہنے دے

تمھیں کہو غمِ فردا کا ہوش ہے کس کو،   جو کل کے واسطے تھوڑی شراب رہنے دے

خیال اور کسی کا اگر نہیں نہ سہی   تجھے تو چین سے تیرا شباب رہنے دے

جواب ریختۂ انوری[1] نہ لکھ امید،   یہ لا جواب غزل ہے جواب رہنے دے

چار دن کی تھی زندگی لیکن   یہ بھی ان کی خوشی نہیں نہ سہی

کہنے کے لئے خضر و مسیحا کی بھی سُن لو   لیکن غمِ ہستی کی دوا اور ہی کچھ ہے

ہر ہوسناک کو سودا ہو نظر بازی کا   آپ کا جلوہ اب ایسا بھی نہ ارزاں ہو جائے

کچھ نہیں اس کے سوا جلوہ گہِ یار کا راز   کوئی حیراں کرے اور کوئی حیراں ہو جائے

جو دیکھیں تو تڑپیں نہ دیکھیں تو ترسیں   یہ صورت ہے دیکھیں جو صورت کسی کی

ہے یہاں کام کی ہر شے مگر اک چیز ہے دل   جس کی حاجت ہے نہ ان کو نہ ضرورت مجھ کو

کیا کہوں اے طالبِ صبر و سکوں   دل کی بیتابی میں ہے آرام کیا

جو بس ہو تو خود کو بھی خود سے چھپائیں   ہیں ایسے بھی شرم و حیا کرنے والے

برہمن کفر میں پورا نہ شیخ اسلام میں کامل،   کرشمہ ہے یہ سب تیرے حجابِ نیم حایل کا

ملامت کر نہ اے ذوقِ طلب گر چھٹ گئی منزل   خیال قطعِ منزل میں کسے تھا دھیان منزل کا

---

[1] محبی و محسنی جناب سید اسد علی صاحب انوری فریدآبادی ۔ امید

کچھ اب کے عجب حسرت دیدار ہے ورنہ
کیا گل نہیں دیکھے کہ گلستاں نہیں دیکھا

ٹوٹا تو طلسم امید ان سحر آگیں آنکھوں کا
آپ اپنے ہی کو دیکھا ظالم نے مگر دیکھا

ہنستے ہیں یونہی خوبیٔ تقدیر پر اپنی
تو اور کچھ اسے رہبرِ کامل نہ سمجھنا

ہر دل سے مجھے خود ہی کبھی رونا کبھی ہنسنا
دل کو کبھی دل اور کبھی دل نہ سمجھنا

طور ہو یا کلیم ہوں مجھ کو تو ہے یہ دیکھنا
عشق و ہوس کا فیصلہ تیری نظر نے کیا کیا

پہلے تو مجھ کو غم یہ تھا آہ میں کچھ اثر نہیں،
اب تو مجھے یہ رنج ہے ہائے اثر نے کیا کیا

کھو گیا میں خود تلاش یار میں انجام کار
سعی بے حاصل سے آخر کچھ تو حاصل ہو گیا

بے نیاز آگہی ہے ماجرائے حسن و عشق،
کیا خبر کس کی ادا پر کون مایل ہو گیا،

ہم لئے پھرتے ہیں آنکھوں میں چمن اے باغباں
جس طرف اُٹھی نگاہ شوق گلشن ہو گیا

ظلمت ہستی عاشق ہے حجاب معشوق
عید نظارہ ہے اس شب کا سحر ہو جانا

حباب و موج کو بھی دیکھکر آنکھیں نہیں کھلتیں
غضب کی نیند میں ڈوبا ہوا ہے ناخدا میرا

خبر کیا اس محیط آوارہ کو ڈوبے ہوئے دل کی
جو قطرہ جذب ہو کر رہ گیا دامان ساحل میں

دیکھتے تھے سب اُسے وہ دیکھتا تھا آپ کو۔
کل اک ایسا بھی تماشا یار کی محفل میں تھا،

قیس کے حسن تصور کی کرے تصدیق کون
ورنہ اب محمل میں کوئی ہے نہ جب محمل میں تھا

کچھ درد محبت کا اس کو بھی دیا ہوگا
کیا اے مرے رب تو نے ایسا بھی کیا ہوگا

کہاں کا حشر، کس کی داد، اک خواب پریشاں تھا
کھلی جب آنکھ تو اپنا ہی ہاتھ اپنا گریباں تھا

مجھے میرے تصور نے بڑا دھوکا دیا ورنہ
کسی کا میزباں تھا میں نہ کوئی میرا مہماں تھا

گلوں سے بھی شکایت بلبلوں کو ہو گئی پیدا
خدا معلوم کل امید کا رنگِ فغاں کیا تھا

کل تک جن کے نالوں سے تھا شکوہ نیند اُچٹنے کا
آج کسی نے ان کو نہ پوچھا کہاں پہ کیسے سوتے ہیں

خدا معلوم کیا وعدہ ہے اس جان تغافل سے
کہ اب جینا بڑی مشکل ہے مرجانا تو آساں تھا

امید خیر رکھئے تو اس بے خبر سے آپ
آئینہ اپنا دیکھئے میری نظر سے آپ

اللہ رے فریب تمنا کہ بارہا
اپنے ہی خط کو لیکے بڑھا نامہ بر سے آپ

کیا سے کیا ہو گئے ہم دیکھتے ہی دیکھتے آج،
اب وہ پہلی سی طبیعت ہے نہ پہلا سا مزاج

جس طرح گزری ہے کل آج بھی کٹ جائے گی
اور جو آرام کی پوچھو تو نہ کل ہی تھا نہ آج،

کون کس سے چھپائے کس کا راز
ذرہ ذرہ یہاں کا ہے غماز

خاک سے خاک مل گئی امید — اب حقیقت اسے کہیں کہ مجاز

کنج قفس میں کیا کہیں کس گل کی تھی نمود — اکبار گی جو ٹوٹ پڑے آشیاں سے ہم
امید، پاس چشم مروت کا ہو بُرا — دل لے گئے وہ کہہ نہ سکے کچھ زباں سے ہم

پرستش کے ہے قابل ذرہ ذرہ میری ہستی کا — مگر یہ بات کہنے کی نہیں شیخ و برہمن میں
زہے یادِ غمِ ایام کی کلفت فراموشی — قفس میں مطمئن یوں ہوں کہ جیسے ہوں نشیمن میں
بتائیں کیوں نکلوائے گئے امید کعبے سے — وہاں بھی کوئی شے پوشیدہ تھی حضرت کے دامن میں

مرہون التفات مسیحا نہیں ہوں میں — آخر بُرا ہی کیا ہے جو اچھا نہیں ہوں میں
میری طرح بھی محو تماشا نہ ہو کوئی — یوں ہوں کسی کی بزم میں گویا نہیں ہوں میں
تو اس دروغ مصلحت آمیز پر نہ جا — قطرہ ہے ہزار کہ دریا نہیں ہوں میں

وہ اک اک سانس میں سو سو امید و بیم کی دنیا — نہ بھولے گی ترے بیمار غم کی داستاں برسوں
نہ ہو گر سادگی اعتبار یاس کا رونا — عجب اک لطف ہے ظالم کے جور بے نہایت میں
بگڑ بیٹھے اگر امید اس جان تمنا سے — تعجب کیا کبھی ایسا بھی ہوتا ہے محبت میں

جلوہ باعتبار تماشا تھا اے کلیم، — ورنہ ابھی وہ شمع حقیقت بجھی نہیں

غیر کا سر اور ترا خنجر کہاں — اعتبار دیدۂ جوہر کہاں،

حساب کیا کرم بے حساب کا تیرے — ہماری حسرت دل کا اگر شمار نہیں،
بس اب نہ پوچھئے جوش نشاط وعدۂ یار — یہ بیخودی ہے کہ تکلیف انتظار نہیں
کہیں وہ شوخ نہ سنتا ہو چپ رہو امید — جفا شعار تو ہے، گو وفا شعار نہیں

تم کو تو بیمار کا دل توڑنا لازم نہ تھا، — گو یہ ظاہر ہے کہ امید شفا باقی نہیں
مجھ کو غیروں سے شکایت ہے نہ اپنوں کا گلہ — دل کا دشمن اب کوئی دل کے سوا باقی نہیں

چھوڑئے شعر و شاعری امید — حال دل کا اگر چھپانا ہے

اُدھر ان کو اُبھارا ان کے حسن جلوہ مائل نے — ادھر تاب نظر سے جھوٹے وعدے پھر گئے دل نے
اُدھر اک برق حاصل سوز گرم سعی بے حاصل — ادھر محروم حاصل کر دیا تحصیل حاصل نے
ہوائے شوق ہاتھوں ہاتھ اڑا لائی ہمیں ورنہ — بہت بوئے تھے کانٹے رہبر بیگانہ منزل نے
نہ صاف اقرار کا پہلو نہ صاف انکار کی صورت — بڑے دھوکے دئے تیرے حجاب نیم حایل نے
مبادا پھر زباں کھلتی لب کاوش تقاضا کی، — کلیجے سے لگا رکھا ہے دل کی پھانس کو دل نے
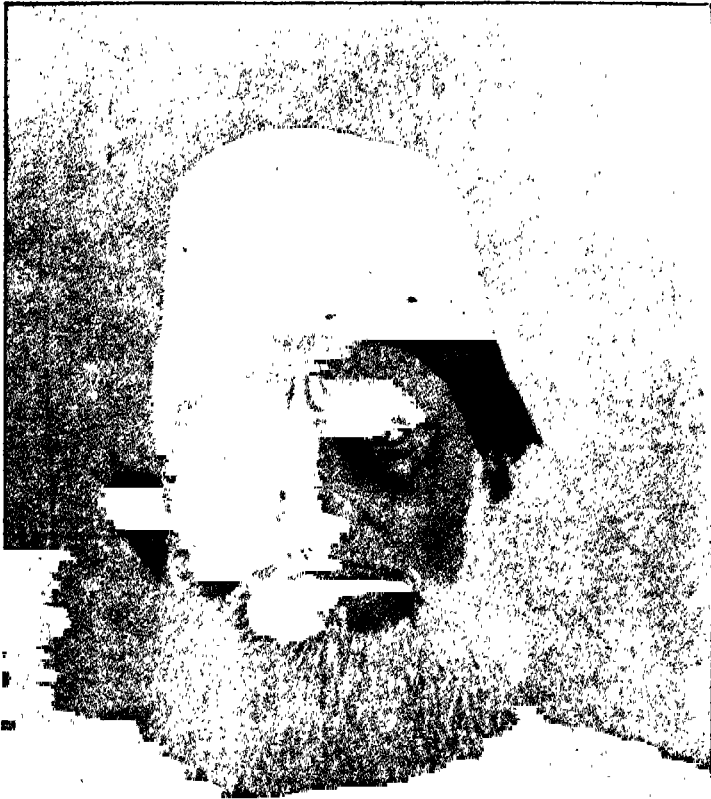
بیخود دہلوی (وفات ۲ر اکتوبر ۱۹۵۵ء)

بیخود دہلوی

نام سید وحید الدین، تخلص بیخود۔ ولادت ۳۰ رمضان سنہ ۱۲۷۹ھ کو بمقام بھرت پور ہوئی لیکن ان کے والد سید شمس الدین عرف سید احمد سالم انھیں اپنے ساتھ دہلی لے آئے
آپ کو ابتدا سے شاعری کا شوق تھا اس لئے آپ مولانا حالی کی تحریک سے داغ کے شاگرد ہوگئے۔ آپ کے دو دیوان گفتار بیخود اور شہوار بیخود طبع ہو چکے ہیں۔

فرق کچھ عالم ایجاد سے پہلے تو نہ تھا ۔۔۔ ایک ہی رنگ تھا اُسوقت تو میرا تیرا

گستاخ و بے ادب کی نظر سے نہاں ہیں آپ ۔۔۔ اتنا تو چشم غیر سے پردہ ضرور تھا

ہجر میں موت نے آکر مجھے صحت بخشی ۔۔۔ کر لیا درد جدائی نے مسیحا پیدا

وہی ہم ہیں وہی راتیں وہی ہے جستجو تیری ۔۔۔ وہی آنکھوں کی حالت ہے اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا

درد دل جس کا صلہ ہے وہ دعا تو یہ تھی، ۔۔۔ آدمی مجھکو بنانا مجھے انساں کرنا
سوگواروں میں مرے حسن ادا بھی ہو شریک ۔۔۔ آئینہ دیکھ کے زلفوں کو پریشاں کرنا
کافر عشق ہے کمبخت خرابی یہ ہے ۔۔۔ ہوسکے تم سے تو بیخود کو مسلماں کرنا

شمع مزار تھی نہ کوئی سوگوار تھا ۔۔۔ تم جسپہ رو رہے تھے یہ کس کا مزار تھا
تڑپوں گا عمر بھر دل مرحوم کے لئے ۔۔۔ کمبخت نا مراد لڑکپن کا یار تھا
سودائے عشق اور ہے وحشت کچھ اور شے ۔۔۔ مجنوں کا کوئی دوست فسانہ نگار تھا
جادو ہے یا طلسم تمھاری زبان میں ۔۔۔ تم جھوٹ کہہ رہے تھے مجھے اعتبار تھا
کیا کیا ہمارے سجدہ کی رسوائیاں ہوئیں ۔۔۔ نقش قدم کسی کا سر رہگزار تھا
اسوقت تک تو وضع میں آیا نہیں ہے فرق ۔۔۔ تیرا کرم شریک جو پروردگار تھا

سمجھ سکتا جسے کوئی نہ تھا وہ مدعا میرا ۔۔۔ مری بیتابیوں سنے راز شاید کہہ دیا میرا

ے نالۂ دل سننا۔ تھم تھم کے اثر کرنا — نازک ہے بہت کوئی اس پر بھی نظر کرنا

اب سوچ کے دل میں وہ مسکراتے ہیں — ابھی زبان پہ میری سوال بھی تو نہ تھا

ہے ہیں ظلم مگر یہ ستم نہیں دیکھا — جفا کے بعد تجھے انفعال بھی تو نہ تھا

پ کے نیرنگِ قدرت کا تماشائی ہوں میں — یہ بھی کہہ سکتا نہیں یہ کیوں ہوا یہ کیا ہوا

غ عالم کے تماشائی مجھے بھی دیکھ لیں، — میں بھی اس گلشن کا ہوں اک پھول کملایا ہوا

تو ہے دیکھنے میں نظر کا مری قصور — یا کچھ بدل گیا ہے زمانے کا حال اب

جربے وفا سے عہدِ وفا لے رہے ہیں ہم — بے اعتباریوں کا نہیں اعتبار آج

م اسے دیکھا کئے جب تک ہمیں غفلت رہی — پڑ گیا آنکھوں پہ پردہ ہوش آجانے کے بعد

ں حقیقت آشنا ہوں ہستی موہوم کا — دیکھتا ہوں غور سے پھولوں کو مرجھانے کے بعد

اہ میں بیٹھا ہوں میں تم سنگِ رہ سمجھو مجھے — آدمی بن جاؤں گا کچھ ٹھوکریں کھانے کے بعد

بزم دشمن میں بنا بیٹھا تھا میں تصویرِ غم — چھیڑ کر مجھکو کسی نے چھیڑ دی تفسیرِ غم

کافر عشق سے خالی نہ رہے گی دُنیا — کوئی ہو جائے گا اللہ کا بندا پیدا

ہوگیا درِ طلب سے یہ زمانہ خالی، — سو میں دس بھی نہیں ہوتے ترے جویا پیدا

چوٹ کھا کر ہی تو انسان بنا کرتا ہے، — دل تھا بیکار اگر درد نہ ہوتا پیدا

اللہ رے بیقدری اربابِ زمانہ، — یوسف اُسے سمجھیں گے جو زنداں میں رہیگا

اقرار سے لیتی ہے مرے دل میں جو چٹکی — اک طعن کا انداز بھی "جی ہاں" میں رہیگا

ہر اک گل کے لئے لازم ہے بو کیا — نہیں ہوتا دل بے آرزو کیا

زباں پر راز کی باتیں ہیں بیخود — کہیں سے آج پی آیا ہے تو کیا

تم سے کھلنے نہیں دیتا دلِ بدظن میرا — میرے پہلو میں چھپا بیٹھا ہے دشمن میرا

چاک کے ساتھ ہے گریہ کا اثر بھی موجود — باغ میں چھین لیا پھول نے دامن میرا

جب تک تھا دل میں آپ کے اقرار وصل تھا — جب آگیا زبان پہ انکار ہوگیا،

کھولنے میں کوئی ٹوٹا جو ترا بندِ نقاب — وہ گلا گھوٹنے کو میرے گریباں میں رہا

امیدِ وصل میں کاٹے ہیں دن جدائی کے — خزاں کا رنگ نظر میں بہار ہوکے رہا،

چھپ کر مرے دل میں مرے کانوں سے سنو تم — کہتا ہے زمانہ سرِ بازار تمھیں کیا

وہی ہے بیخودِ ناکام تم سمجھ لینا، — شرابخانے سے جو ہوشیار آئے گا

آپ ہی سے کے تو اشارہ سے میرا اک کام ہوا — چھپ گئے آپ تو، میں مفت میں بدنام ہوا
کہیں تنہا بھی نہ تھا، رات اندھیری بھی نہ تھی — قتل میں تو سرِ بازار سرِ شام ہوا
خوفِ رسوائی سے آیا جو لحد تک خاموش — لوگ سمجھے ترے بیمار کو آرام ہوا
بادۂ عشق کا یہ خاص اثر ہے بیخودؔ، — سل گئے ہونٹ جہاں لب سے جدا جام ہوا

مشرق کی سمت کیوں شب وعدہ ہے روشنی — نکلے گا آج رات کو بھی آفتاب کیا،
دم بھر کے بعد تم مجھے پہچانتے نہیں، — اب اس سے بڑھکر اور مٹے گا شباب کیا
بیٹھے ہوئے ہیں سامنے صورت تو دیکھئے — بیخودؔ ہیں نام کے یہ پئیں گے شراب کیا

بہت دشوار تھا میدان ہستی سے گزر جانا — بہت مشکل سے سیکھا عمر بھر میں ہم نے مرجانا

زخم دل ہوں مسکرانا بھی مرا رونا ہوا — میرا ہنسنا تو نہیں معلوم کیا ہو جائے گا
پہلے ہی زخمی نہ کرلوں دل کو نوکِ تیر سے — کیا کروں گا تیر جب ان کا خطا ہو جائے گا

شرم عصیاں بھی مرے ساتھ ہے مظلومی بھی — دادرِ حشر، مرا حشر جدا ہونا تھا
آپ کی یاد نے سب کام بنائے میرے — عشق سے کچھ نہ ہوا عشق سے کیا ہونا تھا

دل صاف اگر ہوتا پردے کا گلہ ہوتا — میں آئینہ بن جاتا وہ جلوہ نما ہوتا
کیوں دل کے تقاضے پر بیوقت دعا مانگی — کچھ جبر کیا ہوتا کچھ صبر کیا ہوتا
مے تلخ نہ تھی اتنی تلخی تھی جدائی کی — وہ ساتھ اگر پیتے کچھ اور مزا ہوتا
بیخودؔ نے محبت کو بدنام کیا آخر، — یہ جام جو پینا تھا، ہونٹوں کو سیا ہوتا

تمہارے بعد سنا ہے مری اجل آئی — تمہارے ساتھ سنا تھا مرا شباب گیا
گنتی مصیبتوں کی شب غم نہ پوچھئے — ایسا ہجوم تھا کہ مرا دم اُلٹ گیا
دامن کسی کا کھینچ رہا تھا خیال میں — اب دیکھتا ہوں میرا گریبان پھٹ گیا

پیامِ عشق بھیجا تھا اُدھر سے یہ جواب آیا — بلایا کس نے اس کو کیوں دلِ خانہ خراب آیا
مجھے کس طرح باور ہو کہ وہ تشریف لاتے ہیں — کلیجہ میں نہ ٹیس اُٹھی نہ دل میں اضطراب آیا
چراغِ طور روشن ہو گیا حسن جوانی سے — صدائے لن ترانی آئی جب اُن کا شباب آیا
تمہاری ایک محفل، اس میں یہ دو رنگ کیسے ہیں — کہیں آنکھوں میں اشک آئے کہیں جام شراب آیا
نہ تھا پھر مدعی دیدار کا کوئی وہی وہ تھے — غرورِ حسن جب بڑھکر اُلٹنے کو نقاب آیا

بھری محفل میں حسن و عشق کا باہم اثر دیکھا — کبھی اُس نے اِدھر دیکھا کبھی ہم نے اُدھر دیکھا

ترے دیدار سے بڑھکر نہیں کوئی خوشی ہم کو — ہلال عید بھی ہم نے ترا منہ دیکھ کر دیکھ
محبت دل میں لائے تھے محبت سے غرض رکھی — غرض یہ ہے یہی اک خواب ہم نے عمر بھر دیکھ

خواب میں بجود وہ آئے مسکرا کر کہہ گئے — جاگ کر سو جائے پھر تقدیر یہ ممکن نہ

جفائیں تم کئے جاؤ، وفائیں میں کئے جاؤں — تم اپنے فن میں کامل ہو میں اپنے فن میں یکتا
اجل نے منہ پہ منہ رکھکر دم آخر کہا مجھ سے — ادھر تو دیکھو، آنکھیں کھول میں تیری تمنا ہو

ہمیں ہم ہیں تو یہ آنکھوں پہ کیسا پڑ گیا پردہ — تمھیں تم ہو تو کیوں پوشیدہ صورت ہم سے کر
شکایت پر ستم کی اُس ستمگر نے کہا مجھ سے — اسی منہ پر اسی دل سے محبت ہم سے کرنے
غافل ہے وہ مجھ سے مجھے کس طرح یقیں ہو — آنکھوں میں پھرا کرتا ہے ہر وقت کہیں
جب عرش پہ رہتے تھے تو اب دل کے مکیں ہو — پہچان لیا میں نے تمھیں تھے وہ تمھیں
موسیٰ کی طرح اور بھی ہیں طالب دید — جب جلوہ نما طور پہ تھے اب بھی کہیں

غصہ میں بھی جھکتے ہوئے دیکھا جو نظر کو — مرہم کی ضرورت نہ رہی زخم جگر کو
کیا آگ لگائے کوئی نالے کے اثر کو — پہلو میں وہ بیٹھے ہیں جھکائے ہوئے سر کو
میں چشم عنایت کا بھروسہ نہ کروں گا — سو رنگ بدلتے ہوئے دیکھا ہے نظر کو
میں پوچھ تو سکتا نہیں رستہ ترے گھر کا — حیرت سے تکا کرتا ہوں ہمراہ گزر کو

موت رخصت ہوئی وہ صبح کا تارا چمکا — اب سنبھلنے دے ذرا اے شب ہجراں مجھ
رونق گلشن و گل تھی مرے دم سے صیاد — پھوٹ کر روئے نہ کیوں ابر بہاراں مجھ
رات بھر شمع کی مانند جلایا شب وصل — رات بھر کا وہ سمجھتے رہے مہماں مجھ

غیر کے نام کی تاثیر تھی یا شوخی تھی — فکر تو یہ ہے تڑپتے ہوئے دیکھا ت
شعلۂ حسن نے جمنے ہی نہ دی رخ پہ نظر — دیکھ کر بھی نہیں دیکھا ابھی گویا تم

جان بھی نذر حاضر تھی، اجل نے دیر کی — آپ سمجھے تھے ٹالا آپ کے ارشاد
وہ تو کیا اس کو بناتا، رنگ بھرتا، کھینچتا — یاں تری تصویر نے چمکا دیا بہزاد

نیاز عشق و ناز حسن کی تصویر کھنچتی ہے — ہمارے ہاتھ پر دل ہو تمھارا ہاتھ دل پر
ملا ہوگا نہ مجھ سا قدرداں درد محبت کو — نکل جاتا ہے دم میرا اگر تسکین دم بھر

دل تھا تیار ہو ہجر میں رُلوانے کو — کیا سنبھالا ہے چھلکتے ہوئے پیمانے
ہاتھ سے ذبح کرو، اُٹھ نہیں سکتی جو چھری — ہم تو بے موت بھی موجود ہیں مرجانے

چونک اُٹھتا ہوں کہ دُنیا سے سفر کرنا ہے — کوئی تیار جو ہوتا ہے کہیں جانے کو
کئی میدان تو ایسے ہیں کہ تڑپا دیں گے — ختم تک کون سنے گا مرے افسانے کو

دل ہو پہلو میں تو ہو دل میں محبت کیوں ہو — آدمی کے لئے دُنیا میں قیامت کیوں ہو
ہم نے بیخود تجھے ہنستے ہوئے دیکھا نہ کبھی — زندگی خواب سہی صرف متانت کیوں ہو

آنکھوں سے رواں اے دل یوں اشک تمنا ہو — رک جائے تو موتی ہو بہ نکلے تو دریا ہو
جھگڑا یہ مٹے کیونکر دل ہو گیا جب خود سر — میں کہتا ہوں میرا تھا، تم کہتے ہو میرا ہو

تمھیں غرض جو دلِ داغدار کو دیکھو — تم اپنے حسن کو اپنی بہار کو دیکھو
اسی پہ کہتے تھے قایل نہ ہم کبھی ہونگے — یہ کیا ہوا نگہ سحر ساز کو دیکھو

مجھکو مٹا رہے ہو کہ میری وفا کو تم، — اب میں وفا سے پہلے مٹوں یا وفا کے ساتھ
بلبل کہیں قفس میں، بنائے گی آشیاں — تنکے چمن سے اُڑکے چلے ہیں صبا کے ساتھ

وحشت نے باریاب کیا، کیا کہوں، کہاں — دیوانگی کو عشق کو دولت عطا ہوئی،

جب آہ کھینچتا ہوں دل داغدار سے — آتی ہے یہ صدا کہ نسیم بہار ہوں
تم آنکھ مجھ سے پھیر لو مت جاؤں گا ابھی — کیوں پائمال گردش لیل و نہار ہوں،

سب پہلے تو منہ ہی منہ میں خدا جانے کیا کہا — اب مجھ پہ یہ عتاب ہے تو نے سنا نہیں
خلوت سمجھ رہا ہوں تری بزم ناز کو — میں کیا کروں کہ غیر مجھے سوجھتا نہیں

سہے ہیں ظلم اتنے بن گیا ہوں درد کا پتلا — جو توڑا پھول گلشن میں تو کانٹا چبھ گیا دل میں
دُعائے با اثر پیدا کروں گا توڑ کر دل کو — دوائے درد دل مل جائے گی ٹوٹے ہوئے دل میں

دم آخر نہیں ارمان میری زندگی کے ہیں — وہ اب سمجھے کہ یہ سارے تعلق جیتے جی کے ہیں
جدائی میں بھی پیمانِ ازل بھولے نہیں اب تک — وہاں بھی آپ ہی کے تھے یہاں بھی آپ ہی کے ہیں

منہ پھیر کے بیٹھو ابھی غصہ ہے نظر میں — اب تیر سے پڑ جائے گا ناسور جگر میں
طے راہ فنا کرتا ہوں میں شمع کی مانند — اک پاؤں مرا گھر میں ہے اک پاؤں سفر میں

ہو نہ رونے میں اثر اے بیکسی تو کیا کریں — یہ تو ہو سکتا ہے ہر آنسو کو ہم دریا کریں
یوں ورق اُلٹے زمانے کا تو کیسی سیر ہو — روز تم ہم کو مناؤ، روز ہم روٹھا کریں
ہم نے یہ مانا نہیں دشوار کچھ ترک وفا — گفتگو تو صرف اس میں ہے کہ ہم ایسا کریں

کچھ ایسی بات مجھ سے منہ بنا کر گل نے کہدی ہے — مزا آتا نہیں بلبل کی اب نغمہ سرائی میں

قیامت میں اجل کب آئے گی دیدار تو ہوگا　　تمنا تھی ہمیں ہم جان دیتے رونمائی میں،

میرے سب کام ہیں جب تیری خوشی پر موقوف　　تیری ہر بات کو کیوں اپنا مقدر نہ کہوں

ہم کو رسوائی کا شکوہ ہے تو اپنے دل سے ہے　　آپ نے جو کچھ کیا اس کا گلہ کچھ بھی نہیں

در مسجد ہی پہ میخانہ ہے بیخود افسوس　　مجھ کو بدنام مرے نقش قدم کرتے ہیں

نکالوں پاؤں سے کانٹے مگر جب ہاتھ خالی ہو،　　ابھی کچھ تار باقی رہ گئے ہیں جیب و داماں میں

خزاں میں کون پی کر آنسوؤں سے خون کے رہئے　　مزے وہ رنگ و بو کے چھوڑ آئے ہم گلستاں میں

وہ بیوفا کہے مجھے، جس سے وفا کروں　　میں بدنصیب اپنے مقدر کو کیا کروں

چبھے کسی کے نہ دل میں الٰہی یہ کانٹا　　ہزار طرح کی تکلیف ہے محبت میں

وصال و ہجر کو ہم ایک ہی سمجھتے ہیں　　کسے خبر ہے کہ کیا ہے ہماری قسمت میں

کیا محبت بھی گئی بیخود کے ساتھ　　اب کہیں اس بات کے چرچے نہیں

بہار گل کو کب وہ سیر کے قابل سمجھتے ہیں،　　ہر اک ٹوٹے ہوئے غنچے کو میرا دل سمجھتے ہیں

ہمارا قتل کیا دشوار تھا باتوں سے مر جاتے　　مگر مشکل تو یہ ہے وہ اسے مشکل سمجھتے ہیں

وہی ہم وہی دل وہی دل کی حسرت　　قیامت میں بچھڑے ہوئے مل گئے ہیں

قلق ہے رنج ہے غم ہے الم ہے داغ فرقت ہے　　محبت میں یہ سب سامان میری بیکسی کے ہیں،

سمجھے رونا وفا کا ہے مجھے رونا محبت کا　　مرے رونے پہ ہنستے ہو محل یہ کب ہنسی کے ہیں

وہ سن کر حور کی تعریف پردے سے نکل آئے　　کہا پھر مسکرا کر حسن زیبا اس کو کہتے ہیں

اجل کا نام دشمن دوسرے معنی میں لیتا ہے　　تمہارے چاہنے والے تمنا اس کو کہتے ہیں

مرے مدفن پہ کیوں روتے ہو عاشق مر نہیں سکتا　　یہ مرجانا نہیں ہے صبر آنا اس کو کہتے ہیں

نمک بھر کر مرے زخموں میں تم کیا مسکراتے ہو　　مرے زخموں کو دیکھو مسکرانا اس کو کہتے ہیں

زمانے سے عداوت کا سبب تھی دوستی جن کی　　اب ان کو دشمنی ہے ہم سے دنیا اس کو کہتے ہیں

دکھاتے ہم نہ آئینہ تو یہ کیونکر نظر آتا　　بشر حوروں سے اچھا تم نے دیکھا اسکو کہتے ہیں

بلاؤ بزم میں غیروں کو تم اس کی ضرورت کیا　　جہاں تم ہو جہاں ہم ہوں وہاں سارا جہاں بھی ہو

جان دینے نہیں دیتے مرے ارماں مجھکو　　زندہ در گور سمجھ اے شب ہجراں مجھ کو

ناامیدی نے کیا ہے یہ پریشاں مجھکو　　اب تو ہے اُن کی تمنا کا بھی ارماں مجھ کو

غیر کی بزم سے آئے تھے عیادت کے لئے　　یاد ہے یاد ہے وہ آپ کا احساں مجھ کو
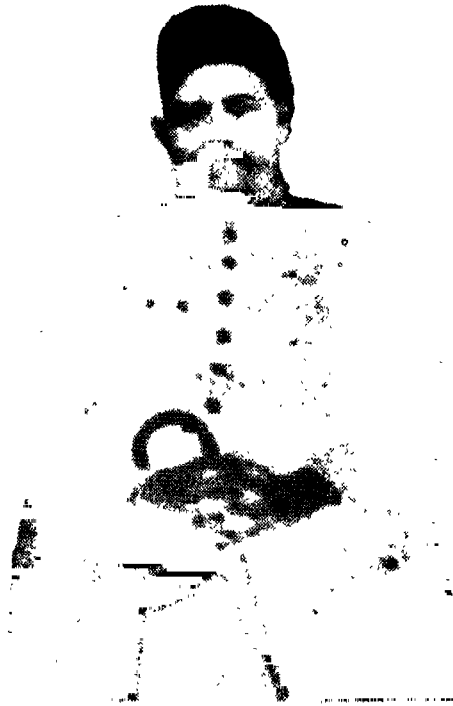
تاجور نجیب آبادی (وفات ۳۰ر جنوری ۱۹۵۱ء)

حامداً ومصلیاً

محترم آنریبل سید صاحب قبلہ!

ہدیۂ عقیدت۔ ایک عریضہ اس سے قبل حبیب آباد سے ارسال خدمت
کرچکا ہوں۔ مگر محروم جواب رہے۔

میں آج کل اردو مرکز کی جانب سے مشہور مصنف مرزا محمد سعید دہلوی ایم اے
آئی۔ ای۔ ایس (ریٹائرڈ) کی معرکۃ الآرا تصنیف "مذہب اور باطنی تعلیم" کی کتابت
کرا رہا ہوں۔ یہ کتاب ۵۵۰ صفحات کی ہوگی اور مصور شائع کی جائے گی
اس پر ۱۴ سو روپیہ لاگت کا اندازہ ہے۔

حدادب۔
نیازکیش تاجور ایڈیٹر شاہکار

تاجور نجیب آبادی

میں نسباً درّانی افغان ہوں، اپنے وطن نجیب آباد میں فارسی عربی کی ابتدائی تعلیم میں نے اپنے برادر معظم سے حاصل کی۔ ماہ صفر ۱۳۲۲ھ میں دس سال کی عمر میں دارالعلوم دیوبند کا طالب علم بنا۔ دس سال وہاں رہ کر درس نظامیہ کی تکمیل کر کے اگست سنہ ۱۹۱۳ء میں لاہور آیا۔ اور حسب ایماء حضرت شمس العلماء مفتی عبداللہ ٹونکی، اورینٹل کالج میں داخل ہوا۔ پنجاب یونیورسٹی سے سنہ ۱۹۱۵ء میں مولوی فاضل اور سنہ ۱۹۱۶ء میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ سنہ ۱۹۱۶ء ہی میں رسالہ مخزن کا اڈیٹر بنا۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں دیال سنگھ کالج لاہور میں فارسی اور اُردو کے اُستاد کی حیثیت میں میرا تقرر ہوا۔ اسی سال رسالہ ہمایوں لاہور میں معاون مدیر بنایا گیا۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں رسالہ ادبی دنیا اور سنہ ۱۹۳۱ء میں رسالہ شاہکار جاری کیا۔ ادبی دنیا میری انتظامی ناقابلیت اور زود اعتمادی کے سبب میرے ہاتھ سے منتقل ہو کر دوسرے ہاتھوں میں پہونچ گیا اور شاہکار ابتک میری نگرانی میں جاری ہے۔ میں نے سارا عہد طالب علمی امتیازی شہرت میں بسر کیا تھا۔ مگر غالباً کسی گناہ کبیرہ کی پاداش کے طور پر قدرت نے مجھے اُردو کے جنون خدمت میں مبتلا کر دیا۔ اُردو زبان و ادب کی راہ میں اپنا ذاتی سرمایہ تیس ہزار روپیہ کاروباری آمدنی کا، اپنی جوانی صحت و طاقت اور متعلقین کا حال و مستقبل سب کچھ نثار کر دیا

اُردو مرکز کے نام سے سنہ ۱۹۳۳ء میں ایک ادارہ تصنیف و تالیف قایم کیا تھا۔ جو اب تک قائم ہے میرے ہندوستانگیر شہرت رکھنے والے شاگردوں کی ایک جماعت اُردو اصناف ادب کے ہر شعبے میں رہنمایانہ خدمت انجام دے رہی ہے یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ جدید دور ادب کی تعمیر کرنے والوں میں ۸۰ فیصدی میرے شاگرد ہیں۔ اُردو میری تفریح تھی لیکن شامت اعمال سے یہ تفریح عذاب زندگی ہو گئی۔ چونکہ میرا مجموعۂ کلام ابھی تک شایع نہ ہو سکا۔ اس لئے جدید دور کے نام نہاد نقادوں کے دائرۂ تعارف سے آج تک خارج ہوں، متعدد اصنافِ ادب میں بیسیوں شاگردوں کو آسمان شہرت پر پہونچا دیا۔ لیکن ماہناموں کے صفحات سے اُردو نثر کی تاریخ مرتب کرنے والے اُن تابناک ستاروں کے مبدأ نور سے بےخبر رہے ہیں۔ اِدھر جس ادبی فضا میں زندگی کے ۲۵ سال بسر کر چکا ہوں، وہ میرے لئے اس وجہ سے ناساز گار چلی آتی ہے کہ میں دریائے ستلج کے اُس پار کیوں پیدا ہوا۔

اوائلِ مشق کا کلام تو اگر گم نہ ہوتا تو میں اُسے خود گم کر دیتا۔ البتہ اواسطِ مشق کے ایک مجموعے کے گم ہونے کا افسوس ہے۔ غالباً کسی شاگرد کی سعادتمندی اس سرقے کی مرتکب ہوئی۔ اِس مجموعے کے گم ہو جانے سے میری ہمت شکستہ ہو گئی اور پھر کبھی میں نے اپنے کلام کی فراہمی کی جانب توجہ نہیں کی۔

میرا کلام وقتاً فوقتاً پنجاب کے اخبارات اور ماہناموں میں شایع ہوتا رہا ہے۔ میرے پاس اس کی کوئی نقل بھی نہیں نہ یہ یاد کہ کس پرچے میں کب شایع ہوا۔ حافظہ بھی اب کمزور ہو چکا ہے۔ تاہم مدیر محترم نگار کے امتثال امر کے لئے چند اشعار منتخب کر کے پیش کر رہا ہوں:

تاجور

اب عشق سے لو لگائیں گے ہم
اس درد کو دل بنائیں گے ہم
اب آپ بنیں گے اپنی دُنیا
دُنیا سے تجھے بھول جائیں گے ہم

غم کی تنہائی میں جب وہ خوابِ حسیں یاد آتا ہے
یوں ہی بیٹھے بیٹھے دل کو جانے کیا ہو جاتا ہے
راتوں کو جب تارے گنتے گنتے گھبرا جاتا ہوں
دوست کی یاد میں دوست کی یاد سے دل مجھکو بہلاتا ہے

یہ قطرۂ خوں دل نام ہے جس کا اے چشمِ مستِ ساقی
اِس فتنے کو مت چھیڑ صبا دا حشر کوئی برپا کر دے
اے دوست ترے ہوتے بھی طلسمِ راز بنی ہو کیوں ہستی؟
اِس چہرے سے بھی نقاب اُٹھا اس راز کو بھی رسوا کر دے
محروم نظر ہے دل میرا اے حسنِ اتم اے بحرِ کرم
اِس ذرّے کو خورشید بنا، اس قطرے کو دریا کر دے
اے واعظ کیا سمجھا تو ہے؟ میں اُس کا دیکھنے والا ہوں
جو اپنی ایک نظر سے پتھر میں بھی دل پیدا کر دے

غمِ محبت میں دل کے داغوں سے روکشِ لالہ زار ہوں میں
فضا بہاریں ہے جسکے جلووں سے وہ حریفِ بہار ہوں میں
کھٹک رہا ہوں ہر اک کی نظروں میں، بچ کے چلتی ہے مجھ سے دُنیا
زہے گراں باریٔ محبت کہ دوشِ ہستی پہ بار ہوں میں
یہاں ہو تو وعدۂ وفا کر کے اور مرے بھول جانے والے!
مجھے بچا لے کہ پائمالِ قیامت انتظار ہوں میں
تری محبت میں میرے چہرے سے ہے نمایاں، جلال تیرا
ہوں تیرے جلووں میں محو ایسا کہ تیرا آئینہ دار ہوں میں
وہ حُسنِ بے التفات اے تاجور ہوا التفات فرما
تو زندگی اب سنا رہی ہو کہ عمر بے اعتبار ہوں میں

ہر عشق تری اُلفت کے سوا آئینہ ہے خود غرضی کا
جو تجھ سے محبت کرتے ہیں وہ تجھ سے محبت کرتے ہیں

یہ ستم قیدِ قفس میں صیاد!
کس نے پوچھا تھا بہار آئی ہے؟

خانہ بربادِ چمن برسوں قفس میں ہمصفیر!
آشیاں سے چھُٹ کے خوابِ آشیاں دیکھا کئے

اب قفس میں تو کسے چھیڑے گی اے بادِ بہار
رہ گئے ہیں یادگارِ بلبلِ ناشاد، ہم

چمن والو چمن جب ہو چکا تاراج بربادی،
قفس کی زندگی اپنے لئے دشوار کر لیتے

رہ رہ کے برق گرتی ہے اِن پر ہی بار بار
گلشن میں چار تنکے مرے آشیاں کے ہیں!

اہلِ چمن نویدِ قفس کی ہے آرزو
صیاد سے بھی بڑھ کے ستم باغباں کے ہیں

تجھے کیا سناؤں یہ حادثہ کہ چمن میں جوشِ بہار ہے
مجھے ہم صفیر قفس کی قید میں کیا نویدِ بہار دوں

غمِ آشیاں مرے بال و پر کے قفس کو پھونک نہ دے کہیں
یہ نویدِ مرگ ہے ہم قفس کہ چمن میں جوشِ بہار ہے

یہ لٹی ہوئی سی بہار کیوں ہے کہاں وہ جانِ بہار ہے؟
یہ چمن سے کون چلا گیا کہ کلی کلی کو فشار ہے

یہ انیسِ غمکدۂ قفس، ہے عزیز جاں مجھے ہمنفس!
دلِ داغدارِ غمِ بہار میں یادگارِ بہار ہے

ترے باغ میں ہو بہار، تجھ کو مبارک، اے مرے باغباں!
جو کھبا ہے میری نظر میں پھول وہ انتخابِ بہار ہے

بس رہا ہے مری آنکھوں میں وہی جانِ بہار
جس کا ہم رنگ کوئی پھول چمن بھر میں نہیں

محفلِ حشر بھی سونی نظر آتی ہے مجھے
ڈھونڈتی ہیں جسے نظریں وہی محشر میں نہیں

نہ دے بشارتِ بادِ بہار اے صیاد
چمن سے کیا انھیں جو بال و پر نہیں رکھتے

وفا کے گائے ہوئے گیت گا رہا ہوں میں
سنی سنائی کہانی سنا رہا ہوں میں

جفائے دوست بنی رہنمائے منزلِ دوست
وہ ٹھوکریں ہیں مجھے اُن کو پا رہا ہوں میں

ہے میری خاک کے ذروں میں پھر نمودِ حیات
کہیں انھیں تو نہیں یاد آ رہا ہوں میں

محبت! آہ محبت کی زندگی مت پوچھ،
بڑی مصیبتوں میں مبتلا رہا ہوں میں

ہے کائنات کا ہر ذرہ ہمنوا میرا
کچھ ایسا محفلِ ہستی پہ چھا رہا ہوں میں

مرا فسانۂ غم دل نے بھی کبھی نہ سنا
قتیلؔ شکوۂ درد آشنا رہا ہوں میں

سچ ہے کہ دل فریبیٔ رنگِ رخِ بہار کیا
حسن پہ اعتماد کیوں وقت کا اعتبار کیا

لے غمِ مرگ بے کسی جان ترے سپرد ہے
دوست بہانہ ساز کا کیجئے اعتبار کیا

اپنی نظر میں بھی مجھے وقفِ جنوں بنائیگی
یہ مری بات بات پر آپ کی بار بار کیا،

مان لیا کہ تاجور وہ نہیں اختیار میں
کہئے تو اپنے دل پہ ہے آپ کو اختیار کیا

محبت آہ جو تو کامیاب ہو نہ سکی،
ہوس میں عمر کو صرفِ گناہ کر دوں گا

جو مجھ سے چھین لیا دہر خود غرض نے تجھے
مٹوں گا لیکن اسے بھی تباہ کر دوں گا

نہ دل بدلا نہ دل کی آرزو بدلی نہ وہ بدلے
میں کیسے اعتبارِ انقلابِ آسماں کر لوں

سبب ہر ایک مجھ سے پوچھتا ہے میرے رونے کا
الٰہی ساری دنیا کو میں کیونکر رازداں کر لوں

حشر میں پھر وہی نقشہ نظر آتا ہے مجھے
آج بھی وعدۂ فردا نظر آتا ہے مجھے

خلشِ عشق مٹے گی مرے دل سے جب تک
دل ہی مٹ جائیگا ایسا نظر آتا ہے مجھے

رونقِ چشمِ تماشا ہے مری بزمِ خیال،
اِس میں وہ انجمن آرا نظر آتا ہے مجھے

اُن کا ملنا ہے نظر بندیِ تدبیر اے دل
صاف تقدیر کا دھوکا نظر آتا ہے مجھے

تجھ سے میں کیا کہوں اے سوختۂ جلوۂ طور
دل کے آئینے میں کیا کیا نظر آتا ہے مجھے

دل کے پردوں میں چھپایا ہے ترے عشق کا راز
خلوتِ دل میں بھی پردہ نظر آتا ہے مجھے

عبرت آموز ہے بربادیِ دل کا نقشہ
رنگِ نیرنگیِ دُنیا نظر آتا ہے مجھے

اے آرزوے شوق تجھے کچھ خبر ہے آج
حُسنِ نظر نواز حریفِ نظر ہے آج

ہر رازداں ہے حیرتیِ جلوہ ہائے راز
جو با خبر ہے آج وہی بے خبر ہے آج

کیا دیکھئے کہ دیکھ ہی سکتے نہیں اُسے
اپنی نگاہِ شوق حجابِ نظر ہے آج

دل بھی نہیں ہے محرمِ اسرارِ عشقِ دوست
یہ رازداں بھی حلقۂ بیرونِ در ہے آج

کل تک تھی دل میں حسرتِ آزادیِ قفس
آزاد آج ہیں تو غمِ بال و پر ہے آج

دامنِ نگاہ میں جلوہ ہائے حُسنِ دوست
بجلیاں بھری ہوئی دامنِ نگاہ میں

حُسنِ بے نیاز کی ٹھوکروں سے پائمال
عشق! بے پناہ آئے ہیں تری پناہ میں

شش جہت بنی ہے جلوہ گاہِ دوست تا جور
جب سے جلوہ گر ہے دوست وسعتِ نگاہ میں

میرا ہونا تہمتِ ہستی بنا میرے لئے
اپنی فطرت پر میں اک الزامِ بے بنیاد ہوں

ملامت گرو! اُن کو ضد پر بٹھا رہی
نہیں بھی اگر چاہتا، چاہتا ہوں

خدا مجھ کو تجھ سے ہی محروم کر دے
جو کچھ اور تیرے سوا چاہتا ہوں،

میں کیا چاہتا ہوں؟ بتاؤں تمھیں کیا؛
میں خود سوچتا ہوں میں کیا چاہتا ہوں

نظر بھر کے جو دیکھ سکتے ہیں تجھ کو
میں اُن کی نظر دیکھنا چاہتا ہوں

جو دیکھتے ہیں تجھے اور دیکھ سکتے ہیں
مری نگاہ میں ذوقِ نظر نہیں رکھتے

کہیں رسوا نہ ہوں رنگینیاں دردِ محبت کی
مرا اتنا خیال اے دیدۂ خوں بار کر لینا

بس اتنی داد دینا بعد میرے میری اُلفت کی
کہ یاد آؤں تو اپنے آپ کو تم پیار کر لینا

دل کے ہاتھوں آہ اُٹھوائے گئے محفل سے ہم
آج دل برداشتہ سے ہو رہے ہیں دل سے

بیکسی میں اک انیسِ کُنجِ تنہائی ہے دل،
دل کی باتیں کرتے رہتے ہیں شبِ غم دل سے

نوازشِ گردشِ زمانہ حریفِ عمرِ رواں رہے گی
حواسِ خمسہ بجا ہیں جب تک جفائے ہمتِ آسماں رہے گی

محبّتِ دوست تا دمِ مرگ راحت افروزِ جاں رہے گی
زباں پہ جاری رہیگا یہ نام مُنہ میں جب تک زباں رہے گی

کس کی یاد آ کر تجھے محوِ تحیّر کر گئی
خود فراموشِ جنوں اِسوقت کس عالم میں ہے؟

تو ہوا نذرِ قفس اے تو گرفتارِ قفس
باغ میں ہر گُل گریباں چاک تیرے غم میں ہے

برداشت دردِ عشق کی دشوار ہو گئی
اب زندگی بھی جان کا آزار ہو گئی

ہے وجہ انبساط محبّت میں اعتدال
جب حد سے بڑھ گئی رسن و دار ہو گئی

خود داریِ جنوں نے نہ جانے دیا وہاں
کمبخت راہِ دوست میں دیوار ہو گئی

اُلفت ہے راز، راز کی حدتک ہی سرفراز
جب داستانِ بزم بنی خوار ہو گئی،

اُس بزمِ خاص میں تھا کبھی عشق باریاب
بے امتیازیوں سے آج جو بازار ہو گئی،

اُف وہ نظر کہ سب کے لئے دل نواز ہے
میری طرف اُٹھی ہے تو، تلوار ہو گئی،

جنسِ ہنر مذاق خریدار دیکھکر
خود بے نیازِ چشم خریدار ہو گئی،

خانہ بربادی کے ہاتھ آئی نہ میری بزمِ عیش
بجلیوں کو میرے خرمن کا پتہ ملتا نہیں

بتا نہ مجھکو محبت کی خود فراموشی !
کہ اپنے بھولنے والے کی یادگار ہوں میں

محبت میں زیاں کاری مرادِ دل نہ بن جائے
یہ لاحاصل ہی عمرِ عشق کا حاصل نہ بن جائے

مجھی پر پڑ رہی ہے ساری محفل میں نظر اُن کی
یہ دلداری حسابِ دوستاں دردل نہ بن جائے

کروں گا عمر بھر طے راہِ بے منزل محبت کی
اگر وہ آستاں اس راہ کی منزل نہ بن جائے

یہ متوالی نظر یہ بادۂ بے جام ارے توبہ
کسی پر بے بنی اے ساقی محفل نہ بن جائے

ترے انوار سے ہے نبضِ ہستی میں تڑپ پیدا
کہیں سارا نظامِ کائنات اک دل نہ بن جائے

کہیں رسوا نہ ہو اب شانِ استغنا محبت کی
مری حالت تمھارے رحم کے قابل نہ بن جائے

مرزا ثاقبؔ لکھنوی (وفات ۱۹۴۹ء)

غزل

وہی ذات باری کو پہچانتا ہے — جو اپنی حقیقت کو خود جانتا ہے

اٹھاتا ہے دل دلنشیں دوستوں پر — مگر میرا کہا نہیں مانتا ہے

لائق نیاز و در طرف تغافل — یہ میں جانتا ہوں وہ تو جانتا ہے

خشیت وہاں ہے بعنوان دیگر — جہاں اور کچھ دل میں تو ٹھانتا ہے

ستمگر وہی چپ ہے راضی ہے ورنہ — گلہ کیجئے تو برا مانتا ہے

بری ہو نہیں لوث گنہ سے مگر دل — مجھے اپ کردار میں سانتا ہے

ادھر سنگ نہیں اُدھر میرا قاتل — ہے نقش دامن کہ گرد انتا ہے

صفائی کہاں خاکدان جہاں میں — وہ سب کر کرا ہے جو تو چھانتا ہے

غنیمت ہے ثاقب کا دم لکھنؤ میں
وہ جو کچھ برا یا بھلا جانتا ہے

الراقم
خاکسار میرزا ثاقب قزلباش
۲۴ ماہ مارچ سنہ ۱۴ء

میرزا ثاقب لکھنوی

میرزا ذاکر حسین نام، ثاقب تخلص، وطن طبرستان، مولد اکبرآباد (آگرہ) گہوارۂ تعلیم و تربیت لکھنؤ۔ سلسلۂ نسب حاجی علی قزلباش ماژندرانی المعروف بہ علی قلی خاں شاملو سے ملتا ہے، جو شاہ طہماسپ صفوی کے معتمد علیہ تھے۔

میرزا ثاقب کے آبا و اجداد نے اکبرآباد میں سکونت اختیار کی اور یہ ۲ر ماہ جنوری ۱۸۶۹ء مطابق ۱۹ر ماہ مبارک رمضان ۱۲۸۵ھ کو یہیں پیدا ہوئے۔ میرزا کی ولادت کو تقریباً چھ ماہ کا زمانہ گزرا تھا کہ نامساعدت روزگار نے میرزا کے والد ماجد کو اکبرآباد چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ بڑے میرزا صاحب مرحوم مع اہل و عیال لکھنؤ چلے آئے اور یہیں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی۔

میرزا کی ابتدائی تعلیم قدیم اسلوب پر ہوئی اور پھر انگریزی تعلیم کے لئے آگرہ بھیجے گئے، وہاں تقریباً چار سال قیام رہا اور یہیں میر مومن حسین صفی کی صحبت میں اُن کی شاعرانہ اہلیت بروئے کار آئی۔ ماہ دسمبر ۱۸۹۱ء میں میرزا کی شادی ہوئی۔ اب عرصہ سے ریاست محمود آباد کے وثیقہ دار ہیں۔

دیارِ دل میں کہیں دوست کا پتا نہ ملا
وہ بدنصیب ہوں کعبے میں بھی خدا نہ ملا

شریکِ قید تھے جذباتِ دل مگر بیکار
قفس تھا ایسا کہ نالوں کو راستا نہ ملا

متاعِ عشق کا ہو دل کے بعد کیا سودا
کہ گم شدہ کا بھروسا نہیں ملا نہ ملا

یہ کس نے غمکدہ دنیا کا نام رکھا ہے
ہمیں تو کوئی یہاں درد آشنا نہ ملا

میں امتحاں کدۂ دہر سے اٹھا جب سے
خبر نہیں مگر اتنی کہ دوسرا نہ ملا

چھپا ذات کو جس رنگ یا جس بھیس میں چاہو
مگر چشمِ حقیقت بیں سے پردا ہو نہیں سکتا،

کس جلوے پہ مرتے ہیں ہم سے نہ کوئی پوچھے،
پہچان نہیں سکتے لیکن کبھی دیکھا ہے

ہے طور پہ اک خلوت بجلی کی تجلی میں، ہشیار سرک جائیں، سنتے ہیں کہ پردا ہے

جو کچھ ہوا عالم میں ہوتا نہ تو کیا ہوتا بہتر تھا بگڑنے کو یہ دل نہ بنا ہوتا،

دم نہیں لیتا دھواں دل کا نظر آئے تو کیا سیکڑوں پردے پڑے ہیں دیدۂ ادراک پر

میں تو ہوں مارا ہوا دل کا اگر شک ہو تو آپ اور اسی صورت کا اک بیمار پیدا کیجئے
دل سے جھگڑا کس لئے بیکار پیدا کیجئے توڑ کر شیشے کو کیوں تلوار پیدا کیجئے

سوائے رحمت رب کچھ نہیں ہے بہت کچھ تھا مگر اب کچھ نہیں ہے
نہ پوچھو دل سے اُسکی راہ کا حال سوائے عشق مذہب کچھ نہیں ہے
اندھیرے میں وہ سوجھی یہ نہ سوجھی تری شب ہے مری شب کچھ نہیں ہے

جو سر پہ بلا آئی وہ غفلت ہی سے آئی، ہے سوئے ہوئے خواب پریشاں نہیں دیکھا

مل گئے ہوں گے کہیں حسرت بھرا دل اور آپ خواب دیکھا ہے کہ اک افسردہ محفل اور آپ
آسئے گا ہاں گھیرے گزر جانے کے بعد ایک دن ہوگی یہی برباد منزل اور آپ
خوف محشر کس لئے، آنکھوں کو دھوکا ہو گیا ایک ہی صورت کے ہونگے میرا قاتل اور آپ

مجھ کو یقینِ وعدۂ فردا ضرور تھا، مشکل یہ آپڑی تھی کہ دل ناصبور تھا،
گلشن بہار پر تھا نشیمن بنالیا میں کیوں ہوا اسیر مرا کیا قصور تھا،
پیدا ہوا ہے جو مری ہستی سے انقلاب دل کا کیا دھرا ہے مجھے کیا شعور تھا،
گلچیں! برا کیا جو یہ تنکے جلا دیئے تھا آشیاں مگر ترے پھولوں سے دور تھا

میں رو رہا ہوں جو دل کو تو بیکسی کے لئے وگرنہ موت تو دنیا میں ہے سبھی کے لئے
شبِ فراق کی روز انہ آفتیں، تو بہ یہ امتحان تو ہوتا کبھی کبھی کے لئے
بہت سی عمر مٹا کر جسے بنا یا تھا مکاں وہ جلگیا، تھوڑی سی روشنی کے لئے
قفس میں چپ نہ رہوں میں تو کیا کروں کہ یہ قید نہ دوستی کے لئے ہے نہ دشمنی کے لئے

بڑھائی جس نے تری نیند مجھکو تڑپا کے وہ میری عمر گزشتہ نہ تھی کہانی تھی

جہاں تھا تنگ جس طولِ امل کے پھیل جانے سے لحد میں آگیا سارا وہ قصہ مختصر ہو کر
وجودِ بے ضرر ہوں باغباں! گلشن میں رہنے دے کسی جا پڑ رہوں گا سایۂ برگِ شجر ہو کر
ابھی تو نقطۂ موہوم ہستی ہوں زمانے میں، کسی دن دیکھ لینا پھیل جاؤں گا خبر ہو کر

گرنے لگی ہے قیمتِ دل آنسوؤں کے ساتھ کس نے اُلٹ دیا ورقِ اعتبار کو

جب زلف دیکھ لی ہے تو چہرہ بھی دیکھ لوں — گردش نہیں ہے کیا مرے لیل و نہار کو

عجب ہے اُترے دمِ ذبح اُن کی آنکھ میں خون — کٹیں کہاں کی رگیں اور کہاں لہو آئے

کہاں تک جفا حسن والوں کی سہتے — جوانی جو رہتی تو پھر ہم نہ رہتے
بڑے شوق سے سُن رہا تھا زمانہ — ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے
نشیمن نہ جلتا نشانی تو رہتی — ہمارا تھا کیا ٹھیک رہتے نہ رہتے
مری ناؤ اس غم کے دریا میں ثاقبؔ — کنارے پہ آہی لگی بہتے بہتے

اُنکی بزمِ ناز میں تو سانس بھی دل نے نہ لی — نالہ کش برسوں کا اک تصویر بنکر رہگیا

خوب سنبھلا میں نگاہِ مست ساقی کے حضور — کانپتے ہاتھوں سے گرتے گرتے ساغر رہگیا

نزع اک عید ہے روتے ہوئے وہ آئے ہیں — اے دلِ زار یہی وقت ہے مرجانے کا

دیکھ خونِ سرِ فرہاد کا رنگیں تیشہ — یہ نگینہ ہے بنایا ہوا دیوانے کا

غنیمت ہے قفس فکرِ رہائی کیا کریں ہمدم! — نہیں معلوم اب کیسی ہوا چلتی ہے گلشن میں

مرے دل کی لگی کب زندگی میں بجھنے والی تھی — دبا دی دوستوں نے مدتوں کی آگ مدفن میں

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے — جن پہ تکیہ تھا وہی پتّے ہوا دینے لگے

مٹھیوں میں خاک لیکر دوست آئے وقتِ دفن — زندگی بھر کی محبت کا صلا دینے لگے

جز زمینِ کوئے جاناں کچھ نہیں پیشِ نگاہ — جس کا دروازہ نظر آیا صدا دینے لگے

عروسِ دہر کو دل دیکے آزماؤں کیا — سنوارنے میں جو بگڑے اُسے بناؤں کیا
جو اہلِ دل پہ گزرتی ہے، مجھ پہ بھی گزری — سُنا ہوا ہو جو قصہ اُسے سُناؤں کیا
شبِ فراق کو میں جانوں یا خدا جانے — جو تم سمجھ نہیں سکتے اُسے بتاؤں کیا

حیلۂ صبر بتائیں جو تمھیں یاد رہے — ہمکو دم توڑتے دیکھو تو خفا ہو جانا
دامِ اُلفت نے قفس مجھکو دکھایا آخر — خوف کہتا تھا کہ گلشن سے جدا ہو جانا
پھول کو توڑکے دیکھو اثرِ وصل و فراق — موت ہے چاہنے والوں سے جدا ہو جانا
کس دوراہے میں کھڑا ہوں تحیر کی طرح — کہ بقا ہے مجھے ممکن نہ فنا ہو جانا
تہنیت موت کو دیتا ہے مرے دل کا مرض — عید ہے ماتمِ حسرت کا بپا ہو جانا

ہے روشنی قفس میں مگر سوجھتا نہیں، — ابرِ سیاہ جانبِ گلزار دیکھکر
وہ کیا سمجھ سکیں گے نشیب و فرازِ دہر — جو چل رہے ہیں راہ کو ہموار دیکھکر

کہنے کو مشتِ پر کی اسیری تو تھی مگر
خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا

گلشن سے اُٹھ کے میرا مکاں دل میں آ گیا
اک داغ بن گیا ہے نشیمن جلا ہوا

کیا تیرگی لئے ہوئے آئی شعاعِ نور
دیکھا شبِ فراق ازل کا لکھا ہوا

دل سے میں کہہ رہا ہوں تجھ پر ہوا فدا میں
دل مجھ سے کہہ رہا ہے او بے خبر جلا میں

تڑپا دیا ہے دل کو شاباش ہمصفیرو
یونہی پھر اک صدا دو، ٹوٹا قفس، چلا میں

اُن کی رضا پہ مرنا اک قسمِ زندگی تھی،
اپنے دلِ حزیں سے پھر کیوں ہوا خفا میں

پھر اور کس طرح سے اُجڑے مکاں کو سجتا
قصرِ لحد میں آ کر تصویر ہو گیا میں

وہ نزع کی خموشی جامِ جہاں نما تھی
اک عمر کی کہانی دم بھر میں کہہ گیا میں

جلوۂ حُسن اک اشارے میں بہت کچھ کہہ گیا
میں نہیں سمجھا مگر ہاں دل تڑپ کر رہ گیا

حادثوں کے زلزلوں سے جامِ دل چھلکا کیا
ایک چُلّو خون ہی کیا بہتے بہتے بہہ گیا

وہ شباب کے فسانے جو میں سن رہا ہوں دل سے
اگر اور کوئی کہتا تو نہ اعتبار ہوتا

یہ زمانہ بڑھ رہا ہے فقط اضطراب دل سے
شبِ غم نہ یوں ٹھہرتی جو مجھے قرار ہوتا

مری داستانِ غم کو وہ غلط سمجھ رہے ہیں
کچھ اُنھیں کی بات بنتی اگر اعتبار ہوتا

قفس کی تیلیاں اچھی ہیں تنکوں سے نشیمن کے
یہ سب کچھ ہے مگر صیاد! دل پر کیا اجارا ہے

نزاعِ خواب و بیداری وہ فیصل کر نہیں سکتے
مقابل میرے نالوں سے جوانی کا تقاضا ہے

زمانے کی بھری محفل کی آبادی مٹانے کو
بہت کچھ حُسن نے اُس آفتِ جاں کو سنوارا ہے

وردہ ہے اک آہ بھی کرنے نہیں دیتے مجھے
موت سے ہے آساں مگر مرنے نہیں دیتے مجھے

عقلِ حقیقت آشنا اور ہے کار قلب اور ہے
عشق نہیں یہ ضعف ہے، حُسن نہیں شباب ہے

جنوں اس کو جانئے کہ شغلِ زندگی دل ہے،
لگا کے آگ دیکھتا ہوں خانۂ شباب میں

کسی کا رنج دیکھوں یہ نہیں ہو گا مرے دل سے
نظر صیاد کی چوکے تو کچھ کہہ دوں عنادل سے

دُعائیں دیں مرے بعد آنے والے میری وحشت کو
بہت کانٹے نکل آئے مرے ہمراہ منزل سے

امید و نا امیدی کا بہم ہونا وہی جانے
کہ جس نے کشتیوں کو ڈوبتے دیکھا ہے ساحل سے

کیا سبب کچھ تجھے معلوم ہے اے ابرِ بہار
دل کے مُرجھانے سے کیوں زخم ہرا ہوتا ہے

میرے راضی برضا ہونے سے سب راضی ہیں
ورنہ جو ہے وہ شکایت سے خفا ہوتا ہے

نزا دیتے تھے باہم راستے حُسن و محبت کے
بغیر آنکھوں کے پہچانا یونہی منزل کو منزل نے

میں وہ ہوں جس کا زمانے نے سبق یاد کیا
غم نے شاگرد کیا پھر مجھے اُستاد کیا

بو نکلنے لگی غنچوں سے ؟ تو پھر ڈر کس کا
یہ خبر سچ ہے، تو صیاد نے آزاد کیا

نہ شرماؤ اگر ہم شکوۂ بیداد کرتے ہیں
محبّت ہے، تمھاری عادتوں کو یاد کرتے ہیں

عدو صیاد و گلچیں کیوں ہوئے میرے نشیمن کے
یہ تنکے بھی ہیں اس قابل جنھیں برباد کرتے ہیں

خود اُن کا حسن میری دادخواہی ان سے کرتا ہے
وہ آئینہ لئے ہیں اور مجھکو یاد کرتے ہیں

کہے جا، بندھ چلا ہے داستاں کا رنگ محفل میں
مری سننے لگے ہیں روئے جاناں دیکھنے والے

رو کر، حریفِ گنبدِ خود کام ہوگیا
نالہ کیا تو چنگ کا پیغام ہوگیا

خوش گوئیاں مخالفِ طبعِ زمانہ تھیں
ثاقب انھیں گنوں سے تو بدنام ہوگیا

کب اُس نے کی ہے پرستشِ غمہائے جانگسل
جب حالِ دل بیان کے قابل نہیں رہا

آگ یہ کیسی لگی ہے سینۂ دلگیر میں
چھالے آتے ہیں نظر آئینۂ تقدیر میں

ظالم و مظلوم اُن کے زورِ بازو پر نثار
چھوڑتے ہیں دل پہ چٹکی لیکے پائے تیر میں

نامہ لکھتے وقت کیا جانے قلم کیونکر چلا
اضطرابِ دل نظر آنے لگا تحریر میں

نالے کرتا جا کہ زورِ ناتوانی سے بہت
جھک چلا ہے چرخ گر جائے گا دو اک تیر میں

پیشِ عاقل بولتا ہے عالمِ نقش و نگار
کہہ گئی سب کچھ خموشی پردۂ تصویر میں

وہ روح بخشِ جاں تھے، جانگاہ بن کے نکلے
کچھ دم تھے پاس اپنے جو آہ بن کے نکلے

جفا اُٹھانے کی عادت پڑے تو کیونکر جائے
ستم سہے مگر اتنے کہاں کہ جی بھر جائے

یہی سمجھ کے جفاؤں کا سلسلہ چھوڑو
کہ جس کی موت نہ آئے وہ کس طرح مرجائے

جب میں کہتا ہوں کوئی تو وصل کا ساماں نہ ہوا
کان میں آتی ہے آواز کہ 'جی ہاں' نہ ہوا

بوئے گل پھولوں میں رہتی تھی مگر رہ نہ سکی
میں تو کانٹوں میں رہا اور پریشاں نہ ہوا

گوہرِ عشق کی نایابی و عزت کو سمجھ
پھر دیا صحنِ جہاں کو مگر ارزاں نہ ہوا

تاثیرِ ہجر کون بتائے کہ میں تو میں
ہوتے ہی شام دہر کی صورت بدل گئی

شبِ وصال بھی تا صبح مطمئن نہ رہا
ابھی تھی رات کہ پیغامِ آرزو آئے

وصال و ہجر میں چھپتا ہے دل کا حال کہیں
بجھے تو پیاس سوا ہو جلے تو بو آئے

سجدے کا کام آج نہ لیں گے جبیں سے ہم
نقشِ قدم اٹھائیں گے اُنکے زمیں سے ہم

نغمے نہ جان نوحۂ اہلِ قفس ہے یہ
صیاد! ذبح ہوگئے اس آفریں سے ہم

اقب ملالِ اہلِ حسد بھی ہے ناگوار — کیا خوش ہوں اپنی طبعِ سخن آفریں سے ہم

ل کے بھی میں نے اُف دکی ہمتِ دل وہی رہی — برسوں دھواں گھٹا کیا پھر بھی یہ سینہ صاف ہے

ب تھا قصۂ قفس سنتے جو میرے ہم نوا — قید میں ہوں کہ مر گیا اس میں بھی اختلاف ہے

ل کیفِ بیخودی میں کٹی شب وصال کی — اچھا ہوا خبر نہ ہوئی اپنے حال کی

پناسا زور کرکے جھکے منعمانِ دہر — مٹھی نہ کھل سکی مرے دستِ سوال کی

ھ سے نہ پوچھ حالِ دلِ چور ہے جو رحیف ہے — اُس پہ ہر ایک پارہ ہے اک ورق انقلاب کا

لشن میں کہیں بوئے دمساز نہیں آتی — اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی

رگشتہ ہوئی دنیا رسم و رہِ الفت سے — اک میری طبیعت ہے جو باز نہیں آتی

حر کو بھی مری محفل میں برہمی نہ ہوئی — تمام رات ہوئی درد میں کمی نہ ہوئی

زورِ حسن تمنائے دل کا دشمن تھا — وہ کون دن تھا کہ جس دن ہماہمی نہ ہوئی

یری قسمت میں یہی لکھا ہے پھر کیا کیجئے — بند میری آنکھ ہو اور آپ دیکھا کیجئے

سفت بازیگاہِ دنیا میں ہیں بدنام اہلِ عشق — جان ہی کا کھیل ہوتا ہو تو پھر کیا کیجئے

واہ وا، اے بیکسیِ عشق! کیا کہنا ترا — دل پہ چل جائے چھری آنکھوں سے دیکھا کیجئے

ہم تو دل بیچیں مگر ثاقب وہ دل والے کہاں — ہے بھری بازار لیکن کس سے سودا کیجئے

طینتِ آدم میں تھی اللہ! کیا نشو و نما — ایک مٹھی خاک یوں پھیلی کہ دنیا ہو گئی

قیدِ غم بھی دل لگی ہے ہنسنے والوں کے لئے — عندلیب آ کر قفس میں اک تماشا ہو گئی

یہ بے مروتیاں دیکھئے کہ اب نہ ملے — جو پاس تھے ہم اُنھیں دور تک پکار آئے

قریب ہو کے نہ سننا دلیلِ الفت ہے — پکارے جاؤ کوئی ہم کلام ہو کہ نہ ہو

حجاب پڑ نہیں سکتا نگاہِ اُلفت پر — سخن طراز ہیں آنکھیں کلام ہو کہ نہ ہو

قوتِ غم دیکھ، زورِ ناتوانی پر نہ جا — زلزلے عالم میں تھے جب دل مرا بیتاب تھا

شکر شانے کا کروں یا صبر کو ڈھونڈوں کہیں — زلف تو سمٹی مگر ہاں دل پریشاں ہو گیا

بڑے شباب پہ دردِ فراق مستی ہے — نہ ہو شراب تو پہروں گھٹا برستی ہے

بھرے ہوؤں کو بھرا کرتے ہیں کرم والے — جہاں ہے سبزہ گھٹا بھی وہیں برستی ہے

نازاں نہ ہو کہ محفلِ ہستی میں سازِ عیش — ہوتا ہے بارِ خاطرِ انساں کبھی کبھی

رونے کو پوچھتے ہو تو آنکھیں ہیں سامنے — ہنسنے کو پوچھتے ہو تو جی ہاں کبھی کبھی

گزرے گی یونہی شام و سحر دیکھتے رہنا
جو ہے وہ نہ آئے گا نظر دیکھتے رہنا

صیاد! تری قید سے چھٹنا تو ہے معلوم
آفات سے کہدے مرا گھر دیکھتے رہنا

کیوں میرے داغِ دل کی ہے دشمن ہوائے دہر
ایسے چراغ بجھ نہیں سکتے زمانے میں

یوں تو مشتِ خاک تھا دل خون ہو کر بہہ گیا
لیکن اس قطرے میں وہ کچھ تھا جو دریا میں نہ تھا

دل یہ کہتا ہے کہ نالے بے اثر تھے شامِ غم
میں یہ کہتا ہوں کہ اس شب کوئی دنیا میں نہ تھا

دیکھ میرے دل کو تو، اے منکرِ اعجازِ عشق،
گر نہیں سکتا ہے بادہ اور شیشہ چور ہے

یہ ہے بہتے ہوئے دریا کی آواز
وہیں جانا ہے آئے تھے جہاں سے

سراسر دفترِ عالم ہے رنگیں
فقط میری تمہاری داستاں سے

کسی کے سامنے کیونکر کہا جائے
خود اپنا دردِ دل اپنی زباں سے

موہوم ہے امید رہائی کی قفس میں
ممکن ہے، مگر دہر کا دستور نہیں ہے

سونے والوں کو کیا خبر اے ہجر
کیا ہوا ایک شب میں کیا نہ ہوا

ہنس کے بھی، رو کے بھی کہا لیکن
مطلبِ دل کبھی ادا نہ ہوا

بیانِ حال کا نیرنگِ عشق دشمن ہے
ادھر وہ سامنے آئے اُدھر گلا در رہا

کس منہ سے زباں کرتی اظہارِ پریشانی
جب تم نے مری حالت صورت سے نہ پہچانی،

راز غمِ الفت ہم سمجھے تو مگر چپ ہیں،
کہنے میں نہیں آتی جو بات ہو وجدانی

اب تک سجھے کچھ اور دکھائی نہیں دیتا
کیا جانئے کس آنکھ سے یہ آنکھ لڑی ہے

آدھی سے زیادہ شبِ غم کاٹ چکا ہوں
اب بھی اگر آ جاؤ تو یہ رات بڑی ہے

سلوم تھا، پہ رسمِ دنیا، نباہنا تھا
کہتا تھا میں کہ "کیا ہے؟" جب دل کراہتا تھا

لیا ضبطِ درد کرتا دل کا علاج لیکن
جو کچھ میں کہہ چکا تھا اُس کو نباہتا تھا

سنتا ہوں مرا دل کی صفیں گرد ہیں اُسکے
محفل تو بہت خوب ہے دیکھوں جو گزر ہو،

ویرانہ جہاں دیکھ لیا راہِ سفر میں،
بڑھتا ہوں اُسی سمت کو شاید مرا گھر ہو،

سیکڑوں نالے کروں لیکن نتیجا بھی تو ہو،
یاد دلواؤں کسے جب کوئی بھولا بھی تو ہو،

ل بدل دیں خوف نے سارے جہاں کی صورتیں
کھولکر آنکھیں جدھر دیکھا اُدھر صیاد تھا

شر میں میرا لہو چھپتا تو آخر کس طرح،
آپ بھی بھولے نہ تھے مجھکو بھی کچھ کچھ یاد تھا

ید تنہائی نے پھیرا زندگی بھر کا ملال،
میں جو بھولا تھا چمن میں وہ قفس میں یاد تھا

ٔ خندۂ طرب نامناسب رک اہلِ دہر کو　　بہت زمانہ ہو گیا کہ میں ہنسی کو رو چکا
ٔ آشیانۂ ستم چمن میں ہو تو خوب ہے　　یہ جی میں ہے کہ لے اُڑوں قفس تو میرا ہو چکا

وت وہ اچھی کہ جس کے بعد مل جائے حیات　　جو سبب ہو موت کا وہ زندگی بیکار ہے
ہریں پھر غیر، دل اپنا تھا اس سے پوچھئے　　کیا خطا کی تھی جو اب تک درپئے آزار ہے
پنی حالت کے سوا کچھ بھی نظر آتا نہیں،　　جس کی صورت دیکھتا ہوں میں وہی بیمار ہے

، کتنے زخم تھے گھٹنے پہ جن کو داغ کہتے ہیں　　ہر اک جا دامنِ دل پر رفو معلوم ہوتا ہے
ہراغِ عقل بھی گل ہے شبِ غم کی سیاہی سے　　نہ میں معلوم ہوتا ہوں نہ تو معلوم ہوتا ہے

قدہائے غم سے وابستہ ہے اپنی زندگی　　ہم کہاں یہ مشکلیں جو وقت آساں ہو گئیں
ندگی میں کیا مجھے ملتی بلاؤں سے نجات،　　جو دُعائیں کیں وہ سب تیری نگہباں ہو گئیں
وٹ لی گردوں نے آخر دل کی ساری کائنات　　کچھ تمنائیں تھیں وہ بھی وقفِ نسیاں ہو گئیں

ید و آزادی سے کیا مطلب ہے مجھ دلگیر کو　　تم نے جو پہنائی ہے پہنے ہوں اُس زنجیر کو،

ک نیا دل ظلم سہنے کو بنانا چاہئے،　　ہو تو سکتا ہے مگر اس کو زمانہ چاہئے،

تی چتی سے نہ خون اُبلے تو مجرم جاننا　　ذبح میں ہو لوں تو پھر رنگ گلستاں دیکھنا
ائناتِ موت دامن میں لئے ہیں دل کے زخم　　درد اگر کم ہو تو تم سوئے نمکداں دیکھنا،
ستی فانی پہ اک اصرار تھا تقدیر کو　　ورنہ کب منظور تھا خوابِ پریشاں دیکھنا
پیس ڈالا خواہشِ بیجا نے کوہِ طور کو　　دل کی قوت دیکھ لے پھر روئے جاناں دیکھنا

اس کی رحمت پہ گرے پڑتے ہیں عصیاں والے　　حشر کا ہے کو ہے اک جلسۂ رندانہ ہے

دل کے قصے کہاں نہیں ہوتے　　ہاں وہ سب سے بیاں نہیں ہوتے

مری قید کا دل شکن ماجرا تھا،　　بہار آئی تھی آشیاں بن چکا تھا
شبِ غم کی تنہائیوں کو نہ پوچھو،　　جدھر دیکھتا تھا خدا ہی خدا تھا
میں دُنیا کو میخانہ سمجھا کہ اس میں　　کوئی ہنس رہا تھا کوئی رو رہا تھا

وہ گبر مسلماں صورت ہے دیندار نہیں ثاقب نہ سہی
خود صدق و صفا کہتے ہیں ولی اس رندِ خجستہ سیرت کو

جلیل مانک پوری (وفات ۶ر جنوری ۱۹۴۶ء)

جلیل مانک پوری

جلیلؔ تخلص۔ جلیل حسن نام۔ خلف مولوی حافظ عبدالکریم مرحوم۔ سنہ ۱۲۸۱ھ میں بمقام مانک پور (اودھ) ولادت ہوئی۔ دس گیارہ سال کی عمر میں حفظ قرآن سے فراغت پائی۔ طالب علمی کا زمانہ اکثر لکھنؤ میں گزرا جہاں عربی اور فارسی میں استعداد بہم پہونچائی۔ ابتدا ہی سے سخن گوئی کا شوق تھا۔ بیس سال کی عمر میں حضرت امیرؔ مینائی کے سلسلۂ تلمذ میں وابستہ ہوئے اور تادم واپسیں شفیق اُستاد کے قدموں سے جدا نہ ہوئے۔ عروض و قوافی کے ساتھ جملہ نکات و محاسن شاعری حضرت امیرؔ ہی کے فیضان صحبت سے حاصل کئے۔ رام پور میں جب امیر اللغات کی تدوین کے لئے ایک وسیع دفتر کھولا گیا تو اس کی ادارت انھیں کے سپرد ہوئی۔ پھر سفر بنارس اور بھوپال وغیرہ میں حضرت امیرؔ کے ہمراہ رکاب رہے۔

۱۰ جمادی الاول سنہ ۱۳۱۸ھ کو حضرت امیرؔ مینائی کے ہمراہ حیدرآباد پہونچے اور اس زمانے میں مہاراجہ بہادر سریمین السلطنت کی امانت اور مہماں نوازی ان کے شامل حال رہی اور دو رسالے محبوب الکلام اور دبدبۂ آصفی کی ترتیب و اشاعت کا کام بھی سپرد کیا گیا۔ سنہ ۱۳۲۵ھ میں چند احباب کے اصرار سے تذکیر و تانیث پر ایک مبسوط کتاب لکھی جس میں سات ہزار الفاظ کی تذکیر و تانیث نہایت واضح طور پر بتائی گئی ہے۔ اس کا مقدمہ مولانا عبدالحلیم شررؔ لکھنوی نے لکھا ہے۔ پھر اخترؔ مینائی کی شرکت سے دکن ایک ضخیم تاریخ سرکار نظام کے حکم سے مرتب اور مطبوع ہوئی۔

حضرت داغؔ مرحوم کی وفات کے بعد سنہ ۱۳۲۲ھ میں حضرت غفران مکان نواب میر محبوب علی خاں بہادر سابق تاجدار دکن نے اپنی اُستادی کا شرف بخشا اور داغؔ مرحوم کی جگہ پر مامور فرمایا اور "جلیل القدر" کے معزز خطاب سے سرفراز کیا۔ پہلا دیوان تاج سخن اسی زمانے کی یادگار ہے۔ حضور پر نور نواب میر عثمان علی خاں بہادر آصف سابع خلد اللہ ملکہ جب سریر آرائے سلطنت ہوئے تو انھوں نے بھی اپنی اُستادی کے شرف سے مشرف فرمایا اور آج تک جلیلؔ ہی سے مشورۂ سخن فرماتے ہیں۔ پہلے آپ نے "نواب فصاحت جنگ بہادر" کے خطاب سے سرفراز فرمایا پھر "امام الفن" کے لقب سے مزید عزت افزائی فرمائی۔ شہزادگان اور صاحبزادگان بھی حسب حکم سرکار انھیں کو اپنا کلام دکھاتے ہیں۔

تصنیفات کی فہرست یہ ہے :- تاج سخن — پہلا دیوان جو پہلی مرتبہ سنہ ۱۹۰۸ء میں طبع ہوا ——

جانِ سخن ۔ دوسرا دیوان۔ پہلی مرتبہ ۱۹۱۶ء میں شایع ہوا ——— سرتاجِ سخن :۔ (در مدح حضور نظام) قصاید، قطعات اور تاریخوں کا مجموعہ ——— معراجِ سخن ۔ نعتیہ کلام اور سلام وغیرہ کا مجموعہ ——— تعلیم الصلوٰۃ :۔ دینیات کا رسالہ ——— تذکیر و تانیث :۔ مفصل ذکر اوپر آچکا ہے ——— اُردو کا عروض :۔ اُردو میں مستعملہ بحروں کا مجموعہ ——— گلِ صد برگ :۔ رباعیات کا مجموعہ ——— سوانح حضرت امیر مینائی :۔ اس میں حضرت امیر کے حالات و واقعات زندگی اور کلام کے انتخاب کے ساتھ محاسن شاعری کو واضح کیا گیا ہے۔ ۱۹۲۶ء میں شایع ہوئی ——— معیارِ اُردو :۔ محاورات کا مجموعہ ——— روحِ سخن :۔ تیسرا دیوان (غیر مطبوعہ)

انتخاب از تاجِ سخن :

میری وحشت بھی تماشا ہو گئی　　جو اِدھر گزرا کھڑا دیکھا گیا

آج ہی آ جو تجھکو آنا ہے　　کل خدا جانے میں ہوا نہ ہوا

مزہ لیں گے ہم دیکھ کر تیری آنکھیں　　اُنھیں خوب تو نامہ بر دیکھ لینا

یہ رنگ گلاب کی کلی کا　　نقشہ ہے کسی کی کمسنی کا

بُلبُل کی بہار میں نہ پوچھو　　منہ چومتی ہے کلی کلی کا

منہ پھیر کے یوں چلی جوانی　　یاد آگیا روٹھنا کسی کا

اے جلیل آنسو بہائے تم نے کیوں　　اُن کو ہنسنے کا بہانا مل گیا

میں نے جو تمھیں چاہا کیا اس میں خطا میری　　یہ تم ہو یہ آئینہ انصاف ذرا کرنا

جاتے ہو خدا حافظ ہاں اتنی گزارش ہے　　جب یاد ہم آجائیں ملنے کی دعا کرنا

تھی عشق و عاشقی کے لئے شرطِ زندگی　　مرنے کے واسطے مجھے جینا ضرور تھا

وہ بیخودی کی آڑ میں لپٹے جلیل سے　　کیونکر کہوں کہ ہوش نہ تھا، تھا ضرور تھا

چمن سے توڑ کر گل لے گیا بولی نہ کچھ بلبل　　جو میں ہوتا تو گلچیں کے گلے کا ہار ہو جاتا

دن جو دشمن کے پھرے میرے بھی پھرنا چاہئے　　کیا زمانہ ایک ہی کروٹ بدل کر رہ گیا

خاک چمن میں شبنم و گل کا عجب ہے رنگ　　ساغر کسی سے چھوٹ پڑا ہے شراب کا

چلے ہائے دم بھر کو مہمان ہو کر　　مجھے مار ڈالا مری جان ہو کر

ہم بھولے ہوئے راہ ہیں اے کعبہ نشینو　　جاتے تھے کہیں اور نکل آئے کہیں اور

یوسف بیچنے کئے بیٹھے ہیں — جان کتنوں کی لئے بیٹھے ہیں
جھوٹے وعدے بھی نہیں کرتے آپ — کوئی جینے کا سہارا ہی نہیں
وعدہ کرکے وہ ہائے جاتے ہیں — روگ دل کو لگائے جاتے ہیں
نگاہ برق نہیں چہرہ آفتاب نہیں — وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں
سونے میں کھل گئی ہے جو وہ زلف مشکبو — کیا کیا اڑا رہا ہوں نسیم سحر کو میں
اچھا نہیں کہ ہو رُخ محبوب بے نقاب — پردہ اُٹھے تو ڈال دوں اپنی نظر کو میں
اک شمع ہے مزار پہ وہ بھی بجھی ہوئی — کیا دیکھ کر بلاؤں نسیم سحر کو میں
او آنکھ چُرا کے جانے والے — ہم بھی تھے کبھی تری نظر میں
اُر بھاگے ہوئے بیٹھے ہیں جتنے سننے والے ہیں — مرے پر درد نالے بھی بڑے بیدرد نالے ہیں
سیب سے کہیں مرنا کسی پہ ہوتا ہے — مزہ جو اس میں ہے وہ عمر جاوداں میں نہیں
پ نے تصویر کھینچی میں نے دیکھی غور سے — ہر ادا اچھی خموشی کی ادا اچھی نہیں
اہ طلب میں ایسا خود رفتہ کون ہوگا — منزل پہ ہم پہونچکر منزل کو ڈھونڈتے ہیں
لٹتے لوٹتے ہیں نالۂ و فریاد کرتے ہیں — ہم اپنے بھولنے والے کو یوں ہی یاد کرتے ہیں
ماری بیخودی کا حال وہ پوچھیں تو لے قاصد — یہ کہنا ہوش اتنا ہے کہ تم کو یاد کرتے ہیں
لیل اچھا نہیں آباد کرنا گھر محبت کا — یہ اُن کا کام ہے جو زندگی برباد کرتے ہیں
مزے بے تابیوں کے آرہے ہیں — وہ ہم کو، ہم انھیں سمجھا رہے ہیں
پال ہے مست، نظر مست، ادا میں مستی — جیسے آتے ہیں وہ لوٹے ہوئے میخانے کو
بات ساقی کی نہ ٹالی جائے گی — کرکے توبہ توڑ ڈالی جائے گی
آتے آتے آئے گا اُن کو خیال — جاتے جاتے بے خیالی جائے گی
دیکھتے ہیں غور سے میری شبیہ — شاید اس میں جان ڈالی جائے گی
اے تمنا تجھ کو رولوں شام وصل — آج تو دل سے نکالی جائے گی
قبر میں بھی ہوگا روشن داغ دل — چاند پر کیا خاک ڈالی جائے گی
فصل گل آئی جنوں اچھلا جلیل — اب طبیعت کیا سنبھالی جائے گی
یری ہر بات کو اُلٹا وہ سمجھ لیتے ہیں — اب کے پوچھا تو یہ کہدوں گا کہ حال اچھا ہے
قاب کہتی ہے میں پردۂ قیامت ہوں — اگر یقین نہ ہو دیکھ لو اُٹھا کے مجھے

ڈر رہا ہوں تمھاری نشیلی آنکھوں سے
کہ لوٹ لیں نہ کسی روز کچھ پلا کے مجھے

ہوئی مدت کہ چمن چھوٹ گیا
اب ہمیں کیا جو بہار آئی ہے

آپ اور سوگ مرا کیا کہنا
دیکھئے لب پہ ہنسی آئی ہے

تھک کے بیٹھوں تو یہ کہتا ہے جنوں
دو قدم کوچۂ رسوائی ہے

بھلا تو یہ کا میخانے میں کیا ذکر
جو ہے بھی تو کہیں ٹوٹی پڑی ہے

ز بھی ہوتا رہے ہوتی رہے بیداد بھی
سب گوارا ہے جو تم سنتے رہو فریاد بھی

جو کہتے ہو بگڑ کر ہم نہ آئیں گے کبھی
یہ بھی کہدو اب نہ آئے گی ہماری یاد بھی

ئے کیا حسرت کدہ تھا دل ہمارا اے جلیل
ہو گیا دو روز میں آباد بھی برباد بھی

نکھوں میں کون آکے الٰہی نکل گیا
کس کی تلاش میں مرے اشک رواں چلے

ب میں چلوں تو سایہ بھی اپنا نہ ساتھ دے
جب تم چلو زمین چلے آسماں چلے

ن کی آہیں نہ گئیں رات کے نالے نہ گئے
مرے دلسوز مرے چاہنے والے نہ گئے

اظہار حال پر مجھے قدرت نہیں رہی
ان کو یہ وہم ہے کہ محبت نہیں رہی

یا عمر بھر کا شوق تھا یا اک نگاہ میں
دیدار کی کلیم کو حسرت نہیں رہی

آج آنسو تم نے پونچھے بھی تو کیا
یہ تو اپنا عمر بھر کا کام ہے

کہدو یہ کوہکن سے کہ مرنا نہیں کمال
مر مر کے ہجر یار میں جینا کمال ہے

اس محویت پہ آپ کی قربان میں جلیل
اتنا نہیں خیال کہ کس کا خیال ہے

ب کون پھر کے جائے تری جلوہ گاہ سے
او شوخ چشم پھونکدے برق نگاہ سے

دل گیا دل لگی نہیں جاتی
روتے روتے ہنسی نہیں جاتی

کتنی گہری مرے ساقی کی نظر ہوتی ہے
مجھکو پھر دن میں کہیں اپنی خبر ہوتی ہے

بے وفائی ہو کہ شکوہ کہ ستم کی فریاد
سب کا توڑ ایک لگاوٹ کی نظر ہوتی ہے

مار ڈالا مسکرا کر ناز سے
ہاں مری جاں پھر اُسی انداز سے

کس نے کہدی اُن سے میری داستاں
چونک چونک اُٹھتے ہیں خواب ناز سے

درد دل پہلے تو وہ سنتے نہ تھے
اب یہ کہتے ہیں ذرا آواز سے

زندگی کیا جو بسر ہو چین سے
دل میں تھوڑی سی تمنا چاہیے

بنی ہے جان پہ جانے کی تم نے خوب کہی
مرا یہ حال! پھر آنے کی تم نے خوب کہی

مجھے زاہد بُرا کہہ رہا ہے کہنے دو
غرض ہے تم سے زمانے کی تم نے خوب کہی

پھر کہاں جلوۂ جاناں کی بہار اے موسیٰ
ایسے موقع پہ تمھیں نیند نہ آئی ہوتی

محبت رنگ دکھاتی ہے جب دل دل سے ملتا ہے
مگر مشکل تو یہ ہے دل بڑی مشکل سے ملتا ہے

اُن سے اظہارِ محبت جو کوئی کرتا ہے
دور سے اُس کو دکھا دیتے ہیں تربت میری

یہ کون زیرِ زمیں اس کو گدگداتا ہے
کہ مسکراتی ہوئی ہر کلی نکلتی ہے

رُکی رکی جو چھُری دستِ نازنیں میں رہی
تڑپ تڑپ کے تمنا دلِ حزیں میں رہی

دلچسپ ہوگئی ترے چلنے سے رہگزر
اُٹھ اُٹھ کے گردِ راہ لپٹتی ہے راہ سے

سب اپنا حال کہتے رہے چارہ ساز سے
میں تھا کہ محوِ لذتِ دردِ جگر رہا

انتخاب از جانِ سخن

ذرا ذرا سی شکایت پہ روٹھ جاتے ہیں
نیا نیا ہے ابھی شوق دلربائی کا

رہا اسیر تو شکوے رہے اسیری کے
رہا ہوا تو مجھے غم ہوا رہائی کا

کچھ اس ادا سے یار نے پوچھا مرا مزاج
کہنا پڑا کہ شکر ہے پروردگار کا

خوب انصاف تری انجمنِ ناز میں ہے
شمع کا رنگ جمے خون ہو پروانے کا

میں سمجھتا ہوں تری عشوہ گری کو ساقی
کام کرتی ہے نظر نام ہے پیمانے کا

وعدہ کرکے اور بھی آفت میں ڈالا آپ نے
زندگی مشکل تھی اب مرنا بھی مشکل ہو گیا

رازداری کی ہے پابند مری مے نوشی
ہو کے لبریز چھلکتا نہیں ساغر میرا

منتظر موسمِ گل کے ہیں ترے دیوانے
ہاتھ رکھے ہوئے بیٹھے ہیں گریبانوں پر

یا خُدا دردِ محبت میں اثر ہے کہ نہیں
جس پہ مرتا ہوں اُسے میری خبر ہے کہ نہیں

آپ سے آنکھ ملاؤں یہ مری طاقت ہے
دیکھتا یہ ہوں کہ اگلی سی نظر ہے کہ نہیں

مست کر دے مجھے ساقی مگر اس شرط کے ساتھ
ہوش اتنا رہے باقی کہ تجھے یاد کروں

ان شوخ حسینوں پہ جو آتی ہے جوانی
تلوار بنا دیتی ہے ایک ایک ادا کو

دیر و کعبے کی زیارت تو فقط حیلہ ہے
جستجو تیری لئے پھرتی ہے گھر گھر مجھ کو

کرتا ہوں یاد شام سے ابروئے یار کو
خنجر سے کاٹتا ہوں شبِ انتظار کو

آنکھوں نے جمیلؔ آج کیا مجھکو پشیماں
پہچان گئے لوگ محبت کی نظر کو

یہاں اُڑ گئی خاک اہلِ وفا کی
وہاں امتحانِ وفا ہو رہا ہے

سچ پوچھئے تو نالۂ بلبل ہے بے خطا
پھولوں میں ساری آگ لگائی صبا کی ہے

دل ہے عجیب گل چمنِ روزگار میں
رنگت تو پھول کی ہے مگر بو وفا کی ہے

اہلِ غرض کو منہ نہ لگاؤ بلا کے ہیں
یوسف کہیں گے تم کو پیمبر بنائیں گے

مجھے تمام زمانے کی آرزو کیوں ہو
بہت ہے میرے لئے ایک آرزو تیری

چمن کے پھول بھی تیرے ہی خوشہ چیں نکلے
کسی میں رنگ ہے تیرا کسی میں بو تیری

رض کے آشنا ہیں ساقیا سب بزمِ عالم میں
جہاں شیشہ ہوا خالی جدا پیمانہ ہوتا ہے

سن دیکھا جو بتوں کا تو خدا یاد آیا
راہ کعبہ کی ملی ہے مجھے بتخانے سے

ہم تم ملے نہ تھے تو جدائی کا تھا ملال
اب یہ ملال ہے کہ تمنا نکل گئی

ساقیا کیوں نہ ہوس ہو مجھے میخانے کی
دل ہے شیشہ کا مری آنکھ ہے پیمانے کی

اپ پہلو میں جو بیٹھیں تو سنبھل کر بیٹھیں
دلِ بیتاب کو عادت ہے مچل جانے کی

بے پئے کہتے ہیں سب رندِ مے آشام مجھے
بیخودی تو نے کیا مفت میں بدنام مجھے

بس نہ سمجھا تھا کہ مے اتنی گراں قیمت ہے
پارسائی ہوئی صدقے تو ملا جام مجھے

نسیمِ صبح سے کہہ دو کہ گل شمعِ لحد کردے
کوئی چھپ چھپ کے روتا ہے لپٹ کر میرے مدفن سے

آئینہ بھی یہ سمجھتا ہے کہ معشوق ہے تو
تیری تصویر کو سینے سے لگا رکھا ہے

میری توبہ بھی کوئی توبہ ہے
جب بہار آئی توڑ ڈالی ہے

شمع کو تم اُٹھا دو خلوت سے
یہ ہمیشہ کی جلنے والی ہے

چھپنے والے تجھے خبر بھی ہے
نگہِ شوق پردہ در بھی ہے

ساقیا صحبتِ دیرینہ جو یاد آتی ہے
چشمِ تر صورتِ پیمانہ چھلک جاتی ہے

مجھے جس دم خیالِ نرگسِ مستانہ آتا ہے
بڑی مشکل سے قابو میں دلِ دیوانہ آتا ہے

حواس آئے ہوئے پھر کھو دئے لیلیٰ نے مجنوں کے
یہ کہتا تازیانہ تھا مرا دیوانہ آتا ہے

کوئی ساغر بکف ہے کوئی محوِ چشمِ ساقی ہے
ہمارے ہاتھ دیکھیں کونسا پیمانہ آتا ہے

مشیت جب یونہیں ٹھیری تو میری کیا خطا ناصح
حرم کو ڈھونڈتا ہوں سامنے بتخانہ آتا ہے

درد سے واقف نہ تھے غم سے شناسائی نہ تھی
ہائے کیا دن تھے طبیعت جب کہیں آئی نہ تھی

سچ کہا زاہد یہ تو نے زہرِ قاتل ہے شراب
ہم بھی کہتے تھے یہی جب تک بہار آئی نہ تھی

عجب ادا سے چمن میں بہار آتی ہے
کلی کلی سے مجھے بوئے یار آتی ہے

کچھ اختیار کسی کا نہیں طبیعت پر
یہ جب یہ آتی ہے بے اختیار آتی ہے

بیاباں سے نکلنا اب ترے مجنوں کا مشکل ہے
یہ کانٹا بھی اُلجھ کر رہ گیا صحرا کے دامن سے

تخاب از "روح سخن" (غیر مطبوعہ)

آرام گیا صبر گیا دل سے نکل کر
کمبخت تمنا بھی نکل جائے تو اچھا

اِس اتفاق کو فضلِ خدا سمجھ واعظ
کہ جو مے ترے لب پر تھی مجھکو ہوش نہ تھا

دکان مے پہ پہونچکر کھلی حقیقت حال
حیات بیچ رہا تھا وہ مے فروش نہ تھا

منحصر موسم گل پر نہیں سودا میرا
آ گیا ذکر ترا اور میں دیوانہ ہوا

تو جس روزے کی آ کے سر چرخ جلیل
بجلیاں مجھپہ گراتی ہیں گھٹائیں کیا کیا

قاصد چلا یہاں سے جو لیکر پیام شوق
کچھ کہتے کہتے میں کئی منزل نکل گیا

حقیقت میں پتہ دیتا ہے در پردہ محبت کا
جلیل اُن کا تمہارے نام پر خاموش ہو جانا

ملتی جلتی ہے قیامت سے شباہت لیکن
اک ذرا رنگ ہے گہرا شب تنہائی کا

جان دینے کے لئے لوگ مرے جاتے ہیں
ابتو قاتل کو بھی دعوے ہے مسیحائی کا

ضبط نالہ سے آج کام لیا
گرتی بجلی کو میں نے تھام لیا

ہائے ساقی پہ توبہ ٹوٹ گئی،
ہاتھ میں اس ادا سے جام لیا،

منحصر تھا تری زلفوں کے سلجھ جانے پر
کسی شیرازۂ ہستی کا پریشاں ہونا

مر کے یاد آئے مزے دُنیا کے
گھر کو چھوڑا تھا کہ گھر یاد آیا

بیخودی کا ہے مرے یہ عالم
تیغ کو دیکھ کے سر یاد آیا

میرے آنے کی تو بندش ہے مگر
کیا کریں گے، میں اگر یاد آیا

ابر اُٹھا تھا بڑے دعوے سے
دیکھ کر دیدۂ تر لوٹ گیا

اے چرخ کتنے خاک سے پیدا ہوئے حسین
تو ایک آفتاب کو چمکا کے رہ گیا

لایا گلِ مراد نہ جھونکا نسیم کا
دامن میں ہر بہار میں پھیلا کے رہ گیا

کسی کا حسن اگر بے نقاب ہو جاتا
نظام عالمِ ہستی خراب ہو جاتا

اگر میں ہوش میں ہوتا تو یہ طلسم جہاں
مری نگاہ میں بھولا سا خواب ہو جاتا

کون بلبس غریقِ بحر ہوا — سر پٹکتی ہیں موجیں ساحل پہ
آنکھوں کو چھوڑ جاؤں الٰہی میں کیا کروں — ہٹتی نہیں نظر رُخِ جانانہ چھوڑ کر
ہائے وہ دردِ آشنا تھا کس قدر — جس نے ڈالی ہے بنائے دردِ دل
آپ آئیں پوچھنے میرا مزاج — میں تصدق میں فدائے دردِ دل
محتسب سے میکشی کا ڈھنگ سیکھا چاہیئے — مست ہے لیکن ذرا اس پر گماں ہوتا نہیں
ملبتِ گل کی پریشانی نہ پوچھو باغ میں — اس طرح طائر کوئی بے آشیاں ہوتا نہیں
اگر یہ سچ ہے تو مرنے پہ ناز ہے مجھ کو — تر آنسوؤں سے رہی انکی آستیں برسوں
پریاں ہیں سب یہ غنچہ و گل اے نسیمِ صبح — کچھ آنکھ مل چکی ہیں کچھ ہیں ابھی خوابِ ناز میں
میں شمعِ بزم ہوں نہ چراغِ مزار ہوں — راتیں مگر گزرتی ہیں سوز و گداز میں
قاصد پیامِ شوق کو دینا بہت نہ طول — کہنا فقط یہ اُن سے کہ آنکھیں ترس گئیں
گزریں جو اس طرف سے حسینوں کی ٹکڑیاں — کچھ رو گئیں تو کچھ مرے رونے پہ ہنس گئیں
گم قافلے سے کون ہوا جس کے واسطے — جائیں نکل کے صورتِ بانگِ جرس گئیں
آ کے دو دن کو فصلِ گل ساقی — مبتلا کر گئی گناہوں میں
خضر کو ڈھونڈنے میں نکلا تھا — مل گئے میکدہ کی راہوں میں
تبسم تھا اس رنگ سے اُن کے لب پر — میں سمجھا کوئی جام چھلکا رہے ہیں
بہار ایک دم کی ہے کھلتا نہیں کچھ — یہ گل کھل رہے ہیں کہ مرجھا رہے ہیں
ہے آباد میرے تصور کی دُنیا — حسیں آ رہے ہیں حسیں جا رہے ہیں
عدم کے دشت میں پایا گیا ہوں — کہاں سے میں کہاں لایا گیا ہوں
نفس کی طرح کوچے میں کسی کے — ہزاروں بار میں آیا گیا ہوں
سب باندھ چکے کب کے سرِ شاخ نشیمن — ہم ہیں کہ گلستاں کی ہوا دیکھ رہے ہیں
کس کا میں دیکھنے والا ہوں نہ پوچھو یہ کلیم — اک نظر میں مجھے سو طور نظر آتے ہیں
نہ اشارہ نہ کنایہ نہ تبسم نہ کلام، — پاس بیٹھے ہیں مگر دور نظر آتے ہیں
ستم کرنے والے یہاں اور بھی ہیں — تہِ آسماں آسماں اور بھی ہیں
نگاہیں تری دیکھ کر میں یہ سمجھا — سوا اس جہاں کے جہاں اور بھی ہیں
لاکھ دل مست ہو مستی کا عیاں راز نہ ہو — یہ وہ شیشہ ہے کہ ٹوٹے بھی تو آواز نہ ہو

اس گرفتاری کی پوچھو نہ تڑپ جسکے لئے | در قفس کا ہو کھلا، طاقت پرواز نہ ہو

میں کسی سرزمیں کا قصد کروں | آسماں ساتھ ساتھ چلتا ہے

نہ وہ آئیں کہ راحت ہو نہ موت آئے کہ فرصت ہو | پڑی ہے جان جھگڑے میں نہ دم نکلے نہ غم نکلے

کیا کہوں مر مر کے جینے کا مزہ | اے خضر یہ زندگانی اور ہے

موسم گل میں حسینوں کا مرقع ہے چمن | جو کلی کھلتی ہے تصویر نظر آتی ہے

حال باقی نہ رہا کچھ ترے دیوانے میں | ابتو زنجیر ہی زنجیر نظر آتی ہے

ہوا گلستاں کی کھا کے دل کو قرار کچھ آچلا تھا لیکن | کسی کی پھر یاد تازہ کر دی گلوں کا منھ چوم کر صبا نے

فایدہ کیا ہوسِ دل کے بڑھانے سے جلیل | وہی نکلیں گے جو ارماں ہیں نکلنے والے

تھا شب کو جو سرور ان آنکھوں میں اب کہاں | آباد ہو کے میکدے ویران ہو گئے

غضب ہوتا تری صورت جو بے پردہ کہیں ہوتی | کہ تجھ پر جو نگہ پڑتی نگاہِ واپسیں ہوتی

سجودِ آستانِ یار سے سیری نہیں ہوتی | کئے جاتے جبیں سائی اگر باقی جبیں ہوتی

ٹپکتے ہیں شب غم دل کے ٹکڑے دیدۂ تر سے | سحر کو کیسے کیسے پھول چنتا ہوں میں بستر سے

الٰہی آگ برقِ طور نے کیسی لگائی تھی | نکلتے ہیں شرارے آج تک ایک ایک پتھر سے

نظر پڑتی ہے تم پر سب کی مجھکو رشک آتا ہے | چلو خلوت میں چل بیٹھیں نکلکر بزم محشر سے

پھولوں کی سیر کرکے میں دیوانہ ہو گیا | ہر گل پہ ہو رہا ہے کسی کا گماں مجھے

واماندگی سے پا نہ سکا قافلے کو میں | تھک تھک گئی پکار کے بانگِ درا مجھے

افسانہ طلب حسن ہے اسکا مجھے ڈر ہے | ظالم مری ہستی کو نہ افسانہ بنا دے

پھر شوقِ تماشا لئے جاتا ہے کسی سمت | پھر ذوقِ طلب مجھکو تماشا نہ بنا دے

ہوائے خلد کہاں میکدہ کہاں ساقی | یہ آہ سرد کسی مست نے بھری ہوگی

جو کی ہے توبہ تو پھر میکدے میں کیوں جائیں | کھنچی شراب صراحی بھری بھری ہوگی

کہوں کیا ماجرا اپنا حقیقت ہے عیاں میری | اداسی حال ہے میرا خموشی ہے زباں میری

بچھڑ کر کارواں سے میں کبھی تنہا نہیں رہتا | رفیق راہ بنجاتی ہے گرد کارواں میری

خوشی ہو جائے گی اُن کی اُنھیں کے نذر کرنے دے | اجل تو کیا کرے گی لیکے جانِ ناتواں میری

جب تک خلشِ درد تھی یک گونہ مزا تھا | جب سے مجھے آرام ہے آرام نہیں ہے

تم یاں سے گئے کیا مری دنیا ہی بدل دی | وہ لطف نہیں وہ سحر و شام نہیں ہے

رُخ پہ قائم مری نظر نہ ہوئی، دیدِ جاناں ہوئی مگر نہ ہوئی

سب شرابی مجھے کہیں مجھکو شرم اسے بیخودی نہیں آتی

ساقی کی چشمِ مست کا عالم نہ پوچھئے اک اک نگاہ ہے کئی عالم لئے ہوئے

ادا ادا تری موجِ شراب ہوکے رہی نگاہِ مست سے دُنیا خراب ہوکے رہی

کسی میں تاب کہاں تھی کہ دیکھتا اُنکو اُٹھی نقاب تو حیرت نقاب ہوکے رہی

جلیلؔ فصلِ بہاری کی دیکھئے تاثیر گری جو بوند گھٹا سے شراب ہوکے رہی

تم نے آکر مزاج پوچھ لیا، اب طبیعت کہاں سلجھتی ہے

تی نہیں اب دیر سے آوازِ جرس بھی ہے کون جو آوارۂ منزل کی خبر لے

جو آیا جان آئی تو گیا دل بھی گیا، اک خوشی آنے میں تیرے اک خوشی جانے میں ہے

بہاریں لٹا دیں جوانی لٹا دی تمہارے لئے زندگانی لٹا دی

عجب حوصلہ ہم نے غنچے کا دیکھا تبسم پہ ساری جوانی لٹا دی

آج تک دل کی آرزو ہے وہی پھول مرجھا گیا ہے بو ہے وہی

آج ہے وہ بہار کا موسم، پھول توڑوں تو ہاتھ جام آئے

رنگِ مستی کو انقلاب نہیں، صبح آئے یہاں کہ شام آئے

مرغِ تصویر پہ رشک آئے نہ کیوں بلبل کو نہ رہائی کا اسے غم نہ گرفتاری کا

مان لیتا ہوں تیرے وعدے کو بھول جاتا ہوں میں کہ تو ہے وہی

دے رہے ہیں مے وہ اپنے ہاتھ سے اب یہ شئے انکار کے قابل نہیں

زمانہ ہے کہ گزرا جا رہا ہے، یہ دریا ہے کہ بہتا جا رہا ہے

زمانے پر ہنسے کوئی کہ روئے جو ہونا ہے وہ ہوتا جا رہا ہے

رواں ہے عمر اور انسان غافل، مسافر ہے کہ سوتا جا رہا ہے

ائے پھر چھیڑ دیا ذکرِ گلستاں تو نے خشک آنسو نہ ہوئے تھے مرے صیاد ابھی

سب دل کے داغ مٹ گئے اُس گل کو دیکھکر قربان ایک پھول پہ سارا چمن ہوا،

بجلی کی تانک جھانک سے تنگ آگئی ہو جان ایسا نہ ہو کہ پھونکدوں خود آشیاں کو میں

مدت ہوئی ہے، سیرِ گلستاں کئے ہوئے گل منتظر ہیں چاک گریباں کئے ہوئے

بیٹھے رہے قفس میں مزے آشیاں کے ہم دامن کو اشک خوں سے گلستاں کئے ہوئے

جگرؔ مراد آبادی (وفات ۹ ستمبر ۱۹۶۰ء)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جو سرور تیری گلی میں نہیں جو اثر ترے جاں میں مزا نہیں
ترے حسن کا بھی قصور ہے، مرے عشق ہی کی خطا نہیں

مرے جذبِ عشق پہ حرف ہے، مجھے بے بسی کا گلا نہیں
ترے جبرِ حسن کی خیر ہو، مرے اختیار میں کیا نہیں

مجھے میں بھی خود نہ بتا سکوں، مرا راز دل ہے وہ رازِ دل
جسے غیر دوست سمجھ سکے، مرے ساز میں وہ صدا نہیں

مرا ذوق بھی، مرا شوق بھی ہے بلند سطحِ عوام سے
ترا ہجر بھی، ترا وصل بھی مرے دردِ دل کی دوا نہیں

یہ مرید جبہ پوش خوب ترا، مگر آہ واعظِ بے خبر
اُسے ساز کا رہِ زہد کیا، جسے معصیت بھی روا نہیں

وہ ہزار دشمنِ جاں سہی، مجھے پھر بھی غیر عزیز ہے
جسے خاکِ پا تری چھو گئی، وہ برا بھی ہو تو برا نہیں

مرے دردِ دل میں خلش کہاں، مرے سوز میں یہ تپش کہاں
کسی اور ہی کی پکار ہے، مری زندگی کی صدا نہیں

وہی ربطِ عشق و وصال ہے، ترا اور کچھ جو خیال ہے
یہ سمجھ "کہ تجھ میں ہے کچھ کمی" یہ نہ کہہ کہ جنسِ وفا نہیں

مرے شعر میں ہیں نزاکتیں، مری نظم میں ہیں لطافتیں
مگر ان کو یہ کہیں اے جستجو "ادیب کیف" کی صدا نہیں

جگر مرادآبادی

علی سکندر نام۔ جگر تخلص، وطن مرادآباد۔ سنہ ولادت ۱۸۹۰ء۔ آپ کے مورث اعلیٰ مولوی محمد سمیع دہلی کے باشندے تھے اور شاہجہاں کے استاد۔ لیکن کسی وجہ سے عتاب ہوا اور مرادآباد چلے آئے۔ آپ کے دادا حافظ محمد نور بھی شاعر تھے اور آپ کے والد مولوی علی نظر بھی وزیر لکھنوی کے شاگرد تھے۔
انگریزی میں انٹرنس تک تعلیم پائی اور شاعری میں پہلے داغ، اور پھر امیر اللہ تسلیم کا تلمذ حاصل کیا۔ اس دور کی شاعری کے نمونے داغ جگر میں پائے جاتے ہیں، دوسرا دور شاعری کا وہ ہے جو اصغر گونڈوی کے زیر اثر شروع ہوا اور شعلۂ طور اسی دور کی یادگار ہے۔ اب کچھ زمانہ سے مستقلاً گونڈہ میں قیام ہے۔

اللہ اللہ رے ہستی شاعر
قلب غنچے کا آنکھ شبنم کی

ترے بیان میں قاصد کچھ اشتباہ نہیں
مخبر ایں قدر، کہ یہ فرمودۂ نگاہ نہیں

وہ میری طرف بڑھا دے گلچیں،
جن پھولوں میں رنگ ہے نہ بو ہے

بیٹھے ہیں بزم دوست میں گم شدگان حسن دوست
عشق ہے اور طلب نہیں، نغمہ ہے اور صدا نہیں

ازل ہی سے چمن بند محبت
یہی نیرنگیاں دکھلا رہا ہے
کلی کوئی جہاں پر کھل رہی ہے
وہیں اک پھول بھی مرجھا رہا ہے

ارباب چمن سے نہیں پوچھو یہ چمن سے
کہتے ہیں کسے نکہت برباد کا عالم

سحر ہونے کو ہے بیدار شبنم ہوتی جاتی ہے
خوشی منجملۂ اسباب ماتم ہوتی جاتی ہے

اپنے کو میں آپ پوجتا ہوں،
آئینۂ حسن روبرو ہے،

جو ساز کہ خود نغمۂ حرماں تھا اسی کو
اندیشۂ مضراب ہے معلوم نہیں کیوں

ہر اک صورت ہر اک تصویر مبہم ہوتی جاتی ہے
الٰہی کیا مری دیوانگی کم ہوتی جاتی ہے

ترے بغیر تو جینا روا نہیں لیکن،
میں کیا کروں جو ترا غم ہی جاں نواز رہے

عشق ہی کے ہاتھوں میں کچھ سکت نہیں رہتی
ورنہ چیز ہی کیا ہے گوشۂ نقاب اُن کا

آنکھوں کا تھا قصور نہ دل کا قصور تھا
آیا جو میرے سامنے میرا غرور تھا

گلے مل کر وہ رخصت ہو رہے ہیں
محبت کا زمانہ آ رہا ہے

وہ ہزار دشمنِ جاں سہی مجھے پھر بھی غیر عزیز ہے
جسے خاکِ پا تری چھو گئی وہ بُرا بھی ہو تو بُرا نہیں

محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گزرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

جو ہیں خاص چشم و چراغِ محبت
وہ آنسو نہیں ہیں نظر آنے والے

کسی صورت نمودِ سوزِ پنہانی نہیں جاتی
بجھا جاتا ہے دل چہرے کی تابانی نہیں جاتی

جب تک شباب عشق مکمل شباب ہے
باقی بھی ہے شراب ہو ابھی شراب ہے

وہ لاکھ سامنے ہوں مگر اس کا کیا علاج
دل اتنا نہیں کہ نظر کامیاب ہے

صبا یہ اُن سے ہمارا پیام کہہ دینا
گئے ہو جب سے یہاں صبح و شام ہی نہ ہوئی

اُنھیں کے دل سے کوئی اسکی عظمتیں پوچھے
وہ ایک دل جسے سب کچھ لٹا کے لوٹ لیا

اور تو کچھ کمی نہیں، آپ کے اقتدار میں،
آپ مجھے بھلا سکیں یہ نہیں اختیار میں

فتنۂ روزگار میں امن ہے کیا قرار کیا
حاصلِ زیست غم سہی غم کا بھی اعتبار کیا

جیسے حسن کی دیوی جھانکتی ہے چلمن سے
نیم واسی آنکھوں میں اُف وہ کیفِ خواب اُن

اک لفافۂ رنگیں ایک پرچۂ سادہ
اے دلِ سکون دشمن۔ لے ترا جواب آ

کیوں آتشِ گل میرے نشیمن کو جلائے
تنکوں میں ہے خود برق چمن زاد کا ع

جوانی حاصلِ حُسنِ دو عالم ہوتی جاتی ہے
ارے تو یہ قیامت قد آدم ہوتی جاتی ہے

جسے رونق ترے قدموں نے دے کر چھین لی رونق
وہ لاکھ آباد ہو۔ اس گھر کی ویرانی نہیں جا

اُن لبوں کی جاں نوازی دیکھنا
منہ سے بول اُٹھنے کو ہے جامِ شراب

دل کو برباد کر کے بیٹھا ہوں،
کچھ خوشی بھی ہے، کچھ ملال بھی ہے

آ کہ تجھ بن اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

کوئے جاناں کی ہوا تک سے بھی تھراتا ہوں میں
کیا کروں بے اختیارانہ چلا جاتا ہوں میں

میری ہستی شوقِ پیہم، میری فطرت اضطراب
کوئی منزل ہو مگر گزرا چلا جاتا ہوں میں

اُن کے بہلائے بھی نہ بہلا دل،
رائگاں سعیِ التفات گئی،

ترکِ اُلفت۔ بہت بجا ناصح،
لیکن اُس تک۔ اگر یہ بات گئی،

دن کا کیا ذکر تیرہ بختوں میں، ایک رات آئی، ایک رات گئی،
سینۂ سنگ پہ جو گزرتی ہے وہ لب سنگ نواز کیا جانے،
عبرتِ بندگی و ناچاری، کوئی بندہ نواز کیا جانے،
دل تو سینے ہی میں رہتا ہے مگر اُن کے حضور جیسے اب جاتا ہے دل سینے سے اب جاتا ہو دل
اس عشق کی تلافی مافات دیکھنا رونے کی حسرتیں ہیں جب آنسو نہیں رہے
ہم نہ مرتے ترے تغافل سے پرسشِ بے حساب نے مارا
ہائے یہ مجبوریاں محرومیاں ناکامیاں عشق آخر عشق ہے، تم کیا کرو ہم کیا کریں
کس طرف جاؤں کدھر دیکھوں کسے آواز دوں اے ہجومِ نامرادی جی بہت گھبرائے ہے
ہم سے پوچھو تو عشق کی بھی نگاہ سخت کافر نگاہ ہوتی ہے،
وہ بھی ہے اک مقامِ عشق جہاں، ہر تمنا گناہ ہوتی ہے،
کہاں کے حُسن و محبت کہاں کے مہر و وفا بس ایک سحر جوانی تھا اور زمانا تھا،
الٰہی ترکِ محبت بھی کیا محبت ہے بھلاتے ہیں اُنھیں وہ یاد آئے جاتے ہیں
حُسن کی معیت میں اس طرح شباب آیا جیسے کچی نیند اُٹھ کر کوئی مست خواب آیا
وہ یوں دل سے گزرتے ہیں کہ آہٹ تک نہیں ہوتی وہ یوں آواز دیتے ہیں کہ پہچانی نہیں جاتی
دریا کی زندگی پر صدقے ہزار جانیں، مجھ کو نہیں گوارا ساحل کی موت مرنا
میں ترا عکس ہوں کہ تو میرا اس سوال و جواب نے مارا
دیکھا کیا نہ یہ بھی صیاد و باغباں سے اک شاخ گل تھی لپٹی اک شاخ آشیاں سے
جو خود نہ زندگی ہو نہ پیغامِ زندگی وہ حُسن قہر ہے، وہ محبت عذاب ہے
زمانے کے ہم دوش و ہمراز کب تک زمانے کو پیچھے ہٹاتا چلا جا
دل آج بھی سینے میں دھڑکتا تو ہے لیکن کتنی ہی تہ آب ہے معلوم نہیں کیوں
دیر تاثیرِ محبت ـ کا تماشا دیکھیں اب وہ آئینے میں رنگِ رخ زیبا دیکھیں
ہر حقیقت کو بہ اندازِ تماشا دیکھا خوب دیکھا ترے جلووں کو مگر کیا دیکھا
زمانہ گرم رفتار ترقی ہوتا جاتا ہے مگر اک چشم شاعر ہے کہ پرنم ہوتی جاتی ہے
[illegible] کی رین اندھیری تنہائیوں کا عالم بھولے ہوئے فسانے سب یاد آرہے ہیں
جو پڑی تھی دل پہ سہہ گئے لیکن ایک نازک سی بات نے مارا

شکن کاش پڑ جائے اپنی جبیں پر　　پشیماں بہت ہیں ستم ڈھانے والے
سراپا محبت بنے جا رہے ہیں　　سلامت رہیں اُن کو بہکانے والے

دل دھڑکتے ہی پھر گئی وہ نظر　　لب تک آئی نہ تھی کہ بات گئی
مرگِ عاشق تو کچھ نہیں لیکن　　اک مسیحا نفس کی بات گئی

شکرِ شباب و یادِ یار درد فراق و انتظار　　آنکھ کھلی سُلا دیا، آنکھ لگی جگا دیا،
شوق نے بیخودی میں جب دستِ طلب بڑھا دیا　　عبرتِ عشق نے وہیں پہلو دل دبا دیا،
حسن ہے حسنِ بے اماں، ضد نہ کرائے غمِ نہاں　　پھر یہ نگاہ دل کہاں پردہ اگر اُٹھا دیا
خیر ہوا اے نسیمِ ناز، پھیل نہ جائے بوئے راز　　تو نے یہ کیا غضب کیا، غنچۂ دل کھلا دیا

عشق فنا کا نام ہے۔ عشق میں زندگی نہ دیکھ　　جلوۂ آفتاب بن، ذرے میں روشنی نہ دیکھ
ہو کے رہے گا ہم نوا وہ بھی ترے ہی ساتھ ساتھ　　نغمۂ شوق گائے جا حسن کی برہمی نہ دیکھ

سوزِ تمام چاہیئے رنگِ دوام چاہیئے　　شمعِ سرِ مزار ہو، شمع سرِ مزار کیا

بھول جاؤں کہ مرا ذوقِ محبت کیا ہے　　اس طرح تو نہ مری حوصلہ افزائی ہو

یہ عشق نہیں آساں اتنا ہی سمجھ لیجے　　اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے
ستمِ عشق میں آپ آساں نہ سمجھیں　　تڑپ جائے گا جو تڑپائے گا،

"ترا جذبۂ عشق ہے بے حقیقت"　　ذرا پھر تو ارشاد فرمائیے گا

محبت میں ہم تو جیئے ہیں جئیں گے　　وہ ہوں گے کوئی اور مر جانے والے

یہ تو نہیں کہ عرضِ غم درخورِ اعتنا نہیں　　عالمِ حسن کو مگر فرصتِ ماسوا نہیں

کچھ جو پشیمانِ جفا ہو گئے　　اور وہ گھبرا کے خفا ہو گئے

دیرینہ دوستی خوش انفاس کا لحاظ　　اے محتسب نزاکتِ احساس کا لحاظ

اُن کے جاتے ہی یہ حیرت چھا گئی،　　جس طرف دیکھا کیا۔ دیکھا کیا
نظر سے اُن کی، پہلی ہی نظر یوں مل گئی اپنی،　　کہ جیسے مدتوں سے تھی کسی سے دوستی اپنی

وہ ان کی بے رُخی وہ بے نیازانہ ہنسی اپنی　　بھری محفل تھی لیکن بات بگڑی بن گئی اپنی

پھول وہی چمن وہی، فرق نظر نظر کا ہے　　عہدِ بہار میں تھا کیا دورِ خزاں میں کیا نہیں

رہ گیا ہے اب تو بس اتنا ہی ربط اک شوخ سے　　سامنا جس وقت ہو جاتا ہے بھر آتا ہے دل

تو نے جس اشک پر نظر ڈالی　　جوش کھا کر وہی شراب ہوا

شاعر ہے محوِ فطرت جذبات چھا رہے ہیں   پیغام آ رہے ہیں پیغام جا رہے ہیں

جب ملی آنکھ ہوش کھو بیٹھے   کتنے حاضر جواب ہیں ہم لوگ

اللہ تجھے رکھے محفوظ حوادث سے   اے کفر ترے دم تک آرائشِ ایماں ہے

پیتا بغیرِ اذن یہ کب تھی مری مجال   در پردہ چشمِ یار کی شہ پا کے پی گیا

کدھر سے برق چمکتی ہے، دیکھیں اے واعظ   میں اپنا ساغر اُٹھاتا ہوں تو کتاب اُٹھا

جدھر کو مستیِ دریا نے رخ کیا اپنا   تڑپ کے موج اُٹھی جھوم کر حباب اُٹھا

مجھے اُٹھانے کو آیا ہے واعظِ ناداں   جو اُٹھ سکے تو مرا ساغرِ شراب اُٹھا

کہاں فراغ تلوّن مزاجیوں سے تری   یہ دردِ ہجر ہی اے کاش جاوداں ہوتا

بہار توبہ شکن چشمِ مستِ یار مُصر   میں آج پی جو نہ لیتا وہ بدگماں ہوتا

ہم سے نظر پھیر لی اُس شوخ نے   ہم بھی ہیں انساں خفا ہو گئے

عشق ہی تنہا نہیں آشفتہ سر میرے لئے   حسن بھی بیتاب ہے اور کس قدر میرے لئے

اب نظر کو کہیں قرار نہیں،   کاوشِ انتخاب نے مارا

کوئی حسیں حسیں ہی ٹھہرتا نہیں جگر   باز آئے اس بلندیِ ذوقِ نظر سے ہم

ذروں سے باتیں کرتے ہیں دیوار و در سے ہم   مایوس کس قدر ہیں، تری رہگزر سے ہم

اتنی سی بات پر ہے بس اک جنگ زرگری   پہلے اُدھر سے بڑھتے ہیں وہ یا اِدھر سے ہم

لازم خودی کا ہوش بھی ہے بے خودی کے ساتھ   کس کی اُسے خبر، جسے اپنی خبر نہ ہو

ممکن نہیں کہ جذبۂ دل کارگر نہ ہو،   یہ اور بات ہے تمھیں اب تک خبر نہ ہو

وہ بدگمانیاں ہیں کہ وہ سرگرانیاں   اتنی بھی دل کی دل کو الٰہی خبر نہ ہو

جسے میں بھی خود نہ بتا سکوں، مرا راز دل ہے وہ رازِ دل   جسے غیر دوست سمجھ سکے، مرے ساز میں وہ صدا نہیں

عرضِ شوق پر میری پہلے کچھ عتاب اُن کا   خاص اک ادا کے ساتھ اُف وہ پھر حجاب اُن کا

نہ ہو جس میں شامل ستم کا بھی پہلو   مرے حق میں وہ مہربانی نہیں ہے

صیاد و باغباں کی توجہ نہیں تو پھر   مجھ کو حصولِ خار و خسِ آشیاں سے کیا،

یہ عالم ہے اب خشک آنکھوں میں اپنی   کہ طوفاں ہے برپا روانی نہیں ہے

حدودِ کوچۂ محبوب ہیں، وہیں سے شروع   جہاں سے پڑنے لگیں پاؤں ڈگمگاتے ہوئے

لے کے خط اُن کا کیا ضبط بہت کچھ لیکن   تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں نے بھرم کھول دیا

ملا کے آنکھ نہ محرومِ ناز رہنے دے　　تجھے قسم جو مجھے پاکباز رہنے دے،

اب تجھے میری محبت کا یقیں ہو کہ نہ ہو　　میں نہ کھاؤں گا ترے دردِ محبت کی قسم

جب سے اُس نے پھیر لیں نظریں رنگ تباہی آہ نہ پوچھ　　سینہ خالی۔ آنکھیں ویراں۔ دل کی حالت کیا کہئے

خطا معاف، کسی اور کا تو ذکر ہی کیا،　　نیاز مند ترے تجھ سے بے نیاز رہے

افسوس اعتبارِ کرم کیوں کیا مجھے　　اب ہر خطائے شوق اُسی کا جواب ہے

خجل جس سے ہونا پڑے دل ہی دل میں　　وہ کچھ اور ہے۔ مہربانی نہیں ہے

ترے حسنِ حیات افروز کو دیکھا ہے جس دن سے　　بہت مجھ کو عزیز اُس دن سے اپنی زندگانی ہے

خوشا بیداد خونِ حسرتِ بیداد ہوتا ہے　　ستم ایجاد کرتے ہو کرم ایجاد ہوتا ہے

کوئی حد ہی نہیں شاید محبت کے فسانے کی　　سناتا جا رہا ہے، جس کو جتنا یاد ہوتا ہے

ہم عشق کے ماروں کا اتنا ہی فسانا ہے　　رونے کو نہیں کوئی۔ ہنسنے کو زمانا ہے

وہ مسرتوں میں خلش نہیں جو اذیتوں میں مزا نہیں　　ترے حسن کا بھی قصور ہے مرے عشق ہی کی خطا نہیں

مرا ذوق بھی، مرا شوق بھی ہے بلند سطحِ عوام سے　　ترا ہجر بھی، ترا وصل بھی، مرے دردِ دل کی دوا نہیں

چُپ ہیں وہ یوں سُن کے مری عرضِ شوق　　جیسے کہ سچ مچ ہی خفا ہو گئے

کہئے حالِ دل لیکن۔ دیکھئے کن آنکھوں سے　　ہر سکوں کے پردے میں۔ حشرِ اضطراب اُن کا

اللہ رے اس گلشنِ ایجاد کا عالم　　جو صید کا عالم وہی صیاد کا عالم

تصور رفتہ رفتہ اک سراپا بنتا جاتا ہے　　وہ اک شے جو مجھی میں ہے مجسم ہوتی جاتی ہے

کرے نہ کام جو بلبل کا نالۂ خونیں　　نہ غنچے نیند سے چونکیں، نہ رنگ و بو آئے

خبر نہیں مجھے، میں کیا ہوں آرزو کیا ہو　　کسی نے جب مٹے یہ سمجھا دیا کہ تو کیا ہے

غنچۂ و نسرین و گل انجم و خورشید و ماہ　　یہ بھی مری رہ گزر وہ بھی مری گردِ راہ

کوچۂ عشق میں نکل آیا　　جس کو خانہ خراب ہونا تھا

لاکھوں میں انتخاب کے قابل بنا دیا　　جس دل کو تم نے دیکھ لیا دل بنا دیا

اُف رنگِ رخ بانیِ بیداد کا عالم　　جیسے کسی مظلوم کی فریاد کا عالم

قدم ڈگمگائے نظر بہکی بہکی　　جوانی کا عالم ہے سرشاریاں ہیں،

چمن سوز گلشن کی گل کاریاں ہیں　　یہ کس سوختہ دل کی چنگاریاں ہیں،

میرے جنونِ عشق کی کیوں نہ ہو عاقبت خراب　　مجھ کو ہنسا ہنسا کے آج اُن کو بلا کے رلا دیا

ہمیں کیوں اب کوئی سمجھائے دل اپنا خوشی اپنی   گریباں اپنا، ہاتھ اپنے جنوں اپنا ہنسی اپنی،

۔ اُن کے جانے ہی پہ حیرت چھا گئی   جس طرف دیکھا کیا، دیکھا کیا،

یہ تیرِ ناز نہیں تو شوق سے چلائے جا   خیالِ خاطرِ اہلِ نیاز رہنے دے

لٹا دے دولتِ کونین اور میرے لئے   بس اک تبسم عاجز نواز رہنے دے

حاصلِ صد عرضِ غم، مایۂ صد عرضِ شوق،   اک مترنم سکوت، اک متبسم نگاہ،

مانا غرورِ عشق بھی اک چیز ہے مگر   اتنے بھی دور، دور، ترے آستاں سے کیا

ناصح فسانہ اپنا، ہنسی میں اُڑا گیا   خوش فکر تھا کہ صاف یہ پہلو بچا گیا،

یہ فریب جلوہ ہے سر بسر مجھے ڈر یہ ہے دلِ بے خبر   کہیں جم نہ جائے تری نظر انھیں چند نقش و نگار پر

کبھی شاخ و سبزۂ و برگ پر کبھی غنچۂ و گل و خار پر   میں چمن میں چاہے جہاں رہوں مرا حق ہے فصلِ بہار پر

ان کی وہ آمد آمد اپنا یہاں یہ عالم   اک رنگ آ رہا ہے، اک رنگ جا رہا ہے

دل سے خطا ہوئی تو، اب دل ہے اور میں ہوں   نازک معاملہ ہے، تم فیصلہ نہ کرنا !

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں   یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں

وہی قیامت ہے قدِ بالا وہی ہے صورت وہی سراپا   لبوں کو جنبش، نگہ کو لرزش کھڑے ہیں اور مسکرا رہے ہیں

کرشمے ذات و صفات کے ہیں جمالِ قدرت دکھا رہے ہیں   کہ ہر تصور سے دور رہ کر وہ ہر تصور میں آ رہے ہیں

لگا دے آگ او برقِ تجلی دیکھتی کیا ہے،   نگاہِ شوق ظالم نارسا یوں بھی ہے اور یوں بھی

آج کچھ اپنا پتا ملتا نہیں،   میں کہاں ہوں اور نگاہِ باریاب

یوں تو پیاسے ہیں سبزۂ و گل بھی   کس نے دیکھی ہے پیاس شبنم کی

حسن آیا تھا خود منانے کو   سو توجہ ہی عشق نے کم کی،

یہی جی چاہتا ہے چھیڑتے ہی چھیڑتے رہئے   بہت دلکش ادائے حسن برہم ہوتی جاتی ہے

مجھے کیا پڑی ہے ترے در سے اٹھوں   ٹھہرنے جو دے اضطرابِ محبت

یہ کیا ہے، کہ پہلو میں وہ بھی ہیں لیکن،   شبِ ماہ پھر بھی سہانی نہیں ہے

عجب انقلاب زمانہ ہے، مرا مختصر سا فسانہ ہے   یہی۔ اب جو بار ہے دوش پر یہی سر تھا زانوئے یار پر

حشر کے دن وہ گنہگار نہ بخشا جائے   جس نے دیکھا تری آنکھوں کا پشیماں ہونا

دل کو کیا کیا سکون ہوتا ہے   جب کوئی آسرا نہیں ہوتا

امیدِ عفو کو بھی میں نے اب دل سے مٹا ڈالا   یہ تھا اک بدنما دھبا مرے دامانِ عصیاں کا،

بجھتی ہی نہیں اب کسی ساغر سے مری پیاس
شاید مرا مقصد ہی مری تشنہ لبی ہے،

قلزم آشامی یک قطرۂ بیتاب کو دیکھ
گم کئے دیتی ہے میری ہی محبت مجھ کو

چاندنی ہے ہوا ہے کیا کہئے
مفلسی کیا بلا ہے کیا کہئے

یہ نشہ بھی کیا نشہ ہے کہتے ہیں جسے حسن
جب دیکھئے کچھ نیند سی آنکھوں میں بھری ہے

اپنا زمانہ آپ بناتے ہیں اہلِ دل
ہم وہ نہیں کہ جن کو زمانہ بنا گیا

نکہتِ گل کا بھی دماغ نہیں
کتنا آزردۂ بہار ہوں میں،

ارباب چمن سے نہیں، پوچھو یہ چمن سے
کہتے ہیں کسے نکہتِ برباد کا عالم

مجھ ناتوانِ عشق کو سمجھا ہے تم نے کیا،
دامن پکڑ لیا تو چھڑایا نہ جائے گا

ان لبوں کی جاں نوازی دیکھنا
منھ سے بول اُٹھنے کو ہے جامِ شراب

پھر وہ ہم سے خفا ہے کیا کہئے
زندگی بے حیا ہے کیا کہئے

کیا بتائیں عشق ظالم کیا قیامت ڈھائے ہے
یہ سمجھ لو جیسے دل سینے سے نکلا جائے ہے

حرم و دیر میں رندوں کا ٹھکانا ہی نہ تھا
وہ تو یہ کہئے، اماں مل گئی میخانے میں،

وہ بھی نکلی ایک شعاعِ برقِ حُسن
میں نے جسے اپنی نظر سمجھا کیا

نویدِ بخششِ عصیاں سے شرمسار نہ کر
گناہگار کو یارب گناہگار نہ کر

جب ملی آنکھ ہوش کھو بیٹھے
کتنے حاضر جواب ہیں ہم لوگ

ناز کرتی ہے خانہ ویرانی
ایسے خانہ خراب ہیں ہم لوگ

اُس سے بھی شوخ تر ہیں اس شوخ کی ادائیں
کر جائیں کام اپنا لیکن نظر نہ آئیں،

جنونِ محبت یہاں تک تو پہونچا
کہ ترکِ محبت کیا چاہتا ہوں

محوِ تسبیح تو سب ہیں مگر ادراک کہاں
زندگی خود ہی عبادت ہے مگر ہوش نہیں

حُسن کی سحر کاریاں عشق کے دل سے پوچھئے
وصل کبھی ہے ہجر سا، ہجر کبھی وصال سا

حُسن کی شانیں تھیں جتنی سب نمایاں ہوگئیں
بو ترے رخ سے کہیں رنگِ گلستاں ہوگئیں

جوشؔ ملیح آبادی (وفات ۲۲ فروری ۱۹۸۲ء)

پروگرام

اے شخص، اگر جوشؔ کو تو ڈھونڈنا چاہے — وہ پچھلے پہر حلقۂ عرفاں میں ملیگا

اور صبح کو وہ ناظرِ نظارۂ قدرت — طرفِ چمن و صحنِ گلستاں میں ملیگا

اور دن کو وہ سرگشتۂ اسرار و معانی — بزمِ ہنر و کوئے ادیباں میں ملیگا

اور شام کو وہ مردِ خدا، رندِ خوش اوقات — رحمت کدۂ بادہ فروشاں میں ملیگا

اور رات کو وہ خلوتیِ کاکل و رخسار — بزمِ طرب و کوچۂ خوباں میں ملیگا

اور ہوگا کوئی جبر، تو وہ بندۂ مجبور
مُردے کی طرح خانۂ ویراں میں ملیگا

جوشؔ
۲۶ فروری ۱۹۴۲ء
رام پور

جوشؔ ملیح آبادی

نام شبیر حسن خاں۔ جوشؔ تخلص۔ ولادت ۱۸۹۶ء آپ کے بزرگ کابل سے آئے اور عرصہ تک قائم گنج ضلع فرخ آباد میں قیام کیا۔ پھر ملیح آباد آگئے۔ اکثر افراد اس خاندان کے سلطنت اودھ میں اعلیٰ عہدوں پر مامور رہے آپ کے جد امجد نواب فقیر محمد خاں، آپ کے دادا نواب محمد احمد خاں اور آپ کے والد نواب بشیر الدین خاں سب کے سب شاعر تھے۔

جوشؔ کی شاعری بارہ تیرہ سال کی عمر سے شروع ہو گئی تھی۔ ابتدا میں کچھ دنوں عزیزؔ لکھنوی سے اصلاح لی بعد پھر خود اپنی طبیعت کی رہنمائی میں ترقی کی۔ آپ کے کلام کے کئی مجموعے شایع ہو گئے ہیں۔ فی الحال لکھنؤ میں قیام ہے

صبح، بالیں پہ یہ کہتا ہوا غمخوار آیا
اُٹھ، کہ فریاد رسِ عاشقِ بیمار آیا

للہ الحمد کہ گلزار میں ہنگامِ صبوح
حکمِ آزادیٔ مرغانِ گرفتار آیا

اے نظر! شکر بجا لا کہ کھلی زلفِ دراز
اے صدف! آنکھ اُٹھا، ابرِ گہربار آیا

خوش ہو اے گوش! کہ جبریلِ ترنم چہکا
مژدہ اے چشم! کہ پیغمبرِ انوار آیا

اے حسن! اگر عشق خریدار نہ ہوتا
یہ غلغلۂ گرمیٔ بازار نہ ہوتا

میں آہ نہ بھرتا تو ترا لعلِ نگاریں
گل بیز و گل افشان و گہربار نہ ہوتا

صد شکر کہ پھر زیست کا ساماں نظر آیا
پھر در پہ کوئی فتنۂ دوراں نظر آیا

پھر کاکلِ ژولیدہ سے جھلکا رخِ رنگیں
پھر ابر کے سائے میں گلستاں نظر آیا

اب تک نہ خبر تھی مجھے اُجڑے ہوئے گھر کی
تم آئے تو گھر بے سر و ساماں نظر آیا

محفلِ عشق میں وہ نازشِ دوراں آیا
اے گدا خواب سے بیدار کہ سلطاں آیا

دور اے زہد! کہ وہ زہد شکن آپہونچا
رخصت، ایماں! کہ وہ غارتگرِ ایماں آیا

کج کلاہی کا سر و برگ مبارک اے جوشؔ
لے پیامِ شکنِ طرۂ جاناں آیا

گزر رہا ہے ادھر سے تو مسکراتا جا
چراغِ مجلسِ روحانیاں جلاتا جا

اٹھا کے ناز سے شب آفریں نگاہوں کو
کسی کی سوئی ہوئی صبح کو جگاتا جا

اٹھا کے عارضِ گلگوں سے دو گھڑی کو نقاب
نظر سے ارض و سما کا حجاب اٹھاتا جا

اگر یہ لطف گوارا نہیں تو مستِ خرام!
جبینِ جوشؔ پہ ٹھوکر ہی اک لگاتا جا

ارض و سما کو ساغر و پیمانہ کر دیا
رندوں نے کائنات کو میخانہ کر دیا

کچھ روز تک تو نازشِ فرزانگی رہی
آخر ہجومِ عقل نے دیوانہ کر دیا

دنیا نے ہر فسانہ "حقیقت" بنا دیا
ہم نے حقیقتوں کو بھی "افسانہ" کر دیا

آواز دو کہ جنسِ دو عالم کو جوشؔ نے
قربانِ یک تبسمِ جانانہ کر دیا

جب دل نے مجھکو شعلہ بداماں بنا دیا
میں نے ہر ایک خار کو بستاں بنا دیا

زلفوں کی ہر گرہ کو عطا کی متاعِ دل
ابرو کی ہر شکن کو رگِ جاں بنا دیا

خالِ سیہ کو بخشش کے مُہرِ پیمبری
زلفوں کی موجِ کفر کو ایماں بنا دیا

کج کر کلاہِ فخر کو تیرے شباب کو
میں نے خدائے عالمِ امکاں بنا دیا

لیکن با ایں ہمہ ترا احساں ہے جوشؔ پر
دل کو دئے وہ داغ کہ انساں بنا دیا

حرم ہو، مدرسہ ہو، دیر ہو، مسجد کہ میخانہ
یہاں تو صرف جلوے کی تمنا ہے کہیں آ جا

بڑے دعوے ہیں اہلِ انجمن کو صبر و تمکیں کے
کبھی جلوت میں بھی اے فتنۂ خلوت نشیں آ جا

چلا ہے سوئے حرم، دل سے ساز کرتا جا
طوافِ کعبۂ حسنِ مجاز کرتا جا

فراغِ روزِ مسرت کے ڈھونڈنے والے
شبوں کو محرمِ سوز و گداز کرتا جا

چلا ہے خدمتِ یارِ درست پیماں میں
پرستشِ صنمِ حیلہ ساز کرتا جا

نہ جانے رات کو کیا میکدے میں مشغلہ تھا
کہ ہر نفس میں قیامت کا جوش و ولولہ تھا

زباں پہ آئیں تو ہر حرف سے لہو ٹپکے
ہر ایک سانس میں ان ولولوں کا قافلہ تھا

بساطِ خاک سے تا اوجِ ثابت و سیار
شمیمِ کاکلِ عنبر فشاں کا سلسلہ تھا

دور بینی و جوانی، یہ تماشا کیسا؟
عیشِ امروز کے طوفان میں فردا کیسا

رامش و رنگ کی گونجی ہوئی آوازوں میں
قصۂ جنت و افسانۂ عقبےٰ کیسا

جس شبِ ماہ میں ہو بربط و فرشِ سحاب
اُس شبِ ماہ میں تسبیح و مصلےٰ کیسا

جوشؔ، باغی ہے مشیت کا جوانِ صالح
موسمِ کفر میں اسلام کا دعوےٰ کیسا

ادھر بھی بادِ صبا! آ، بہار کی سوگند — شمیم طرۂ گیسوئے یار کی سوگند
چھڑا دو رنگیِ امید و بیم سے دل کو — طلسمِ گردشِ لیل و نہار کی سوگند
مرے دماغ پہ بھی ڈال پرتوِ مجذوب — تجھے شعاعِ سرِ کوہسار کی سوگند
وفا کے دُکھتے ہوئے پہلوؤں کو دے آرام — کنارِ یار و لبِ جوئبار کی سوگند
سُنا فسانۂ رفتارِ دل فروزِ نگار — جواں خرامیِ ابرِ بہار کی سوگند
بتا، بکھرتی ہے کس طرح زلف شانوں پر؟ — نزولِ رحمتِ پروردگار کی سوگند
ٹھہر ٹھہر کے سنا داستانِ عشوۂ و ناز — نزاکتِ دلِ امیدوار کی سوگند
سُنا دے جوشؔ کو بھی نغمہائے لعلِ نگار — خروشِ آمدِ فصلِ بہار کی سوگند

آ، اور جہاں کو غرقِ لبِ نوشخند کر — آوازۂ فسونِ جوانی بلند کر،
سنتا ہوں دردِ عشق ہے ہر درد کی دوا — آ، اور میرے دردِ جگر کو دوچند کر
اے خواجہ! زندگی میں اسیری ہے ناگزیر — دل کو اسیرِ کاکلِ مشکیں کمند کر
آیا ہے جوشؔ تحفۂ داغِ جگر لئے — مرضی تری پسند نہ کر یا پسند کر!

اُٹھی وہ گھٹا، رنگ سامانیاں کر — گہر پاشیاں کر، زر افشانیاں کر
وہ چھلکے عنادل، وہ سنکیں ہوائیں — گلوں کی طرح چاک دامانیاں کر
سکوں پاؤں چومے وہ ہلچل مچا دے — خرد سر جھکا دے وہ نادانیاں کر
علم کھول کر جوشؔ بدمستیوں کے — جہاں داریاں کر، جہاں بانیاں کر

شیخ اور خلشِ بندگی و زحمتِ پرہیز — میں اور مئے دیرینہ و معشوقۂ نوخیز
[ک]ہسار میں تیشے کی صدا گونج رہی ہے — افسوس ہے اے زمزمۂ عشرتِ پرویز
[ا]ے گیسوئے شبرنگ! وہی نکہتِ فردوس — اے نرگسِ مخمور! وہی ساغرِ لبریز

[پ]ھر ہمدباں وہ خسروِ خوباں ہے آجکل — پھر دستِ شوق و دامنِ جاناں ہے آجکل
[ہ]ر ذرۂ حقیر ہے فردوسِ رنگ و بو — ہر دشتِ بے گیاہ گلستاں ہے آجکل
[ہ]ر فکر، پھر ہے فکرِ الٰہی سے ہم عناں — ہر عزم پھر ارادۂ یزداں ہے آجکل

[پ]ھر ابرِ تیرہ اُٹھا، پھر چلی نسیمِ شمال — کدھر ہے ساقیِ جادو نگاہ و زہرہ جمال
[ا]بل رہی ہے بلندی پہ موجِ آبِ بقا — دمک رہی ہے گلابی میں آتشِ سیال
[ف]ضا ہے پرتوِ ابرِ سیہ سے رنگا رنگ — صبا ہے دولتِ بوئے چمن سے مالا مال

وہ جوشِ سوئے چمن جھومتا ہوا آیا
اُٹھ اے زمان و مکاں، اُٹھ برائے استقبال

زلفِ شکیب و صبر پریشاں ہے آجکل
پھر اضطراب سلسلہ جنباں ہے آجکل
پھر عاشقی کے روبہ ترقی ہیں ولولے
پھر سعیِ عقل سر بگریباں ہے آجکل
وہ سجدہ جس کے واسطے فرشِ حرم ہے ننگ
پھر آستانِ یار میں غلطاں ہے آجکل
اللہ رے گدازِ محبت کے معجزے
کافر تھا جو دماغ مسلماں ہے آجکل
وہ جان، جس پہ مایۂ کون و مکاں نثار
پھر نذرِ یک تبسّمِ جاناں ہے آجکل

پھر آشنائے لذّتِ دردِ جگر ہیں ہم
پھر محرمِ کشاکشِ ہر خیر و شر ہیں ہم
پھر عشق کی نظر میں ہے معشوقیت کا ناز
پھر حُسنِ دل نواز سے شیر و شکر ہیں ہم
جینے کے اشتیاق سے ہے پھر رمیدگی
پھر سینۂ حیات میں عزمِ سفر ہیں ہم
ہُشیار باش، ظلمتِ غمخانۂ حیات
پھر مرکزِ تجلّیِ شمس و قمر ہیں ہم
کس زعم میں ہے اے شبِ دیجورِ زندگی؟
پھر رازدارِ نورِ طلوعِ سحر ہیں ہم
پھر زندگی ہے غم کی امانت لئے ہوئے
ہر دولتِ نشاط سے پھر بہرہ ور ہیں ہم
آنکھوں میں نورِ مصحفِ جاناں لئے ہوئے
پھر کردگارِ عشق کے پیغامبر ہیں ہم
کھلتے نہیں ہیں ہوش، دماغوں پہ دل کے راز
بالاتر از رسائیِ نقد و نظر ہیں ہم'

نہ جادو، نہ افسوں، گری چاہتا ہوں
فقط حُسن سے دلبری چاہتا ہوں'
مزاجِ تمنائے خود دار توبہ
عبادت میں بھی داوری چاہتا ہوں
جو "پیغمبری" میں بھی دشواریاں ہوں
تو ہنگامۂ کافری چاہتا ہوں

دوستو! وقت ہے، پھر زخمِ جگر تازہ کریں
پردہ جنبش میں ہے، پھر آؤ نظر تازہ کریں
تا کجا نالۂ غربت، کہ چلی بادِ شمال
دل میں پھر زمزمۂ عزمِ سفر تازہ کریں
آؤ پھر جلوۂ جاناں پہ لٹا دیں کونین
شغلِ پارینۂ اربابِ نظر تازہ کریں

مری مجال، تیری بزم، اور لن ترانیاں!
میں نقشِ پائے رہرواں، تو افسرِ جہانیاں
شدید بدگمانیوں پہ حُسنِ ظن ہے یا سے
عمیق حُسنِ ظن میں ہیں ہزار بدگمانیاں'
عجیب طرفہ راز ہیں، مری شبوں کے راز بھی
جنھیں نہاں کئے ہوئے ہیں سیکڑوں جوانیاں
شبابِ رفتہ کے قدم کی چاپ سن رہا ہوں میں
ندیم! عہدِ شوق کی سنائے جا کہانیاں

اُٹھ، کہ تعمیرِ حیاتِ گزراں کچھ بھی نہیں
جز مئے ناب، سر و برگِ جہاں کچھ بھی نہیں

جام اُٹھا جام، کہ سرشاریٔ مستی کے بغیر — خندۂ حور و تماشائے جناں کچھ بھی نہیں
ایک ذرہ بھی ہو محسوس تو سب کچھ ہے وہی — ہو نہ محسوس تو خلاقِ جہاں کچھ بھی نہیں

نہ جانے رات کو تھا کون زینتِ پہلو — مچل رہی تھی ہوا میں شراب کی خوشبو
مٹا چکا تھا فلک رسمِ ساغر و سنداں — بھلا چکا تھا زمانہ نزاعِ سنگ و سبو
ہوا کی جیب میں تھا تیرِ از کماں رفتہ — کشش کے دام میں تھی کاوشِ رمِ آہو
اُدھر اُڑا ہوا طولِ شبِ فراق کا رنگ — اِدھر شباب پہ آرائشِ خمِ گیسو
چھڑی ہوئی ہے حکایت شبِ جوانی کی — تڑپ کے جوشؔ! پھر اک بار نعرۂ یاہو

فکر ہی ٹھہری تو دل کو فکرِ خوباں کیوں نہ ہو؟ — خاک ہونا ہے تو خاکِ کوئے جاناں کیوں نہ ہو؟
اِک نہ اِک رفعت کے آگے سجدہ لازم ہے تو پھر — آدمی محوِ سجودِ سروِ خوباں کیوں نہ ہو؟
جب فریبوں ہی میں رہنا ہے تو اے اہلِ خرد — لذتِ پیمانِ یارِ سست پیماں کیوں نہ ہو؟
ہاں جب آویزش ہی ٹھہری ہے تو ذرّے چھوڑ کر — آدمی خورشید سے دست و گریباں کیوں نہ ہو؟
اِک نہ اِک ظلمت سے جب وابستہ رہنا ہے تو جوشؔ — زندگی پر سایۂ زلفِ پریشاں کیوں نہ ہو؟

پا چکا طاعت کی لذت، درد کے پہلو بھی دیکھ — شیخ! آ محراب سے باہر، خمِ ابرو بھی دیکھ
فرشِ مسجد سے اٹھا بھی خاک آلودہ جبیں — رکھ کے زیرِ سر کبھی معشوق کا زانو بھی دیکھ
حسن ذرّوں سے اُبلتا ہے کبھی تو جام اُٹھا — دیکھتی ہیں جوشؔ کی آنکھیں جو عالم، تو بھی دیکھ

وہ شیشۂ شفق سے چھلکی مئے مغانہ — اے ساقیِ شبینہ! وا کر شراب خانہ
ہر شے سے پھوٹ نکلیں چشمے جوانیوں کے — ہاں اے نگارِ نورس! ایسا کوئی ترانہ
نغموں کو تیز تر کر ہاں اے جوان مغنّی! — وہ آ رہا ہے واپس گزرا ہوا زمانہ

سرشار ہوں، سرشار ہے دنیا مرے آگے — کونین ہے اک لغزشِ صہبا مرے آگے،
ہوں کتنی ہی تاریک شبِ زیست کی راہیں — اک نور سا رہتا ہے جھلکتا مرے آگے،
جب چاند جھلکتا ہے مرے ساغرِ زر میں — چلتا نہیں خورشید کا دعویٰ مرے آگے
جب جھوم کے مینا کو اُٹھاتا ہوں گھٹا میں — ہلتا ہے سرِ گنبدِ مینا مرے آگے
آتی ہے دُلہن بن کے بہشتیت کی جلو میں — آوارگیِ آدم و حوّا مرے آگے

آ، فصلِ گل ہے غرقِ تمنا ترے لئے — ڈوبا ہوا ہے رنگ میں صحرا ترے لئے
اُٹھ چشمِ جادوانۂ ساغر فروش اُٹھ — مچلی ہوئی ہے لغزشِ صہبا ترے لئے

آ، اور داد دے، کہ بایں چشمِ حق نگر — کھائے ہوئے ہوں زیست کا دھوکا ترے لئے
سبزے کا فرش، ابر کا خیمہ، گلوں کا عطر، — گلشن میں اہتمام ہے کیا کیا ترے لئے
طغیانِ گل شباب پہ، بلبل خروش میں — اِک حشر سا ہے باغ میں برپا ترے لئے

ہنوز چرخ پہ چھائی نہیں ہے مست گھٹا — چمن کی خاک ہے خود کو دُلہن بنائے ہوئے
نہیں ملا ہے صبا کو ہنوز اذنِ خرام — مگر چراغ ابھی سے ہیں جھلملائے ہوئے
سلگ رہے ہیں برابر ہزار ہا خرمن، — ہنوز ابر میں بجلی ہے منہ چھپائے ہوئے
کھلے ہوئے ہیں صبا میں ہزار ہا نافے — ہنوز زلف میں ہیں وہ گرہ لگائے ہوئے
ہنوز یار ہے خلوت گزین و حجلہ نشیں، — تمام بزم کے چہرے ہیں مُسکرائے ہوئے
سنا ہے جوشؔ، اُٹھے گی کسی آنکھ اِدھر — دلوں کو لوگ کلیجے سے ہیں لگائے ہوئے

یہ مانا دونوں ہی دھوکے ہیں رندی ہو کہ درویشی — مگر یہ دیکھنا ہے کونسا رنگین دھوکا ہے؟
کھلونا تو نہایت شوخ و رنگیں ہے تمدن کا — معترف میں بھی ہوں، لیکن کھلونا پھر کھلونا ہے
مجھے معلوم ہے جو کچھ تمنا ہے رسولوں کی! — مگر کیا درحقیقت وہ خدا کی بھی تمنا ہے؟

سوزِ غم دے کے مجھے اُس نے یہ ارشاد کیا — جا تجھے کشمکشِ دہر سے آزاد کیا
وہ کریں بھی تو کن الفاظ میں تیرا شکوہ — جن کو تیری نگہِ لطف نے برباد کیا
اے میں سو جان سے اِس طرزِ تکلم کے نثار — پھر تو فرمایئے کیا آپ نے ارشاد کیا
آشنا نوس ہوں فطرت سے، کلی جب چٹکی — جُھک کے میں نے یہ کہا مجھ سے کچھ ارشاد کیا
مجھ کو تو ہوش نہیں، تم کو خبر ہو شاید — لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا
کچھ نہیں اِس کے سوا جوشؔ حریفوں کا کلام — وصل نے شاد کیا، ہجر نے ناشاد کیا

وہ غریب دل کو سبق ملے کہ خوشی کے نام سے ڈر گیا — کبھی ہنس کے تم نے بھی بات کی تو ہمارا چہرہ اُتر گیا
تمھیں آہیں سننے کا شوق تھا، مگر اب بتاؤ کروگے کیا؟ — جو کراہتا تھا تمام شب، وہ مریضِ جوشؔ تو مر گیا

مٹ چلی تھی خلشِ سجدۂ شوق — پھر ترا نقشِ قدم یاد آیا
ہمنشیں! تو نے بھلایا تھا جسے — پھر ترے سر کی قسم یاد آیا

موت کی جانب مُڑا ہے بڑھ کے ہر اک راستہ — زندگی نے عافیت کی راہ دکھلائی تو کیا
سلسلہ خوابِ پریشاں کا نہ ٹوٹا صبح تک — ہم کو ہجرِ یار میں اے جوشؔ نیند آئی تو کیا

یارب [illegible] کہ راحت کی فکر نے — انساں کو اور غم میں گرفتار کر دیا

دل کچھ پنپ چلا تھا تغافل کی رسم سے — پھر تیرے التفات نے بیمار کر دیا
کل اُن کے آگے شرحِ تمنا کی آرزو — اتنی بڑھی کہ نطق کو بیکار کر دیا
یہ دیکھ کر کہ اُن کو ہے رنگینیوں کا شوق — آنکھوں کو ہم نے دیدۂ خونبار کر دیا

جو چاہنا اختیار کرنا — دنیا پہ نہ اعتبار کرنا
اے حشر! یہ تجھ سے التجا ہے — اب ہم کو نہ ہوشیار کرنا
اے بادِ صبا! اُس آشنا کو — ہم سے کبھی کبھی دوچار کرنا
حاصل ہو خدا کرے تجھے جوشؔ — نظارۂ روئے یار کرنا

یہ صبا نے خاک اُڑائی کیوں، یہ چٹک کے غنچے نے کیا کہا؟ — مجھے وہم ہوتا ہے ہمنوا! کوئی بھید اس میں ضرور تھا

وہ صبر دے کہ نہ دے، جس نے بیقرار کیا؟ — بس اب تمھیں پہ چلو ہم نے انحصار کیا
تمھارا ذکر نہیں ہے، تمھارا نام نہیں — کیا نصیب کا شکوہ ہزار بار کیا
ثبوت ہے یہ محبت کی سادہ لوحی کا — جب اُس نے وعدہ کیا، ہم نے اعتبار کیا

"کیوں چپ ہیں سب، مریضِ محبت کو کیا ہوا؟" — اُن کا یہ پوچھنا تھا کہ محشر بپا ہوا
زحمت نہ ہو تو در پہ ذرا چل کے دیکھ لو — آیا ہے کوئی اپنا پتا پوچھتا ہوا
اک تم کہ اہلِ دل کی نظر پر چڑھے ہوئے — اک میں کہ ہوں خود اپنی نظر سے گرا ہوا
شاعر کا دل، مناظرِ قدرت سے بے نیاز؟! — پیغمبر، اور کلامِ خدا سے پھرا ہوا!!!

تم بھی آؤ، ورنہ کلیوں کا چٹکنا باغ میں — میرے دل کے ٹوٹ جانے کی صدا ہو جائیگا

مطرب! بربط ہات سے رکھ دے، ماضی نے دکھ لوٹا — فریاد کہ جھوم کر ٹوٹ گیا، پھر کا تنا سا ارمانوں کا،
اے دیوِ وفا، اے جانِ کرم! یوں غم میں نہ میرا ہاتھ بٹا — مرجاؤں گا میں! اے شمعِ اخلاص! رحم، ذرا پھر پروانوں کا
اے جوشؔ! جنوں کی شام و سحر میں وقت کی یہ رفتار نہیں — داتاؤں کی طولانی صدیاں اور ایک نفس دیوانوں کا

فغاں، کہ مجھ غریب کو حیات کا یہ حکم ہے — سمجھ ہر ایک راز کو مگر فریب کھائے جا

ہٹ گئے دل سے تیرگی کے حجاب — آفریں اے نگاہِ عالمتاب
آڑے آیا نہ کوئی مشکل میں، — مشورے دے کے ہٹ گئے احباب
کیا قیامت تھی صبر کی تلقین — اور بھی روح ہو گئی بیتاب
بارے اُٹھے تو ناصحِ مشفق! — ہاں کدھر ہے صراحیِ مئے ناب
ہاں اثر اب ہوا محبت کا — ہم سے آنے لگا ہے اُن کو حجاب

شب جو بیٹھے وہ میرے پہلو میں
مسکرانے لگی شبِ مہتاب

جوشؔ، کھلتی تھی جن سے دل کی کلی
کیسے وہ لوگ ہو گئے نایاب

کشتیِ مے کو اے خدائے صبوح
بخش دے قسمتِ سفینۂ نوح

بخش اِس جسمِ پاک جوہر کو
مرگ فرسائیِ جلالتِ روح

چشمۂ زندگی ہو مدحِ سرا
ارغوانی شراب ہو ممدوح

بادہ ہے اِس طرف، اُدھر کوثر
اِس کو فاتح بنا، اُسے مفتوح

آنچ آئے نہ مے پر اے معبود!
تیرے بندے ہیں خستہ و مجروح

ہوئی جاتی ہے زندگی برباد
اے مرے دیر آشنا! فریاد

جی کڑا کر کے، حالِ دل اُن سے
اب تو کہتے ہیں، ہرچہ بادا باد

مست باقی، اے نگاہِ بادہ فروش
ہو گئے کتنے میکدے برباد

ہم بھی آخر خدا کے بندے ہیں
کوئی حد بھی ہے، او ستم ایجاد؟

جوشؔ اپنی سحر پرستی سے
جاگ اُٹھی قسمتِ ملیح آباد

عشووں کو چین ہی نہیں آفت کئے بغیر
تم اور مان جاؤ شرارت کئے بغیر؟

اہلِ نظر کو یار دکھاتا رہِ وفا
اے کاش ذکرِ دوزخ و جنت کئے بغیر

اب دیکھ اُس کا حال، کہ آتا نہ تھا قرار
خود تیرے دل کو جس پہ عنایت کئے بغیر

اے ہمنشیں محال ہے ناصح کا ٹالنا
یہ، اور یہاں سے جائیں نصیحت کئے بغیر!!

تم کتنے تند خو ہو کہ پہلو سے آج تک
اک بار بھی اُٹھے نہ قیامت کئے بغیر

اپنی ان انکھڑیوں کی تجھ کو قسم
ہاں اِدھر بھی کبھی نگاہِ کرم،

آنے والی ہے کیا بلا سر پر
آج پھر دل میں درد ہے کم کم

لذتِ مرگ، اے معاذ اللہ
وائے بر خضر و عیسیٰ مریم

کس حد کا دلنشیں ہے محبت کا بھی سبق
اک بار جس کو یاد ہوا بھولتا نہیں

اس نامرادِ عشق کی تلخی کو کیا کروں
ہرچند جس سے کام ہے وہ بیوفا نہیں

واقف ہے جوشؔ، عشق سے اپنے تمام شہر
اور ہم یہ جانتے ہیں کوئی جانتا نہیں

یہ بات، یہ تبسم، یہ ناز، یہ نگاہیں
آخر تمھیں بتاؤ کیونکر نہ تم کو چاہیں

اب سر اُٹھا کے میں نے شکووں سے ہاتھ اُٹھایا
مر جاؤں گا ستمگر، نیچی نہ کر نگاہیں

پہلو گل ہی سے نہیں ہے روح تو کو رغبت — گردن میں خار کی بھی ڈالے ہوئے ہے بانہیں،
اللہ ری دلفریبی جلووں کے بانکپن کی — محفل میں وہ جو آئے کج ہو گئیں کلاہیں،
یہ بزم، جوشؔ، کس کے جلووں کی رہگزر ہے — ہر ذرّہ میں ہیں غلطاں اٹھتی ہوئی نگاہیں

جاں بلب ہوں فراق کے مارے — چار دن کی ہے زندگی پیارے!
اے مرے وعدہ بھولنے والے — ڈوبنے کے قریب ہیں تارے
جوشؔ سے کل جو نام اک پوچھا — ہو گیا زرد شرم کے مارے

دل کا رونا ہے دل کا ماتم ہے — اب تو ہر سانس نوحۂ غم ہے
میرا صدموں میں مسکرا دینا — بدتر از صد ہزار ماتم ہے
دیکھ، وہ دل نہ توڑ او ظالم — رازِ کونین کا جو محرم ہے
یاد اُن کی بہت نہیں آتی، — شاید اب دل کی زندگی کم ہے
خون دل کی ہر ایک بوند میں جوشؔ، — وسعتِ عرصۂ دو عالم ہے

آپ سے، ہم سے، رنج ہی کیسا، — مسکرا دیجئے، صفائی ہے
آئی عاشق میں شانِ محبوبی — یعنی اب عشق انتہائی ہے
حد ہے، اپنی طرف نہیں میں بھی — اور اُن کی طرف خدائی ہے

خلافِ مصلحت میں بھی سمجھتا ہوں، مگر ناصح! — وہ آتے ہیں تو چہرے پر تغیر آ ہی جاتا ہے
شگوفوں پر بھی آتی ہیں بلائیں، یوں تو کہنے کو — مگر جو پھول بن جاتا ہے وہ کمھلا ہی جاتا ہے
سمجھتی ہیں مآلِ گل، مگر کیا زورِ فطرت ہے — سحر ہوتے ہی کلیوں کو تبسم آ ہی جاتا ہے

وہ جوشِ خیرگی ہے، تماشا کہیں جسے — بے پردہ یوں ہوئے ہو کہ پردا کہیں جسے
زلفِ حیاتِ نوعِ بشر میں ہے آج تک — وہ خم، گناہِ آدم و حوا کہیں جسے،
کتنی حقیقتوں سے فزوں تر ہے وہ فریب — دل کی زباں میں وعدۂ فردا کہیں جسے
میرے نشاطِ خاطرِ امروز میں نہیں — وہ بزدلی کہ خطرۂ فردا کہیں جسے
خنجر ہے جوشؔ ہات میں، دامن لہو سے تر — یہ اُس کے طور ہیں کہ مسیحا کہیں جسے

عشاق بندگانِ خدا ہیں، خدا نہیں، — تھوڑا سا نرخِ حسن کو ارزاں تو کیجئے،

ہزار بار ہوئی گو مآلِ دل سے دوچار — کلی سے خو نہ گئی پھر بھی مسکرانے کی
چراغ دیر و حرم کب کے بجھ گئے اے جوشؔ — ہنوز شمع ہے روشن شراب خانے کی

حسرت موہانی (وفات ۱۳ر مئی ۱۹۵۱ء)

حسرت موہانی

نام سید فضل الحسن، حسرت تخلص۔ وطن موہان ضلع اُناؤ۔ ولادت ۱۸۸۰ء۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اس کے بعد فتح پور گورنمنٹ اسکول سے انٹرنس پاس کیا اور پھر علیگڑھ کالج سے گریجویٹ ہوئے۔ آپ کو بہت ابتدا سے غزل کہنے کا شوق ہے اور اسی ادبی ذوق کی بنا پر آپ نے علیگڑھ سے اُردوئے معلی کا پرچہ جاری کیا، لیکن ساتھ ہی ساتھ آپ کو سیاسیات سے بھی دلچسپی ہو گئی اور کئی بار اسی کی وجہ سے جیل جانا پڑا۔

حسرت نے تسلیم لکھنوی سے مشورہ کیا ہے اور خاندان مومن کے اب تنہا یادگار یہی ہیں۔ کچھ عرصہ سے آپ کا مستقل قیام کانپور میں ہے، آپ کے متعدد دیوان شایع ہو چکے ہیں اور اساتذۂ قدیم و جدید کے کلام کا انتخاب بھی متعدد جلدوں میں آپ نے شایع کیا ہے۔

کہاں سے حوصلہ آرزو سپاس کا — جبکہ صفات یار میں دخل نہ ہو قیاس کا

ن بے پروا کو خود بیں و خود آرا کر دیا — کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کر دیا

وتے میں چمکتا ہے طرحداری کا — طرفہ عالم ہے ترے حسن کی بیداری کا

بسم نہ کرے شان توجہ پیدا — دیکھ بدنام نہ ہو نام ستمگاری کا

کیا قید میں ماہ رمضاں بھی حسرت — گرچہ سامان سحر کا تھا نہ افطاری کا

وہ ملا شوق سے اور تو نے نہ جانا — حسرت کو ابھی یاد ہے تیرا وہ زمانا

نے کس دن ترے کوچے میں گزارا نہ کیا — تو نے اے شوخ مگر کام ہمارا نہ کیا

ہی بار ہوئیں وجہ گرفتاری دل — التفات ان کی نگاہوں نے دوبارا نہ کیا

سل یار کی رہ جائے گی آدھی رونق — ناز کو اس نے اگر انجمن آرا نہ کیا

تھم سے مجھے پیالہ سے بہلا دیا — ساقی نے التفات کا دریا بہا دیا

ہ سر ناز وہ از راہ کرم پہونچا تھا — شب عجب لطف کا سامان بہم پہونچا تھا

یاد کر وہ دن کہ تیرا کوئی سودائی نہ تھا — باوجودِ حسن تو آگاہِ رعنائی نہ تھا
کیا ہوئے وہ دن کہ محوِ آرزو تھے حسن و عشق — ربط تھا دونوں میں گو ربطِ شناسائی نہ تھا
تو نے حسرت کی عیاں تہذیبِ رسمِ عاشقی — اس سے پہلے اعتبارِ شانِ رسوائی نہ تھا

ادا نہ ہم سے ہوا حق تری غلامی کا — نصیبِ شوق رہا داغ ناتمامی کا
بچھی ہیں راہِ تمنا میں سیکڑوں آنکھیں — کہ تا نہ جلوہ کرے تیری خوش‌خرامی کا
بقدرِ شوق کہاں تابِ التماس ہمیں — لکھیں جواب جو اُس نامۂ گرامی کا

اک برقِ تپاں ہے کہ تکلم ہے تمھارا — اک سحر ہے لرزاں کہ تبسم ہے تمھارا

پیروِ عشق رہ نما نہ ہوا — زاہدِ خشک باخدا نہ ہوا
ایسے بگڑے کہ پھر جفا بھی نہ کی — دشمنی کا بھی حق ادا نہ ہوا
کٹ گئی احتیاطِ عشق میں عمر — ہم سے اظہارِ مدعا نہ ہوا
تیرے اس التفات کا ہوں غلام — جو ہوا بھی تو برملا نہ ہوا
لطفِ ساقی تھا بیدریغ۔ مگر — مجھ بلا نوش کا بھلا نہ ہوا
ہو کے بیخود کلامِ حسرت سے — "آج غالب غزل سرا نہ ہوا"

شوقِ پوشیدہ کا اظہار نہ ہونے پایا — داغِ دل کوئی نمودار نہ ہونے
دل کچھ اس ڈھب سے لئے اُن نے کہ برسوں کوئی — حال سے اپنے خبردار نہ ہونے
اس سلیقے سے کیا ذبح کہ دامن اُن کا — خونِ عشاق سے گلنار نہ ہونے

بام پر آنے لگے وہ سامنا ہونے لگا — اب تو اظہارِ محبت برملا ہونے لگا

دیکھنا بھی تو انھیں دور سے دیکھا کرنا — شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا

گماں نہ کیوں ہو زاہد کو ہرزہ کاری کا — کہ ذکرِ یار میں ہے شغل بیقراری کا

بہار آئی سب شادماں ہیں، مگر ہم — یہ دن کیسے کاٹیں گے بے جام و مینا

مٹے عیب سب عشقبازی میں حسرت — نہ بغض و حسد ہے نہ غصہ نہ کینا

کچھ بھی حاصل نہ ہوا زہد سے نخوت کے سوا — شغل بیکار ہیں سب ان کی محبت کے سوا
سب سے منہ موڑ کے راضی ہیں تری یاد سے ہم — اس میں اک شانِ فراغت بھی ہے راحت کے سوا
عقل حیران ہے اے جانِ جہاں راز ترا — کون سمجھے دلِ دیوانۂ حسرت کے سوا

شوقِ وصالِ یار کے قابل بنا دیا — دل کیا تھا عاشقی نے اسے دل بنا دیا

آئی جوان کی یاد مرا دل ٹھہر گیا
دعوئے غمِ فراق کا باطل ٹھہر گیا

عہدِ یک عمرِ فراغت سے بھی خوشتر گزرا
وہ جو یک لحظہ تری یاد میں ہم پر گزرا

کوچہ اس فتنۂ دوراں کا دکھا کر چھوڑا
دل نے آخر ہمیں دیوانہ بنا کر چھوڑا

کچھ خوف خدا کا ہے نہ ڈر خلقِ خدا کا
کیا آئے خیال اُن کو شہیدانِ وفا کا

نکلا نہ کرو خود پئے تعزیر کہ پکا
پڑ جائے گا عصیانِ محبت کو سزا کا

ہیں اُن کے رضا کار بری لوثِ طلب سے
کوئی بھی جو ہو اُن میں گنہگار دعا کا

اک خلش ہوتی ہے محسوس رگِ جاں کے قریب
آن پہونچے ہیں مگر منزلِ جاناں کے قریب

کرم ساقیِ میخانہ مبارک باشد
گرمیِ مجلسِ رندانہ مبارک باشد

دلفروشانِ تماشا کو بصد عیش و نشاط
دولتِ جلوۂ جانانہ مُبارک باشد

جانِ حسرت کے لئے پایۂ نازش ہے یہی
اضطرابِ دلِ دیوانہ مبارک باشد

وہ قامتِ بلند نہیں در قبا سے ناز
اک سرو ناز ہے جو بنا ہو برائے

کچھ یونہیں اپنے حُسن پہ مغرور تھا وہ شوخ
کچھ سے اُڑی ہے اور بھی اُسکو ہوائے

شوق لقائے یار میں مرتے تو ہو مگر
حسرت جو نقد جاں بھی نہ ٹھہرے بہا

ہر درد ہر مرض کی دوا ہے تمھارے پاس،
آتے ہیں سب یہیں کہ شفا ہے تمھارے

بیمارِ غم ہیں دور سے آئے ہیں سُن کے نام
کہتے ہیں دردِ دل کی دوا ہے تمھارے

حسرت کرو نہ دل میں زیارت حضور کی،
آئینۂ رسولنما ہے ہمارے

پیمانِ وفا نہ کر فراموش،
اے حسرتِ بیقرار خاموش

پوشیدہ سکونِ یاس میں ہے
اِک محشرِ اضطرابِ خاموش

آزاد ہیں قید میں بھی حسرت
ہم دلشدگانِ خود فراموش

قوی دل، شاداں دل، پارسا دل
ترے عاشق نے بھی پایا ہے کیا دل

جفا کار رہی ہے تسلیم ستم بھی،
نہ ہوگا تابعِ جور و جفا دل

بڑی درگاہ کا سائل ہوں حسرت
بڑی امید ہے میری، بڑا دل۔

روشن جمالِ یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہوا ہے آتشِ گل سے چمن

تصور میں وہ شوخ ہوتا ہم سے باہم
عجب لذت بیخودی تھی فسہ

اس تغافل پہ بھی کرتے ہیں تجھی کو یاد ہم
کتنے ہیں مجبور دیکھ او بانیِ بیدا

اپنا سا شوق اور دل میں لائیں کہاں سے ہم　　گھبرا گئے ہیں بیدلی ہمرہاں سے ہم
اے زہدِ خشک تیری ہدایت کے واسطے　　سوغاتِ عشق لائے ہیں کوئے بتاں سے ہم
بیتابیوں سے چھپ نہ سکا حالِ آرزو　　آخر بچے نہ اُس نگہِ بدگماں سے ہم
ہے انتہائے یاس بھی اک ابتدائے شوق　　پھر آگئے وہیں پہ، چلے تھے جہاں سے ہم

سیہ کار تھے باصفا ہوگئے ہم　　ترے عشق میں کیا سے کیا ہوگئے ہم
جب اُن سے ادب نے نہ کچھ منہ سے مانگا　　تو اک پیکرِ التجا ہو گئے ہم
فنا ہو کے راہِ محبت میں حسرت　　سزاوارِ خلدِ بقا ہوگئے ہم

خوبرویوں سے یاریاں نہ گئیں　　دل کی بے اختیاریاں نہ گئیں
حسن جب تک رہا نظارہ فروش　　صبر کی شرمساریاں نہ گئیں
تھے جو ہم رنگِ ناز اُن کے ستم　　دل کی امیدواریاں نہ گئیں

جلوۂ یار نہ چھپ جائے سرِ بام کہیں　　جلد اے حوصلۂ دید مجھے تھام کہیں
رنجِ بیسود سے حاصل ہو کہیں کاش نجات　　مار ہی ڈالے ہمیں وہ بتِ خودکام کہیں
کچھ کچھ اس راز کی ہمکو بھی خبر ہے حسرت　　آپ جاتے ہیں جو روزانہ سرِ شام کہیں

ان سے ملکر شکوۂ بے اعتنائی پھر کہاں　　شاد رہ اے دل کہ یہ لطفِ جدائی پھر کہاں
سب ہماری زندگی ہی تک ہیں انکے حوصلے　　ورنہ یہ نازِ غرورِ دلربائی پھر کہاں
لوٹ لے جی بھر کے حسرت لذتِ آزارِ عشق　　اُس ستمگر کا یہ رنگِ آشنائی پھر کہاں

اک طرفہ ماجرا ہے درِ کوئے میفروشاں　　سرگرمِ بادہ نوشی انبوہِ خرقہ پوشاں

اثرِ عشق سے نکلیں جو تمہارے آنسو　　دامنِ جاں میں وہ لے لیجئے سارے آنسو

وہ اب یہ کہتے ہیں دیکھا کرے نہ تو مجھ کو　　سمجھ لیا ہے جو مجبورِ آرزو مجھکو

حسنِ بے مہر کو پروائے تمنا کیا ہو　　جب ہو ایسا تو علاجِ دلِ شیدا کیا ہو
دیکھیں ہم بھی جو ترے حسنِ دلآرا کی بہار　　اس میں نقصان ترا اے گلِ رعنا کیا ہو
راتدن رہنے لگی اُس ستم ایجاد کی یاد　　حسرت اب دیکھئے انجام ہمارا کیا ہو

نامرادوں کو شادکام کرو　　کرم اپنا کبھی تو عام کرو
سب کی خاطر کا ہے خیال تمہیں　　کچھ ہمارا بھی انتظام کرو
پوچھتے ہیں وہ جاں نثاروں کو　　تم بھی حسرت اُٹھو سلام کرو

اپنے آپے میں نہیں شوق کے مارے گیسو — پھیلے جاتے ہیں رخِ یار پہ سارے گیسو
مائلِ شوق سے مجھے پا کے وہ بولے ہنس کر — دیکھو تم نے جو چھوئے آج ہمارے گیسو
فاتحہ پڑھنے چلے مرقدِ حسرت پہ جو وہ — پہلے کس ناز سے رو رو کے سنوارے گیسو

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے — وہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے
دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد — ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے
خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد — جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے
امیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ — تری نگاہ کو اللہ دلنواز کرے
ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرت — اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

نہ ہو اس کی خطا پوشی پہ کیوں نازِ گنہ گاری — نشانِ شانِ رحمت بن گیا داغِ سیہ کاری

میں ہوں مجبور دل ہے سودائی — رخصت اے صبر اے شکیبائی

نہ کر اتنا ستم ہم دردمندوں پر کہ دنیا سے — مبادا ایک قلم اٹھ جائے آئینِ وفاداری
نہ دیکھے اور دلِ عشاق پر پھر بھی نظر رکھے — قیامت ہے نگاہِ یار کا حسنِ خبرداری
نہیں کھلتی مری نسبت تری اے حیلہ جو مرضی — کہ ہے اقرارِ دلجوئی نہ انکارِ ستمگاری
نسیمِ دہلوی کو وجد ہے فردوس میں حسرت — جزاک اللہ تیری شاعری ہے یا فسونکاری
برق کو ابر کے دامن میں چھپا دیکھا ہے — ہم نے اس شوخ کو مجبورِ حیا دیکھا ہے

دلِ مایوس کو سرچشمۂ صدق و صفا کر دے — گدازِ غم اگر چاہے تو مجھکو با خدا کر دے
تقاضا کر رہا ہے اب یہ حسنِ تازہ کار ان کا — کہ جس نے دل دیا تھا جان بھی ہم پر فدا کر دے
گراں گزرے گا حرفِ آرزو اس طبعِ نازک پر — نگاہِ شوق اس مفہومِ رنگیں کو ادا کر دے

تاثیر برقِ حسن جو ان کے سخن میں تھی — اک لرزشِ خفی مرے سارے بدن میں تھی
واں سے نکل کے پھر نہ فراغت ہوئی نصیب — آسودگی کی جان تری انجمن میں تھی
اک رنگِ التفات بھی اس بے رخی میں تھا — اک سادگی بھی اس نگہِ سحر فن میں تھی
محتاجِ بوئے عطر تھا جسمِ خوبِ یار — خوشبوئے دلبری تھی جو اس پیرہن میں تھی
کچھ دل ہی بجھ گیا ہے مرا ورنہ آج کل — کیفیتِ بہار کی شدت چمن میں تھی
معلوم ہو گئی مرے دل کو ز راہِ شوق — وہ بات پیار کی جو ہنوز اس دہن میں تھی
غربت کی صبح میں بھی نہیں ہے وہ روشنی — جو روشنی کہ شامِ سوادِ وطن میں تھی

بہت خجل ہے ترے درد سے دوا میری ۔ یہ خوف ہے کہ نہ سن لے کہیں خدا میری
چھپے وہ مجھ سے تو کیا یہ بھی اک ادا نہ ہوئی ۔ وہ چاہتے تھے نہ دیکھے کوئی ادا میری
کبھی چرا کے جو روزن سے بھی تجھے دیکھوں ۔ تو چور کی جو سزا ہو وہی سزا میری

پردے سے اک جھلک جو وہ دکھلا کے رہ گئے ۔ مشتاق دید اور بھی للچا کے رہ گئے
آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن ۔ آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے
ٹوکا جو بزمِ غیر سے آتے ہوئے انھیں ۔ کہتے نہ کچھ بنا وہ قسم کھا کے رہ گئے
دعوائے عاشقی ہے تو حسرت کرو نباہ ۔ یہ کیا کہ ابتدا ہی میں گھبرا کے رہ گئے

مستی کے پھر آ گئے زمانے ۔ آباد ہوئے شراب خانے
ہر پھول چمن میں زر بکف ہے ۔ بانٹے ہیں بہار نے خزانے
کر دوں گا میں ہر دلی کو میخوار ۔ توفیق جو دی مجھے خدا نے
ہم نے تو نثار کر دیا دل ۔ اب جانے وہ شوخ یا نہ جانے
اب کاہیکو آئیں گے وہ حسرت ۔ آغاز جنوں کے پھر زمانے

اس محوِ تغافل کی جفا میرے لئے ہے ۔ صد شکر کہ اتنا تو روا میرے لئے ہے
دعوت میں تری میں بھی ہوں معلوم ہے لیکن ۔ کیا غیر کی خاطر سے ہے کیا میرے لئے ہے

زمانِ فصلِ گل آیا نسیم مشکبار آئی ۔ دلوں کو مژدہ ہو پھر جوشِ مستی کی بہار آئی
پھلا پھولا رہے گلزار یارب حسنِ خوباں کا ۔ مجھے اس باغ کے ہر پھول سے خوشبوئے یار آئی
تری محفل سے ہم آئے مگر با حالِ زار آئے ۔ تماشا کامیاب آیا تمنا بیقرار آئی
الٰہی رنگ یہ کب تک رہیگا ہجرِ جاناں میں ۔ کہ روز بیدلی گزرا تو شامِ انتظار آئی
بجا ہیں کوششیں ترکِ محبت کی مگر حسرت ۔ جو پھر بھی دلنوازی پر وہ چشمِ سحر کار آئی

چھپ کے اس نے جو خود نمائی کی ۔ انتہا تھی یہ دلربائی کی
دام سے ان کے چھوٹتا تو کہاں ۔ یاں ہوس بھی نہیں رہائی کی
ہو کے نادم وہ بیٹھے ہیں خاموش ۔ صلح میں شان ہے لڑائی کی

ترے درد کو جس سے نسبت نہیں ہے ۔ وہ راحت مصیبت ہے راحت نہیں ہے
ترے غم کی دنیا میں اے جانِ عالم ۔ کوئی روح محرومِ راحت نہیں ہے
مجھے گرمِ نظارہ دیکھا تو ہنسکر ۔ وہ بولے کہ اس کی اجازت نہیں ہے

حفیظ جالندھری (وفات ۲۰ر دسمبر ۱۹۸۲ء)

تو ہی بھردسا تو ہی سہارا

پروردگارا پروردگارا

منصور منصور اے اہلِ دنیا

اللہ میرا باقی تمہارا

گو میں نے جیتی الفت کی بازی

اک بار کھیلا سو بار ہارا

یہ ناخدا ہے اے اہلِ کشتی

شاید کسی وقت کر دے کنارا

عفو و خطا میں ضد ہو گئی تھی

وہ بھی نہ ہارے میں بھی نہ ہارا

حفیظ جالندھری

حفیظ جالندھری

میرا خاندان تقریباً ۲۰۰ (دوسو) برس پیشتر چوہان راجپوت کہلاتا تھا، میرے بزرگ ہندو سے مسلمان ہو گئے اور بادشاہ میں اپنی املاک وغیرہ کھو بیٹھے۔ البتہ سورج بنسی ہونے کا غرور مسلمان ہونے کے باوجود ساتھ رہا میری ذات تک پہونچا اور ختم ہو گیا۔

میں ننھا سا تھا۔ جب مجھے محلے کی قدیم مسجد میں داخل کیا گیا، میں یقیناً اُس زمانے میں ذہین لڑکوں میں شمار ہوتا تھا۔ کیونکہ میں نے چھ برس ہی میں ناظرہ قرآن شریف پڑھ لیا، بہت سے سورے زبانی یاد کر لئے۔ اور کریما و مقیماں رٹ لیں

اس سے آگے میں مسجد میں نہ چل سکا، جس کے وجوہ کثیر ہیں۔ اخلاقی بھی مادی بھی۔ اب مجھے مشن اسکول میں داخل کیا گیا۔ وہاں سے میں دوسرے درجے سے بھاگ نکلا۔ سرکاری مدرسے میں داخل ہوا۔ چوتھی جماعت میں وہاں سے بھاگا، آریہ اسکول میں داخل ہوا۔ پھر مشن ہائی اسکول میں لے جایا گیا۔ لیکن حساب سے میری جان جاتی تھی ہر روز حساب کے وقت بھاگ جاتا تھا۔ دوسرے دن پٹتا تھا۔ یہ بھاگنے اور پٹنے کی جنگ چار سال تک جاری رہی آخر پٹنے پر بھاگنا غالب آیا اور میں ہمیشہ کے لئے بھاگ نکلا

شعر گوئی یوں تو میری عمر کے ساتویں برس ہی شروع ہو گئی تھی۔ لیکن اس مرض کا باقاعدہ حملہ گیارہ سال کی عمر میں ہوا۔ جب میں چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا اور اس بیماری کا سبب عشق کی گرمی تھی۔ لڑکپن کا یہ عشق بھی عجیب چیز تھا۔ اے کاش، اس کو میں بیان کر سکتا

اس زمانے میں ناول افسانے، ڈرامے، شعراء کے دواوین، تھیٹر، مشاعرے، سب سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ میرے گھرانے پر فرشتۂ موت سایہ ڈال رہا تھا پانچ بھائی یکے بعد دیگرے نذرِ اجل ہو گئے۔ ایک طرف تو یہ آفت تھی۔ دوسری طرف میں گھر کے لئے ایک مصیبت بن گیا تھا۔ کیونکہ گھر سے بھاگتے وقت جو کچھ ہاتھ لگتا اُڑا لے جاتا

لوگ کہتے ہیں، کہ فنِ شاعری نحوس ہے، اس قول میں صداقت ضرور ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ شعر گوئی

آوارگی ساتھ لاتی ہے۔ تو نحوست کا سبب بھی سمجھ میں آجاتا ہے۔ کم از کم میرے ساتھ تو یہی گزری۔ آوارگی اور شعرگوئی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے تھے۔

آنکھ اُسوقت کھلی، جب والدین نے میری شادی کردی۔ اسوقت مجھے معلوم ہوا کہ میرے گھرانے کی دولت پیدا کرنے والے افراد اجل کے ہاتھوں اور جمع جتھا میرے ہاتھوں غائب ہوچکی تھی اور یہ سب کچھ چند ہی برس میں ہوگیا تھا۔

اب مجھے ذمہ داریوں کا احساس ہوگیا۔ میرے والد بوڑھے، والدہ علیل، ایک سوتیلا بھائی جس کا خاندان بہت وسیع، آمدنی بہت قلیل، باقی بیوہ بہنیں، بیوہ بھاوجیں۔ یتیم بچے بچیاں۔ یہ سب کچھ تھا۔ لیکن مجھے کام کاج کوئی نہ آتا تھا۔ صرف فارسی کی چند کتابیں، "اُردو شعراء کے چند دواوین" میرا مبلغ علم اور مبتدیانہ غزل گوئی میرا مبلغِ فن تھا۔ پنجاب میں اُردو شاعری کا رواج تازہ تازہ ہوا تھا اور عوام کو اس سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ البتہ میرے وطن جالندھر کو فارسی زبان کے مسلم الثبوت اُستاد مولانا گرامی کا جنم بھوم ہونے کی وجہ سے یہ شرف حاصل تھا، کہ وہاں باقاعدہ مشاعرے ہوتے تھے اور ان مشاعروں میں شہر اور مضافات کی بستیوں کے شعراء حصہ لیتے تھے۔ اُن میں ایک دو اچھا خاصہ کہتے تھے۔ لیکن ایک بہت بڑی تعداد تشاعروں کی تھی۔ حضرت مولانا گرامی اگرچہ دربارِ دکن سے منسلک اور حیدرآباد ہی میں رہتے تھے، لیکن وہ جالندھر کے مشاعروں کے لئے فارسی غزل بھجوا دیا کرتے اور جب کبھی وطن میں تشریف لاتے، تو ایک بڑا مشاعرہ ہوتا۔ جس میں وہ اپنا فارسی کلام سناتے تھے۔ ان دنوں جالندھر میں فارسی جاننے والے بہت سے بزرگ موجود تھے۔

میں نے سات آٹھ سال کی عمر میں گرامی کو ایک مشاعرے میں شعر پڑھتے سنا تھا۔ اس وقت تو مجھے یہ مجلس مضحکہ خیز سی نظر آئی۔ واہ وا، سبحان اللہ، مکرر ارشاد ہو، واللہ اعجاز ہے، واللہ سحر ہے، واللہ جادو ہے یا داد دینے والوں کا اُچھلنا۔ ہاتھوں کا ہلنا۔ سب کا مل کر شور مچانا، عجیب مسخرہ پن معلوم ہوتا تھا۔ کیا خبر تھی کہ آخر یہی مسخرہ پن مجھے بھی کرنا پڑے گا اور عمر کا ایک حصہ اسی تماشاگاہ میں گزرے گا۔

جب میں نے باقاعدہ غزل گوئی شروع کی، تو حسب دستور قدیمی اُستاد کی ضرورت لاحق ہوئی۔ قریبی بستی میں سرفراز خاں صاحب سرفراز مدرس تھے۔ جیسا اُسوقت کہتے تھے۔ ویسا ہی آج بڑھاپے میں بھی کہتے ہیں۔ اور میرا خیال ہے، کہ اگر ان کا کہا ہوا سب شایع ہوجائے، تو اُس کا حجم بیس تیس ہزار صفحات سے کم نہ ہوگا۔ خیر میں نے اُن کو آغاز کی دو تین غزلیں دکھائیں۔ اُنھوں نے کوئی خاص اصلاح نہ دی۔ لیکن میں اب تک اُنکا شکرگزار ہوں مجھے کسی نے مشورہ دیا کہ اپنا کلام حضرت گرامی کی خدمت میں دکن ارسال کروں اور اصلاح چاہوں۔ میں نے ایسا ہی کیا اور چند غزلیں ان کی خدمت میں ارسال کیں، جواب ملا "گرامی فارسی کا شاعر ہے اُردو سے بہت دور

حفیظؔ جوہر قابل معلوم ہوتا ہے، حفیظؔ کو چاہئے کہ اپنا کلام بار بار خود ہی ناقدانہ نظر سے دیکھا کرے۔" وغیرہ وغیرہ میں نے اس مشورہ پر عمل شروع کر دیا۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ میری غور و فکر کی عادت اسی مشورہ کی بدولت ہے۔ پھر جب حضرت گرامیؔ وظیفہ لیکر ہمیشہ کے لئے وطن میں مقیم ہوگئے۔ تو شاعری کے اس آفتاب لب بام کے سامنے میں نے باقاعدہ زانوئے تلمذ تہ کیا۔ اب فارسی کے مطالعہ کا شوق تو بڑھ گیا، لیکن اپنے لئے میں نے اُردو ہی میں شعر کہنے کو بہتر سمجھا۔ اور گرامی صاحب کا مشورہ بھی یہی تھا۔

متاہل ہو جانے کے بعد میں نے کسب معاش کے لئے تھوڑے ہی عرصہ میں بیسیوں پاپڑ بیل ڈالے۔ ریلوے لائن پر میٹی۔ عطر فروشی۔ کلاہ سازی۔ خیاطی۔ فوج کی ٹھیکیداری۔ خطوط نویسی۔ ریلوے اسٹیشنوں پر مزدوری۔ آٹے کی مشین۔ متشاعروں کو غزلیں لکھ لکھ کر دینا۔ سنگر سیونگ مشین کمپنی کی منیجری، سب کچھ کر ڈالا۔ لیکن پوری نہ پڑی۔ فراغت نصیب نہ ہوئی۔ اتنے بڑے کنبے کا پیٹ پالنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ مکانات کو بیچ بیچ کر کھاتا کھلاتا رہا اور سچ یہ ہے کہ نوکری ہو یا کاروبار میں کسی کام کا نہ تھا۔ رات دن فکر شعر۔ طبیعت کمزور اور حساس خلافت اور کانگرس دونوں میں شامل۔ لیکن لیڈروں سے متنفر۔ نتیجہ یہ کہ نہ اِدھر نہ اُدھر۔

۱۹۲۱ء میں سنگر کمپنی کی ملازمت چھوڑ دی۔ وطن میں آگیا اور وہاں سے اُردو زبان میں ایک ماہانہ رسالہ 'اعجاز' جاری کیا۔ جس کے سرپرست مولانا گرامی تھے۔ یہ رسالہ پانچ ماہ بعد آخری مالی جبر کا دیکر مرگیا۔ اس وقت مایوسی سے میری حالت دیوانگی تک پہونچ گئی تھی۔ کیونکہ میں نے ایک بہت بڑا مکان فروخت کر دیا تھا، والد صاحب کو اطلاع بھی نہیں کی تھی۔ اُن کو معلوم ہوا۔ تو اُنھوں نے مجھ کو چھپایا اور گھر سے نکال دیا۔ اس وقت میں ایک بچی کا باپ تھا۔

اب میں نے کشمیر کا پیدل سفر کیا۔ ارادہ تو کچھ اور تھا۔ لیکن ستم دیدہ والدہ کا خیال۔ ننھی بچی کا تصور اور زوجہ کے متعلق ذمہ داریوں کا احساس سدّ راہ تھا۔ پلٹ آیا۔ رسالہ شباب اُردو لاہور میں ملازمت کر لی۔ اس کے بعد 'نونہال' اور 'ہزار داستان' کی ادارت میرے سپرد ہوئی۔ پھر پھول اور تہذیب نسواں میں کام کیا۔ یہاں سے پھر سے ریاست خیرپور سندھ کا شاعر دربار مقرر ہوا۔ لیکن یہ زندگی میرے مزاج کے خلاف تھی۔ پلٹ آیا۔ نظم رقاصہ اسی دوران میں لکھی گئی۔

اب مجھے ادبی اور صحافتی زندگی کا تجربہ ہو چکا تھا اور یہ معلوم ہو گیا تھا۔ کہ پانی کس رخ بہتا ہے۔ اِس میدان میں جو کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ آپ بیتی اور جگ بیتی، دونوں اس قدر تلخ ہیں کہ اگر بیان کر دوں تو ایک آفت برپا ہو جائے۔

۱۹۲۲ء میں لاہور آیا تھا۔ اس وقت سے اب تک برابر ادب و شعر میرا اوڑھنا بچھونا ہے۔ مشاعرے کی واہ وا۔ اسلامی انجمنوں کی سبحان اللہ، داد کی وصولی اور چندوں کی فراہمی یہ میرے مشاغل رہے ہیں۔ بڑے بڑے مشاعرے دیکھ ڈالے ہیں۔ دھڑا دھڑ داد وصول کی ہے۔ ہزار ہا انسانوں کو ہمہ تن گوش اور "ہمہ جان" پر جوش کر دیا ہے۔

لاکھوں روپے چندہ دوسروں کی جیبوں سے نکلوا کر انجمنوں کے خزانے میں داخل کرا دیا ہے۔ بڑی بڑی ریاستوں کے
رؤسا سے شرف ملازمت حاصل کیا ہے بڑے بڑے لیڈروں۔ نامی گرامی ادیبوں اور شاعروں سے ملاقات رہی ہے۔
درباروں میں حاضری کی عزت اور درگاہوں میں زمین بوسی کی سعادت مل چکی ہے۔

بزعم خود اُردو نظم میں نئی نئی اختراعیں کی ہیں۔ گیت لکھے ہیں۔ مناظر قدرت کی مصوری کی ہے۔ بحور و اوزان میں تصرفات
کئے ہیں۔ بچوں کے لئے شاعری کی ہے۔

میں پنجابی ہوں، لیکن اُردو زبان سے مجھے ایک خاص لگاؤ ہے۔ غلط کہتا ہوں یا صحیح، اُردو ہی کہنا پسند کرتا ہوں۔
ابھی زندہ ہوں اور معلوم نہیں کب تک زندہ رہوں۔

حفیظ جالندھری

ذوقِ نگاہ کے سوا۔ شوقِ گناہ کے سوا | مجھکو بتوں سے کیا ملا۔ مجھکو خدا نے کیا دیا
حسنِ نظر کی آبرو صنعتِ برہمن سے ہے | جس کو صنم سمجھ لیا۔ اُس کو خدا بنا دیا

وفا جس سے کی بیوفا ہو گیا، | جسے بُت بنایا خدا ہو گیا
ہوا سے اُلجھتا رہا ناخدا، | سفینہ سپردِ خدا ہو گیا

کرتا ہے تصوّر تیرا اِس رنگ کی باتیں، | سُن لے کوئی اک حرف تو افسانہ بنا دے۔
آخر کوئی صورت تو بنے خانۂ دل کی، | کعبہ نہیں بنتا ہے تو بتخانہ بنا دے۔
دیوانگیِ عشق کے بعد آہی گیا ہوش، | اور ہوش بھی وہ ہوش کہ دیوانہ بنا دے۔

اب اشتیاقِ عرضِ تمنا نہیں رہا | اب ہر کوئی ہے عرضِ تمنا لئے ہوئے
میری یہ زندگی ہے کہ مرنا پڑا مجھے | اک اور زندگی کی تمنا لئے ہوئے

چاہوں تو اب بھی جانبِ منزل پلٹ چلوں | گمراہ اس لئے ہوں کہ رہبر خفا نہ ہو

حُسن بھی اب تو ٹھہرتا نہیں معیارِ نظر | آدمی شانِ خدا ہے تو خدا کیا ہو گا
ہر قدم جس کو نئی چال نہ چلنی آئے | وہ تو رہزن بھی نہیں، راہنما کیا ہو گا

اوننگِ شوق سجدہ گوارا ہوا تجھے | سر کاٹ کر نہ پھینک دیا سجدہ گاہیں

اب وہ نوید ہی نہیں صوتِ ہزار کیا کرے | نخلِ امید ہی نہیں ابرِ بہار کیا کرے
دن ہو تو مہر جلوہ گر، شب ہو تو انجم و قمر | پردے ہی جب ہوں پردہ در۔ روئے نگار کیا کرے
عشق نہ ہو تو دل لگی۔ موت نہ ہو تو خودکشی | یہ نہ کرے تو آدمی آخرِ کار کیا کرے
موت نے کس امید پر سونپ دئے ہیں بحر و بر | مُشتِ غبار ہے بشر، مُشتِ غبار کیا کرے

گریۂ شرم واہ واہ ۔ فردِ عمل ہوئی تباہ — دیکھئے اک یہی گناہ روزِ شمار کیا کرے
اپنے لئے یہ بار بار کون ہو روز شرمسار — بل گیا عذر پائدار قول و قرار کیا کرے

عفو و خطا میں ضد ہو گئی تھی — وہ بھی نہ ہارے، میں بھی نہ ہارا!
پھر یہ جہنم کس کے لئے ہے — آمرزگارا! آمرزگارا!
یوں میں نے جیتی اُلفت کی بازی — اک بار کھیلا، سو بار ہارا

او دل توڑکے جانے والے، دل کی بات بتاتا جا — اب مَیں دل کو کیا سمجھاؤں مجھکو بھی سمجھاتا جا
میری چپ رہنے کی عادت جس کارن بدنام ہوئی — اب وہ حکایت عام ہوئی ہے سنتا جا، شرماتا جا
یہ دُکھ درد کی برکھا بندے دین ہے تیرے داتا کی — شکرِ نعمت بھی کرتا جا۔ دامن بھی پھیلاتا جا
دونوں سنگِ راہ طلب ہیں راہنما بھی منزل بھی — ذوقِ طلب ہر ایک قدم پر دونوں کو ٹھکراتا جا
نغمے سے جب پھول کھلیں گے، چننے والے چن لیں گے — سننے والے سن لیں گے، تو اپنی دھن میں گاتا جا

ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات - یاد نہ تم کو آسکے — تم نے ہمیں بھلا دیا - ہم نہ تمھیں بھلا سکے
ہوش میں آچکے تھے ہم، جوش میں آچکے تھے ہم — بزم کا رنگ دیکھ کر سر نہ مگر اُٹھا سکے
رونقِ بزم بن گئے، لب پہ حکایتیں رہیں — دل میں شکایتیں رہیں، لب نہ مگر ہلا سکے
عجز سے اور بڑھ گئی برہمیِ مزاجِ دوست — اب وہ کرے علاجِ دوست جسکی سمجھ میں آسکے
اہلِ زباں تو ہیں بہت - کوئی نہیں ہے اہلِ دل — کون تری طرح حفیظ درد کے گیت گا سکے

برہمن نالۂ ناقوس مسجد تک تو پہونچا دے — بُرا کیا ہے موذّن بھی اگر بیدار ہو جائے
ذکرِ ذکرِ نشیمن فکرِ آزادی میں اے ہمدم — مبادا اپنے ہاتھوں ہی قفس تیار ہو جائے

آنے والے کسی طوفان کا رونا رو کر — ناخدا نے مجھے ساحل پہ ڈبونا چاہا

فردوس کی طہور بھی آخر شراب ہے — مجھ کو نہ لے چلو میری نیت خراب ہے
او مبتلائے زیست - ٹھہر - خودکشی نہ کر — تیرا علاج زہر نہیں ہے - شراب ہے
ہے اک یہی جھلک تو مری جانِ جستجو — کیوں مان لوں کہ آب نہیں ہے شراب ہے
توبہ کئے ہوئے بھی زمانہ گزر گیا — اب تک رگوں میں خون نہیں ہے شراب ہے

کیا ناخدا بغیر کوئی ڈوبتا نہیں، — مجھکو میرے خدا سے پشیمان نہ کیجئے

اُسی کی شرم ہے میری نگاہ کا پردہ — وہ بے حجاب سہی - میں تو بے حجاب نہیں

ناکامیِ عشق - یا کامیابی — دونوں کا حاصل - خانہ خرابی

دنیا و دین سے بیگانہ ہو جا
دیوانہ ہو جا بن جا شرابی

اُن کا بہانہ برجستہ گوئی
اپنا تبسم حاضر جوابی

بہت ہی مختصر ہے داستانِ گمرہی اپنی
قدم گھر سے نکالا اور منزل آگئی اپ

پھر کدھر جائیں گے راندے ہوئے بتخانے کے
در کعبہ بھی اگر وا نہ ہوا، کیا ہو

ابھی باقی ہے میعادِ مصیبت
ابھی کچھ اور جینا چاہتا ہوں

وہ سرخوشی دے کہ زندگی کو شباب سے بہرہ یاب کر دے
مرے خیالوں میں رنگ بھر دے میرے لہو کو شراب کر

یہ خوب کیا ہے یہ زشت کیا ہے بشر کی اصلی سرشت کیا ہے
بڑا مزا ہو تمام چہرے اگر کوئی بے نقاب کر د

کہو تو رازِ حیات کہہ دوں۔ حقیقتِ کائنات کہہ دوں
وہ بات کہہ دوں۔ کہ پتھروں کے دلوں کو بھی آب آب

خلافِ تقدیر کر رہا ہوں۔ پھر ایک تقصیر کر رہا ہوں
پھر ایک تدبیر کر رہا ہوں خدا اگر کامیاب کر د

کچھ محتسب کا خوف ہے کچھ شیخ کا لحاظ
پیتا ہوں چھپ کے دامنِ ابرِ بہار م

وہ سامنے دھری ہے صراحی بھری ہوئی
دونوں جہاں ہیں آج مرے اختیار میں

جھوٹی تسلیوں سے نہ بہلاؤ۔ جاؤ جاؤ،
جاؤ کہ تم نہیں ہو مرے اختیار میں

رونے والوں نے میرا کو کیا جھک کر سلام
لائے تھے حضرت تو یہ زندگی میرے

زمانے میں چرچے ہیں دیر و حرم کے،
بڑی رونقوں پر ہیں دونوں دکانیں

بھلائی نہیں جا سکیں گی یہ باتیں،
تمہیں یاد آئیں گے ہم۔ یاد رکھنا

لے جاؤ ساتھ ہوش کو اے اہلِ ہوش جاؤ
ہے خوب اپنی بے خبری کی خبر م

اللہ اللہ کیا ہوا انجام کارِ آرزو،
توبہ توبہ کس قدر ہنگامہ آرائی ہو

ہو گیا جب عشق ہم آغوشِ طوفانِ شباب
عقل بیٹھی رہ گئی ساحل پہ شرمائی ہو

اب تک اسیرِ دامِ فریبِ حیات ہوں
مجھکو بھلا دیا میرے پروردگار نے

غالب رہی حفیظ حقیقت مجاز پر
کعبے سے مجھکو کھینچ لیا کوئے یار نے

رہبرِ راہِ محبت کس قدر ہشیار ہے
راہ کتراتا ہے شکلِ رہنما کو دیکھکر

ہاں میں تو لئے پھرتا ہوں اِک سجدۂ بیتاب
اُن سے بھی تو پوچھو وہ خدا ہیں کہ نہیں ہیں

جلوے کی طلب پیرویِ حضرتِ موسیٰ،
گمراہ مرے راہنما ہیں کہ نہیں ہیں

ناصح کو بلاؤ میرا ایمان سنبھالے
پھر دیکھ لیا اُس نے شرارت کی نظر سے

ایک ایک قدم پر ہے جہاں خندۂ تقدیر
تدبیر گزرتی ہے اُسی راہ گزر سے

اے بدنصیب حشر کے وعدے کا حشر دیکھ
وہ رفتہ رفتہ وعدے فراموش ہو گئے

بے ربطیٔ فسانہ کا اب تذکرہ ہی کیا
خاموش تم کے کر دیا خاموش ہو گئے

اس کی افتاد پہ خورشید کی رفعت قرباں
جس کو بھایا ترا نقشِ کفِ پا ہو جانا

رونقِ بزم ہے شیون سے تو شیون ہی سہی
ہمصفیرانِ چمن، پھر نہ خفا ہو جانا

مبادا پھر اسیرِ دامِ عقل و ہوش ہو جاؤں
جنوں کا اس طرح اچھا نہیں حد سے گزر جانا

آنکھ کمبخت سے اُس بزم میں آنسو نہ رکا
ایک قطرے نے ڈبویا مجھے دریا ہو کر

کچھ تعجب نہیں کعبے میں اگر جی نہ لگے
آئے ہیں ہم طرفِ دیر و کلیسا ہو کر

بے تعلق زندگی اچھی نہیں،
زندگی کیا موت بھی اچھی نہیں،

یہ ہوا - یہ ابر - یہ سبزہ حفیظ
آج پینے میں کمی اچھی نہیں،

پی تو لیتا ہوں مگر پینے کی وہ باتیں گئیں
وہ جوانی وہ سیہ مستی وہ برساتیں گئیں

اللہ اللہ کہہ کے بس اک آہ کرنا رہ گیا
وہ نمازیں وہ دعائیں وہ مناجاتیں گئیں

راہ و رسمِ دوستی قایم تو ہے لیکن حفیظ
ابتدائے شوق کی لمبی ملاقاتیں گئیں

مجھکو لیجا کے درِ یار پہ قاصد نے کہا
خامہ فرسائی نہ کر ناصیہ فرسائی کر

گزرے ہوئے زمانے کا اب تذکرہ ہی کیا
اچھا گزر گیا بہت اچھا گزر گیا،

اب ابتدائے عشق کا عالم کہاں حفیظ
کشتی میری ڈبو کے وہ دریا اُتر گیا،

عاشق سا بدنصیب کوئی دوسرا نہ ہو
معشوق خود بھی چاہے تو اُسکا بھلا نہ ہو

کعبے کو جا رہا ہوں نگہ سوئے دیر ہے
ہر پھر کے دیکھتا ہوں کوئی دیکھتا نہ ہو

اے داورِ حشر اُس سے نہ کر پرسشِ ایماں
انکار کا عادی کہیں انکار نہ کر دے

آپ بیتاب نمائش نہ کریں جلووں کو
ہم نے دیدار قیامت پہ اُٹھا رکھا ہے

رکھتی تھی لاگ میرے گریباں سے نوبہار
دامن گلوں کے باغ میں کیوں چاک ہو گئے

کچھ راز نہیں کھلتا دزدیدہ نگاہی کا
اب تو میرے سینے میں دل ہے نہ تمنا ہے

اُمیدیں آرزوئیں کھیلتی ہیں یوں میرے دل سے
پلٹ جاتی ہیں موجیں جس طرح ٹکرا کے ساحل سے

سرِ مقتل حفیظ اپنا کوئی ہمدم نہ تھا لیکن
نگہ کچھ دیر تک لڑتی رہی شمشیرِ قاتل سے

اُٹھا رکھا ہے میں نے آپ کا دیدار محشر پہ
مرا منہ تک رہے ہیں میری ہمت دیکھنے والے

دیکھ اے رحمتِ حق میرے گلے سے نہ لپٹ
میں گنہگار ہوں آلودہ ہے دامن میرا

جانبِ کعبہ تو چلتا ہوں مگر یا اللہ ! بتکدہ میرا۔ صنم میرے۔ برہمن میرا !!!

وہ نگہ باندھ گئی دل میں طلسمِ اُمید نظر آتی ہے تمنّا ہی تمنّا ہم کو

پھر مُردہ آرزوؤں میں اک روح پھونکدی گزرا پھر اس طرف سے کوئی دیکھتا ہوا

لحاظِ خاطرِ احباب دیرینہ ہے اے زاہد چلوں کیا سوئے مسجد راہ میں میخانہ آتا ہے

چلی ہے جان یادِ رفتگاں میں، مسافر ہے تلاشِ کارواں میں

وہ اور ہمارے پاس۔ خدا ساز بات تھی ہم مدتوں خدا کی قسم بدگماں رہے

تھے حق شناس اور انا الحق نہ کہہ سکے اہلِ زباں تھے ہم بھی مگر بےزباں رہے

اِس زندگی کو چاہیئے سامانِ زندگی کچھ بھی نہ ہو تو شیشہ و پیمانہ چاہیئے

رہنے دے جامِ جم مجھے انجامِ جم سنا کھل جائے جس سے آنکھ وہ افسانہ چاہیئے

تم نے دُنیا ہی بدل ڈالی میری اب تو رہنے دو یہ دُنیا دار یاں

قایم کیا ہے میں نے عدم کے وجود کو دنیا سمجھ رہی ہے فنا ہوگیا ہوں میں،

ہمّت بلند تھی مگر اُفتاد دیکھنا چپ چاپ آج محوِ دعا ہوگیا ہوں میں

ناآشنا ہیں رتبۂ دیوانگی سے دوست کم بخت جانتے نہیں۔ کیا ہوگیا ہوں میں

ہاں کیفِ بیخودی کی وہ ساعت بھی یاد ہے محسوس ہو رہا تھا خدا ہوگیا ہوں میں

حشر کے دن میری چُپ کا ماجرا کچھ نہ کچھ تم سے بھی پوچھا جائے گا

دوستوں کی بیوفائی پر حفیظ، صبر کرنا بھی مجھے آ جائے گا

ہاں جانتا ہوں شومیِ دستِ دعا کو میں کچھ روز اور دیکھ رہا ہوں خدا کو میں

ثابت قدم رہوں کہ تلاطم کا ساتھ دوں ساحل کے رُخ تو لا نہ سکوں گا ہوا کو میں

اُٹھو صنم کدے والو تلاش لازم ہے اِدھر ہی لوٹ پڑیں گے اگر خدا نہ ملا

تمام زادِ سفر راستے میں لٹ جاتا خدا نے فضل کیا کوئی رہنما نہ ملا

فغاں کے واسطے ذوقِ سلیم ہے درکار یہ جس کے پاس نہ ہو۔ صبر اختیار کرے

محبت کی دُنیا میں سب کچھ حسیں ہے محبت نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے

یہ اعترافِ عجز بھی معیوب ہے تو خیر چُپ ہو رہیں گے کچھ نہ کہیں گے زباں سے ہم

تھا زندگی سے بڑھ کے ہمیں وضع کا خیال جب عمر نے نباہ نہ کی۔ ہم بھی چُپ رہے

مغرور تھا کمالِ سخن پر بہت حفیظ، ہم نے بھی واہ واہ نہ کی ہم بھی چپ رہے

نگاہِ آرزو آموز کا چرچا نہ ہو جائے — شرارت سادگی ہی میں کہیں رسوا نہ ہو جائے
ارادے باندھتا ہوں۔ سوچتا ہوں۔ توڑ دیتا ہوں — کہیں ایسا نہ ہو جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے

نہ دردِ محبت نہ جوشِ جوانی، — یہ جنت ہے تو، ہائے دنیائے فانی!
سناتا ہے کیا حیرت انگیز قصے — حسینوں میں کھوئی ہو جس نے جوانی
نظر اور ذوقِ نظر دینے والے! — عجب شے بنا دی ہے دُنیائے فانی!

مجھ کو ان مجبوریوں پر بھی ہے اتنا اختیار — آہ بھر لیتا ہوں میں فریاد کر لیتا ہوں میں
جب کوئی تازہ مصیبت ٹوٹتی ہے اے خدا — ایک عادت ہے کہ تجھ کو یاد کر لیتا ہوں میں

اُس فتنۂ شباب کا عالم نہ پوچھئے — اک حشر اُٹھ رہا ہے تماشا لئے ہوئے

عبادت کی لذت نہ جی بھر کے پینا، — یہ کیا زندگی ہے نہ مرنا نہ جینا،
مجھے یاد ہے اپنا انجام ناصح — میں اک روز مر جاؤں گا بس یہی نا!
تنزل کی حد دیکھنا چاہتا ہوں — کہ شاید وہیں ہو ترقی کا زینا
مرے ڈوب جانے کا باعث تو پوچھو — کنارے سے ٹکرا گیا تھا سفینا

سہارا کیوں لیا تھا ناخدا کا — خدا بھی کیوں کرے امداد میری
بلندی پر اُٹھائی تھیں نگاہیں — یہی تھی اولیں اُفتاد میری

مری مجبوریاں کیا پوچھتے ہو — کہ جینے کے لئے مجبور ہوں میں
کسی نے بھی نہ پہچانا وطن میں، — میں سمجھا تھا بہت مشہور ہوں میں

فرش سے مطمئن نہیں، پست ہے ناپسند ہے — عرش بہت بلند ہے ذوقِ نظر کو کیا کروں
اہلِ نظر کوئی نہیں اس لئے خود پسند ہوں — آپ ہی دیکھتا ہوں میں اپنے ہنر کو۔ کیا کروں

یہ دامن ہے یہ ہے گریباں۔ آؤ کوئی کام کریں — موسم کا منہ تکتے رہنا کام نہیں دیوانوں کا
ایسی جنس فراہم کر لی جس کا گاہک کوئی نہیں — لادے لادے پھرتا ہوں اب پشتارا ارمانوں کا
لے چل ہاں منجدھار میں لے چل۔ ساحل ساحل کیا چلنا — میری اتنی فکر نہ کر میں خوگر ہوں طوفانوں کا

گوارا ہے دوامی تلخ کامی — کسی میٹھی زباں والے نے مارا
مجھے کم ظرف کہلانا پڑے گا — متاعِ دو جہاں والے نے مارا

چاند اور ستاروں کا یہ سماں کیا دلکش اور سہانا ہے — افسوس مجھے نیند آتی ہے افسوس مجھے سو جانا ہے
معصوم اُمنگیں جھول رہی ہیں دلداری کے جھولوں میں — یہ کچی کلیاں کیا جانیں کب کھلنا کب مرجھانا ہے

دل شاہ جہاں پوری (وفات ١٣ دسمبر ١٩٥٩ء)

دلؔ شاہجہاں پوری

نام حکیم ضمیر حسن خاں دلؔ شاہجہاں پوری۔ ابن احمد حسن ابن جمال الدین عرف قدرت علی خاں۔ فارسی کتب درسیہ کی تکمیل کے بعد عربی تعلیم کا آغاز ہوا صرف و نحو سے فارغ ہونے کے بعد مولوی سید محمد علی خانصاحب خیالؔ اور مولوی نادرالدین صاحب سے معقول کی اکثر کتابیں پڑھیں۔ فقہ حدیث اور تفسیر کی تعلیم مولوی بشیر احمد صاحب مراد آبادی اور مولوی عبدالباری صاحب شاہجہاں پوری سے حاصل کی بعد ازاں علم طب کا درس جو خاندانی مشغلہ تھا، مولوی حکیم محمد صاحب سے۔

پندرہ سولہ سال کی عمر سے ذوق شاعری پیدا ہوا۔ چند سال تک بغیر اصلاح مشغلۂ شاعری قایم رہا مگر اُستاد کامل کی تلاش تھی بذریعہ خط و کتابت منشی امیر احمد صاحب امیرؔ مینائی لکھنوی سے سلسلۂ تلمذ قایم ہوا بعد ازاں بمقام رامپور حاضر ہوکر شرف نیاز بھی حاصل کیا۔

حسب الارشاد اُستاد علیہ الرحمۃ بذریعہ خط و کتابت حضرت اُستاد و نیز دیگر اہل فن سے استفادہ کیا۔ رنگ تغزل میں دہلی کی تقلید کی۔ جذباتی رنگ پسند خاطر رہا۔ تصنع سے ہمیشہ احتراز کیا۔ پہلا دیوان نغمۂ دل طبع ہوچکا ہے دوسرا مجموعۂ کلام موسوم ترانۂ دل غیر مطبوعہ ہے۔

دلؔ شاہجہاں پوری

اثر عشق سے ہوں صورتِ شمعِ خاموش
یہ مرقع ہے مری حسرت گویائی کا

چمنِ دہر میں ہر پھول رہا پیشِ نظر
کھینچنا تھا ہمیں نقشہ تری رعنائی کا

نظر آتی ہے مجھے حسن کی دنیا بے حس
کس کو افسانہ سناؤں شبِ تنہائی کا

بار ہا ڈوب کے ابھرا مرے دل سے نشتر
راز پھر بھی نہ کھلا عشق کی گہرائی کا

سوزِ نہاں کا اب ہے وہ عالم کہ الاماں
پردہ اُلٹ نہ دے کہیں اخفاءِ راز کا

کیا جانے کس خیال سے چھوڑا بحالِ زار
مجھ پر بڑا کرم ہے مرے چارہ ساز کا

جب دل میں دردِ عشق اُٹھا ہم اچھل پڑے
سمجھے کہ یہ کرم ہے کسی دلنواز کا

نارسائی کا سبب کیا ہے یہی ذوقِ طلب
بڑھ گئے ہم اس قدر آگے کہ رہبر رہ گیا

یہ گویا واقعات بزم ہستی کا خلاصہ ہے — ترا یوں دفعتاً خاموش اے شمع سحر ہونا
اُدھر گھبرا کے غمخواروں کی مایوسانہ سرگوشی — اِدھر بیمار کا کچھ کہہ کے سب سے بے خبر ہونا

ذوق جانبازی میں یہ احساس تک باقی نہیں، — دل میں پیکاں رہ گیا یا دل کو پیکاں لے چلا

اُٹھ گیا پردہ حائل فقط اتنا ہے خیال — کیا کہیں جلوہ گہہ ناز میں پھر کیا دیکھا

اے نگاہ روح پرور آفریں صد آفریں — جانِ بسمل بن گیا وہ درد پیدا کر دیا

خاک ہو جانا نمودِ عشق ہے اے اہلِ دل — جل گیا پروانہ لیکن رنگ محفل بن گیا

وقت رخصت تسلیاں دے کر — اور بھی تم نے بے قرار کیا

چمکی تھی برقِ طور کہ بیخود ہوئے کلیم — پردہ حجاب کا جو اُٹھا بھی تو کیا ہوا

آغاز تمنا سے انجام محبت تک — گزرا ہے جو کچھ ہم پر تم نے بھی سنا ہوگا

یاد ہے ہاں یاد ہے طرزِ نگاہِ مستِ یار — ایک نازک پنکھڑی سے پارہ پارہ دل ہوا

کیا سنائیں سرگزشتِ زندگیِ پُر الم — آشیاں اب تو قفس ہے اس سے پہلے دام تھا
درحقیقت مضطرب دل کے لئے وہ موت تھی — اصطلاحِ عام میں تسکین جس کا نام تھا

یاد ہے اب تک وہ کیف انگیزیِ جوشِ بہار — شاخِ گل تھی دستِ ساقی ہر گلِ تر جام تھا

رہا اپنے سفینہ کا یہ عالم بحرِ ہستی میں، — کبھی ساحل سے مل جانا کبھی کچھ دور ہو جانا

دفعتاً پھر بھول جاتے ہیں جو کچھ آتا ہے یاد — ہم کسی کے سامنے کیا جانے کیا کہنے کو ہیں

نہ وہ آرام جاں آیا نہ موت آئی شبِ وعدہ — اسی دھن میں ہم اُٹھ اُٹھ کے ہزاروں بار بیٹھے ہیں

کھینچی ہوئی اک شکل مجسم نظر آئی — دیکھا کسی مایوس نے یوں جانبِ در آج

نتیجے تک کھینچے کیا کیا امید و یاس کے نقشے — تلاطم میں تھی کشتی سامنے نظروں کے ساحل تھا
حقیقت میں وہ اک نیرنگیِ بحرِ محبت تھی، — نہ موجیں تھیں نہ طوفاں تھا نہ کشتی تھی نہ ساحل تھا

کنارے تک تو پہونچے گو کسی صورت سے بھی پہونچے — تلاطم بحرِ غم کے ڈوبنے والے کو ساحل تھا

رہنمائی کیا ضرورت عشق کامل چاہیئے — دل جہاں تڑپے سمجھ لینا یہی ہے کوے دوست

یہ شرحِ غم ہے یہ انجام نالۂ سحری، — کہ چھا گئی مرے ظلمت کدہ پہ بے اثری
اُٹھا جو پردۂ ظلمت تو وجد میں تھی نسیم — فضا میں گونج رہا تھا ترانۂ سحری

اسے قلق ہے مرا حالِ زار سن سن کر — یہ وقت تھا کوئی تدبیر چارہ جو کرتے
نگاہِ شوق رہی ہمزبانِ دل لیکن — کسی طرح نہ بنا شرح آرزو کرتے

دیا تھا عشق تو ہمت بھی یہ خدا دیتا — کہ ایک وقت میں ہم ترک آرزو کرتے

اک بے خبر ہوش کا عالم ہی جدا ہے — نالے ہیں نہ آہیں نہ اثر ہے نہ دعا ہے

راہِ طلب میں ٹھوکریں کھانے کے بعد — کہتا ہے عشق ترک تمنا نہ کیجئے

ہو کچھ تو میری ناصیہ سائی پر التفات — اتنا نیاز عشق کو رسوا نہ کیجئے

ان کی نظر اُٹھے گی کبھی تو پئے کرم — حسنِ طلب یہی ہے تقاضا نہ کیجئے

محوِ جمال بیخود و مخمور ہو گئے — یعنی قریب ہو کے بہت دور ہو گئے

منزل کا خواب دیکھ رہے تھے سفر نصیب — چونکے تو کارواں سے بہت دور ہو گئے

مصیبت ہے نگاہِ شرمگیں سے واسطہ دل کا — نہ آہِ سرد بھرنے دے نہ منہ سے اُف نکلنے دے

بس انتہا ہے کہ سنگِ درِ حبیب سے ہم — بیان کرتے ہیں جو دل کا حال ہوتا ہے

حسنِ چمن تھے قطرۂ شبنم بہار میں — پلٹی ہوا تو اشکِ گلِ تر کے ہو گئے

کسی کی یاد تھی آنکھوں سے اشک ڈھلتے تھے — اسی خیال میں ہم کروٹیں بدلتے تھے

ہماری کشتیِ عمر آہ ڈوبتی تھی اِدھر — اُدھر نجومِ فلک ڈوبتے اُچھلتے تھے

اک وہم کی نقاشی پر مرحلۂ دل ہے — دنیائے محبت میں رہبر ہے نہ منزل ہے

ہمدم غمِ فرقت کی تشریح نہیں ممکن — اک نشترِ صد ایذا ہر ہر نفسِ دل ہے

ذروں میں کچھ کشش ہمیں محسوس ہو چلی — اے دل سنبھل کہ پیشِ نظر کوئے یار ہے

انِ دل میں جوشِ تمنا لئے ہوئے — آیا ہوں اک تلاطمِ دریا لئے ہوئے

ے احترامِ ساقیِ محفل سنبھالنا — لغزش ہوئی ہے ساغر و مینا لئے ہوئے

رار ہا ہے دعوئے پندار و اتقا — آتا ہے کوئی ساغر و مینا لئے ہوئے

ے جوشِ جنوں میں دستِ وحشت جس قدر چاہے — قیامت کی ہے گنجائش مرے چاکِ گریباں میں

مت کی کشش ہے تارہائے جیب و داماں میں — یہ زنجیریں مجھے کھینچے لئے جاتی ہیں زنداں میں

ر اُٹھتا ہوں اب تک جب وہ شکوے یاد آتے ہیں — اثر تھا کس قیامت کا تری چشمِ پشیماں میں

ہم کو بے چین کئے جاتے ہیں — ہائے کیا شے وہ لئے جاتے ہیں

گوشِ دل کے لئے کچھ طور کی تخصیص نہیں — ہر جگہ ہم تری آواز سنا کرتے ہیں

اب یہ صورت ہے دلِ زار کے بہلانے کی — ذکرِ ناکامیِ اربابِ وفا کرتے ہیں

سنگِ درِ حبیب کو حسن نہ سہی قبول کی — فرق نہ آئے اے جبیں حوصلۂ نماز میں

وہی مست حقیقی ہے جو پیہم بزم ساقی میں، شکست شیشۂ دل کی صدا پر وجد کرتا ہے

اُٹھے تو محوِ تمنا سے لے تو غرقِ نیاز نگاہِ شوق کو فکرِ مآل کار نہ ہو

خود شعلۂ فنا سے ہم آغوش ہو گئے بزمِ وفا میں آج شہیدانِ آرزو

ناکامیوں کے بعد بھی چھوٹا نہ ہاتھ سے کیا جانے کس خیال سے دامانِ آرزو

سرِ طور ایک برقِ حسن لہراتی نظر آئی، ذرا شوخی سے جھٹکا تھا کسی نے اپنے داماں کو

ہر ذرہ میں در پردہ اک شعلہ بھڑکتا ہے اے اہلِ نظر دیکھو خاکسترِ پروانہ

جب صاعقہ لہرائے حد جاننا منزل کی چل وادیٔ ایمن تک سن طور کا افسانہ

رہیں گے بیخود و سرشار جام ہو کہ نہ ہو ملے تو ہمتِ ساقی اگر نہیں نہ سہی

یہی ہیں سوزِ دلِ عندلیب کے معنی قفس تو پھونک دیا چند پر نہیں نہ سہی

نگاہِ مست سے اُدھر کے دیکھنے والے تجھے تو ہے مجھے اپنی خبر نہیں نہ سہی

کہئے تو کہہ دوں عرشِ بریں کو مقامِ دوست ہمت مگر کچھ اور ہے اپنے خیال کی

اندازِ برقِ طور نمایاں ہیں حسن بن اب وقت آگیا ہے کہ پردا کرے کوئی

ہے ہے یہ بیکسیٔ محبت کہ خاکِ دل اپنی نظر کے سامنے برباد ہوگئی

نظر میں ہمتِ جلوہ اگر نہیں نہ سہی کبھی کبھی تری آواز ہی سنا کرتے

بہار جام بکف جھومتی ہوئی آئی، شکستِ عہد نہ کرتے تو اور کیا کرتے

مایوس ازل ہوں یہ مانا ناکام تمنا رہنا ہے جاتے ہو کہاں رخ پھیر کے تم مجھکو تو ابھی کچھ کہنا ہے

مآلِ عشق کی اہلِ وفا سے داستاں کہئے جہاں دل مٹ چکا ہے اُس زمیں کو آسماں کہئے

رات آنکھوں میں کٹ جاتی ہے دل پر وہ مصیبت ہوتی ہے میں تارے گنتا رہتا ہوں جب دنیا غافل سوتی ہے

قدرت کی چمن آرائی کا گو ایک اثر ہے دونوں پر غنچے ہیں کہ ہنستے رہتے ہیں شبنم ہے کہ پیہم روتی ہے

ہو چکا ناکامیٔ دل تک بیانِ زندگی، عشق نے اب کی مکمل داستانِ زندگی

ایک آہ سرد میں مضمر ہیں لاکھوں واقعات مختصر یوں کر رہا ہوں داستانِ زندگی

ہو چکی ہر بار گو اسے شمع پروانوں کی خاک، ذرہ ذرہ میں ہے پنہاں اک جہانِ زندگی

حشر بھی شامل ہے اسے دل واقعاتِ عشق میں آپ کہئے گا کہاں تک داستانِ زندگی

نظروں سے نہاں کیوں رہتے ہو جب جان لیا پہچان لیا، نشتارِ حجاب آخر کیا ہے تم کو تو خدا بھی مان لیا

نہ ہوا دل کسی صورت سے بھی مانوس اے دل گو لبھاتی رہی نیرنگیٔ دنیا مجھکو

پہلے رودادِ دلِ ناکام پر ہو اک نظر   پھر جہاں سے چاہئے چاکِ گریباں دیکھئے
دل صرفِ وفا ہوا تو سمجھے   کیا چیز یہ جنس رائگاں ہے

جوشِ الم کب تک گریہ دل آج تو ڈوبا جاتا ہے   موجیں ہیں کہ بڑھتی جاتی ہیں طوفاں ہے کہ امڈا آتا ہے
خلش دشوار بہت تشریح خلش ممکن ہی نہیں   چپ رہنے میں دم گھٹتا ہے کہتا ہوں تو دل تھراتا ہے
ز تمنا بے حاصل انجامِ محبت مجبوری   کہتے ہیں یہ دل دینے والے جانے کے لئے دل آتا ہے

پھر اعتبارِ عشق کے قابل نہیں رہا   جو دل تری نظر سے گرا دل نہیں رہا
نشتر چبھوئے اب نہ پشیمانیٔ نگاہ   مجھکو تو شکوۂ خلشِ دل نہیں رہا
موجیں اُبھار کر مجھے جس سمت لے چلیں   حدِ نگاہ تک کہیں ساحل نہیں رہا
کیا کہئے اب مآلِ محبت کی سرگزشت   یاد اُس کی رہ گئی ہے مگر دل نہیں رہا

حال تھا جہاں تک وہ ادا کیا زباں سے   جو کہیں گے اشک رنگیں وہ الگ ہے داستاں سے
سکے ہم اب تک وہی فیصلہ تھا دل کا   جو کہا تری نظر نے جو سنا تری زباں سے
بں امتیاز ناصح تری پندِ برمحل کا   یہ مقام بیخودی ہے مجھے چھوڑ دے یہاں سے
ہر نفس بیاں ہے مرے اشک ماجرا ہیں   یہی شرحِ مدعا ہیں وہ سنیں جہاں جہاں سے
نشاط ختم ہے خاک اُڑائے گی خزاں   کوئی کہے کوئی سنے میں نہ سنوں بہار میں

مری خموشیٔ مجبور پر بھی ایک نظر   زباں سے جو نہ ادا ہو وہ ماجرا ہوں میں
نشان دو مجھے اسے کوئے یار کے ذرّو   یہیں کہیں کوئی شے آج کھو چکا ہوں میں
اس اضطراب پہ قرباں اک جہانِ سکوں   کوئی سنبھال رہا ہے تڑپ رہا ہوں میں
اسی سے کیجئے رفتار کا کچھ اندازہ   نظامِ دہر بدلتا ہوا اُٹھا ہوں میں

توبہ کے احترام سے تھرا رہے تھے ہاتھ   دل کانپتا تھا جام کو ہر بار دیکھکر
اب کیوں شکستِ عہد کی ہمت ہے دفعتہً   کیا ہوگیا مجھے نگہِ ناز دیکھکر

سرِ سجدہ سوئے بزمِ ناز جانا ہی پڑا   حسن کی تسخیر پر ایمان لانا ہی پڑا
کھیلتی تھی یوں چمن میں شوخیٔ موجِ نسیم   بے تکلف ہر کلی کو مسکرانا ہی پڑا

ہم کو تسلیم زمانہ کا تغیر لیکن   عشق مظلوم رہا حسن پشیماں نہ ہوا

لب آنے سے پہلے خود ہیں شکوے سے منفعل   حسن کی معصوم فطرت کو پشیماں دیکھکر
لیجئے کب ختم ہو شوقِ نظر کا امتحاں   بڑھ گیا نازِ تجلی مجھکو حیراں دیکھکر

حضرتِ دل کچھ تو کہئے واقعاتِ زندگی
ہنس دیئے ہنگامِ گریہ آپ یہ کیا راز ہے

سوز و گدازِ شمع کو بیکار دیکھ کر
تڑپا ہوں صبح تک یہی آثار دیکھ کر

حشر آفریں ہے کوئے محبت میں ہر قدم
ہم تو بڑھے تھے راہ کو ہموار دیکھ کر

گرتی رہیں تبسمِ پنہاں کی بجلیاں
ہم کو مشاہدہ کا طلبگار دیکھ کر

اے حسن جو سزا ہے تمنا ہو وہ قبول
لیکن مری نظر کو پھر اک بار دیکھ کر

تم تو سکونِ خاطرِ ناشاد بن گئے
سمجھا تھا میں کچھ اور یہ رفتار دیکھ کر

تقوے بھی آج ہو گیا قربانِ میکدہ
ہر جام میں بہار کے آثار دیکھ کر

یہ مانا سننے والے کی نظر کچھ اور کہتی ہے
ہوائے کوچۂ دلکش مگر کچھ اور کہتی ہے

تمنائے کرم اس کیف پر کچھ اور کہتی ہے
چھلک جاتا ہے جب ساغر نظر کچھ اور کہتی ہے

ادھر کوثر ادھر کوثر جدھر دیکھو ادھر کوثر
ہوا کا رخ بدلتے ہی نظر کچھ اور کہتی ہے

تری نظروں میں ہیں نقش و نگارِ حال و مستقبل
مگر خاموشیٔ دیوار و در کچھ اور کہتی ہے

یہ صدا آئی جو پہونچا کوئی ساحل کے قریب
بحر جس موج کو چاہے اسے طوفاں کردے

موجِ فنا ہے زندگی دل لئے ہوئے
ابھرا ہوں غرق ہو کے تو ساحل لئے ہوئے

منظر اداس شمعِ سحر پیکرِ خموش
اٹھا ہے کوئی گرمیٔ محفل لئے ہوئے

موجِ بہار۔ موجِ صبا۔ موجِ بوئے گل
ہر دلکشی ہے طوق و سلاسل لئے ہوئے

آئی صدا کہ تو ابھی منزل سے دور ہے
پہونچا جہاں جہاں بھی مجھے دل لئے ہوئے

بھٹک رہا ہوں تماشائے بام و در کے لئے
قدم قدم پہ طلسمات ہیں نظر کے لئے

اٹھے جو بہرِ کرم وہ نگاہ بے پروا
سکونِ اہلِ محبت ہے عمر بھر کے لئے

تلاشِ منزلِ مقصود میں نہ ہو مایوس
بہت وسیع ہے دنیا تری نظر کے لئے

حریمِ حسن میں کیا دخل فہم و عقل و شعور
ابھی یہ چند حجابات ہیں نظر کے لئے

بجھنے کے لئے شمعِ محفل جلنے کے لئے پروانہ ہے
سمجھو تو حیاتِ عاشق کا ایک ایک نفس افسانہ ہے

ناز کہوں یہ سوئے ادب، سفاک کہوں یہ ناممکن
منشائے نظر جو کچھ بھی ہو انداز تو معصومانہ ہے

اے اہلِ نظر میں کیا سمجھوں آگاہ نہیں مستقبل سے
انجامِ محبت کیا ہوگا آغاز ہی ایک افسانہ ہے

وہ کون سا مقام تھا اے ضبطِ رازِ عشق
ہم جن حدود میں چاک گریباں نہ کر سکے

روش صدیقی (وفات ۲۳ جنوری ۱۹۷۱ء)

اب عالمِ تغافلِ پنہاں کچھ اور ہے
ہر لمحہ اضطراب کا عنواں کچھ اور ہے

ہے یوں تو ہر نشاط تہِ ہوسِ عاشقاں
لیکن اشارۂ غمِ جاناں کچھ اور ہے

یہ داستاں بھی رخ دگیر یہ مختصر
افسانۂ جہاں کا عنواں کچھ اور ہے

ہرچند جامِ مرگ بھی ہے راحت آفریں
اے دردِ زندگی ترا درماں کچھ اور ہے

الطافِ برملا کی تو کیا بات ہے، مگر
رعنائیٔ نوازشِ پنہاں کچھ اور ہے

بیتابیٔ خرد ہے نہ بیتابیٔ جنوں
اے دوست! رازِ چاکِ گریباں کچھ اور ہے

زاہد! ترا یقینِ ایماں بھی ہے بلند
لیکن مرا تصورِ ایماں کچھ اور ہے

برحق مسرتِ سروساماں، مگر روش
لطفِ حیاتِ بے سروساماں کچھ اور ہے

☆

روش صدیقی

مصطفیٰ آباد رامپور
۱۵ ربیع الاول ۱۳۶۰ھ

روشؔ صدیقی

نام شاہ عزیز، تخلص روشؔ، ولادت ۱۰ جولائی ۱۹۱۱ء، وطن جوالا پور (سہارنپور) جو مناظر فطرت کے لحاظ سے عجیب جگہ ہے اور قدیم ہندوستانی تہذیب کا گہوارہ گروکل کانگڑی بھی یہیں ہے۔ والد کا نام مولوی طفیل احمد صاحب شاہد۔ اُردو و فارسی قرآن کی تعلیم گھر پر ہوئی۔ ہندی سنسکرت۔ انگریزی سے بھی واقفیت حاصل کی۔ اور سات سال کی عمر میں آغاز شاعری ہوا۔ زندگی کے سب سے پہلے دو شعر سُن لیجئے:

یہ میرے ضبطِ محبت نے کی عجب تاثیر
کہ ان کو ضبط محبت کا حوصلہ نہ رہا

ہے روز میرے گریباں سے گفتگوئے رفو
بہار کے لئے کیا کوئی مشغلہ نہ رہا

تلمذ اگر کسی سے ہے تو والد ماجد سے — ۱۹۴۲ء تک برابر غزلیں کہیں اس کے بعد نظم نگاری شروع ہوئی۔ سب سے پہلی نظم انتظار و ہمایوں میں شایع ہوئی۔

روشؔ صدیقی

محبت اک تپشِ ناتمام ہوتی ہے
نہ صبح ہوتی ہے اس کی نہ شام ہوتی ہے

جو راہ اہل خرد کے لئے ہے لامحدود
جنونِ عشق میں وہ چند گام ہوتی ہے

باقتضائے محبت محال سمجھوں گا
اگر یہ سچ ہے کہ ملنا ترا محال نہیں

ازل سے حسن ہے آمادۂ کرم لیکن
ہنوز عشق کے لب پر کوئی سوال نہیں

سکونِ دل جو ملا بھی تو آہ کیا ہوگا
سکونِ دل تو مرے درد کا مآل نہیں

نفسانِ روح بیتابی ہے خاموشی محبت کی
سکوتِ عشق بھی اک عالمِ فریاد ہوتا ہے

بظاہر تو کوئی وجہ مسرت بھی نہیں ہوتی
یہ کیوں اکثر بہت شاداں دلِ ناشاد ہوتا ہے

خوش آتا ہے مری آزادیوں کو سایۂ زنداں
وہیں اُڑ کر پہونچتا ہوں جہاں صیاد ہوتا ہے

دل گوارا نہیں کرتا ہے شکستِ امید
ہر تغافل پہ نوازش کا گماں ہوتا ہے

کچھ مرا حال سناتی ہے مری خاموشی
کچھ تری نیم نگاہی سے عیاں ہوتا ہے

وہ کوئی نالۂ غم ہو کہ نغمۂ عشرت
شکست دل کی صدا کے سوا کچھ اور نہیں

ہ اک تسکین جو اتنک چارہ ساز دردِ الفت تھی
وہ تسکیں بھی شریکِ دردِ الفت ہوتی جاتی ہے
موشی سے بھی بارِ ترجمانی اُٹھ نہیں سکتا
بہت غمناک رودادِ محبت ہوتی جاتی ہے
ڑھانا چاہتا ہوں وسعتیں خوابِ محبت کی
مجھے اے زندگی تیری ضرورت ہوتی جاتی ہے
روشن اب ہم ہیں اور رازونیازِ سوزِ محرومی
بہت محبوب شمعِ شامِ فرقت ہوتی جاتی ہے

غمِ وفا تو کہانی نہ تھا مگر اے دل
بنا دیا تری خاموشیوں نے افسانہ
ہر ایک ذرہ شریکِ غم و مسرت ہے
ملا نہ شہرِ محبت میں کوئی بیگانہ،
وہ لب کھلیں تو بکھر جائیں نغمہ ہائے ارم
وہ آنکھ اُٹھے تو برس جائے کیفِ میخانہ
ہوا نہ تکملۂ حسرتِ دلِ رنگیں!
تمام عمر چھلکتا رہا یہ پیمانہ
پہونچ سکے نہ جہاں خواہشات کی پرواز
نہ بن سکا کسی ایسی فضا میں کاشانہ

یہ کون مسندِ عشرت سے مستِ خواب اُٹھا
کہ جھانکتا ہوا مشرق سے آفتاب اُٹھا
تکلفات کو بالائے طاق رکھ مطرب
میں دل سے ہاتھ اُٹھاتا ہوں تو رباب اُٹھا
نہ دیکھنے دیا کچھ مجھکو شوق بے حد نے
ہزار پڑ گئے پردے جو اک حجاب اُٹھا

ذوقِ یقیں نے کفر کو ایماں بنا دیا
جس در پہ سر جھکا درِ جاناں بنا دیا
اُس راز کو جو قلبِ ازل میں نہ چھپ سکا
پنہاں کیا تو پیکرِ انساں بنا دیا
کیا کیا خیال زینتِ آغوشِ شوق تھے
تم نے تو سب کو خوابِ پریشاں بنا دیا
یہ بھی سب اُن کا حسنِ نوازش ہے اے روش
غم ہی کو چارۂ غمِ پنہاں بنا دیا

ہونے ہی کو ہے اے دل تکمیل محبت کی
احساسِ محبت بھی مٹتا نظر آتا ہے

وسعتیں پاتا گیا ذوقِ لطافت جس قدر
میں بعید جلوہ ہائے رنگ و بو ہوتا رہا

سافرِ رہِ اُلفت یہ شرطِ منزل ہے
کہ ہر قدم ہو ترا اور جہانِ بے خبری
ب اشک دیدۂ بیتاب میں نہیں رکتے
ادھر نہ دیکھ ذرا اے ستارۂ سحری

ندگی کیوں ہمہ تن گوشں ہوئی جاتی ہے
کبھی آیا ہے جواب آئے گا پیغام اُن کا
تذکرہ رہتا ہے دل سے سحر و شام اُن کا
لب پہ آجائے نہ بھولے سے کہیں نام انکا

دلِ افسردہ محبت کو نہیں ہے درکار
اس گلستاں کے لئے اک گلِ تر پیدا کر
منتظر ہیں ابھی تیرے لئے لاکھوں جلوے
تو ذرا وسعتِ دامانِ نظر پیدا کر

جادواں جن سے بنے انجمن نیم شبی   وہ ستارے کبھی اے دیدۂ تر پیدا کر

بتا سکا نہ کوئی رازِ تشنہ کامیِ شوق   نمودِ تشنہ میکدۂ دوجہاں ملا مجھ کو
مجھے جنونِ وفا سے بڑی امیدیں تھیں   یہ مرحلہ بھی مگر رائیگاں ملا مجھ کو
شرف عطا جو کیا تو نے ہم کلامی کا   زمانہ منتظر داستاں ملا مجھ کو

نہ اب سکوں ہی مرا ہے نہ اضطرار مرا   عجیب حال ہوا اے نگاہِ یار مرا
خزاں کے ساتھ بہت دور مجھکو جانا ہے   نہ انتظار کرا اے محفلِ بہار مرا
وہ ضبط جس نے سکھائی ہو مجھکو خاموشی   کرے گا ذکر وہی اُن سے بار بار مرا

اِک ذرہ جہاں منزلِ ہے خورشیدِ محبّت کی   وہیں اے کاش ! صبحِ زندگی کی شام ہو جائے
آغازِ محبّت کا کوئی انجام ہوتا ہے   تو آغازِ محبت ہی مرا انجام ہو جائے
ہیں سے ابتدا ہوتی ہے اقلیمِ محبّت کی   جہاں مجبور دورِ گردشِ ایام ہو جائے

رحدِ عشق سے آگے نہ بڑھی وحشتِ عشق   حُسن ہشیار کو دیوانہ بنایا نہ گیا
شق کو داغِ دلِ زیست سمجھنے والے   دو نوں عالم سے بھی یہ داغ مٹایا نہ گیا
بھی اسے جنبشِ دامانِ تصور تجھ سے   شمعِ احساسِ جدائی کو بجھایا نہ گیا
س کس عنواں سے بھلانا انھیں چاہا تھا روشؔ   کسی عنواں سے مگر اُن کو بھلایا نہ گیا

نگاہِ ناز میں ہلکا سا رنگِ ناتوانی ہے   محبّت کی کہانی ہے محبّت کی زبانی ہے
بسائی ہے وہ دُنیا ایک ناکامِ محبّت نے   جہاں ہر نامرادی میں جمالِ کامرانی ہے
کسی کا لطفِ پنہاں آنسوؤں میں مسکراتا ہے   مری ناشادمانی انتہائے شادمانی ہے

یہ بھی اُس جانِ تغافل سے گوارا نہ ہوا   کہ تغافل ہی نصیبِ کششِ دل ہو جائے
حُسن وہ خواب نہیں ہے جو مکمل ہو کبھی   عشق وہ کیف نہیں ہے کہ جو کامل ہو جائے
ہائے کیا شے ہے وہ اک حسرتِ روپوش، روشؔ   جو کبھی درد بنے اور کبھی دل ہو جائے

گزر چکی تری کشتی ہزار طوفاں سے   ہنوز حسرتِ طوفاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

اس نے کچھ سوچ کے سب پردے اُٹھا ہی ڈالے   کر گئی آج بڑا کام مری بے خبری

ترے مذاق نے کیا کیا دکھائے ہیں عالم   ترا مذاق ہی اے کاش جاوداں ہوتا
جو میں کرم نہ سمجھتا، ترے تغافل کو   تو بار بار یہ دل مجھ سے بدگماں ہوتا
ہزار طور نگاہوں نے کر لئے پیدا   حجاب اُن سے بالآخر کہاں کہاں ہوتا

جس میں ہو یاد بھی تری شامل
ہائے اس بیخودی کو کیا کہئے

ہے وہی رنگِ حسن بے پردا
عشق کی سادگی کو کیا کہئے

کھینچ لے جائے جو ترے در تک
ایسی دیوانگی کو کیا کہئے

اُن پہ قربان ہستیِ کونین
اک مری زندگی کو کیا کہئے

سکونِ دل تو کہاں ہے، مگر یہ خوابِ سکوں
نثارِ زلفِ پریشاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

بہت بلند ہے دل کا مقامِ خودداری
مگر شکست کا امکاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

سکوتِ عشق ہو یا اضطرابِ شوقِ روش
اگر نوازشِ جاناں نہیں تو کچھ بھی نہیں

غمِ پنہاں کی نہ ہو جائے کہیں پردہ دری
آہ رہنے دو یہ اندازِ پشیماں نظری

مجھ تک آتی تھی کہاں نکہتِ گیسوئے نگار
وحشتِ عشق مبارک غمِ شوریدہ سری

یہ حجاباتِ محبت کے لئے لازم ہیں
کچھ تری کم نگہی ہے نہ مری کم نظری

مدتوں سے ہے کسی عالمِ خاموش میں عشق
گریۂ نیم شبی ہے نہ دعائے سحری

اب عالمِ تغافلِ پنہاں کچھ اور ہے
ہر لمحہ رنگِ شوقِ فراواں کچھ اور ہے

الطاف برملا کی تو کیا بات ہے مگر
رعنائیٔ نوازشِ پنہاں کچھ اور ہے

حد سے گزر چلا ہے اب عالمِ انتظارِ دوست
صبح بھی درمیاں نہیں شام بھی درمیاں نہیں

روزِ ازل سے عشق ہے رفتۂ سوزِ ناتمام
وصل بھی جاوداں نہیں، ہجر بھی جاوداں نہیں

حالِ روش سنو گے کیا، حالِ روش کہے گا کون
درد کوئی فغاں نہیں، غم کوئی داستاں نہیں

محبت ایک بڑا مدعا ہے فطرت کا
خبر بھی ہے کہ محبت کا مدعا ہے تو

کہیں برہم ہی نہ ہو جائے نظامِ ہستی
ضبط کرتا ہے محبت میں تو اتنا بھی نہ کر

زینتِ دہر کوئی جلوۂ موہوم سہی
نگہِ شوق کو محرومِ تماشا بھی نہ کر

محرمِ رازِ محبت ہے اگر دل تیرا
تو، خدا کے لئے اس راز کو رسوا بھی نہ کر

بہت بلند ہے دل کا مقامِ خودداری
مگر شکست کا امکاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

گزر چکی تری کشتی ہزار طوفاں سے
ہنوز حسرتِ طوفاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

شبِ ہجر نشاطِ گریۂ الفت نہ پوچھئے
آنکھوں پہ اُن کا دامنِ تر دیکھتے رہے

میری حالت سے دل دوست حزیں ہوتا ہے
جانِ بیتاب بس اب صبر نہیں ہوتا ہے

حسن کچھ چشمِ زلیخا میں نہیں ہے محدود
کہ محبت میں ہر اک خواب حسیں ہوتا ہے

پنڈت امرناتھ ساحرؔ (وفات ۱۹۴۲ء)

عیاں ہو گر ہمیں اور قسمت لو گل میں نہاں ہی ہو
جہاں جان ہو اگر گل میں تو جاں جسماں ہی ہو

بہار دیر و حرم میں ہو وہاں میخانہ میں ساغر
برہمن ہو خیابِ شیخ ہو بہر نشاں ہی ہو

از ما تیسہ مدن آر دہلوی
۲۵ مئی سنہ ۱۹۲۱

پنڈت امرناتھ ساحر

نام پنڈت امرناتھ، تخلص ساحر، آپ رائے بہادر پنڈت جانکی ناتھ مدن رئیس دہلی کے خلف اکبر ہیں آپ کی ولادت ۲۹ مارچ ۱۸۶۳ء کو بانس بریلی میں ہوئی۔ رنجیت سنگھ شیر پنجاب اور اُن کے جانشینوں کے مشہور دیوان راجہ دینا ناتھ آپ ہی کے خاندان کے ایک معزز رکن تھے۔ ساحر صاحب بارہ برس کی عمر میں پنڈت پرشاد رام راز داں کے زمرۂ تلامذہ میں داخل ہوئے اور اُردو فارسی کی تعلیم حاصل کی اور سب سے پہلے فارسی زبان میں شعر کہا، مولانا عبدالحلیم عاصم کاشانی سے جو فارسی کے ادیب اور زبردست شاعر تھے فارسی میں تلمذ اختیار کیا ۲۲ سال کی عمر میں آپ اجمیر تشریف لے گئے اور وہاں احباب کی ترغیب سے ریختہ اُردو پر توجہ فرمائی پھر دہلی آکر پنڈت جواہر ناتھ ساقی اور منشی رام جیال سنگھ شیدا سے صحبت گرم رہی اور شعر و سخن کا مشغلہ جاری رکھا۔ آپ عرصہ دراز تک عہدۂ تحصیلداری پر ممتاز رہے مگر شاعری کا مشغلہ جاری رہا اب اپنے وطن دہلی میں رونق افروز ہیں اور ہر مہینہ کے اخیر ہفتہ کو مشاعرہ آپ کے دولت خانہ پر ہوتا ہے۔ آپ متعدد کتابوں کے مترجم مؤلف و مصنف ہیں۔ آپ کا ایک اُردو دیوان مسمّیٰ "کفر عشق" چھپ چکا ہے۔

چشم و دل نزع میں ہیں محوِ تماشائے جمال — حشر کیا دور ہے اس سے کوئی بہتر اپنا

نظر کب تاب لا سکتی ہے دیدارِ تجلّی کی — جو بیہوشی میں دیکھا بھی تو بیہوش و نظر دیکھا

گرم تھا رونقِ شمع میں شب ہنگامہ — شمع تھی محوِ فنا اُس کو سروکار نہ تھا

چمن میں آتشِ رخسارِ گل سے آگ لگی — نہ آشیانۂ بلبل بچا نہ دام رہا

گویا زبانِ حال تھی ساحر خموش تھا — یہ سعیِ ضبط تھی وہ تقاضائے ہوش تھا

ہونے کو تو ہے اب بھی وہی حسن وہی عشق — جو حرفِ غلط ہو کے مٹا نقشِ وفا تھا

پنہاں نظر سے پردۂ دل میں رہا وہ شوخ — کیا امتیاز ہو مجھے ہجر و وصال کا

دل مٹا پر نہ مٹا حسرتِ محبت دل سے — کفر اسلام ہوا مرکزِ ایماں نہ ہوا

دل ہے بت خانۂ اصنامِ خیالی ساحر — تو وہ کافر ہے کہ بھولے سے مسلماں نہ ہوا

اُلفت آئینہ رویاں آخر اب بس کر کہ میں — دیکھتے ہی دیکھتے محوِ تماشا ہو گیا

ے پری رو ترے دیوانے کا ایماں کیا ہے
اک نگاہِ غلط انداز پہ قرباں ہونا،

ت تسلیم و رضا چاہئے دل عاشق کا
ساحر آسان نہیں بندۂ جاناں ہونا،

ن عشق میں کب تن بدن کا ہوش رہتا ہے
بڑھا جب جوشِ سودا ہم نے سر کو دردِ سر جانا

قدم سے ہے عین حدوث اور حدوث عین قدم
جو تو دجلوے میں آتا تو میں کہاں ہوتا

ایک جذبہ تھا ازل سے گوشہ دل میں نہاں
عشق کو اس حسن کے بازار نے رسوا کیا

. اور بار امانت عشق اور عشقِ ازل
شانِ رحمت ہے کہ ساحر اس کا حامل ہوگیا

نائیں برآئیں اپنی ترکِ مدعا ہو کر
ہوا دل بے تمنا اب رہا مطلب سے کیا مطلب

ہ کر آئینہ کہتے ہیں کہ لاثانی ہوں میں
آئینہ دیتا ہے اُس کی لن ترانی کا جواب

یا آپ کو اب کوئی تمنا نہ رہی
بے طلب مجھ کو جو ملنا تھا ملا آپ سے آپ

کر دیا ہے عالمِ ہستی میں ہوش کو
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ ساحر کہاں ہے آج

ن عشق ساماں اب فنا کا رنگ لایا ہے،
گماں تار رگ جاں کا ہے ہر اک تار دامن پر

د رفتگی سے منزلِ حیرت میں ہے قیام،
آئینہ خانہ ہے در و دیوار آج کل،

نگامۂ ہستی کا انجام ہے معدومی
اس خواب پریشاں کی تعبیر سے کیا حاصل

امانِ یار مر کے بھی چھوٹا نہ ہاتھ سے
اُٹھے ہیں خاک ہو کے سرِ رہگذر سے ہم

صدائے وصل بام عرش سے آتی ہے کانوں میں
محبت کے مزے اس دار پر چڑھ کر نکلتے ہیں

ره دریا ہے اگر اپنی حقیقت جانے
کھوئے جاتے ہیں جو ہم آپ کو پا جاتے ہیں

ن مستانِ ازل کفر سے آزاد نہیں
بیخودی کا ہے یہ عالم کہ خدا یاد نہیں،

ہاں دیر و حرم میں جلوۂ ساقی و مے باقی
چلیں میخانے میں اور بیعتِ پیرِ مغاں کرلیں،

ایا ہے خودی نے نقش پندارِ خودی دل سے
رہا باقی نہ کچھ نام و نشاں قطرہ کا دریا میں

وہ حسن ہر اک شے میں نظر آتا ہے
ماسوا کی کوئی ہستی میرے ایماں میں نہیں

ہے وازِ عنقا لائیں گے گر لامکاں بھی ہو
تمھیں ہم ڈھونڈ لائیں گے کہیں بھی ہو جہاں بھی ہو

اُٹھا اُدھر نقاب اُدھر ہوش اُڑ گئے
چشمک تھی ہم سے برقِ تجلائے یار کو

ریش ہو دل جو مئے عشق سے سرشار نہ ہو
سر قلم ہو جو سزاوارِ سرِ دار نہ ہو

حسن کیا حسن ہے جلوہ جسے درکار نہ ہو
یوسفی کیا ہے جو ہنگامۂ بازار نہ ہو

ہے مقتضائے حسن کہ دیکھے نہ دیکھ کر
ہے اقتضائے عشق کہ بارِ دگر تو دیکھ

بے تمنائی نے برہم رنگِ محفل کر دیا — دل کی بزم آرائیاں تھیں آرزو سے دل کے ساتھ

ازل سے دل ہے محوِ ناز وقفِ خود فراموشی، — جو بیخود ہو وہ کیا جانے جفا کیا ہے وفا کیا ہے

پردہ پڑا ہوا تھا غفلت کا چشمِ دل پر — آنکھیں کھُلیں تو دیکھا عالم میں تو ہی تو ہے،

چشمِ ساقی میں وہ کیفیتِ مستی دیکھی — بے مئے و جام و سبُو بادہ پرستی دیکھی

دل سی ارزاں نہیں عالم میں کوئی شے ساحر — بے دلی ہم نے مگر اس سے بھی سستی دیکھی

روشن کئے چراغ دلِ داغ دار نے — اِس گل زمیں میں آگ لگا دی بہار نے

جلوۂ حق نظر آتا ہے صنم میں ساحر — ہے مرے کعبہ کی تعمیر صنم خانوں سے

میں اپنی ہستی موہوم کو مٹاتا ہوں، — کہ دہر میں تری ہستی کا اعتبار رہے

کوئی مستِ جامِ خود بینی ہے کوئی مستِ جام — یہ نشے وہ ہیں کہ چڑھتے اور اُترتے جائیں گے

حُسن میں اور عشق میں جب رابطہ قائم ہوا — غم بنا دل کے لئے اور دل بنا میرے لئے

وہ بھی عالم تھا کہ تو ہی تو تھا اور کوئی نہ تھا — اب یہ کیفیت ہے میں ہی میں کا ہے سودا مجھے

حُسن کو عشق سے بے پردہ بنا دیتے ہیں وہ، — وہ جو پندارِ خودی دل سے مٹا دیتے ہیں

خالی ہاتھ آئیں گے اور جائیں گے بھی خالی ہاتھ — مُفت کی سیر ہے کیا لیتے ہیں کیا دیتے ہیں

بزم میں شمع بھی ہے آپ بھی ہیں شب افروز — دیکھنا یہ ہے کہ پروانے کدھر جاتے ہیں

زندگی میں ہے موت کا نقشہ — جس کو ہم انتظار کہتے ہیں

دیدار شش جہت ہے کوئی دیدہ ور تو ہو — جلوہ کہاں نہیں کوئی اہلِ نظر تو ہو

ہم ہیں اور بے خودی و بے خبری، — اب نہ رندی نہ پارسائی ہے

دیر و حرم ہیں جلوہ گہِ حُسنِ روئے یار — وقفِ نگاہ حُسن خود آرا نظر میں ہے

درِ صنم کدہ کو ہم نے جا کے کھڑکایا — حرم میں جب نہ ہوئے باریاب کیا کرتے

چلے جو ہوش سے ہم بے خودی کی منزل میں — ملا وہ ذوقِ نظر پر اُدھر نہ دیکھ سکے

نظر میں ہیں میرے ساحر وہ حُسن کے جلوے — کہ حیرتی ہو نظر دیکھ کر نہ دیکھ سکے،

حرم ہے مومنوں کا بُت پرستوں کا صنم خانہ — خدا ساز اک عمارت ہے مرے پہلو میں جو دِل ہے

ذرہ ذرہ مہرِ عالمتاب کی تصویر ہے — قطرہ قطرہ موجِ بحرِ حُسن عالمگیر ہے

بے لوث ہے دامانِ نظر رنگِ اثر سے — ہے خار بھی گل مجھکو مساوات نظر سے

جس کی باطن پہ نظر ہے اُسے آتا ہے نظر — قلب کے آئینے میں حُسن کا تاباں ہونا

سیماب اکبر آبادی (وفات ۳۰ جنوری ۱۹۵۱ء)

سیماب اکبرآبادی

میں جمادی الثانی ۱۲۹۹ھ مطابق ۱۸۸۰ء بروز دوشنبہ وقت صبح اکبرآباد (آگرہ) کے محلہ نائی منڈی ۔ گوگلی، املی والے مکان میں پیدا ہوا۔ والد ماجد مولانا محمد حسین مرحوم (نور اللہ مرقدہٗ) فاضل عصر اور عالم متبحر تھے ۔ اجمیر شریف میں ٹائمس آف انڈیا پریس کی شاخ کے افسر اعلیٰ تھے ۔ اپریل ۱۸۹۶ء میں بمقام آگرہ انتقال فرمایا۔

شاعری میرا فطری ذوق اور پدری میراث ہے ۔ کتب متداولہ عربی و فارسی کی تکمیل کے بعد حضرت والد مرحوم نے مجھے انگریزی مدرسے میں داخل کر دیا۔ جو گورنمنٹ کالج اجمیر کے تعلق و الحاق کی وجہ سے "برانچ اسکول" کہلاتا تھا ۔ برانچ اسکول کے مدارج درس بعجلت طے کر کے جب کالج پہونچا تو وہاں مولوی سدید الدین قریشی اکبرآبادی مرحوم، مولوی تحسین علی اجمیری مرحوم اور مولوی عابد حسین کی عالمانہ اور فاضلانہ توجہات نے میرے اُس ذوقِ شاعری کو بے حجاب کر دیا جو میری فطرت میں ازل سے ودیعت تھا میرا دستور یہ تھا کہ فارسی نصاب میں جتنے اشعار شریکِ درس ہوتے ہیں اُن کا ترجمہ اُردو نظم میں کر کے اپنے اساتذہ کے سامنے رکھ دیتا تھا اور یہ مقدس حضرات میری اس جسارت کی حوصلہ افزائی سے پذیرائی فرماتے تھے ۔

مجھے خوب یاد ہے کہ مولوی عابد حسین کے سامنے جب میں نے ایک روز بوستاں کی ایک حکایت کا ترجمۂ منظوم پیش کیا تو مولوی صاحب نے میری کاپی کے اُسی صفحے پر پنسل سے یہ شعر لکھ دیا:

جب نہیں ہے شعر کہنے کا شعور　　　پھر بھلا ہے شعر کہنا کیا ضرور

لیکن ساتھ ہی ساتھ متبسم ہو کر یہ بھی فرما دیا کہ کل پھر کسی فارسی نظم کا ترجمہ نظم ہی میں کر کے لانا۔ غرض یہ میری عادت جاری تھی کہ میں ہاتفی، جامی، سعدی، عرفی، قاآنی وغیرہ کے اشعار و قطعات کا ترجمہ (جن کا انتخاب کلام جزو نصاب تھا) ہمیشہ بصورت نظم پیش کیا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ جسارت اتنی بڑھ گئی کہ امتحان کے پرچوں میں بھی میں ہمیشہ فارسی نظم کا ترجمہ اُردو نظم ہی میں کرتا رہا اور صاحب ذوق ممتحن میری اس بدعت سے کبھی چیں بجبیں نہ ہوئے ۔

۱۷ سال کی عمر میں مجبوراً کالج چھوڑ دینا پڑا۔ اس وقت میں ایف اے کا آخری امتحان دینے والا تھا۔ والد مرحوم کے انتقال نے سلسلۂ تعلیم جاری رکھنے سے معذور رکھا۔ بیس سال کی عمر میں شادی ہو گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ میں بے تکلف شعر کہہ لیتا تھا۔ مگر چونکہ شاہراہِ سخن میں ہنوز کسی کو اپنا رہنما نہیں بنایا تھا۔ اس لئے مشاعرے میں غزل پڑھنے سے کسی قدر جھجک

ہوتی تھی۔

والدِ مرحوم کے انتقال کے بعد اُن کا فرزندِ اکبر ہونے کی حیثیت سے گھر کا تمام بار میرے سر پہ آپڑا۔ اور مجھے بسلسلۂ معاش کان پور جانا پڑا۔ حکیم ازل لکھنوی، جناب محب لکھنوی اور کانپور کے اکثر شعرا سے مجالست رہی۔ اس زمانے میں وہاں حکیم سید ضامن علی جلال لکھنوی کا طوطی بول رہا تھا اور قربِ وجوار کی وجہ سے کانپور لکھنؤ کے زیرِ اثر تھا۔ لیکن میری طبیعت فطرتاً "دبستانِ دہلی" کی طرف مائل تھی۔ اس لئے میں ۱۹۰۵ء میں فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کا شاگرد ہوگیا۔ لیکن دوسری یا تیسری غزل پر فصیح الملک مرحوم نے لکھ دیا کہ "ابھی آپ کو مشق کی ضرورت ہے" اس تنبیہ کے بعد میں نے غزلوں کی ترسیل کچھ عرصہ کے لئے بند کردی اور مشقِ سخن کی طرف متوجہ ہوگیا۔ کئی ماہ تک یہ سلسلۂ مشق اسی طرح جاری رہا۔ اس کے بعد مول گنج (کان پور) میں ایک مشاعرہ کا اعلان ہوا۔ " دم نکلتا ہے کم نکلتا ہے" میں نے ایک غزل کہی اور اُستاد کی خدمت میں حیدرآباد بھیجدی۔ یہ غزل جب بعد اصلاح واپس آئی تو پیشانی پر سُرخ سیاہی سے لکھا ہوا تھا۔ "آفریں ہے، کیا خوب غزل کہی ہے" بس پھر تو حوصلے بڑھ گئے۔ طبیعت کی جھجک نکل گئی اور میں کانپور اور لکھنؤ کے مشاعروں میں بے تکلف غزل سرائی کرنے لگا۔

اصلاح کا سلسلہ فصیح الملک مرحوم کی وفات سے کچھ پہلے تک جاری رہا۔ اُن کی وفات کے بعد پھر میں نے کسی کو غزل نہ دکھائی۔ نظر مرحوم وارثی تھے۔ کان پور میں وہ اور میں ایک ہی مکان میں (بمقام گوال ٹولی) رہا کرتے تھے۔ اُن کی تشویق سے سے اُنھیں کی ہمراہی میں ایک دن دیوہ شریف جانے کا اتفاق ہوا اور مرشدی و مولائی حضرت حاجی حافظ سید شاہ وارث علی رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ دیکھا جو کچھ دیکھا اور پایا جو کچھ پایا۔

کانپور سے بیمار ہوکر آگرہ آیا۔ آگرہ سے بسلسلۂ ملازمت اجمیر شریف جانا پڑا۔ جہاں کبھی طالب علمانہ زندگی بسر کی تھی۔ پانچ سال تک اجمیر شریف رہکر ۱۹۱۶ء پھر آگرہ آیا۔ اور "رسالہ مرقع" کا مدیر رہا۔ یہاں کچھ روز ٹھہر کر ٹونڈلہ (ضلع آگرہ) بصیغۂ ملازمت جانا پڑا۔ "آگرہ اخبار" کی ادارت بھی ٹونڈلے کی ملازمت کے ساتھ شریکِ مشاغل تھی۔

جب معلوم ہوا کہ فطرت نے مجھے اس لئے پیدا نہیں کیا کہ میں اپنی تمام عمر ذہنی غلامی میں بسر کردوں۔ بلکہ میری تخلیق خدمتِ ادب کے لئے ہوئی ہے۔ اس انکشافِ ضمیری کے بعد میں نے ملازمت کو ابدی استعفا دیدیا اور اکبرآباد (آگرہ) میں مستقل اقامت اختیار کرلی۔ چنانچہ ۱۹۲۹ء سے اپنے وطنی مستقر پر قائم و باقی ہوں۔

مری رسائی سے دور رہے تو، مگر ابھی تجھ کو یاد ہو گا ۔۔۔ کہ میں نے ایمن کی وادیوں میں اُلٹ دیا تھا نقابِ تیرا

خود بین و خود شناس ملا خود نما ملا ۔۔۔ انساں کے بھیس میں مجھے اکثر خدا ملا

اللہ رے شامِ غم مرے دل کی شکستگی ۔۔۔ تاروں کا ٹوٹنا بھی مجھے ناگوار تھا

اک انقلاب زمانے میں تھا شباب کے بعد
نظر اُٹھی تو کسی چیز پر شباب نہ تھا،

خود قصۂ غم اپنا کوتاہ کیا میں نے
دُنیا نے بہت چاہا افسانہ بنا دینا

نہ پوچھ مجھ سے، ترے جبر و اختیار کی خیر
گناہ ہو نہ سکے، یا گناہ کر نہ سکے

قفس سے چھٹ کے بڑی دیر میں ٹھکانہ ملا
خیال سے بھی کہیں دور آشیانہ ملا

جو کچھ کھویا ہے، پروانے ہوں یا ہوں شمع کے آنسو
یہ سب کچھ ایک دن خاکسترِ محفل سے نکلے گا

اے غمِ عشق ترے ظرف میں کچھ آگ بھی ہے؟
آنسوؤں سے تو علاجِ تپشِ دل نہ ہوا

ہے شمع آج صورتِ پروانہ رقص میں
شاید مزاجِ حسن شریکِ وفا ہوا

اے خادمانِ حُسن یہ کیا انتظام ہے؟
اب تک چراغِ طور پڑا ہے بجھا ہوا

کیوں ہمنشیں یہی تو نہیں ساقیِ بہار؟
جاتا ہے میکدہ سا ہوا پر اُڑا ہوا

ہوش آیا تو ہنسی آ گئی وحشت پہ مجھے
اپنے ہاتھوں میں جب اپنا ہی گریباں دیکھا

ایوانِ تصور سے اپنے، نکلا نہ طلب کی دنیا میں
جب تک ہر ذرے کو میں نے پھیلا کر دنیا کر نہ دیا!

جبیں سائی سے تسکیں، نہ سجدوں سے تسلّی
اُٹھا کر سر میں رکھ لوں، تمھارا نقشِ پا کیا؟

بقدرِ شوق اقرارِ وفا کیا
ہمارے شوق کی ہے انتہا کیا

میں اپنے حال سے خود بے خبر ہوں
تمھاری کم نگاہی کا گلا کیا،

دُعا دل سے جو نکلے کارگر ہو
یہاں دل ہی نہیں، دل سے دعا کیا،

یہ زمیں خود ایک دن کیا جانے کیا بن جائے گی
گر یوں ہی انسان پیوندِ زمیں ہوتا رہا

زندانِ کائنات میں محصور کر دیا
محفل سے اپنی تم نے بہت دور کر دیا

فطرت یہی ازل سے ہے برقِ جمال کی
اس نے جسے تباہ کیا، طور کر دیا،

بدل گئیں وہ نگاہیں، یہ حادثہ تھا اخیر
پھر اس کے بعد کوئی انقلاب ہو نہ سکا

کم سے کم فرشتوں کو چین تو ملا دل کا
آپ کی محبت میں آدمی نے کیا پایا؟

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر

[illegible]رہ جائے یہیں نقشِ غلامی بعدِ آزادی
مری تصور کس نے کھینچ دی دیوارِ زنداں پر

مجھے فکرِ وفا ہے ہنوز
بادۂ عشق نارسا ہے ہنوز

بندگی نے ہزار رخ بدلے
جو خدا تھا وہی خدا ہے ہنوز

شورِ ہستی ابھی ذرا ٹھہرے
سُن رہا ہوں ضمیر کی آواز

میری بے اختیاریوں کی نہ پوچھو، نہ حقیقت ہی بس میں ہے نہ مجاز
کر رہی ہے خود آشیاں سے قریب میرے لیل و نہار کی پرواز

دے ابتو مجھے نہ طعنۂ ہوش، اے تجھ کو بھی کر دیا فراموش
اب رات نہ آئے یہ دُعا ہے کیا عرض کروں فسانۂ دوش،

کبھی پھُول بن کر کبھی اشک بن کر ہو رنگینیٔ دامن و آستیں تم

دفعتًا سازِ دو عالم بے صدا ہو جائے گا کہتے کہتے رُک گئے جس دن ترا افسانہ
دل جلا، پھر خود جلے، پھر ساری دنیا جل اُٹھی سوز لائے تھے بمقدار پرِ پروانہ

نوید میرے تصور کے دست و بازو کو حریم حُسن کے پردے اُٹھا رہا ہوں میں
تو انتظار میں اپنے یہ میرا حال تو دیکھ کہ اپنی حدِ نظر تک تڑپ رہا ہوں میں
جلالِ مشربِ منصور، اسے معاذ اللہ کسی نے پھر نہ کہا آج تک خدا ہوں میں

صحنِ گلشن میں بنے پھرتے ہیں دامانِ بہار چند ٹکڑے جو مرے چاک گریباں میں نہیں

ذرا کھل کر پکارا سے صورِ مجذوبانِ اُلفت کو یہ دیوانے کہیں بیٹھے نہ رہ جائیں بیاباں :

بزمِ افسانہ کرو ختم جوانی گزری، قابلِ ذکر اب آگے کوئی روداد نہ
آہ غمخانۂ غربت کی جنوں سامانی، ہے جہاں تک حرمِ دُنیا کوئی آباد نہ

معمورۂ فنا کی کوتاہیاں تو دیکھو اک موت کا بھی دن ہے دو دن کی زندگی

میں چاہتا ہوں کہ منزل ہی منھ سے بول اُٹھے فضا شناس کوئی میرے کارواں میں نہ

ترے جلووں نے مجھے گھیر لیا ہے اے دوست اب تو تنہائی کے لمحے بھی حسین ہوتے

تم نے تو اپنے حُسن کو محفوظ کر لیا ہم کس کے ساتھ عمرِ محبت بسر کریں؟
جب تو نہیں تو خلوتِ دیر و حرم فضول اب کیا یہاں پرستشِ دیوار و در کریں؟
اُس مرکزِ جمال پر اب ہے مری نگاہ، جلوے بھی دیکھ لیں تو طوافِ نظر کریں؟

شوقِ دیدار کا کیوں اُن سے اعادا نہ کریں لاؤ وہ کام کریں ہم جسے موسیٰ نہ کریں
اُن سے کہتا ہوں جو ہیں شاکیِ بے لطفیٔ عشق غمِ اُلفت کو شریکِ غمِ دنیا نہ کریں

حجاب اپنی نظر سے تو ہم اُٹھا نہ سکے انھیں کے حُسن سے پردے اُٹھائے جاتے ہیں
کوئی تو سرخیِ افسانہ یادگار رہے ہم اپنا خون قفس میں لگائے جاتے ہیں

جنوں کی نذرِ سالانہ کا ساماں دیکھ لیتا ہوں بہار آتے ہی پہلے میں گریباں دیکھ لیتا ہ

یری میں مذاقِ سیر مست جانے کا ماتم کیا　یہ کیا کم ہے در و دیوارِ زنداں دیکھ لیتا ہوں
ہے کوئی اور شے انسانیت میرے تخیل میں　خیالوں میں کبھی تصویرِ انساں دیکھ لیتا ہوں
ر زندگی سے جب خودی کی موج اُٹھتی ہے　تو ہنس کر جانبِ گورِ غریباں دیکھ لیتا ہوں

ل کی بساط کیا تھی نگاہِ جمال میں　اک آئینہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں
ببر آ ہی جائے گر ہو بسر ایک حال میں　امکاں اک اور ظلم ہے قیدِ محال میں
زدہ اس قدر ہوں سرابِ خیال سے　جی چاہتا ہے تم بھی نہ آؤ خیال میں
ل آ کے توڑتا ہوں طلسمِ خیال کو　یا مطمئن کرو کہ تمھیں ہو خیال میں،
نیا ہے خواب حاصلِ دُنیا خیال ہے　انسان خواب دیکھ رہا ہے خیال میں
بجلی گری او نہ آنچ نہ آئی کلیم پر　شاید ہنسی بھی آ گئی ان کو جلال میں
ر دو روزہ واقعی خواب و خیال تھی　کچھ خواب میں گزر گئی باقی خیال میں

سف کی طرح عشق میں خودداریاں کہاں　ورنہ مذاقِ حُسن زلیخا سے کم نہیں
وقت اُن کے ساتھ ہوں اک انتظام میں　میرا خیال خوابِ زلیخا سے کم نہیں

دنیا اگر میرے قابل نہیں ہے　ترے پاس یا رب جہاں اور بھی ہیں
ھاؤ نہ منزل کی شمعیں ابھی سے　ابھی راہ میں کارواں اور بھی ہیں

قیر ہوں، مگر اتنا حقیر بھی نہ سمجھ　میں ذرہ بھی تو نہیں ہوں جو آفتاب نہیں
ائے بیٹھے ہیں اک شمع لاشریک سے لو　ہماری بزم میں پروانہ باریاب نہیں
رہے ذوقِ تماشا تو بند کر آنکھیں　جہاں نگاہ نہیں ہے وہاں حجاب نہیں

برباد حسنِ ظن سے مآلِ وفا نہ ہو　ایسا نہ ہو کہ حقِ محبت ادا نہ ہو
اُلجھا رہا ہوں زلفِ تصور میں دستِ شوق　اور اس طرح کہ موجِ ہوا آشنا نہ ہو
وہ سرخوشی کا وقت ہے جب کائنات میں　دل بولتا ہو اور کوئی بولتا نہ ہو
آ، اور آخری نگہِ یاس دیکھ جا!　شاید پھر اس کے بعد عیادت روا نہ ہو

اری خانہ ویرانی زمانے پر عیاں کیوں ہو؟　جلے جتنا نشیمن، سرخ اُتنا آسماں کیوں ہو؟
رانی اور مرگِ عشق! یہ ہے رقص کا موقع!　غزل خواں ہو مرے ماتم میں کوئی نوحہ خواں کیوں ہو؟
مجھے ہے اعتبار اے ہم نفس اپنی رہائی کا　بنے جس سے قفس وہ میری شاخِ آشیاں کیوں ہو؟
پروانے سے بھی ہیچ ہے کیا شمعِ زندگی؟　یا رب اسے فروغ بقدرِ شرر نہ ہو

بتائیں تو مری ہستی بگاڑنے والے! — بگاڑ کر کوئی مجھ کو بنا بھی سکتا ہے
تصورات کی خلوت میں کر تلاش اُس کو — تحیرات کی دنیا میں کیوں بھٹکتا ہے!
تجھے نہ دیکھ سکوں میں تو کچھ ملال نہیں، — یہی بہت ہے کہ تو مجھ کو تو دیکھ سکتا ہے

اب اسے بیدرو کیا اس کے لئے ارشاد ہوتا ہے؟ — پھر اپنی خاک سے پیدا دلِ برباد ہوتا ہے!
مٹادو، خاک کردو، پھونک دو، کردو فنا، لیکن — ہمارا جذبۂ فطری کہیں برباد ہوتا ہے!

لے لیا کیوں آپ نے الزام میری موت کا — اس تباہی میں ابھی گنجائشِ تقدیر تھی

اشاروں سے نگاہوں سے بہت کچھ منع کرتا ہوں — قفس ہی پر جھکی پڑتی ہے شاخِ آشیاں پھر بھی!

میں غافل ہوکے دانستہ خرابِ بزمِ ہستی ہوں — سمجھتا ہوں کہ یہ محفل نہیں ہے خواب محفل ہے
وہ دل لے کر ہمیں بے دل نہ سمجھیں اُن سے کہدینا — جو ہیں مارے ہوئے نظروں کے اُن کی ہر نظر دل ہے

ہر انجمن میں موقعِ وجدان و رقص ہے — آزادیٔ طبیعتِ پروانہ چاہیے،
اے جانے والے نجد کے۔ لازم ہے ترکِ ہوش — کچھ احترامِ تربتِ دیوانہ چاہیے
نیرنگِ انقلاب ہیں راتیں بہار کی — صبحِ چمن کو روز اک افسانہ چاہیے

مجھے اُس نگاہ پہ ناز ہے، جسے بزمِ ناز میں بار ہے — مجھے اُس حجاب پہ رشک ہے جو شریکِ جلوۂ یار ہے
نہ کلی ہے وجہِ نظر کشی، نہ کنول کے پھول سے تازگی — فقط ایک دل کی شگفتگی سببِ نشاطِ بہار ہے
نہ غرض حرم کے وقار سے نہ صنم کدے کی بہار سے — ہمیں کام ہے درِ یار سے، درِ یار پھر درِ یار ہے!

دینا مجھے فریبِ نویدِ حیات تم — جب لوگ جا رہے ہوں جنازا لئے ہوئے
تو اپنی بزمِ ناز کو دیکھ اور ازل کو دیکھ — آیا کہاں سے تیری تمنا لئے ہوئے
اس خاکدانِ عشق کی پہنائیاں نہ پوچھ — ذرے پڑے ہیں وسعتِ صحرا لئے ہوئے
تھی کثرتِ جمال سے تاریک بزمِ دہر — آنا پڑا چراغِ تمنا لئے ہوئے

بیگانگی بقدرِ اصرار و التجا ہے — شاید ترے ستم کو اندازۂ وفا ہے!
صانع کی صنعتوں پہ سو حسن کیوں نہ برسیں — اپنی کسی ادا کو انساں بنا دیا ہے!

اندازۂ نظر میں تھی حدِ ہر دو عالم — تم پھر بھی دور نکلے اندازۂ نظر سے!
جب ملتفت ہوئی ہے اُن کی سکوں نگاہی — چُن چُن کے لے گئی ہے کانٹے دل و جگر سے
خوکردۂ خلش ہوں مجھ سے چرا نہ آنکھیں — اک درد مانگتا ہوں وہ بھی تری نظر سے

اک جہاں میرا شریکِ آرزو محفل میں ہے — کاش وہ تیری تمنا ہو جو میرے دل میں ہے

اپنے دل میں دے جگہ خانہ خرابِ عشق کو — آخر اسے بیدرد تو بھی توکسی کے دل میں ہے

سرِ محفل نہ کیوں کھل کر بیوں میں — اُن آنکھوں سے عنایت ہو رہی ہے
خدا سے مل گیا ہے حُسن کا فر — خدائی پر حکومت ہو رہی ہے
نہیں تنہائیِ زنداں کُمتّل — مجھے سائے سے وحشت ہو رہی ہے
ابھی تک محشرِ انسانیت میں — تلاشِ آدمیت ہو رہی ہے

پہلے خیالؔ خواب سے تھا طالبِ سکوں — اب خواب ڈھونڈتا ہے پناہیں خیال کی

ہم آپ سیر ہی کر آئیں بزمِ محشر کی ! — ابھی تو دیکھنے والے حساب دیکھیں گے؟

یہ فضا، یہ ابر، یہ ٹھنڈی ہوا یہ سبزہ زار — آج تو جنگل کا جنگل قابلِ تصویر ہے

مختلف ہیولوں میں اک مری تمنا تھی — چھپ گئی تو عقبیٰ تھی، مل گئی تو دُنیا تھی
تو ہوس میں دنیا کی زندگی مٹا بیٹھا، — بھول ہو گئی غافل، زندگی ہی دنیا تھی
میں جیا بھی دُنیا میں اور جان بھی دیدی — یہ نہ کھُل سکا لیکن آپ کی خوشی کیا تھی

کنعاں کی برقِ حُسن تڑپتی ہے مصر میں — کتنا وسیع سلسلۂ اضطراب ہے

تو نے سب رشتے وفا کے کر دئے تقسیم بزم، — کیوں نگاہِ ناز، اور میرے گریباں کے لئے !
زندگی دریائے بے ساحل ہے اور کشتی خراب — میں تو گھبرا کر دعا کرتا ہوں طوفاں کے لئے!

کون جانے آسماں سے اُن کو کیا امید تھی — مرتے مرتے بھی جو سوئے آسماں دیکھا گئے

بادل تھے، گل خانے تھے، جھولے تھے، پیمانے تھے — پوچھ رہا ہوں ساقی سے ساون پھر کب آئیں گے؟
دید سے اُن کی مطلب ہے، گھر نہ سہی محشر ہی سہی — ہم دانستہ دیکھیں گے وہ مجبوراً آئیں گے،

کہانی میری رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے — جو سنتا ہے اُسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے
چمن کے سائے کو مدتیں گزریں مگر اب بھی، — چمکتی ہے جو بجلی، آشیاں معلوم ہوتی ہے
ترقی پر ہے روز افزوں خلش دردِ محبت کی — جہاں محسوس ہوتی تھی وہاں معلوم ہوتی ہے
قفس کی تیلیوں میں جانے کیا ترکیب رکھی ہے؟ — کہ ہر بجلی قریبِ آشیاں معلوم ہوتی ہے

یوسف غیور، فطرتِ یوسف غیور تر! — کیا اعتبارِ خوابِ زلیخا کرے کوئی

وصالِ دوست ہے تکمیلِ نقصِ بے خودی کر لے — سنبھل اے بے خبر اس سے آگے جو ہستی ہے!

شامِ فرقت انتہائے گردشِ ایام ہے — جتنی صبحیں ہو چکی ہیں، آج سب کی شام ہے،

بے خودی کچھ دے گئی ہے اُن کے جلوؤں کا پتہ — آج خلوت میں اُٹھا ہے نقابِ دل مجھے

پھر تری محفل میں دورِ جام مجھ تک آئے گا ——— ہے ابھی تو اعتبارِ گردشِ محفل مجھے

خاکسترِ پروانہ میں جو سوز نہاں ہے ——— جب چاہے پھر اس خاک سے پروانہ بنا لے
اے شمع یہ پروانے کو ہنس ہنس کے جلانا! ——— کیا ہو جو تجھے بھی کوئی پروانہ بنا دے؟

طور، اے خاکسترِ سوزِ دلِ موسیٰ بتا! ——— جو دئے تھے برقِ ایمن نے وہ جلوے کیا کئے؟

نہ فرماؤ، نہیں ہے آدمی میں تابِ نظارہ ——— سنبھل جاؤ، اب اُٹھتی ہے نگاہِ ناتواں میری
مری حیرت پہ وہ تنقید کی تکلیف کرتے ہیں ——— جنھیں یہ بھی نہیں معلوم نظریں ہیں کہاں میری
پھر اس کے بعد، میرے منہ سے جانے کیا نکل جائے؟ ——— جب اُن کا نام لوں میں، قطع کر لینا زباں میری

پھر میں آیا ہوں ترے پاس اے امیرِ کارواں ——— چھوڑ آیا تھا جہاں تو، وہ مری منزل نہ تھی

لی دل کی بھڑک اُٹھی ہے داغِ کہنۂ دل سے ——— کوئی پروانوں کو آواز دے اُن کی محفل سے
بتائے وسعتِ کون و مکاں اس کو کہاں رکھیں ——— ذرا سا درد لیکر آئے ہیں ہم اُن کی محفل سے

ہے بتدریج آفتِ عالم مذاقِ کافری ——— ہائے پھر وہ بت، جو پوشیدہ ابھی پتھر میں ہے

کچھ وقت کٹ گیا تھا تری یاد کے بغیر ——— ہم پر تمام عمر وہ لمحے گراں رہے
یارب مری طرف رہے کچھ دن ہوا کا رُخ ——— جب آشیاں جلے تو قفس تک دھواں رہے

یوں طوافِ بارگاہِ ناز ہونا چاہئے ——— آنکھ میں بھی پاؤں کا انداز ہونا چاہئے

اس طرح سے مجھے ستا رہے ہو ——— جیسے میرا خدا نہیں ہے
اُس دل پہ نثار دونوں عالم ——— جس میں کوئی مدعا نہیں ہے

یہ سمجھئے ہے کوئی دیوانہ دنیا میں اُداس ——— بے سبب جب بزمِ عالم کو پریشاں دیکھئے

دنیا ہے اک افسانہ، کہنے کو تھے پھر سوچا ——— دنیا ہے خود افسانہ، افسانے سے کیا کہئے
کیا آگئی نیند اہلِ محفل؟ ——— کہنی تھی ہمیں بھی اک کہانی؟

نگاہ و ذہن ہے احساسِ کائنات سے خالی ——— عجیب چیز ترا انتظار میرے لئے ہے
یہ وہم ہو کہ حقیقت، سکوں اسی سے ہے دل کو ——— سمجھ رہا ہوں کہ تو بیقرار میرے لئے ہے

ہیں کچھ سُنی ہوئی سی صدائیں فضا میں آج ——— کیا میرے ہمصفیر بھی زنداں میں آگئے!
بھاری قدم، نظر متحیر، نفس دراز ——— کیا ہم حدودِ کوچۂ جاناں میں آگئے!

ہیں اب صرف انجامِ گلشن نگاہیں ——— وہ موسم گیا جب نظر چار سو تھی

صدائے صور سے میں قبر میں نہ جاگوں گا ——— کسی سنی ہوئی آواز سے پکار مجھے

آتے بھی ہو تو ابھی نہ آنا،
ہوں محوِ تصور آزمائی

مرا کفرِ محبت ہے فروغِ جادۂ ایماں
وہ شمعِ دیر ہوں میں روشنی جس کی حرم تک ہے

تری محفل میں اپنی نارسائی کی شکایت کیا
غنیمت ہے کہ در پردہ رسائی تیری ہم تک ہے

بھڑک اُٹھی ہے کیوں دنیا مری اُنکی محبت پر
یہ شورش کیوں خلافِ شمع و پروانہ نہیں اُٹھتی

اک نشیمن (وہ خاشاک و خس کا مکاں) اور اس پہ یہ غرہ تھا
کس قدر تنگ سہی ہو مرا باغباں، جیسے دنیا میں صحرا نہیں ہے

تو اور ارمانِ حرص و ہوائے ہوس، اسکی تکمیل فطرت کرے کیوں
یہ تو اک آب و گندم کی انگڑائی ہے، یہ تمنا، تمنا نہیں ہے

اختیاراتِ فطرت ترا شکریہ! چھٹ گئے ہم بڑی کشمکش سے
پہلے کچھ عزم تھے دل میں اچھے بُرے، لیکن اب کچھ ارادہ نہیں ہے

وہ اُنکا جانا دامن جھٹک کر، وہ بیٹھ جانا دل کا دھڑک کر
وہ اُنکا آنا وہ شادمانی، ہائے محبت، ہائے جوانی

وہ شامِ فرقت آفت کی گھڑیاں، اشکوں کی لڑیاں، ساون کی جھڑیاں
آنکھوں سے دل تک پانی ہی پانی، ہائے محبت، ہائے جوانی

ساون کی بھیگی بھیگی فضا میں دل کا فسانہ جاگ کے سننا
اپنی کہانی، دل کو سنانی، ہائے محبت، ہائے جوانی

وہ جس سے سمجھ جائے روداد مرے غم کی
ایسا بھی کوئی ٹکڑا افسانے میں رکھ دینا

صبر کر اے دلِ بیکس جو ہوا تو برباد،
ابھی قسمت میں ہے کیا جانئے کیا ہو جانا!

جتنے ستم کئے تھے کسی نے عتاب میں
وہ بھی ملا لئے کرمِ بے حساب میں

ہر چیز پر بہار، ہر اک شے پہ حُسن تھا
دُنیا جوان تھی مرے عہدِ شباب میں

وصالِ دوست اور میں، اتفاقاتِ محبت ہیں
یہ ہے وہ چیز جو شاید نہ تھی میرے مقدر میں

عبودیت بقدرِ ذوق، شایانِ نوازش ہے
خلوصِ دل سے اک سجدہ بہت ہے زندگی بھر میں

تو کیا سمجھے گا اے بُت ساز یہ پردے کی باتیں ہیں
تراشا جس کو، تھی پہلے سے وہ تصویر پتھر میں

ہاں فریبِ پردہ سے ہشیار اے اہلِ نظر
پردہ پردہ ہی تو ہے، کیا جانئے کیا پردے میں ہو

لطف تو جب ہے کہ ہو تجھ کو تمنا دید کی
اور تیری طرح کوئی دوسرا پردے میں ہو

تجھ کو در پردہ سمجھ کر ہو رہا ہوں بے قرار
کیا تماشا ہو جو کوئی دوسرا پردے میں ہو

کب تک دلِ مایوس کو برباد کریں گے
اب ہم تری امید سے فریاد کریں گے

تعجب کیا لگی گر آگ اے سیماب سینے میں
ہزاروں دل میں انگارے بھرے تھے لگ گئی ہوگی

حیرتِ جلوہ گری مُہرِ لبِ خاموش ہے
آنکھ محوِ دید تھی اتنا مجھے بھی ہوش ہے

جوش پر ہے جلوۂ مستانۂ عہدِ شباب
او نشیلی آنکھ والے کچھ تجھے بھی ہوش ہے

تیری زلفیں بھی نہ نکلی تھیں سوادِ حُسن سے
حسرتِ آوارہ جب سے خانماں بردوش ہے

کیوں ہنسی تو اے اجل، فانی اگر سمجھا مجھے
ایک دن سب کو فنا ہے کیا تجھے اور کیا مجھے!

ہے حصولِ آرزو کا راز ترکِ آرزو
میں نے دنیا چھوڑ دی تو مل گئی دنیا مجھے

کہہ کے سویا ہوں یہ اپنے اضطرابِ شوق سے
جب وہ آئیں قبر پر فوراً جگا دینا مجھے

صبح تک کیا کیا تری امید نے طعنے دئے
آگیا تھا شامِ غم اک نیند کا جھونکا مجھے

دیکھتے ہی دیکھتے دُنیا سے میں اُٹھ جاؤں گا
دیکھتی کی دیکھتی رہ جائے گی دنیا مجھے

کتنے دیوانے محبت میں مٹے ہیں سیمابؔ
جمع کی جائے جو خاک ان کی تو ویرانہ بنے

اب مجھ کو ہے قرار تو سب کو قرار ہے
دل کیا ٹھہر گیا کہ زمانہ ٹھہر گیا

مشربِ قیس کی ترویج نہ کی دنیا نے
کبھی میلہ نہ لگا نجد میں دیوانوں کا

یونہی ہم تم گھڑی بھر کو ملا کرتے تو بہتر تھا
یہ دونوں وقت جیسے روز ملتے ہیں جُدا ہو کر

خوش رہیں کوچۂ جاناں میں ہوا کے جھونکے
دل کے ٹکڑے تو مجھے ڈھونڈ کے لا دیتے ہیں

اے پردہ دار اب تو نکل آ کہ حشر ہے،
دُنیا کھڑی ہوئی ہے ترے انتظار میں!

عمرِ دراز مانگ کے لائی تھی چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

نظر آتا نہیں وحشت میں کہیں دستِ جنوں
اور کھینچے لئے جاتا ہے گریباں کوئی

کسی مردِ وفا کا کوچ ہے پھر اپنے مسکن سے
اُداسی مانگنے آئی ہے دنیا میرے مدفن سے

ہمیں تو یوں بھی نہ جلوے ترے نظر آئے
نہ تھا حجاب، تو آنکھوں میں اشک بھر آئے

چین ملنے سے ہے اُن کے، نہ جدا رہنے سے
آخر اے عشق کسی طرح بسر بھی ہوگی!

ایک وہ شمع نہ ہوگی جو بجھی جل جل کر
شام بھی ہوگی زمانے میں سحر بھی ہوگی

ہم اپنی موت پر دیکھیں کسی کا آنکھ تر کرنا
ہمیں بھی انعقادِ بزمِ ماتم کی خبر کرنا

وہ عالمِ شکستگیِ ناز الاماں،
جب حُسن خودکشی کے اثر سے تباہ ہوا!

ہائے سیمابؔ اُس کی مجبوری!
جس نے کی ہو شباب میں توبہ

ضعف کہتا ہے کہ ہاتھوں سے گرا دے تصویر
درد کہتا ہے کلیجے سے لگا لینے دے

قاتل کا نام لکھ دیا کیوں میری قبر پر
لیتے ہیں راہگیر بھی بوسے مزار کے

ہم کو تو جاگنا ہے ترے انتظار میں
آئی ہو جس کو نیند وہ سوئے مزار میں

ستم زدوں پہ گراں تھی ہوا زمانے کی
جھکی تو پھر نہ اُٹھی شاخ آشیانے کی

فانی بدایونی (وفات ۲۶ ,اگست ۱۹۴۱ء)

فاؔنی بدایونی

میں ۱۳ ستمبر سنہ ۱۸۷۹ء کو دنیا میں لایا گیا۔ اب تک کہ دسمبر سنہ ۴۰ء ہے زندہ سمجھا جاتا ہوں۔ نسلاً پٹھان ہوں اصلی وطن کابل ہے۔ اس طرح کہ شاہ عالم بادشاہ دہلی کے زمانے میں میرے مورث اعلیٰ اصالت خاں نامی ہندوستان آئے دربار دہلی نے انھیں اور اُن کے جانشینوں کو بہت کچھ نوازا۔ ممتاز عہدوں پر فایز کئے جانے کے علاوہ جاگیرات خطابات منصب وغیرہ سے سرفراز کئے گئے۔ نواب بشارت خاں مرحوم جو میرے پردادا تھے صوبہ بدایوں کے گورنر تھے۔ تقریباً دو سو مواضعات پر ان کی جاگیر مشتمل تھی مگر زمانے کے انقلاب نے رفتہ رفتہ یہ نوبت پہونچا دی کہ میرے والد محمد شجاعت علی خاں صاحب جو مورث اعلےٰ سے چھٹی پشت میں تھے پولیس کی ملازمت اختیار کرنے پر مجبور ہوگئے تھے چنانچہ قلیل آمدنی کے سہارے پر مرحوم نے اپنی ساری زندگی شرافت دیانت غیرت اور جرأت کے ساتھ گزار دی۔ میری جوان لڑکی نے سنہ ۳۳ء میں انتقال کیا۔ میرے دو لڑکے سعادت علی خاں اور وجاہت علی خاں کے نام سے موسوم ہیں۔ مذہباً میں حنفی ہوں۔

میں نے سنہ ۱۹۰۱ء میں بی۔ اے اور سنہ ۱۹۰۶ء میں ال۔ ال۔ بی کی ڈگری حاصل کی۔ سنہ ۲۲ء تک لکھنؤ میں اور اس کے بعد سنہ ۳۲ء تک آگرہ میں پیشہ وکالت ذریعہ معاش رہا۔ کچھ سال بدایوں اور بریلی میں بھی وکالت کرتا رہا۔ سنہ ۳۲ء سے سنہ ۳۹ء تک حیدرآباد دکن میں صدر مدرس رہا۔ سنہ ۳۹ء کے بعد سے اب تک بیکار ہوں۔ آیندہ کیا ہوگا معلوم نہیں۔ مختصراً ننگ خاندان بھی ہوں اور بار زمین بھی۔ میری ہستی کسی اور کے لئے تو کیا مفید ہوتی۔ خود میرے لئے نہیں۔

میری موجودہ تصنیفات دیوان فاؔنی مطبوعہ نقیب پریس بدایوں سنہ ۲۰ء۔ باقیات فاؔنی مطبوعہ آگرہ اخبار پریس آگرہ سنہ ۲۶ء اور عرفانیات فاؔنی مطبوعہ لطیفی پریس دہلی سنہ ۳۹ء ہیں۔ باقی تصانیف تلف ہوگئیں۔

فاؔنی

اب تک تری گلی میں یہ رسوائیاں نہ تھیں،
اب تک تو اس زمیں پہ کوئی آسماں نہ تھا

ہر شاخ ہر شجر سے نہ تھی بجلیوں کو لاگ
ہر شاخ ہر شجر پہ مرا آشیاں نہ تھا

اللہ رے بے نیازیِ آدابِ التفات
دیکھا مجھے تو پاسِ نظر درمیاں نہ تھا

تو نے کرم کیا تو بہ عنوانِ رنجِ زیست
غم بھی مجھے دیا تو غمِ جاوداں نہ تھا

مفت دو عالم ہے وہ تیرِ نگاہ — جو مری شامت سے خطا ہو گیا،

آ گئی ہے ترے بیمار کے منھ پر رونق — جان گیا جسم سے نکلی کوئی ارماں نکلا،

رسم خودداری سے گو واقف نہ تھی دنیائے عشق — پھر بھی اپنا زخم دل شرمندۂ مرہم نہ تھا،

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا — زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا،

حسن ہے ذات مری عشق صفت ہے میری — ہوں تو میں شمع مگر بھیس ہے پروانے کا

مذاق تلخ پسندی نہ پوچھ اُس دل کا — بغیر مرگ جسے زیست کا مزا نہ ملا،

مری حیات ہے محروم مدعائے حیات — وہ رہگزر ہوں جسے کوئی نقشِ پا نہ ملا،

یوں سب کو بھلا دے کہ تجھے کوئی نہ بھولے — دُنیا ہی میں رہنا ہے تو دُنیا سے گزر جا

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول — تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دُکھا ہوا،

کیا کیا گلے نہ تھے کہ ادھر دیکھتے نہیں، — دیکھا تو کوئی دیکھنے والا نہیں رہا

کچھ بھی ہوں برق و باراں ہم تو یہ جانتے ہیں، — اک بے قرار تڑپا اک دل فگار رو دیا

ایک عالم کو دیکھتا ہوں میں، — یہ ترا دھیان ہے مجسّم کیا

فرصتِ رنج اسیری دی نہ ان دھڑکوں نے ہائے — اب چھُری صیاد نے لی اب قفس کا در کھُلا

منزلِ عشق پہ تنہا پہونچے کوئی تمنا ساتھ نہ تھی — تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

دل پہ جو نگاہیں تھیں رفتہ رفتہ آہیں تھیں، — عشق بن گیا آخر حُسن جلوہ ساز اُن کا

رفتۂ نظر ہو جا سب سے بے خبر ہو جا — کھُل گیا ہے راز اپنا کھل نہ جائے راز اُن کا

میرے سوا تھے اور جو پردے سارے کے سارے چاک ہوئے — یہ بھی اگر اللہ نے چاہا اب کوئی دن میں چاک ہوا

فریب جلوہ اور کتنا مکمل اسے معاذ اللہ — بڑی مشکل سے دل کو بزم عالم سے اُٹھا پایا

وحشت بقید چاک گریباں روا نہیں — دیوانہ تھا جو معتقد اہلِ ہوش تھا

ہائے کیا دن ہیں کہ نقش سجدہ ہے اور سر نہیں — یاد ہیں وہ دن کہ سر تھا اور وبالِ دوش تھا

عشق کی دنیا زمیں سے آسماں تک شوق تھی — تھا جو کچھ ترے سوا آغوش ہی آغوش تھا

بھڑک کے شعلۂ گل تو ہی اب لگا دے آگ — کہ بجلیوں کو مرا آشیاں نہیں ملتا

غیرت ہو تو غم کی جستجو کر — ہمت ہو تو بے قرار ہو جا

ملا ازل میں مجھے اپنی زندگی کے عوض، — وہ ایک لمحۂ ہستی کو صرف خواب ہوا

بوئے خزاں سے مست ہیں یاد ہمیں بہار کیا — ہم تو چمن پرست ہیں پھول کہاں کے خار کیا

اپنے کمال شوق پر حشر کا دن ہے منحصر
وعدۂ دید چاہیئے زحمت انتظار کیا

سن کے ترا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی
آج ترا نام لیکر کوئی غافل ہو گیا

کیا سوال تو آواز بازگشت آئی،
جواب مجھ سے طلب ہے مرے سوالوں کا

نگہ قہر خاص ہے مجھ پر
یہ تو احساں ہوا ستم نہ ہوا

اب کرم ہے تو یہ گلہ ہے مجھے
کہ مجھی پر ترا کرم نہ ہوا

گل میں وہ اب نہیں ہے جو عالم تھا خار کا
اللہ کیا ہوا وہ زمانہ بہار کا

تنکوں سے کھیلتے ہی رہے آشیاں میں ہم
آیا بھی اور گیا بھی زمانہ بہار کا

گھر خیر سے تقدیر نے ویرانہ بنایا
سامان جنوں مجھ سے فراہم نہ ہوا تھا

الہی یہ تم جب آئے تو آئی وہ موت بھی
جس موت کے لئے مجھے جینا ضرور تھا

تھی اُن کے روبرو بھی وہی شانِ اضطراب
دل کو بھی اپنی وضع پہ کتنا غرور تھا

آئینہ اب نہیں دیکھا جاتا،
میں بعنوان دگر یاد آیا

اُس کو بھولے تو ہوئے ہو فانی
کیا کروگے وہ اگر یاد آیا

باخبر ہیں وہ سب کی حالت سے
لاؤ ہم پوچھ لیں نہ حال اپنا

لنگر کا آسرا ہے نہ تائید ناخدا
میرے سپرد ہے مری کشتی خدا کے بعد

اللہ رے اعتماد محبت کہ آج تک
ہر درد کی دوا ہیں وہ اچھا کئے بغیر

ممکن نہیں ہے راحتِ دُنیا کی آرزو
غم پر گمان راحتِ دُنیا کئے بغیر

تا عرض شوق میں نہ رہے بندگی کی لاگ
اک سجدہ چاہتا ہوں ترے آستاں سے دور

نگاہیں ڈھونڈتی ہیں دوستوں کو اور نہیں پاتیں
نظر اُٹھتی ہے اب جس دوست پر پڑتی ہے دشمن پر

کھُل گیا میری زندگی کا راز
اے شبِ ہجر تیری عمر دراز

مست کو چاہیئے بلا کا ہوش،
خُم دئے اور دیا نہ اذن خروش

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا
بات پہونچی تری جوانی تک

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

یہ زندگی کی ہے روداد مختصر فانی
وجود درد مسلم علاج نا معلوم

وہ ہے مختار سزا دے کہ جزا دے فانی
دو گھڑی ہوش میں آنے کے گنہگار ہیں ہم

جئے جانے کی تہمت کس سے اُٹھتی کس طرح اُٹھتی
ترے غم نے بچائی زندگی کی آبرو برسوں،

بہلا نہ دل نہ تیرگی شامِ غم گئی
یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

کس زعم میں ہوائے رہرو غم دھوکے میں نہ آنا منزل کے
یہ راہ بہت کچھ چھانی ہے اس راہ میں منزل کوئی نہ

ہاں اسے یقین وعدہ دامن ترا نہ چھوٹے
یہ آسرا نہ ٹوٹے وہ آئیں یا نہ آئیں

میری نظروں میں تو بے واسطۂ دید ہے تو
میں بہ عنوان تجلّی بھی تجھے یاد نہ

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں
ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

دل میں آتے ہوئے شرماتے ہیں،
اپنے جلووں میں چھپے جاتے ہیں،

نامہربانیوں کا گلہ تم سے کیا کریں
ہم بھی کچھ اپنے حال پہ اب مہرباں نہیں

تسکین عجیب چاہتا ہوں
دشمن کا نصیب چاہتا ہوں

تم دل میں بھی رہ کے دور سے ہو،
کچھ اور قریب چاہتا ہوں

غم بھی گزشتنی ہے خوشی بھی گزشتنی
کر غم کو اختیار کہ گزرے تو غم نہ

بہار لائی ہے پیغام انقلاب بہار
سمجھ رہا ہوں میں کلیوں کے مسکرانے

زمانہ بر سر آزار تھا گراں جانی
تڑپ کے ہم نے بھی تڑپا دیا زمانے

کافر صورت دیکھ کے منھ سے آہ نکل ہی جاتی ہے
کہتے کیا ہو اب کوئی اللہ کا یوں بھی نام نہ

اک برق سر طور ہے لہرائی ہوئی سی
دیکھوں ترے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی

درپیش ہے پھر مسئلۂ طاقت دیدار
پھر کچھ نگہ شوق ہے گھبرائی ہوئی سے

اک عالم دل ہے یہی دنیا یہی فردوس
ہر شے نظر آتی ہے نظر آئی ہوئی سی

گو نہیں جز ترک حسرت درد ہستی کا علاج
آہ وہ بیمار جو آزردۂ پرہیز سے

عہد خرد میں عشق کی رسوائیاں نہ پوچھ
آنے لگی ہے ذکر وفا سے حیا مجھے

اس کے سوا نہیں خبر آشیاں مجھے
میں تھا اسیر دام تو بجلی چمن میں تھ

یارب نوائے دل سے تو کان آشنا سے ہیں
آواز آ رہی ہے یہ کب کی سنی ہو

خالی ہے بزم ذوق طلب اہل ہوش سے
اتنا نہیں کہ تیری تمنا کرے کوئی

خفا نہ ہو تو یہ پوچھوں کہ تیری جان سے دور
جو تیرے ہجر میں جیتا ہے مر بھی سکتا ہے

ترک تدبیر کو بھی دیکھ لیا
یہ بھی تدبیر کارگر نہ ہوئی

یوں ملی ہر نگاہ سے وہ نگاہ
ایک کی ایک کو خبر نہ ہوئی

آج تسکین درد دل فانی
وہ بھی چاہا کئے مگر نہ ہوئی

اُن کے تو دل سے نقش کدورت بھی مٹ گیا — ہم شاد ہیں کہ دل میں کدورت نہیں رہی
فانی امیدِ مرگ نے بھی دیدیا جواب — جینے کی ہجر میں کوئی صورت نہیں رہی

آمادۂ فریاد رسی ہے وہ ستمگر — فریاد کہ اب طاقتِ فریاد نہیں ہے

تعمیرِ آشیاں کی ہوس کا ہے نام برق — جب ہم نے کوئی شاخ چُنی شاخ جل گئی

طبیعت رفتہ رفتہ غم کی خوگر ہوتی جاتی ہے — جفا کم کر جفا اب روح پرور ہوتی جاتی ہے

سرکار پاسِ وضعِ جفا چاہتا ہوں میں — یہ بھی اگر وفا ہے تو اچھا نہ کیجئے،

نہیں معلوم راہِ شوق میں ہے بھی کوئی منزل — جہاں تھک کر نظر ٹھہرے وہیں معلوم ہوتی ہے

زندگی خود کیا ہے فانی یہ تو کیا کہئے مگر، — موت کہتے ہیں جسے وہ زندگی کا ہوش ہے

اک بوند لہو کی ہے تو یہ حال ہے دل کا — وہ موجِ تبسم کہیں دریا نہ بنا دے

دل کے ظرف کو دیکھو نہ طور کو دیکھو، — بلا کی دُھن ہے تمہیں بجلیاں گرانے کی

کل تک جو تم سے کہہ نہ سکا حالِ اضطراب — ملتی ہے آج اُس کی خبر اضطراب سے

مدعا ہے کہ مدعا نہ کہوں، — پوچھتے ہیں کہ مدعا کیا ہے

دُشمنِ جاں تھے تو جانِ مدعا کیوں ہو گئے، — تم کسی کی زندگی کا آسرا کیوں ہو گئے

اچھا یقیں نہیں ہے تو کشتی ڈبو کے دیکھ — اک تو ہی ناخدا نہیں ظالم خدا بھی ہے

وہم و قیاس کے سوا حاصلِ ہوش کچھ نہیں. — فہم کی انتہا ہے وہم عقل کی حد قیاس ہے

زندگی یادِ دوست ہے یعنی، — زندگی ہے تو غم میں گزرے گی

آپ نے عہد کیا ہے مری غمخواری کا — اب اجازت ہو تو یہ عہد، مجھے یاد رہے

مر کے ٹوٹا ہے کہیں سلسلۂ قیدِ حیات — مگر اتنا ہے کہ زنجیر بدل جاتی ہے

آبادی بھی دیکھی ہے ویرانے بھی دیکھے ہیں — جو اُجڑے اور پھر نہ بسے دل وہ نرالی بستی ہے

ہم کہاں اور نگاہِ شوق کہاں، — وہ بھی تیری نگاہ ہوتی ہے

کچھ نظر کہہ گئی زباں نہ کھلی — بات اُن سے ہوئی مگر نہ ہوئی

شیوۂ عاشقی نہیں ہجر میں آرزوئے مرگ — ہاں نہیں زندگی عزیز موت ہی زندگی سہی

بساطِ عجز میں اک آہ تھی متاعِ حیات — سو وہ بھی صرفِ ستم ہائے روزگار ہوئی

جینے بھی نہیں دیتے مرنے بھی نہیں دیتے — کیا تم نے محبت کی ہر رسم اُٹھا ڈالی

بچھ گئے راہِ یار میں کانٹے — کس کو عذرِ برہنہ پائی ہے

ترکِ امید بس کی بات نہیں
ورنہ امید کب بر آئی ہے

اک فسانہ سُن گئے اک کہہ گئے
میں جو رویا مسکرا کر رہ گئے

کچھ کھیل نہ تھا یوں بھی پروانے کا جل بجھنا،
جل کر نہ بجھے ایسے پروانے کو کیا کہیے

موجوں کی سیاست سے مایوس نہ ہو فانی
گرداب کی ہر تہ میں ساحل نظر آتا ہے

محشر میں جبرِ دوست سے طالب ہوں داد کا
آیا ہوں اختیار کی تہمت لئے ہوئے

پھولوں سے تعلق تو اب بھی ہے مگر اتنا
جب ذکرِ بہار آیا سمجھے کہ بہار آئی

میں نے فانی ڈوبتے دیکھی ہے نبضِ کائنات
جب مزاجِ دوست کچھ برہم نظر آیا مجھے

ہاں ناخنِ غم کمی نہ کرنا،
ڈرتا ہوں کہ زخمِ دل نہ بھر جائے

کر خوئے جفا نہ یک بیک ترک
کیا جانئے مجھ پہ کیا گزر جائے

زباں کٹتی ہے ذکرِ آشیاں پر
تمنا بھی بہت تھی آشیاں کی

وہ ہم سے کہاں چھپتے ہم خود ہیں جواب اُنکا
محمل میں جو چھپتے ہیں چھپتے نہیں محمل سے

ہر راہ سے گزر کر دل کی طرف چلا ہوں
کیا ہو جو اُن کے گھر کی یہ راہ بھی نہ نکلے

شکوہ نہ کر فغاں کا وہ دن خدا نہ لائے
تیری جفا پہ دل سے جب آہ بھی نہ نکلے

لو تبسم بھی شریکِ نگہِ ناز ہوا
آج کچھ اور بڑھا دی گئی قیمت میری

دو گھڑی کے لئے میزانِ عدالت ٹھیرے
کچھ مجھے حشر میں کہنا ہے خدا سے پہلے

کچھ ادائیں ہیں جنھیں قتلِ عبث سے منظور
کچھ سزائیں ہیں جو ملتی ہیں خطا سے پہلے

وہ میری لاش پہ تہمت سی کچھ اُٹھا کے چلے،
مجھے قرار سے دیکھا تو مسکرا کے چلے

کرم کیا تو باندازۂ تبسّمِ برق،
وہ کچھ خیال میں آئے ہی تھے کہ آ کے چلے

گُل دئے تھے تو کاش فصلِ بہار
تو نے کانٹے بھی چُن لئے ہوتے

سوالِ دید پہ تیوری چڑھائی جاتی ہے
مجالِ دید پہ بجلی گرائی جاتی ہے

مرے قیاس کو اپنی تلاش میں کھو کر،
مرے حواس کو دُنیا دکھائی جاتی ہے

چونک پڑتے ہیں ذکرِ فانی سے
نیند اُچٹتی ہے اس کہانی سے

بے ذوقِ نظر بزمِ تماشا نہ رہے گی
منہ پھیر لیا ہم نے تو دُنیا نہ رہے گی

پچھتائیں گے آپ دل کو لیکر
کم بخت غم آشنا بہت ہے

تو کہاں ہے کہ تری راہ میں یہ کعبہ و دیر
نقش بن جاتے ہیں منزل نہیں ہونے پاتے

زندگی کی دوسری کروٹ تھی موت — زندگی کروٹ بدل کر رہ گئی،

کیا بلا تھی ادائے پرسشِ یار — مجھ سے اظہارِ مدعا نہ ہوا

ترے فراق میں حالت تباہ سی ہے تباہ — نہ دل پہ ہاتھ نہ اب سوئے آسماں ہے نگاہ

رسمِ بیداد دوست عام ہوئی — تھی زیست بھی حرام ہوئی

گو بستی تھی خواب پریشاں نیند کچھ ایسی گہری تھی، — چونک اُٹھتے تھے ہم گھبرا کر پھر بھی آنکھ نہ کھلتی تھی

رودادِ مرگ و زیست ہے یہ قصۂ مختصر — مجبور زندگی کو بھی جینا محال ہے

مطلب ہے ضبطِ عشق سے تاثیرِ دردِ عشق — اخفائے حال سے غرضِ افشائے حال ہے

کس کو یہاں امید اثر ہم دل کو سمجھا لیتے ہیں — حال دل اس سے یوں کہتے ہیں گویا اک افسانہ ہے

کرم بے حساب چاہا تھا — ستم بے حساب میں گزری

کچھ کٹی ہمت سوال میں عمر — کچھ امید جواب میں گزری

وعدے کے یہ تیور ہیں کہہ دوں کہ یقیں آیا — اب اُن سے کوئی کیونکر کہہ دے کہ نہیں آیا

جھوٹ ہی سہی وعدہ کیوں یقیں نہ کر لیتے — بات دلفریب اُن کی دل امیدوار اپنا

طولِ رودادِ غم معاذ اللہ — عمر گزری ہے مختصر کرتے

اب نہ کانٹوں ہی سے کچھ لاگ نہ پھولوں سے لگاؤ — ہم نے دیکھا ہے تماشا تری رعنائی کا

مزاجِ دہر میں اُن کا اشارہ پائے جا — جو ہو سکے تو بہر حال مسکرائے جا

یہ تو برے آثار ہیں فانیؔ غم ہو خوشی ہو کچھ تو ہو — دل کا یہ کیا حال ہوا مغموم نہیں مسرور نہیں

یاد ہے وہ نومیدی میں ہلکی سی جھلک امیدوں کی — ہائے وہ دل کے ویرانے پر دھوکا سا آبادی کا

یاس و امید سے کام نہ نکلا دل کی تمنا دل میں رہی — ترک تمنا کر نہ سکے اظہار تمنا ہو نہ سکا،

ہائے وہ پہلی نظروں میں ہر موج کا ساحل بن جانا — بحرِ بے پایاں محبت کی پایابی کیا کہئے،

اگلے برس کے پھولوں کا کیا حشر انھیں معلوم نہیں — کلیوں کا یہ طرزِ تبسم یہ شادابی کیا کہئے،

دل کی جو حقیقت ہو کیا کہئے حسن بھی دل ہے عشق بھی دل — ہر شمع جلائے جاتی ہے پردے میں کسی پروانے کے

حرفِ تمنا بے معنی سا نقشِ وفا سو دھندلا سا، — دل کی حقیقت کچھ بھی نہیں ہے دل کی حقیقت کیا کہئے

حشر بھی گزرا حشر میں بھی یہ سوچ کے ہم نے کچھ نہ کہا — غم کی حکایت کون سنے گا غم کی حکایت کیا کہئے

کیا عمر میں اک آہ بھی بخشی نہیں جاتی — اک سانس بھی کیا آپ کے ناکام نہ لیتے

زندگی ہے دلوں پہ تہمت تھی — مر نہ جاتے اگر جئے ہوتے

فراق گورکھپوری (وفات ۳ مارچ ۱۹۸۲ء)

جہاں میں تھی فقط افواہ تیرے جلووں کی
چراغ دیر و حرم جھلملائے ہیں کیا کیا

غم حیات وہی دور کائنات وہی
جو زندگی نہ بدل دے وہ زندگی کیا ہے
تو حسن عشق کا آغاز ہے میں ہوں انجام
یہ سلسلہ تو بہت دور تک پہونچتا ہے

کسی کا کون رہا یوں تو عمر بھر پھر بھی
یہ حسن و عشق تو دھوکا ہی سب مگر پھر بھی
ہزار بار ادھر سے زمانہ گزرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگذر پھر بھی

آج کچھ عشق چونک اٹھا
آج تو بول اٹھے ہیں سمجھانے

میں جب پڑھتا تھا وہ اشعار جن میں تھا بیاں تیرا
نمایاں تھا ترے چہرے پہ اک جذبہ رقابت کا

غرض کہ کاٹ دیئے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

کہاں ہر ایک سے بار نشاط اٹھتا ہے
بلائیں یہ بھی محبت کے سر گئی ہوں گی

کچھ گراں ہو چلا ہی بار نشاط
آج دکھتے ہیں حسن کے شانے

رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری
بمقام رامپور - ۱۱ مئی سنہ ۱۹۲۱ء
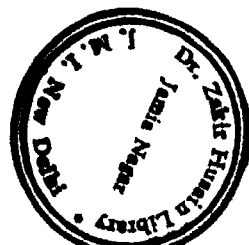
فراق گورکھپوری

سنہ ۱۸۹۶ء میں شہر گورکھپور میں پیدا ہوا۔ یہ سری واستو کایستھوں کا خاندان پورے چار سو برس سے ضلع گورکھپور میں آباد ہے میرے بزرگوں کو پانچ گاؤں شیر شاہ کے دئے ہوئے اسی ضلع میں آباد ہیں اور ہم لوگ پنچگاواں کے کایستھ کہلاتے ہیں۔ میرے والد منشی گورکھ پرشاد عبرت چوٹی کے وکیلوں میں تھے اور ان کا نام حالی اور آزاد کے ساتھ ساتھ جدید اُردو شاعری کی تاریخ میں لیا جاتا تھا۔ میری تعلیم گھر پر شروع ہوئی۔ والد مرحوم کی تعلیم تو عربی اور فارسی کے باقاعدہ اکتساب سے شروع ہوئی تھی اور جب ان زبانوں میں دسترس ہوگئی تب وہ انگریزی اور وکالت کی طرف مائل ہوئے لیکن اب زمانہ بدل چکا تھا، اُردو کی دو تین کتابیں ختم کرنے کے بعد ہی انگریزی کی باقاعدہ تعلیم شروع ہوگئی۔ ایف۔اے کا امتحان فارسی کے ساتھ دیا لیکن بی۔اے میں فارسی چھوڑ دی۔ غرضکہ جہاں تک اسکول اور کالج کے باقاعدہ یا بے قاعدہ تعلیم کا تعلق ہے انگریزی زبان اور مغربی علوم ہی کو اہمیت رہی۔ مگر دل و دماغ کی تہیں اور گہرائیاں انگریزی زبان اور مغربی علوم سے کب آسودہ ہوسکتی تھیں۔ جب تک کوئی حقیقت، شعر و نغمہ یا حُسن کی شکل میں شعور میں نہ اتر جائے مجھے تشفی نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے انگریزی تعلیم تو زندگی کے اسٹیج کا ایک پردہ تھا، باوجود اپنے تمام آب و تاب کے۔ پس پردہ جو محرکات کارگر تھے انھیں کوئی اور الفاظ ہاتھ نہ آنے کی وجہ سے حُسن و عشق ہی کہہ لیجئے۔ بچپن ہی سے خوش قسمتی یا بدقسمتی سے طبیعت بہت حساس تھی اپنے ہم عمروں اور ہم جماعتوں میں سات ہی آٹھ سال کی عمر سے جس سے یگانگت یا دوستی ہوگئی اسے اُٹھا کر کلیجے میں رکھ لینے کا جی چاہتا تھا۔ گانے اور نغمے اسی عمر سے اس طرح متاثر کرتے تھے کہ ان گونگی کیفیتوں کی یاد سے اب بھی گھبرا جاتا ہوں ایک بچے کے نرم قویٰ، شدید تاثرات کے آسانی سے حامل نہیں ہوسکتے۔ سورداس کے نغمے اور دیگر ہندی نغمے تلسی داس کی رامائن کا ترنم خاص طور سے متاثر کرتے رہے جو اُردو اشعار یا نظمیں درسی کتابوں یا دوسری کتابوں میں یا لوگوں کی زبانی سننے کے موقعے ملتے تھے وہ بہت کچھ تو خشک اور کرخت اور بے رس چیزیں معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن ان میں جو اشعار مترنم ہوتے تھے وہ دلمیں ڈوب جاتے تھے اور چونکہ ہماری روز مرہ کی بولی میں ہوتے تھے اس لئے ایسے اشعار کا اثر بہت ہوتا تھا۔ کچھ نظمیں اور غزلیں والد مرحوم کی بچپن ہی سے ورد زبان رہتی تھیں اور کچھ دوسروں کی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ کہانیاں وہ واقعے وہ مناظر بہت متاثر کرتے تھے جن میں میری بچپن کی ذہنیت کوئی بات پاتی تھی۔ انسانی حُسن کا اثر تو یہ ہوتا تھا کہ بیک وقت

موت اور زندگی کا گویا سامنا ہو جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ غصہ اور نفرت بھی کچھ لوگوں سے اور کچھ باتوں سے میرے لئے ناقابلِ برداشت اور بے مغز چیزیں تھیں جتنی شدید محبت تھی اتنی ہی شدید نفرت بھی یا جتنا تیز حُسن کا احساس تھا اتنا ہی تیز قبح کا احساس تھا۔ مگر بہ حیثیت مجموعی حیات اور کائنات کے لئے ہم آہنگی محبت و احترام کے جذبے اور تحیر کی کیفیت میری زندگی اور میرے وجدان کے خاص عناصر تھے۔ ان کے تصور سے گویا میری آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے اور اسی مرکزی مستقل جذبے کی تشفی مغربی علوم سے نثر کی کتابوں سے اور تمام دیگر ذرایع سے ہوتی رہی۔ گھبراہٹ اور بے صبری اور تنہائی کا احساس بھی شروع ہی سے اتنا تیز تھا کہ اب تک فیصلہ نہ کر سکا کہ اس کو کیا کہوں۔ قریب قریب پینتیس برس کے مجموعی تاثرات شاید میرے ان دو چار اشعار میں کچھ ظاہر ہو گئے ہوں:

اسی دل کی قسمت میں تنہائیاں تھیں	کبھی جس نے اپنا پرایا نہ جانا
ہزار غم ہو نہیں چاہتا کوئی لیکن	کہ اس کے بدلے کوئی اور زندگی ہوتی
اسے ساکنانِ دہر یہ کیا اضطراب ہے	اتنا کہاں خراب جہانِ خراب ہے
ترک محبت کرنے والو کون بڑا جگ جیت لیا	عشق سے پہلے کے دن سوچو کون ایسا سکھ ہوتا تھا

بہر حال یہ سب باتیں پسِ پردہ ہوتی رہیں اور رسمی تعلیم جاری رہی اور دبے پاؤں زندگی نما موت یعنی جوانی بھی آگئی۔ شادی بھی ہو گئی اور ازدواجی زندگی اتنی ناخوشگوار ثابت ہوئی کہ میں یہ کہہ نہیں سکتا کہ اس نے مجھے بگاڑ دیا یا بنا دیا شاید دونوں حالتوں میں زیادہ فرق نہیں۔ اس کے بعد بی۔ اے ہوئے، نوکر ہوئے (لیکن ابھی) پنشن (نہیں) ملی اور (نہ ابھی) مرگئے۔ بی۔ اے کے امتحان کے بعد ہی والد مرحوم کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور غمِ روزگار کا بار سر پر پڑ گیا۔ ڈپٹی کلکٹری کی ملازمت اور یونیورسٹی کی پروفیسری بی۔ اے کے بعد ہی مل گئی تھی اور آئی سی ایس کے لئے گورنر نے نامزد کر دیا تھا لیکن ازدواجی زندگی کی تلخی نے اتنا بیدل کر دیا تھا کہ حبِ وطن یا جھوٹی سچی خدمتِ وطن میں پناہ لینا چاہی۔ تمام ملازمتوں سے انکار کر کے کانگریس میں شامل ہو گیا اور قیدِ فرنگ کی سیر بھی کی۔ یہ ۱۹۲۲ء تک کا ذکر ہے اس کے بعد لکھنؤ کرسچین کالج میں، پھر کانپور سناتن دھرم کالج اور اب الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کا لکچرار ہوں۔ بدنصیبوں میں تقدیر کی یہ بھی ستم ظریفی ذرا قابلِ ذکر ہے کہ ہر امتحان میں چوٹی کی کامیابی حاصل ہوتی رہی۔ لیکن خوش ہونے کی نوبت نہیں آتی تھی۔ مجھے زیادہ خوش وہ ہوتے تھے جو صرف تھرڈ ڈویژن میں کامیاب ہوتے رہے۔ میرے لئے آج تک کامیابی اور خوشی ایک چیز نہ ہو سکیں۔

اچھا اب لگے ہاتھوں اپنی شاعری کے بارے میں کچھ گزارش کر دوں۔ جی تو بچپن ہی سے شعر کہنے کو چاہتا تھا لیکن بچپن کی صلاحیتیں یہ بار برداشت نہ کر سکتی تھیں میرے والد امیر مینائی کی شاعری سے متاثر تھے لیکن میرے پھوپھی زاد بھائی منشی راج کشور لال سحر جو مجھ سے محبت کرتے تھے امیر مینائی کی شاعری کے بہت دلدادہ تھے۔ اب میں جو غور کرتا ہوں تو بچپن سے امیر مینائی کی شاعری سے لگاؤ کا یہ سبب پاتا ہوں کہ امیر کے کلام میں۔ ان کی لے میں ٹھہراؤ اور بہاؤ کا ایک ایسا

امتزاج ہے جو غیر شعوری طور پر مجھے اس سے ہم آہنگ کر دیتا تھا۔ شاید اثر ان کے کلام میں غیر شعوری طور پر مصحفی کے کلام کے مطالعہ سے پیدا ہو گیا ہے۔ بہرحال خود تو شعر کہنے کے لئے جھک مارا کرتا تھا اور ایک مصرع بھی مجھ سے نہ ہوتا تھا۔ لیکن بی۔ اے کلاس تک امیر مینائی ہی کی شاعری اور لب ولہجہ یا یوں کہئے کہ ان کے اشعار میں جو آواز تحت الشعر تھی، اسی سے متاثر ہوتا رہا۔ پھر عزیز لکھنوی۔ شاد عظیم آبادی اور ناصری مرحوم کی صحبت کے اثر سے میر۔ درد۔ غالب کی ادائیں میرے دل میں اُترتی گئیں۔ حسرت۔ اصغر۔ یگانہ۔ اقبال کے کلام سے بھی فیضیاب ہوتا رہا ہوں۔ اور فارسی شعراء سے بھی۔ ساتھ ہی ساتھ انگریزی ادب کو بھی اپنے اندر یوں تحلیل کرتا رہا کہ اس کی آواز اپنی آواز میں ڈھلتی جائے۔ جب کہیں جا کر بی۔ اے میں پہلی غزل کہی۔ یہ سنہ ۱۹۱۶ء کی بات ہے۔ دو چار غزلیں ناصری مرحوم نے دیکھیں بعد کو دو چار غزلیں حضرت وسیم خیرآبادی کو دکھائیں۔ پھر کسی سے اصلاح کی نوبت نہ آئی۔ بلکہ شاعروں کے بدلے مجنوں گورکھپوری۔ پریم چند آنجہانی اور حضرت نیاز فتحپوری نثر نگار حضرات کی صحبتوں کا زیادہ اثر میری ادبی زندگی پر رہا۔ ہاں جوانی اور تنہائی اور گناہ عشق کا بھی ساتھ رہا اور اس کے جو نتائج ہو سکتے تھے وہ بھی ہوتے رہے۔ سچ پوچھئے تو شعر کہنے کا شروع میں تو ممکن ہے شوق ہی رہا ہو۔ لیکن جب سے جوان ہو کر زندگی کی تلخیوں کو یعنی ہوئے گھونٹ کو شیر و شکر کر کے اُتارنا پڑا تب سے شاعری گویا زندگی کی تلاش کا ایک ذریعہ بن گئی۔ شاید زندگی کو شعر میں تحلیل کرنا اور شعر کو زندگی کا آئینہ بنانا مقصدِ زندگی ہو۔ کون جانے۔

میرے چند احباب شروع ہی سے میری شاعری کی ایک خصوصیت اتحاد اور اجتماع ضدین اور (Paradox) بتاتے ہیں۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ نفرت و محبت حسن و قبح کا شدید ترین احساس کرتے ہوئے حیات اور کائنات پر میرا ایمان قایم رہا۔ کفر اور ایمان دونوں لحاظ سے وحدت وجود کا قایل رہا۔ پھر تلخی ناکامی حسرتوں کا خون ہونا اور جدلیت پذیر وحدت کا احساس اتحاد ضدین (reconciliation of opposites) کی صفت میرے وجدان اور میری شاعری میں کیوں نہ پیدا کر دیتی۔ مجھے تو زخم ہی کا مرہم بنانا تھا۔ پھر کیا کرتا۔ اگر درد بھری آواز میں سکون نہیں تو وہ نغمہ کہاں، چیخ ہو گئی۔ میں شاعری میں لہجہ کو سب سے ضروری چیز سمجھتا ہوں۔ اسی لہجہ میں شاعر کی شخصیت چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ شاعری تمام عالم کے دُکھ درد کے احساس کو بغیر کم کئے ہوئے اگر اس میں نرمی اور جزو برکت سمو سکے تو اس میں قوتِ شفا (Healing Power) آجاتی ہے اور شاید یہی چیز شاعری کو عظمت دے سکتی ہے

رگھوپتی سہائے فراق

ـ فسوں ساماں نگاہِ آشنا کی دیر تھی — اس بھری دُنیا میں ہم تنہا نظر آنے لگے

تیرے چھونے سے بھی دُکھے جو — کون اُس دل کی پھانس نکالے

ات ہو کہ اجل سب سے کام لے غافل — کہ مختصر بھی ہے کارِ جہاں دراز بھی ہے

تو نے بھرم غمِ عشق کے کھوئے
اے غمِ دوراں اے غمِ دوراں

یونہی فراق نے عمر بسر کی،
کچھ غمِ جاناں کچھ غمِ دوراں

تھی یوں تو شامِ ہجر مگر پچھلی رات کو
وہ درد اُٹھا فراق کہ میں مسکرا دیا

اب دورِ آسماں ہے نہ دورِ حیات ہے
اے دردِ ہجر تو ہی بتا کتنی رات ہے،

کچھ نہیں کہتیں وہ نگاہیں مگر
بات پہونچتی ہے کہاں سے کہاں

وقات دل کے ساتھ بارِ غم اُٹھانے میں
سُنا ہے حُسن بھی اپنی نزاکت بھول جاتا ہے

اں ہر ایک سے بارِ نشاط اُٹھتا ہے
بلائیں یہ بھی محبت کے سر گئی ہوں گی

کچھ گراں ہو چلا ہے بارِ نشاط
آج دیکھتے ہیں حُسن کے شانے

پھر دل پہ ہے نگاہ کسی کی رُکی رُکی،
کچھ جیسے کوئی یاد دلاتا ہو آج پھر

سنگ و آہن بے نیازِ غم نہیں،
دیکھ ہر دیوار و در سے سر نہ مار

تری یاد کرتا ہوں اور سوچتا ہوں
محبت سے شاید تجھے بھول جانا

اسی دل کی قسمت میں تنہائیاں تھیں
کبھی جس نے اپنا پرایا نہ جانا

عشق میں صبر و قرار بھی آئے
تم بھی جو آ جاتے اچھا تھا

یار کب تک یہ فریبِ ہمت افزائی
یہیں تک عشق مشکل تھا یہیں سے عشق آساں ہو

، میں تھی فقط افواہ تیرے جلووں کی،
چراغِ دیر و حرم جھلملائے ہیں کیا کیا

بھ کر رہگذارِ جستجو میں رکھ قدم،
اس کا پانا سہل اس کا ڈھونڈھنا دشوار ہے

، نازک ہے اسے کیونکر بیاں کیجئے فراق
صبح کرنا سہل شب کا کاٹنا دشوار ہے!!

ہی تھی دُھواں دُھواں حُسن بھی تھا اُداس اُداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں،

پچھلے پہر شبِ فراق کون یہ مجھ سے کہہ گیا
تیرا جواب پھر کہاں تو جو یہ درد سہہ گیا

اس سے زیادہ اور کیا اب کوئی نامراد ہو
آج نظر سے گر چلیں عشق کی کامرانیاں

ابھی فطرت سے ہوتا ہے نمایاں شانِ انسانی
ابھی ہر چیز میں محسوس ہوتی ہے کمی اپنی

آہ ان مست نگاہوں کے اشارے بھی فراق
ہم سمجھنے کو بہت سمجھے مگر کیا سمجھے

قفس سے چھٹکے وطن کا سراغ بھی نہ ملا
وہ رنگ لالہ و گل تھا کہ باغ بھی نہ ملا

جب دیکھو اس کو، ہے یہ عالم
اک انگڑائی آئی ہوئی سی

ہجر میں پچھلے پہر کا عالم
تاروں کو نیند آئی ہوئی سی

عجب کیا ترے آگے جو ہم کچھ چپ سے رہتے ہیں
ہمارے اے دوست لاکھوں خواب حائل ہیں

دل و قرارِ حسن بھی خواب و خیال ہو گئے
جو نہ کہا تھا وہ، مگر عشق کو بھولتا نہیں

دیکھ لیا وہاں سے تجھے دیدۂ اعتبار نے
ہاتھ کو ہاتھ بھی جہاں کہتے ہیں سوجھتا نہیں

دل دکھ کے رہ گیا یہ الگ بات ہے مگر
ہم بھی ترے خیال سے مسرور ہو گئے

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں
تو نے تو خیر بیوفائی کی،

نثار پیمانِ دوستی کے مگر ہے گردش میں آسماں بھی
جو یادِ ماضی پہ منحصر ہو وہ عہد کیا استوار ہوگا

ہزار بار محبت ہو، دل تو ہلکا ہے
نہ سر کو اور نہ ہم در و سر کو دیکھتے ہیں

نگاہِ ناز میں صبحِ ازل کی کیفیت !
ارے یہ کب سے کہ فسانے سنائے جاتے ہیں

غبارِ راہ طلب اُٹھ کے بیٹھ بھی نہ سکا
فراقؔ ابھی سے قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

آ نہ گئی آ نہ گئی تیری یاد
چھا نہ گئیں چھا نہ گئیں بدلیاں

چل گئی کیا جانیے کیسی ہوا
آج بجھے دل سے بھی اُٹھا دھواں

پار کیا پار کیا بحرِ عشق
ڈوب چلیں ڈوب چلیں کشتیاں

ہوش کی توفیق بھی کب اہلِ غم کو ہو سکی
عشق میں اپنے کو دیوانہ سمجھ بیٹھے تھے ہم

رفتہ رفتہ عشق مانوسِ جہاں ہونے لگا
خود کو ترے ہجر میں تنہا سمجھ بیٹھے تھے ہم

حسن کو اک حسن ہی سمجھے نہیں اور اے فراقؔ
مہرباں نامہرباں کیا کیا سمجھ بیٹھے تھے ہم

اس کی جفا پیامِ غمِ جاوداں نہیں
اے عشق نا امید کبھی شادماں بھی ہو

نگاہِ ناز تیرے چھیڑنے کی اور بات ہے
ملول بھی کہاں ہوں میں اگرچہ شادماں نہیں

تمکنت و سکونِ حسن سر بسر اضطراب ہیں
آئینۂ جمال میں عشق کی صورتیں نہ دیکھ

گرد و غبارِ دہر کو حسن کا جلوہ زار کر
سینۂ کائنات کی مجھ سے کدورتیں نہ دیکھ

پاؤں کی تھرتھری کو دیکھ دیکھ یہ نالۂ جرس
راہگذارِ عشق میں چھوٹتی ہمتیں نہ دیکھ

اب فضا میں وہ اک کسک سی نہیں
مٹ چلی ہیں نشانیاں تیری

وہ سوز و درد مٹ گئے وہ زندگی بدل گئی
سوالِ عشق ہے ابھی "یہ کیا کیا یہ کیا ہوا؟"

بہت دنوں میں محبت کو یہ ہوا معلوم،
جو تیرے ہجر میں گزری وہ رات رات ہوئی

ایک وہ ملنا ایک یہ ملنا،
کیا تو مجھ کو چھوڑ رہا ہے

اس پرسشِ کرم پہ تو آنسو نکل پڑے
کیا تو وہی خلوص سراپا ہے آج بھی؟

رموزِ عذرِ جفا تک خیال جا نہ سکا — میں چپ رہا تو بُرا ماننے کی بات نہیں

کب دیکھئے دلوں کو ملے اذنِ یاس بھی — بیگانہ وار کہتی ہے وہ آنکھ "ابھی نہیں"

ہم دیکھ کر بھی دیکھ سکیں حُسنِ یار کو — اتنی طویل فرصتِ نظارگی نہیں

درسِ عبرت ہے محبت کا یہ رنگ بھی — آہ وہ چوٹیں جو صرفِ فکرِ داماں ہو گئیں

فراق زیرِ چرخ کچھ، چمک بھی ہے دھواں بھی ہے — کہ جیسے اُٹھ رہی ہو وہ نگاہِ سرمگیں کہیں

نثارِ دیدۂ بے خواب ۔ جاگنے کی طرح — جو جاگ بھی نہ سکے اس کو نیند کیا آئے

پہلے بھی رو لیتے تھے کچھ دن کو کچھ راتوں کو — دل ہی ڈوبا جاتا ہے آگ لگے برساتوں کو

جب شبِ مہ میں اسکی نگاہ ایک کہانی ہوتی تھی — یاد نہ کر ان راتوں کو بھول بھی جا اُن باتوں کو

سچ ہے ٹھنڈا کون کرے تیرے سوا گرمائے کون — جلتے جلتے اشکوں کو بھیگی بھیگی راتوں کو

آج تو کفرِ عشق چونک اُٹھا — آج تو بول اُٹھے ہیں بُت خانے

اُٹھنے والی ہے وہ نگاہِ کرم — عشق بھی کچھ لگا ہے شرمانے

بعد مدت کے تیرے ہجر میں پھر — آج بیٹھا ہوں دل کو سمجھانے

نگاہِ یار کچھ ایسی بھری ہجراں نصیبوں سے — کہ اب تو جس کا جی چاہے وہی غمخوار ہو جائے

خستگی مہر و ماہ کی مت پوچھ — کون پیمانہ ہے جو چور نہیں

تیری رنگینئ طبیعت سے — عشق کی سادگی بھی دور نہیں

فیصلہ عشق کی تقدیر کا ہونا معلوم، — آپ نے کچھ مگر اس بات میں سوچا بھی کہاں

مفت بدنام ہوا نام بھی بدنامی کا، — ہو سکا کوئی ترے عشق میں رسوا بھی کہاں

نشاطِ حُسنِ ازل کو بھی وجد آ جاتا — دُکھی ہوئی ابھی اتنی رگِ حیات نہیں

یہی ہوا کہ ترے غمزدوں پہ کچھ نہ ہوا — جو آئے لفظ و بیاں میں وہ واردات نہیں

تجھے دُنیا کو سمجھنے کی ہوس ہے۔ اے کاش — تجھے دُنیا کو بدل دینے کا ارماں ہوتا

رفتہ رفتہ عشق کو تصویرِ غم کر ہی دیا — حُسن بھی کتنا خراب گردشِ ایام تھا!!

عشق کے اضطراب میں پہلے یہ نرمیاں نہ تھیں، — سوزِ نہاں کی شکل میں کون یہ مسکرا د

آنکھ چُرا رہا ہوں میں اپنے ہی شوقِ دید سے — جلوۂ حسنِ بے پناہ تو نے یہ کیا دکھا د

گدازِ انجم میں اک درماندگی کا کیف عالم میں — فراق ایسی کہاں ہے شامِ غم سب کے مقدر میں

میں گریباں پکڑے یوں روؤں — اسے جنوں تیرا اعتبار نہیں

یاد آغازِ محبت کی دلوں سے نہ گئی — قافلے گھر سے بہت دور نہ ہونے پائے

خیال کو بے اثر نہ جانو عمل کی چنگاریاں ہیں اس میں — کہ آج ظلمت سرائے دل میں جو نور ہے کل وہ نار ہوگا

چمن میں جن کی موج رنگ و بو طرحِ نشیمن ہو — خدا معلوم کھلتے ہیں وہ گل کن سرزمینوں میں

دیارِ عشق آیا کفر و ایماں کی حدیں چھوٹیں — یہیں سے اور پیدا اگر خدا و اہرمن کوئی

نہ سر ہو سکے آتش کدے محبت کے — بجھے دلوں سے بھی اُڑتے شرر کو دیکھتے ہیں

اب حُسن بھی رہینِ غمِ روزگار ہے — کیا انقلاب، اے دلِ رنجور ہو گئے،

آخر تپاکِ عشق کی کچھ انتہا بھی ہے — تجھ سے وہ اے فراق بہت دور ہو گئے

تھی ان کی شوخیوں میں بھی شانِ سپردگی — نیرنگِ اختیار سے مجبور ہو گئے

سن لے کہ خود شناس بھی ہے حُسن بے نیاز — اے دل یونہی سہی کہ وہ مغرور ہو گئے

کر عہدِ گزشتہ کو شریکِ غمِ امروز — خاکسترِ ماضی سے کچھ اُٹھتا ہے دھواں بھی

اے حسن و محبت کے وہ ایام بھی آئے — کچھ کم ہے ترا لطف بھی کچھ دردِ نہاں بھی

اُٹھ پڑے درِ محبت ہی سہی — خیر آئے تو قیامت ہی سہی

احساس بس احساس ہے یہ غم یہ خوشی کیا، — اے عشق تجھے کارِ اہم اور ہی کچھ ہے

وہ شدتِ حیات جو نہ عمل میں جگمگائے — رنگِ نشاط و کیفِ غمِ عشق کے ترجمان نہیں،

اسی سے نظمِ دو عالم بدل گئی اکثر — وہ سعیِ عشق جسے بختِ نارسا کہیے

کچھ تو رنگِ جہاں بدل ہی دیا — تیرے دیدار کی تمنا نے،

نہ جانیں کیوں بھری دنیا میں خاک اُڑتی ہے — بہ فیضِ عشق یہ دریا ابھی سراب نہ تھا

ہم نے تو جسے دیکھا ہم نے تو جہاں دیکھا — اک پیکرِ مہجوری اک عالمِ تنہائی

اظہارِ تمنا کی توفیق نہیں سب کو، — دیکھی ہی کبھی اے دل ان آنکھوں کی گویائی

غم کا بھی فراق اب تو احساس نہیں ہوتا — شامِ شبِ فرقت ہے تنہائی سی تنہائی

تیری سپردگی کو اگر دل کے شوق پر — کچھ اعتماد ہے تو کبھی بدگماں بھی ہو

وہ دردِ عشق کیا جو حریفِ عدم نہیں — اے حاصلِ حیات کبھی رائگاں بھی ہو

نہ رہا حیات کی منزلوں میں وہ فرقِ ناز و نیاز بھی، — کہ جہاں ہے عشق برہنہ پا وہیں حسن خاک بسر بھی ہے

وہ غمِ فراق بھی کٹ گیا وہ ملالِ عشق بھی مٹ گیا — مگر آج بھی ترے ہاتھ میں وہی آستیں ہے جو تر بھی ہے

نہ ازل ہے کچھ نہ ابد ہے کچھ وہی موت ہے وہی زندگی — جسے وقت کہتے ہیں اہلِ دل وہ فنا بھی ہو وہ بقا بھی ہے

اہلِ غم کو تیرا پیمانِ وفا — یاد تو کیا ہے مگر بھولا نہیں
زندگی اے دوست غم کا نام ہے — یہ تو شاید شکوۂ بے جا نہیں
قافلے یا مٹ گئے یا بڑھ گئے — اب غبارِ راہ بھی اُٹھتا نہیں

حُسن کے اعتدال سے ملتی ہیں سب کی سرحدیں — اپنے حدود ہی میں ہیں بحر کی بیکرانیاں،

اب تو زعمِ وفا مجھے بھی نہیں — کیوں تری سرگرانیاں نہ گئیں

جب تری یاد نہ تھی جب ترا احسان نہ تھا — ہم تو اس کو بھی محبت کا زمانہ سمجھے

عشق افسردہ نہیں آج بھی افسردہ بہت — وہی کم کم اثرِ سوزِ نہاں ہے کہ جو تھا

کہاں اتنی خبر عمرِ محبت کس طرح گزری، — ترا ہی درد تھا دل میں جہاں تک یاد آتا ہے

اپنے جلووں سے بھی برقِ حُسن کو ہے احتراز — اب نگاہِ شوق کو بھی دور جانا چاہیے
پرستشِ پنہاں نہ اس درجہ بڑھانا چاہیئے — رشتۂ امید اکثر ٹوٹ جانا چاہیئے
حُسن کی جاتی رہی خود اعتمادی بھی فراق — اس طرح جذبِ نہاں کو آزمانا چاہیئے؟

اب یادِ رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی — یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

تجھ کو پاکر بھی نہ کم ہو سکی بیتابیِ دل، — اتنا آسان ترے عشق کا غم تھا بھی کہاں!

دنیا سے اے دل اتنی طبیعت بھری نہ تھی — تیرے لئے اُٹھائی ندامت کہاں کہاں

ابھی فکرِ علاجِ عشق نہ کر — ابھی کچھ دن یہ درد رہنے دے

پردہ داریِ غم ہے شاکی، — تو نے حال تو پوچھا ہوتا
آج تو دردِ ہجر بھی کم ہے — آج تو کوئی آیا ہوتا
منزل منزل دل بھٹکے گا — آج تمھیں نے روکا ہوتا
میں ہوں دل ہے تنہائی ہے — تم بھی جو ہوتے اچھا ہوتا

خبر کچھ اُن کی بھی رکھتے ہو رنگ و بو والو — جو کاٹتے چلے جاتے تھے راہِ صحرا کو

جو نہ لکھا کاتبِ تقدیر نے — ہاں وہ پیغام زبانی پھر سُنا
معنیِ تقدیر تو وہ تھا جسے — کاتبِ تقدیر بھی سمجھا نہیں،

وہ بیخودی وہ دل اُمڈا ہوا وہ روئے نگار — نظر بھی صورتِ شبنم بکھر گئی ہوتی
غم و الم وہی ہوتے وہی ترے مہجور — گزرنے والی جو شب تھی گزر گئی ہوتی

یاد ہے چشمِ کرم کا وہ بدلنا یاد ہے — حُسن افسردہ سا تھا اور عشق کو حیرت نہ تھی

اک شام فراق صبح کرلیں،
ہستی کو تو کیا عدم کریں گے

پردے سکوت کے بھی تو اہائے راز تھے
تھیں حسن و عشق میں یہ ہم آہنگیاں کبھی

میں پوچھتا تو ہوں مگر جواب کے لئے نہیں،
یہ کیوں تری نظر پھری یہ کیوں بدل گئی ہوا،

حیرتیں ہیں خلوصِ عشق کو بھی
نہ گئیں بدگمانیاں تیری

شامِ ہجراں سنا گئی اکثر
خامشی بھی کہانیاں تیری

احتیاطِ عشق کی اس وقت کوئی داد دے
جب نگاہِ یار بھی رسوا نظر آنے لگے

گوش بر آواز ہونا ہی شکستِ ساز ہے
اک سکوتِ غم کو ہنگامہ سمجھ بیٹھے تھے ہم

مسافرِ رہِ عدم اگرچہ بے نیاز تھے
یہاں بھی پڑ گئیں مگر ضرورتیں نئی نئی

فسردہ کیوں ہے چار بوند آنسوؤں میں کیا نہیں
حرارتیں نئی نئی طراوتیں نئی نئی

بچی بچی سی وہ نظر ملی ملی سی وہ نظر
یہ فاصلے نئے نئے یہ قربتیں نئی نئی

نگاہِ کامیاب کا بھی اعتبار اُٹھ گیا
ملیں ترے جمال کو نزاکتیں نئی نئی

کہیں وہی تو گریباں نہیں ہے آج اپنا
وہ تیرا گوشۂ دامن جو دستیاب نہ تھا

رو کر عشق خموش ہوا ہے
وقت سہانا اب آیا ہے

زندگی کو بھی منہ دکھانا ہے
رو چکے تیرے اشکبار بہت

کچھ نہ وحدت میں ہے نہ کثرت میں
اسکی خلوت ہے اور جلوت اور

دل میں کچھ غم ہے کچھ سرور بھی ہے
کوئی نزدیک بھی ہے دور بھی ہے

چونک پڑے جو سناٹے میں
ایسے دل کو کون پکارے،

نکہتِ زلفِ پریشاں داستانِ شامِ غم
صبح ہونے تک اسی انداز کی باتیں کرو،

سکوتِ ہوش کو مرکز بنا محبت کا
جنوں کا غلغلہ نزدیک و دور ہونے دے

اُٹھ یہ صدا کہ جلد آ، اُٹھ یہ ندا کہ دور باش!
کاوشِ قرب و بعد کا کوئی بھی رازداں نہیں

گرد و غبار سے ہے صاف غم کی فضائے بیکراں
ابتو فنا و عشق میں موت بھی درمیاں نہیں

حسن کے ہر تپاک میں جذب تھیں لاکھوں مستیاں
کون کسی کو یاد تھا؟ کس نے کسے بھلا دیا؟

کسی کی آنکھ میں ملتے ہیں دونوں وقت فراق
ہم اک نگاہ میں شام و سحر کو دیکھتے ہیں

بوقتِ لطف و کرم حسن کے یہ تیور ہیں
نہ ہم دعا نہ دعا کے اثر کو دیکھتے ہیں

وہ رنگ زاہدِ شب زندہ دار کیا جانے
جو اہلِ میکدہ پچھلے پہر کو دیکھتے ہیں

ہم اہلِ غم کی تمنا ہی کیا - نگاہ تری — نہ ہو تو خیر اگر ہو سکے تو اچھا ہے،

ہاں تجھے بھی نہ کہہ سکیں تجھ سا — تجھ کو یکتائے روزگار کریں

کوئی آیا نہ آئے گا لیکن — کیا کریں گر نہ انتظار کریں

جوششِ تجدیدِ شوق سچ کہنا — دل کو پھر ہم امیدوار کریں

کیا کیجئے فراقؔ اگر کسی پہ کوئی — نامہرباں کی طرح ہوا مہرباں کوئی

اے رازِ جہاں بتانے والے — اک اور جہانِ راز بھی ہے،

لاکھ قیامتیں نثار ایک اس انقلاب پر — عالمِ حسن بدگماں رنگِ نگاہِ یار دیکھ

ہم وہی ہیں اے نگاہِ آشنا، — خوش نہیں ہوتے طبیعت ہی تو ہے

چل نہیں سکتے یہاں خوش بختیوں کے بھی فریب — عشق کا رونا ہے یہ تقدیر کا رونا نہیں

جورِ پیہم سے ترے چھوٹ تو رہے ہیں لیکن — آج ہم اہلِ وفا پائیں گے ایسا بھی کہاں،

رنگ جہاں بدل گیا شانِ عدم بدل گئی — دُکھتے دلوں سے پچھلی رات آئی ہے وہ صدا کہ بس

اس نے پیمانِ وفا بھی آج پورا کر دیا — حق اگر یہ ہے تو باطل کو کہاں تک روئے

انقلاب آیا تو یوں آیا نگاہِ یار میں، — کچھ مروت میں اضافہ کچھ محبت میں کمی

نگاہِ یار بڑھ چلی حدودِ لطف و جور سے — بدلتی جا رہی ہیں بزمِ ناز کی روایتیں،

آنچ قفس والوں تک آئی، — اب کے بہت ہے شورِ بہاراں

ہے شامِ ہجر گوش بر آواز ہوں فراقؔ — لرزاں ہیں کچھ سکوت فضائیں پیام سے

حالِ انجامِ عشق کیا کہیے — اب تو ہم بھی لگے ہیں پچھتانے

اک فسوں ساماں نگاہِ آشنا کی دیر تھی — اس بھری دنیا میں ہم تنہا نظر آنے لگے

وہ سوز و درد مٹ گئے وہ زندگی بدل گئی — سوالِ عشق ہے ابھی یہ کیا کیا، یہ کیا ہوا

آج تو دردِ ہجر بھی کم ہے — آج تو کوئی آیا ہوتا

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں — تو نے تو خیر بے وفائی کی

نہ رہزنوں سے رُکے راستے محبت کے — وہ قافلے نظر آئے سلے لٹائے ہوئے

بس ایک عشق کے خراب ہونے ہی کی دیر تھی — شباب تھا سنور گیا زمانہ تھا گزر گیا،

رفتہ رفتہ عشق مانوسِ جہاں ہوتا چلا — خود کو تیرے ہجر میں تنہا سمجھ بیٹھے تھے ہم

بہارِ جلوۂ صبحِ ازل کو دل نہیں بھولا — پڑی جب جب نظر تیری نگاہِ اولیں نکلی،

نیرنگِ حسنِ یار ترے بس میں کیا نہیں　　　لطف و کرم تو مانعِ جور و جفا نہیں،

جن کی صدائے درد سے نیندیں حرام تھیں　　　نالے اب ان کے بند ہیں، تو نے سنا نہیں؟

اہلِ جنوں کو وسعتیں کچھ اور مل گئیں　　　دل بڑھ گئے ہیں پاؤں میں زنجیر دیکھ کر

جفائیں حسن کی رہ رہ کے چونک اٹھتی ہیں　　　اگرچہ عشق بہت خوش قیاس ہوتا ہے،

رقیب پر بھی ستم ہیں مگر ستم کیا ہیں　　　کہ جورِ حسن بھی مردم شناس ہوتا ہے،

نہ اس کو ربط پسند اور نہ احتراز پسند،　　　ابھی سمجھتے نہیں تم مزاجِ دنیا کو

ہر اک کے ہاتھ فقط غفلتیں تھیں ہوش نما　　　ہر اک کو اپنے سے بیگانہ وار جینا تھا

کھلا ہے ہوش میں آکر فریبِ بادہ کشی　　　سیاہ کارِ دل کے دامن کو داغ بھی نہ ملا،

پوچھئے ان سے کہ ثابت قدمی کام آئی،　　　ہوئے گمراہ جو منزل ہی پہ رہتے رہتے،

دیکھئے کب اس نظامِ زندگی کی صبح ہو　　　آسمانوں کو بھی جیسے آ رہی ہو نیند سی،

نہ سمجھنے کی یہ باتیں ہیں نہ سمجھانے کی　　　زندگی اچٹی ہوئی نیند ہے دیوانے کی

کیسی خوشی، کہاں کا الم یہ کوئی بتائے　　　دنیا میں زندگی بھی کہیں دستیاب ہے

شورشِ کائنات ہے خاموش　　　موت ہے زندگی کے دوش بدوش

ہر دل کو بنائیں گے جہاں تاب،　　　ہر جام کو جامِ جم کریں گے

جہاں کو دے گی محبت کی تیغ آبِ حیات　　　ابھی کچھ اور اسے زہر میں بجھائے جا

اس اضطراب میں رازِ فروغ پنہاں ہے　　　طلوعِ صبح کے مانند تھرتھرائے جا

نگاہِ یار ترا یوں تو ہے پیام کچھ اور　　　مگر کرم بھی کئے جا، ستم بھی ڈھائے جا

وہ کیمیا ہی سہی پہلے خاک ہونا ہے　　　ابھی تو سوزِ محبت کی آنچ کھائے جا

نہ اور کھول ابھی نیم باز آنکھوں کو،　　　ترے نثار یہ جادو ابھی جگائے جا

شباب پر ہے زمانہ ترے ستم کے نثار　　　ابھر رہا ہوں کئی رنگ سے مٹائے جا،

خلوصِ عشق کو کرما ورائے غفلت و ہوش　　　کسی کو یاد کے پردے میں کچھ بھلائے جا

پہلے خدا کا چھوڑ سہارا　　　درسِ عمل آسان نہیں ہے

بچھڑ کے تجھ سے کہیں دیکھنا نہ پڑ جائے　　　وصال ایسوں کا جن کی جدائی شاق نہیں

محبت میں مری تنہائیوں کے ہیں کئی عنواں　　　ترا آنا، ترا ملنا، ترا اٹھنا، ترا جانا

وصال کو بھی بنا دے جو عین دردِ فراق　　　اسی سے چھوٹنے کا دکھ سہا نہیں جاتا

پنڈت برجموہن دتاتریا کیفیؔ وفات یکم نومبر ۱۹۵۵ء

مرکز ادب کا روح سخن رامپور ہے

یہ شمع وہ ہے جس کا زمانے میں نور ہے

سب حکمراں کے عدل و کرم سے ہیں چین میں

میرے خیال میں تو یہ آرامپور ہے

---

۲۵ مارچ سنہ ۱۹۴۱ع

برجموہن دتاتریہ

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی

آپ کے بزرگ کشمیر سے بادشاہ فرخ سیر کے عہد میں دہلی آئے اور سلطنت کے مرکزی دفاتر میں عہدہ ہائے جلیلہ پر ممتاز ہوگئے، انیسویں صدی کے اوایل میں بوجہ انتزاع سلطنت ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کی اور اسوقت کے اعلےٰ عہدوں پر فایز ہوئے۔ حضرت کیفی کے والد پنڈت کنہیا لال راجہ بھرت پور سنگھ کے عہد میں نابہ میں کوتوال تھے۔ کیفی صاحب کی ولادت ۱۳ دسمبر سنہ ۱۸۶۶ء میں بمقام دہلی ہوئی، ابھی بہت صغیر سن تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ آپ کی تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی۔ بازار سیتارام میں رہتے تھے۔ قریب ہی حکیم بو رسیے والے کا مطب تھا اور ان کے ہاں مکتب تھا اس میں آپ کی بسم اللہ ہوئی اور پرانے طریق کے مطابق میاں جی سے فارسی کی تعلیم شروع ہوئی۔ آپ کی فارسی کی تکمیل گھر پر اپنے نانا صاحب سے ہوئی جو اس زبان کے جید فاضل تھے اور انگریزی کی تعلیم سینٹ سٹیفنس کالج دہلی میں۔ شاعری کا مذاق آپ نے اپنے ایک بزرگ پنڈت نراین داس ضمیر دہلوی سے ورثہ میں پایا۔ شاعری کی ابتدا اس زمانے کے مذاق اور رواج کے مطابق غزل سے شروع ہوئی مگر خود آپ کے قول کے مطابق یہ رنگ پختہ نہ ہونے پایا تھا کہ اسے ترک کر دیا۔ اس کے باعث اول زمانے کی رفتار اور پسند عام اور دوسرے حضرت آزاد مرحوم و خواجہ حالی مغفور کی صحبتوں اور ادب مغربی کا اثر کہنا چاہیئے نیچرل شاعری شروع کی۔ کیفی صاحب نے سنہ ۱۹۱۵ء میں یورپ کا سفر کیا اور وہاں اکثر علما اور ادیبوں سے ملاقات کی۔
ان کی بعض تصنیفات گورنمنٹ سے انعام اور پبلک سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ علامہ موصوف ریاست کشمیر میں اسسٹنٹ فارن سکریٹری کے عہدۂ جلیلہ سے سبکدوش ہونے کے بعد ایک پہاڑی ریاست چینتی میں مجسٹریٹ اور کلکٹری کے فرایض ادا کرتے رہے۔ لیکن اب انجمن ترقی اردو کے کاموں میں مولوی عبدالحق صاحب کا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔

ہیں مرے دل میں وہ آہیں کہ جو بجلی نہ بنیں، مری آنکھوں میں وہ قطرہ ہے جو طوفاں نہ ہوا
غم رہا ان کا جو دوزخ میں پڑے سڑتے ہیں میرے خوش ہونے کا جنت میں بھی ساماں نہ ہوا

تو دیکھ رہا ہے جو مرا حال ہے قاصد مجھ کو یہی کہنا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
راز ان کے کھلے جاتے ہیں ایک ایک بھنوں پر اور اس پہ تماشا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

وسعت آرائی دلتنگی حسرت مت پوچھ
دم جو نکلا تو میں اپنا اسے ارماں سمجھا
حال یہ بیخودی عشق میں کیفی کا ہوا
شیخ کافر اسے اور گبر مسلماں سمجھا

عمل و عزم ہیں محروم جسارت۔ ورنہ
غیر ممکن کا محل عالم امکاں میں نہیں
یوں اگر دیکھئے کیا کچھ نہیں یہ مشت غبار
اور اگر سوچئے تو خاک بھی انساں میں نہیں
رحمت و عفو الٰہی کا ہوا جب سے یقیں
دلفریبی کا اثر لذت عصیاں میں نہیں

حُسن عشق میں ہے یا عشق حُسن میں مضمر
جو ہر آئینہ میں یا آئینہ ہے جوہر میں
عشق محشر آرا کی طور پر گری بجلی
حسن لنترانی کی رہ سکا نہ چادر میں
فرط سوز الفت میں دیکھ کر سکوں دل کا
بجلیاں مچلتی ہیں بادلوں کے محشر میں
چارہ گر کو حیرت ہے ارتقائے وحشت سے
پاؤں میں جو چکر تھا آرہا ہے وہ سر میں
ہوں وہ رند یا صوفی مست اس کی دھن میں ہیں
جانے کتنے میخانے بھر دئے ہیں کوثر میں

صحبتیں اگلی جو یاد آتی ہیں جی کٹتا ہے
کوئی پوچھے بھی تو کہہ دیتے ہیں ہم یاد نہیں

فراہم ہوکے خونِ آرزو پھر دل نہ بن جائے
یہ اُجڑی پر سکوں بستی بھری محفل نہ بن جائے
مریض غم کے جینے کی دعا احباب کرتے ہیں
جسے آسان سمجھا ہوں وہی مشکل نہ بن جائے

ہاں، ہاں، گمراہے دوست تو تدبیر کئے جا
یہ بھی تری تقدیر کے دفتر میں لکھا ہے

وہ اب جرم وفائے عشق کا الزام دیتے ہیں
رہوں چپ تو بھی مشکل ہے۔ کہوں کچھ تو بھی مشکل ہے

گل پژمردہ کی بکھری ہوئی کچھ پتیاں دیکھیں
تو اک بیدل یہ چیخ اُٹھا مرا دل ہے۔ مرا دل ہے!

نظارہ ذات کا اپنی ہے اس سے دور ہوجانا
جدا ہی جیسے آئینہ سے تو اور اس میں شامل ہے
ہمارا دل بڑھاتی ہے درازی راہ اُلفت کی
سمند شوق کو اک تازیانہ بُعد منزل ہے

جناب محتسب ہم اور توبہ آپ کے ڈر سے
یہاں تو پینے والے ہیں کفِ ساقیِ کوثر سے

لطف ہو حشر میں کچھ بات بنائے نہ بنے
آنکھ بھی شوخ ستمگر سے چُرائے نہ بنے
تم سے اب کیا کہیں وہ چیز ہے داغِ غم عشق
کہ چھپائے نہ چھپے اور دکھائے نہ بنے
بات وہ کہہ گئے آئے بھی تو کس طرح یقیں،
اور سحر اس میں کچھ ایسا ہے بھُلائے نہ بنے

جس کو خبر نہیں اسے جوش و خروش ہے
جو پا گیا ہے راز۔ وہ گم ہے خموش ہے
وارفتۂ ہوائے طرب یاد رکھو اسے
جو درد کی کھٹک ہے نوید سروش ہے
ساقی کی اک نظر ہی ہمیں مست کر گئی
کس کو صراحی و خم و ساغر کا ہوش ہے

اک خواب کا خیال ہے دنیا کہیں جسے — ہے اس میں اک طلسم تمنا کہیں جسے
خمیازہ ہے کرشمہ پرستی دہر کا — اہل زمانہ عالم عقبےٰ کہیں جسے
برہمزنِ حجاب ہے خود رفتگیٔ حسن، — اک شانِ بیخودی ہے زلیخا کہیں جسے

پیکرِ خاک ہے تو چرخ پہ چھا مثلِ غبار — تجھ کو مٹی میں ملایا ہے جبیں سائی نے
جام کیا ایک نظر میں تجھے کرتا سرشار — تجھ کو اے شیخ ملا ہی نہیں ایسا کوئی

دہی کیا ہے وہ جس درد کا درماں ہو جائے — مشکل ایسی کوئی مشکل ہے جو آساں ہو جائے

ے سکھلاتے ہیں نظارے کا انداز مجھے — پردے آتے ہیں نظر سب نظر انداز مجھے
ں معلوم اذاں تھی کہ وہ بانگ ناقوس — کہیں کھینچے لئے جاتی ہے اک آواز مجھے
لاب آنے کو ایسا ہے نہ آیا ہو کبھی، — در و دیوار سے آتی ہے یہ آواز مجھے

دم آنکھوں میں اور آنکھیں ہیں کسی کو ڈھونڈتی — موت بھی ایذا دہی میں زندگی ہونے لگی

ں بتلا دے مجھے یارب کہاں سجدہ کروں — ذرّے ذرّے کو تو جلوے طورساماں کر چکے

زندہ دل ہیں ہمیشہ جوان رہتے ہیں — بہار زیست یقیناً اسی شباب میں ہے

تو یونہی بُرے بنے نالہ سے آہ سے — دل میں جو تھا وہ پھوٹ ہی نکلا نگاہ سے
ست کا کیا گلہ جو کیا تم نے خود کیا — عذر گناہ کیوں نہ ہو بدتر گناہ سے

دہے یہ خانۂ دل اک خیال سے — دُنیا کے حادثے اسے ویراں نہ کر سکے
، میں جو تھا نہاں وہی مرکوز دل رہا — جلوے مری نظر کو پریشاں نہ کر سکے

ق ہی عشق ہو عاشق ہو نہ معشوق جہاں — ایسی اک درگہ توحید مآب اور بھی ہے
ں سے کاٹ یہ دن۔ زندہ دلی سے رکھ کام — شیب کے بعد مری جان شباب اور بھی ہے
پیمانے اگر کر گئے خالی۔ غم کیا؟ — اب بھی ابر آتا ہے اور خم میں شراب اور بھی ہے
رکیا غالب و مومن نے جہاں آنکھوں میں — اسی بستی میں کوئی خانہ خراب اور بھی ہے

تلوک چند محرومؔ (وفات جنوری ۱۹۶۶ء)

محروم! فصلِ گل کا ہمیں انتظار کیا ___ زندہ کریگی مُردوں کو بادِ بہار کیا؟

غم تازہ ہے دلِ مُردہ کا، الم آرزوئے فسردہ کا
ترے عہدِ ناز میں دیکھ دیکھ کے اہتمام نئے نئے!

عالم روا روی کا ہے آئینہ نیرنگ ___ دنیا میں ہے بسر کہ مسافر سفر میں ہے!

ہے خاتمہ قریب جوانی کی رات کا ___ محروم پھر فسانۂ زلفِ بتاں نہ چھیڑ

شبِ ہجراں کی صورت دن ڈھلے سے پھر نظر آئی
الٰہی بھیجدے صبحِ قیامت شام کے بدلے!

پُر ہے نوحوں سے زیست کا دیواں ___ ناسمجھ ان کو یہ ترانے ہیں

دل میں کہتے ہیں کہ کاش آئے ہوتے ___ اُن کے آنے سے جو بیمار کا حال اچھا ہے!

چمن اندر چمن حسنِ جہاں افروز ہے تیرا ___ مگر ویرانۂ مری منزل بیاباں در بیاباں ہے!

کون مختار ہے دنیائے وفا میں اے دل! ___ جو ہے مجبور ہے اک تو ہی تو مجبور نہیں

بیدار کے لئے نہیں ممکن اگرچہ خواب ___ جو کچھ ہے خواب ہے دلِ بیدار کیلئے!

تلوک چند محروم
مقام رامپور - ۲۲ نومبر ۱۹۴۱ء

تلوک چند محروم

آباؤ اجداد ضلع میانوالی (پنجاب) میں دریائے سندھ کے کنارے ایک گاؤں میں سکونت پذیر تھے۔ آراضی کے دریا برد ہو جانے پر دوکانداری اور بیوپار کا پیشہ اختیار کیا۔ میری ولادت تحصیل عیسےٰ خیل ضلع میانوالی کے ایک گاؤں میں ہوئی۔ سال ولادت ۱۸۸۵ء یا ۱۸۸۶ء ہے۔ پہلے ورنیکولر مڈل پاس کیا۔ پھر انٹرنس اس کے بعد بی۔ اے۔ اور ایس۔ اے۔ وی پرائیوٹ طور پر پاس کئے۔ ۱۹۰۸ء میں مشن ہائی اسکول ڈیرہ اسمٰعیل خاں میں انگلش ٹیچر ہو گیا۔ اب ۱۹۳۳ء سے کنٹونمنٹ بورڈ مڈل اسکول کا ہیڈ ماسٹر ہوں۔ سبکدوش ہونے میں دو سال باقی ہیں۔ اس طویل عرصہ میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا جو ادبی طور پر قابل ذکر ہو۔ حادثات چند ایک ایسے پیش آئے جنھوں نے کچھ شکستہ خاطر کر دیا یہاں ان کا ذکر غیر ضروری ہے۔ جذبۂ شاعری طبیعت میں فطری تھا جس کا اظہار بچپن میں ہونے لگا۔ تیسری جماعت میں تھا کہ مصرعے خود بخود زبان پر آنے لگے چونکہ زبان اس حصۂ ملک کی ملتانی ہے اس لئے زبان کے لحاظ سے ابتدائی کلام ناقص تھا۔ جوں جوں مطالعہ بڑھتا گیا زبان صاف ہوتی گئی لیکن پوری قدرت ابھی تک حاصل نہیں ہو سکی۔ زمانۂ طالب علمی میں نظمیں پنجاب کے اخبارات اور رسایل میں شایع ہونی شروع ہو گئیں۔ کسی سے اصلاح نہیں لی۔ عروض کا باقاعدہ مطالعہ بھی نہیں ہو سکا، ہاں اساتذہ کا کلام غور سے دیکھا ہے اور اُردو ادب میں جو تنقیدی مضامین میسر آ سکے ان کا مطالعہ بھی کیا ہے۔ پنجاب کے اکثر مشاعروں میں بھی شمولیت کی ہے اور شعرائے دور حاضر سے ذاتی مراسم بھی رہے ہیں۔ اب چند سال سے طبیعت بجھ چکی ہے۔ اس کا سبب بچوں کی موت ہے۔ پہلا مجموعۂ کلام ۱۹۱۶ء میں شایع ہوا۔ اس کا دوسرا اور تیسرا حصہ بعد کے چند سالوں میں طبع ہوئے۔ ۱۹۲۹ء میں ایک ضخیم مجموعہ بنام "گنجِ معانی" مسٹر عطر چند کپور نے لاہور سے شایع کیا۔ دیباچہ سر شیخ عبد القادر نے تحریر فرمایا۔ غزل میرا موضوع نہیں اگرچہ کچھ غزلیں لکھی ضرور ہیں انھیں میں سے انتخاب بھیجا جا رہا ہے۔

تلوک چند محروم

اے ہمرہانِ دشتِ محبت! بڑھے چلو
اپنا تو پائے شوق، سلاسل میں رہ گیا

اے دل یہ کیا فسردگی آغازِ عشق میں
گل کیوں ترا چراغ سرِ شام ہو گیا

ہو دورِ غم کہ عہدِ خوشی، دونوں ایک ہیں
دونوں گزشتنی ہیں، خزاں کیا۔ بہار کیا

سمجھ میں آیا نہ رازِ صنعت ذرا بھی صورت گرِ ازل کا
بنا رہا ہے مٹا مٹا کر، مٹا رہا ہے بنا بنا کر

ہے منظور سربلندی تو دور نظروں سے کر بلندی، — کہ اوج شمس و قمر نے پایا ہے سر کو اپنے جھکا جھکا کر

ہے ہے! کسی کی بزم مجھے یاد آگئی — واعظ خدا کے واسطے ذکرِ جناں نہ چھیڑ

دُنیا میں اے زباں! روشِ صلح کل نہ چھوڑ — جس سے کسی کو رنج ہو، ایسا بیاں نہ چھیڑ

ہمدم! کہیں نہ حسرتِ خوابیدہ جاگ اُٹھے — ایام حسن و عشق کی پھر داستاں نہ چھیڑ

محفل میں ان کی غیر ہیں، جلئے کہ بیٹھئے، — محروم! دیکھ شمع کو، یعنے کہ جل کے چل،

کس سے سنوں جو تم نہ کرو بات پیار کی — کس سے کہوں نہ تم نہ سنو ماجرائے دل

ہوگیا آخر تلف وہ کاروانِ آرزو — مدتوں جس نے اُڑائی دل کے ویرانے کی خاک!

مئے گلرنگ نہ دے ساقیِ بزمِ عشرت — اشکِ خوں دیکھ مرے، باعثِ انکار نہ پوچھ

ہے صبح اور آج پریشاں ابھی سے ہیں — یعنے شبِ فراق کے ساماں ابھی سے ہیں

کوہ و صحرا و ساحلِ دریا — بے ٹھکانوں کے سو ٹھکانے ہیں!

خلوت نشیں حرم کے ہیں یا دیر کے مکیں، — سب سجدہ کرنے والے ترے آستاں کے ہیں

چھیڑا اے آرزوئے نغمہ! میرے سازِ ہستی کو — کہ پنہاں جز نوائے غم نہیں کچھ اُس کے تاروں میں

شبستانِ فلک میں محوِ خوابِ ناز ہے کوئی — کہ ایمائے خموشی ہے کواکب کے اشاروں میں

دل تیری آتشِ عشق سے یہ مجال و تاب کہاں مجھے — مرے دل کا اور ترے حُسن کا ہے خس و شرر کا معاملہ

شایانِ تعمیر دُنیا تھی یہی بے رونقی، — عشق کے دم سے مگر کچھ گرم بازاری رہی

نظر کر خندۂ گُل پر ریاضِ دہر میں غافل! — نہایت مختصر ہے جو گھڑی ہے یاں مسرت کی

بعدِ ترکِ آرزو بیٹھا ہوں کیسا مطمئن — ہوگئی آساں ہر اک مشکل بہ آسانی مری

نسیمِ صبح کا جھونکا نفس نفس تیرا — رہے گی سوختہ حالوں کو آرزو تیری

شبِ فرقت کی داستاں ہو طویل — نیند المختصر نہیں آتی

فردوس میں دل اُنکا لگا ہے نہ لگے گا، — جو ہیں ترے کوچے کی فضا دیکھنے والے

پھر لذتِ ایذا کی ہوئی دل کو تمنا — اللہ کرے وہ بُتِ بیدادگر آئے

مری فغاں ہی سے رونق ہو میری ہستی کی، — صدا جرس کی ضروری ہے کارواں کے لئے

خلش نے دل کو مرے کچھ مزا دیا ایسا — کہ جمع کرتا ہوں میں خار آشیاں کے لئے

نہیں اب فغاں میں بھی کچھ مزا کہ نشیمن اپنا قفس ہوا — وہ زمانہ خوب تھا جبکہ ہم تھے اسیرِ دام نئے نئے!

الم تازہ ہے دل مردہ کا۔ الم آرزوئے فسردہ کا — تری بزم ناز میں دیکھتا ہوں بپا جو تماشے نئے نئے

دل میں کہتے ہیں کہ اے کاش نہ آئے ہوتے — اُن کے آنے سے جو بیمار کا حال اچھا ہے

بھیجتے ہیں آج مرگِ ناگہانی کو پیام — ترے وعدوں پر کوئی اے حیلہ جو کب تک رہے

من عمر بھی پھٹ جائے گا جب تک کہ رفو — چاک دل، چاک جگر، چاک گریباں ہوں گے

یں سے لی ہے صبا نے بھی شوخیٔ رفتار — چراغِ گورِ غریباں نہ کیوں بجھا کے چلے

ہے کی حاجتِ شرحِ جفا نہ محشر میں — اسی ادا سے جو تم سامنے خدا کے چلے!

دکھائی دیتے ہیں خوبوں کے عیب بھی اچھے — کہ چاکِ دامنِ گل کو نہیں رفو کرتے

ریاضِ دہر میں دیتے ہیں جبکو داغ دروں — برنگِ لالہ اُسی کو ہیں سرخرو کرتے

ل بہار ہے چیدنی نہ فضائے باغ ہے دیدنی — کہ بہارِ باغ گزشتنی ہے تو رنگِ گل ہے پریدنی

ستعار ہے زندگی، تجھے اسکے سود و زیاں سے کیا — غمِ روزگار سے ہاتھ اُٹھا کہ نہیں یہ جنسِ خریدنی

ہے تلا ہوا تبرِ فنا سرِ برگ و شاخ و ثمر سدا — وہ تعلقات فریب ہیں جو سرشت میں ہیں بریدنی

ئی سوتا ہو جیسے ڈوبتی کشتی کے تختے پر — اگر کچھ ہے تو بس اتنی ہے اس دُنیا کی راحت بھی!

ں مُنھ سے جا کے شکوۂ جور و جفا کریں، — مرتے ہیں اور ان کی پشیمانیوں سے ہم

نٹوں میں رہ کے پھول یہ تو نے کھلائے ہیں، — محروم خوش ہیں تری گل افشانیوں سے ہم

تقدیر اگر ہے ناموافق — موہوم ہے جذبِ عشقِ صادق

ہو جاتے ہیں دورِ عاشقی میں — حالات تمام ناموافق

حسرت نے کہا ہے خوب یہ شعر — بالکل مرے حال کے مطابق،

محروم نہیں تو اور کیا ہے — اس دشمنِ عاشقاں کا عاشق

حلقۂ دامِ علائق، بندِ مذہب، قیدِ ننگ، — کس قدر پابندیاں ہیں فطرتِ آزاد پر

ب جہاں میں ان کی قبروں کے نشاں ملتے نہیں — عمر بھر جو فکرِ تسخیرِ جہاں کرتے رہے

نقشِ ہستی اپنا پھیکا ہی رہا۔ ہر چند ہم — دیدۂ خونبار سے گلکاریاں کرتے رہے

ہوں وہ برباد کہ قسمت میں نشیمن نہ قفس — چل دیا چھوڑ کے صیاد تہِ دام مجھے

میں نے دیکھے ہیں بہت خونِ تمنا کے رنگ — ساقیا دے نہ فریبِ مئے گلفام مجھے

پھر بہار آئی، ہوا پھر گرم بازارِ جنوں، — شوق کے پھولوں میں پھر تلنے لگے خارِ جنوں

اہلِ دنیا کی تنگ و دو دیکھکر دیوانہ وار — ساری دنیا مجھکو آتی ہے نظر دارِ جنوں

مجھ پہ وحشت کا اثر محروم پھر ہونے لگا — پھر ترے اشعار میں پاتے ہیں آثارِ جنوں

پہلو میں دل ہے، درد کی دنیا کہیں جسے
پر اس قدر اُجاڑ کہ صحرا کہیں جسے

وہ رعبِ حسن تھا کہ بن آئی نہ ہم سے بات
یوں حالِ دل کہا کہ نہ کہنا کہیں جسے

اے جانِ بہار تیرے دم سے
گلزار ہوا تمام رنگیں

ساقی! ترا عکسِ رخ ہے ورنہ
صہبا رنگیں نہ جام رنگیں

پھر جوشِ بہارِ گل ہے، بلبل
ہر سمت بچھے ہیں دام رنگیں

بے رنگ ہے زیست تیری محروم
لیکن ہے ترا کلام رنگیں

پایا ہزار شکر نہ دنیا کو حسبِ کام
محروم ورنہ ہم بھی لگاتے اسی سے دل

جن کی تقدیس کی کھاتے ہیں فرشتے بھی قسم
ہم گنہ گاروں میں ہوتے ہیں وہ انساں پیدا

اے نازشِ دوراں یہ پریشانی ہے
روز ہوتے ہیں کہاں ہم سے پریشاں پیدا

ہم جو آہ و فغاں نہیں کرتے
آپ کا امتحاں نہیں کرتے

روز نا مہربانیاں ہم پر
یوں تو اسے مہرباں نہیں کرتے

عقل کو کیوں بتائیں عشق کا راز
غیر کو راز داں نہیں کرتے

یادِ ایامِ شوق سے محروم
دل کو اب ہم تپاں نہیں کرتے

زیست کی دشواریوں نے یہ تو احساں کر دیا
موت سی مشکل کو میرے حق میں آساں کر دیا

ہے یہ دنیا ایک ہی افسانۂ ناکامِ شوق
جس نے جو چاہا الگ تجویز عنواں کر دیا

ان بے نیازیوں پہ تو دل ہے رہینِ شوق
کیا جانے اس کو کیا ہو جو پروا کرے کوئی

کل کی نہ ہو امید تو پھر کس امید پر
آباد آرزوؤں کی دنیا کرے کوئی

اُٹھائے بہت دلِ ناشاداں سے ہم
عہدہ برا نہ ہو سکے جب دلستاں سے ہم

کس منہ سے شکوہ اُن کے نہ آنے کا کیجیے
جب جا سکے نہ اُن کے نہ آئے پہ جاں سے ہم

دل مجھ سے پوچھتا ہے کہ جائیں گے اب کہاں
میں دل سے پوچھتا ہوں کہ آئے کہاں سے ہم

کب ملا چین وطن میں دلِ ناشاد سے مجھے
درد کیوں مجھ کو وطن کا ہے۔ وطن کس کا ہے

ہدفِ ناوکِ صیاد ہوا پھر کوئی؟
ماتم اے نوحہ سرایانِ چمن کس کا ہے

زمانہ خاکساری کا نہیں، خود دار بن کر اُٹھ،
مٹا وہ راہِ منزل میں جو بیٹھا نقشِ پا ہو کر

باعثِ تسکیں ہے نیرنگِ فنا میرے لئے
یعنی ہے اک روز غم کی انتہا میرے لئے

یاد جب بھی آ گئی تیری نگاہِ اولیں،
کھل گیا اک دفترِ مہر و وفا میرے لئے

زندگی ناکامیوں کی اک مسلسل داستاں — موت کیا ہے زندگی کی داستاں کا خاتمہ!

سفر کرتے ہوئے منزل بہ منزل جا رہے ہیں ہم — مجھے یہ ساری دُنیا کارواں معلوم ہوتی ہے

مسرت ہائے بے پایاں اُبھرتی ہیں، سنورتی ہیں — جوانی اک بہارِ بے خزاں معلوم ہوتی ہے

دردِ دل، سوزِ جگر، اشکِ رواں، داغِ فراق — سچ تو یہ ہے آپ کے احساں ہیں مجھ پر بے شمار

حُسن یہ سارا اسی کا ہے کہ جس کے عشق میں — چاک روزِ ابتدا سے ہے گریبانِ سحر

سوئے در کیا دیکھتا ہے اے دلِ غمدیدہ دیکھ — یہ شبِ فرقت ہے، اس میں کم ہے امکانِ سحر

صاف آتا ہے نظر انجام ہر آغاز کا — زندگانی موت کی تمہید ہے میرے لئے

چاک اُٹھتی ہے تہِ دامانِ شب سے صبح تو — موت کیا ہے زیست کی تجدید ہے میرے لئے

جو تو غمخوار ہو جائے تو غم کیا، — زمانہ کیا، زمانے کے ستم کیا

مرا ہونا نہ ہونا ہے برابر — نشاطِ ہستی و خوفِ عدم کیا

شہیدِ یک نظر ہوں گے دل و جاں — ہماری آرزو کیا اور ہم کیا

ذوقِ مستی مرا محتاجِ مے و جام نہیں — گر نہیں بادۂ گلگوں، شفقِ شام تو ہے

ہوسِ گُل میں بڑھایا نہ کبھی میں نے ہاتھ — نہ کسی خار سے اُلجھا کبھی دامن میرا

کہاں افسانۂ ہستی کا آغاز — سناتے آئے ہیں سب درمیاں سے

تمھارے آستاں پر خاک میری — زمیں ٹکرا رہی ہے آسماں سے

تجھ سے راحت چھین لی جائے گی کل اس کے لئے — اے دلِ راحت طلب! جو طالبِ ایذا ہے آج

دامنِ فردا میں ہوگا کیا نہ غم تیرے لئے — اے دلِ ناداں عبث مجھکو غمِ فردا ہے آج

بادِ بہار! تجھ سے امیدِ نشاط کیا — بس اس قدر کہ زخمِ کہن کو ہرا کرے

عالت وہ دل کی اب ہے کہ گزرا زباں سے کام — میری نگاہِ یاس ہی اس کو ادا کرے

غلط کہ ہجر میں حاصل مجھے قرار نہیں، — اسیرِ یاس ہوں، پابندِ انتظار نہیں،

یہاں تو ضبطِ جنوں پر نہ کر مجھے مجبور — فضائے دشت ہے اے عقل! بزمِ یار نہیں

بیدار کے لئے نہیں ممکن اگرچہ خواب — جو کچھ ہے خواب ہے دلِ بیدار کے لئے

ظلمتِ یاس ہے وہی، داغِ جگر کو کیا کروں — غم کی گھٹا نہ کھل سکی، آہِ سحر کو کیا کروں

اشکِ رواں نہ ایک دن، دل کی لگی بجھا سکے — گریۂ غم سے کیا ملا - دیدۂ تر کو کیا کروں

جلوۂ برقِ حُسن سے ہے دشمنِ خرمنِ قرار — دل کو بچاؤں کس طرح؟ ذوقِ نظر کو کیا کروں

آنند نرائن ملاّ لکھنوی

خلوتِ آزاد

ہنسی ہے خاک میری خود خاک سر بسر ہوں ۔ دامِ حیات میں اک مرغِ شکستہ پر ہوں

پالا ہے مجھ کو کیسی تاروں بھرے فلک نے ۔ اس تیرہ خاکداں میں اک جلوۂ سحر ہوں

میں مشتِ خاک لیکن فردوس در نظر ہوں

اپنے اور صورتِ ماغذ میں فضائے خلوت ہے ۔ مری اور تیری یکجائی میں پنہاں پستیِ قدرت ہے

حیات بار داں دونوں کو ملنا اب یقینی ہے ۔ اگر شک ہے تو اس میں ہے کہ کس کی مدد لغت ہے

آشنا لین کلاں ۔
۱۳ فروری ۳۹ء

آنند نراین ملا

پیدائش: اکتوبر سنہ ۱۹۰۱ء — مقام پیدائش: آبائی مکان محلہ رانی کٹرہ لکھنؤ — خاندان: میرا خاندان کشمیری ہے میرے جد امجد پنڈت سیتارام ملا کشمیر سے کلکتہ چلے آئے تھے ان کے صاحبزادے (میرے دادا) پنڈت کالی سہائے ملا کی تربیت لکھنؤ میں ہوئی اور اسی وقت سے میرا خاندان مستقل طور پر یہاں رہنے لگا میرے دادا کے دو اولادیں ہوئیں پنڈت بشن نراین ملا اور پنڈت جگت نراین ملا۔ جو میرے والد تھے — تعلیم: سنہ ۱۹۱۱ء سے لیکر سنہ ۱۹۱۷ء تک گورنمنٹ جوبلی ہائی اسکول لکھنؤ میں ہوئی اس کے بعد گورنمنٹ جوبلی انٹرمیڈیٹ کالج سے سنہ ۱۹۱۷ء میں انٹرنس پاس کیا پھر سنہ ۱۹۱۷ء سے سنہ ۱۹۲۵ء تک کیننگ کالج لکھنؤ میں سنہ ۱۹۱۹ء میں ایف۔اے۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں بی۔اے سنہ ۱۹۲۳ء میں ایم۔اے اور سنہ ۱۹۲۵ء میں ال۔ال۔بی کا امتحان پاس کیا۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں آئی۔سی۔ایس کے امتحان میں بیٹھا لیکن اُردو کے پرچہ میں بہت کم نمبر ملنے کی وجہ سے فیل ہوگیا۔ نمبر کم ملنے کی غالباً دو وجہیں تھیں ایک تو پرچہ کے جوابات بجائے اُردو کے انگریزی میں دئے دوسرے ممتحن کے الوقت نقدی نظر سے بالکل اختلاف تھا۔ مثلاً میر کو خدائے سخن ماننے کو ہرگز طیار نہیں۔ کیونکہ میر کی شاعری محض ایک مشتعل دل کی شاعری ہے۔ نہ اس میں کوئی فلسفیانہ گہرائی ہے نہ ذہنی رفعت۔ میر کا شاعری میں درجہ کیا ہے اس کے متعلق ایک سوال پرچہ میں تھا اور ممکن ہے کہ ایسے جواب کو دیکھ کر ممتحن نے یہ اندازہ کیا ہو کہ یہ اُردو ادب سے بالکل بے بہرہ ہے — ۹ فروری سنہ ۱۹۲۳ء کو شادی ہوئی — سنہ ۱۹۲۶ء سے لکھنؤ میں وکالت شروع کی۔ وکالت خاندانی پیشہ کی حیثیت رکھتی ہے ؎ "کہتے ہیں وکالت جسے گھُٹّی میں پڑی ہے"۔

اسکول اور کالج کی طالبعلمی کے زمانہ میں گھر پر اُردو اور فارسی مولانا محمد برکت اللہ صاحب رضاؔ مرحوم فرنگی محلی سے پڑھتا تھا اور وہ اکثر سبق دیکر غزل کہنے میں مصروف ہوجاتے تھے۔ ہر طرح پر کم سے کم وہ پچاس ساٹھ شعر کہتے تھے۔ جب میں کالج کا طالبعلم تھا تب انھوں نے دو تین بار اپنے کہے ہوئے اشعار پڑھنے کے لئے دئے لیکن میں نے پڑھنا گوارا نہ کیا۔ مولانا بھی ناراض ہوئے اور یہ بھی بتایا کہ شروع شروع میں سب یہی کرتے ہیں لیکن مجھے پھر بھی قبول نہ ہوا۔ غالباً ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مجھے وہ شعر پسند نہ آتے تھے مولانا نے میری طرف سے ایک قطعہ تاریخ لکھوا کے کسی شاگرد کے دیوان کے ساتھ چھپوا بھی دیا۔ ان کا نام شاید اشفاق حسین تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ میرا تخلص بھی اثرؔ رکھ دیا گیا ہے۔ جب میں نے مولانا سے شکایت کی تب انھوں نے ناراض ہوکر فرمایا کہ نہ آیندہ مجھ کو کوئی غطیہ دیں گے اور اگر میں کہوں گا بھی تو میرے اشعار کی

[illegible] فرمائیں گے۔

جب سے کہ میں ۱۵ یا ۱۶ سال کی عمر میں کالج آیا تھا مجھے انگریزی میں تھوڑی بہت نظم کرنے کی عادت ہوگئی تھی اور میرا انگریزی کلام کالج میگزین میں شایع ہوا کرتا تھا۔ اسی زمانہ میں میں نے انیس کی چند رباعیات کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا تھا جس کو لوگوں نے کافی پسند کیا تھا۔

سنہ ۱۹۲۲ء میں میری صحت کچھ خراب ہوگئی اور ڈاکٹروں نے ایک مہینہ تک بستر پر ڈال رکھا۔ کوئی ایسی بیماری نہ تھی کہ میں اور کام نہ کر سکوں صرف شام کو حرارت ہو جاتی تھی۔ پڑے پڑے جی گھبراتا تھا تو زیادہ تر وقت کتابیں پڑھنے ہی میں صرف ہوتا تھا اسی زمانہ میں میں نے اقبال کے فارسی کلام کا مجموعہ جو 'پیام مشرق' کے نام سے شایع ہوا تھا پڑھا۔ اُس کی پہلی نظم 'لالۂ طور' پڑھی۔ .... یہ نظم اس قدر زیادہ پسند آئی کہ میں نے بڑے پڑے قریب .. قطعات کا انگریزی میں ترجمہ کر ڈالا جب میرے احباب نے یہ ترجمہ دیکھا تو انھوں نے اسے بے انتہا پسند کیا۔ پنڈت منوہر لال زتشی جو جوبلی اسکول میں میرے ہیڈ ماسٹر بھی رہ چکے تھے اور ہمیشہ میرا دل بڑھایا کرتے تھے انھوں نے جب یہ ترجمہ دیکھا تو انھوں نے مجھے یہ مشورہ دیا کہ میں اپنی شاعرانہ قابلیت کو انگریزی شعر کہکر ضایع نہ کروں بلکہ اُردو میں شعر کہا کروں۔ میں نے اس وقت تک مزاقاً شاید کبھی کوئی شعر کہا ہو لیکن ایک مکمل غزل کبھی نہ کہی تھی۔ میں نے عذر کیا کہ اُردو میں کہنا میرے بس کی بات نہیں۔ ان کا اصرار مگر جاری رہا اور جب ملتے تھے تو ٹوکتے تھے کہ تم نے کچھ کہا یا نہیں۔ چنانچہ ان کے اصرار پر میں نے غالباً سنہ ۱۹۲۳ء میں پہلی نظم کہی جس کا عنوان "پرستارِ حسن" تھا۔ انھوں نے اس نظم کو اتنا پسند کیا کہ اس کی نقلیں اپنے احباب کو بھیجیں جن کے مبارکباد کے خطوط میرے پاس آئے۔ اس نظم کو زمانہ میں انھوں ہی نے بھیجا اور زمانہ میں یہ ایک ایڈیٹوریل نوٹ کے ساتھ شایع کی گئی اس کے بعد تو ان کا اور نیز دیگر احباب کا اصرار اور بڑھ گیا اور میں مستقلاً نظم کہنے لگا۔ زمانہ میں دو چار نظمیں چھپنے کے بعد شہر کے مشاعروں کے دعوت نامے آنے لگے۔ اور بہار مرحوم نے گھیر کر انجمن معین الادب کا ممبر بھی بنا لیا۔

کبھی شعر کہنے کی نیت سے بیٹھکر آجتک شعر نہیں کہا جو کچھ کہا ہے وہ چلتے پھرتے اُٹھتے بیٹھتے کہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی لکھکر کچھ نہیں کہا۔ بڑی سے بڑی نظمیں اولین مصرعہ سے لیکر آخر تک دماغ ہی میں نظم ہوئیں۔ پہلے خاکہ سے لیکر آخری خاکہ تک وہیں انکی اصلاح اور ترقی ہوتی رہی اور مکمل ہو جانے کے بعد بھی دماغ ہی میں محفوظ رہیں۔ اکثر نظمیں محفلوں میں پڑھے جانے کے کئی مہینہ بعد کاپی پر لکھی گئیں۔ آج بھی قریب قریب اپنی ساری نظمیں یاد ہیں جس میں کچھ کم سے کم بارہ سال پرانی ہیں۔ غزلیں بھی یونہی کہی گئیں اور وہ بھی اسی طرح یاد ہیں۔ چونکہ خیال پر کبھی قافیہ اور ردیف کی پابندی لگا کر فکر نہیں کی لہذا ایسا کبھی نہ ہوا کہ طرح پر تو شعر کوئی نہ کہہ سکے لیکن دو دو چار چار شعر طبعزاد زمینوں میں نکل آئے۔ ایسا تو ہمیشہ ہوا کہ ایک غزل کہتے کہتے دو چار طبعزاد غزلیں تیار ہوگئیں۔ یہی وجہ ہے کہ غزلوں کے مجموعہ میں طرحی غزلیں بہت کم ہیں اور غیر طرحی بہت۔

شروع شروع میں میرے احباب نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں کسی کا شاگرد بن جاؤں لیکن میرے ذوق نے اسے گوارا نہ کیا

اول تو یہ کہ شاگردی سے انفرادیت اس قدر سخت مجروح ہوتی ہے کہ وہ پھر جاں بر نہیں ہو سکتی اُستاد کا رنگ شاگرد کے کلام پر ایک نہ ایک حد تک ضرور حاوی ہو جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہر شخص کا تجربہ مختلف ہوتا ہے۔ اس کے جذبات میں مختلف طریقوں سے کیفیت پیدا ہوتا ہے اور اس کے دل و دماغ پہ ایک مخصوص عالم طاری ہوتا ہے جس میں کوئی اُس کا شریک نہیں ہو سکتا۔ ایک آدمی کے دل کی ترجمانی دوسرا کس طرح کر سکتا ہے۔ کہنے کو تو غم اور خوشی دُنیا میں سب کو ہوتی ہے لیکن ایک ہی غم اور خوشی کا اثر دنیا میں دو انسانوں پر بھی یکساں نہیں ہوتا۔ وہی شاعر کامیاب ہے جو اس مخصوص اثر کو ادا کر سکتا ہے لہذا ظاہر ہے کہ شاعر کے لئے سب سے پہلے صداقت کی ضرورت ہے اور صداقت دوسرے کے رنگ میں ڈوب کر قائم نہیں رہ سکتی۔ اُستاد زبان کی غلطیاں ضرور دور کر سکتا ہے لیکن اس طرح شاگرد کی ذہنی ترقی نہیں ہوتی اور اگر شاگرد میں جوہر قابل ہے تو وہ خود کچھ زمانہ بعد اپنے پُرانے کلام پر نظر ثانی کر کے ان غلطیوں کو بغیر اپنے مفہوم کا خون کئے ہوئے استاد سے کہیں بہتر طریقہ سے نکال سکتا ہے۔

ابھی تک کوئی پچاس ساٹھ نظمیں کہی ہیں اور قریب سو غزلیں پیشہ کی معروفیت کی وجہ سے کوئی وقت فکر سخن کے لئے نہیں ملتا۔ اور جو کچھ ملتا بھی ہے وہ مشاعرہ میں شریک ہونے کے خیال سے کسی غزل کہنے میں صرف ہو جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نظمیں سال میں تین چار سے زیادہ کہنے کا وقت نہیں ملتا۔ ابھی بھی فرصت نہیں ملتی کہ جو کچھ کہا ہے اسی پر نظر ثانی ڈالی جائے اور اسے شائع کرا دیا جائے۔

آنند نرائن ملاؔ

تڑپ شیشے کے ٹکڑے بھی اُڑا لیتے ہیں ہیرے کی
محبت کی نظر جلدی سے پہچانی نہیں جاتی

کسی کے لطفِ بے پایاں نے کچھ یوں سوئے دل دیکھا
کہ اب ناکردہ جرموں کی پشیمانی نہیں جاتی

یہ بزمِ دیر و کعبہ ہے نہیں کچھ صحنِ میخانہ
ذرا آواز گونجی اور پہچانی نہیں جاتی

نظر جھوٹی، شباب اندھا۔ وہ حُسن اک نقشِ فانی ہے
حقیقت ہے تو ہو لیکن ابھی مانی نہیں جاتی

نظر جس کی طرف کر کے نگاہیں پھیر لیتے ہو،
قیامت تک پھر اُس دل کی پریشانی نہیں جاتی

مجھے دھوکا نہ دیتی ہوں کہیں ترسی ہوئی نظریں
تمہیں ہو سامنے یا پھر وہی تصویرِ خواب آئی؟

جسے میں چاہتا ہوں وہ اگر قسمت سے بالا ہے،
مرے حصہ میں کیوں میری نگاہِ انتخاب آئی

کرن مہتاب کی پھولوں میں جب تھی جانِ تسکیں تھی
یہی ذرّوں میں کیا آئی کہ موجِ اضطراب آئی

شیخ میں اور ترکِ عصیاں وہ بھی جنت کے لئے
جب خطا کی تھی مرے قبضہ میں کیا جنت نہ تھی

مائل بہ ستم چرخِ زمیں بر سرِ کیں ہے
آخر مری دنیائے تمنا بھی کہیں ہے

دل مرکزِ احساس ہے ایذائے جہاں کا
لگ جائے کہیں چوٹ مگر درد نہیں ہے

صبر آنے کو آ جائے مجھے حسرتِ دل پر
لیکن یہ تقاضائے جوانی تو نہیں ہے

یا یہی کہدے کہ راحت تری قسمت میں نہیں
یا جو دینا ہے تو دے آج قیامت میں نہیں

ہاں دوسرے کا درد ہے پھر دوسرے کا درد
لینے کو اپنے دل پہ اثر ہم ہزار لیں،

جفا صیاد کی اہلِ وفا نے رائگاں کر دی
قفس کی زندگی وقفِ خیالِ آشیاں کر دی

یہ دل کیا ہے کسی کو امتحانِ ظرف لینا تھا
تنِ خاکی میں اک چھوٹی سی چنگاری نہاں کر دی

بھرم حسنِ حقیقت کا کوئی کھلنے نہیں دیتا
نظر جب سامنے آئی تجلی درمیاں کر دی

نزع ہے پھر یہاں آخر وہ نازک وقت لے آئیں
کراہنوں کی محبت بھی طبیعت پر گراں کر دی

اسیر آنکھیں کہاں سے سیرِ گلشن کے لئے لائیں
نظر جتنی بھی تھی صرفِ تلاشِ آشیاں کر دی

میکشوں نے پی کے توڑے جامِ مے
ہائے وہ ساغر جو رکھے رہ گئے

ہر شورشِ حیات سے بدظن بنا دیا
دُنیا کو اہلِ امن نے مدفن بنا دیا

اظہارِ دردِ دل کا تھا اک نام شاعری
یارانِ بیخبر نے اسے فن بنا دیا

اک ربطِ باہمی کا جو امکاں نہ ہو سکا
گل جمع بھی ہوئے تو گلستاں نہ ہو سکا

دل بجھا شمعِ کائنات گئی
زندگی کی اُجالی رات گئی

دل کا چراغ جب تلک تجھ سے جلے جلائے جا
رات بھی ہے اگر تو کیا رات کو دن بنائے جا

سرِ محشر یہی پوچھوں گا خدا سے پہلے
تو نے روکا بھی تھا مجرم کو خطا سے پہلے

اشک آنکھوں میں ہیں ہونٹوں پہ بکا سے پہلے
قافلہ غم کا چلا بانگِ درا سے پہلے

اُڑ گیا جیسے یکایک مرے شانوں پر سے
وہ جو اک بوجھ تھا تسلیم خطا سے پہلے

رازِ مے نوشیِ ملّا ہوا افشا ورنہ
کیا وہ بدمست نہ تھا لغزشِ پا سے پہلے

آئینہ رنگینِ جگر کچھ بھی نہیں کیا
کیا حسن ہی سب کچھ ہے نظر کچھ بھی نہیں کیا

ناگفتہ اشارے بھی ہیں جن کے مجھے احکام
ان پر مرے نالوں کا اثر کچھ بھی نہیں کیا

مانا مرے جلنے سے نہ آنچ آئے گی تم پر
لیکن مرے جلنے میں ضرر کچھ بھی نہیں کیا

مہر وہ ہے خاک کے ذرے جو کر دے زرنگار
اونچی اونچی چوٹیوں پر نور برسانے سے کیا

عرشِ بریں پہ چمکا آج اور اک ستارہ
کس نے خلوصِ دل سے سر رکھدیا زمیں پہ

ذرہ ذرہ پہ لکھا ہے مرا افسانۂ دل
پہلے تقصیر نے پھر ذوقِ جبیں سائی نے

پیہم رہِ طلب میں مشکل کا سامنا ہے
ہر گام پر فریبِ منزل کا سامنا ہے

ہشیار حسن حیرت ارمان بن چلی ہے
پہلے فقط نظر تھی اب دل کا سامنا ہے

ظالم مری حیات کا دورِ شباب ہے — ہاں ہاں تری جفا پہ بھی جینے کی تاب ہے

قفس والے نہ گل دیکھیں نہ سبزہ — نظر جتنی ہے صرفِ آشیاں ہے
گلِ خنداں ابھی غافل ہے شاید — وہی گلچیں بھی ہے جو باغباں ہے

ارماں کو چھپانے سے مصیبت میں ہو جاں اور — شعلہ کو دباتے ہیں تو اُٹھتا ہے دھواں اور
اتنا بھی مرے عہدِ وفا پر نہ کرو شک — ہاں ہاں میں سمجھتا ہوں کہ ہے رسمِ جہاں اور
اب کوئی صدا میری صدا پر نہیں دیتا — آوازِ طرب اور تھی آوازِ فغاں اور

تابِ جلوہ بھی تو ہو وہ سوئے بام آیا تو کیا، — چشمِ موسیٰ کے لئے گر عشق تشنہ کام آیا تو کیا
دعائے دل سمجھ لیں گے اگر چاہیں گے وہ — میرے ہونٹوں تک سوالِ ناتمام آیا تو کیا
ظرفِ سائل بھی بدل اے رحمتِ سائل نواز — مے سے پُر ان کانپتے ہاتھوں میں جام آیا تو کیا
پُر ہے تیرے ذکر سے اپنی حدیثِ زندگی، — اس میں بھولے سے کہیں دل کا بھی نام آیا تو کیا
خونِ دل ضایع نہ ہو، مجھ کو بس اتنی فکر ہے — اپنے کام آیا تو کیا، غیروں کے کام آیا تو کیا
ہیں ابھی خاکسترِ دل میں کچھ چنگاریاں — شعلۂ ہستی قریبِ اختتام آیا تو کیا

اشک بن کر آئی ہیں وہ التجائیں چشم تک — جن کے کہنے کے لئے ہونٹوں میں گویائی نہیں

تیری اُجڑی ہوئی جنت کو بسانے والا — وہی غصہ میں نکالا ہوا انساں نکلا

ابھی شباب ہے کر لوں خطائیں جی بھر کے — پھر اس مقام پہ عمرِ رواں ملے نہ ملے

دل ہے اک دولت مگر درد آشنا ہونے کے بعد — اشک موتی ہیں مگر غم کی جلا ہونے کے بعد
تا بہ دامن آئی اک بے رنگ سی پانی کی بوند — تھا ہی کیا آنسو میں حرفِ التجا ہونے کے بعد

اسی کا نام جینا ہے جگر خوں ہو تو ہو جائے — نقوشِ دہر میں اک خاص اپنا رنگ بھر جانا

گزری حیات وہ نہ ہوئے مہرباں کبھی — سنتے تھے ہم کہ عشق نہیں رائگاں کبھی
آنکھوں میں کچھ نمی سی ہے ماضی کی یادگار — گزرا تھا اس مقام سے اک کارواں کبھی
ہاں یاد ہے کسی کی وہ پہلی نگاہِ لطف — پھر خوں کو یوں رگوں میں نہ دیکھا رواں کبھی

مری باتوں پہ دُنیا کی ہنسی کم ہوتی جاتی ہے — مری دیوانگی شاید مسلّم ہوتی جاتی ہے،
ابھی سن لو تو شاید سن سکو تم دل کے نغموں کو — کہ اب اس کی صدا کچھ خود بخود کم ہوتی جاتی ہے
تجھے مذہب مٹانا ہی پڑے گا روئے ہستی سے — ترے ہاتھوں بہت توہینِ آدم ہوتی جاتی ہے

خالی ہے مرا ساغر تو رہے ساقی کو اشارا کون کرے — خودداریِ سائل بھی تو ہے کچھ بار بار تقاضا کون کرے

ے محبت بھی ہے عجب دو دل ستے کو راضی ہیں
لیکن یہ تکلف حائل ہے پہلا وہ اظہار کون کرے

دل تھا شگفتہ گل کی طرح ٹہنی کا نشا سی چبھتی تھی
اب ایک فسردہ دل لیکر گلشن کی تمنا کون کرے

، دو نشیمن کو اپنے پھر ہم بھی کریں گے سیرِ چمن
جب تک کہ نشیمن اُجڑا ہے پھولوں کا نظارا کون کرے

، شاخ میں یہ کہیں سوکھ جائیں پھول مرے
جو توڑتا ہوں تو اب توڑ، انتظار نہ کر

مآلِ زیست سے گھبرا کے کر نہ خونِ شباب
خزاں کے خوف سے رسوائی بہار نہ کر

، کے خیال میں ہوں گم اُس کو بھی کچھ خیال ہے
میرے لئے یہی سوال سب سے بڑا سوال ہے

رُخ اپنا آئینہ مجھ کو بنا کے دیکھ لیا
مری نگاہ کے پردے میں آ کے دیکھ لیا

اب اور اس سے سوا چاہتے ہو کیا ملّا
یہ کم ہے اُس نے تمھیں مسکرا کے دیکھ لیا

جو اپنی موت سے دُنیا میں کچھ کمی نہ ہوئی
تو زیست مستحق نامِ زندگی نہ ہوئی

اور دنیا میں کہیں تیرا ٹھکانا ہی نہیں
اے مرے دل کی تمنا لبِ خاموش میں آ

عشق کرنا ہے تو پھر عشق کی توہین نہ کر
یا تو بیہوش نہ ہو، ہو تو، نہ پھر ہوش میں آ

مجھے یہ ڈر ہے کہیں کچھ کہہ نہ دے نظر تیری
انھیں گلہ کہ پیامِ نظر زباں پہ نہیں

حیات فکرِ نشیمن میں کاٹنے والو،
چمن کا کیا کوئی حق اہلِ آشیاں پہ نہیں

کسی کے پاؤں کا روندا ہوا نہیں ملّا
وہ ہے تو گرد مگر راہِ کارواں پہ نہیں

نے بھی کی تھیں کوششیں، ہم نہ تمھیں بھلا سکے
کوئی کمی ہمیں میں تھی یاد تمہیں نہ آ سکے

ست کی راحتوں میں بھی غم نہ ترا بھلا سکے
لب سے ہنسے ہزار بار دل سے نہ مسکرا سکے

ں سا اک زباں پہ تھا آنکھ میں کچھ نمی سی تھی
ہوش نہیں کہ دل کا بھید کہہ گئے یا چھپا سکے

ہ بھی شوق کی خطا اپنی ہی آنکھ کا قصور
وہ تو اُٹھا چکا نقاب ہم نہ نظر اُٹھا سکے

کام، عشق بے سوال آ ہی گیا
خود بخود اس کو خیال آ ہی گیا

تم نے پھیری لاکھ نرمی سے نظر
دل کے آئینہ میں بال آ ہی گیا

غم بھی ہے اک پردۂ اظہارِ شوق
چھپ کے آنسو میں سوال آ ہی گیا

بچ کے جاؤ گے کہاں ملّا، کوئی
ہاتھ میں لیکر گلال آ ہی گیا

، بات کا جو یقیں نہیں مجھے آزما کے بھی دیکھ لے
تجھے دل تو کب کا میں دے چکا اسے غم بنا کے بھی دیکھ لے

ٹھیک ہے کہ تری جفا بھی ہے اک عطا مرے واسطے
مری حسرتوں کی قسم تجھے کبھی مسکرا کے بھی دیکھ لے

آج ہی اسے کیوں صرفِ دل نہ کر ڈالوں
یہ خوں کی بوند مجھے کل یہاں ملے نہ ملے

متاعِ شوق کو اشکوں کے ساتھ بیچ بھی دوں | پھر اس کے بعد کوئی کارواں ملے نہ ملے

میرے جگر کی تاب دیکھ رخ کی شگفتگی نہ دیکھ | فطرتِ عاشقی سمجھ، قسمتِ عاشقی نہ دیکھ

تجھ پہ عیاں ہے رازِ دل جان کے بن نہ بیخبر | معنیِ خامشی سمجھ، صورتِ خامشی نہ دیکھ

تری محفل میں ہوں میں بھی مگر بیگانۂ محفل | کسی زنجیر میں جکڑی نہیں شاید کڑی اپنی

وہ بھی آتے ہیں بن کے شکلِ بہار | وہ جو خونِ بہار کے دن ہیں

فسردہ ہوتے ہوئے ڈالیوں پہ پھولوں کو | خود اپنی آنکھ سے دیکھا ہے اور خزاں میں نہیں

اپنے جی میں ہے کہ دنیا چھوڑ دیں | اور دنیا کو ہمیں سے کام ہے

جل چکے چشمِ اعزہ میں چراغ | سو بھی جا لا کہ وقتِ شام ہے

رہروِ صادق اٹھاتا ہے قدم کس شوق سے | ہاں مگر جب تک نظر کے سامنے منزل نہیں

کچھ بھی کہنے کی مجھے ان سے ضرورت نہ پڑی | آ گیا کام مرا بے سر و ساماں ہونا

اسی کو جس نے نہ کی بھول کر بھی بات کبھی | بغیر یاد کئے کٹ سکی نہ رات کبھی

بس ایک پھول نمایاں ہے دل کے داغوں میں | یہاں رکی تھی تری چشمِ التفات کبھی

وہ اک زمانہ کو اپنے ناز و ادا کے جلوے دکھا رہے ہیں | مری نظر سے جو بچ گئے ہیں وہی خزانے لٹا رہے ہیں

وہ کون ہیں جنھیں توبہ کی مل گئی فرصت | ہمیں گناہ بھی کرنے کو زندگی کم ہے

وہ دیکھتے تو ہیں مجھکو مگر چرا کے نظر | حجاب ٹوٹ رہے ہیں مگر حجاب کے ساتھ

جو گل تھے قبر انھوں نے سنواری غریب کی | جو ننگِ گل تھے زینتِ دستار ہو گئے

میری الفت نے انھیں کر تو لیا ہے اپنا | اب فقط شرم کی سینہ سپری باقی ہے

تری ہستی سے منکر ہوتے جاتے ہیں جہاں والے | سنبھال اپنی خدائی کو ارے او آسماں والے

سوکھنے پائے نہ دل میں دیکھ جوئے آرزو | سینکڑوں دریا تنک آبی سے صحرا بن گئے

امرِ الفت مثل میرے کوئی سمجھا ہی نہیں | آج تک میں نے انھیں جی بھر کے دیکھا ہی نہیں

پھر ہوسِ نظارہ کر بزمِ جمالِ یار میں | پہلے نظر کو تاب دے آتشِ انتظار میں

ایک جگر کا سوز و ساز کشمکشِ امید و یاس | ایک فسانۂ حیات دفن ہے ہر مزار میں

سختیِ زیست عشق سے دور نہ ہو سکی مگر | پھول تو کچھ کھلا دئے دامنِ کہسار میں

مجھ کو غمِ انساں کی حقیقت نظر آئی | دنیا ابھی محتاجِ محبت نظر آئی

تم جس کو سمجھتے ہو کہ ہے حسن تمھارا | مجھکو تو وہ اپنی ہی محبت نظر آئی

مولانا ناطق گلاوٹھی (وفات ۲ مئی ۱۹۶۹ء)

ناطق گلاؤٹھوی

میرا نام ابوالحسن ہے۔ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اسم گرامی ظہور الدین حسن تھا۔ وطن مالوف قصبہ گلاؤٹھی ضلع میرٹھ۔ خاکسار نومبر ۱۸۸۶ء کو شہر کاشی میں جو ناگپور سے ۶ میل ہے پیدا ہوا۔ سلسلۂ نسب سادات گیلان سے ملتا ہے۔ ہندوستان میں مولانا سید منہاج الدین صاحب مورث اعلیٰ احمد شاہ ابدالی کے ساتھ تشریف لائے جن کا میں ساتواں پوتا ہوں۔ جدی جائیداد کا غدر ۱۸۵۷ء میں خاتمہ ہو گیا جبکہ میرے ایک تایا صاحب کو پھانسی بھی دی گئی۔ والد صاحب نے جو کچھ پیدا کیا تھا اُسے چھوٹے بھائی نے میری عدم موجودگی میں ختم کیا اور مر بھی گیا خدا اُس کی مغفرت کرے۔ والد صاحب کو بھی ذوق سخن تھا مگر دہ فکر کو جمع کرنے کے عادی نہ تھے۔ میرے تایا سید فیض الحسن صاحب جو بھاولپور کے وزیر اعظم ہو کر وہیں سو رہے ہیں ایک تبحر عالم ادیب اور شاعر تھے مگر اُن کے صاحبزادے نے اُن کا سب کچھ برباد کر دیا۔ زمانۂ تعلیم وطن مالوف میں گزرا اور دارالعلوم دیوبند سے علوم عربیہ کی سند حاصل کی۔ میرے زمانے کے اساتذہ مولانا شیخ الہند مولانا خلیل احمد سہارنپوری مولانا محمد حسن مراد آبادی اور مولانا ماجد علی صاحب جونپوری تھے اور اس وقت کے طلبہ میں مولانا انور شاہ مولانا حسین احمد مدنی تھے خود میں کیا تھا معلوم نہیں۔ انگریزی کہیں پڑھی نہیں مگر ضرورت زمانہ نے یہ زبان بھی سکھائی اور اس میں بھی تحریر و تقریر کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہوں۔ شاعری ۱۹۰۱ء میں شروع کی ۱۹۰۲ء میں حضرت داغ سے تلمذ حاصل کیا اور ہنوز چار چھ غزلوں پر اصلاح لینے پایا تھا کہ اُن کا انتقال ہو گیا پھر کسی کو کلام دکھانے کا خیال نہیں کیا ہمیشہ اپنے لکھے پر خود اصلاح کی۔ عرصۂ دراز سے بسلسلۂ تجارت خاص شہر ناگپور میں مقیم ہوں۔

حالات متوسلاً کے غیر موزوں ماحول کی بدولت مدت دراز سے مشق سخن غائب ہے عرصہ سے یہ ہو رہا ہے کہ کوئی سال ایسا نہیں آیا جس میں پانچ سے زیادہ غزلیں لکھنے کا اتفاق ہوا ہو اور ایسے بھی کئی سال گزرے ہیں جن میں ایک غزل بھی نہیں کی۔ فی الحال زندہ ہوں مگر تندرست نہیں موت کے استقبال کو آمادہ ہوں مگر یہ بھی جانتا ہوں کہ سخت جانوں کو موت جلدی نہیں آیا کرتی۔

عاجز ناطق ۔ ۲۵ ستمبر

پست ہمت نہ کہیں دیدۂ گریاں ہوتا   اب بہت دور نہیں گھر سے بیاباں ہوتا

تو تو جا مونسِ غم، فکرِ دلِ زار نکر،　　میرے اللہ کو آتا ہے نگہباں ہونا

خدا کی شان تو دیکھئے کہ خدا کا نام ہی رہ گیا　　مجھے تازہ یا دِ بتاں ہوئی جو حرم سے شوریاذاں اُٹھا

ے صبر نے بھی غضب کیا کہ عدو کی جان پہ بن گئی　　یہ کہاں کی چوٹ کہاں لگی یہ کہاں کا درد کہاں اُٹھا

وصفِ جمال، ذوق ہے اہلِ نگاہ کا　　حیرت کہوں کہ شور کہوں واہ واہ کا

رکھتا ہے تلخ کام غمِ لذّتِ جہاں،　　کیا کیجئے کہ لطف نہیں کچھ گناہ کا

عالم کون و مکاں تمام ہے ویرانے کا　　پاس وحشت نہیں گھر دور ہے دیوانے کا

کہنے والے وہ سننے والا میں،　　ایک بھی آج دوسرا نہ ہوا

اب کہاں گفتگو محبّت کی　　ایسی باتیں ہوئے زمانہ ہوا

از اُدھر دل کو اُڑا لینے کی گھاتوں میں رہا　　میں اِدھر چشم سخن گو تری باتوں میں رہا

لیمار سے ہیں دوست مجھے آرہا ہے دوست　　کیا موت کو بھی آج ہی مرنا ضرور تھا

ے بادہ کش گئی ہے مئے عیش کس کے ساتھ　　ہر اک نے سے کے جام کو آگے بڑھا دیا

مجھ اتنا تو کرم گردشِ دوراں ہوتا　　یہ تو ہوتا کہ کہیں بیٹھ کے گریاں ہوتا

بس کی حسرت تھی اُسے پا بھی چکے کھو بھی چکے　　اب کسی چیز کا ہم کو نہیں ارماں ہوتا

خراب، خانۂ خانہ خراب ہو نہ سکا　　یہاں کوئی اثر انقلاب ہو نہ سکا

اُسی کی دین ہے غم میں گلا نہیں کرتا　　قبول ہو کہ نہ ہو اب دعا نہیں کرتا

ملے مرادِ ہماری مگر ملے بھی کہیں　　خدا کرے مگر ایسا خدا نہیں کرتا

سرد ہو جاتی ہے فکرِ جاہِ دُنیا جس کے بعد　　وہ ذرا سا ہے خیال اے دل کہ پھر کیا اس کے بعد

بیخودی آئی تھی اُن کے بعد بزمِ ناز میں　　پھر نہیں معلوم ہم کون آیا کس کے بعد

غم کی دنیا ہے خاطرِ نا ساز　　واہ رے بیکسی ترا انداز

زندگی کا ثبوت نالۂ زار　　وہ بھی کیا اک مری ہوئی آواز

صیاد اب قفس کی مصیبت گراں نہیں　　میں نے سمجھ لیا ہے کہ یہ آشیاں نہیں

صحرائے زندگی سے نہ بھاگوں تو کیا کروں　　آخر کہاں تک اس میں بھٹکتا پھرا کروں

باقی نہیں جہاں میں کوئی مانگنے کی چیز　　اب ہاتھ بھی اُٹھاؤں تو میں کیا دعا کروں

شامِ غم کو تو ابھی دیر ہے آنے کے لئے　　دو گھڑی دن سے نہ ہم کوچ کا ساماں کر دیں

آج بھی کچھ یوں تو اس دنیا میں کل سے کم نہیں،　　ہے وہی عالم مگر افسوس وہ عالم نہیں

ہ لو اہلِ چمن رسوائیِ صبحِ بہار ، کون سا گل ہے کہ جس پر قطرۂ شبنم نہیں
ٹ گیا کھو کر شریکِ عیش ذوقِ اختلاط غم ہے اور ہم اب ہمیں فکرِ شریکِ غم نہیں

رہ گرمست کی دُنیا ہے زمانے سے جُدا ہوش میں آکر جہاں ہم ہیں وہاں ہوش نہیں
کرنے کی تو باتیں ہیں بہت سی ناطق بھولے وہ بھول تو جاؤں جو فراموش نہیں

زندگی ہی ناطق آزارِ زندگی ہے ہیں خارِ پیرہن ہوں خود اپنے پیرہن میں

ی ہم جان دیکر سوئے ہیں دم لیکے اُٹھیں گے نہ چھیڑ اے شورِ محشر ہٹ ذرا آرام لیتے ہیں
یں کچھ کام لینے کا اگر بازارِ دُنیا میں تو اچھالاؤ دیدہ ہم دل ناکام لیتے ہیں

کیفِ آمادۂ ہستی دلِ رنجور نہیں اب تو غم ہو کہ خوشی کچھ ہمیں منظور نہیں
لوٹ چل عمرِ رواں بڑھ کے ملا لیتے ہیں ابھی گزرے ہوئے ایام گئے دور نہیں

ہم کر رہا ہوں اپنی بربادی کا افسانہ جو گلیاں میں نے دیکھی تھیں وہ گلیاں دیکھتا ہوں میں
یالِ خواب راحت حسرتِ سامانِ دلجمعی ، نہیں سوتا مگر خوابِ پریشاں دیکھتا ہوں میں

بزمِ ناز وہ اُس جلوۂ جاں بخش کا عالم جہاں لوگوں نے جیتی جاگتی دیکھی ہیں تصویریں
ایمانِ تازہ شورِ ناقوسِ برہمن سے مری بھولی ہوئی یاد آ رہی ہیں مجھکو تکبیریں

فردوس کو احباب کی محفل تو بنا دو پہلے مری کھوئی ہوئی دُنیا مجھے لادو

روِ مہد سے اے رہروانِ منزلِ پیری ، کہیں شاید نظر آئے جوانی دیکھتے جاؤ
ارے بعد جو دنیا کہے گی وہ بھی سُن لینا ابھی تو تم ہماری بے زبانی دیکھتے جاؤ

ں کیوں کیا کوئی کہنے نہیں دیتا مجھکو آپ سُن لیجئے کیا کہتی ہے دُنیا مجھکو

کہتے ہیں جسے وحشت وہ بات کہاں صاحب کیا کہتے ہو مجنوں سے دیکھا ہوا دیوانہ
جب ذکر نکلتا ہے بیتابیِ خاطر کا سو طرح مچلتا ہے چھیڑا ہوا افسانہ
اِس دور میں بھی ناطق جویائے محبت ہے کس وہم میں پھرتا ہے کھویا ہوا دیوانہ

تا صنم کدے سے تھی کیا مجال واعظ جی ہاں ہمیں اُٹھا تا ہم راہ میں پڑے تھے

ائے سازِ ہستی تارِ پیہم سے پیدا ہے ابھی تارِ نفس پر چل رہی ہیں اُنگلیاں میری
شار قبر کا مارا ہوا ہوں اُٹھ نہیں سکتا ، سنبھال اے حشر سب ٹوٹی ہوئی ہیں ہڈیاں میری

فیں ذوقِ شورِ وجود تھا وہ اسی ہوس میں فنا ہوئے جو اُٹھے تو اُٹھ کے کہیں نہ تھے یہ ہوا کہ بانگِ درا ہوئے
تھی اِدھر ہوتی اُدھر تو کہاں ہیں سب مرے ہم نظر دمِ جلوہ تم نے یہ کیا کیا وہ جو دیکھتے تھے وہ کیا ہوئے

ہاں آگ لگانے کے لئے میرے گھر آئے — قاصد وہ اسی واسطے آئے گھر آئے
تھی راہِ نہاں خانۂ دل بامِ نظر سے — وہ آنکھ بچا کر مرے گھر میں اُتر آئے

عدو سے وعدہ کیا وعدہ کر کے ٹال سکے — چلو وہ اب بھی بہت بات کو سنبھال گئے
ملال کر گئے کہہ کر کہ اب نہ آئیں گے — وہ جاتے جاتے تڑپتے پہ ہاتھ ڈال گئے

ڈھونڈتی ہے اضطرابِ شوق کی دنیا مجھے — آپ نے محفل سے اُٹھوا کر کہاں رکھا مجھے
اے نگاہِ مست اس کا نام ہے کیفِ سرور — آج تو نے دیکھ کر میری طرف دیکھا مجھے
یار سے ہو کر جدا جورِ فلک کا غم نہیں — ہو چکی وہ بات تھی جس بات کی پروا مجھے
ساتھ بھی چھوڑا تو کب جب سب برے دن کٹ گئے — زندگی تو نے کہاں آ کر دیا دھوکا مجھے

ہچکیوں پر ہو رہا ہے زندگی کا راگ ختم — جھٹکے دے کر تار تو ٹوٹے جا رہے ہیں ساز کے
نالۂ پیہم ہے اندازِ سکوتِ اہلِ درد — ہیں کہاں پہچاننے والے مری آواز کے

کیا ارادے ہیں وحشتِ دل کے — کس سے ملنا ہے خاک میں مل کے
اے دلِ شکوہ سنج کیا گزری — کس لئے ہونٹ رہ گئے سل کے
مٹتے جاتے ہیں راہِ عمر میں دوست — مل رہے ہیں نشان منزل کے
چھوڑ ناطق فضائے بزمِ شکست — اُٹھ کے ٹکڑے سنبھال لے دل کے

پریشاں خاطری تو اے دلِ اندوہ گیں نکلی — جگر کی پھانس تھی اچھا ہوا جانِ حزیں نکلی
بلا کی مردنی چھائی ہے بزمِ آفرینش پر — یہ کس کے منہ سے آئینِ فنا پر آفریں نکلی

پھر وہی ہم ہیں وہی شیشہ وہی پیمانہ ہے — توبہ کیا ہے رندی کی اِک لغزشِ مستانہ ہے

کیا کروں بیکار کوشش مسکرانے کے لئے — کس کی لے آؤں ہنسی ہونٹوں تک آنے کے لئے
یہ رہی صورت کہ منہ تکتا رہا سامانِ عیش — آشیاں تھا ہم نہیں تھے آشیانے کے لئے

ختم ہوتی ہے کہیں منزلِ آلام ابھی — پوچھتا کیا ہے چلا چل دلِ ناکام ابھی
ہم کو شیرینیٔ راحت کی تمنا یعنی — کم ہے کچھ تلخیٔ ذوقِ دہن و کام ابھی

یہ مدت ہستی کی آخر یوں بھی تو گزر ہی جائے گی — دو دن کے لئے میں کس سے کہوں آسان مری مشکل کر دے

کون آئے مرنے کو وہ ہماری بستی ہے — زندگی جہاں آ کر موت کو ترستی ہے
رازِ بیخودی ہے یہ اہلِ ہوش کے لئے — مست اس کو کیا جانیں کس گلی میں بستی ہے
اب کہاں ہیں وہ دن ناطق لطفِ چشمِ ساقی کے — اب کہاں ہے وہ دنیا مے جہاں برستی ہے

گے ہیں جب سے وہ اپنے بھی آئے غیر بھی آئے
سب آئے بھی گئے بھی گھر کی ویرانی نہیں جاتی

ظر آتا ہے کیا میں کیا کہوں اشکال ہستی میں
کوئی دیکھی ہوئی صورت ہے پہچانی نہیں جاتی

ہر اُسنکر بھی ہم سے بُرا مانا نہیں جاتا
وہاں یہ ہے کہ اچھی بات بھی مانی نہیں جاتی

رہ گئے ہمت گئی رخصت شکیبائی ہوئی
رفتہ رفتہ اپنی دُنیا ہی، گئی آئی ہوئی

اپنی رسوائی کا غم تھا جب ہمیں وہ دن گئے
ابتو یہ غم ہے کہ ایسی پھر نہ رسوائی ہوئی

جانتے ہیں یہ کہ پہچانا نہیں کوئی ہمیں،
یہ نہیں معلوم کس کس سے شناسائی ہوئی

لیا کہا میں اور تمنا عشرتِ گمگشتہ کی
وہ مری سو بار کی کھوئی ہوئی پائی ہوئی

آتا ہے میرے حال پہ اہلِ ہوس کو رشک
ان کو بھی آرزو ہے کہ رسوا کرے کوئی

میں زندگی کے کھیل کو سمجھا نہیں ہنوز
کچھ ہو رہا ہے جیسے تماشا کرے کوئی

اُن کا حریم ناز مرا پردۂ نگاہ،
بیٹھے ہیں اس ادا سے کہ دیکھا کرے کوئی

مرے غم کی اُنھیں کس نے خبر کی
گئی کیوں گھر سے باہر بات گھر کی،

گئے تھے پوچھنے اپنا پتہ آج،
ہمیں اُس نے بتا دی راہ گھر کی،

بتاؤں کیا وہ دل لیتے ہیں کیونکر
ذرا سی اک صفائی ہے نظر کی

مشکل رہ عدم کو ہم آساں نہ کرسکے
جلدی میں چلدئے کوئی ساماں نہ کرسکے

شرط اُن کی جستجو تھی نہ پایا نہیں سہی
یہ تو نہیں ہوا کہ ہم ارماں نہ کرسکے

کچھ ہم پہ اہلِ دیں نے عنایت تو کی ضرور
کافر بنا دیا جو مسلماں نہ کرسکے

رہ غربت میں اپنا زور پائے ناتواں تک ہے
مگر اس کا بھروسہ کیا ہے یہ بھی ہے جہاں تک ہے

میں بھی کوئی چیز تھا لیکن نہ پہچانا مجھے
بندہ پرور قدر ہی تمنے نہیں جانی مری

کھا رہا ہوں رنج اگلی صحبتوں کی یاد میں
ہے پُرانے دوستوں میں آج مہمانی مری

ناز تھا روز مسرت پہ کسے اے شبِ غم،
ہم نہ ہوتے تو کوئی اور پشیماں ہوتا

شدت درد ہی ہوتی کہیں غارتگر ہوش
بخت اِتنا تو نہ برہم زنِ ساماں ہوتا

رہ آنکھ تو دل کو لینے تک بس دل کی ساتھی ہوتی ہے
پھر لیکر رکھنا کیا جانے دل لیتی ہے اور کھوتی ہے

یا دُنیا ہم پر ہنستی تھی یا ہم ہنستے ہیں دُنیا پر
جب ہم رو بیٹھے دنیا کو تو دُنیا ہم کو روتی ہے

لیا بیفکری کی نیند اس کو آئی ہے تیرے پہلو میں
اے مست خواب ناز کہاں ناطق کی قسمت سوتی ہے

ناطق لکھنوی

نام سعید احمد اور تخلص ناطق ہے۔ آپ سید محمد عبدالبصیر حضور زیدی واسطی بلگرامی کے صاحبزادے ہیں۔ آپ کے جدِّ اعلیٰ نواب امیر الحسام مبلغ و مجدد بغداد سے ہندوستان آئے۔ اور بارہ بنکی کے ضلع میں قصبۂ دیوا آباد کیا۔ جناب ناطق صاحب کا سنہ ولادت ۱۸۷۸ء ہے۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں علوم متداولہ سے فارغ ہوئے۔ ابتدا میں تصنیف و تالیف کو ذریعۂ معاش قرار دیا تھا۔ اب تیس برس سے طبابت کر رہے ہیں

ہر ذرہ کائنات ہے اک کائنات کا
موصوف کل صفات ہے ہر جزِ صفات کا

کیا بتاؤں دل کہاں ہے اور کس جا درد ہے
میں سراپا دل ہوں دل میرا سراپا درد ہے

اپنا اپنا حال کہہ لینے دو ناطق سب کو تم
جانتا ہے وہ کہ کس کے دل میں کتنا درد ہے

جو نہ سنبھلا ابتدائے عشق میں
پھر وہ آخر تک سنبھل سکتا نہیں

رسا ہے خضرِ منزل کون اسکے آستاں تک ہے
وہیں تک مجھ کو پہونچا دے نظر میری جہاں تک ہے

کرم ہے اس کا جو عشق و ہوس پہلو بہ پہلو ہیں
یہ دُنیا ورنہ اُن کی اک نگاہِ امتحاں تک ہے

داغ افسردہ مرا سرمایہ دارِ نور تھا
بجھ گیا تھا دل مگر بھی چراغ طور تھا

اک فریبِ حسرتِ دیدار تھا جلوہ ترا
نور سمجھے تھے جسے وہ بھی حجابِ نور تھا

کوئی نہ سُن سکا مرا قصہ زمانے میں
اتنا اثر بھی ہو نہ کسی کے فسانے میں

گزاری دیکھنے میں اسکی ساری زندگی میں نے
مگر یہ شوق ہے دیکھا نہیں گویا کبھی میں نے

محبت ایک مدت سے ہے یہ معلوم ہوتا ہے
تمھیں ہر چند پہلی بار دیکھا ہے ابھی میں نے

خیال دوستی میں محو تھا مجھکو معافی دے
نہ پہچانا جو تجھ کو اے نگاہ دشمنی میں نے

میکشوں کی کمی بیشی پہ ناحق جوش ہے
یہ تو ساقی جانتا ہے کس کو کتنا ہوش ہے

کہہ رہا ہے شور دریا سے سمندر کا سکوت
جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

ابتدا سے آج تک ناطق یہی ہے سرگزشت
پہلے چپ تھا پھر ہوا دیوانہ اب بیہوش ہے

کٹے جا یاد ساری عمر اس حلال مشکل کی
کسی دن ایک ہچکی میں گرہ کھل جائے گی دل کی

مبارک تجھکو جلوہ اور چشم خوں فشاں مجھکو
ترا نظارہ کرلوں اس قدر فرصت کہاں مجھکو

ہر بزم میں وہ مجھکو تنہا نظر آتا ہے
دریا میں ہر اک قطرہ دریا نظر آتا ہے

وہ بے نقاب کہیں بے نقاب ہوتا ہے
کہ آفتاب خود اپنا حجاب ہوتا ہے

چھلک کے گر جو گئی ہے مرے مقدر کی
ضرور لڑ گئی ساقی سے آنکھ ساغر کی

مجال کس کی جو دے ساتھ اسکی منزل تک
کہیں وہی نہ ہو صورت بدل کے رہبر کی

جو زندگی ہو تو کیوں امید ہی کیا ہے
امید بھی ہو تو امید زندگی کیا ہے

سب سے بہتر ہیں کہ میرا ذکر اس محفل میں ہے
مجھسے بہتر وہ کہ جس کی یاد اسکے دل میں ہے

مجھسے چھپ سکتی نہیں ہے آپ کی کوئی ادا
دل مرا آئینہ ہے اور آپ کی محفل میں ہے

جس سے پوچھو میزباں ہے جس کو دیکھو منتظم
پھر کہاں محفل اگر وہ فتنہ گر محفل میں ہے

راز اگر کونین کے ظاہر ہوئے ناطق تو کیا
کاش وہ معلوم ہو جائے جو اسکے دل میں ہے

یہ دل نہیں، نور کا ہے شعلہ کسی سے اس کو ضرر نہیں ہے
مثال برق شرر ہو لیکن مزاج برق و شرر نہیں ہے

حجاب ہے اک مشاہدہ بھی وہ روبرو ہے مگر نہیں ہے
نقاب ہے ایک اسکے رخ کی نظر ہماری نظر نہیں ہے

یا جدائی کے ہیں دن نزدیک یا مرنے کے دن
کہہ رہے وہ کہ اب کوئی جفا باقی نہیں

ڈوبتا ہوں میں مدد میری کرے جو کوئی ہو
مجھکو احساس خدا و ناخدا باقی نہیں

مری نظر ہی پہونچتی نہیں مرے دل تک
رسا نہیں ہے کوئی راہ تیری منزل تک

اے شمع تجھپہ رات یہ بھاری ہے جس طرح
میں نے تمام عمر گزاری ہے اس طرح

ان جفاؤں پر بھی دل کیا جانے کیوں گرویدہ ہے
عشق ہے اک راز جو عاشق سے بھی پوشیدہ ہے

گل پیرو گریباں بلبل مرید نالہ
میری معاشرت کا شہرہ چمن چمن ہے

فرقت میں یہ تو پوچھو کیونکر ہے زندگانی
کچھ ضبط جوشش الفت کچھ ربط جان و تن ہے

ذوق فنا کا بھی کوئی حاصل نہیں رہا
مرتا ہوں میں کہ مرنے کے قابل نہیں رہا

چھپ کر ہوا کے جھونکوں میں آتی ہیں بجلیاں
ناطق چمن یہ رہنے کے قابل نہیں رہا

سر آنکھوں پہ غم دنیا و عقبیٰ
مگر اب دل میں گنجایش کہاں ہے

وہ نازک وقت آیا آخر کار
کہ ہر رنگ اب طبیعت پر گراں ہے

ہے بزمِ محبت میں دل کا عجب افسانہ ۔۔۔ جب شمع نہیں ہوتی جلتا ہے یہ پروانہ
آنکھوں کو بچائے تھے ہم اشکِ شکایت سے ۔۔۔ ساقی کے تبسم نے چھلکا دیا پیمانہ

دل شکن ثابت ہوا ہر آسرا میرے لئے ۔۔۔ کوئی دنیا میں نہیں میرے سوا میرے لئے
شاہراہِ عام سے رسوائی منزل نہ کر ۔۔۔ کچھ نئی راہیں نکال اے رہنما میرے لئے
امتحاں دیکر بھی دے سکتا نہیں اُنکو فریب ۔۔۔ جانتے ہیں وہ کہ آساں ہے وفا میرے لئے

روح کا عقدہ اُلجھکر عقدۂ مشکل بنا ۔۔۔ پھر وہ عقدہ پیکرِ انسانیت میں دل بنا
عشق کی خاطر سے انساں عشق کے قابل بنا ۔۔۔ درد پہلے بن چکا تھا بعد اس کے دل بنا

دیر و حرم میں بحث یہ تھی دل کہاں رہے ۔۔۔ آخر کو طے ہوا کہ یہ بے خانماں رہے

سو تیر زمانے کے اک تیرِ نظر تیرا ۔۔۔ اب کیا کوئی سمجھے گا دل کس کا نشانہ ہے

یہ اثر آیا کہاں سے اک شکستہ ساز میں ۔۔۔ تیری ہی آواز ہے مظلوم کی آواز میں

تبسم ان کے لب پر ایک دن وقتِ عتاب آیا ۔۔۔ اسی دن سے ہماری زندگی میں انقلاب آیا
نہ تقریروں کی حاجت ہے نہ تحریروں کی زحمت ہو ۔۔۔ جہاں دل میں سوال آیا وہیں اس کا جواب آیا
چلو دیکھیں تو ناطق اپنی حد سے بڑھ نہ آیا ہو ۔۔۔ اُٹھا ہے شور کعبہ میں کہ اک خانہ خراب آیا

حسرتوں سے شاد ہے آباد ہے ۔۔۔ دل کی بربادی کی یہ بنیاد ہے
دفعتہً اُس کی نگاہِ التفات ۔۔۔ عشق میں سب سے بڑی آواز ہے
ہے وہی دیوان مطبوعہ مرا ۔۔۔ جس قدر لوگوں کو ناطق یاد ہے

وقتِ بیہوشی جب آجائے تبھی آلام ہے ۔۔۔ دل مسافر کا جہاں ڈوبے وہیں پر شام ہے

ہر رنگ کے جلوے کا ہے پرتو مرے دل میں ۔۔۔ آئینہ کسی شکل سے بیگانہ نہیں ہے
اس بزم میں یوں اہلِ غرض محوِ غرض ہیں ۔۔۔ پروانہ کو جیسے غمِ پروانہ نہیں ہے
ناطق سے چلو پوچھ لیں اسرارِ محبت ۔۔۔ فی الجملہ غنیمت ہے کہ دیوانہ نہیں ہے

نگاہیں باغباں کی بار بار اُٹھتی ہیں اس جانب ۔۔۔ گرے جاتے ہیں ایک ایک کرکے سب تنکے نشیمن سے
یہی شاید بجھا جاتا ہے شمعِ تربتِ ناطق ۔۔۔ وہ دیکھو منہ چھپائے جا رہا ہے کوئی دامن سے

کبھی دامانِ دل پر داغ مایوسی نہیں آیا ۔۔۔ اِدھر وعدہ کیا اس نے اُدھر دل کو یقیں آیا
محبت آشنا دل مذہب و ملت کو کیا جانے ۔۔۔ ہوئی روشن جہاں بھی شمع پروانا نہیں آیا
دو عالم سے گزر کے بھی دلِ عاشق ہے آوارہ ۔۔۔ ابھی تک یہ مسافر اپنی منزل پر نہیں آیا

مری جانب سے اُن کے دل میں کس شکوے پہ کینہ ہے ۔۔۔ وہ شکوہ جو زباں پہ کیا ابھی دل میں آیا بھی نہ تھا
حیاتِ بیخودی کچھ ایسی نا محسوس تھی تا حق ۔۔۔ اجل آئی تو سمجھ کر اپنی ہستی کا یقین آیا

نہ قابو میں ہے دل میرا نہ کہنے میں زباں میری ۔۔۔ کوئی ہو راز داں میرا تو کہہ دے داستاں میری
شرارِ برق و شمع و گل ہوں یا پروانہ و بلبل ۔۔۔ جسے ہے یاد جتنی کہہ رہا ہے داستاں میری
مزے پر قصہ آیا تھا کہ نظمِ زندگی بگڑا ۔۔۔ کہاں پر ختم کر دی بیوفا نے داستاں میری

ان کے لب پر ذکر آیا بے حجابانہ مرا ۔۔۔ منزلِ تکمیل تک پہونچا اب افسانہ مرا

تجھے جو کی ہیں باتیں ہر بات میں اثر ہے ۔۔۔ بیمار ہے جو تیرا اوروں کا چارہ گر ہے

دل میں ہے سرمایۂ کونین راحت کے سوا ۔۔۔ دونوں عالم ہیں مرے قبضے میں قسمت کے سوا

عشاق میں غضب کی ناز آفریں ادا ہے ۔۔۔ جو عشق کا ہے بندہ وہ حُسن کا خدا ہے

آواز دلکش اس کی دل میں کھپی ہوا ایسی ۔۔۔ دھیمے سروں کا نغمہ ہر سانس کی صدا ہے

دل کے ٹکڑے جلوہ زار روئے جانانہ بنے ۔۔۔ آئینہ جب ٹوٹ جائے آئینہ خانہ بنے

اپنے قطرے کو کبھی دریا ڈبو سکتا نہیں، ۔۔۔ آپ سے جو مل چکا ہے اب وہ کھو سکتا نہیں،
ضبط کرنا چاہئے گو ضبط ہو سکتا نہیں، ۔۔۔ آنکھ میں آنسو بھرے بیٹھا ہوں رو سکتا نہیں

محبت انسان کی ہے فطرت، کہاں ہے امکانِ ترکِ الفت ۔۔۔ وہ اور بھی یاد آ رہا ہے میں اس کو جتنا بھلا رہا ہوں،
زباں پہ لبیک ہر نفس میں زمیں [illegible] قدم پر ۔۔۔ چلا ہوں یوں بتکدہ کو ناطق کہ جیسے کعبہ کو جا رہا ہوں،

جوششِ گریہ اور اندھیری رات ہے ۔۔۔ کیا گھٹا ہے کیا بھری برسات ہے

دیکھ کر ان کو نظر میں یہ اثر ہوتا ہے ۔۔۔ جس طرف دیکھئے اک حُسن نظر آتا ہے

دل ہے کس کا جس میں ارماں آپ کا رہتا نہیں ۔۔۔ فرق اتنا ہے کہ سب کہتے ہیں میں کہتا نہیں،

سکون جب سے ہے خطرہ یہ دل کو ہر دم ہے ۔۔۔ کہیں وہ پوچھ نہ بیٹھے کہ درد کیوں کم ہے
تمام بزم پہ اک بیخودی کا عالم ہے ۔۔۔ حریمِ ناز کا ہم میں سے کوئی محرم ہے
یہ کون ہے متحرک کہ جس کی وجہ سے دل، ۔۔۔ کسی کا نام نہیں اور ذکر پیہم ہے

دوبارہ دل میں کوئی انقلاب ہو نہ سکا ۔۔۔ تمہاری پہلی نظر کا جواب ہو نہ سکا
کہاں دل اور کہاں دل کے مانگنے کی ادا ۔۔۔ غرض سوال سے بہتر جواب ہو نہ سکا

اُس کی آنکھوں کا مرے دل میں اگر نور نہ ہو ۔۔۔ غیرتِ حُسن کو نظارہ بھی منظور نہ ہو

اک قیامت ہے عبارت آپ کے وعدہ کی بھی ۔۔۔ دن گزرتے جائیں گے معنی بدلتے جائیں گے

بھی ناطق ہے اک افتادہ اٹھو آگے چلو
رہروان عشق تو اکثر گرے اکثر اُٹھے

کھلی ہے چشم مخمور اُسکی خواب ناز سے
جس طرح جادو جگا کر کوئی جادوگر اُٹھے

ن اُس سے رہوں ناطق مرا مطلب یہ ہو
ورنہ کچھ معنی نہیں ہوتے میری تقریر کے

جو نہ سنبھلا ابتدائے عشق میں
پھر وہ آخر تک سنبھل سکتا نہیں

یہ بھی تھا ایک رُخ نگہ لطف یار کا،
ارمان سوال کا دل سائل میں رہ گیا،

ب صاف سنکر پا گیا سب کچھ فقیر اُن کا
صدا دینے سے مطلب تھا فقط آواز سُن لینا

کے تیور بھی نہ بگڑے بات بھی اپنی بنی
حال ہم کہتے رہے وہ داستاں سمجھا کئے

سے کیا ہم کو چشمک باغباں سے کیا خلش،
بات یہ ہے آشیاں کو آشیاں سمجھا کئے

نارہ میں ہے اک معنی بے لفظ نہاں
گفتگو کب تری محتاج صدا ہوتی ہے

فریب وعدہ کا اب خود علاج کر
آئی نہیں قضا ترے امیدوار کو

سلام وکفر دونوں میں دیکھے گا ایک حسن،
لا دل کی روشنی میں ذرا غور دو تار کو

قریب حسرت دیدار تھا جلوہ ترا،
نور سمجھے تھے جسے وہ بھی حجاب نور تھا

کہتے ہیں کہ دُنیا بھر سے ہے بیگانہ وہ
دیکھتا ہوں میں کہ بے رونق کوئی محفل نہیں

گرتا ہے کوئی آگ میں کیا کیجئے مگر
شبنم کو آفتاب کی قربت پسند ہے

اپنے ہی پیروں سے ہوا ہو جو پائمال
میں راہ میں وہ نقش قدم ہوں مٹا ہوا

تار کو نور کر دیا سرورِ کائنات نے
وہ جو لگی تھی طور پہ آکے بجھی حجاز میں،

خوش و ناخوش جسے جنت میں بسر کرنا ہے
اک ذرا رنگ طبیعت کا بدلنا ہوگا

ساقی کا عکس کھینچا تھا پورا شراب میں
مجبور اپنے ظرف سے پیمانہ ہو گیا،

اُس نے رخصت آہ کی دی مضطرب دل دیکھکر
شمع کی لو کانپتی ہے رنگِ محفل دیکھکر

دیکھے اک امید نے دھوکا دیا ہے ہمیں،
غرقِ دریا میں ہوئے ہم عکس ساحل دیکھکر

فغاں سے چھیڑ پہلو میں جو دل ہے
لئے پھرتا ہے ساز بے صدا کیا

ان سلف جب تک رہے صادق رہی ناطق
جب آخر ہو گئی محفل تو ہم پہنچے ہیں محفل میں

سنہری سطر تھی جس کی شعاع برق طور
آج وہ خط صاحبِ معراج کے نام آگیا

ج دانوں میں روح القدس بھی ہیں ہم بھی
یہ دیکھنا ہے کہ کون انتخاب ہوتا ہے

لیئے سب سے تو باتیں بے تکلف کیجئے
آپ کا جو لفظ ہے وہ میرے دل کا ساز ہے

میرے نالوں کی شکایت صاحب محفل ہو گی — یہ اسی کی بزم کا چھیڑا ہوا اک ساز ہے

شاید قبول ہونے کا وقت آ گیا قریب — طاقت جواب دینے لگی ہر سوال میں

کیا ہوا پہونچا خدا تک ان کا عاشق گر کوئی — ہر اسیر اپنے حدود قید میں آزاد ہے

عشق نے حسن کی طرف پھینک دیا تفاول کا پھول — دست قضا سے آ گرا دامن روزگار پر

غربت کی بیکسی پر کروں گا صبر یا رب — واپس اگر نہ کرتا اس حال سے وطن پر

آزادیوں کا حق نہ ادا ہم سے ہو سکا — انجام یہ ہوا کہ گرفتار ہو گئے

اب دور ہوا ختم مری زیست کا شاید — آغاز میں تھا درد جہاں آج وہیں ہے

مرنے میں ہم اک روح نئی پھونک رہے ہیں — شاید کوئی نغمہ تری آواز سنا دے

ادب یہ روز حقیقت کا اسے مجاز رہے — کہ امتیاز نہ ہو پھر بھی امتیاز رہے

خلل پذیر ہوا سجدۂ محبت بھی — دماغ میں نہ رہا فرق ساجد و مسجود

نگاہ سوز محبت میں اب گناہ کہاں — نکل رہا ہے یہ آنکھوں سے شعلۂ بے دود

علحدہ نہ کر الفاظ سے معانی کو — مجاز ہی میں حقیقت کا راز رہنے دے

پیشانی خیال تعین سے صاف رکھ — پیدا نہ کر شکن نظر امتیاز کی

صیاد سے بھی انس رہائی کا شوق بھی — اک دل مرا قفس میں ہے اک آشیانے میں

تیری جگہ نہیں کسی دل میں وہ ساز ہوں — محمود میرا کوئی نہیں اور ایاز ہوں

اوروں کو ہجر میں ہے سہارا امید کا — مشکل مرے لئے ہے کہ میں پاکباز ہوں

ناطق بغیر مے ہے مری زندگی حرام — خود اپنی میکشی پہ دلیل جواز ہوں

غرق کر دیتی ہے کشتی ناخدا کی بیخودی — چھوڑ دے وہ میکدہ ساقی جہاں مدہوش ہو

سفر میں سعی کامل ہو تو نکلے راہ منزل کی — کہ دریا کی روانی سے بنا پڑتی ہے ساحل کی

حقیقت آدمی کی کیا ملائک جان دیتے ہیں — جہاں ہو روح پر قبضہ وہاں پرسش کہاں دل کی

چھپاؤں سب سے منہ کب تک بتا اپنا نشاں مجھکو — کہ تیری جستجو میں ڈھونڈتا ہے اک جہاں مجھکو

اگر یکساں ہو میرے ساتھ اس کا ظاہر و باطن — تو میں سمجھوں کہ گویا مل گئے دونوں جہاں مجھکو

گدائے میکدہ تھا اب ہوں میں شیخ حرم ناطق — کہیں ایسا نہ ہو پہچان لے کوئی یہاں مجھکو

لہراتی ہے اک بجلی سینے کے حجابوں پر — جنبش میں حرم کا جب پردہ نظر آتا ہے

بڑھی نہ قطرے کی وسعت حباب سے آگے — مگر دکھا تو گیا اک جھلک سمندر کی

نوحؔ ناروی (وفات ۱۰ر اکتوبر ۱۹۶۲ء)

۵۸۶

شبنم کے ہر آنسو میں بات نرالی ہوتی ہے — فرشِ چمن پر قطرہ ہے برگِ شجر پر موتی ہے

کھینچ کر بزمِ جہاں میں چند نالے چل دیے — رہنے والے رہ گئے چل دینے والے چل دیے

جانچ لے اے دیکھنے والے دلِ نخچیر کے — کتنے قطرے خون کے ہیں کتنے ٹکڑے تیر کے

خلق ہو کر آپ پر شیدا ہوئے — ہم اسی کے واسطے پیدا ہوئے

مجھے اٹھاتے ہیں یوں پارسا زمانے کے — کہ جیسے ہوں وہی مالک شراب خانے کے

پوچھتے ہو کیا حقیقت عاشقِ دلگیر کی — حیرت آئینے کی دیکھو خامشی تصویر کی

کم بخت کبھی جی سے گذرنے نہیں دیتی — جینے کی تمنا مجھے مرنے نہیں دیتی

ہم دیر و حرم دیکھ چکے کون و مکاں بھی — بس ایک ہی اللہ یہاں بھی ہے وہاں بھی

میرے جگر و دل میں ہے وجہِ ضیا باری — احسان کا انگارا امید کی چنگاری

ملا دی اپنے جوبن میں مٹی میں ساری آبرو میری — نکل جا اب مرے دل سے نہ میں تیرا نہ تو میری

اسی طرح دادِ حسن دی میں نے — دیکھ کر ان کو آہ کی میں نے

ساقی جو دل سے چاہے تو آئے وہ زمانہ — ہر شخص ہو شرابی ہر گھر شراب خانہ

فتنے دبے دبائے تھے جتنے پڑے ہوئے — بیٹھے کہیں جو تم تو وہ سب اٹھ کھڑے ہوئے

سکھا لیے والے سکھا لیں شوق ہے اکثر ہم کو تم کو — آنا جانا ملنا جلنا کھل کر صحبت کر ہم کو تم کو

مقام رام پور ۳ نومبر ۱۹۱۹ء توقیع [illegible]

نوح ناروی

یکم شوال بروز جمعہ بوقت صبح صادق سنہ ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸ ستمبر ۱۸۷۹ء اپنے ننہال بھوانی پور تحصیل سلون ضلع رائے بریلی اودھ۔ اپنے نانا شیخ علم الہدیٰ صاحب کے دولتکدہ پر پیدا ہوا۔ پہلے حافظ قدرت علی صاحب و مولوی یوسف علی صاحب ساکنان نارہ پھر حاجی عبدالرحمٰن صاحب جائسی تعلیم کے لئے مقرر ہوئے۔ ان صاحبوں کے بعد میر نجف علی صاحب سے فارسی کی انتہائی اور عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی کچھ دنوں تک مع سکول پر اپنے مکان واقع قصبہ نارہ ضلع الٰہ آباد ہی میں انگریزی بھی پڑھی۔ شعروسخن کا شوق میر نجف علی صاحب کی صحبت میں پیدا ہوا۔ شروع میں انھیں سے اصلاح لیتا رہا اور پھر جناب امیر مینائی لکھنوی کو دو تین غزلیں دکھائیں پھر جناب جلال لکھنوی سے پانچ چھ غزلوں میں مشورۂ سخن لیا اور آخر میں نواب فصیح الملک حضرت داغ دہلوی کا شاگرد ہو گیا۔ دو تین سال ہی گزرے تھے کہ حضرت داغ نے خود اپنے پاس دوبارہ بلوایا اور ۱۸۹۷ء میں حیدرآباد پہونچا اور یہاں حضرت داغ و جناب ظہیر دہلوی سے مہری و دستخطی سندیں حاصل کیں۔ حضرت داغ دہلوی کے انتقال کے بعد ان کی جانشینی کے جھگڑے بہت دنوں تک چلتے رہے اور بطور خود اس کے مدعی بہت سے لوگ تھے۔ لیکن سائل صاحب دہلوی نے خیال کیا کہ ایک ہی شخص پر یہ شرف کیوں محدود کیا جائے جتنے قابل قابل شاگرد ہیں وہ سب جانشینی کے مستحق ہیں لہٰذا سب سے پہلے مجھکو جانشینی کی سند عطا کی۔ میرے دو دیوان سفینۂ نوح و طوفان نوح چھپ چکے ہیں۔ تیسرا دیوان اعجاز نوح مکمل ہو چکا ہے مگر ابھی طبع نہیں ہوا۔ میرے شاگردوں کی تعداد ۱۰۰۰ سے کسی طرح کم نہ ہوگی اس میں چالیس پچاس اشخاص نہایت اچھے کہنے والے ہیں اور بجائے خود صاحب دیوان و صاحب تلامذہ ہیں۔ انتخاب کلام یہ ہے:-

نوح ناروی

وفا و مہر کے بعد آپ کا مغرور ہو جانا	یہ ایسا ہے کہ جیسے پاس ہوکر دور ہو جانا
دکھائے پانچ عالم اک پیام شوق نے مجھکو	اُلجھنا روٹھنا لڑنا بگڑنا دور ہو جانا
رودادِ شوق و شرحِ محبت نہ پوچھئے	بس جان جائیے مری حسرت نہ پوچھئے
کیوں کر بسر ہوئی شبِ فرقت نہ پوچھئے	سب مجھ سے پوچھئے یہ مصیبت نہ پوچھئے
کعبہ یہی ہے دیر یہی طور بھی یہی ،	اس بے دلی سے دل کی حقیقت نہ پوچھئے

نکھر آئی نکھار آئی سنور آئی سنوار آئی — گلوں کی زندگی لے کر گلستاں میں بہار آئی
مشیت کو نہیں منظور دو دن پارسا رکھنا — ادھر کی میں نے توبہ اور اُدھر فوراً بہار آئی
اسیرانِ قفس کو واسطہ کیا ان جھمیلوں سے — چمن میں کب خزاں آئی چمن میں کب بہار آئی
مجھے گلشن سے اے جوشِ جنوں صحرا کو لے چل — یہاں اس کے سوا کیا ہے خزاں آئی بہار آئی
ہمیشہ بادہ خواروں پر خدا کو مہرباں دیکھا — جہاں بیٹھے گھٹا اُٹھی جہاں پہنچے بہار آئی

آپ ہیں ہم ہیں مے ہے ساقی ہے — یہ بھی ایک امر اتفاقی ہے
ہوگئیں ختم ہجر کی گھڑیاں — اور تھوڑی سی رات باقی ہے
بے پئے نام تک نہیں لیتا — مجھکو یہ احترامِ ساقی ہے

مرنا خیالِ حق میں معراجِ زندگی ہو — دار و رسن سے سنئے منصور کا فسانہ

دل ہے تو اُسی کا ہے جگر ہے تو اُسی کا — اپنے کو رہِ عشق میں برباد جو کر دے
ناکام مقاصد نہ رہیں اہلِ تمنا — تقدیر بھی تدبیر کو امداد اگر دے

میں تسلیم کرتا ہوں کہ تم کو اس سے نفرت ہے — مگر اتنا سمجھ رکھو محبت پھر محبت ہے

اور تو ہم نے کچھ بھی نہ جانا لیکن اتنا جان گئے — دنیا میں ناداں آئے ناداں رہے ناداں گئے
اللہ اللہ اُس کا جلوہ ہم جلوے کو مان گئے — دیکھیں تو کیا حال ہوا اپنا بے دیکھے قربان گئے

ہم اُن سے کیوں کہیں آزار دینا ملتوی کر دو — طبیعت رفتہ رفتہ خوگرِ غم ہوتی جاتی ہے

تیرِ نظر کے شوق میں دل بے قرار ہے — دیکھیں نہ دیکھیں اب یہ انھیں اختیار ہے
کیا کام اُس کو پرسشِ جرم و قصور سے — کچھ اور خیر رحمتِ پروردگار ہے

کم بخت کبھی جی سے گزرنے نہیں دیتی — جینے کی تمنا مجھے مرنے نہیں دیتی

ہر صدائے عشق میں اک راز ہے — نالۂ دل غیب کی آواز ہے
کچھ نہ کہنا بھی کسی کے سامنے — اک طرح کا انکشافِ راز ہے
عشق نے دل کو پکارا اس طرح — میں یہ سمجھا آپ کی آواز ہے
اُن سے مل کر میں انھیں میں کھو گیا — اور جو کچھ ہے وہ آگے راز ہے
حُسن کے جلووں کو اپنے دل میں دیکھ — لن ترانی دور کی آواز ہے
وسعتِ تنظیمِ قدرت دیکھنا — ایک دل میں دو جہاں کا راز ہے

میں غم کا فسانہ کس سے کہوں غمخواروں سے گھر خالی ہو — کون آنے جانے والا ہے سانس آنے جانے والی

حسرت جوشِ وحشت کی نہ فصلِ گل کا ارماں ہے   جو خود ہی چاک ہو جاتا ہے وہ میرا گریباں ہے
فرضی رکھ لئے دو نام دستورِ محبت نے   حقیقت میں مرا دل ہے نہ ارماں ہے نہ پیکاں ہے

کیوں رندی و مستی میں لہرائے نہ میخانہ   بہتا ہوا دریا ہے چلتا ہوا پیمانہ
رنگینیِ عالم کی برعکس یہ تصویریں   سو گل ہیں مگر عالم ہر گل کا جداگانہ
قبروں کے مناظر نے کروٹ نہ کبھی بدلی،   اندر وہی آبادی باہر وہی ویرانہ

طلب میں بنے وہ نشتر ادھر سے جاتے اُدھر سے آتے   چبھے جو کانٹے قدم قدم پر ادھر سے جاتے اُدھر سے آتے
ہیں نہ تھک کر رُکے کوئی دم طوافِ بزمِ حبیب میں ہم   چلے ہیں دیر و حرم بھی اکثر ادھر سے جاتے اُدھر سے آتے

ہانے والے بہکائیں شوق سے اکثر ہم کو تم کو   آنا جانا ملنا جُلنا چھپ کر کھل کر ہم کو تم کو
پھر گردوں پر بدلی چھائی بدلی میں بجلی لہرائی   پیتے جائیں دیتا جائے ساقی ساغر ہم کو تم کو
کتنے دنوں تک بزم آرائی آپس میں پھر ہوگی جدائی   ایک جگہ رہنے ہی نہ دے گا چرخِ ستمگر ہم کو تم کو

دلِ مضطر کو اظہارِ وفا کی یہ نئی سوجھی،   فغاں کرتا ہے پہلے پھر تمھارا نام لیتا ہے

وہ نادم ہوئے قتل کرنے کے بعد   ملی زندگی مجھکو مرنے کے بعد
رہا زندہ در گور مرنے سے قبل   خدا جانے کیا ہوگا مرنے کے بعد
ترے عشق کا خاتمہ ہو گیا،   مرے کون اب میرے مرنے کے بعد

اب اور اس سے سوا حالِ زار کیا ہوگا   وہ مجھ کو دیکھنے آئے مگر نہ دیکھ سکے،
وہ برق کیا جو دوبارہ نہ طور پر چمکی،   وہ حسن کیا جسے ہم دیکھ کر نہ دیکھ سکے

حسن کے ناز جدا عشق کے انداز جدا   ہے یہ مشکل مری دنیا تری دنیا ہو جائے
دینے والے نے فقط دل کو یہ قدرت دی ہو   ابھی گلشن ابھی صحرا ابھی دریا ہو جائے
عشق میں ضبطِ غمِ عشق کی خوبی ہے یہی،   دم بخود میں رہوں لیکن کوئی رسوا ہو جائے

محفلِ عالم کی رونق میں کمی ممکن نہیں،   چل بسے میخوار لیکن دور چلتے ہی رہے
وادیِ اُلفت میں دیکھی ہم نے کب منزل کی شکل   گر پڑے گر کر اُٹھے اُٹھ کر سنبھلتے ہی رہے

جہاں میں اک نہ اک مرنے کی نئی کہانی ہے اور ہم ہیں   ابھی تمنا ہے اور دل ہے ابھی جوانی ہے اور ہم ہیں
غریقِ بحرِ ستم نہ کیوں ہوں یہ جاں فشانی ہے اور ہم ہیں   کہ آپ ہیں آپ کی چھری ہے چھری کا پانی ہے اور ہم ہیں،

شکوۂ غم مجھے روا بھی نہیں   اور پھر حلم آپ کا بھی نہیں
ہم بڑی دیر سے یہ دیکھتے ہیں   اس طرف کوئی دیکھتا بھی نہیں
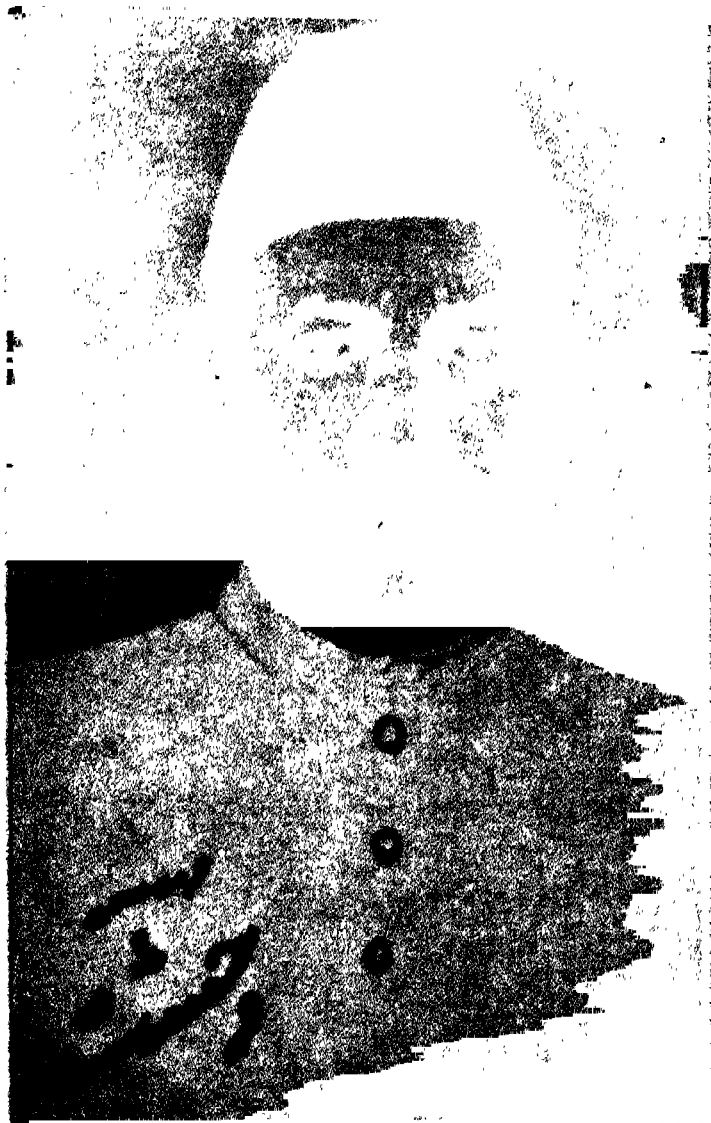
وحشت کلکتوی (وفات ۱۹۵۶ء)

غزل

تری بزم ناز میں تھا جو دل کبھی شمعِ روشنِ آرزو
ستمِ زمانہ سے بنگیا وہی آج مدفن آرزو

مرا دل ازل کا فسردہ ہے مجھے شوق سے سروکار کیا
نہ ہوائے میکدۂ ہوس نہ دماغِ گلشن آرزو

گئی یک بیک مری خستگی ہوئی دور ساری شکستگی
کبھی آئی جھولکے شوے دل جو نسیمِ گلشنِ آرزو

نہ خدنگِ ناز نے رُخ کیا کبھی جانبِ دلِ بے نوا
نہ گلِ مراد سے پُر ہوا کبھی اپنا دامنِ آرزو

مجھے یاد آتا ہے اپنا دل کہ بہار جس سے تھی منفعل
وہ نہالِ تازۂ رنگ و بو وہ چراغِ روشنِ آرزو

نہ کوئی ہوس ہے نہ ولولہ یہ ہے حال وحشتِ خستہ کا
ہے فریب خوردۂ آرزو وہ بنا ہے دشمنِ آرزو

وحشت کلکتوی

میں ۱۸ر نومبر سنہ ۱۸۸۱ء میں متولد ہوا۔ شہر کلکتہ میرا مولد و مسکن ہے۔ سنہ ۱۹۱۰ء میں میرا دیوان شایع ہوا جس میں
کچھ فارسی کلام بھی شامل ہے۔ مولانا حالیؔ علامہ شبلیؔ حضرت ظہیرؔ دہلوی (شاگرد ذوقؔ) اور دیگر اکابر عصر نے اِس کی
بہت تحسین کی۔ بقول مولانا حالیؔ اِس حقیر نے تتبع غالبؔ کا حق ادا کیا۔
میں اسلامیہ کالج کلکتہ میں اُردو کا پروفیسر تھا۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں سرکار سے خطاب خان بہادر عطا ہوا۔ فی الحال پنشن پاتا ہوں

وحشت

انتخاب اشعار یہ ہے:-

خود نما جلوہ ترا د[illegible]
کون ہے تیرے سوا پردہ دریِ راز ترا

ہمارے پاؤں میں تو تم نے زنجیرِ [illegible] ڈالی
تمہارے ہاتھ سے کیوں رشتۂ مہر و کرم چھوٹا

تغافل تو ادا ہے، پُرخطر ہے التفات اُس کا
مصیبت آئے گی اُس وقت جب وہ مہرباں ہوگا

ابھی تو تیری مایوسی سے اطمیناں ہے اے دل
مجھے اُس وقت ہوگا خوف جب تو شادماں ہوگا

تہِ مرقد قرار آئے گا کیونکر مرنے والوں کو
[illegible] تم کو دوستوں کا غم نصیب دشمناں ہوگا

پھر نوازش آپ کی حد سے زیادہ ہو گئی
[illegible] دل آفت رسیدہ بدگماں ہونے لگا

پھر ہوا میرے لئے شوق آفریں اُس کا شباب
پھر مرا دل عہدِ پیری میں جواں ہونے لگا

ہوئی جو چشمِ ہوس کامیاب نظارہ
کرم ہے یہ بھی ترے شوقِ خود نمائی کا

جو مجھکو ڈر ہے تو یہ ڈر ہے طیِ منزل میں
شکستہ دل نہ کرے غم شکستہ پائی کا

بہارِ گلشنِ اُمید کا مآل نہ پوچھ
وہ خواب رونقِ گلدستۂ خیال ہوا

جہانِ شوق میں کیا کیا رہا ہے شور انگیز
فسونِ عشق کہ افسانۂ جمال ہوا

گئے وہ دن کہ حصہ تھا ترا تیرِ نظر میرا
ابھی تک اُس خلش کو یاد کرتا ہے جگر میرا

مجھے اب طعنۂ افسردگی دیتا ہے تو اے دل
کبھی طوفان تھا میں بھی [illegible] یاد کر میرا

وہ سنگِ در کو اپنے دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں خدا لائے کہاں سے وحشتِ شوریدہ سر میرا

ہر چند اُس نے رسمِ تغافل کر[illegible]ی شوقِ جنوں مزاج نہ واقف ذرا ہوا

عبرت کی داستاں ہوں بس اے ہمنشیں نہ پوچھ انجامِ کاروبارِ تمنا کا کیا ہوا

گو حیا نے جنبشِ لب کی نہ دی رخصت انھیں میں شہیدِ طرزِ پرسشہائے پنہاں ہو گیا

میں تیری بزم سے کچھ نامراد بھی نہ پھرا بقدرِ شوق اگر بامراد آ نہ سکا

کسی سے کہتی ہے چتون کسی کی کہ تو کیا اور تیرا مدعا کیا

معاذ اللہ اتنی نا اُمیدی کہے بھی وہ نگاہِ آشنا کیا

مجالِ ترکِ محبت نہ ایک بار ہوئی خیالِ ترکِ محبت تو بار بار آیا

نشانِ منزلِ جاناں ملے ملے نہ ملے مزے کی چیز ہے یہ ذوقِ جستجو میرا

موافقت کی توقع ہے مجھ کو عالم سے نہیں ہے دہر میں میرے سوا عدو میرا

تغافل تو قیامت ہے ترے ایذا پسندوں کو جفا کرتا اگر تو واقفِ رسمِ وفا ہوتا

نجانے ناز کرتی کس قدر بلبل گلستاں پر اگر اک پھول بھی شرمندۂ بوئے وفا ہوتا

بارہا بے اتفاق دیکھ کر صیاد کی خود بخود بیتاب ہو کر میں تہِ دام آ گیا

گو کہ میں بیٹھا تھا وحشت بزم میں بیگانہ وار اُس نگاہِ آشنا کا مجھ کو پیغام آ گیا

مانعِ فریاد ہے کچھ طبع کی افسردگی کچھ سکوت آموز ہے پاسِ ادب صیاد کا

نرگسِ مستانہ میں کیفیتِ جامِ شراب قامتِ رعنا پہ عالم مصرعۂ اُستاد کا

اُس نگاہِ شرمگیں نے کر دیا رسوا ہمیں ہائے وہ افسوں کہ جو آخر کو افسانہ ہوا

ہے نظر بازوں میں ہلچل سب ہیں گرمِ جستجو وہ پری ہے کون، وحشت جس کا دیوانہ ہوا

وہ آنسو باوجودِ ضبط جو نکلے، قیامت تھے غمِ طولانیِ دل کو بشکلِ مختصر دیکھ

دلِ آشفتہ کو گم گشتۂ کوئے وفا پایا سرِ شوریدہ کو منت گزارِ سنگِ در دیکھ

اندیشۂ سود و زیاں زنجیرِ پائے شوق ہے کچھ جذبۂ دل کی بھی سُن، اے عقل خودداری نہ کر

ایمان اگر جاتا رہا اُس بت کی وحشت کیا خطا ہم بھی خدا لگتی کہیں تو بھی طرفداری نہ کر

خود بخود آ ہی گیا کچھ شیوۂ عرضِ نیاز اُس سراپا ناز کو اپنے مقابل دیکھ کر

بیخبر منزل سے ہیں وہ سالکانِ راہِ عشق جو قدم رکھتے ہیں راہ و رسمِ منزل دیکھ کر

گویا ہے کوئی اور بھی مامن زمانے میں! مایوس ہو کے اُٹھتے ہیں اُس آستاں سے ہم

جور ترے کچھ اور خبر دیتے ہیں ہمیں،   گھبرا رہے ہیں اپنے دلِ شادماں سے ہم

اک یادِ عیش جس پہ ہو قرباں ہزار عیش   لے کر چلے ہیں ساتھ تری انجمن سے ہم
کیا رنگ انتقامِ خزاں کا ہو دیکھیے   ڈرنے لگے ہیں جوششِ بہارِ چمن سے ہم

ہمارے آگے سے وہ جب کبھی گزرتے ہیں   ہم اپنے کھوئے ہوئے دل کو یاد کرتے ہیں
یہ کیا ہجومِ تمنا ہے، خیر ہو یا رب   ہم اُن سے ڈرتے نہیں، اپنے دل سے ڈرتے ہیں

دل کے کہنے پہ چلوں عقل کا کہنا نہ کروں   میں اسی سوچ میں ہوں کیا کروں اور کیا نہ کروں
کس طرح حسنِ زباں کی ہو ترقی وحشتؔ   میں اگر خدمتِ اُردوئے معلیٰ نہ کروں

جو حق پوچھو، کتابِ آرزو کا حرفِ باطل ہوں   مٹا دیں کیوں نہ وہ مجھکو، مٹا دینے کے قابل ہوں
خفا تم جرمِ اُلفت پر، خجل میں جرمِ اُلفت سے   نہ تم ملنے پر آمادہ نہ میں ملنے کے قابل ہوں،

التفات وہ نہیں ہوتا جو مرے دل کی طرف   دلربائی کی اسے خاص ادا کہتے ہیں،
سادہ دل کتنے ہیں اربابِ محبت ہے ہے   کہ ترے عشوۂ پنہاں کو حیا کہتے ہیں

وہی غواص ہیں جو ڈوب کر اُبھرے نہ دریا سے   نہیں ہے عشق میں اُن کی سند جو پار اُترتے ہیں
ضرورت تم کو کیا مجھ سے تکلف کی، تواضع کی   یہی انداز وہ ہیں جو مجھے پامال کرتے ہیں

بنایا میں نے دلکش اور بھی نقشِ محبت کو   وفا کا رنگ بھر کر اُس کی تصویرِ خیالی میں

اِس دلنشیں ادا کا مطلب کبھی نہ سمجھے   جب ہم نے کچھ کہا ہے وہ مسکرا دیے ہیں
کچھ شوخ کر دیا ہے چھیڑوں سے ہم نے تم کو   کچھ حوصلے ہمارے تم نے بڑھا دیے ہیں

جھوم رہا ہوں بیٹھ کر وادیٔ کوہسار میں   جاؤں چمن کی سیر کو، ہوش کہاں بہار میں
ہو گئی زندگی عذاب کیسی کشاکش آ پڑی   شوقِ سبک خرام میں عقلِ گراں وقار میں

کبھی جو دیکھتے تھے خواب ہم جمعیتِ دل کے   وہ اب نذرِ خیالاتِ پریشاں ہوتے جاتے ہیں
جنوں انگیزیاں بڑھتی چلی ہیں اُس کے گیسو کی   بہت سے ہاتھ اب صرفِ گریباں ہوتے جاتے ہیں

نشانِ زندگیٔ دل ہے بیقراریٔ دل   ہے دل کی موت اگر چین آ گیا دل کو
فریب کھاتا ہے ہر ہر قدم پہ منزل کا   وہ کیا کرے کہ نہ دیکھا ہو جس نے منزل کو

بزمِ اغیار میں معذور نہ تھے وہ وحشتؔ   بات اگر کر نہیں سکتے تھے، اشارا کرتے!

تا بکے شکلِ مجازی میں تری جلوہ گری   اُس حقیقت کو جو پوشیدہ ہے عریاں کر دے

اک حد ضرور ہوتی ہے صبر و قرار کی   اب نوبت آئی نالۂ بے اختیار کی،

آنکھوں نے تیری ہوش اڑائے شراب کے — چہرے نے تیرے بات بگاڑی بہار کی

آپ اپنا روئے زیبا دیکھئے — یا مجھے محوِ تماشا دیکھئے

حسرتوں کا ہائے رے دل میں ہجوم — آرزوؤں کا نتیجہ دیکھئے

مرہم کا ذکر کس نے عداوت سے کر دیا — یہ کیا نئی خلش مرے زخمِ کہن میں ہے

ہیں اہلِ انجمن کی جو بے التفاتیاں — خلوت کا لطف مجھکو تری انجمن میں ہے

اور ہوں گے وہ نکالیں گے جو دل کی آرزو — وہ تمنا جان ہے میری جو میرے دل میں ہے

جس سے چاہو پوچھ لو تم میرے سوزِ دل کا حال — شمع بھی محفل میں ہے پروانہ بھی محفل میں ہے

یقینِ نامرادی پر بھی حالت ہے وہی دل کی — تمھیں سے چاہتا ہوں داد اپنی سعی باطل

چشم کو میں نے بہر سو نگراں دیکھا ہے — نہیں معلوم ترا جلوہ کہاں دیکھا ہے

شرم ہے ایک ادا ورنہ تری آنکھوں میں — ہم نے اک میکدۂ شوق نہاں دیکھا ہے

عجب نعمت ہے سوزِ عشق بھی جس کو میسر ہو — نہ جل سکتا ہو جو دل وہ جلا دینے کے قابل

فقط بیگانہ خوئی ہی نہیں ہے شانِ محبوبی — کتابِ آشنائی دیکھ اُٹھا کر طاقِ نسیاں

کوئے جاناں کے لئے میں ہی نہیں ہوں مضطرب — کوئے جاناں بھی ہے آتش زیرِ پا میرے

اب خفا ہونے لگے ہو مجھ سے ہر ہر بات میں — تم کہ ہو جاتے تھے دشمن سے خفا میرے

دونوں نے کیا ہے مجھ کو رسوا — کچھ درد نے اور کچھ دوا نے

بیجا ہے تری جفا کا شکوہ — مارا مجھکو مری وفا نے

کیوں میرے فایدے کو بدلے نظامِ قدرت — پروا ہو دشتِ غم کو کیا اک شکستہ پا کی

ارمان کا نتیجہ حرماں نہ ہو الٰہی — حسرت ہے آشنا کو دیدارِ آشنا کی

ہے یہ اندیشہ کہیں دل کو نہ ہو جائے خبر — آنکھ دیکھی ہے تری او دلستاں بدلی ہوئی

خزاں کا شکوہ کریں کیا کہ ہم بہار میں بھی — ہلاکِ جلوۂ رنگینیٔ بہار رہے

اُس انجمن میں کہ بہتی ہو بیخودی کی شراب — وہ ہوشیار نہیں ہے جو ہوشیار رہے

گئے وہ دن جبکہ اس چمن میں ہوائے نشو و نما تھی ہم کو — خزاں کو دیکھا نہیں ہے ہم نے خواہشِ رنگ و بو کریں

وطن میں آنکھ چُراتے ہیں ہم سے اہلِ وطن — تڑپتے رہتے تھے غربت میں ہم وطن کے لئے

نیازِ عشق اپنی حد کو پہونچا وائے ناکامی — ابھی نیرنگیاں باقی ہیں نازِ فتنہ پرور

سرِ بالیں ذرا آجاؤ تم بیمارِ ہجراں کے — کہ اک ہچکی میں وہ کہدے کہانی زندگی بھر

نگاہِ ناز تیری میرے حق میں اک معما ہے — سمجھ ہی میں نہیں آتا ہے کیا ارشاد ہوتا ہے
عجب حسرت فزا ہوتی ہیں وہ شبہائے تنہائی — کہ میں ہوتا ہوں اور میرا دلِ ناشاد ہوتا ہے

قفس میں عمر گزری نالہ و آہ و فغاں کرتے — ہم آخر کس توقع پر خیالِ آشیاں کرتے
پتا ملتا نہیں جنسِ وفا کا اب زمانے میں — کہیں سے ہاتھ اگر لگتی تو نذرِ دوستاں کرتے
مزا آتا اگر گزری ہوئی باتوں کا افسانہ — کہیں سے ہم بیاں کرتے کہیں سے تم بیاں کرتے
نہ پروا کی ہماری کارواں نے جب تو پھر ہم بھی — بچھڑ کر کارواں سے کیا تلاشِ کارواں کرتے

دمِ عشرت مجھے اندیشۂ انجام ہوتا ہے — مرا دل کانپتا ہے دور میں جب جام ہوتا ہے

رہی یک چند نقشِ آرزو کی دل میں رنگینی — وہ اک بیکار سی تحریر تھی، میں نے مٹا ڈالی،
تری بیگانہ خوئی پردہ دارِ رازِ الفت تھی — کیا وحشت کو رسوا جب نگاہِ آشنا ڈالی

ہنسا ہوں حال پر اپنے جہاں رونے کا موقع تھا — کیا ہے تکرکے پردے میں قسمت کا گلا میں نے
حریفِ غفلتِ ہستی نہیں تحریکِ بیداری — نہ اٹھنا تھا نہ اٹھا گو سنی بانگِ درا میں نے

ہے ہدایت کے لئے موجود خود تیرا ضمیر — گوشِ دل سے سُن حقیقت کی یہی آواز ہے
کس طرح وحشت کروں عرضِ نیازِ بندگی — بے نیازِ سجدہ اُس کا آستانِ ناز ہے

گو میں ہوں تجھ سے دور تری آرزو تو ہے — تیرا پتا ملے نہ ملے جستجو تو ہے
وہ آئیں یا نہ آئیں اُنھیں اختیار ہے — اے ذوقِ انتظار میں خوش ہوں کہ تو تو ہو
پروانے کی ہے موت پہ اے شمع مجھکو رشک — تیرا شہیدِ ناز ترے روبرو تو ہے

اُنھیں علم ہو چکا ہے مری طاقت و تواں کا — وہ کریں گے خاک پروا مرے نالہ و فغاں کی
سرِ شاخ آشیاں بھی مجھے خوف تھا قفس کا — نہ ہوئی نصیب دل کو کبھی راحت آشیاں کی
مرے گریۂ الم پر نہ بہائے جائیں آنسو، — کہیں تم ہنسی، نہ کرنا مری چشمِ خونفشاں کی
مجھے ہمنوا نہ دینا کہیں زحمتِ تکلم — کہی جائے گی قفس میں نہ حکایت آشیاں کی
ہو رسائی کیا وہاں تک بس اک آسرا یہی ہے — کہ اُنھیں کو یاد آئے کبھی اپنے ناتواں کی
مجھے اب شگفتگی کی ہو قفس میں کیا توقع — گئی ساتھ آشیاں کے جو تھی بات آشیاں کی

چین آئے گا کہاں دل کو خدا ہی جانے — دشت سے بھی وہی وحشت ہے جو تھی گھر سے مجھے
ساقیِ بزم سے کہتی ہے ہماری توبہ — کہ تو ٹکرا دے چھلکتے ہوئے ساغر سے مجھے

یگانہ چنگیزی (وفات ۹ر فروری ۱۹۵۶ء)

یگانہ چنگیزی

میرزا واجد حسین یگانہ چنگیزی ابن میرزا پیارے صاحب ابن میرزا آغا جان ابن میرزا احمد علی ابن میرزا حسن بیگ چغتائی۔ یہ سلسلۂ نسب چنگیز خاں تک پہونچتا ہے۔ میرے ننھیالی بزرگ جس کا سلسلہ نواب میرزا آغا جان تک پہونچتا ہے، لکھنؤ سے عظیم آباد چلے گئے اور مرشد آباد سے بھی ان کے تعلقات تھے۔

میری ولادت کی ٹھیک تاریخ تو معلوم نہیں مگر اتنا معلوم ہے کہ سنہ ۱۳۰۱ھ ذی الحجہ کی آخری تاریخوں میں سے کوئی تاریخ تھی۔ عظیم آباد کا محلہ مغلپورہ میرا مولد ہے.................. میری ابتدائی تعلیم مولانا محمد سعید صاحب حسرت عظیم آبادی کے مدرسہ میں ہوئی۔ اُس کے بعد عظیم آباد کے محمڈن اینگلو عربک اسکول میں داخل ہوا۔ اول سے آخر تک وظیفے، تمغے اور انعام پاتا رہا۔ سنہ ۱۹۰۳ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے انٹرنس پاس کیا۔ میرے مذاقِ سخن کی اصلاح سب سے پہلے حضرت اُستاذی مولوی سید علی خاں صاحب بیتاب عظیم آبادی نے کی اور بعد ازاں اپنے اُستاد خان بہادر مولانا سید علی محمد صاحب شاد کے سپرد کر دیا جن کی ذات گرامی سے خاکسار کو بہت کچھ فیض پہونچا ہے۔ سنہ ۱۹۰۴ء میں میں نے کلکتہ اور مٹیا برج کا سفر کیا جہاں پرنس میرزا محمد مقیم بہادر (سلطان عالم حضرت میرزا محمد واجد علی شاہ بہادر کے نواسے) کے مرشد زادوں یعنی محمد یعقوب علی میرزا اور محمد یوسف علی میرزا کا کچھ دنوں معلّم رہا۔ مگر مٹیا برج کی آب و ہوا نے صحت پر بہت خراب اثر کیا۔ کچھ دنوں علیل رہکر عظیم آباد واپس آیا یہاں بھی صحت درست نہ ہوئی۔ آخرکار لکھنؤ پہونچا۔ یہ واقعہ سنہ ۱۹۰۵ء کا ہے۔ یہاں کی آب و ہوا اور رنگا رنگ دلچسپیوں نے مجھ پر کچھ ایسا اثر کیا کہ یہیں کا ہو رہا۔ وقتاً فوقتاً عظیم آباد جاکر اور جایداد کا کچھ حصہ فروخت کرکے لکھنؤ میں بے فکری سے بسر کرتا رہا۔ حسنِ اتفاق سے ایک سال میرے مکرم و محترم نواب نبا صاحب موجؔ عظیم آبادی اپنے علاج کی غرض سے لکھنؤ تشریف لائے اور اُنھیں کی وساطت سے لکھنؤ کے اک معزز متوسط گھرانے میں میری شادی ہوئی۔ یہ واقعہ سنہ ۱۹۱۳ء کا ہے۔ میرے خسر جناب حکیم میرزا محمد شفیع صاحب اور نواب نبا صاحب موجؔ سے دیرینہ مراسم تھے۔ کتنے شایستہ کتنے پاکیزہ مزاج لوگ تھے خدا جنت نصیب کرے۔

خاکسار میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی سب رجسٹرار (سرکار نظام)

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

پیامِ زیرِ لب ایسا کہ کچھ سنا نہ گیا، اشارہ پاتے ہی انگڑائی لی رہا نہ گیا

گناہِ زندہ دلی کہیے یا دل آزاری کسی پہ ہنس لیے اتنا کہ پھر ہنسا نہ گیا!

سمجھتے کیا تھے۔ مگر سنتے تھے ترانۂ درد سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سنا نہ گیا!

بتوں کو دیکھ کے سب نے خدا کو پہچانا خدا کے گھر تو کوئی بندۂ خدا نہ گیا!

انھیں ذوقِ حضوری خواب و بیداری میں حائل تھا خداوندا وہ آنکھیں کون سی تھیں کون سا دل تھا؟

تماشا گاہِ حیرت میں کہاں کا تو کہاں کا میں بس اتنا تھا کہ آئینے سے آئینہ مقابل تھا!

نگاہِ شوق کی دُنیا خدا جانے کہاں تک ہے جہاں دیکھا وہی حسنِ یگانہ۔ شمعِ محفل تھا!

قصہ کتابِ عمر کا کیا مختصر ہوا؟ رُخ داستانِ غم کا اِدھر سے اُدھر ہوا!

ماتم سرائے دہر میں کس کس کو روئیے اے وائے۔ دردِ دل نہ ہوا دردِ سر ہوا

ادب نے دل کے تقاضے اُٹھائے ہیں کیا کیا ہوس نے شوق کے پہلو دبائے ہیں کیا کیا!

اسی فریب نے مارا کہ کل ہے کتنی دور؟ اس آج کل میں عبث دن گنوائے ہیں کیا کیا!

پیامِ مرگ سے کیا کم ہے مژدۂ ناگاہ؟ اسیر چھوٹتے ہی تلملائے ہیں کیا کیا!

پہاڑ کاٹنے والے زمیں سے ہار گئے اسی زمین میں دریا سمائے ہیں کیا کیا!

بلند ہو تو کھلے تجھ پہ زورِ پستی کا بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا!

خوشی میں اپنے قدم چوم لوں تو زیبا ہے وہ لغزشوں پہ مری مسکرائے ہیں کیا کیا!

خدا ہی جانے یگانہ میں کون ہوں کیا ہوں؟ خود اپنی ذات پہ شک دل میں آئے ہیں کیا کیا!

سب ترے سوا کافر۔ آخر اس کا مطلب کیا! سر پھرا دے انساں کا ایسا خبطِ مذہب کیا؟

روح پھونک دیتی ہے ایک جنبشِ لب کیا دیکھئے دکھاتا ہے وعدۂ مذبذب کیا؟

ہو رہے گا سجدہ بھی جب کسی کی یاد آئی یاد جانے کب آئے؟ زندہ داریِ شب کیا؟

آندھیاں رُکیں کیونکر۔ زلزلے تھمیں کیونکر کارگاہِ فطرت میں پاسبانیِ رب کیا؟

تو کیا ہمیں ہیں گنہگار، حسنِ یار نہیں؟ لگاوٹوں کا گناہوں میں کیا شمار نہیں؟

بدل نہ جائے زمانے کے ساتھ نیت بھی سنا تو ہوگا جوانی کا اعتبار نہیں؟

کرے گا پرورشِ نخلِ آرزو کے دن وہ بدنصیب جسے ذوقِ انتظار نہیں!

حاصلِ فکرِ نارسا کیا ہے؟ تو خدا بن گیا بُرا کیا ہے؟

کیسے کیسے خدا بنا ڈالے؟ کھیل بندے کا ہے خدا کیا ہے؟

نہ سنا ہو گا راگ فطرت کا   جانتے ہو مری صدا کیا ہے؟
دیدۂ دل سے دیکھ اپنی طرف   چشمِ حیراں تجھے ہوا کیا ہے؟
اپنے ہی عکس پر ہو چیں بہ جبیں؟   کیوں یگانہ یہ ماجرا کیا ہے؟

مستانہ رقص کیجئے گردابِ حال میں   بیڑا ہے پار۔ ڈوب کر اپنے خیال میں
ترسی ہوئی نگاہوں پہ اب رحم کیجئے   کب تک یہ امتیاز۔ حرام و حلال میں
ہاں کیوں نہ پار اُتر چلوں خمیازہ جھیل کر   ڈوبے مری بلا۔ عرقِ انفعال میں
کیا زندگی کے بعد بھی ہے کوئی زندگی؟   پھر جان آ چلی چمنِ پائمال میں!
آوازِ بازگشت پہ کیا دیتے ہو صدا   کس سے اُلجھ رہے ہو جواب و سوال میں
واللہ قفس میں آتے ہی کیا مت پلٹ گئی!   آخر ہمیں تو ہیں کہ پھڑکتے تھے جال میں
کیا بزمِ اتحاد ہے کیا حُسنِ اتفاق   بیگانہ و یگانہ ہیں سب ایک حال میں

ہنوز زندگیٔ تلخ کا مزہ نہ ملا،   کمالِ صبر ملا۔ صبر آزما نہ ملا،
مری بہار و خزاں جس کے اختیار میں تھی   مزاج اُس دلِ بے اختیار کا نہ ملا،
امیدوارِ رہائیٔ قفس بدوش چلے   جہاں اشارۂ توفیقِ غائبانہ ملا
ہوا کے دوش پہ جاتا ہے کاروانِ نفس   عدم کی راہ میں کوئی پیادہ پا نہ ملا
بس ایک نقطۂ فرضی کا نام ہے کعبہ   کسی کو مرکزِ تحقیق کا پتا نہ ملا،
امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر   کہاں کے دیر و حرم؟ گھر کا راستا نہ ملا!
خوشا نصیب جسے فیضِ عشق شور انگیز   بقدرِ ظرف ملا۔ ظرف سے سوا نہ ملا
سمجھ میں آ گیا جب عذرِ فطرتِ مجبور   گناہگارِ ازل کو نیا بہانہ نہ ملا
بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے؟   وہ بدنصیب جسے بختِ نارسا نہ ملا
نگاہِ یاس سے ثابت ہے سعیِ لاحاصل   خدا کا ذکر تو کیا بندۂ خدا نہ ملا

پیمانہ ہو زمیں سے نیا آسماں کوئی؟   دل کانپتا ہے آپ کی رفتار دیکھ کر
کیوں انقلابِ عشق یہ کیسی ہوا چلی،   جی سن سے ہو گیا رخِ بیمار دیکھ کر
غیرت سے رنگِ نامۂ اعمال اُڑ نہ جائے   کیفیتِ نگاہِ گنہگار دیکھ کر،
آئینہ رکھ کے آپ بھی سجدے میں جھک گئے   اب کیا کہیں گے کافر و دیندار دیکھ کر
گردن ہی اپنی جب کسی قابل نہ ہو گی یاس،   پھر کیا بڑھے گا دل رسن و دار دیکھ کر

خزاں کے دور میں دل کی لگی بجھتی تو کیا بجھتی؟
ہمیں خود آشیاں سے اُڑ گئے ہوتے دھواں ہوکر

پیامِ غفلتِ جاوید ہے جلوہ حقیقت کا
سما جائے نہ آنکھوں میں کہیں خوابِ گراں ہوکر

اُٹھو اے سونے والو سر پہ دھوپ آئی قیامت کی
کہیں یہ دن نہ ڈھل جائے نصیبِ دشمناں ہوکر

ارے او جلنے والے کاش جلنا ہی تجھے آتا
یہ جلنا کوئی جلنا ہے کہ رہ جائے دھواں ہوکر

قفس میں بوئے مستانہ بھی آئی دردِ سر ہوکر
نویدِ ناگہاں پہونچی ہے مرگِ منتظر ہوکر

نگاہِ شوق سے کیا کیا گلوں کا دل دھڑکتا ہے
مبادا رنگ و بو اُڑ جائے پامالِ نظر ہوکر

کہاں پر نارسائی کی ہے پروانوں کی قسمت ہے
پڑے ہیں منزلِ فانوس پر بے بال و پر ہوکر

عدو کیا زہر دیتا ہے ہم ایسے تلخ کاموں کو
لہو کا گھونٹ اُتر جاتا ہے جب شمشیرِ شکر ہوکر

وفورِ بیخودی میں امتیازِ روز و شب معلوم
بلا آئی ہے بدمستوں پہ شامِ بے سحر ہوکر

نگاہِ یاس کا عالم جو آگے تھا سو اب بھی ہے
ہزاروں گل کھلے بازیچۂ شام و سحر ہوکر

نقشِ باطل ہو چلا خوابِ پریشانِ بہار
دیدۂ حیراں میں کھچ کر آ گئی جانِ بہار

چشمِ پرخوں نے مجسّم کر دیا موہوم کو
ورنہ بے تعبیر تھا خوابِ پریشانِ بہار

اپنا ہاتھ اپنا گریباں اپنا سودا اپنا سر
استخارہ کر چکے پابندِ فرمانِ بہار

کیوں قفس بردوش پھرتے ہیں اسیرانِ ہوس
ننگِ یارانِ چمن، ناخواندہ مہمانِ بہار!

اے خزاں پروردہ دل فکرِ چمن سے باز آ
اپنے اوپر رحم کر اے دشمنِ جانِ بہار

قافلے کا قافلہ مارا ہوا ہے دہر نے
رہ گئے سوتے کے سوتے سب حسینانِ بہار

اپنے اپنے رنگ میں اور اپنے اپنے حال میں
کوئی حیرانِ خزاں کوئی پشیمانِ بہار

دیکھ لیتا ہوں چمن کو دور سے بیگانہ وار
یاس مجھ سے کیوں کھٹکتا ہے نگہبانِ بہار؟

بہارِ زندگی ناداں بہارِ جاوداں کیوں ہو
یہ دنیا ہے تو ہر کروٹ وہی آرامِ جاں کیوں ہو

کوئی ناگفتنی مطلب ہے ان نیچی نگاہوں کا
زباں تک آ نہیں سکتا تو آنکھوں سے بیاں کیوں ہو

گنہگارِ محبت کو اسی عالم میں رہنے دے
سزاوار جب سہی لیکن بہشتِ جاوداں کیوں ہو

زمانہ لاکھ گم ہو جائے آپ اپنے اندھیرے میں
کوئی صاحبِ نظر اپنی طرف سے بدگماں کیوں ہو

یہ ناہموار ہی ہموار ہو جائے تو کیا کم ہے
زمیں سے جب نہیں فرصت تو فکرِ آسماں کیوں ہو

کہاں خواب و خیال اتنے۔ حقائق ہر طرف جتنے
نگاہِ نارسا یہ نقدِ فطرت رایگاں کیوں ہو

یگانہ فکر حاصل کیا؟ تم اپنا حق ادا کر دو
بلا سے تلخ گزرے زندگانی رایگاں کیوں ہو

آزاد انصاری (وفات ۴۲ ۱۹ء)

ترے بے خبر کو یہ پیام خبر ہے - کہ تو مبتدا اور عالم خبر ہے

اگر آزاد سا درویش لاکھوں میں نہیں جچتا — تو جا اور جا کے اہل اللہ کی پہچان پیدا کر

زباں تک شکوۂ محرومیٔ دیدار آتا تھا - خطاب آیا کہ جا اور طاقت دیدار پیدا کر

تجھے آزاد! یوں درویش حال کون مانے گا - جہاں سے ہو، حریت جبہ و دستار پیدا کر

بت کافر! یہ واضح ہو، خدا بھی اپنے بندوں پر - فقط ظلم و ستم کر کے خدائی کر نہیں سکتا

ازل سے جو سرشت اللہ مشرب لیکے آتا ہے - ابد تک وہ گناہ پارسائی کر نہیں سکتا

جہاں آزاد اب بے خوف سرگرم تکلم ہے

وہاں روح القدس بھی لب کشائی کر نہیں سکتا

خاکسار الطاف احمد آزاد انصاری سہارنپوری بقلم خود

رام پور (ریاست) ۲۲ نومبر سنہ ۱۹۴۱ء

آزاد انصاری

الطاف احمد مشہور نام، نظیر حسین تاریخی نام، ابوالاحسان کنیت، آزاد تخلص، والد کا اسم گرامی محمد حسن خلف امیر احمد، نسلاً شیخ انصاری جس کا سلسلہ حضرت ایوب انصاری رضی اللہ عنہ تک پہونچتا ہے، والدۂ ماجدہ کا پدری سلسلۂ نسب بھی انصاری ہی ہے مگر مادری سلسلہ صدیقی ہے۔ سالِ ولادت ۲۰ رجب ۱۲۸۸ھ، مقامِ ولادت ناگپور جہاں والد ماجد اس وقت اوورسیری کے عہدے پر فائز تھے۔

ہم نے اٹھارہ اُنیس سال کی عمر تک مختلف درس گاہوں میں فارسی و عربی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد ہماری شادی ہوگئی اور تعلیم چھوٹ گئی لیکن کچھ مدت بعد مولانا حکیم نور الدین صاحب سہارنپوری اور ڈاکٹر احمد خاں صاحب لکھنوی اور ان کے علاوہ دیگر اساتذہ فن سے تعلیم حاصل کی اور مولوی حکیم معین الدین صاحب نانوتوی سے جو ہماری والدہ کے ماموں زاد بھائی ہوتے تھے سندِ طبی حاصل کرنے کے بعد ۱۹۰۱ء میں دہرہ دون میں جا کر مطب کھولا اور پھر ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۹ء تک کانپور میں یہی شغل جاری رکھا، یہاں ہماری اہلیہ کا انتقال ہوگیا اور سہارنپور چلے آئے، ایک سال بعد جب یہ صدمہ کم ہوا تو ہم نے انبالہ چھاؤنی (پنجاب) میں جا کر مطب جاری کیا اور قریباً آٹھ سال تک وہاں علاج و معالجہ کا کام کرتے رہے، ۱۹۱۹ء میں ہم علی گڈھ آگئے، وہاں ہمارا ڈیڑھ سال تک قیام رہا۔ مگر جب وہاں ہم نے اپنا کاروبارِ مطب چلتے نہ دیکھا تو ہم دہلی چلے آئے اور اواخر ۱۹۲۲ء تک دہلی میں رہ کر بسر اوقات کرتے رہے، اس کے بعد ۱۳ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو حیدرآباد دکن پہونچ گئے اور کاروبارِ مطب چھوڑ کر عینک کی تجارت اختیار کرلی جس پر آج تک گذر اوقات ہے۔ مجھے مولانا حالی مرحوم سے تلمذ حاصل ہے۔

آزاد انصاری

اچانک نزولِ بلا ہوگیا　　یکایک ترا سامنا ہوگیا

طبیعت ہی درد آشنا ہوگئی　　دوا کا نہ کرنا دوا ہوگیا

سی بھی تلافی اسوقت تک بہت تھی　　پھر کوششیں کروگے اور فایدہ نہ ہوگا،

یوں یاد آؤگے ہمیں، اصلاً خبر نہ تھی　　یوں بھول جاؤگے، ہمیں وہم و گماں نہ تھا

آہ کس نے مجھے دُنیا سے مٹانا چاہا　　آہ اُس نے کہ جسے حاصلِ دُنیا جانا

ظاہر ہے کہ بے کس ہوں، ثابت ہے کہ بے بس ہوں
جو ظلم کیا ہوگا، برداشت کیا ہوگا

بیدل بھی ہوں، شاداں بھی، شاکی بھی ہوں، نازاں بھی
جو داغ دیا ہوگا، دلچسپ دیا ہوگا

اک دن گلۂ غفلت سننے کو ترسیئے گا
اک دن الم فرقت کچھ دیکے سلا دے گا

امید سکوں رخصت، تسکین درون رخصت
اب درد کی باری ہے، اب درد مزا دے گا

تم اور دل آزاری ارباب محبت
ارباب محبت کا یہ شیوہ نہیں ہوتا

اک وہ ہیں کہ بے خوف و خطا گرم شکایات
اک ہم ہیں کہ اظہار تمنا نہیں ہوتا

وہ اک حیرت فزا ساعت، وہ اک بالکل نئی حالت
وہ اک جلوہ نظر آنا، وہ اک عالم گزر جانا

تم اور چارۂ غم فرقت، محو شا نصیب!
دکھ کو دوا نصیب، مرض کو شفا نصیب

زلفوں والو! یہ اندھیر
دُہرے دُہرے کالے ناگ

شاد کر، ہم غمزدوں کو شاد کر
یاد کر حق ہائے خدمت یاد کر

طالب ہوں مگر ناکام، سائل ہوں مگر محروم
تقدیر مری تقدیر، مقسوم مرا مقسوم

قسمت سے وہ ملزم ہوں، شامت سے وہ مجرم ہوں
جو داد سے بھی محروم، بیداد سے بھی محروم

غمخوار یہ کہتے ہیں، "ارمان غم آساں ہے"
آثار یہ کہتے ہیں، "خیریت جاں معلوم"

خیال نگاہ محبت عبث
کہ تاب نگاہ محبت کہاں

جو اٹھے ہیں تو گرم جستجوئے دوست اٹھے ہیں
جو بیٹھے ہیں تو محو آرزوئے یار بیٹھے ہیں

وہ دل جس میں تمنا کی خوشی تھی،
اُسے صرف تمنا دیکھتا ہوں

کبھی دن رات رنگیں صحبتیں تھیں
اب آنکھیں ہیں، لہو ہے اور میں ہوں

نزاکت ہے کہ قرباں ہے تری ترکیب اعضا پر
قیامت ہے کہ پنہاں ہے ترے بے ساختہ پن میں

ترا گلشن وہ گلشن جس پہ جنت کی فضا صدقے
مرا خرمن وہ خرمن جس پہ انگارے برستے ہیں

اگر کار الفت کو مشکل سمجھ لوں،
تو کیا ترک الفت میں آسانیاں ہیں

سزائیں تو ہر حال میں لازمی تھیں
خطائیں نہ کرکے پشیمانیاں ہیں

آؤ، پھر عہد وصال یار کی باتیں کریں
داستان لطف چھیڑیں، پیار کی باتیں کریں

ارمان التفات دل دوستاں درست
شایان التفات دل دوستاں کہاں

اب آنکھوں کے آگے وہ جلوے کہاں
اب آنکھیں اٹھانے سے کیا فائدہ

الٰہی! کامیابی رہنما ہو،
کوئی امیدوارانہ چلا ہے

اب فریبِ مہربانی رائگاں
زندگی بھر کو نصیحت ہو گئی

جب ہمیں بزم میں آنے کی اجازت نہ رہی
پھر یہ کیوں پرسشِ حالات ہو، یہ بھی نہ سہی

تو اور پاسِ خاطرِ اہلِ وفا کرے
امید تو نہیں ہے، مگر ہاں خدا کرے

میں اور انحراف، مگر بدنصیب دل
میرا کہا کرے نہ تمھارا کہا کرے

اب حالِ دل نہ پوچھ کہ تابِ بیاں کہاں
اب مہرباں نہ ہو کہ ضرورت نہیں رہی

اک پائمالِ جور سے امیدِ شکرِ جور
جا شکر کر کہ تابِ شکایت نہیں رہی

میں تو اظہارِ درد کرتا ہوں
کوئی درد آشنا نہیں، نہ سہی

ترکِ حاجت بھی ممکنات سے ہے
کوئی حاجت روا نہیں، نہ سہی

ترا بارِ گرانِ مہربانی کون اُٹھا سکتا،
ترا نا مہرباں ہونا کمالِ مہربانی ہے

ستم شعار! ستا لیکن اس قدر نہ ستا
کہ شکر شکلِ شکایات اختیار کرے

خدا کے واسطے آ اور اس سے پہلے آ
کہ یاسِ چارۂ تکلیف انتظار کرے

ے وہ راحت کہ جب تک دل کہیں آیا نہ تھا
ہائے وہ ساعت کہ جب تم سے شناسائی ہوئی

ن، اے اظہارِ حرفِ شوق کے اقدامِ حیف
وہ نظر جھپی ہوئی، وہ آنکھ شرمائی ہوئی

ے شوق سزا کا خوفناک آغاز تو دیکھو
کسی کا جرم ہو، اپنی خطا معلوم ہوتی ہے

سمجھتا ہوں کہ تم بیداد گر ہو
مگر پھر داد لینی ہے تمھیں سے

فسوں گر! میں تجھے پہچانتا ہوں
وہیں سے بات کرنا بس وہیں سے

اک گدائے راہ کو ناحق نہ چھیڑ،
جا، فقیروں سے مذاق اچھا نہیں

کرم ہیں اور طلب سے بھی زیادہ
ستم ہے اور بہ اندازِ دگر ہے

تیرا عدیل کوئی تیرے سوا نہ ہوگا
تجھ سا کہاں سے لاؤں، تجھ سا ہوا، نہ ہوگا

منزل کی جستجو سے پہلے کسے خبر تھی
رستوں کے پیچ ہوں گے اور رہنما نہ ہوگا

اک روز دلِ رہزنِ خود راہ نما ہو گا
اک روز یہی دشمنِ منزل کا پتا دے گا

کس نے تا منزل رفاقت کی طلب کے شوق نے
کون رہبر ہو گیا، اللہ رہبر ہو گیا

نا، ہم نے تم کو ایک حد تک خاص کر جانا
مگر کیا جس قدر ارمانِ دل تھا، اُس قدر جانا

را ماننا طاقت سے باہر تھا، مگر مانا
تمھارا جاننا امکاں سے خارج تھا، مگر جانا

بنا، باطل بنا، ناقص بنا، کامل بنا
جو بنانا ہو، بنا لیکن کسی قابل بنا

زباں تک شکوۂ محرومئ دیدار آنا تھا
خطاب آیا کہ "جا اور طاقتِ دیدار پیدا کر"

غیر فانی خوشی عطا کر دی
اے غمِ دوست! تیری عمر دراز

اُٹھو، درد کی جستجو کر کے دیکھیں
تلاشِ سکونِ طبیعت کہاں تک

دیدار کی طلب کے طریقوں سے بے خبر!
دیدار کی طلب ہے تو پہلے نگاہ مانگ

جو چاہنا ہے، چاہ۔ مگر قاعدے کے ساتھ
جو مانگنا ہے، مانگ۔ مگر راہ مانگ

نشانِ راہ ہاتھ آیا تو کس سے، صرف اُلفت سے
کمالِ رہبری پایا تو کس میں، صرف رہزن میں

بتاتیں کس کے قبضے کی، تری قدرت کے قبضے کی
پناہیں کس کے دامن میں، تری رحمت کے دامن میں

آؤ، پھر موقع ہے، کچھ اسرار کی باتیں کریں
صورتِ منصور بہکیں، دار کی باتیں کریں

بیانِ رازِ دل کی خواہشیں اور وہ بھی منبر پہ
خبر بھی ہے، یہ باتیں دار پر کہنے کی باتیں ہیں

کوئی دونوں جہاں سے ہاتھ اُٹھا بیٹھا تو کیا پروا
تم ان مولوں بھی سستے ہو، تم ان داموں بھی ارزاں ہو

نازِ خودداری غلط ثابت ہوا
عادتِ تسلیم ڈالی جائے گی

دل اور ترے خیال سے راحت نہ پا سکے
شاید مرے نصیب میں راحت نہیں رہی

اسے بھی خوش نظر آیا، اُسے بھی خوش نظر آیا
ترے غم میں بہ حالِ شادماں کر دی بسر جس نے

طلبِ عاشقِ صادق میں اثر ہوتا ہے
گو ذرا دیر میں ہوتا ہے، مگر ہوتا ہے

مناسب ہو تو اب پردہ اُٹھا کر
ہمارا شک بدل ڈالو یقیں سے

تدبیر کیا ہے، آپ کی جانب سے حکمِ کار
تقدیر کیا ہے، آپ کا منشا کہیں جسے

یا درد کے احساس کو لذت بھی عطا کر
یا درد کے احساس سے بیگانہ بنا دے

بے خبر! کارِ خبر مشکل نہیں
بے خبر ہو جا، خبر ہو جائے گی

جو وہ ملتا نہیں ہے، آپ کھو جا
کہ اک یہ بھی طریقِ جستجو ہے

ترے ہوتے مری ہستی کا کیا ذکر
یہی کہنا بجا ہے، میں نہیں ہوں

ترے جلووں میں کھو جاتا مگر آہ!
جہاں تو جلوہ زا ہے، میں نہیں ہوں

اگر حد سے گزریں تو بے شک حرام
جو تھوڑی سی پی لی تو کیا ہو گیا

آج وہ دن ہے کہ اک ساقی کے دستِ خاص سے
پی اور اتنی پی کہ میں حقدار کوثر ہو گیا

عشقِ اصنام بھی ہے، دعوئے اسلام بھی ہے
تم کو آزاد! عجب مرشدِ کامل دیکھا

نہ آزاد میکش، نہ شاہد پرست
وہ کم بخت بدنام ہے اور بس

اگر آزاد سا درویش نظر دل میں نہیں جچتا
تو جا اور جا کے اہل اللہ کی پہچان پیدا کر

کبھی شاہد وے کا بھی حق ادا کر
لگا تار کفرانِ نعمت کہاں تک

یارائے زہد و تاب ورع کچھ طلب نہ کر
توفیق ہو تو صرف مجالِ گناہ مانگ

آزاد کی مے خواری آزاد کا حصّہ تھی،
جب پی تو یہ کہکر پی "النادر کالمعدوم"

جو اہلِ حرم درپئے دشمنی ہیں
تو پروا نہیں، آستاں اور بھی ہیں

حضرت آزاد! آپ اور اتقا
کاش! ظاہر ہو کہ یہ کیا راز ہے

غیر ممکن ہے کہ اس بزم میں آزاد نہ ہو
کہ فقیروں کی توجّہ میں اثر ہوتا ہے

یہ کیف بارشوں کے، یہ مستی سحاب کی
توفیق ہو تو نہر بہا دوں شراب کی

وہ دن گئے کہ معتکفِ خانقاہ تھے
اب ہم ہیں اور سنگِ درِ مے فروش ہے

کوئی آخر تلخ کامِ زندگی کب تک جئے
آج سے شغلِ مئے و شاہد روا رکھتا ہوں میں

تم سے نظامِ دو جہاں، تم سے قیامِ دو جہاں
مرجعِ ہر دیار ہو، مرکزِ ہر مدار ہو،

ستم ہے، یوں سکونِ دل کے مٹنے کا ستم دیکھیں
تمھارے درد کا ردِّ عمل ہو اور ہم دیکھیں

ازل سے ربطِ حسن و عشق ہے اور جاودانی ہے
نہ تیرا حسن حادث ہے، نہ میرا عشق فانی ہے

عالم ترے وجود سے تکمیل پا گیا،
آیندہ ارتقا کی ضرورت نہیں رہی

ہمیشہ غم نصیب آزاد نے تیری خوشی چاہی
ہمیشہ راحتِ دُنیا کو ممنوعہ شجر جانا

کبھی عالم کی ہستی اصل پر مبنی سمجھتا ہوں
کبھی بالکل نمود و سیمیا معلوم ہوتی ہے

افسوس! بے شمار سخن ہائے گفتنی
خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

اعتبارات سے بالا ہو جا
اعتبارات میں کیا رکھا ہے

آ، مگر اس قدر قریب نہ آ
کہ تماشا محال ہو جائے

بنایا، کھیل دیکھے، توڑ پھینکا،
یہ کیا اندازِ تخلیقِ جہاں ہے

جب رُخِ مقصد سے اک پردہ اُٹھا
اور لاتعداد پردے پڑ گئے

کبھی جس شوق کا وقتِ عمل تھا
اب اُس کی ساعتِ ردِّ عمل ہے

انسان کی بدبختی اندازے سے باہر ہے
کمبخت خدا ہو کر بندا نظر آتا ہے

بندہ پرور! میں وہ بندہ ہوں کہ بہرِ بندگی
جس کے آگے سر جھکا دوں گا، خدا ہو جائے گا
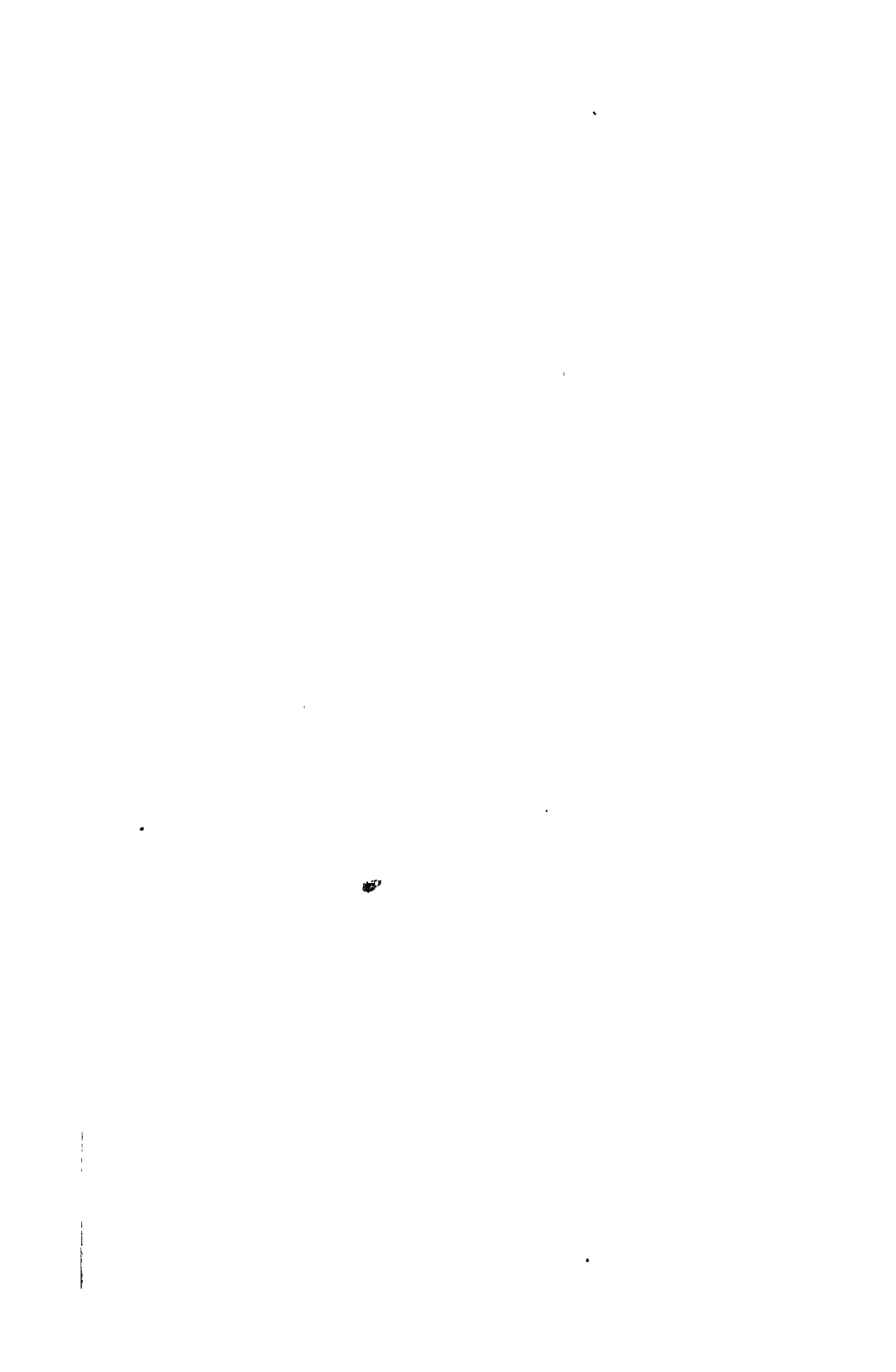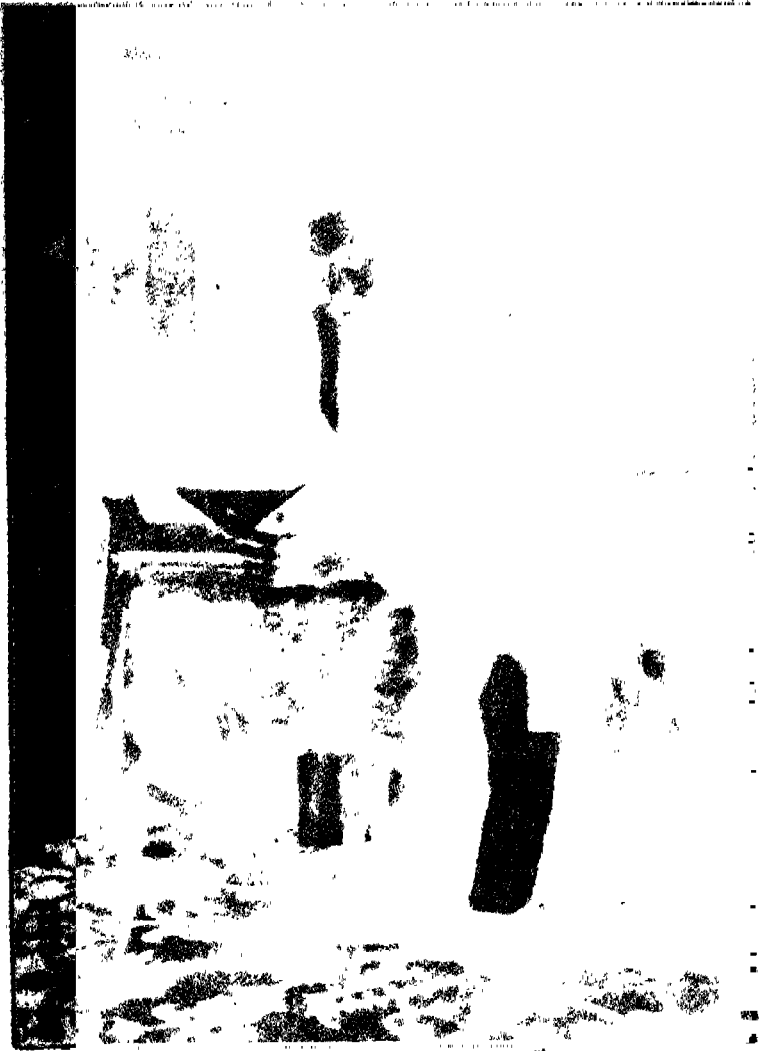
افسر میرٹھی (وفات ۱۹/ اپریل ۷۴ ۱۹ء)

افسر میرٹھی

میرا نام حامد اللہ اور تخلص افسر ہے۔ میرا وطن میرٹھ ہے اور سنہ پیدائش ۱۸۹۹ء۔ ابتدائی تعلیم حضرت مولانا مولوی احمد علی صاحب محدث کی نگرانی میں ہوئی اس کے بعد ایک مدت تک عربی فارسی کی تعلیم حضرت موصوف ہی کی نگرانی میں مدرسہ عالیہ عربیہ میرٹھ میں ہوتی رہی، پھر انگریزی زبان حاصل کی اور میرٹھ کالج سے بی۔ اے پاس کیا۔ شعر و شاعری کا شوق ابتدا سے تھا لیکن اس کو کسی پر ظاہر نہ کرتا تھا سب سے پہلے بعض ہم جماعتوں کے اصرار سے ۱۹۱۶ء میں میرٹھ کے ایک مشاعرے میں شرکت کی اور جو غزل وہاں سنائی وہ بہت مشہور ہوئی، لیکن اس کے بعد ایک مدت تک کسی مشاعرے میں شرکت نہیں کی۔ شعر گوئی کا شغل برابر جاری رہا طرح پر شعر کہنے سے ہمیشہ الجھن ہوتی تھی۔ غزل کہنے کا طرز ہمیشہ یہ رہا کسی واقعہ سے متاثر ہو کر ایک شعر کہا پھر اسی زمین میں اور شعر کہکر غزل پوری کر لی۔

حامد اللہ افسر

بھٹکتی ہیں نظریں مری ہر طرف
خدا جانے کس بھیس میں تو ملے

یہ جی چاہتا ہے مرا آج افسرؔ،
ابھی اور تم سے کئے جاؤں باتیں

ایسی خلوت بھی کچھ نہیں افسرؔ
کہیں آنے کے ہو نہ جانے کے

ہائے وہ جس کی امیدیں ہوں خزاں پر موقوف
شاخ گل سوکھ کے گر جائے تو کاشانہ بنے

نہ شکوہ سنج مرا جوشش سعی ہو کیونکر
محال ہی تو نہیں ہے محال ہونا بھی

بڑھائے ریش تو مسجد کو گیا چلا افسرؔ
یہ شکل اب کہیں ہوتی نہیں نمازی کی

رکھکر نظر کے سامنے تصویر خواب ناز
پہروں ترے خیال میں بیٹھا رہا ہوں میں

دل پر اپنا بس چلتا تو وحشت کا ہے کو ہوتی
اور کسی سے کیا مطلب ہے تو خود کیا کہتا ہوگا

ان بھلا روتا پھرتا ہے آدھی راتوں کو
اس بادل کے پردے میں بھی کوئی دل والا ہوگا،

جو غم حد سے زیادہ ہو خوشی نزدیک ہوتی ہے
چمکتے ہیں ستارے رات جب تاریک ہوتی ہے

وہ دولت جس کا دنیا نے مسرت نام رکھا ہے
ترے جلووں کی دامان نظر میں بھیک ہوتی ہے

بزم میں ان مدبھری آنکھوں کو گردش دے گر　　اس کا اندازہ تو کرے کس کو کتنا ہوش ہے
یہ نظر کی جنبشیں یہ [illegible] ہوئی　　کچھ تمھیں بھی آج اپنی بیخودی کا ہوش ہے

دکھا دے سکے ہیں سب یہ دُنیا کے میلے　　کبھی بزم میں ہم رہے ہیں اکیلے
انوکھے خیالوں کی محفل جمائے ہیں　　بچھڑے رہتے ہیں گھر میں افسر اکیلے

کچھ توجہ خاص ہوتی ہے عیاں　　نام لے لے کر دعا کو سا کیجئے
مصلحت کا ہے تقاضا احتیاط　　دل یہ کہتا ہے کہ دیکھا کیجئے

ہو قرب اور پھر وہی دلبستگی رہے　　ہیں اصل میں یہی تو محبت کے دلولے
واں اُن کو یہ گمان کہ دامن بھی تر نہیں　　یاں حال یہ کہ آگیا پانی گلے گلے

ہر خزاں کے غبار میں ہم نے　　کاروانِ بہار دیکھا ہے
کتنے پشمینہ پوش جبّوں میں　　روح کو تار تار دیکھا ہے

اللہ رے جنوں کی یہ ذرّہ نوازیاں　　بیٹھا ہوا ہوں دل میں بیاباں لئے ہوئے
زمانہ ڈھونڈتا ہے مجھ کو افسر　　خدا جانے کہاں کھو یا گیا ہیں

کچھ قطعِ منازل کی نہیں فکر سفر میں　　ہر گام پہ منزل ہے تری راہ گزر میں
للہ یہ تم دیکھنے والوں سے نہ پوچھو　　کیا چیز ہو تم دیکھنے والوں کی نظر میں

میں تو تام کا مالی ہوں پھولوں کا رکھوالا ہوں،　　جس نے بیل اُگائی ہے خود پروان چڑھائے گا
افسر میرے کانوں میں کوئی یہ کیا کہتا ہے　　وہ سرکار ہماری ہے بے مانگے جو پائے گا

محوِ تلاشِ راحت تو یہ بھی جانتا ہے　　کہتے ہیں جس کو راحت وہ غم کی انتہا ہے

مذاہب کیا ہیں؟ راہیں مختلف ہیں ایک منزل کی،　　ہے منزل کیا؟ جہاں سب کچھ ہے پر راہیں نہیں ہوتیں

اُن کی پرواز انھیں تا بہ فلک لے پہونچی　　ہم یہی سوچ رہے ہیں کہ خیال اچھا ہے

اُف رے یہ ذوقِ عبادت کی عجائب کاریاں　　دل کہیں ہے میں کہیں سجدہ کہیں ہے سر کہیں،
موت ہے وہ راز جو آخر کھُلے گا ایک دن　　زندگی ہے وہ معمّا کوئی جس کا حل نہیں

کس نظر سے آشیاں کو آسماں دیکھا کیا　　اور تو اے چارہ ساز بے کساں دیکھا کیا،
میں نے یوں دل کی کہانی کا اثر قایم رکھا　　ہر گھڑی قسم قسم کے رنگِ داستاں دیکھا کیا

تاروں کا گو شمار میں آنا محال ہے　　لیکن کسی کو نیند نہ آئے تو کیا کرے
دُنیا میں اک سکوں کا ذریعہ ہو جب یہی　　انسان تجھ سے لو نہ لگائے تو کیا کرے

موت کے خواب کی تعبیر ہے تجدیدِ حیات   یعنی اول سے سُنائیں گے پھر افسانے کو

مل جائے جو تجھ سے جاکر ایسا کس کا مقدر ہو   دریا میں جو قطرہ ہو وہ دریا ہے یا گوہر ہے

عمل کی جن میں قوت ہے انھیں ملتی ہیں تاثیریں   نمایاں ہو حیات نو اگر ذرّوں کے دل چیریں
خدا توفیق دیتا ہے جنھیں وہ یہ سمجھتے ہیں   کہ خود اپنے ہی ہاتھوں سے بنا کرتی ہیں تقدیریں

تو بیچ میں رہ جائے تو یہ تیری خطا ہے   جنت جسے کہتے ہیں اُدھر بھی ہے اِدھر بھی

نہ سمجھا جب حقیقت کو کسی نے   خدا پیدا کیا ہر آدمی نے

تجھ کو پالینے میں یہ بیتاب کیفیت کہاں   زندگی وہ ہے جو تیری جستجو میں کٹ گئی،

نیچی نظر ہو، خصمت سے وہ معصوم نظر ہو   اور مجھ کو کہیں دور کا درپیش سفر ہو

فسانہ خواں تری آنکھیں قصور وار نہیں   میں جانتا ہوں خطا ہے مرے فسانے کی
قریب ہے مری منزل قریب ہے شاید   کہ اب نہیں رہی ہمت قدم اُٹھانے کی

اے انجام تجسس کی عجائب کاریاں   تم ملے اور ڈھونڈنے والے تمھارے کھو گئے

وہ آرہے ہیں ستاروں کو نیند کے جھونکے   اثر کسی پہ تو ہوتا مرے فسانے کا
جہان بھر میں ہیں تنکے کہاں کہاں سے جنوں   صبا نے کر دیا کیا حال آشیانے کا

ہم جس کو موت سمجھتے ہیں پیغام حیات جدید ہے وہ   یہ پھول چمن میں جتنے ہیں پھر کھلنے کو مرجھاتے ہیں،

دو شخص جب ایسے ملتے ہیں آپس میں جن کو محبت ہو   خاموشی طاری ہوتی ہے لب کھل کر رہ جاتے ہیں

جب خوشی کا خیال آتا ہے   دل مایوس کانپ جاتا ہے
مجھے فردا کی فکر کیونکر ہو   غم امروز کھائے جاتا ہے
سکھ میں ہوتا ہے حافظہ بیکار   دُکھ میں اللہ یاد آتا ہے

نظر کے سامنے آ جنگلوں میں بولنے والے   کوئی دھیمی رسیلی ہلکی آوازوں سے کیا سمجھے
رسیلا راگ چھیڑا آم کے باغوں میں کوئل نے   نہ ہو جب کوئی دل والا تو اس کا درد کیا سمجھے

پھر وحشیوں کو شوق ہوا کوہسار کا   شاید اسی کو کہتے ہیں موسم بہار کا

تیری بھی اے ابرِ نیساں ہر صورت دلکش ہوتی ہو   جب جانِ بہار ہو قطرہ ہو جب نہ ہو تاج ہو موتی ہو

چمکتی ہے یہ بجلی ابر میں یا   کسی سے کچھ اشارے ہو رہے ہیں

للہ یہ بتا دے اے جذبۂ محبت   کیا حسن ہے خدا میں کیا عیب آدمی میں

بادلوں کی سرزمیں پر نغمہ ہائے جانفزا،   مرغِ خوش پرواز آزادی اسی کا نام ہے

۸ خودکشی کا حکم اور فرمانِ نہاں ہے سوختہ تن کا
دیکھیے تشنہ جس سے ہیں سرگشتگاں کا گلہ گماں ہے زدہ خنجر دریا سے

محمد طیب صبیح الدین مالک ساک

سائلؔ دہلوی

سراج الدین احمد خاں نام، سائلؔ تخلص، سنہ ولادت ۱۲۸۱ھ، مطابق ۱۸۶۸ء۔ مقام ولادت دہلی، اور والد کا نام نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقبؔ، ابنِ ضیاء الدین احمد خاں جاگیر دار ریاستِ لوہارو ہے۔ چار سال کی عمر میں سایۂ پدری سر سے اُٹھ گیا اور اپنے جدِّ بزرگوار کے آغوشِ شفقت میں پرورش پانے لگے۔

عربی و فارسی کی تعلیم مولوی قاسم علی سے اور فنّی کتابیں میرزا ارشد علی گورگانی سے پڑھیں اور انھیں کو ابتدائی کلام دکھایا پہلی شادی نواب ممتاز حسن خاں کی بہن سے ہوئی تھی۔ چند سال کے بعد ان کا انتقال ہوگیا، تو دوسرا عقد ۲۴ سال کی عمر میں فصیح الملک نواب میرزا خاں داغؔ دہلوی کی دخترِ خوانده سے ہوا۔ تین سال کی مشق میں جناب داغؔ کے تلامذۂ ارشد میں جگہ پائی۔ شوقِ شعر گوئی کے علاوہ شہسواری اور پولو کا از حد شوق تھا اور بہترین "جاکی" شمار ہوتے تھے۔

ہمیں کہتی ہے دنیا زخمِ دل زخمِ جگر والے
ذرا تم بھی تو دیکھو ہم کو، تم بھی ہو نظر والے

نظر آئیں گے نقشِ پا جہاں اُس فتنہ گر والے
چلیں گے سر کے بل رستہ وہاں کے رہگزر والے

ستم ایجادیوں کی شان میں بٹّا نہ آجائے
نہ کرنا بھول کر تم جورِ چرخِ کینہ ور والے

جفا د جورِ گلچیں سے چمن ماتم کدہ سا ہے
پھڑکتے ہیں قفس کی طرح آزادی میں پَر والے

الف سے تا بہ یا، لِلّٰہ افسانہ سُنا دیجے
جناب موسیِٔ عمراں وہی حیرت نگر والے

ہمیں معلوم ہے، ہم مانتے ہیں، ہم نے دیکھا ہے
دل آزردہ ہوا کرتے ہیں از حد چشم تر والے

کٹانے کو گلا آٹھوں پہر موجود رہتے ہیں
وہ دل والے جگر والے سہی، ہم بھی ہیں سر والے

تماشا دیکھ کر دُنیا کا سائلؔ کو ہوئی حیرت
کہ تکتے رہ گئے بد گو ہروں کا مُنھ گہر والے

زعم نہ کیجو شمع رو، بزم کے سوز و ساز پر
رکھیو نظر بجائے ناز خاطرِ بے نیاز پر

زیب نہیں ہے شیخ یہ میکشِ پاکباز پر
تہمتیں سو لگائے گا داغ جبیں نیاز پر

کہتا ہوں ہر حسیں سے میں نیتِ عشق ہے مری
آئے گا میرا دل مگر شاہدِ دل نواز پر

فرقِ حیات و مرگ کا مرغِ چمن کے دل سے پوچھ
دیتا ہے فوق دام کو چنگلِ شاہباز پہ

خوابِ لحد ہے پُر سکوں، عہدِ حیات پُر الم
موت نہ کیوں ہو طعنہ زن، زندگیِ دراز پہ

سنگِ درِ حبیب پر ہوتا ہوں سجدہ ریز میں
خلقِ خدا ہے معترض مجھ پہ مری نماز پر

منعمِ بے بصر یونہیں دیکھیے تا کجا رہے
محوِ نشاط و خوشدلی نغمۂ تارِ ساز پر

فخرِ عمل نہ چاہیے، سعیِ عمل ضرور ہے
آنکھ رہے لگی ہوئی رحمتِ کارساز پر

در پہ بتوں کے دی صدا سائلِ بے نوا نے یہ
فضلِ خدا رہے مدام حالِ گدا نواز پر

امانت محتسب کے گھر شرابِ ارغواں رکھدی
تو یہ سمجھو کہ بنیادِ خراباتِ مغاں رکھدی

کہوں کیا پیش زاہد کیوں شرابِ ارغواں رکھدی
مری توفیق جو کچھ تھی برائے میہماں رکھدی

یہاں تک تو نبھایا میں نے ترکِ مے پرستی کو
کہ پینے کو اُٹھا لی اور لیں انگڑائیاں، رکھدی

جنابِ شیخ مے خانہ میں بیٹھے ہیں برہنہ سر
اب اُن سے کون پوچھے آپ نے پگڑی کہاں رکھدی

تمھیں پروا نہ ہو، مجھ کو تو جنسِ دل کی پروا ہے
کہاں ڈھونڈوں، کہاں پھینکی، کہاں دیکھوں، کہاں رکھدی

لگا لیں گے اُسے اہلِ وفا بے شبہ آنکھوں سے
اگر پائے عدو پر اُس نے خاکِ آستاں رکھدی

اِدھر پَر نوچ کر ڈالا قفس میں اُف رے بیدردی
اُدھر اک جلتی چنگاری میانِ آشیاں رکھدی

ضمیر اُس کا ڈبو دے گا اُسے آبِ خجالت میں
وفاداری کی تہمت غیر پر کیوں بدگماں رکھدی

ہوسِ مستی کی سائل کو نہیں کافی ہے تھوڑی سی
پیالے بھر اگر پس خوردۂ پیرِ مغاں رکھدی

حق و ناحق جلانا ہو کسی کو تو جلا دینا
کوئی روئے تمھارے سامنے تم مسکرا دینا

تردّدِ برق ریزوں میں تمھیں کرنے کی کیا حاجت
تمھیں کافی ہے ہنستا دیکھ لینا مسکرا دینا

دلوں پر بجلیاں گرنے کی صورت گر کوئی پوچھے
تو میں کہدوں تمھارا دیکھ لینا مسکرا دینا

ہوئی بجلی سے کس دن نقلِ اندازِ ستمگاری
تمھاری طرح سیکھا لاکھ اُس نے مسکرا دینا

ستمگاری کی تعلیمیں اُنھیں دی ہیں یہ کہہ کہہ کر
کہ رونا جس کسی کو دیکھ لینا مسکرا دینا

تکلّف برطرف کیوں پھول لے کر آؤ تربت پر
مگر جب فاتحہ کو ہاتھ اُٹھانا مسکرا دینا

نہ کیوں ہم انقلابِ دہر کو مانیں اگر دیکھیں
گلوں کا نالہ کرنا بلبلوں کا مسکرا دینا

نہ جاتا ناتوانی پر گر اب بھی سعیِ ناخن سے
دکھا سکتے ہیں ہم زخمِ کہن کا مسکرا دینا

تمھارے نام میں کیا زعفراں کی شاخ ہے سائل
کہ جو سنتا ہے اِس کو اُس کو سُن کر مسکرا دینا

بسا اوقات آجاتے ہیں دامن سے گریباں میں
بہت دیکھے ہیں ایسے جوشِ اشکِ چشمِ گریاں میں

نہیں ہے تابِ ضبطِ غم کسی عاشق کے امکاں میں
دلِ خوں گشتہ یا دامن میں ہوگا یا گریباں میں

مبارک، بادیہ گردو، بہار آئی بیاباں میں
نمودِ رنگِ گُل ہے ہر سرِ خارِ مغیلاں میں

زیادہ خوفِ رُسوائی نہیں ہے سوزِ پنہاں میں
دھواں ہوتا ہے لیکن کم چراغِ زیرِ داماں میں

ہمیشہ پی کے مے جام و صراحی توڑ دیتا ہوں
نہ میرا دل ترستا ہے، نہ فرق آتا ہے ایماں میں

مزہ کیوں کاوشِ زخمِ جگر کا آج کم کم ہے
نمک کی کوئی چٹکی رہ گئی ہو گی نمکداں میں

جنابِ قیس نے دل سے بھلایا دونوں عالم کو
جنوں کے چار حرفوں کا سبق لے کر دبستاں میں

بہار آئی ملا یہ حکم مجھ کو اور بلبل کو
کہ وہ کاٹے قفس میں، خاک چھانوں میں بیاباں میں

ترنّم ریزیاں بزمِ سخن میں سن کے سائل کی
گماں ہوتا ہے بلبل کے چہکنے کا گلستاں میں

اڑا سکتا نہیں کوئی مرے اندازِ شیون کو
بمشکل کچھ سکھایا ہے نوا سنجانِ گلشن کو

گریباں چاک کرنے کا سبق وحشی نے فرمایا
کہ اس کے تار لے کر میں سیوں گا چاک دامن کو

بہار آتے ہی ملتی ہیں یہ چیزیں قید خانوں میں
سلاسل ہاتھ کو، پاؤں کو بیڑی، طوق گردن کو

جھڑی ایسی لگا دی ہے مرے اشکوں کی بارش نے
دبا رکھا ہے بھادوں کو، بھلا رکھا ہے ساون کو

دلِ مرحوم کی میّت اجازت ہو تو رکھ دیں ہم
ترے تلوے برابر ہی زمیں کافی ہے مدفن کو

اجازت دو تو ساری انجمن کے دل ہلا دوں میں
سمجھ رکھا ہے تم نے ہیچ تاثیراتِ شیون کو

سلوکِ پیرِ میخانہ کی لے ساقی تلافی کیا
بجز اس کے دعائیں دو اسے پھیلا کے دامن کو

خزاں کا جو گلشن سے پڑ جائے پالا
تو صحنِ چمن میں نہ گل ہو نہ لالا

لیا تیرے عاشق نے برسوں سنبھالا
بہت کر گیا مرنے والا کسالا

پئے فاتحہ ہاتھ اٹھا دے گا کوئی
سرِ تربتِ بے کساں آنے والا

اسی گریہ کے تار سے میری آنکھیں
بنا دیں گی ندی، بہا دیں گی نالا

بٹھا کر تمھیں شمع کے پاس دیکھا
تم آنکھوں کی پتلی، وہ گھر کا اجالا

خطِ شوق کو پڑھ کے قاصد سے بولے
یہ ہے کون دیوانہ خط لکھنے والا

دیا حکم ساقی کو پیرِ مغاں نے
ق پئے محتسب جام و مینا اٹھا لا

یہ سنتے ہی مے خوار بولے خوشی سے
ہمیں سا ہے یہ نیک اللہ والا

حقیقت میں سائل نے ذوقِ ادب سے
جہاں تک اچھالا گیا نام، اچھالا

ہوتے ہی جواں ہو گئے پابندِ حجاب اور
گھونگھٹ کا اضافہ ہوا، بالائے نقاب اور

جب میں نے کہا کم کرو آئینِ حجاب اور
فرمایا بڑھا دوں گا ابھی ایک نقاب اور

پینے کی شراب اور، جوانی کی شراب اور
ہشیار کے خواب اور ہیں، مدہوش کے خواب اور

گردن بھی جُھکی رہتی ہے کرتے بھی نہیں بات
پانی میں شکر گھول کے پیتا تو ہے اے شیخ
ساقی کے قدم لے کے کہے جاتا ہے یہ شیخ
سائل نے سوال اُس سے کیا جب بھی یہ دیکھا
جتاتے رہتے ہیں یہ حادثے زمانے کے
سبب یہ ہوتے ہیں ہر صبح باغ جانے کے
ہزاروں عشق جنوں خیز کے بنے قصّے
ہیں اعتبار سے کتنے گرے ہوئے، دیکھا
قرارِ جلوہ نمائی ہوا ہے فردا پر
نہ پھول مرغِ چمن اپنی خوشنوائی پر
اُسی کی خاک ہے ماتھے کی زیب بندہ نواز

دستورِ حجاب اور ہیں، اندازِ حجاب اور
خاطر سے ملا دے مری دو گھونٹ شراب اور
تھوڑی سی شراب اور دے تھوڑی سی شراب اور
ملتا نہیں گالی کے سوا کوئی جواب اور
کر تنکے جمع کریں پھر نہ آشیانے کے
سبق پڑھاتے ہیں کلیوں کو مُسکرانے کے
ورق ہوئے جو پریشاں مرے فسانے کے
اِسی زمانے میں قصّے اسی زمانے کے
یہ طول دیکھیے اِک مختصر زمانے کے
جواب ہیں مرے نالے ترے ترانے کے
جبیں پہ نقش پڑے ہیں جس آستانے کے

●●

صفی لکھنوی (وفات ۱۵ جون ۱۹۵۰ء)

للہ
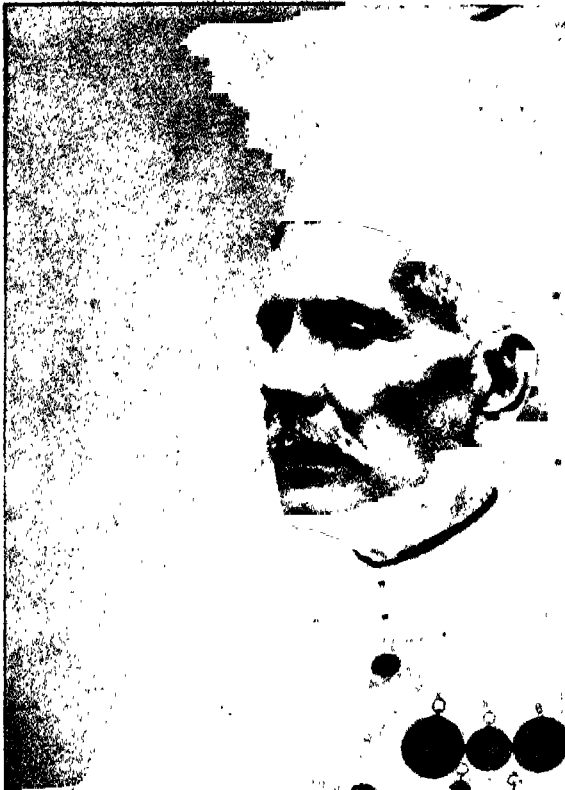
غزل اُس نے چھیڑی مجھے ساز دینا ٭ ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

کوئی سیکھ لے دل کی بیتابیوں سے ٭ ہر انجام میں رنگ آغاز دینا

صفی لکھنوی عفا عنہ
۲۰ مارچ ۱۹۳۲ء

صفی لکھنوی

سیّد علی نقی نام، صفؔی تخلص، تاریخ ولادت ۳ر جنوری ۱۸۶۲ء - مطابق یکم رجب ۱۲۷۸ھ اور قدیم وطن لکھنؤ ہے۔ والد مولوی سیّد فضلِ حسین، آخری تاجدارِ اودھ کے بھائی شاہزادہ سلیماں قدر بہادر کے معتمد تھے۔ ۵ سال کی عمر میں مکتب نشین ہوئے اور مولوی نجم الدین کاکوروی سے فارسی اور مولوی احمد علی محمد آبادی سے درسیاتِ عربی و فارسی کی تکمیل کی۔ فنِ طب کی تعلیم حکیم سیّد باقر حسین صاحب سے ہوئی۔ امین آباد نائٹ اسکول اور کیننگ کالیجیئیٹ اسکول لکھنؤ میں انٹرنس تک انگریزی پڑھی۔ اس کے بعد لال اسکول اور برانچ اسکول متعلقہ کیننگ کالج لکھنؤ میں انگریزی پڑھانے پر مامور ہو گئے۔ جون ۱۸۸۳ء سے اودھ کے محکمۂ دیوانی میں مستقل ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا، اور سلطان پور، رائے بریلی وغیرہ مقامات میں مختلف عہدوں پر رہ کر ۱۹۲۲ء میں سرکاری ملازمت سے پنشن حاصل کی۔ کلام پڑھنے کا طریقہ خاص ہے، جو تحت اللفظ اور ترنّم کے بَین بَین ہے۔ انجمن بہارِ ادب کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔ ان کی مثنوی "تنظیم الحیات" پر ہندوستانی اکاڈمی الٰہ آباد نے بحیثیت اعلیٰ نمونۂ شاعری کے پانچسو کی رقم بطورِ صلہ مرحمت کی ہے۔ قومی نظموں کے اعتراف میں پبلک نے "لسان القوم" کا لقب دیا ہے اور کئی بار طلائی تمغے پیش کیے ہیں۔ فارسی کلام کا خاصا مجموعہ ہے اور کافی تعداد میں متفرق نظمیں اور ایک دیوان طبع ہو چکا ہے۔

انسان کو اُس نے خاک سے پاک کیا
ذی حوصلہ و صاحبِ ادراک کیا

پہلے تو بنایا اسے گنجینۂ علم
پھر گنج کو پوشیدہ تہِ خاک کیا

غم نقدِ حیات لوٹنے کو ہے
یہ رشتۂ عمر ٹوٹنے کو ہے

پیری میں کمر جُھکی تو کیا دم کا قیام
اب تیر کماں سے چھوٹنے کو ہے

طالبِ دید پہ آنچ آئے یہ منظور نہیں
دل میں ہے ورنہ وہ بجلی جو سرِ طور نہیں

دل سے نزدیک ہیں آنکھوں سے بھی کچھ دُور نہیں
مگر اس پہ بھی ملاقات اُنھیں منظور نہیں

ہم کو پروانہ و بلبل کی رقابت سے غرض
گُل میں وہ رنگ نہیں، شمع میں وہ نُور نہیں

خلوتِ دل نہ سہی، کوچۂ شہ رگ ہی سہی
پاس رہ کر نہ سہی آپ سے کچھ دُور نہیں

ذوقِ پابندِ وفا کیوں ہے محرومِ جفا
عشق مجبور سہی، حُسن تو مجبور نہیں

تابشِ حُسن نے جب ڈال دیے ہوں پردے
ممکن آنکھوں سے علاجِ دلِ رنجور نہیں

لاؤ میخانے ہی میں کاٹ نہ دیں اتنی رات
مسجدیں ہو گئیں معمور، یہ معمور نہیں

چھیڑ دے سازِ انا الحق جو دوبارہ سرِ دار
بزمِ رنداں میں اب ایسا کوئی منصور نہیں

کبھی، کیسے ہو صفی، پوچھ تو لیتا کوئی
دل دہی کا مگر اس شہر میں دستور نہیں

حدِ آغازِ محبت کا اب انجام نہیں
زندگی کیا ہے، اگر موت کا پیغام نہیں

کیجیے غور، تو ہر لذّتِ دنیا ہے فریب
کون دانہ ہے یہاں پر جو تہِ دام نہیں

ہے تنزّل کہ زمانے نے ترقی کی ہے
کفر وہ کفر اب، اسلام وہ اسلام نہیں

کون آزاد نہیں حلقہ بگوشوں میں ترے
نقش، کس دل کے نگینے پہ ترا نام نہیں

نارسیدہ ہے ترا میوۂ جنّت، زاہد
پختہ مغزوں کو تلاشِ ثمرِ خام نہیں

یہی جنّت ہے جو حاصل ہو سکونِ خاطر
اور دوزخ یہی دنیا اگر آرام نہیں

شعر گوئی کے لیے بس وہی موزوں ہے صفی
جس کو جُز فکرِ سخن اور کوئی کام نہیں

کوئی آباد منزل، ہم جو ویراں دیکھ لیتے ہیں
بحسرت سُوئے چرخِ فتنہ ساماں دیکھ لیتے ہیں

نظر حسن آشنا ٹھہری، وہ خلوت ہو کہ جلوت ہو
جب آنکھیں بند کیں، تصویرِ جاناں دیکھ لیتے ہیں

خدا نے دی ہیں جن روشن دلوں کو دُوربیں نظریں
سوادِ کفر میں وہ نورِ ایماں دیکھ لیتے ہیں

دلِ بیتاب کا اصرار، مانع شرمِ رُسوائی
بچا کر سب کی نظریں سوئے جاناں دیکھ لیتے ہیں

وہ خود سر سے قدم تک ڈوب جاتے ہیں پسینے میں
بھری محفل میں جو ان کو پشیماں دیکھ لیتے ہیں

ٹپک پڑتے ہیں شبنم کی طرح بے اختیار آنسو
چمن میں جب کبھی گلہائے خنداں دیکھ لیتے ہیں

اسیرانِ ستم کے پاسبانوں پر ہیں تاکیدیں
بدلتے ہیں جو پہرا قفلِ زنداں دیکھ لیتے ہیں

صفی رہتے ہیں جان و دل فدا کرنے پہ آمادہ
مگر اُس وقت جب انساں کو انساں دیکھ لیتے ہیں

تڑپ کے رات بسر کی جو اِک مہم سر کی
چُھری تھی میرے لیے جو شکن تھی بستر کی

ہوا گمان اُسی شوخِ سست پیماں کا
اگر ہوا سے بھی زنجیر ہل گئی در کی

اسی طرف، ترے قرباں، نگاہِ شرم آلود
مجھی پہ تیز ہو یہ باڑھ کُند خنجر کی

سجائی حضرتِ واعظ نے کس تکلّف سے
متاعِ زہد و ورع سیڑھیوں پہ منبر کی

عبورِ بحرِ حقیقت سے جب نہیں ممکن
کنارے بیٹھ کے لہریں گِنوں سمندر کی

سُنے گا کون، سُنی جائے گی صفی کس سے
تمہاری رام کہانی یہ زندگی بھر کی

کچھ متغزّلین کے بارے میں

اُردو کا رنگِ تغزل

دُنیا کی مختلف زبانوں میں سب سے پہلا شعر یا مصرعہ کب موزوں ہوا، اسے کوئی نہیں جانتا، اور شعر کیا، خود الفاظ کی پیدایش کا بھی صحیح علم کسی کو نہیں۔ آفرینشِ عالم کے کروروں سال بعد جب زمین پر انسان نمودار ہوا تو اس کے نشوونما کے چند مخصوص خطّے تھے۔ غالباً انھیں خطّوں میں دو تین مختلف زبانوں کی بنیاد پڑی ہوگی اور انھیں دو تین بولیوں سے آج دُنیا کی ہزاروں بولیاں بن گئی ہیں

کسی چیز کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس کا ذکر سنتے ہی سراپا توجہ بن جائیں اور اُس سے مانوس ہونے کے بعد بھی کبھی کبھی اس کے تصور سے چونک اُٹھیں۔ افلاطون کا قول ہے کہ فلسفہ یا عرفان، حیرت سے شروع ہوتا ہے، لیکن شاید وہ ختم بھی حیرت ہی پر ہوتا ہے

حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنی زبان سے اس قدر مانوس ہیں کہ اس کی پیدایش یا نشوونما کی کہانی بھول جاتے ہیں اور ہم میں سے اکثر وہ کہانی جانتے ہی نہیں — اُردو زبان، اُردو نثر، اُردو نظم کی کہانی بار بار کہی جا چکی ہے اور کہی جائے گی، لیکن آج ایک سرسری گفتگو اُردو تغزل پر بھی سُن لیجئے

اُردو کی پہلی غزل، ردیف و قافیہ کی پابندی کے ساتھ کب کہی گئی، اس کا صحیح علم نہیں، لیکن اگر اس کو صحیح مان لیا جائے کہ اُردو تغزل فارسی تغزل کی نقل ہے تو شاید ہم ایک ناقص سا اندازہ کر سکتے ہیں کہ اُردو تغزل کی ابتدا کب سے ہوئی لیکن میرے نزدیک یہ خیال ہی قابلِ قبول نہیں کہ اُردو غزل گوئی، فارسی تغزل کی نقل ہے۔ یہ کہکر گویا ہم یہ مراد لیتے ہیں کہ اُردو غزل گوئی میں خود اپنی کوئی چیز نہیں ہے، درانحالیکہ فارسی تغزل میں خود مقامی رنگ اس قدر کم ہے کہ تقلید کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ اس کے جواب میں شاید گل و بلبل، شراب و ساقی، شیریں فرہاد، مقتل و خنجر، کعبہ و بت خانہ، منزل و کارواں صحرا و گلستاں، جنون و گریباں وغیرہ کو پیش کریں گے، لیکن غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ "مقامیت" سے وسیع تر چیزیں ہیں اور ان کو صرف اسلامی یا ایرانی نہیں کہا جا سکتا۔ فارسی تغزل میں ان باتوں کا ذکر محدود یا مادی معنے میں بہت کم آیا ہے بلکہ ان کا استعمال عموماً تمثیلی حیثیت سے ہوا ہے، کیونکہ یہ الفاظ ہر زمانہ ہر مقام اور ہر تہذیب و تمدن میں انسانی زندگی کے داخلی پہلو کی ترجمانی کر سکتے ہیں۔ علاوہ اس کے اُردو غزلوں میں یہ الفاظ شاید دس پندرہ فی صدی سے زیادہ ہونگے بھی نہیں

اور اس لئے اگر ان کو ہم بدیسی چیز خیال کریں تو بھی اس کا امتزاج اُردو تغزل میں بہت کم ہے اور جتنا ہے وہ بھی کوئی معیا
چیز نہیں سمجھا جاتا۔

حقیقت یہ ہے کہ تغزل جغرافی صنفِ سخن ہی نہیں، اس کا موضوع انسان و انسانیت ہے اور اس لئے اس میں ایا
تو ران کی تفریق ہی خارج از بحث ہے

اس میں شک نہیں کہ اُردو غزل کی داغ بیل ہندوستان میں ادب پرست مسلمانوں نے ڈالی اور اسی لئے اس
اسلوب میں وہ باتیں بھی آگئیں جن سے تعلیم یافتہ مسلمان طبقہ صدیوں سے متاثر و مانوس تھا یعنی فارسی تغزل، لیکن خود فارسی
تغزل پر مقامی رنگ اتنا تیز نہ تھا کہ وہ ہندوستان کے باشندوں کے لئے بالکل بدیسی چیز ہوتا ورنہ ظاہر ہے کہ اُردو شاعری
غزل پیدا ہی نہ ہوتی اور ہوتی بھی تو اس قدر مقبول نہ ہوتی۔

اُردو غزل میں ان تمثیلات کا عنصر جنھیں ایرانی کہا جاتا ہے اتنا زیادہ نہیں ہے جتنا خود ہماری زبان کا یعنی اُرد
غزل میں خود ہماری بولی ٹھولی اس طرح گھلی ملی ہوتی ہے کہ سارا شعر اپنی جگہ اک مقامی چیز معلوم ہوتا ہے اور جن ٹکڑوں
میں ہم اپنے دلوں کی دھڑکن محسوس کرتے ہیں، وہ اپنی زبان ہی کے ہوتے ہیں نہ کہ ایرانی تمثیلات کے!

غزل کی زبان عام طور پر سہل و نرم ہوتی ہے اور ہمیشہ انھیں شعراء کی غزل کو معیاری چیز سمجھا جاتا ہے جنکی غزل
میں زبانِ ہندی کے مہذب اور رچے ہوئے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ اس لئے غزل کو زبان و خیال دونوں حیثیت سے ا
دیس کی چیز ماننا پڑے گا، ورنہ اس کے ہزاروں اشعار اُن لوگوں کی زبان پر نہ ہوتے جو فارسی جانتے ہی نہیں۔ یقیناً غز
میں ہمارے کاروبار، ہمارے دفتر، کارخانے اور کھیتوں کا ذکر نہیں ہوتا۔ نہ اس میں علوم و فنون کا بیان ہوتا ہے نہ دُنیا
اقتصادی و سیاسی تحریکوں کا، لیکن اس میں ان سے زیادہ اہم اور اساسی چیزوں کا ذکر پایا جاتا ہے۔ یعنی اس میں ہم
ہوتے ہیں، کائنات کے مجموعی تاثرات ہوتے ہیں اور ہمارے وہ مرکزی جذبات جن کی حیثیت عالمگیر ہے۔

غزل کو ہماری عملی زندگی کے مادی پہلو سے کوئی غرض نہیں۔ غزل کی شاعری ایک مہذب اور رچی ہوئی بیکاری ہے لیکن
شاید ایسی بیکاری جو فلسفہ و تمدن کی روح و رواں بن سکتی ہے۔

انسان کیا کرے، اس سے زیادہ اہم سوال شاید یہ ہے کہ انسان کیا محسوس کرے اور غزل اسی مقصد کو اپنے خا
انداز میں پورا کرتی ہے۔ غزل میں سمیٹ اور لپیٹ ہوتی ہے اسکے اسلوب میں منتشر حقایق کو جامعیت و ترنم کے ساتھ د
کی گہرائیوں میں اُتار دینے کی صلاحیت ہوتی ہے، غزل میں ایک معاملہ یا کیفیت کا ہر پہلو اپنی پوری کلیت کے ساتھ دل
پر چھا جاتا ہے اور یہیں سے غزل اور نظم کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے۔ غزل کا ہر شعر اپنی جگہ ادھوری بات ہے جس حد تک
وجدان، تخییل اور تصور کا تعلق ہے، نظم و غزل کی کیفیتیں بالکل ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ غزل کی اہم خصوصیت یہ
کہ اس کا لہجہ مانوس ہو اسی لئے شعورِ انسانی غزل کے اشعار سے فوراً حقایق تک پہونچ جاتا ہے اور اس کا ہر شعر ہمار

وجدان کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔

اُردو تغزل پر کئی پہلوؤں سے نظر ڈالی جا سکتی ہے مثلاً دہلی اور لکھنؤ اسکول کا تغزل، تغزل میں حسن و عشق کا معیار تغزل و اخلاق، تغزل و فلسفہ، تغزل و نفسیاتی حقایق وغیرہ وغیرہ، لیکن اس وقت ان میں سے کسی پر گفتگو نہیں کروں گا، بلکہ ان سب سے ہٹکر کچھ اور باتیں کہوں گا۔

اُردو غزل کا ذکر چھیڑتے ہی سب سے پہلے میر کا نام ہمارے سامنے آتا ہے۔ ہر چند ان کے زمانہ میں اور بھی کئی شاعر ایسے ہوئے ہیں جن کی غزلوں میں جان ہے، لیکن غزل کو بلند ادب کا مرتبہ دینے میں اولیت کا فخر میر کو حاصل ہے اور اس کے بعد سودا اور درد کو۔

کہا جاتا ہے کہ اُردو غزل کا آغاز اور ایک صدی تک اس کا نشو و نما ہماری زندگی کے انحطاطی دور کی یادگار ہے جب ہندوستان میں ہندوستانی حکومت کا چراغ جھلملا رہا تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا بابر و اکبر کے زمانہ میں، میر، سودا اور درد کی سی عشقیہ شاعری ممکن نہ تھی۔ شیکسپیر اپنی قوم کے انتہائی عروج کے زمانہ میں پیدا ہوا تھا پھر بھی اس کی شہرت کا راز اس کی المیہ تمثیلوں ہی میں پوشیدہ ہے

یہ درست ہے کہ زمانہ کی حالت سے شعوری یا غیر شعوری طور پر شاعر ضرور متاثر ہوتا ہے لیکن اس کلیہ کو استعمال کرنے میں کسی قدر احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ شاعر کے ذاتی حالات اور فطری افتادِ مزاج کو بھی اس میں بڑا دخل ہے ذوق کی عمر کا بڑا حصہ مفلسی میں گزرا، لیکن قناعت و خودداری انھوں نے کبھی نہ چھوڑی، برخلاف اس کے غالب کو دیکھئے کہ ہر طرف سے روپیہ ان کو ملتا رہا لیکن ان کی قنوطیت کا عنصر بدستور قایم رہا، یہی وجہ ہے کہ ذوق کا کلام ہمارے دل کی کلی کھلا دیتا ہے اور غالب ہم کو ہنساتا بھی ہے تو ہمارا دل دُکھ کر رہ جاتا ہے۔ بہر حال میر اور غالب کے زمانہ کی شاعری میں جو فرق پایا جاتا ہے اس میں دو خاص باتیں دیکھنے کی ہیں۔ ایک یہ کہ حسن و عشق کے واردات میں کوئی تبدیلی نظر آتی ہے یا نہیں، دوسری بات زبان کی صفائی، روانی اور بندش کی چستی ہے۔ زبان تو خیر پیچیدہ بھی ہوتی گئی اور سلجھتی بھی رہی، لیکن جہاں تک جذبات محبت کا تعلق ہے، میر کا حوصلہ شکن احساس غالب کے دور میں بدل جاتا ہے اور عشق کی طبیعت اگر بہل نہیں جاتی تو کچھ سنبھل ضرور جاتی ہے۔

میر کے لہجہ میں جو وسعت اور گہرائی پائی جاتی ہے وہ اس کے معاصرین میں بہت کم پائی جاتی ہے۔ میر کے یہاں محض غم و غصہ، سوز و گداز، حسرت و بیدلی ہی نہیں بلکہ ایک خاص داخلی بصیرت بھی اس کے یہاں پائی جاتی ہے اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اگر میر کے سے محبت کرنے والے اُس دور میں ہوئے بھی تھے تو وہ شاعر نہیں تھے اور اپنا درد دکھ اپنے ساتھ قبروں میں لے گئے۔ رہا ذوق و غالب کا زمانہ سو یہ ہر اعتبار سے مختلف تھا۔ ظفر کی عشقیہ شاعری میں غم کے عناصر پائے جاتے ہیں لیکن کمزور اور بجھے بجھے سے۔ اس زمانہ میں مومن بیشک ایک ایسا شاعر ہوا ہے جس کی احساس کی شدت کو تسلیم کرنا

پڑتا ہے، لیکن وہ کلیۃً تمام کر رہ جانے کی جگہ نفسیاتی کیفیات کی تلخیاں پیش کرتا ہے جن سے ہمیں خاص دلچسپی پیدا ہونے لگتی ہے۔ وہ جذبات سے مغلوب ہونے کی بجائے، وقوتِ جذبات کو اپنی شاعری کا خاص مقصد قرار دیتا ہے۔ مومن پہلا شخص ہے جس نے نفسیاتی واقعیت کی داغ بیل اردو تغزل میں ڈالی جو ہمیں کھُل کر رونے دیتی ہے نہ کھل کر ہنسنے دیتی ہے، لیکن افسوس ہے کہ لوگوں نے غالب کے مقابلہ میں مومن کی طرف کم توجہ کی اور اسکا سبب غالبًا یہ تھا کہ غالب کے یہاں صرف الفاظ کا اشکال ہے اور مومن کے یہاں مفہوم کا۔ غالب کا مشکل سے مشکل شعر آسان ہو جاتا ہے اگر آپ الفاظ کے معنے اور ان کی ترکیب کو سمجھ لیجئے، لیکن مومن کا آسان سے آسان شعر سمجھنا مشکل ہے اگر ہم کو جذبات کے نفسیاتی ادراک کا شعور حاصل نہیں۔

میر اگر اپنے زمانہ کا تنہا شاعر تھا، تو مومن بھی اپنے عہد کا ایک ہی شخص تھا اور ان دونوں کا فرق یہ تھا کہ میر کا فن دلوں میں آگ سلگاتا تھا اور مومن کا فن ہمارے سینوں کے اندر نشتر توڑتا۔ اس کے بعد بھی دلی میں اچھے اچھے شاعر ہوئے، لیکن ان میں سے کوئی کسی ایسی خصوصیت کا حامل نہ تھا جسے مرکزی حیثیت دی جائے۔ البتہ داغ کے تغزل کو علحدہ جگہ دینا پڑے گی، کیونکہ وہ میر اور مومن دونوں سے مختلف تھا، یعنی اس وقت تک لوگوں کی نگاہیں تغزل کی صرف وسعت اور گہرائی کی طرف تھیں، لیکن اب سطح پر بھی انھیں کچھ دلچسپیاں نظر آنے لگیں اور کھلنڈرے پن سے اُلجھنے لگیں۔ داغ کا رنگ میر و مومن کے رنگ کا انحطاط نہ تھا بلکہ ان سے علحدہ بالکل دوسری چیز تھی جو دلی سے باہر کی پیداوار تھی، اور اس سلسلہ میں لکھنؤ اسکول کی شاعری کا ذکر ناگزیر ہے۔

جب دلی مٹی تو لکھنؤ کی زندگی میں ایک زمانہ ضرور ایسا آیا جس میں خاصی چہل پہل پائی جاتی تھی اور رنگ رلیوں کی بھی کمی نہ تھی، لیکن اس جگمگاہٹ میں آتشبازی کی روشنی سے زیادہ کوئی بات نہ تھی جسے ہم ایک "دلفریب انحطاط" کہہ سکتے ہیں۔ یہاں میر بھی آئے، سوز بھی آئے، لیکن "پورب کے ساکنوں" سے وہ گھُل مل نہ سکے اور نہ یہاں کا رنگ انکی شاعری میں کوئی تغیر پیدا کر سکا۔ البتہ مصحفی نے اُردو تغزل کو ایک معتدل مزاج عطا کیا اور اسی اعتدال کے بدولت وہ سنگلاخ زمینوں سے اس طرح گزر جاتا ہے جیسے پانی کا ریلا کنکر پتھر سے۔ مصحفی نے اُردو غزل گوئی کو حسن کا سکون اور حسن کا خرام ناز عطا کیا جو معمولی بات نہیں۔

انشاء کی غزل گوئی کو لوگ دھیان میں نہیں لاتے، لیکن وہ چیز جسے انگریزی میں (Fancy) اور (Conceit) کہتے ہیں یعنی خیال و تصور میں گدگدی سی پیدا کرنا اور استعارات و تشبیہات سے کھیلنا صرف انشاء کے یہاں ملتی ہے۔ اسی طرح جرات نے نفسیاتی کیفیات کی جتنی صحیح مصوری کی ہے وہ بھی اپنی جگہ بے مثل ہے یہاں تک کہ داغ بھی اس کی تقلید میں کامیاب نہ ہوا۔

مصحفی اور انشاء کے بعد ناسخ و آتش کا دور شروع ہوتا ہے۔ ناسخ نے خارجی تغزل کو ایسا گورکھ دھندا بنا دیا کہ

وہ خارجی بھی نہ رہا اور حسن و عشق اس کے ننانوے فیصدی اشعار سے اس طرح غائب ہوا کہ لڑکے لڑکیوں کے کورس میں داخل ہو
کے لئے ناسخ کی غزلیں ہر وقت حاضر ہیں۔ آتش نے جہاں اس رنگ کی تقلید کی ناسخ کی طرح بگڑ گئے اور ناسخ نے جہاں آ
کی تقلید کی بن گئے۔ آتش کے کلام میں حسن و عشق زیادہ نہیں، لیکن جتنا کچھ ہے، وہ میر، غالب، مومن، جرأت، انشا
سب سے الگ ہے۔ آتش کی عشقیہ شاعری ایک صاحب باطن کی مجاز پرستی معلوم ہوتی ہے۔ آتش نے عشقیہ تغزل
ایک نیا مزاج دیا، نیا بانکپن نئی سرمستی، نیا اُبھار، نیا نکھار، نئی مادیت، نئی روحانیت بخشی اور مصحفی نے اس کی زبان کو
تسنیم بنا دیا۔ آتش کا تغزل اس شخص کا تغزل نہیں ہے جو انفرادی زندگی کے پیچیدہ مسائل کا حل ڈھونڈھ رہا ہو یا
اس شخص کا تغزل ہے جو ان مسائل کو حل کرنے کے بعد ہم کو بتا رہا ہے — یہ نشاط اور شگفتگی سودا کے یہاں بھی ہے لیکن آ
کے یہاں اس کی تہیں گہری ہیں۔ بہرحال ہندوستان میں مذاقِ زندگی اور مذاقِ محبت میر اور سودا کے زمانے سے آ
کے زمانے تک بدلا ہو یا نہ بدلا ہو لیکن شاعری کے اندر مذاقِ زندگی اور مذاقِ محبت دونوں بہت کچھ بدلتے

اُردو تغزل کا جاندار حصہ اور رچا ہوا حصہ لکیر کا فقیر نہیں تھا اس کا قالب ہمیشہ بدلتا رہا اور یہ بات محض زبان ا
انداز بیان کی تبدیلی تک محدود نہیں تھی۔

آتش اور ناسخ کے بعد امیر مینائی نے لکھنؤ میں غزل سرائی شروع کی اور ان کے تغزل میں ناسخ، مصحفی، آتش
مختلف رنگوں کا امتزاج ہمیں ملتا ہے۔ امیر نے مصحفی کے رنگین البیلے پن کو ناسخ کے تصنع کی چاشنی دیکر اُردو تغزل ا
انداز سے رچایا اور سنوارا۔ ناسخ کے بگڑے ہوئے رنگ اور داغ کے خطرناک کامیاب رنگ کی لالچ میں پڑکر امیر
اکثر غزل کو بگاڑا بھی مگر یہ حیرت سے خالی نہیں کہ امیر خاندان آتش و مصحفی کے فرد ہوتے ہوئے اپنے تغزل میں بار بار ناسخ
زانو دبا کر بیٹھتے ہیں اور امیر سے کچھ ہی کم مشہور ان کے ہمعصر جلال خاندان ناسخ سے ہوتے ہوئے اپنے متعدد اشعار میں ا
سوز و گداز اور نغمگی بھر دیتے ہیں جن کی تاثیر و لطافت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ وہی زمانہ ہے جب لکھنؤ کے اُجڑنے
دہلی والے اور لکھنؤ والے سب رام پور پہونچ گئے تھے اور ایک دوسرے کے رنگِ تغزل سے متاثر ہو چلے تھے۔ امیر او
حیدرآباد میں پیوندِ خاک ہوئے اور کچھ دنوں بعد جلال لکھنؤ میں۔ ان کے ساتھ اُردو تغزل کا ایک دور ختم ہو گیا۔ صر
اُردو تغزل کا نہیں بلکہ ہندوستانی تہذیب اور ہندوستانی زندگی کا بھی۔ اب ہندوستانی سماج اور ہندوستانی کلچر
ادب کی دُنیا بدلنے والی ہے۔ بیسویں صدی کا آغاز ہے۔

امیر، داغ اور جلال کے شاگردوں کی آوازیں ابھی فضا میں گونج رہی ہیں۔ ان کی جانشینی کے بھی چرچے ہیں
ابھی یہ بات کسی کو معلوم نہیں کہ جن کی جانشینی کی بحثیں جاری ہیں وہ اپنی ملکیت اور ملوکیت لیکر دُنیا سے سدھار رہے ہیں
لیکن امیر، داغ اور جلال کے زمانہ ہی میں اُردو تغزل حالی پانی پتی، شاد عظیم آبادی، آسی غازیپوری کے ہاتھوں نیا قا
اختیار کر رہا تھا۔ ان کی آوازوں میں جو خلوص تھا جو معصومیت تھی اور جو رس تھا وہ رفتہ رفتہ دلوں کو موہنے لگا کم سے کم ا

دلوں کو جنھیں دھڑکنا آ گیا تھا۔ یہ بھی سوفی صدی داخلی اور معنوی انقلاب تھا جس میں اگر کوئی دخل ہے تو ہماری تہذیب اور زندگی کی نئی بیداری کو اور شعراء کے انفرادی وجدان کو دکر طرزِ بیان اور طرزِ ادا کو۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اُردو تغزل کے ہر دور میں ایک طرح کی نقطہ پرستی دوسری طرح کی لفظ پرستی سے بدلتی رہی ہے۔ وہ خود لفظ پرستی کے دام میں گرفتار ہیں۔ زندگی بدلتی رہی اس لئے اُردو غزل بدلتی رہی۔ جیسا ابھی گذارش کر چکا ہوں، ہندوستان کی دنیا بدل رہی تھی اور ہمارے ادب کی ہر صنف کا بدل جانا لازمی تھا۔ ناول میں سرشار کا دور ختم ہو کر فسانہ نگاری کا دور شروع ہونے والا تھا، پُرانے طرز کے قصاید اور قطعات کا دور ختم ہو کر آزاد، حالی، اسماعیل اور اکبر کا دور آنے والا تھا، پُرانے تذکروں کی جگہ حالی اور شبلی تاریخ و تذکرہ کو نئے راستہ پر لا رہے تھے، علمی کتابوں کی تصنیف و تالیف کا دور شروع ہو گیا تھا۔ ہندوستان کا وسطی طبقہ مغربی کلچر کی روشنی اور آنچ کو جذب کر رہا تھا، شاعری کو سننے اور پڑھنے والوں کے دل و دماغ بدل رہے تھے، پُرانا نظام ہندوستان کو خیرباد کہہ رہا تھا۔ اگر ہندوستان کے اس عالمگیر ذہنی انقلاب کا احساس کسی کو ہو تو اس انقلاب میں اور اُردو غزل کی بدلی ہوئی آواز میں جو ہم آہنگی ہے وہ سمجھ میں آ جائے گی گو یہ بات نہیں کہ نئے تغزل کے نمایندے کبھی کبھی قدما کی آواز پر آواز نہ دیں۔ لیکن ان کے یہاں جو چیز دیکھنے یا سننے کی ہے وہ ان کی بازگشت آوازیں نہیں بلکہ نئی آوازیں ہیں۔ اگر ہمارے کان کے پردے ان نئی آوازوں کو پہچان سکیں۔

دہلی (اور اس کے اطراف) میں غالباً داغ ہی کی کچھ کامیاب اور کچھ ناکامیاب تقلید ہوتی رہی اور لکھنؤ و جوار لکھنؤ میں امیر کی۔ لیکن لکھنؤ میں صفی، عزیز، محشر، نوبت رائے نظر وغیرہ نے بیسویں صدی کے ابتدائی دس پندرہ سال میں اُردو غزل کو نئی شستگی اور شایستگی دی اگرچہ ایسا کرنے میں انھوں نے بار ہا مرثیت کا سہارا لیا۔ میں اسے جذباتی اسکول کی شاعری کہتا ہوں۔ اس اسکول کے کئی شاعر سنجیدگی اور خلوص پیدا کرنے کے لئے امیر مینائی کے نشاطیہ رنگ کے بجائے غم کا سہارا لیتے ہیں اور غم کو عموماً بستر علالت، نزع، جنازہ اور گورِ غریباں کے تصورات تک محدود کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں کہ اس اسکول کے تغزل میں حسن و عشق کی داستان نہیں۔ قبل کی عشقیہ شاعری کے کچھ اثرات جذباتی مدرسہ کی عشقیہ شاعری میں ضرور نظر آتے ہیں، مگر اس اسکول کے اچھے عشقیہ اشعار محض قدما کی تقلید نہیں ہیں۔ غالب کی پرچھائیں اور کہیں کہیں میر کی ہلکی سی پرچھائیں ان اشعار پر ضرور پڑتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میر اور غالب کے جذبات میں وہ مرکزیت و ہمہ گیری ہے کہ ان کی آوازیں پچاسوں اور سیکڑوں برس بعد بھی دلوں میں اُتر کر پھر اُبھرتی ہیں لیکن ان کے یہاں غالب کی آواز ایک نیا چھیلاپن اور ایک نئی تلخی لئے ہوئے اور میر کی آواز بھی کچھ پُرانی کچھ نئی صورت میں نظر آتی ہے۔ وسعت و تنوع البتہ جذباتی اسکول کی عشقیہ شاعری میں کم ہے۔ اس شاعری میں جو نکھار ہے وہ عموماً ایک منہ کلی کا نکھار ہے کھلے ہوئے پھول کا نکھار نہیں ہے۔ بہرحال یہ تو نے ہوئے غنچۂ سربستہ بھی ایک رنگ و بو رکھتے ہیں گو اس رنگ و بو میں سیاہی مایل فاسد خون کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔

اس رقیق یاتمی یا جذباتی اسکول سے ثاقب لکھنوی کا تغزل کچھ الگ تھلگ سے اور کچھ ملتا ہوا بھی۔ ثاقب کے یہاں پرخلوص عشقیہ اشعار کا فقدان ہے اور حسن وعشق کا بیان جہاں جہاں ہے وہ لطافت و رنگینی سے خالی ہے۔ انھوں نے حیات وکائنات پر ذاتی شکوہ وشکایت اور غم پرستی سے آگے بڑھکر بہت کم کہا ہے، مگر گل وبلبل اور اُردو تغزل کی روایتی تمثیلوں کی بنیاد پر ثاقب نے ایسے اشعار بھی ضرور کہے ہیں جن پر نگاہیں اٹھ جاتی ہیں۔۔ آرزو تو ثاقب سے بھی زیادہ جذباتی اسکول کے شعراء سے علحدہ ہیں۔ انھوں نے میر کی لمبی بحروں میں اور میر کے انداز کی مشابہت لئے ہوئے غزلیں کہی ہیں اور حسن وعشق کی کیفیات کی کہیں کہیں بڑی کامیاب مصوری کی ہے۔ لیکن چونکہ بوساطت اپنے اُستاد جلال کے وہ خاندان ناسخ کے شاعر ہیں اس لئے زیادہ تر خارجی اور کم تر داخلی کیفیات حسن وعشق کی مصوری آرزو کے یہاں ملتی ہے۔ آرزو کے یہاں زبان وطرز ادا میں وہی سنگار اور بناؤ پایا جاتا ہے جو مسجع و مرصع نثر میں ہوتا ہے۔ الغرض ثاقب کی شاعری کے سرے تو جذباتی اسکول سے مل بھی جاتے ہیں۔ لیکن آرزو کو جذباتی اسکول کا شاعر نہیں کہا جا سکتا۔

جذباتی اسکول کی تپ زدہ شاعری کے عروج کا زمانہ سنہ ۱۹۱۰ء سے سنہ ۱۹۲۵ء یا اس کے کچھ پہلے بعد تک سمجھئے، لیکن آخرکار وہی ہوا جو ہونا تھا یعنی مرزا یاس نے ان منہ بند کلیوں پر وہ چنگاریاں برسائیں کہ ان کی افسردگی دھویں میں تبدیل ہوگئی۔ یگانہ کے تغزل میں حسن وعشق کی داستان بہت کم آتی ہے اور جب آتی ہے تو اس میں جذباتی اسکول کے نسائی جلاپے کے انداز نہیں ہوتے بلکہ مردانہ زور ہوتا ہے ان کے تخیل و احساس کی گرمی خود بخود لو دیتی ہے یگانہ عاشق نہیں لیکن ان کے عشقیہ اشعار میں حسن کا احساس ومشاہدہ ہے اس لئے وہ بڑے پتہ کی کہہ جاتے ہیں۔ یگانہ کے زیادہ تر اشعار براہ راست حسن وعشق کے بیان سے متعلق نہیں بلکہ حیات وکائنات کے دوسرے پہلوؤں سے متعلق ہیں اور ان اشعار میں بھی وہی چوٹ کھائے ہوئی تلملاہٹ پائی جاتی ہے جو اُن کی عشقیہ شاعری میں ہے۔ کلام یگانہ میں کڑی دھوپ کی آنچ ضرور ہے لیکن تونسانے کے ساتھ ساتھ وہ ہمارے لئے ایک طاقت بخش فرحت بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔

یاس اُدھر لکھنؤ کے رقت پسند جذباتی اسکول کی شاعری پر آگ برسا رہے تھے، اِدھر حسرت موہانی قید فرنگ کی چکیوں کے سنگین پاٹوں سے جو چنگاریاں اُڑتی تھیں، ان کو نرم اور رسیلے نغمہ میں تبدیل کر رہے تھے۔ حسرت نے اپنی ہستی کو روح تغزل میں بالکل حلول کر دیا تھا۔ جرأت، مصحفی اور مومن کے انداز احساس اور وجدان کی مختلف تحریراتوں کا وہ لطیف ومکمل امتزاج حسرت کے تغزل میں ملتا ہے جسے ہم اپنے قلب وگوش کے لئے صرف ایک نعمت کہہ سکتے ہیں۔ حسرت کے کلام کی واقعیت ایک ایسی نرم راست گوئی اور رنگین سچائی بن گئی ہے جسے ہم جان تغزل کہہ سکتے ہیں بیان و وجدان کی اس پختگی کی مثال حسرت کی غزلوں میں ملتی ہے ان کے اشعار میں شعور کی وہ سادگی و پُرکاری اور کیف و اثر کی وہ رنگینی نظر آتی ہے جو بیک وقت سامنے کی چیز بھی معلوم ہوتی ہے اور مسلک انسانی کی آخری منزل بھی

اُردو تغزل میں اتنی لطیف و رنگین داخلیت اس سے پہلے مفقود تھی۔ حسرت کا تغزل ہمیں تخیل کی بلند پروازیوں سے فلسفیانہ معنویت سے اور تصوف و عرفانیت سے بے نیاز کر دیتا ہے اور وہ ہمارے اندر ایک ایسی رفاقت (Companionship) کی صلاحیت پیدا کر دیتا ہے جس کی مثال اُردو کے کسی غزل گو کے کلام میں نہیں ملتی یہاں تک کہ امیر و غالب کے کلام میں بھی نہیں۔

فانی بدایونی نے بھی اپنے انداز تغزل سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا شروع کیا، لیکن ان کی غزل گوئی ایسی ہے جیسے چوٹ کھائی ہوئی بجھی ہوئی طبیعت کو کرید کرید کر خاک کی ڈھیر سے چنگاریاں اُڑائی جا رہی ہیں۔ وہ لکھنؤ کے جذباتی اسکول اور لکھنؤ کے عام رنگ سے کافی حد تک متاثر معلوم ہوتے ہیں لیکن وہ لکھنؤ کے رنگ سے صرف غمگینی اور نکھرا ہوا انداز بیان لے لیتے ہیں اور مرثیت نہیں ہے۔ باقیات اور عرفانیات فانی کو ہمدردی اور قدردانی کے ساتھ پڑھ چکنے کے بعد کائنات اور حیات بجائے کوئی وسیع ڈرامائی کیفیت رکھنے کے بہت چھوٹی چیز معلوم ہونے لگتی ہیں۔ فانی کا شیوۂ تسلیم و رضا، محاسن کائنات و حیات کا احساس پیدا نہیں کرتا۔ ان کے یہاں نہ تحیر ہے نہ تحیر کی سپردگی۔ محبت کی تلخیاں ان کے یہاں شدید سے شدید تر یا تلخ سے تلخ تر تو ہوتی گئی ہیں، لیکن شاید مے کہنہ ہونے کے بجائے وہ تیزاب ہو کر رہ گئی ہیں۔

فانی کے ساتھ ہی ساتھ اصغر گونڈوی بھی اُبھرے۔ اصغر نے اپنا پینتیس یا چالیس برس کی عمر تک کا کلام شایع ہونے سے روک دیا۔ مذہب کے اثر سے جو ذہنی و اخلاقی انقلاب چالیس برس کی عمر میں اصغر کی زندگی میں ہوا اس نے ان کی طبیعت میں نئی لطافت پیدا کر دی تھی اور اسی لئے ان کے کلام میں داخلی طہارت، روحانی نشاط اور لطیف سرمستی کی کمی نہیں۔

اصغر کے کلام میں انسان کا انسان سے عشق قریب قریب مفقود ہے۔ آب و گل کی دنیا، ماہ و انجم، دریا، صحرا، بادہ و ساغر یہاں تک کہ پیکر انسانی اور تمام مادی چیزیں اصغر کے یہاں سماوی ہو گئی ہیں۔ بات شاید یہ ہے کہ اصغر کی جوانی نے جنسیات و شہوانیات میں روحانیت کا عنصر پایا ہی نہیں تھا۔ عاشق و محبوب کے تعلقات جنسی کو ان کا شعور لطیف بنا ہی نہ سکا تھا، اسی لئے ان کی روحانیت سونی نظر آتی ہے۔

اسی کے ساتھ جگر کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ وہ ہماری گوشت و پوست کی رگوں پر زخمہ زن ہیں۔ ان کے تغزل میں ان کے پڑھنے کا انداز چار چاند لگا دیتا ہے۔ جگر جیتے جی اپنی طرز زندگی کی وجہ سے ایک سنسنی پیدا کرنے والی روایت (Sensation) بن گئے اور چونکہ ان کے تغزل میں دعوت فکر کم اور دعوت کام و دہن زیادہ ہے، اس لئے اپنی شاعری و شخصیت کے اُبال سے جلد اُبھر آئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ جگر کی شاعری میں والہانہ انداز ہے کہیں مجھے ایک ہیجانی اضطراب کی کیفیت نظر آتی ہے۔ بیمار کی لڑکھڑاتی ہوئی چال اور شرابی کی لغزش مستانہ میں جو

جو فرق ہے وہی جگر کے ہیجان اور سچے والہانہ انداز میں ہے۔ جگر کی کامیابی کا اک راز یہ بھی ہے کہ ان کے تغزل
جتنی زندگی ہے اس سے کہیں زیادہ "شاعری" ہے اور زندگی بھی ایک بیتاب نفسانی خواہش والی زندگی سے
اچھے اور بُرے دونوں معنوں میں جو "شاعری" جگر کی غزلوں میں پائی جاتی ہے اس کی وجہ سے ان کی کامیا
ایک حد تک لازمی تھی کیونکہ داغ دہلوی کی روایتیں اور لکھنؤ کی لفظ پرستی کی روایتیں اب تک شاعری کی دنیا میں
جمہور کے لئے ایک کشش و دلفریبی رکھتی ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ جگر کی زندگی اور شاعری کے یہ محرکات
ان کے تغزل میں کوئی محاسن پیدا کر ہی نہیں سکے۔ کلام جگر کے اگر اس حصے کا انتخاب کیا جائے جو ذرا سنبھل
کہا گیا ہے یا جہاں ان کے وجدان کا ہیجان اپنے رنگ میں کامیاب ہو گیا ہے تو یہ مجموعہ ہمارے کبھی کبھی کے توجہ کی
چیز ضرور ہوگا۔ چونکہ ہیجان و اضطراب بہت جلد باسی ہو جانے والی اور حقیقی مستی و والہانہ پن سدا بہار چیزیں ہیں
اسی لئے جگر کا تغزل جتنا سنتے ہی متاثر کرتا ہے اتنا بعد کو نہیں۔ اس میں عطر کی بو اور اُڑان ہے لیکن
شراب کہنہ کا دیرپا اثر اس میں نہیں جگر کے بہت کم اشعار ایسے ہیں جن میں وہ روک تھام ہو کہ ہم انھیں تنہائی
کے لمحوں میں گنگنا گنگنا کر خاموش طور پر متاثر ہو سکیں۔ ان میں رنگِ مشاعرہ یا رنگ محفل زیادہ ہے اور خلوت کے جلوے
بہت کم ہیں۔

سیماب اکبرآبادی کی غزلوں کا ایک خاصہ حصہ اچھا ہے لیکن کسی انفرادیت کے بدلے مشاقی ان میں
زیادہ نمایاں ہے۔ سیماب کے اشعار بسا اوقات بہت اچھے ہوتے ہیں اور اسی دور کے تغزل کے جلوے ان میں
نظر آتے ہیں لیکن ان کی کوئی اپنی آواز نہیں، اپنا لہجہ نہیں، اپنا جمالیاتی نظریہ اور اپنا وجدان نہیں ان کے اچھے
سے اچھے شعر کو سن کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ سیماب کی آواز ہے۔

حال میں اثر لکھنوی کا دیوان بہاراں شایع ہوا ہے۔ اُسے غور سے پڑھنے پر اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے
یہ کلام نہایت متین، مہذب اور سنجیدہ ہے، بالکل مذاق سلیم کے مطابق اور زبان و بیان کے لحاظ سے مستند ہے
ہے۔ اثر نے عشق کیا ہے حسن کا مشاہدہ کیا ہے حسن و عشق کے تاثرات اور ان کے نفسیات کا شعور حاصل
کیا ہے۔ لیکن شاعری میں وہ چیز جسے ہم جادو کہتے ہیں اثر کے یہاں ہمیں نہیں ملتا، اسی لئے ان کی شاعری
محض "سمجھنے" کی چیز ہے۔ اس میں ہم کھونا چاہیں تو کھو نہیں سکتے۔

آزاد انصاری کا تغزل بھی نہایت حساس اور واقفکارانہ ہے۔ وہ ایک نئے قابل قدر اور مخصوص اسلوب
و انداز کے مالک ہیں اور ان کا کلام ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ ہے مختصر سا حال آج تک کے اُردو تغزل کا۔ دورِ حاضر کے اُردو تغزل کو ہم پچھلے ادوار کے تغزل سے
کئی باتوں میں مختلف پاتے ہیں۔ "جذباتی" "رقی" یا "ماتمی" مدرسۂ تغزل کے بعد کے شعرا کسی ایک مدرسہ یا

اسکول کے نہیں ہیں۔ حسرت، یگانہ، اصغر، فانی، جگران سب کا الگ الگ مزاج ہے الگ الگ تغزل ہے۔ اب و لہجہ، آوازیں اور فضائیں ضرور دورِ حاضر کی ہیں لیکن جو تنوع و اختلافِ مزاج ان میں ہے وہ ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم انھیں دورِ حاضر کے متغزلین کا ایک گروہ کہیں نہ کہ ایک مدرسہ یا اسکول کا چند اور اُمور بھی قابلِ لحاظ ہیں۔ اُردو زبان و ادب پر خصوصاً اُردو شاعری پر اور اس سے بھی زیادہ اُردو غـــزل پر جو حکومت دہلی اور لکھنؤ کی تھی وہ جہاں تک تغزل کا سوال ہے حسرت اور ان کے غیر دہلوی اور غیر لکھنوی معاصرین کے کارناموں کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مٹ گئی۔ اُردو رسایل نے جہاں تک شہرت قایم ہونے یا قایم کرنے کا سوال تھا اب مشاعروں کی جگہ لے لی ہے۔ اس طرح ہر پڑھا لکھا آدمی ملک کے مشہور شعرا کو جان پہچان گیا ہے اور شعرا کی اہمیت کے متعلق اہلِ ملک کا خیال منظم ہو چلا ہے۔ اب ایک تعلیم یافتہ جمہوریت اس کا فیصلہ کرتی ہے کہ کون شاعر کیسا ہے اور اُسے کتنا بڑا اور کتنا چھوٹا سمجھا جائے۔ یونیورسٹیوں میں اُردو ادب کے مطالعہ اور رسایل میں تنقیدی مضامین کے اثر نے نئی آزادی اور نئی ذمہ داری اُردو خواں پبلک کے لئے پیدا کر دی ہے۔ اُردو ادب کی یہ ترقی ہندوستان کی اس نشأۃ ثانیہ کا نتیجہ ہے جو غدر کے بعد شروع ہوا اور جس نے پچھلے پندرہ بیس سال کے اندر ہمارے ملکی ادب میں ایک انقلاب رونما کر دیا۔

یہ عہد اُردو ادب کا عہد زریں ہے اور نثر میں بھی خوب کام ہو رہا ہے — یوں کہئے کہ پچھلی چوتھائی صدی میں جتنے مصنف اور جتنی کتابیں نثر کی نکلی ہیں وہ تعداد و اہمیت کے لحاظ سے ایسی ہیں کہ اُردو ادب کی پچھلی تاریخ اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ نظم اور غزل میں صرف چوٹی کے شعرا نہیں بلکہ قریب پچاس ساٹھ شعرا نے اسی چوتھائی صدی میں مقدار، تعداد، تنوع اور ادبی اہمیت کے لحاظ سے جو کچھ کیا ہے وہ دو سو برس کے اُردو کارناموں پر بھاری ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی طور پر ہمارا ذہن اُگ آیا ہے۔ جس کا ثبوت چوٹی کے غزل گو شعرا کے علاوہ دوسری اور تیسری صف کے شعرا کے کلام سے بھی ملتا ہے۔

دورِ حاضر کے تغزل کی خصوصیتوں میں معنویت، سنجیدگی، وقوفِ جذبات، اور حسن و عشق کی کیفیتوں کا تجزیہ اور کلام کی ہمواری، ترنم کا عنصر ایک رچا ہوا مذاق، سطحی یا رسمی شکوہ و شکایت سے بچنا اور حسن و عشق کے احساس کے ذریعہ سے حیات و کائنات کی نئی تنقید اور ان سے متعلق نئے اشارات۔ نفسیات انسانی کی تحلیل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اُردو تغزل میں علاوہ ان باتوں کے جن کا ذکر پہلے آ چکا ہے خود عشق یا غم زندگی محض جنسی محرکات تک محدود نہیں تھا۔ بلکہ یہ الفاظ اُس تہذیب یا زندگی کے ان اُصول کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو زندگی کو خشک بنجر ہو کر رہ جانے سے بچاتے ہیں، جو زندگی کو طاقت و تازگی بخشتے ہیں، اگر ایسا نہ ہوتا تو اُردو تغزل کا وہ حصہ جس میں معاملہ بندی یا مخصوص طور پر حسن و عشق کا حال نہیں بیان کیا گیا ٹکسال باہر سمجھا جاتا۔ جو لوگ تغزل کو صرف عورتوں یا

معشوقوں سے بات چیت تک محدود رکھنا چاہتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ تغزل میں اُصولِ زندگی اور زندگی کے مستقل عناصر سے متعلق ہر موضوع شامل ہے، شرط صرف یہ ہے کہ ایسے اشعار میں شعریت ہو، کیف و اثر ہو۔ دورِ حاضر کے تغزل میں حسن و عشق کا بیان ہی پہلے کے عشقیہ اشعار سے مختلف نہیں بلکہ حیات و کائنات پر جو حکم لگائے گئے ہیں وہ بھی بسا اوقات نئے احساسات کے حامل ہیں اور نئے نئے نظریئے پیش کرتے ہیں۔

میں نے اب تک جان بوجھ کر اُردو تغزل میں اس انقلاب کا ذکر نہیں کیا جو اقبالؔ کے ہاتھوں رونما ہوا۔ اب تک اُردو تغزل میں عشق و زندگی کے جو اُصول پیش کئے گئے تھے ان میں انفرادی زندگی کے لئے جو کچھ بھی کہا گیا ہو لیکن اجتماعی زندگی کا موضوع اور اجتماعی زندگی کے اُصول بیان نہیں کئے گئے تھے۔ غزل کی زبان بڑی حد تک اس کام کے لئے ناموزوں تھی۔ اگرچہ اس دور کے تغزل میں بہت وسعت و تنوع ہے پھر بھی اجتماعی زندگی اور اسکے اُصول اجتہاد اور ایجاد چاہتے تھے۔ یہ کام اقبالؔ نے کیا۔ انسانی تاریخ اور اجتماعی زندگی کا فلسفہ انھوں نے اپنے زاویۂ نگاہ سے اپنی غزلوں کے سیکڑوں اشعار میں بیان کیا۔ کچھ پُرانی زبان سے مدد لی اور کچھ اپنی زبان خود بنائی۔ انسانیت کے عروج و زوال سماجی زندگی کے پیچیدہ مسائل انسانی تاریخ کے رجحانات سائنس اور جدید فلسفہ کی روشنی میں پیش کرنے کی ضرورت ہے لیکن ایسے غزل گو اب آئیں گے۔ اس کے لئے مغربی علوم سے محرکات ملیں گے۔ اشتراکیت، جمہوریت، دہریت، حسن و عشق، حیات اور کائنات کے نئے نظریئے علاوہ نظم گو شعرا کے، آنے والے غزل گو شعرا پیش کریں گے۔ اقبالؔ نے موضوع میں اہم وسعت ضرور پیدا کر دی لیکن اقبالؔ کا نظریہ جو ایک شخصی آسمانی خدا اور دینیاتی ملت و نظام پر قایم ہے اب اس کے بھی دن بیت چکے ہیں۔

میں نے دورِ حاضر کے جن بڑے متغزلین کا نام لیا ہے یعنی حسرتؔ، یگانہؔ، فانیؔ، جگرؔ اور اقبالؔ ان سب کے کام ختم ہو چکے۔ اُن میں جو زندہ ہیں ان کی عمر پچاس سال یا اس سے زاید ہے، اُردو کا کوئی غزل گو جس کی عمر پچیس سال سے چالیس پچالیس سال تک ہو ایسا نہیں ہے جس پر نگاہیں اُٹھیں۔ برعکس اس کے اُردو نظم گو شعرا جن کی شہرت قایم ہو چکی ہے ان میں ایک جوشؔ ملیح آبادی کو چھوڑ کر اور جتنے ہیں سب لگ بھگ تیس برس کے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ آیندہ پچیس تیس سال تک اُردو غزل ایک لمبی نیند سوئے گی۔ اُردو تغزل کو پھر سے زندہ کرنے والا جو شاعر ہوگا وہ یا تو آج بالکل بچہ ہے یا دو چار برس بعد پیدا ہوگا اور مزاج، تعلیم و تربیت، ذہنی فضا اور زندگی کے لحاظ سے بالکل نیا انسان ہوگا۔ مگر اُردو تغزل کے اس خوابِ گراں کو اُردو تغزل کی موت نہ سمجھنا چاہئے۔ تغزل ہمارے نخلِ ادب کا اولین ثمر تھا اور آخری ثمر بھی تغزل ہوگا کیونکہ غزل کا اسلوب وہ بنیادی و انتہائی چیز ہے کہ ہمارے کلچر کی پختہ ترین شکل غزل ہی کے اشعار میں نظر آئے گی، غزل ہی ہمارے ادب کے دل کا چور ہے۔ غزل ہی ہمارے ہر دور کی آخری منزل کی نمایندگی کرسکے گی اور غزل ہی میں ہمارے کلچر کی تکمیل کے آثار نظر آئیں گے

امیر و داغ کے بعد ہی معیاری اور حقیقی اُردو تغزل کے مطالبے سخت تر ہوتے گئے، چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ عزیز، حسرت، یگانہ، فانی اور ان سے پہلے حالی وغیرہ نے جو غزلیات کے مجموعے چھوڑے وہ اشعار کی تعداد کے لحاظ سے میر، مصحفی، ناسخ، آتش، امیر اور داغ کی پُرگوئی کے مقابلے میں بہت مختصر ہیں۔ بیسویں صدی کے اُردو تغزل نے چوتھائی صدی تک قدم قدم پھونک پھونک کر آگے بڑھایا ہے اور اب اگر اُسے دورِ حاضر کی منزل پر منید آگئی ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ابتک کی غزل گوئی اور تیس چالیس برس آگے کی غزل گوئی کے درمیان ایک دُنیائے خواب حایل ہے۔ اس دوران میں ہماری زندگی اور ہمارے ادب کی تکمیل کئی طرح سے ہوتی رہے گی جب نئی تہذیب نئی زندگی نیا ادب اپنی پوری جوانی پر آجائیں گے تو ان میں شباب کا آخری نکھار پیدا کرنے کے لئے اُردو تغزل آنکھیں ملتا ہوا، انگڑائیاں لیتا ہوا پھر اُٹھ بیٹھے گا۔

اُردو تغزل پر بہ حیثیت مجموعی حکم لگاتے وقت ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ اب تک اس میں عموماً آفاقی لب ولہجہ (Cosmic note) نہیں رہا۔ غزل گو شعرا یہی نہیں کہ اجتماعی زندگی اور انسانیت کا زور اپنے کلام کے زیر و بم میں نہیں بھر سکے بلکہ انفرادی اثرات میں بھی آفاقی وسعت پیدا نہیں کرسکے۔ بلند آہنگی ضرور سودا اور کبھی کبھی ناسخ یا دیگر شعرا نے اپنے تغزل میں پیدا کی لیکن قصیدہ نما بڑے بول اور آفاقی وسعت میں فرق ہے اُن کے انفرادی احساس اور تجربے سے آفاقی قوتوں کی سرحدیں نہیں ملتیں۔ کائنات سے ہم آہنگی کا پتہ نہیں ملتا۔ عبرانیت (Hebraism) تخصیصیت (Particularism) اور ثنویت (Dualism) کے محرکات اب تک زیادہ کارفرما تھے۔ معصومیت اور خیر و برکت کی شان، امرت میں ڈوبی ہوئی آواز کی گونج عموماً بہت کمی رہا ہے۔ اُردو تغزل کو محض حیات نما نہیں ہونا ہے بلکہ حیات بخش ہونا ہے۔ اُردو کے غزل گو کو بلندیوں اور گہرائیوں میں پہنچنا ہے اس کو حیات، کائنات حسن و عشق سے از سرِ نو مانوس ہونا ہے۔ اُسے زندگی کی نئی قدروں کو دریافت کرنا ہے۔ حسن و عشق کو جدید سائنس، جدید فلسفہ، جدید نفسیات، جدید محرکات کی روشنی میں محسوس کرنا اور پیش کرنا ہے۔ انسان کا آفاق میں کیا مقام ہے اس کا شاندار مستقبل کیا ہے۔ اس احساس کی تھرتھراہٹ آئندہ کی غزل کے زیر و بم میں ہونا چاہئے۔ غرضکہ اُردو تغزل کے داخلی، معنوی اور وجدانی اجزائے ترکیبی اب بالکل بدل جائیں گے۔ جس شاعر کا تخیل میر، غالب، آتش، بلکہ حسرت یا اقبال تک کے تخیل سے بوجھل ہو جائے گا، اُس کے ہاتھوں نئے تغزل کی داغ بیل پڑسکے گی اب تک کے اُردو تغزل میں ایک بات ہمیں اور نظر آئی ہے۔ آپ اُردو غزلوں کا کوئی دیوان اُٹھا لیجئے۔ اول، دوئم، سوئم، ہر درجے کے اشعار آپ کو ملیں گے لیکن ایسے شعر بہت کم ملیں گے جو احساس و تفکر کے لحاظ سے یہ پتہ دیں کہ ان اشعار کا شاعر چالیس پچاس برس پہلے زندگی کا یہ احساس کر ہی نہیں سکتا تھا۔ ایسے اشعار جو شاعر کے داخلی و ذہنی ارتقا کا ثبوت دیں بہت کم ملیں گے۔ زیادہ تر ہماری غزل گو بیس پچیس برس کی عمر کے تجربے یا محرکات ہی کو عمر بھر تختۂ مشق بناتے رہے یا

پھر لفظوں سے کھیلتے رہے۔ اس نے مستقبل کا غزل گو بہت سے اُستادوں کے کلام سے استفادہ کر ہی نہیں سکے گا، ہاں میر، غالب، آتش، اقبال اور چند دیگر متغزلین کے کلام سے بالکل آزاد طور پر اپج کی لینا سیکھے گا۔ اس کام میں اُردو کی نظم و نثر، مغربی ادب اور نئی تہذیب سے بہت سہارا مل سکے گا۔ اب پُرانی شاگردی و اُستادی کے دن گئے، عروض کی کتابیں پڑھکر غزل گو ہونے کے دن گئے اور پُرانی ذہنیت کے زیر اثر اظہار جذبات کے دن بھی گئے۔ اب تو حُسن و عشق کی شاعری کے لئے بھی نئے احساسات نئے معلومات اور نئے ادراک کی ضرورت ہے۔ آج جو ہم ادبی مذاق رکھنے والوں کو نظم کی طرف زیادہ راغب و مایل پاتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ زمانہ اُردو میں نئے تغزل کا منتظر ہے اور ابھی نئے تغزل کا وقت نہیں آیا ہے نہ اس سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت ہم میں ابھی پیدا ہوئی ہے، نظموں نے ہمیں بہت کچھ دیتے ہوئے بھی ہمارے تخیل و ادراک کو ذرا آسان پسند بنا دیا ہے۔ آئندہ کا تغزل شاعر اور شعر فہم دونوں سے نسبتاً سخت مطالبہ کرے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ عام پسند ادب کی تخلیق عموماً ناولوں، افسانوں، نظموں، ڈراموں کی صورت میں ہو اور غزل، ادب کا مخصوص ترین اور لطیف ترین حصہ ہو جائے لیکن اگر اُردو تغزل عام پسند ہوا بھی تو صرف اس کا ایک حصہ عام پسند ہوگا۔ اس کا سب سے قیمتی حصہ انھیں کے لئے ہوگا جن میں ادب عالیہ سے متاثر و مستفید ہونے کی خاص صلاحیت ہو۔ آئندہ کے تغزل کے لئے خاص دل و دماغ کی ضرورت ہوگی۔ غزل میں ہمارے کلچر کا عطر ہوگا۔ تغزل ہمارے شعور کو وہ لطیف و نازک نکھار عطا کرے گا جو غالباً کسی اور صنف سخن کے لئے ممکن نہ ہو۔ دیگر اصناف سخن ممکن ہے شاعری کے لئے مخصوص ہو جائیں لیکن زندگی شاید غزل کی آواز ہی پر آواز دے گی۔

بزمِ نگار

آج قارئین نگار کے سامنے جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے، وہ غالباً اُردو ادب اور اُردو تذکروں کی دُنیا میں بالکل نئی چیز ہے۔

اس وقت تک جتنے تذکرے شایع ہوئے ہیں، ان کی نوعیت یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے تذکروں سے کچھ حالات فراہم کرکے اپنی پسند کے چند اشعار لے لیتا ہے اور اُن پر اظہار رائے کر دیتا ہے۔ اس قسم کے تذکروں کی تاریخی اہمیت تو اس لئے ضعیف ہوتی ہے کہ ان کی ترتیب میں تذکرہ نگار خود کوئی مورخانہ جستجو نہیں کرتا اور ان کی انتقادی حیثیت اسلئے کمزور ہوتی ہے کہ ان میں کلام شعراء پر کوئی صحیح نقد و تبصرہ بھی نہیں ہوتا۔ اس قسم کے تذکرے در اصل ایک طرح کی بیاض ہیں جن میں تذکرہ نگار اپنی پسند کے چند اشعار جمع کر دیتا ہے اور خود اپنے ذوق کے لحاظ سے پسندیدگی یا ناپسندیدگی کے اظہار کو کافی سمجھتا ہے۔

یہ درست ہے کہ اس قسم کے تذکروں کا دور ختم ہوگیا ہے اور اب جو کچھ لکھا جا رہا ہے، اس میں نسبتاً زیادہ چھان بین سے کام لیا جاتا ہے، لیکن خود شاعر کا ذوق معلوم کرنے کی کوشش اب بھی نہیں کی جاتی، یعنی ہم خود اپنی جگہ تو یہ فیصلہ کر لیتے ہیں کہ ایک شاعر کا فلاں شعر اچھا ہے اور فلاں شعر بُرا، لیکن خود شاعر کی پسند کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

وہ شعراء جو اس وقت موجود نہیں ہیں، ان کے متعلق تو اب یہ کاوش بیکار ہے کہ وہ اپنے کن کن اشعار کو زیادہ پسند کرتے تھے، لیکن وہ جو ہنوز زندہ ہیں ان کی پسندیدگی کا علم ہم کو ضرور حاصل ہو سکتا ہے اور منجملہ دیگر محرکات کے ایک یہ خیال بھی تھا جس کی بنا پر میں نے عہدِ حاضر کے تمام اکابر شعراء کو تکلیف دی کہ وہ خود اپنے کلام کا انتخاب مرحمت فرمائیں، اور غالباً میری یہ کوشش کہ عہدِ حاضر کے تمام خوش فکر اساتذہ کا خود انتخاب کیا ہوا کلام آپ کو ایک جگہ مل جائے۔ حال و مستقبل دونوں زمانوں کے نقادوں اور تذکرہ نویسوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوگی۔ انتخاب کے ساتھ حالات بھی آپ کو نظر آئیں گے اور یہ بھی سب خود شعراء کے فراہم کئے ہوئے ہیں، خواہ انھوں نے خود اپنی طرف سے انھیں لکھا ہو یا دوسری کی طرف سے۔

اول اول یہ خیال میرے دل میں کیوں پیدا ہوا، اسے بھی مختصراً سن لیجئے: یہ امر مسلّم ہے کہ سخن گو ہونا اور چیز ہے اور سخن فہم ہونا دوسری. یعنی ممکن ہے کہ ایک شاعر خوش فکر ہو اور خوش فہم نہ ہو اور اس طرف سب سے پہلے میرا

ذہن اس وقت منتقل ہوا جب میں نے میر کا خود انتخاب کیا ہوا کلام دیکھا۔ میر اس لحاظ سے کہ وہ بہت سے نشتر رکھنے والے دیوان کا خالق ہے، یقیناً "خدائے سخن" ہے، لیکن جب میں نے خود اس کا انتخاب دیکھا تو مجھے "شعرِ فہمی عالم بالا" کی طرف سے سخت مایوسی ہوئی۔ چنانچہ دوسرا محرک یہ خیال بھی تھا کہ اگر اس وقت کے شاعروں کی خوش گوئی اور خوش فہمی دونوں کی مستند دستاویز ہم کو میسر آ جائے تو یہ تبصرہ نگاروں کے لئے بڑے کام کی چیز ہوگی، علاوہ ان دو باتوں کے ایک تیسری بات اور بھی تھی جس نے مجھے اس طرف مائل کیا۔

غزل کے آپ جتنے دور چاہیں قائم کریں، لیکن ولی اور میر کے زمانہ سے لیکر چند سال پہلے تک "حسن و جمال" کا ذکر خالص عشق و محبت کی زبان میں، کم و بیش ہر دور میں غرض مشترک کی حیثیت سے پایا جاتا تھا، لیکن اب کچھ زمانہ سے "حسن اس پریوش" کا ختم ہو یا نہ ہوا ہو، لیکن "بیاں اپنا" ضرور بدلتا جا رہا ہے۔ یقیناً یہ تبدیلی دفعتاً نہیں ہوئی، بلکہ وقت و زمانہ کے لحاظ سے آہستہ آہستہ ہر دور میں کچھ تغیر ہوا اور اس تغیر کا اثر چونکہ موضوع شاعری پر بھی پڑا، اس لئے غزل کی زبان، اور اس کا اسلوب بیان بھی بدلتا رہا، لیکن اب اس تغیر نے چونکہ انقلاب کی صورت اختیار کر کے غزل گوئی طرف سے انحراف و بغاوت کے جذبات لوگوں میں پیدا کر دئے ہیں، اس لئے ہم اب اسے نمایاں طور پر محسوس کرنے لگے ہیں۔

غزل میں سب سے پہلی آمیزش فلسفہ و تصوف کی ہوئی اور اس میں شک نہیں کہ جس نے اول اول غزل گوئی میں یہ مذہب اختیار کیا وہ سخت "ناکافر" انسان تھا جو ہمارے کرۂ زمین کے "دلبرانِ مہوش" کی "کارگاہِ حسن و محبوبی" کو ہمیشہ کے لئے ویران کر گیا۔

اُردو غزل میں فلسفہ و تصوف کیوں آیا؟ اس کے متعدد اسباب بتائے جاتے ہیں، لیکن ایک وجہ جس کی طرف لوگوں نے بہت کم توجہ کی ہے۔ میں بیان کرتا ہوں۔

آپ اگر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ "مجاز" میں "حقیقت کا مشاہدہ کرنے والے اور "دختِ رز" کا رشتہ کوثر و تسنیم سے جوڑنے والے شاعر دو قسم کے تھے۔ ایک وہ جو قدرت کی طرف سے فکرِ موزوں تو لائے تھے، لیکن چونکہ ان کے دل و دماغ کی ساخت "جراتِ رندانہ" کی مقتضی نہ تھی، اس لئے ان کا ملا شاعری بجائے "قامتِ دوست کے طوبیٰ پر صرف ہونے لگا یعنی جو گناہ وہ یہاں نہ کر سکتے تھے اسے دوسری دُنیا پر اُٹھا رکھا، جہاں دنیا کا ہر گناہ عطیۂ خداوندی کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ یا اگر ہم زیادہ غایر نگاہ و نقد سے کام لیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ان کا احساس اس قدر لطیف نہ تھا کہ وہ دنیاوی عشق و محبت کو اس دُنیا میں رہتے ہوئے اپنے لئے جائز بنا سکتے۔ بہرحال ایک دو کو چھوڑ کر جن جن شعراء نے اپنی غزل گوئی کا مقصود ابتداہی سے فلسفہ و تصوف قرار دیا، ان میں سے ایک قسم تو وہ تھی جس کا ذکر ابھی کیا گیا۔ دوسری قسم اُن شاعروں کی تھی جنھوں نے ابتدا میں تو سب کچھ وہی کہا جو "فردوسِ گوش و نظر" تھا، لیکن جب قوا میں کمزوری اور جذبات میں تھکن

پیدا ہوئی تو وہ صرف " فردوس " کی باتیں کرنے لگے، یعنی ان کی شاعری بجائے اس دنیا سے متعلق ہونے کے دوسری د
سے وابستہ ہوگئی۔

اس حقیقت کو سامنے رکھ کر جب آپ اس وقت کی غزل گوئی پر نگاہ ڈالیں گے تو اس کے موجودہ رجحان و میلان
اندرونی تہوں میں تھی زیادہ تر وہی چیز کار فرما نظر آئے گی جس کا ذکر ابھی کیا گیا اور کمتر اس چیز کا فقدان جسے میں اسی دنیا
احساس بلند و لطیف " کہتا ہوں۔

پچھلے بیس پچیس سال کے اندر ہندوستان اور اس کی آبادی جہاں تھی بظاہر وہیں ہے، لیکن سچ پوچھئے
اس سرزمین میں سخت ذہنی انقلاب پیدا ہوگیا ہے۔ ملوکیت کی بساط رنگین جس پر شاعروں کو بھی " شاہد و شراب " سے
لطف اندوز ہونے کا موقع ملتا تھا، وہ تو عرصہ ہوا اٹھ چکی تھی، لیکن اس کا سوگ بہت زمانہ بعد تک جاری رہا اور اس
معشوق کے اٹھ جانے کے بعد بھی شعراء عرصہ تک اس کے چرچوں میں مصروف رہے، لیکن یہ " دود چراغ محفل " بھی آ
کب تک رہتا، رفتہ رفتہ وہ بھی ختم ہوا اور اب شاعروں کو بعض ایسی تلخ حقیقتوں سے دوچار ہونا پڑا کہ ——
" یاران فراموش کردند عشق " !

وصل معشوق کے بجائے خود عاشق اپنی بقا کی فکر میں الجھ گیا اور لطف و نشاط کی جگہ جبر حیات کے مسائل نے
لیلی، گویا اب سب سے پہلی مرتبہ شاعروں نے دیکھا کہ ان کا دامن واقعی تار تار ہے اور رفو کرنے کی جگہ اب اس
جلد بنا ہی ضروری ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مغربی تعلیم و تہذیب " آئین دہر " بدل کر ہندوستان میں بھی اپنے قدم جما چکی تھی اور شاعر
کے ان نقوش میں جو مٹے تو نہ تھے لیکن ماند پڑ گئے تھے، اب دوسرے ہی رنگ بھرے جا رہے تھے عشق بھی حسن کی گرفت
سے کسی قدر آزاد ہوا، حسن بھی محبت کے بارے کسی قدر سبکدوش ہوا اور غزل میں بیان محبت کی جگہ ان باتوں
لیلی جن کو زمانہ کی ضرورت اور وقت کا اقتضا بتایا جاتا ہے۔ پھر نظموں میں تو بڑی گنجائش تھی یعنی ملک و قوم کے مسا
آزادی سے لیکر " نہر پر چلنے والی پن چکی " تک سبھی کچھ اس میں آسکتا تھا لیکن غزل میں ان حالات کے تحت سوا
فلسفہ و تصوف کے اور کیا لایا جا سکتا تھا۔ کیونکہ جب شاعر کی سمجھ میں خود نہ آئے کہ اسے کیا کہنا چاہئے تو ظاہر ہے
پھر وہ وہی کہے گا جو واقعی سمجھنے کی چیز نہیں۔

بعض حضرات تصوف کو فلسفہ سے علیحدہ کر کے اس کے جواز کے لئے جداگانہ دلیلیں پیش کرتے ہیں لیکن در اصل
دونوں ایک چیز ہیں۔ کیونکہ دونوں میں مختلف نوعیتوں سے اپنے جہل کا اعتراف کیا جاتا ہے اور اسی لئے میں تصوف
محض کی شاعری کو " شئے مجہول " کہتا ہوں۔

بعض کا خیال ہے کہ میں تصوف کا مخالف ہوں لیکن یہ صحیح نہیں۔ میں تو اس کا قائل ہوں کہ تصوف ا

ہی جا سکتا ہے غزل میں بالکل شرط یہ ہے کہ پہلے وہ احساس بلند و لطیف اپنے اندر پیدا کر لیا جائے جو تغزل و تصوف دونوں
ان ہے۔ میں تصوف کے حال کا قائل ہوں، قال کا نہیں جس کا تعلق صرف اصطلاحات سے ہے نہ کہ محاکات سے اور یہ
شل کا ہے۔ اگر بیدل سے ہٹ کر کوئی شخص صوفیانہ شاعری کرتا ہے تو اس پر شعر و تصوف دونوں حرام ہیں۔

بہرحال مقصود یہ بتانا تھا کہ تغزل میں سب سے پہلا تغیر یہ ہوا کہ خالص حسن و عشق کی جگہ اس میں فلسفہ و تصوف
ہوا اور پھر اس کے بعد ملک کے ذہنی انقلابات نے غزل ہی کی طرف سے لوگوں میں بیزاری پیدا کرنا شروع کر دی۔
تک کہ موجودہ دور تغزل، پچھلے ادوار سے اتنا مختلف ہے کہ اگر ہم غزل کو صرف حسن و عشق تک محدود نہ رکھیں تو ہمیں
کا حال و مستقبل دونوں بہت شاندار نظر آتے ہیں اور یہ ماننا پڑتا ہے کہ اسلوب بیان کے جتنے نئے طریقے اب نظر آتے
وہ اس سے پہلے کبھی نہ پائے جاتے تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ اس اُپج نے مہمل نگاری اور غلط نگاری کو بھی بہت
ج دیدیا ہے۔

نئے خیالات اور جدید اسلوب بیان کے لئے ہمارے نوجوان شاعروں میں سے اکثر نئے نئے الفاظ نئی نئی ترکیبیں
مال کرتے ہیں درانحالیکہ انھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ ان الفاظ کا صحیح مفہوم اور محل استعمال کیا ہے۔ یہی حال جدید
فادات و تشبیہات کا ہے، کہ ان میں سے اکثر وہ ہوتی ہیں جن کو ہماری زبان برداشت نہیں کر سکتی اور نہ ذوق
کے استعمال کی اجازت دیتا ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ ضرور ہے کہ اب شاعری خواص کی ملکیت نہیں رہی اور اس میں
ریت کی شان پیدا ہو گئی ہے، یعنی دہلی، لکھنؤ اسکول کی بحث اب بے معنی ہو کر رہ گئی ہے اور زبان سے زیادہ اب
سن خیال پر نگاہ جاتی ہے۔

الغرض اردو شاعری اسوقت جس دور سے گزر رہی ہے، اس کا مستقبل اس تیزی کے ساتھ اپنی جگہ الگ پیدا
بار ہا ہے کہ ممکن ہے عنقریب حسن و عشق والی غزل گوئی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے اور یہی وہ تمام محرکات تھے، جنھوں نے
اس بات کی طرف مائل کیا کہ اس دور کے تمام بڑے بڑے غزل گو شاعروں کے کلام کا انتخاب اگر ان کی پسند کا ایک جگہ
ام کر دیا جائے تاکہ کل کا تذکرہ نویس و تبصرہ نگار ان ہستیوں کو بھی یاد رکھنے پر مجبور ہو جو دور غزل گوئی کی آخری نشانیاں
اور جن کے بعد شاید اس رنگ نباہنے والا کوئی نہ رہے گا۔

میں نے اس بزم میں شرکت کے لئے دو قسم کے غزل گو شعراء کو دعوت دی، ایک وہ جو اپنی کہنہ مشقی یا کسی اور وجہ سے اسوقت
لوئی میں اُستادانہ حیثیت رکھتے ہیں عام اس سے کہ وہ میرے یا آپ کے نقطۂ نظر سے اچھے شاعر ہوں یا نہ ہوں اور دوسرے
عرا جن کی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے ہوئی لیکن شہرت حاصل ہوئی انھیں نظموں کے ذریعہ سے اور وہ واقعی اچھا
والے بھی ہیں۔

پہلے گروپ کے شعراء میں سے میں نے کسی کو نہیں چھوڑا، اور ہو سکتا ہے کہ دوسرے گروپ میں کوئی رہ گیا ہو لیکن

اگر آپ اُن خصوصیات کو سامنے رکھیں گے جن کا میں نے ذکر کیا ہے تو دوسرے گروپ میں وہی شعراء رہ گئے ہوں گے جو غیر معمولی شہرت نہیں رکھتے اور اگر رکھتے ہیں تو فی الحقیقت وہ اچھے شاعر نہیں اور غلط گو ہیں۔

پرانے غزل گو شعراء میں سے آپ کو دو شاعر اس بزم میں نظر آئیں گے، ایک حضرت سائل دہلوی، دوسرے جناب صفی لکھنوی۔ جناب سائل تو اپنی بیماری کی وجہ سے انتخاب کی زحمت گوارا نہ کرسکے اور حضرت صفی کے متعلق میں اس سے زیادہ کہنا مناسب نہیں سمجھتا کہ میں نے ان کا انتخاب حاصل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن انھوں نے انکار سے لیکر وعدہ فردا تک کوئی معشوقانہ ادا ایسی نہ تھی جو صرف نہ کردی ہو، اور میں ان کا انتخاب حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

مجھے ان دونوں بزرگوں کی عدم شرکت پر سخت افسوس ہے لیکن میرا ضمیر غیر مطمئن نہیں ہے۔

پہلے گروپ کے خالص لکھنوی شعراء میں سے چار کا نام آپ کو نظر آئے گا۔ آرزو، ثاقب، اثر اور ناطق یہ چاروں حضرات ملک میں کافی شہرت رکھتے ہیں، آرزو صاحب کا تو حلقۂ تلامذہ بھی بہت وسیع ہے لیکن ثاقب صاحب نے شاید اس دردسری کو قبول نہیں کیا اور ان کی معنوی اولاد اگر ہے تو بہت کم ہے۔

جناب آرزو جلال لکھنوی کے شاگرد و جانشین ہیں اور صحت زبان و بیان کے لحاظ سے استنادی حیثیت رکھتے ہیں، آپ کی غزل گوئی کو دو دور میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک وہ جب آپ کا قیام لکھنؤ میں تھا اور حضرت جلال مرحوم کے رنگ تغزل میں نکھار پیدا کر رہے تھے، دوسرا دور وہ جب آپ کلکتہ چلے گئے اور ضرورتاً خالص ہندوستانی زبان میں شاعری شروع کی۔ اس رنگ کا مجموعہ آپ کا "سریلی بانسری" کہلاتا ہے اور اپنے سادگی زبان کے لحاظ سے ہمیں میر و درد کا زمانہ یاد دلاتا ہے۔

جناب ثاقب کا شمار نہایت متین و سنجیدہ کہنے والوں میں سے ہے، ان کے یہاں نہ عشق و محبت کا نامناسب جنون ہے، نہ خودی و خودداری کی بیجا فرزانگی، وہ نہ عاشق کی حیثیت سے زیادہ کھل کھیلنا پسند کرتے ہیں اور نہ غیر ضروری فلسفہ طرازی صرف کرکے اپنا آشیانہ بہت بلند دکھانا چاہتے ہیں۔ اسی لئے ان کا کلام آپ کو الفاظ و خیال کی رکاکت سے پاک نظر آئے گا۔

مرزا جعفر علی خاں اثر ان لوگوں میں سے ہیں جو شاعر پیدا ہوئے اور شعر و شاعری ہی ان کی زندگی کا مقطع ہوگا۔ آپ نے بہت کچھ کہا ہے اور آپ کی فرصت کا مشغلہ صرف غزل گوئی ہے۔ جناب اثر کے کلام میں ہم کو لکھنؤ کا وہ رنگ بھی نظر آتا ہے جس کو سنکر انسان پھریری لینے پر مجبور ہو جاتا ہے اور حسن تخئیل کا وہ رنگ بھی جسے ہم آفاقی کہہ سکتے ہیں۔ اثر کی شاعری کی ابتدا گو اس زمانہ میں ہوئی جب لکھنؤ میں جذبات نگاری زیادہ تر شیون و ماتم تک محدود تھی، لیکن آپ نے اپنا دامن ہمیشہ اس سے بچایا۔ یہاں تک آپ اپنے استاد عزیز لکھنوی سے بھی اس باب میں زیادہ محتاط نظر آتے ہیں۔ زبان کی صحت کے لحاظ کوئی رائے قایم کرنا اس لئے فضول ہے کہ آپ کے خاندان کی زبان ہمیشہ ٹکسالی مانی گئی ہے۔

جناب ناطق بھی پرانے کہنے والے ہیں اور فلسفہ و تصوف کے استغراق سے علٰحدہ ہوکر اگر آپ کبھی کچھ کہتے ہیں تو

اس میں بعض باتیں چونکا دینے والی بھی نظر آتی ہیں۔

لکھنؤ اسکول کے ایک اور بڑے شاعر بھی آپ کو اس بزم میں نظر آئیں گے یعنی فصاحت جنگ حضرت جلیل مانک پوری آپ امیر مینائی کے شاگرد و جانشین ہیں اور ایسے شاگرد و جانشین کہ اگر آج امیر زندہ ہوتے تو وہ خود ان کے حق میں غزلگوئی سے دستبردار ہو جاتے۔ جناب جلیل کے یہاں، سلاست بیان کا یہ عالم ہے گویا ایک بزم وسبک روچشمہ ہے جو ہلکے ترنم کے ساتھ بہتا چلا جا رہا ہے، ان کا لکھنوی رنگ تغزل اتنا نکھرا ہوا اور اس قدر دلنشین ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے انسان اس کے سامنے سب کچھ بھلا دینے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔

جلیل کے یہاں نہ تصوف ہے نہ فلسفہ، نہ کوئی مضمون آفرینی ہے، نہ فکر و خیال کی بلندی، لیکن ان کے کلام کی سادگی، روانی، بے تکلفی اور خیالات کا سلجھا ہوا ہونا اس گلاب کا سا حسن ہے جس کے قبا کو گل بوٹے کی ضرورت نہیں — حقیقت یہ ہے کہ جلیل اس وقت اپنے رنگ کے تنہا کہنے والے ہیں اور انتخاب تو انھوں نے اتنا پاکیزہ کیا ہے کہ اب کیا کہوں کیا جی چاہتا ہے۔

اول الذکر چاروں حضرات نے اپنا کلام کا انتخاب بہت محنت و کاوش سے کیا ہے، لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اچھے اشعار ان سے نظر انداز نہیں ہو گئے۔

دہلی اسکول کے شاعروں میں تین حضرات کے نام آپ کو اس فہرست میں نظر آئیں گے، ایک بیخود دہلوی، دوسرے پنڈت امرناتھ ساحر، تیسرے پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی اور یہ تینوں اپنی عمر و مشق کے لحاظ سے اسی زمانہ کے شاعر ہیں، جو دہلی میں تو ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا اور دہلی سے باہر بھی ختم ہونے ہی والا ہے۔

جناب بیخود کی حیثیت ایک ایسے کہنہ مشق اُستاد کی سی ہے، جس کے بہک جانے میں بھی لطف ہے اور جس کی اُستادی کو بلا دلیل ماننا پڑتا ہے، امرناتھ ساحر کا میلان زیادہ تر تصوف کی طرف ہے اور کیفی کے یہاں زہد و رندی دونوں کا مناسب امتزاج نظر آتا ہے۔ ان حضرات نے اپنے کلام کا جس قدر انتخاب بھیجا ہے، وہ اُن کے رنگ کو پوری طرح ظاہر کر رہا ہے اور اسلئے خوب ہے۔

لکھنو کے غیر لکھنوی شعرا میں سے صرف دو کے نام آپ کو فہرست میں ملیں گے۔ ایک جناب امید امیٹھوی، دوسرے حضرت آسی الدنی۔ جناب امید امیٹھی کے رہنے والے ہیں اور آسی کا وطن الدن (میرٹھ) ہے، لیکن یہ دونوں حضرات اتنے عرصہ سے لکھنؤ میں ہیں اور لکھنوی شعر و شاعری کے اتنے معرکے انھوں نے دیکھے اور جھیلے ہیں کہ انھیں اب لکھنوی کہنا ہی زیادہ مناسب ہے۔

جناب آسی کی شاعری بڑی دامن دار شاعری ہے یعنی وہ ایک اچھی خاصی جماعت اپنے شاگردوں کی بھی رکھتے ہیں اور مشاعروں میں بھی کثرت سے شریک ہوتے ہیں۔ انکی شاعری میں دہلی اسکول کا رنگ غالب ہے اور وہ محاورات وغیرہ میں زیادہ تر اساتذۂ دہلی ہی کا تتبع کرتے ہیں۔ ان کی غزل گوئی کا حسن، ان کے بیان کی سادگی اور جذبات کا چٹیلا پن ہے، اور اسی لئے جہاں کہیں وہ فارسی ترکیب استعمال کرنے پر آ جاتے ہیں، تو ہم کو کچھ اجنبی سے محسوس ہونے لگتے ہیں، میں آسی صاحب کا شمار ان شاعروں میں کرتا ہوں جو خوش گو بھی ہیں اور خوش فہم بھی۔

جناب امید کا شمار ان پڑھے لکھے شاعروں میں سے ہے جنکی قابلیت و ذہانت کو اُردو شاعری کے علاوہ کوئی اور میدان تلاش کرنا چاہئے
[ا]نھوں نے اُردو میں شاعری اس لئے نہیں کی کہ خود انھیں اس کی خواہش تھی، بلکہ وہ خود ان کا فن ہو کر رہ گئی۔ جناب امید فارسی کے
اچھے شاعر ہیں اور اس زبان پر ماہرانہ عبور رکھتے ہیں، لیکن لکھنؤ میں رہنا اور اُردو غزل نہ کہنا، اُمید صاحب کی رنگینی طبیعت سے
[ب]عید تھا۔ آپ نے کچھ دن جلالؔ لکھنوی سے مشورہ لیا اور پھر خود اپنے ذوق کو اپنا رہبر بنا لیا۔ آپ کی سخن فہمی کا حال آپ کے انتخاب کلام
سے ظاہر ہے کہ اگر میں خود یہ خدمت انجام دیتا تو شاید اس سے بہتر انتخاب نہ کر سکتا۔
امیر مینائی مرحوم کے ایک اور جید شاگرد جناب وفاؔ شاہجہانپوری بھی اس بزم میں شریک ہیں اور اس خصوصیت کے لحاظ سے
[کہ] کچھ کہتے ہیں بہت سوچ سمجھ کر کہتے ہیں، اپنے اُستاد کے بہترین تلامذہ میں سے ہیں۔ ان کے کلام میں وہ بلندی پائی جاتی ہے جس سے
[لکھ]نوی شعراء متاخرین کا کلام خالی نظر آتا ہے۔ ان کا انتخاب بھی اچھا ہے گو بہت اچھا نہیں۔
لکھنؤ اسکول کے سلسلہ میں مجھے یاسؔ کا ذکر بھی کر دینا چاہئے۔ گو ان کا وطن عظیم آباد ہے، لیکن وہ آتشؔ کی شاعری سے
[اس قد]ر متاثر ہیں کہ ان کو لکھنوی اسکول کی پیداوار سمجھنا چاہئے۔ یاسؔ سے جو معرکے یہاں لکھنؤ میں ہوئے ہیں ان کی یاد اب بھی بعض
[لوگوں] کے دلوں میں باقی ہے۔ یاسؔ پہلا شخص تھا جس نے لکھنؤ کے روتے اور بسورتے ہوئے رنگ تغزل پر کاری ضرب لگائی اور یہ کہنا
[مب]الغہ ہوگا کہ یاسؔ ہی نے سب سے پہلے اپنے زمانہ کے لکھنوی شاعروں کے اُس رنگ تغزل کو جلا جو اپنا اصلی رنگ چھوڑ کر بے تمیزی
[سے] غالبؔ کی تقلید پر آمادہ ہو گئے تھے۔ یاسؔ نے غالبؔ کے متعلق جو کچھ لکھا، میں اسے ردِ عمل سمجھتا ہوں اس شدید مخالفت کا
[ج]و مقلدین غالبؔ کی طرف سے یاسؔ کے باب میں ظاہر کی گئی اور جسے یاسؔ ایسے حساس انسان کے دماغ کو واقعی بری طرح
[کھٹک]نا چاہئے تھا، ورنہ یاسؔ کی فطرت شاید اس کو گوارا نہ کرتی۔ یاسؔ کی شاعری حسن و عشق کا وہ مرقع نہیں ہے، جس میں محبت کی
[افت]ادگی، خواری و تذلل تک پہونچ جاتی ہے بلکہ اس میں ہمیں ایک ایسے عشق خود دار کی جھلک نظر آتی ہے جس کا سینہ تو فروزاں
[ہے مگر جس کے لب] پر آہ و فغاں نہیں۔ افسوس ہے کہ انھوں نے اپنے کلام کا انتخاب با دلِ ناخواستہ کیا، ورنہ انکے یہاں جواہر ریزوں کی کمی نہیں۔
دہلی اسکول کے تین اور شاعر آپ کو اس بزم میں نظر آئیں گے۔ ایک حسرتؔ موہانی، دوسرے آزادؔ انصاری تیسرے نوحؔ ناروی
حسرتؔ کے رنگ تغزل کے متعلق کچھ لکھنا حقیقتاً ایسا ہی ہے جیسے ہم دن کو دن کہیں۔ حسرتؔ کی شاعری ایک ایسا آفتاب ہے
[جو ک]سی دلیل کے اپنی روشنی و حرارت ساری دنیا سے تسلیم کرا لیتا ہے۔ یہ ہر چند امیر اللہ تسلیمؔ کے شاگرد ہونے کی حیثیت سے خاندان
[لکھنؤ] سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن سچ پوچھئے تو ان کلام میں میرؔ، مومنؔ و مصحفیؔ تینوں کا اتنا صحیح امتزاج پایا جاتا ہے کہ شاید اب
[ک]وئی دوسری مثال پیش نہ کر سکے۔
حسرتؔ کا کلام اپنی سادگی و پرکاری کے لحاظ سے اتنی حسین و دلکش چیز ہے کہ بجائے سننے کے اسے کلیجے میں رکھ لینے کو جی چاہتا
ہندوستان میں اس وقت حسرتؔ ہی وہ شاعر ہے جس کے کلام کی داد سوائے خاموشی کے اور کسی طرح نہیں دیا سکتی۔

حسرت کی یہ خصوصیت کہ باوصف اسی دُنیا کی شاعری کرنے کے وہ ہمارے سامنے کوئی اور آسمان و زمین کردیتا ہے، حسرت ہی کا حصہ ہے اور اسی کے ساتھ ختم ہوجاتا ہے۔

آزاد انصاری، حالی کے شاگرد ہیں اور اُن کے تغزل میں حالی ہی کی سی سادگی نظر آتی ہے۔ ان کے کلام کی خصوصیت ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور الفاظ کی تکرار سے اپنے بیان میں بہت زور و اثر پیدا کردیتے ہیں اور بعض شعروں میں یہ انداز واقعی سحرِ حلال کی کیفیت پیدا کردیتا ہے

نوح ناروی، داغ کے شاگرد ہیں اور غالباً صفِ اول کے شاگردوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ زبان کی صفائی محاورات کا برمحل استعمال ان کی وہ خصوصیت ہے جسے شاید انھیں کے ساتھ ختم ہوجانا ہے۔

اب پہلے گروپ میں صرف وہ شعراء رہ گئے ہیں جن کا تعلق دہلی و لکھنؤ اسکول سے نہیں ہے اور ان میں سب سے پہلے وحشت کا نام سامنے آتا ہے۔ وحشت بڑے کہنہ مشق شاعر ہیں اور اُردو تغزل میں فارسی ترکیبوں کو گوارا و خوشنا صورت سے استعمال کرنا اسیر کی طرح ان کا خاص کارنامہ ہے۔ پڑھا لکھا آدمی جب غزل میں اپنی قابلیت کے اظہار پر آجاتا ہے تو غزل کو برباد کردیتا ہے، لیکن وحشت کی خوش ذوقی نے کبھی یہ نقص اپنے کلام میں پیدا ہونے نہیں دیا۔ ان کے یہاں یہ سب کچھ بہت سلامت روی کے ساتھ پایا جاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ وہ اس حیثیت سے بڑی عزت کے مستحق ہیں۔

ناطق گلاؤٹھوی بھی تغزل کے دیرینہ گرفتار ہیں اور باوصف کسی خاص اسکول کے پابند نہ ہونے کے ان کا انداز بیان ہم کو اساتذۂ دہلی کی یاد دلاتا ہے۔ یہ معاملات حسن و عشق کو اسی زبان میں ادا کرتے ہیں جو تغزل کے لحاظ سے معیاری چیز سمجھی جاتی ہے اور بعض اوقات یہ اپنے خیال کو ایسے پہلو سے پیش کرتے ہیں کہ سننے والا دفعتاً چونک پڑتا ہے۔ ان کے کلام میں ایک خاص تیکھاپن پایا جاتا ہے، جو پُرانی بات میں بھی نئی کیفیت پیدا کردیتا ہے۔ سلاست و روانی جو تغزل کی جان ہے ان کے کلام میں ہر جگہ پائی جاتی۔

تاجور نجیب آبادی نے گو نظمیں بھی کہی ہیں، لیکن ان کا شمار غزل گو شعراء میں کیا جائے گا، کیونکہ ان کا فطری ذوق جسے وہ پنجاب لیکر گئے، یہی تھا۔ افسوس ہے کہ یہ اپنے کلام کی شیرازہ بندی کی طرف سے بہت بے نیاز واقع ہوئے ہیں ورنہ ان کا دیوان کبھی سے بہت پہلے شائع ہوگیا ہوتا۔ ان کے کلام کی خصوصیت الفاظ کا رکھ رکھاؤ اور خیال کی بلندی ہے۔ ادنیٰ جذبات یا سخیف خیالات سے ان کی غزلیں بالکل پاک ہیں۔

سیماب اکبرآبادی، اپنے آپ کو آگرہ اسکول کا شاعر سمجھتے ہیں، حالانکہ آگرہ اسکول دہلی اسکول سے علٰحدہ کوئی چیز نہیں۔ سیماب اس وقت ہندوستان کے مشہور اساتذہ میں شمار کئے جاتے ہیں اور اس میں شک نہیں انھوں نے اس وقت تک کافی خدمت اردو ادب کی انجام دی ہے۔ آپ کی شاعری کا آغاز بھی غزلوں ہی سے ہوا ہے اور یہ ماننا پڑے گا کہ تقلید و فرسودگی کو انھوں نے اپنی شاعری کا نصب العین کبھی قرار نہیں دیا جو کچھ ان کی شاعری کے ابتدائی دور میں نظر آتی ہے وہی اب بھی موجود ہے اور اگر کوئی ان کے غیر معمولی شاعری کا قائل ہے۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں بہت سوچ سمجھ کر کہتے ہیں اور اسی سے ان کی غزلیں مستا

ایک خاص قسم کی فرزانگی و ہوشیاری پائی جاتی ہے، جو ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ایک مرتبہ ان کے کلام کو سُن کر دوبارہ پڑھا بھی جائے اور سمجھا بھی جائے۔ افسوس ہے کہ ان کے انتخاب میں بہت سے ایسے اشعار نظر نہیں آتے، جن کو سب سے پہلے نظر آنا چاہئے تھا۔

فانی کی شاعری کی یہ خصوصیت کہ ہم اس سے اُن کی زندگی کا پورا حال معلوم کر سکتے ہیں، بہت کم دوسرے شاعروں میں نظر آتی ہے۔ انہوں نے اپنی عمر کا سارا حصہ سوگوارانہ بسر کیا اور یہ کیفیت ان کے ان اشعار سے بھی ظاہر ہے، جنھیں عالم سرخوشی کی پیداوار کہنا چاہئے۔ ان کے سوز و گداز میں نہ میر و درد کی سی کیفیت ہے، نہ لکھنوی آہ و بکا کی، بلکہ سقراط والا فلسفیانہ قسم کا صبر و ضبط پایا جاتا ہے، جو خود اپنے سینے میں خنجر بھونک لینا کہہ سکتے ہیں۔

جگر خالص غزل گو شاعر ہیں اور ان کی یہ خصوصیت مجھے بہت عزیز ہے۔ وہ غزل کے لئے پیدا ہوئے اور انھوں نے ہمیشہ غزل ہی کہی۔ ان کے یہاں رنگینی، سوز و گداز، جوش و ولولہ، عجز و فتادگی، بیخودی و سرشاری سبھی کچھ پایا جاتا ہے اور اس قدر توازن و تناسب کے ساتھ کہ ہر شعر کانٹے کی تُلی ہوئی چیز معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے کلام کا انتخاب مجموعہ کو سامنے رکھ کر نہیں کیا بلکہ جو اشعار بے اختیارانہ ان کی زبان پر آتے گئے، انھیں کو قلمبند کر لیا اور اس میں شک نہیں کہ اس سے بہتر انتخاب ان کے کلام کا ہو بھی نہ سکتا تھا۔

فراق اپنی اور اپنی شاعری کی عمر کے لحاظ سے دوسرے گروپ میں آتے ہیں لیکن چونکہ ان کا ذوق صرف غزل گوئی ہے اسلئے پہلے گروپ کی چیز ہیں۔

فراق کی شاعری کے متعلق میں بہت بلند رائے رکھتا ہوں جس کا اظہار میں ایک مستقل مضمون کے ذریعے سے کر چکا ہوں۔ فراق ایک قادر شاعر ہیں اور اس خصوصیت میں اس کا کوئی دوسرا شریک نہیں۔ وہ شعر نہیں کہتا، زندگی اور محبت کے نکات پر تبصرہ کرتا ہے اور اتنا لطیف و عمیق تبصرہ کہ شاعری سے علیحدہ ایک مستقل لذت محسوس ہونے لگتی ہے۔ فراق کی شاعری پختگی سے قبل ہی ایک ایسی حلاوت اپنے اندر رکھتی ہے کہ ہمیں اس کی پختگی کی طرف سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔

دوسرے گروپ میں، میں نے محروم۔ جوش۔ علی اختر اختر۔ حفیظ۔ افسر۔ اختر شیرانی، آنند نراین ملا۔ روش اور احسان دانش کو رکھا ہے۔ تلوک چند محروم بہت پرانے نظم نگار ہیں، لیکن غزل کہنے کی حیثیت سے وہ اس سے زیادہ پرانے ہیں، یہی حال قریب قریب دوسرے گروپ کے تمام شعراء کا ہے جنھوں نے پہلے غزلیں کہیں اور پھر نظم کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان میں حفیظ اور آنند نراین ملا کو چھوڑ کر باقی تمام شعراء کے انتخاب سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے انھیں واقعی نظم لکھنے کے لئے پیدا کیا تھا، کیونکہ ان کی غزلوں میں بھی زیادہ تر نظم ہی کا انداز پایا جاتا ہے۔ حفیظ کی غزلوں میں البتہ غزل کا سرمایہ موجود ہے اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان کی نظم نگاری ان کا فطری میلان نہیں۔ آنند نراین ملا نے غزلیں بہت کم کہی ہیں، لیکن ان کی یہ خصوصیت کہ وہ نظموں میں بھی غزلوں کا سا لطف پیدا کر دیتے ہیں کسی دوسرے نظم گو شاعر میں نہیں پائی جاتی۔ افسر کی غزلوں میں بھی بہت نرمی پائی جاتی ہے اور اختر شیرانی کے یہاں بھی لافانی رنگینی موجود ہے۔ جوش، علی اختر، روش اور احسان کے متعلق تفصیل سے میں اس وقت لکھوں گا جب خالص نظم نگار شاعروں کے سلسلے میں دوبارہ "بزم نگار" منعقد کروں گا۔ افسوس ہے کہ ہمارا انتخاب جو "مئے دو آتشہ" کے عنوان سے پیش کرنے والا تھا ملتوی کر دینا پڑا۔ امید ہے کہ جلد اس وعدہ کو پورا کروں گا اور اسی وقت ہر شاعر کے متعلق تفصیلی تبصرہ بھی کروں گا۔

تبصرہ

غلام جیلانی برق کی کتابیں

پاک دینی فکر کی ممتاز جہتوں میں سے ایک کا نام غلام جیلانی برق (پ ۱۹۰۱ء) بھی ہے۔ دو اسلام اور دو قرآن اقبال، ابوالکلام، مودودی اور پرویز کے بعد دینی فکر پر سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتابوں میں شمار ہوتی رہی ہیں۔ ایسی کہ اپنے مصنف سے کہیں زیادہ مشہور ہیں۔ یہ دو درجن سے زیادہ کتابوں (اور کئی سو مقالات) کے مصنف ہیں، جن میں عظیم کائنات کا عظیم خدا، دو قرآن، دو اسلام، امام ابن تیمیہ، آئین فطرت، جہان نو، دانش عرب و عجم، اللہ کی عادت، بھائی بھائی، دانشمندانِ سعدی، اسلام اور عصر رواں، ہماری عظیم تہذیب، معجم القرآن، مسائل نو، رمز ایمان، من کی دنیا، میری داستان حیات، عالم اسلام، ایک اسلام، تاریخ انتخاب حدیث، یورپ پر اسلام کے احسان اور میری آخری کتاب قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی کتابوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ قرآن مجید کی آیات کا ترجمہ کرنے میں قرآنی عربی کی روح اردو کی تنگ دامانی میں سماتی نظر آتی ہے اور ایسا دل آویز ترجمہ سامنے آتا ہے جس کی مثال پیشرو اور معاصر ترجموں میں اور کہیں نہیں ملتی۔ اس ترجمہ کی مثالیں پھر کسی موقع پر۔ فی الحال ان کی کتاب 'من کی دنیا' سے ایک اقتباس درج کیا جا رہا ہے۔ 'من کی دنیا' میں ضمیمہ کے طور پر "میرے گیت" کے عنوان سے شامل ہے۔ مذہبی تفکر کے میل میں یہ ادبی دلآویزی اور دلربائی قائم رکھنا کسی معمولی قلم کے بس کی بات نہیں جو اس اقتباس میں ملے گی۔ امید ہے یہ چند صفحے اردو ادب میں ایک نئے تجربے کے طور سے دلچسپی سے پڑھے جائیں گے۔ خلیل جبران اور ہیمرشولڈ (ڈائری) کی طرزِ فغاں کا عکس سہی لیکن یہ دیکھئے کہ اردو ادب میں اور یجنل طور سے تو پہلی بار ہی ہے!

تو ملاحظہ ہو پہلے تو من کی دنیا سے میرے گیت۔ اور پھر میری داستان حیات سے اقبال کے بارے میں ایک اہم اقتباس۔

میرے گیت

- اے رب! میں حریم دل میں ایمان کی جوت جلا کر اندھیروں کو باہر دھکیل رہا ہوں تاکہ تو آ کر بیٹھ سکے۔
- جب احساس ندامت سے میرا ایک آنسو ٹپکا تو کہیں سے آواز آئی، آنسو بہائے جا! کہ روح کی پرکھا یہی ہے۔
- بہار کا ایک پرندہ میری کھڑکی پہ آیا، اور گیت گا کر اُڑ گیا، پھر خزاں کے زرد پتے سرسراتے ہوئے آئے اور آگے چلے گئے۔ میں آج تک یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ طائر بہار کا گیت زیادہ دلکش تھا، یا برگ خزاں کی فریاد۔
- سر جھکانے کے بعد میں سات آسمانوں سے اوپر نکل گیا، لیکن تیرے قدموں کو چھونے کی سعادت پھر بھی حاصل نہ ہو سکی۔ اے روح کائنات! پاؤں ذرا آگے بڑھا۔
- آرزو کے سنسان بیابان میں چلتے چلتے تھک گیا۔ اس ٹوٹنے کو تھی کہ وہ چاند کی ایک پلیج کرن پہ سوار ہو کر میرے سامنے آ گیا۔ چاروں طرف اَن گنت چراغ جلنے لگے اور لاتعداد پھول مہک اٹھے۔
- آسمان کا نیلا دامن اٹھا کر تو نے مجھے جھانکا۔ میں ایک تیز رفتار بادل پر سوار ہو کر تیری دہلیز پر جا پہنچا اور ابھی تک باریابی کا منتظر ہوں۔
- چاندنی کی ساکن جھیل میں یہ نور میں لپٹی ہوئی کشتی کس کی ہے؟ اس میں کون ستار بجا رہا ہے جسے سننے کے لئے ساری کائنات نے سانس روک رکھی ہے۔
- بالآخر رات ختم ہو جائیگی اور تیرے سُریلے گیت سورج کی کرنوں میں حل ہو کر تمام فضا میں پھیل جائیں گے۔
- تم چاندنی کی طرح دبے پاؤں شہر کی اُجاڑ راہوں پر چل رہے تھے۔ میں نے گھر کا دروازہ کھول دیا کہ شاید تم اندر آ جاؤ، لیکن صبح تک یہ دروازہ چشم انتظار کی طرح کھلا ہی رہا۔
- رات کو جب اس کی سانس میرے جسم سے ٹکرائی، تو میرے خواب حسین گیتوں سے گونج اٹھے۔
- کالے بادلوں کو جب چاندنی مَس کرتی ہے تو وہ مسکراتے ہوئے پھول بن جاتے ہیں۔
- میرا خیال تھا کہ میری راہیں شب کے دھندلکوں میں گم ہو چکی ہیں عین اسی عالم میں افق سے ایک

ستارا ٹوٹا جو میری راہوں کو جگمگاتا ہوا میری روح میں ڈوب گیا۔

• میرے گیت، جو الفاظ کی قید سے آزاد ہیں، سمندر کی لہروں اور فضا کی بدلیوں کی طرح آزاد اور ان وسعتوں میں یوں گم ہو رہے ہیں، جس طرح کونجوں کا کوئی قافلہ دور افق میں نظر سے اوجھل ہو رہا ہو۔

• میری حیات کے اڑتے ہوئے عارضی لمحات کو تو نے اپنے مَس سے جاودانی بنا ڈالا۔

• مسافر! تو کہاں جا رہا ہے؟ اس دنیا کی طرف جہاں بھونرے گاتے اور پھول ناچتے ہیں؟ تجھے موت کی تاریک وادی سے گزرنا ہوگا۔ ایمان کا چراغ ساتھ لے جا کہ بھٹک نہ جائے۔

• میں نے ایک کیاری میں پھول لگائے۔ پھر دیکھا کہ پتیاں کانپ رہی ہیں۔ تتلیاں بے چین ہیں۔ کلیاں انگڑائیاں لے کر جاگ رہی ہیں اور مجھے یقین ہو گیا کہ ہر شے تکمیل کے لیے بیتاب ہے۔

• میں شبنم کے موتیوں کا ہار پرونے کے لیے پھول کی طرف لپکا اور شبنم کرنوں کے پر لگا کر اڑ گئی۔ میں نے پھول توڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور پتیاں بکھر گئیں۔ میں اداس ہو گیا اور معاً ایک پتی بول اٹھی "کملے! آنسوؤں کے موتی رول اور ان بہاروں کو آواز دے، جو تیری روح میں خوابیدہ ہیں۔

• آسمان کی تیرہ فضاؤں کو جگمگانے کے لیے شاید اور ستاروں کی ضرورت پڑے، لیکن میرے من کی کٹیا کے لیے صرف ایک جگنو کی لو کافی ہے۔

• غروب آفتاب کے بعد جب جھینگروں کے گیت بند ہو گئے، کوہساروں کی چوٹیاں اداس اداس نظر آنے لگیں اور کائنات پر ایک مہیب سناٹا چھا گیا تو میں نے من کی جھیل سے کنول کا ایک پھول توڑ کر عروسِ شب کی زلفوں میں ٹانک دیا۔

• تیری محبت کے گیت میری روح کی وادی میں یوں گونج رہے ہیں، جس طرح بن میں مور کی جھنکار یا بادلوں میں پپیہے کی پکار۔

• نہ جانے شہد کی مکھی ان گیتوں کو کیسے سن لیتی ہے جو پھول کے ضمیر میں نہاں ہیں اور یہ ان گہرائیوں تک کیونکر پہنچ جاتی ہے جہاں شہد کے خزانے پوشیدہ ہیں۔

• چمن میں بہار آئی اور کہنے لگی: "میں کل چلی جاؤں گی"
میں نے ایک پھول مانگا، تو میری سادگی پہ تمام کلیاں ہنس دیں۔ میں اس غم میں رات بھر نہ سویا۔ صبح دم جب پہلی کرن میرے کاشانے میں داخل ہوئی تو آنگن پھولوں سے مہک رہا تھا، اور بہار جا چکی تھی!

ور سورج کی پہلی کرن نے کہا : "آج وہ اس بستی میں دربار لگائے گا" میں بے تابانہ دوڑا، ہر گلی کوچے کو چھانتا ہوا باہر جھیل پہ جا پہنچا۔ ہر طرف دیکھا۔ ابر رنگ چڑیوں سے پوچھا۔ بھونروں اور تتلیوں سے دریافت کیا، بَن میں ڈھونڈا لیکن بے سود، تھکا ہارا کٹیا میں واپس آیا۔ کھاٹ پہ لیٹ گیا۔ آنکھ بند کی تو تیرا سنہری سنگھاسن روح کے تخل میں بچھا نظر آیا۔

• سنسان اور اجاڑ راہوں پہ چلتے چلتے جب موت گھبرا گئی، تو زندگی کرنوں کا زینہ لگا کر اتری اور اس کی ہمسفر بن گئی۔

• میں برسوں سے ایک ہی ڈگر پہ چل رہا تھا۔ ہر صبح اپنا ریوڑ ایک ہی چراگاہ کی طرف لے کر نکلتا تھا۔ ایک دن جنگل میں بھٹک گیا اور ایک ایسے سبزہ زار میں جا پہنچا جہاں میرا بچپن بیتا تھا، جہاں شباب مجھے دنیائے رنگ و بو میں لے گیا تھا ——— اور یہ تھا میرا اپنا جنم!

• جگنو نے پوچھا: "تو اس تاریکی میں کہاں جا رہا ہے؟" میں نے کہا: "اس کی تلاش میں۔" کہا: "یہ لے ایک شعلہ اور پہلے اپنے آپ کو تلاش کر۔"

• میں ایک چٹان پر ٹہل رہا تھا کہ پاؤں پھسلا اور سمندر میں جا گرا۔ ہاتھ پاؤں مارنے سے سطح سمندر پہ ایک اضطراب سا پھیل گیا۔ پھر ڈوب گیا۔ گہرائیوں میں وہی سکون خیمہ آرا تھا جو رات کو تاروں کی محفل اور دور مشرقی اُفق کی وسیع وادیوں میں ملتا ہے اور میں مطمئن ہو گیا۔

• سرحد ادراک اور اقلیم حقیقت کے درمیان وہ طویل و عریض مسافتیں حائل ہیں، جنھیں راحلۂ عشق کے بغیر طے نہیں کیا جا سکتا۔

• مکتب میں نہ جا، کہ اہل علم کی فصیح و بلیغ تقریروں سے وہ بات سمجھ میں نہیں آئے گی جو لالۂ صحرا کی ایک پتی بہ یک جنبشِ لب سمجھا سکتی ہے۔

• میں نے کہا: "خزاں آگئی! اب کیا ہو گا"!

شاخ بے برگ نے جواب دیا: "گھبراؤ مت کہ خزاں کی آستین میں لاکھوں بہاریں دبکی ہوئی ہیں۔"

• دو آدمیوں کو تلاش کرنا مشکل ہے، ایک وہ جو اپنے آپ سے جدا ہو جائے، اور دوسرا وہ اپنے آپ کو پا لے۔

شاعر، وادی میں چلتا گیا اور بہت دور نکل گیا۔ لوگوں نے اُسے تلاش کیا اور وہ مل سکا البتہ

وہاں ایک چشمہ نظر آیا، جو اس سمت سے آ رہا تھا جس طرف شاعر گیا تھا اور ہر موج کے لب پہ وہی گیت تھے جنھیں شاعر گایا کرتا تھا۔

• میں نے قلم کو روشنائی میں ڈبو کر لکھا، تو آواز آئی: "یہ بیانات ہیں"۔ پھر قلم کو آنسوؤں میں بھگو کر تحریر کیا، تو ندا آئی: "یہ جواہرات ہیں"۔ پھر خونِ جگر سے رقم کیا تو صدا آئی: "یہ الہامات ہیں"۔

• کچھ گیت ایسے بھی ہیں جو شاعر گاتا ہے: کچھ ایسا جو زبانِ گُل سے بلند ہوتے ہیں، اور کچھ ایسے بھی جو زہرہ کی بلندیوں سے بصورتِ شبنم زمین پر ٹپک پڑتے ہیں۔

• افلاس خود ہمیشہ جھونپڑوں میں رہا۔ لیکن اس کے طاقت ور ہاتھوں نے ثقافت و تمدّن کے رفیع و عظیم محل تعمیر کیے ہیں۔

• کیا وہ گا سکتا ہے؟ بلبل سے پوچھیے۔ کیا وہ رو سکتا ہے؟ شبنم سے پوچھیے۔ کیا وہ مسکرا سکتا ہے؟ کلی سے پوچھیے۔

• زندگی ایک متاعِ گم گشتہ ہے، جس کی تلاش میں ہم سرگرداں ہیں۔ جب یہ مل جاتی ہے تو ہم خود گم ہو جاتے ہیں۔

• پہلے میں نے اسے کرنوں کے زینے سے اُترتے دیکھا۔ جب ایک بوڑھا کاشت کار کندھے پہ ہل اٹھائے سبز کھیتوں میں سے جا رہا تھا، تو میں نے اسے ایک گھنے درخت میں گنگناتے دیکھا جس کے سائے میں ایک تھکا ہارا چرواہا سو رہا تھا۔

• حرص و غضب دو متعفن لاشیں ہیں۔ دل کی مقدس زمین کو ان کا مدفن نہ بننے دو۔

• وہ زندگی سے بھاگ کر پہاڑوں میں روپوش ہو گیا۔ دوسری صبح جاگا تو زندگی اس کے آنگن میں ناچ رہی تھی!

("مَن کی دنیا": مصنفہ غلام جیلانی برق: اشاعتِ پنجم)
۲۷۵ - ۲۶۳

ملفوظ اقبال

[غلام جیلانی برقؔ اپنی تازہ تصنیف "میری داستان حیات" میں لکھتے ہیں کہ: "۱۹۱۸ء سے ۱۹۳۱ء تک کے درمیانی عرصہ میں تقریباً دس برس لاہور رہا۔ اسی درمیانی عرصے میں (صحیح تاریخ موجود نہیں) ایک دن اقبالؒ کے یہاں پہنچے ہوئے تھے کہ سالکؔ، مہرؔ اور راجحسن نظر آئے اور باتیں شروع ہو گئیں۔ پھر:]

مولانا سالک نے پوچھا کیا آپ نے دیگر الہامی کتابوں کا بھی مطالعہ فرمایا ہے؟ کیا ان کی تعلیمات قرآنی تعلیمات سے الگ ہیں؟

اقبال: سب الہامی کتابیں اللہ کا کلام ہیں۔ ان میں تفریق مومن کے شایانِ شان نہیں لیکن جب ہم ویدوں کو پڑھتے ہیں تو گرجتے ہوئے بادلوں اور دھاڑتے ہوئے سمندروں کی ہیبت سے دہل جاتے ہیں۔ دوسری طرف جب ہم قرآن میں جابجا اس قسم کے آیات پڑھتے ہیں: سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ (ہم نے سورج چاند اور ارض و سما کی ہر چیز کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے) تو ہمیں اپنی برتری اور عظمت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ ویدوں کے ہاں کائنات عظیم ہے اور انسان حقیر ہیں۔ لیکن قرآن کے ہاں خدا کے بعد عظیم ترین مخلوق انسان ہے۔

("میری داستانِ حیات" مصنفہ غلام جیلانی برق: ۱۲۵)

●●

زبدۃ الطب کا ایک نسخہ پشاور میں

اسلامیہ کالج پشاور، خواہ کسی نیت سے قائم ہوا ہو لیکن اس سے جو اضطراری فوائد حاصل ہوئے ہیں ان کا شکریہ کیوں نہ ادا کیا جائے، اس کالج میں ایک شرقی کتب خانہ کی بھی بنیاد ڈالی گئی ہے۔ پشاور میں مولانا غلام جیلانی مرحوم ایک نہایت علم دوست عالم تھے جو اپنی دولت کا کثیر حصہ نادر کتابوں کی خرید پر صرف کرتے تھے۔ ملک عرب کا سفر علاوہ ارادہ حج کے اہم کتابوں کے شوق میں کیا اور وہاں سے متعدد قلمی کتابیں ان کو ہاتھ آئیں۔ مولانا سے محاورج کا انتقال ہو گیا اور ان کا یہ نادر کتبخانہ ان کی بیوی اور لڑکی کے حصہ میں آیا انھوں نے نہایت فیاضی سے ان زر و جواہر کو اسلامیہ کالج کے علمی خزانہ میں منتقل کر دیا۔ جزاہما اللہ خیر الجزاء۔

ہمارے پاس ان کتابوں کے نام اور خصوصیات پر ایک چھوٹا سا مطبوعہ انگریزی کا رسالہ کالج کی طرف سے آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت اس کالج کی یہ خوش قسمتی تھی کہ یہ سرمایہ اس کی ملکیت میں آسکا۔ ان کتابوں کی عام خصوصیات یہ ہیں: (۱) تمام تر قلمی ہیں اور اکثر اب تک چھپی نہیں، (۲) خود مصنفین یا ان کے شاگردوں یا ان کے معاصرین یا ان کے قریب زمانہ کی لکھی ہوئی ہیں۔ (۳) ان میں سے بعض نہایت عمدہ، خوشخط، مطلا اور مذہبی ہیں، (۴) اکثر کتابیں تیموریوں کے شاہی کتبخانہ کی ہیں، بعض کتابیں جن مصنفین کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں: محمد بن عمران مقدسی، علامہ جبری اور شیخ عبد الحق دہلوی۔

نادر کتابوں میں حسب ذیل کتابیں خاص وقعت کے لائق ہیں: (۱) حدیث میں سنن کبیر بیہقی، مکتوبہ ۷۲۶ھ اس کی دس جلدوں میں سے آٹھ جلدیں موجود ہیں۔ (۲) فتح الباری ابن حجر ۸۸۳ھ کا لکھا ہوا۔ یعنی خود مصنف کی زندگی کا نسخہ (۳) زبدۃ الطب، فن طب پر ایک نادر تصنیف، ساتویں صدی ہجری کا نسخہ ہے۔ (۴) سعید بن ہبتہ اللہ کی کتاب الاقناع فلسفہ میں، یہ نہایت قدیم تصنیف ہے۔ ابن سینا اس کا حوالہ دیتا ہے (۵) امام محمد کی کتاب الزیادۃ فقہ میں نہایت نایاب کتاب، یہ نسخہ ۹۳۲ھ کا لکھا ہے۔ (۶) علم البحریہ، فن جہازرانی میں، مکتوبہ ۱۰۰۷ھ۔ (۷) مفاتح الرحموت، فن کسرہی پر ایک نایاب نسخہ۔ ("معارف" ۸/۲ فروری ۱۹۱۸)

• زبدۃ الطب پر جرنل کے شمارہ ۵۵ میں وسیم احمد اعظمی کا مختصر نوٹ شائع ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں معارف سے متعلقہ نوٹ کی پیشکش مناسب معلوم ہوتی ہے (ادارہ)

••

ڈاکٹر حنیف نقوی

سلمان ساوجی کی غیر مطبوعہ غزلیات کے بارے میں

برادر مکرم! سلام مسنون

"جرنل" کا تازہ شمارہ دیکھنے کا موقع ملا۔ ایک ہی نشست میں تمام کر ڈالا۔ غزلیات سلمان ساوجی پر آپ کا استدراک پڑھ کر لطف آ گیا۔ آپ کی اس بات پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ شائع شدہ غزلیات کی دیوان مطبوعہ میں تلاش کا خیال ان کے متن کی طباعت کے بعد آیا۔ بہرحال اس انکشاف سے یہ تو واضح ہو گیا کہ لوگ اس منصب بلند پر پہنچنے کے بعد بھی کتنے غیر ذمہ دار ہو سکتے ہیں۔ آپ نے بہت جی کی سی باتیں لکھ دی ہیں اس لئے مبارک باد قبول فرمایئے۔

••

ڈاکٹر محمد کلیم سہسرامی

مکرمی بیدار صاحب، سلام و رحمت!

"خدا بخش لائبریری جرنل" کا ۲۰ واں شمارہ ملا' اس عنایت کا شکریہ! آپ کا مقالہ "سلمان ساوجی کی غیر مطبوعہ غزلیات" پر دلچسپ اور پُر از معلومات ہے' لیکن ان فنی نکتوں سے ہر ادیب اور شاعر محظوظ نہیں ہو سکتا' ابھی پورا مقالہ نہیں پڑھ سکا' مطالعہ مکمل ہونے کے بعد اپنی رائے لکھ بھیجوں گا۔"

(۱۵ اپریل ۱۹۸۳ء)

••

ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن[1]
اسسٹنٹ لائبریرین
خدابخش لائبریری

تصحیح و اضافہ

مرآۃ العلوم و مفتاح الکنوز: کتابخانۂ خدابخش کی فارسی و عربی فہرست جلد سوم کے مسامحات

لیلیٰ و مجنوں، مخطوطہ نمبر ۳۹۷ : یہ منظوم نسخہ بارہویں صدی ہجری کا لکھا ہوا ہے اور ۶۳ اوراق پر مشتمل ہے۔ فارسی ہینڈ لسٹ جلد ۳، صفحہ ۵۰ پر، امیر خسرو دہلوی کو اس کا مصنف تحریر کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ اس کے مصنف دراصل عبداللہ ہاتفی ہیں۔ کیونکہ اس کی عبارت لیلیٰ و مجنوں از عبداللہ ہاتفی کے دوسرے نسخوں سے ملتی جلتی ہے۔ شروع کے ۲ دو شعر ملاحظہ ہوں:

این نامہ کہ کرد بنیاد   توقیع قبول روزیش باد
طغرائش بنام پادشاہی   کو راست چو عرش بارگاہی

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل اشعار میں شاعر نے اپنا تخلص استعمال کیا ہے:

یارب بزمین و آسمانت   با صدق و صفا و متانت
کاین نامہ کہ ہاتفی بصد درد   از مجلس دوستان خود فرد
ای واحد جدا کریمان   روزی کنیش بقاء ایمان

غلطی کی وجہ غالباً یہ ہوئی کہ کسی شخص نے مخطوطہ کے شروع صفحہ پر 'لیلیٰ و مجنوں از خسرو دہلوی' لکھ دیا ہے۔ کیٹلاگر نے اس کو دیکھ کر اس کا غلط اندراج کر دیا۔

دیوان محمود مخطوطہ نمبر [illegible] : یہ نسخہ تیرہویں صدی ہجری کا لکھا ہوا ۱۰ ورق پر مشتمل ہے۔ فارسی ہینڈ لسٹ جلد ۳، صفحہ ۲۵ پر دیوان محمود کے نام سے اس کا اندراج کیا گیا ہے، حالانکہ یہ غلط ہے۔ اصل میں یہ محمود نامہ کا نسخہ ہے۔ کیونکہ محمود نامہ کے دوسرے نسخوں سے اس کی عبارت ملتی جلتی ہے۔ پہلا شعر ملاحظہ ہو:

ای داغ بردل از غم حال تو لالہ را   شرمندہ ساخت آہوے چشم غزالہ را

مجموعۂ اشعار مخطوطہ نمبر [illegible] : یہ نسخہ [illegible] صدی ہجری کا لکھا ہوا ہے اور [illegible] اوراق پر مشتمل ہے۔ ناقص الآخر ہے۔ فارسی ہینڈ لسٹ جلد [illegible] صفحہ [illegible] پر اس کا عنوان (مجموعۂ اشعار) [illegible] درج کیا گیا ہے [illegible] [illegible] یہ [illegible] کا دیوان ہے جس میں اس کی غزل، قصیدہ، مثنوی، قطعات اور رباعیات درج ہیں۔

یہ دیوان مثنوی سے شروع ہوتا ہے جس کے چند اشعار اس طرح ہیں :

این نامہ بنام آن خداوند کاندر دل من غم تو افگند

گاہم بوصال آشنا کرد گاہم بفراق مبتلا کرد

گاہی ز دل تو برد یادم از لطف تو کرد گاہ شادم

شاعر نے اپنے اکثر کلام کے آخر میں واثق تخلص استعمال کیا ہے۔ تاہم یہ تحقیق طلب ہے کہ یہ کون ہیں۔ داغستانی، یا ہروی یا کوئی اور؟ سب سے آخر میں جہاں شاعر نے اپنا تخلص استعمال کیا ہے وہ شعر

گرچہ ہر دم رسد آزار ز خلقم واثق شکر للہ کہ منیم در پی آزار کسے

ہفت پیکر مخطوطہ نمبر ۳۹۵۷ : یہ نسخہ ۱۰۱۲ھ کا لکھا ہوا ہے اور ۱۷ اوراق پر مشتمل ناقص الاول ہے۔ فارسی ہینڈ لسٹ جلد ۲ صفحہ ۱۶۱ پر یہ نسخہ ہفت پیکر مصنفہ نظامی گنجوی کے نام سے درج کیا گیا ہے جو غلط ہے۔ کیونکہ یہ ہفت پیکر کا نسخہ ہے اور نہ اس کے مصنف نظامی گنجوی ہیں، بلکہ یہ ہفت منظر ہے اور اس کے مصنف عبداللہ ہاتفی ہیں۔ ہفت منظر کے دوسرے نسخوں سے مقابلہ کیا گیا تو اس کی عبارت سے ملتی جلتی ہے۔ ثبوت کے لیے مندرجہ ذیل ابتدائی اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔ جہاں شاعر نے اپنا تخلص استعمال کیا ہے :

در ازل ہرچہ کردہ تقدیر بنود غیر گردش تدبیر

رحمت از ہاتفی دریغ مدار آفتابش بزمین میغ مدار

'ہفت منظر' نام رکھنے کے لیے شاعر نے یہ شعر تحریر کیا ہے :

ہفت منظر نہادم آن را نام کہ چو سبع شداد گشت تمام

ساختم دلفریب منظرہا در فضای فصاحتش درہا

مثنوی رومؔ دفتر چہارم مخطوطہ نمبر ۲۹۸۰ : یہ نسخہ گیارہویں صدی ہجری کا لکھا ہوا ہے ۱۷۷ اوراق پر مشتمل ہے۔ فارسی ہینڈ لسٹ جلد ۲ صفحہ ۵۲ پر مثنوی روم دفتر چہارم کا نام اس کا اندراج کیا گیا ہے۔ جبکہ اس سے قبل دفتر سوم بھی ہے، جس کا اندراج غلطی سے چھوڑ دیا گیا ہے۔ یہ دفتر مقدمہ کے بعد دفتر ذیل شعر سے شروع ہوتا ہے :

ای ضیاء الحق حسام الدین بیار این سیم دفتر کہ سنت شد سہ بار

کلیاتِ سعدی، مخطوطہ نمبر ۲۷۸۶ : یہ نسخہ ۱۲ ہویں صدی ہجری کا لکھا ہوا ہے اور ۱۴۰ اوراق پر مشتمل ہے۔ فارسی ہینڈ لسٹ جلد ۳، صفحہ ۴۴۱ پر کلیاتِ سعدی کے نام سے ہی اندراج کیا گیا ہے جو غلط ہے۔ یہ دراصل شش رسالہ سعدی ہے جس میں مندرجہ ذیل چھ نثری رسالے موجود ہیں :

رسالۂ اوّل در تقریرِ دیباچہ ۔ رسالۂ دوم در مجالس پنج گانہ

رسالۂ سوم در سوال صاحب دیوان ۔ رسالۂ چہارم در سوال مولانا سعد الدین فی العشق والعقل

رسالۂ پنجم در نصیحۃ الملوک ۔ رسالۂ ششم در تقریرِ ثلاثہ

رسالۂ اوّل سے پہلے ایک دیباچہ ہے جس میں تذکرہ دولت شاہی اور صحف ابراہیم سے شیخ سعدی کے حالات اخذ کر کے نقل کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد ایک اور دیباچہ ہے جو علی بن احمد بیستون کا ہے اور شش رسالہ سے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔

لیلیٰ و مجنوں مخطوطہ نمبر ۳۴۶ : یہ نسخہ ۹۶۵ھ کا لکھا ہے اور ۴۷ اوراق پر مشتمل ہے۔ فارسی ہینڈ لسٹ جلد ۳ صفحہ ۴۷ پر لکھا ہے کہ اس کے مصنف عبداللہ ہاتفی ہیں اور سنہ کتابت ۹۶۴ھ ہے۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ یہ ہاتفی کی نہیں، ملّا عبدالرحمٰن جامی کی ہے اور سنہ کتابت ۹۶۵ھ ہے۔ شروع کا شعر :

ای خاک تو تاجِ سر بلنداں ❖ مجنون تو عقلِ ہوشمنداں

●●

جناب نسیم احمد اعظمی

فارسی مخطوطات کی مطبوعہ فہرست مجمل "مرأۃ العلوم" ج ۳ میں بعض طبی مخطوطات کا اندراج فن اور مجامیع کے ضمن میں علٰحدہ علٰحدہ ہو گیا ہے۔ چند مخطوطات کے مصنفین کا نام تحریر نہیں ہے۔ ایک مخطوط کے مصنف کا نام غلط تحریر ہے۔ تفصیل حسب ذیل ہے:-

(۱) تدارک الخطا (ہینڈ لسٹ ۳۰۰۰/۲ مطبوعہ فہرست "مرأۃ العلوم" ج ۳ ص ۱۶۲ میں اس کا اندراج فن طب کے تحت ہے اور ص ۲۷۶ ج ۳ میں مجامیع کے ضمن میں ہے۔ یہ مخطوط عربی زبان میں ہے۔ فارسی فہرست میں اس کا اندراج غلط ہے۔ مزید یہ کہ یہ ابن سینا کی تصنیف ہے۔ ابو الحسن احمد بن محمد السہیلی کو اس کا مصنف قرار دینا درست نہیں ہے۔ عربی مخطوطات کی مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز ص ۱۸۹ ج ۳ میں ہینڈ لسٹ ص ۲۴۹۳ کے تحت اس کے ایک دوسرے نسخہ کا اندراج ہے۔ اس میں مصنف کی حیثیت سے ابن سینا اور مؤلف کی حیثیت سے ابو الحسن احمد بن محمد السہیلی کا نام تحریر ہے۔ مرآۃ العلوم اور مفتاح الکنوز دونوں میں ابو الحسن احمد بن محمد السہیلی کو "بالیا" لکھا گیا ہے، جو غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابن سینا نے اپنی اس کتاب کو گرگانج کے علم دوست ——— وزیر ابو الحسن احمد بن محمد السہیلی کے لئے تصنیف کیا تھا۔

(۲) دستور الفصد ہینڈ لسٹ ص ۳۰۱۲/۱

مجرب التداوی " " ص ۳۰۱۲/۲

ان دونوں کا اندراج مرآۃ العلوم ج ۳ ص ۱۶۵ میں فن طب اور ص ۲۷۷ ج ۳ میں مجامیع کے ضمن میں ہے۔ مجرب التداوی کے مصنف کا نام درج نہیں ہے۔ اس کے مصنف غلام مصطفٰے بہاری ہیں، اور اس مخطوط کے متعدد نسخے یہاں موجود ہیں۔

(۳) رسالۃ ارسطاطالیس ہینڈ لسٹ ص ۳۰۱۳/۴

فائدۃ " ص ۳۰۱۳/۵

ان کا اندراج مرآۃ العلوم ج ۳ ص ۱۶۵ میں فن طب کے تحت اور ص ۲۷۷ ج ۳ مجامیع کے ضمن میں ہے۔ [illegible] فہرست میں [illegible] اندراج غلط ہے۔ یہ دونوں عربی زبان میں ہیں۔

عربی مخطوطات کی مطبوعہ فہرست مجمل مفتاح الکنوز ج ۳ ، ص۱۸۳ میں ہینڈ لسٹ ۲۱۔۲۱۔۳۵۱۱ کے تحت ایک مجموعہ ہے۔ جس میں ۱۳ رسائل شامل ہیں۔ لیکن مجموعے سے متعلق مفتاح الکنوز کی مندرجہ ذیل اطلاعات صحت پر مبنی نہیں ہیں :۔

کتاب الاکر : (ہینڈ لسٹ ۱۵۱۱ ، ثاؤذسیوس کی اس کتاب کے ترجمہ کو ابوالعباس احمد بن المعتصم متوفی ۲۵۱ھ کی جانب منسوب کر دیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ثاؤذسیوس کی اس یونانی کتاب کو ابوالعباس احمد بن المعتصم نے یونانی سے عربی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا تھا اور قسطا بن لوقا البعلبکی (۲۸۸۔۱۳۹۰ھ) نے یونانی سے عربی میں تیسرے مقالے کی پانچویں شکل تک ترجمہ کیا۔ اس کے بعد اختتام کتاب تک کسی اور نے ترجمہ کیا ہے۔ مخطوط کی عبارت حسب ذیل ہے :

" وقد امر بنقله من اليونانية الى العربية ابو العباس احمد بن المعتصم بالله فتولى نقله قسطا بن لوقا البعلبكى الى الشكل الخامس من المقالة الثالثة ، ثم تولى نقل باقيه غيره ، واصلحه ثابت بن قرة الحرانى "

مذکورہ بالا عبارت سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ کتاب مذکور ابوالعباس احمد بن المعتصم باللہ کے حکم سے یونانی سے عربی میں قسطا بن لوقا البعلبکی اور کسی دوسرے نے ترجمہ کی تھی جس کی اصلاح کے فرائض مشہور حرانی مترجم ثابت بن قرہ (۸۳۶ – ۹۰۱ء) نے انجام دیئے تھے۔ اس مخطوط کا ایک نسخہ رضا لائبریری رامپور (کیٹلاگ ج ۵ ص۱۲) میں بھی ہے جو خط نسخ عربی میں ۷۲۳ھ کا ہے اس میں مترجم کی حیثیت سے قسطا بن لوقا البعلبکی کا نام تحریر ہے۔

کتاب الکرۃ المتحرکہ۔ (ہینڈ لسٹ ۲۵۱۲) اوطولوقس کی اس کتاب کے ترجمہ کو ابوالعباس احمد بن المعتصم باللہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے جب کہ اس بارے میں کوئی وضاحت مخطوط میں نہیں ہے۔ ہاں اس قدر ضرور پتہ چلتا ہے کہ اس کی اصلاح ثابت بن قرہ نے کی تھی۔ مخطوط کی ابتدائی عبارت حسب ذیل ہے :۔ " تحریر کتاب الکرۃ المتحرکۃ لاوطولوقس اصلحہ ثابت

رضا لائبریری رامپور کے کیٹلاگ ج ۵، ص۱۴ میں اس کتاب کے مترجم کی حیثیت سے ثابت بن قرہ ہی کا نام تحریر ہے۔

کتاب ظاہرات الفلک:۔ (ہینڈ لسٹ ص۱۵۱۳) اقلیدس کی اس کتاب کے ترجمہ کو بھی ابو العباس احمد بن المعتصم باللہ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ مخطوطہ میں ایسی کوئی عبارت نہیں جس سے اندازہ ہو سکے کہ اس کا ترجمہ ابو العباس احمد بن المعتصم باللہ نے کیا ہے۔ رضا لائبریری رامپور کیٹلاگ ج ۵، ص۱۶ پر اس کے ایک نسخہ کا اندراج ہے۔ اس میں مصنف کا کالم خالی ہے اور شارح کی حیثیت سے نصیر الدین الطوسی کا نام تحریر ہے۔

کتاب فی الایام واللیالی:۔ (ہینڈ لسٹ ص۳۵۱۴) ثاؤ ذوسیوس کی اس کتاب کے ترجمہ کو بھی ابو العباس احمد بن المعتصم باللہ کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ جب کہ مخطوطہ میں ایسا کوئی اشارہ نہیں ملتا جس سے اندازہ لگایا جا سکے کہ اس کے ترجمہ کے فرائض ابو العباس احمد بن المعتصم باللہ انجام دیئے ہیں ــــ رضا لائبریری رام پور کے کیٹلاگ ج ۵، ص۱۶ میں اس کے ایک نسخہ کا اندراج ہے۔ اس میں مصنف کا کالم خالی ہے اور شارح کی حیثیت سے نصیر الدین الطوسی کا نام تحریر ہے۔

کتاب فی الطلوع والغروب:۔ (ہینڈ لسٹ ص۳۵۱۶) اوطولوقس کی اس کتاب کے ترجمہ کو قسطا بن لوقا البعلبکی کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ جب کہ مخطوطہ میں ایسا کوئی نہیں ملتا جس سے اندازہ کیا جا سکے کہ ترجمہ کے فرائض قسطا بن لوقا ہی نے انجام دیئے تھے۔ ہاں اس قدر پتہ چلتا ہے کہ اس کی اصلاح ثابت بن قرہ نے کی تھی۔ مخطوطہ کی عبارت درج ذیل ہے:

"کتاب اوطولوقس فی الطلوع والغروب من اصلاح ثابت"

رضا لائبریری رام پور کے کیٹلاگ ج ۵، ص۱۶ میں مصنف کی حیثیت سے ثابت بن قرہ کا تحریر ہے۔

مقالہ فی تکسیر الدائرۃ:۔ (ہینڈ لسٹ ص۳۵۲۱) مصنفہ ارشمیدس میں مصنف کا نام غلط تحریر ہے۔ مخطوطہ میں ارسمیدس تحریر ہے۔

جناب سید شاہ محمد اسمٰعیل کاکو
خدابخش لائبریری پٹنہ

مفتاح الکنوز ج ۳، ص ۸۴ پر سلسلہ وار نمبر ۳۲۰۵ کے ذیل میں کتاب نمبر ۳۱۸۷ کا نام "شرح کتاب المنار ۔ن اصول الفقہ" لکھا گیا ہے، اور کیٹلاگ نمبر ۳۰۹ درج ہوا ہے، جبکہ اس مخطوط کا کیٹلاگ نمبر ۳۰۸ ہے، اور یہ لمنار کی شرح نہیں ہے، بلکہ حسام الدین الاخسیکثی (م ۶۴۴ھ = ۱۲۴۶ء) کی تصنیف "المنتخب فی اصول المذہب لمعروف" بالحسامی" کی شرح ہے اور اس کا نام" السامی فی شرح الحسامی" ہے۔ یہ مخطوط تقریباً بارھویں صدی ہجری کا نوشتہ ہے۔ لیکن ق ۱۹، اور ق ۱۰۰ کی کتابت کچھ بعد کی ہے، سرورق اور ق ا کی کتابت قریب العہد ہے۔ ؍چودھویں صدی ہجری کے نصف اول کی کتابت معلوم ہوتی ہے۔ غلط فہمی کی بنیاد یہ ہے کہ کاتب نے سرورق پر تاب کا نام" شرح المنار فی اصول الفقہ" لکھ دیا ہے، ق ا (الف) سے کتاب کی ابتدا لکی ہے، ق ا (ب) کی اخری عبارت مابعد سے مربوط ہے، مخطوط کی ابتدا وہی ہے، جو رامپور کیٹلاگ (ج ۳، نمبر ۲۰۱۷) میں" السامی شرح الحسامی" کے ذیل میں نقل کی گئی ہے۔

الحسامی کے متعدد نسخے لائبریری میں موجود ہیں، (ملاحظہ ہو، لائبریری کیٹلاگ ج ۱۹، حصہ اول نمبر ۱۴۹۵۔ ؍۱۴۹۱، ص ۶ — ۸)۔

شارح کا نام نزھۃ الخواطر (ج ۵، ص ۴۳۹ - ۴۴۰) میں ابو یوسف یعقوب البنانی اللاہوری ہے۔ و رامپور کیٹلاگ (ج ۳، نمبر ۲۰۱۷) میں ابو الفضل محمد یعقوب البنبانی اللاہوری الدھلوی ہے، لائبریری کیٹلاگ ج ۵ حصہ دوم، نمبر ۴۴۲، ص ۲۱۸ اور ج ۱۹ حصہ اول نمبر ۱۶۲۱ ص ۱۲۳ میں محمد یعقوب البنبانی لکھا ہے، جبکہ ج ۱۰ نمبر ۵۶۱، ص ۶۰ میں محمد بن یعقوب لکھا گیا ہے، ابن کا لفظ مخطوط میں نہیں ہے۔ اس لیے صحیح نام محمد یعقوب ہے۔ ؍کہ محمد بن یعقوب، نیز البنبانی صحیح ہے نہ کہ البنانی —
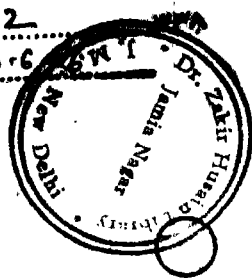
جناب سلیم الدین احمد
اسسٹنٹ لائبریرین
خدا بخش لائبریری پٹنہ

—— مفتاح الکنوز جلد سوم میں ہینڈ لسٹ نمبر ۱۷ - ۳۴۲۶ پر شامل دو مخطوطات "الاسفار عن قلم الاظفار" اور "الظفر بقلم الظفر" کے کیفیت کے خانوں میں درج ہے کہ یہ دونوں کتابیں "علم الاسناد" سے متعلق ہیں۔ حالانکہ یہ بات درست نہیں۔ خود کتابوں کے نام سے ہی ظاہر ہے کہ یہ کتابیں ناخن تراشنے کے آداب کے موضوع پر ہیں۔ پہلی کتاب کے موضوع کی صراحت کرتے ہوئے مصنف لکھتا ہے کہ "هذا جزو لطیف فی آداب قلم الاظفار سمیته بالاسفار عن قلم الاظفار" اور دوسری کتاب کے سلسلہ میں مصنف نے لکھا ہے کہ "هذه رسالة سمیتها الظفر بقلم الظفر مرتبة علی فاتحة ومقصد وخاتمه ..." اور خاتمہ میں لکھا ہے کہ "یستحب لمن قلم اظفاره ان یدفنها" جس سے موضوع کی بخوبی وضاحت ہوتی ہے۔

—— ہینڈ لسٹ نمبر ۳۳۴ پر کتاب کا نام "الارجوزة المسماة التشبیب عند التبیت" درج ہے۔ یہاں لفظ "التشبیب" کو "التبیت" ہونا چاہیے۔ توضیحی فہرست (انگریزی) جلد ۲ میں بھی یہی غلطی دہرائی گئی ہے

—— ہینڈ لسٹ نمبر ۳۴۳۳ پر "تحفة العلماء ... الله" نامی کتاب درج ہے۔ کیفیت کے خانے میں درج ہے کہ "برائے نسخہ دیگر سلسلہ نمبر ۵۳ ۵ مطالعہ کنید" جبکہ سلسلہ نمبر ۵۵۴ پر دوسری کتاب ملتی ہے، یہ نہیں۔ یہاں سلسلہ نمبر ۲۷/۱۵۰ ہونا چاہیے تھا، اسی کتاب کا ایک اور نسخہ سلسلہ نمبر ۳۱۰ (ہینڈ لسٹ نمبر ۲۱۵۰) پر بھی ہے۔

مذکورہ بالا چاروں کتابیں جلال الدین سیوطی کی تصنیف ہیں اور ان کے کاتب خضر بن سلطان ہیں۔ جبکہ توضیحی کیٹلاگ و ہینڈ لسٹ دونوں ہی میں ان کا نام خضر بن سلیمان درج ہے جو غلط ہے۔

—— الصحیفة الکاملة، تصنیف علی بن ابی طالب: فہرست نگار نے کتاب ...... کی ہے جبکہ اصلاً کتاب کا [illegible]

فکر و نظر

ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد کا ماہوار

علمی و دینی مجلّہ

جسمیں

قرآن، حدیث، فقہ، تصوف، علم کلام کے علاوہ

تقابل ادیان، فلسفہ، تاریخ، ادب، قانون، سیاست، معاشرت، معیشت، طب، ثقافت اور عمرانیات

سے متعلق موضوعات پر

اسلامی نقطۂ نظر سے تحقیقی مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔

	چندہ سالانہ	فی شمارہ
پاکستان کے لئے	۳۰ روپے	۳ روپے
دیگر ممالک کے لئے	۱۵ ڈالر	۱-۵۰ ڈالر
	۷-۵۰ پونڈ	۰-۱۵ پونڈ

اہل علم سے قلمی تعاون کی درخواست بھی ہے۔

"فکر و نظر" میں چھپنے والے مضامین کے لئے نقد یا ادارے کی مطبوعات کی صورت میں اعزازیہ بھی دیا جاتا ہے۔

مدیر • فکر و نظر
پوسٹ بکس نمبر ۱۰۳۵ - اسلام آباد - پاکستان

اردو کے عہد آفریں ادیب
ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری
کی
خود نوشت سوانح عمری
شائع ہو گئی
گردِ راہ

26-27